وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ؗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۲)

تفسیرِ کبیر

مصنفہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

جلد سوم

سورۃ البقرۃ رکوع ۱۸ تا رکوع ۴۰

تفسیرِ کبیر

از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

(جلد سوم۔ مشتمل بر سورۃ البقرۃ رکوع ۱۸ تا رکوع ۴۰)

Tafsir-e-Kabir **(The Grand Exegesis)**

by Hazrat Mirza Bashir-ud-Deen Mahmood Ahmad,
Khalifatul-Masih II, al-Muslih al-Mauood (1889-1965),
may Allah be pleased with him.
Volume 3
(Sūrah al-Baqarah, Rukū' 18-40)

(Complete Set – Volumes 1-15)

First published in India and Pakistan between 1940-1962 (11 Volume Set)
Second edition printed in Pakistan and the UK between 1986-1994 (10 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2004 (5 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2010 (10 Volume Set)
Digitally typeset edition published in UK, 2023 (15 Volume Set)

Published by:
Islam International Publications Limited
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey UK, GU9 9PS

Printed in the UK at:

For further information, please visit www.alislam.org

ISBN: 978-1-84880-274-2 (Set Vol. 1-15)
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم   وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مامور حضرت اقدس مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم الشان رحمت کے نشان کے طور پر پسر موعود کی بشارت عطا فرمائی جو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے وجود میں پوری ہوئی اور کلمات الہامیہ آپ کے وجود مسعود میں جلوہ گر ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ 'اسے علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔' قرآن مجید فرقانِ حمید کے وہ علوم و معارف بھی آپ کو سکھائے گئے جو اس سے پہلے منکشف نہ تھے۔ چنانچہ آپؓ نے تحریر فرمایا ہے کہ 'اس تفسیر کا بہت سا مضمون غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔' آپؓ نے قرآن کریم کی تفسیر تحریر فرمائی اور اس کے مطالب و معانی اور نکاتِ عجیبہ کو ظاہر و باطن میں پھر زندہ فرمادیا۔ یہ تصنیف لطیف موسوم بہ تفسیرِ کبیر اس مذکورہ بالا بشارت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت اور شاہد ناطق ہے اور لاریب قرآنی علوم و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو خدا تعالیٰ نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ظاہر فرمایا ہے۔

تفسیر کبیر کی پہلی جلد ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ بعدہٗ مختلف وقتوں میں اس کی کل ۱۱ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اوائل خلافت میں ہی ارشاد فرمایا کہ تفسیر کبیر کی صد سالہ جوبلی کے تحت دوبارہ اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس کے پازیٹو بنوا کر گیارہ کی بجائے دس جلدوں میں شائع کیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس علمی خزینہ کی اشاعت کا تازہ ایڈیشن طبع کروانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی طباعت کتابت ہو کر شائع ہوئی تھی اور باریک قلم سے لکھائی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ ہر صفحہ پر دو کالم تھے۔ چنانچہ یہ نیا ایڈیشن حسب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کمپوز کروایا گیا ہے، اس کا فونٹ سائز ۱۴ مقرر کیا گیا ہے اور دو کالموں کی بجائے عبارت کو ایک ہی سطر میں مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز حضور انور کی ہدایت تھی کہ جلدوں کی ضخامت کو بھی متوازن اور ہلکا

رکھا جائے تاکہ پڑھتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑ کر سنبھالنے میں دقت نہ ہو۔ اس ہدایت پر عملدرآمد کے نتیجہ میں تفسیر کبیر کی جلدوں کی تعداد دس سے بڑھ کر پندرہ ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے حلِ لغات کے مقامات میں بھی ادل بدل کرنا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت کے مطابق تفسیرِ کبیر عربی ایڈیشن کی طرز پر حوالہ جات کی تخریج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیرِ کبیر عربی ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ عربی عبارات بالخصوص حلِ لغات کے مواقع پر عربی عبارات جہاں اعراب کا اہتمام نہ تھا وہاں اعراب لگائے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ اس تفسیر کی اشاعت کو 'دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرنے کا موجب بنائے۔'

اس ترتیب وطباعت کے مختلف مراحل پر جن احباب کو خدمت قرآن کا موقع نصیب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی توفیق میں برکت بخشے۔ آمین

خاکسار

منیر الدین شمس

ایڈیشنل وکیل التصنیف

اپریل ۲۰۲۳ء

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ

اور ہر ایک (شخص) کا ایک (نہ ایک) مطمحِ نظر ہوتا ہے جسے وہ (اپنے آپ پر) مسلط کر لیتا ہے۔ سو (تمہارا مطمحِ نظر

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ

یہ ہو کہ) تم نیکیوں (کے حصول) میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم جہاں کہیں (بھی) ہو گے اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۹﴾

تمہیں اکٹھا کر کے لے آئے گا۔ اللہ یقیناً ہر ایک امر پر پورا (پورا) قادر ہے۔

حل لغات۔ وِجْهَةٌ وِجْهَةٌ کے تین معنے ہیں (۱) جہت (۲) مِنْهَاجٌ یعنی راستہ اور طریقہ (۳) وہ چیز جس کی طرف انسان توجہ کرے یعنی مقصود۔

اِسْتَبِقُوْا اِسْتَبَقَ سے جمع کا صیغہ ہے اور اِسْتَبَقَ کے معنے عربی زبان میں اَرَادَ كُلٌّ وَاحِدٍ اَنْ يَّسْتَبِقَ الْاٰخَرَ کے ہیں۔ یعنی ہر ایک نے دوسروں سے آگے نکل جانے کی کوشش کی۔

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی مطمحِ نظر ہوتا ہے جو ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور اسے پورا کرنے کے لئے وہ اپنی تمام مساعی صرف کر دیتا ہے۔ کبھی وہ تجارت میں ترقی اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ کبھی زراعت میں ترقی اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ کبھی سیاسی لحاظ سے اقتدار کا حصول وہ اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ کبھی سائنس میں ترقی کو اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ کبھی بیواؤں اور یتامیٰ اور مساکین کی خدمت کو وہ اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ کبھی دین اور مذہب کی اشاعت کو اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ غرض ہر شخص کسی نہ کسی مطمحِ نظر کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ ہر قسم کی قربانیوں اور جدوجہد سے کام لیتا ہے۔ نکمّے سے نکمّے انسان کو بھی دیکھ لو۔ تو معلوم ہو گا کہ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ فراغت انسانی فطرت میں داخل ہی نہیں۔ یہی حال اقوام کا ہے ہر قوم نے اپنا کوئی مقصد قرار دیا ہوا ہوتا ہے۔ اور وہ اس کے لئے سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ پس جب ہر انسان دنیا میں کچھ نہ کچھ ضرور کرتا ہے اور کسی نہ کسی امر کے متعلق اُسے شغف ہوتا ہے تو تمہارا بھی ایک مطمحِ نظر ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ تشتّتِ قومی کے ماتحت کوئی کسی مقصد کو اپنے سامنے رکھ لے اور کوئی کسی مقصد کو۔ مُوَلِّيْهَا میں مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے اور اصل عبارت اس طرح ہے کہ وَلِكُلٍّ

وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا وَجْهَهٗ۔یعنی ہر شخص کی کوئی نہ کوئی جہت ہوتی ہے یا ہر شخص کا کوئی نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے جس پر وہ اپنی تمام توجہات کو مرکوز کر دیتا ہے۔اور جسے زندگی بھر اپنے سامنے رکھتا ہے اور پورے انہماک اور توجہ سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔مگر لوگ تو اپنے مقاصد اپنے لئے خود تجویز کرتے ہیں۔لیکن ہم اُمتِ محمدیہ پر رحم کرتے ہوئے خود ہی ایک بلند ترین مطمحِ نظر اس کے سامنے رکھتے ہیں اور ہدایت دیتے ہیں کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ۔ تمہارا مطمحِ نظر یہ ہونا چاہیے کہ تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔اس جگہ نیکیوں میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی تحریک فرما کر اللہ تعالیٰ نے قومی ترقی کا ایک عجیب گُر بتایا ہے جسے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں بالعموم مدّنظر نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کو نیکیوں میں حصہ لینے کی نصیحت کی جائے یا کسی نیک کام کی ترغیب دلائی جائے تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ بس غریبوں پر ہی سارا زور ڈالا جاتا ہے امیروں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔حالانکہ اگر کوئی بڑا ہے اور وہ نیکیوں میں حصہ نہیں لیتا تو وہ اس کی مثال اپنے سامنے کیوں رکھتے ہیں۔انہیں تو اچھے نمونے کی اقتداء کرنی چاہیے اور امارت اور غربت پر بنیاد رکھنے کی بجائے ہمیشہ یہ دیکھنا چاہیے کہ نیکی اور تقویٰ کس میں پایا جاتا ہے اگر ایک غریب میں نیکی پائی جاتی ہے تو وہ اس امیر کے مقابلہ میں جس کے اندر تقویٰ نہیں خدا تعالیٰ کے حضور لاکھوں گُنا زیادہ بہتر ہے۔صحابہؓ کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ غرباء نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! جس طرح ہم نمازیں پڑھتے ہیں اسی طرح امراء بھی نمازیں پڑھتے ہیں۔جس طرح ہم روزے رکھتے ہیں اُسی طرح امراء بھی روزے رکھتے ہیں۔جس طرح ہم جہاد کرتے ہیں اُسی طرح امراء بھی جہاد کرتے ہیں مگر یا رسول اللہ! ایک زائد کام وہ یہ کرتے ہیں کہ وہ صدقہ وخیرات دیتے ہیں اور ہم غربت اور ناداری کی وجہ سے اس میں حصہ نہیں لے سکتے۔ہمیں کوئی ایسا طریق بتائیے جس پر چل کر ہم اس کمی کو پورا کر سکیں۔آپ نے فرمایا تم ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس دفعہ سُبْحَانَ اللهِ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور چونتیس دفعہ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہہ لیا کرو۔وہ بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔مگر تھوڑے دنوں میں ہی امیروں کو بھی اس کا پتہ لگ گیا اور انہوں نے بھی تسبیح وتحمید شروع کر دی۔اس پر غرباء نے پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ یا رسول اللہ! انہوں نے بھی تسبیح وتحمید شروع کر دی ہے اب ہم کیا کریں۔آپؐ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی کو نیکی کی توفیق دیتا ہے تو میں اس کو کس طرح روک سکتا ہوں (مسلم کتاب المساجد باب الذکر بعد الصلوٰۃ)۔یہ تھی ان کی نیکی اور اس میں تسابق کی روح۔اسی طرح بجائے اس کے کہ انسان اعتراض کرے اور کہے کہ فلاں سے یہ کام کیوں نہیں کروایا جاتا۔اُسے چاہیے کہ خود اس میں حصہ لے اور دوسروں سے آگے

بڑھنے کی کوشش کرے۔غرض دنیا میں ہر شخص کا ایک مطمحِ نظر ہوتا ہے۔کسی کو کھانے پینے کا شوق ہوتا ہے۔کسی کو عیش وعشرت کا شوق ہوتا ہے۔کسی کو تجارت کا شوق ہوتا ہے۔کسی کو اچھے لباس کا شوق ہوتا ہے۔کسی کو غیبت اور بدگوئی کا شوق ہوتا ہے۔کسی کو لڑائی جھگڑے کا شوق ہوتا ہے۔غرض کوئی انسان نہیں جس نے اپنے لئے کسی نہ کسی چیز کے حصول کو اپنا مقصد قرار نہ دیا ہوا ہو۔غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل بھی اپنے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد رکھتا ہے کسی کا مقصد چودھرایت حاصل کرنا ہوتا ہے۔کسی کا مقصد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہوتا ہے۔کسی کا مقصد سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہوتا ہے۔فرماتا ہے کہ جب کوئی نہ کوئی مقصد ہر انسان کے سامنے ہوتا ہے تو پھر تم وہ بات کیوں نہ کرو جس میں سب اچھی باتیں آ جائیں۔تمہیں یہ تہیّہ کر لینا چاہیے کہ کوئی خوبی ایسی نہ ہو جس میں دوسرا ہم سے آگے نکل جائے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ جب وہ جُدا ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو افسوس ہوا آپ اِس خیال سے کہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی اور ذریعہ سے اس کی خبر ہوئی تو آپ کو تکلیف ہو گی فوراً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور عرض کیا یارسول اللہ! آج ابوبکرؓ سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا جس کا مجھے افسوس ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات سن کر غصہ آ گیا اور آپ نے فرمایا تم لوگ کیوں اُسے تکلیف دینے سے باز نہیں آتے؟ جب تم لوگ اسلام کا مقابلہ کر رہے تھے تو وہ مجھ پر ایمان لایا تھا۔اور اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔حضرت عمرؓ ابھی معذرت ہی کر رہے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی خیال آیا کہ شاید حضرت عمرؓ میرے متعلق کوئی ایسی بات نہ کر دیں جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ناراض ہوں اس لئے وہ بھی دوڑ کر آئے کہ میں چل کر حقیقت حال بتاؤں۔کہ میرا نہیں بلکہ عمرؓ کا قصور تھا۔ مگر جونہی آپ دروازہ میں داخل ہوئے آپ نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ معذرت کر رہے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو ناراض ہو رہے ہیں۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اُسی وقت دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور عرض کیا۔ یارسول اللہ! فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ۔قصور میرا ہی تھا۔عمر کا قصور نہیں تھا۔اس طرح آپ نے حضرت عمرؓ پر سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کو دُور کرنے کی کوشش کی (بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی باب قول النبی لو کنت متخذا خلیلا....)۔یہ تھی اُن کی نیکی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی رُوح کہ قصور حضرت عمرؓ کا ہے مگر معافی حضرت ابوبکرؓ مانگ رہے ہیں تا کہ حضرت عمرؓ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ناراض نہ ہوں۔

درحقیقت اسلام اور دوسرے مذاہب میں جہاں اور بہت سے امتیازات ہیں جو اُس کی فضیلت کو نمایاں طور پر ثابت کرتے ہیں وہاں ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ دوسرے مذاہب صرف نیکی کی طرف بلاتے ہیں مگر اسلام

استباق کی طرف بلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ دنیا میں ہر قوم نے ایک ایک طرف اختیار کر لی ہے اور نیکی کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا ہے۔ وہ کہتے تو یہی ہیں کہ ہم نیکی کی طرف لے جاتے ہیں لیکن واقعہ میں ایسا نہیں کرتے۔ پس اُن کے اور اطراف کو اختیار کر لینے کی وجہ سے نیکی کی طرف بالکل خالی رہ گئی ہے۔ تم اس کو لے لو اور اوّل تو نیکی اختیار کرو اور پھر نیکیوں میں استباق کرو۔ اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں استباق کا لفظ رکھا ہے جس میں بظاہر سرعت اور تیزی نہیں پائی جاتی اس لئے کہ اگر دو آدمی سُست روی سے جا رہے ہوں اور ایک ان میں سے کسی قدر آگے بڑھ جائے تو لغت کے اعتبار سے اس نے استباق کر لیا۔ اسی طرح ہر کام میں تھوڑا سا بڑھنے کا نام استباق رکھا جا سکتا ہے لیکن دراصل اس لفظ میں انتہا درجہ کی سرعت اور تیزی سے آگے بڑھنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ استباق کرے۔ اب اگر ایک شخص کوشش سے کچھ آگے بڑھے تو دوسرے کے لئے بھی حکم ہے کہ وہ اس سے آگے بڑھے۔ اور جب وہ اس سے آگے بڑھے گا تو پھر پہلے کو وہی حکم آگے بڑھنے کے لئے تیار کر دے گا۔ غرض ہر ایک کے لئے استباق کا حکم ہے۔ اور ہر شخص جہاں تک انسانی طاقت میں ہے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا اور اس طرح اُس کی نیکیوں میں ترقی کرنے کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی۔ یوں تو فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کی بجائے بعض اور الفاظ بھی رکھے جا سکتے تھے مثلاً فَاسْعَوْا بھی رکھا جا سکتا تھا۔ مگر جو حقیقت فَاسْتَبِقُوْا میں رکھی گئی ہے وہ کسی اور میں نہیں آ سکتی تھی۔ درحقیقت اس جگہ قرآن کریم اسلام اور دیگر مذاہب کا مقابلہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ تمام مذاہب خیرات کی طرف سے غافل ہیں اور خیرات کی حقیقت سے ناواقف ہیں پس اس وقت مسلمانوں کے لئے موقعہ ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ یہ لفظ ایسا جامع ہے کہ جس سے بڑھ کر کسی مقصد اور مدعا کی طرف دوڑنے اور اُسے جلدی سے حاصل کرنے کا مفہوم کسی اور لفظ سے ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دوڑے مگر پوری طاقت سے نہ دوڑے۔ جلدی کرے مگر جس قدر چاہیے اس قدر جلدی نہ کرے لیکن استباق کے حکم کا اس وقت تک پورا ہونا ناممکن ہے جب تک کہ پورے زور اور پوری طاقت سے کام نہ لیا جائے۔ اس لئے کہ جب ایک شخص سے دوسرا بڑھتا ہے تو اس کو بھی تو حکم ہے کہ آگے بڑھو۔ اس لئے وہ اس سے زیادہ تیزی سے بڑھے گا۔ پھر پہلے کے لئے حکم آ جائے گا کہ تم آگے بڑھو۔ اور وہ اس سے زیادہ تیزی اختیار کرے گا۔ حتیّٰ کہ جس قدر کسی میں طاقت اور ہمت ہوگی وہ سب اس میں صرف کر دے گا۔ پس استباق بظاہر اپنے اندر تیزی اور دوڑنے اور جلدی کرنے کے معنے نہیں رکھتا مگر حقیقت میں یہ لفظ اس قدر تیزی پر دلالت کرتا ہے کہ جس قدر کسی انسان کی طاقت میں ہوتی ہے۔ دوسرے

مذاہب والے کہتے ہیں کہ نیکی کرو۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ نیکی کرو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ یہ کام کوئی معمولی کام نہیں۔ ایک دو کا مقابلہ ہو تو کوئی بات بھی ہے لیکن یہاں تو لاکھوں کا مقابلہ ہے جب ایک دو کے مقابلہ میں بھی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے تو جہاں لاکھوں میں مقابلہ ہو وہاں کتنی بڑی تیاری کی ضرورت ہوگی۔ گھوڑ دوڑ میں دیکھ لو کتنی تیاری کی جاتی ہے۔ جب لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں تو کتنی کوشش اور تیاری کرتے ہیں لیکن جہاں لاکھوں اور کروڑوں افراد ہوں وہاں تو جتنی تیاری کی ضرورت ہو سکتی ہے اسے ہر انسان آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی شناخت کا یہ معیار بیان فرمایا ہے کہ وہ تسابق اختیار کرتے ہیں اور نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش یقیناً ہر قوم کے معیار کو اتنا بلند لے جاتی ہے کہ اس کا انسان قیاس بھی نہیں کر سکتا۔ جب کبھی نیکی دنیا سے مفقود ہو جائے یا جب کبھی نیکی میں آگے بڑھنے کی رُوح مفقود ہو جائے اس وقت قوم یا تو مرنا شروع ہو جاتی ہے یا گرنا شروع ہو جاتی ہے لیکن جب تک تسابق کی روح کسی قوم میں قائم رہے۔ اس وقت تک خواہ وہ کتنی بھی ذلّت میں پہنچی ہوئی ہو اور کتنی بھی گری ہوئی ہو پھر بھی اپنی چمک دکھلاتی چلی جاتی ہے اور اس کے لئے موقعہ ہوتا ہے کہ وہ پھر آگے بڑھے۔ ہمارے قریب کے بزرگوں میں سے ایسے زمانہ میں جب مسلمانوں پر ایک قسم کے تنزل کی حالت آ گئی تھی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ تسابق کی وجہ سے ان لوگوں کے واقعات سن کر انسان کے دل میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ سید اسمٰعیل صاحب شہید جو تیرھویں صدی میں گذرے ہیں حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے مرید تھے۔ اور سید احمد صاحب بریلوی سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے پشاور کی طرف گئے ہوئے تھے۔ سید اسمٰعیل صاحب کسی کام کے لئے دہلی آئے ہوئے تھے۔ جب دہلی سے واپس جاتے ہوئے کیمبل پور کے مقام پر پہنچے تو کسی نے ان سے ذکر کیا کہ اس دریا کو یہاں سے تیر کر کوئی شخص نہیں گذر سکتا۔ اس زمانہ میں صرف فلاں سکھ ہے جو گذر سکتا ہے مسلمانوں میں سے کوئی اس کا مقابلہ کرنے والا نہیں۔ وہ وہیں ٹھہر گئے اور کہنے لگے کہ اچھا ایک سکھ ایسا کام کرتا ہے کہ کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ اب جب تک میں اس دریا کو پار نہ کر لوں گا میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔ چنانچہ وہیں انہوں نے تیرنے کی مشق شروع کر دی۔ اور چار پانچ مہینہ میں اتنے مشّاق ہو گئے کہ تیر کر پار گذرے اور پار گذر کر بتا دیا کہ سکھ ہی اچھے کام کرنے والے نہیں بلکہ مسلمان بھی جب چاہیں ان سے بہتر کام کر سکتے ہیں۔ اس تسابق کی روح کو جب بھی ہم اپنے سامنے لاتے ہیں ہماری روحوں میں ایک بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے دلوں میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے دماغوں میں عزم پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے مخالف یا مدِّ مقابل یا رقیب سے کسی صورت میں بھی دبیں گے نہیں۔ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ ہم نیکیوں کے مقابلہ

میں سست ہوں۔ بلکہ نیکی کے میدان میں اپنے باپ اور بھائی سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔اسی طرح قومی وقار اور اعزاز کو ہمسایہ قوموں سے آگے بڑھانے کے لئے علمی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی امور میں ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔قرآن کریم نے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کہہ کر اور ایک جگہ وَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا (النازعات:۵) فرما کر اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس دنیا میں مقابلہ ہو رہا ہے۔تمہارا فرض ہے کہ اس مسابقت میں سب سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ ہماری جماعت کو بھی چاہیے کہ ہم میں سے ہر فرد اپنے نفس کو ٹٹولتا رہے اور دین کے ساتھ ایک گہری محبت اور شیفتگی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔اور سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے بس یہی ایک مقصد اپنے سامنے رکھے کہ ہم نے اسلام کو دنیا میں غالب کرنا ہے۔ جب تک یہ روح ہمارے اندر پیدا نہیں ہوتی اُس وقت تک ہم اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس آیت کا پہلی آیت سے یہ تعلق ہے کہ اوپر یہ بتایا گیا تھا کہ یہود نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو اپنا مقصد قرار دیا ہوا ہے چنانچہ فرمایا تھا وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ یعنی اگر تو اہل کتاب کے پاس ہر قسم کا نشان بھی لے آئے تب بھی وہ تیرے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے گویا خواہ ان کے ہاتھ سے خدا جائے یا اس کا رسول جائے انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ضرور کرنی ہے۔اور یہ نتیجہ ہے اس امر کا کہ انہوں نے اپنا کوئی اعلیٰ مقصد قرار نہیں دیا ہوا۔پس چاہیے کہ تم اپنا ایک اعلیٰ مقصد قرار دے لو مگر یہ یاد رکھو کہ کوئی ایک نیکی اپنا مقصد قرار دے لینا کافی نہیں بلکہ الخیرات یعنی سب نیکیوں کو اپنا مقصد قرار دو اور جب بھی تمہیں کوئی نیک بات معلوم ہو بلا کسی اور خیال کے اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔اور اس سے دُور رہنے کو ہلاکت سمجھو۔اور دوسری بات یہ مدِّ نظر رکھو کہ نیکی کے حصول کے وقت تسابق کو مدِّ نظر رکھو یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔اور تیسری بات یہ مدِّ نظر رکھو کہ اگر تمہارا قدم دوسروں کی سُستی کی وجہ سے یا تمہاری چستی کی وجہ سے آگے پڑ رہا ہے تو دوسروں سے صرف بعض نیکیوں میں آگے رہنے کو کافی نہ سمجھو بلکہ جس قدر جلد ہو سکے ہر قسم کی خیرات کے حصول کے لئے قدم بڑھاؤ۔اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بھی توجہ دلائی ہے کہ كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ اَخَذَهَا حَيْثُ وَجَدَهَا (ابن ماجه کتاب الزهد باب الحکمة) یعنی حکمت کی بات مومن کی ایک گمشدہ متاع ہوتی ہے وہ جہاں سے بھی ملے اسے فوراً لے لیتا ہے۔اس حدیث میں ایک تو اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مومن کوئی بات بھی بغیر حکمت کے نہیں کرتا۔تمام خوبیاں اس کے اندر پائی جاتی ہیں اور تمام نیکیاں اُس کے اندر جمع ہوتی ہیں۔اور دوسرے اس امر کی نصیحت کی گئی ہے کہ اُسے جب بھی کوئی حکمت

کی بات نظر آئے تو وہ یہ دیکھے بغیر کہ یہ کلمہ حکمت کسی کافر کے منہ سے نکلا ہے یا منافق کے منہ سے فوراً اسے اپنی کھوئی ہوئی چیز سمجھ کر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ گویا جس طرح ایک کھویا ہوا بچہ اُسے نظر آجائے تو وہ فوراً اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح وہ بھی لپک کر اس خوبی کو لے لے اور کہے کہ اوہو! یہ تو میری ہی چیز تھی افسوس کہ اسے کافر یا منافق لے گیا۔ اب یہ میرا کام ہے کہ میں اپنی گمشدہ متاع واپس لوں اور اس خوبی کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ دُنیا میں بہت سی خرابیاں محض اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ جس کسی کے پاس جتنی نیکی ہوتی ہے وہ اسی پر فخر کرنے بیٹھ جاتا ہے اور مزید خوبیاں اپنے اندر جمع کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور اگر دشمن میں اُسے کوئی خوبی نظر آتی ہے تو کینہ اور بُغض اور حسد کی وجہ سے وہ اسے بھی بُرا قرار دینے کی کوشش کرتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ اس کے ایسا کرنے سے دشمن کا تو کوئی نقصان نہیں اس کے پاس تو وہ خوبی ہے ہی نقصان اس کا اپنا ہے۔ کیونکہ بُغض کی وجہ سے وہ اس خوبی کو حاصل نہیں کر سکے گا پس مومن کا کام ہے کہ وہ ہر خوبی اپنے اندر پیدا کرے۔ اور ہر خوبی میں دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کرے۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام نے اس طرح حسد کی بنیاد رکھی ہے کیونکہ امورِ دینیہ اور امورِ دنیویہ میں یہ مقابلہ ضروری ہے اس کے بغیر کامل ترقی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تمام ترقی کی بنیاد ہی مقابلۂ اقوام و افراد ہے۔ خودغرضی کی جڑ شریعت اسلام نے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۱۱۱) کہہ کر اُکھاڑ دی ہے کیونکہ مومن کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ جس درجہ تک پہنچے اس پر فوراً دوسروں کو بھی پہنچائے۔ کیونکہ اس کی غرض ہی دوسروں کو نفع پہنچانا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران:۱۰۵) یعنی تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کا کام صرف یہ ہو کہ وہ لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔ اور اچھی باتوں کی تعلیم دے اور بُرائیوں سے روکے۔ اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ پس جس خیر کو بھی مومن حاصل کرے گا وہ فوراً دوسروں کو بلائے گا کہ جلد آؤ اور اس چیز کو حاصل کرو۔ گویا مومنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ جب آگے بڑھیں تو پچھلوں کو بھی کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لیں۔ پھر آگے بڑھیں تو جو لوگ پیچھے رہ جائیں ان کو دوبارہ کھینچ کر اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ پھر دوڑیں اور اس طرح جو پیچھے رہ جائیں ان کو اپنے ساتھ شامل کریں اور پھر سارے مل کر نیکیوں کے میدان میں دوڑیں۔ اس پر پھر جو اُن میں سے آگے نکل جائیں وہ پچھلوں کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لیں۔ اور اس طرح ایک دوڑ جاری رہے۔ نیکیوں میں سبقت لے جانے والے سبقت لے جائیں اور پیچھے رہ جانے والوں کو ساتھ ملا لیں۔ پھر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور پھر

پچھلوں کو اپنے ساتھ ملائیں اور یہی عشق کی کیفیت ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ مومنوں سے یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ اس کے پاس اکیلے نہ آئیں بلکہ دوسروں کو بھی ساتھ لیتے آئیں۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو مصر کی طرف روانہ کرتے وقت کہا تھا کہ تم نے اکیلے نہیں آنا بلکہ بن یامین کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ بھی کہتا ہے کہ تم میرے پاس دوڑ کر آنا اور اکیلے نہ آنا بلکہ میرے دوسرے روحانی بیٹوں کو بھی ساتھ لے کر آنا۔ مومن دوڑتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے حضور جانا ہے وہاں میں اُسے کیا جواب دوں گا اس لئے وہ دوسروں کو بھی کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔

غرض كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ نے حسد اور خود غرضی کی جڑ کاٹ دی ہے کیونکہ مومن جس خیر کو خود حاصل کرے گا وہ فوراً اس میں شامل کرنے کے لئے دوسروں کو بھی بُلائے گا اور اس طرح نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جہاں ایک لطیف مقابلہ جاری رہے گا وہاں خود غرضی اور حسد کا بھی کوئی شائبہ دکھائی نہیں دے گا۔ یہ کیا ہی لطیف مقابلہ مبادرہ اور پھر مجاذبہ ہے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا۔ فرماتا ہے تم جہاں کہیں بھی ہوگے آخر ایک دن اللہ تعالیٰ تم سب کو اکٹھا کر کے اپنے پاس لے آئے گا اور تمہیں اپنی سستیوں اور غفلتوں اور لوگوں کو نیکیوں کی دوڑ میں پیچھے چھوڑنے کا جواب دینا پڑے گا۔ پس اُس دن کا تمہیں خیال رکھنا چاہیے اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام نہیں لینا چاہیے وہ تم سے ضرور پوچھے گا کہ جب میں نے تمہیں اسلام جیسی نعمت عطا فرمائی تھی تو تم نے اسے دوسروں تک کیوں نہ پہنچایا اور نیکیوں کی دوڑ میں تم نے دوسروں سے سبقت لے جانے کی کیوں کوشش نہ کی پس تم اُس دن کے آنے سے پہلے پہلے تیاری کر لو اور اپنے اعمال کا جائزہ لو۔ ایسا نہ ہو کہ اس دن تمہیں شرمندگی لاحق ہو اور خدا تعالیٰ کے حضور تم مجرم قرار پاؤ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے تم اس مقصد کو ناقابلِ حصول مت سمجھو۔ جیسا کہ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری قسمت میں کہاں رکھا ہے کہ ہم اتنا بڑا مقام حاصل کر سکیں۔ وہ ہمت سے کام لینا ترک کر دیتے ہیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر کیا ہے وہی کچھ ہمیں ملے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں بڑی طاقتیں رکھی ہیں وہ نیکیوں میں خود بھی بڑھ سکتا ہے اور دوسروں کو بھی کھینچ کر اپنے ساتھ شامل کر سکتا ہے۔ یہ کام ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ

اور تو جس جگہ سے بھی نکلے اپنی توجہ مسجد حرام کی طرف پھیر دے اور یہ (حکم)

وَ اِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا

یقیناً تیرے رب کی طرف سے (آئی ہوئی) صداقت ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے ہرگز بے خبر

تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ

نہیں ہے اور تُو جس جگہ سے بھی نکلے اپنی توجہ مسجد حرام کی طرف

الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَیۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ

پھیر دے اور تم (بھی) جہاں کہیں ہو اپنے منہ اس کی طرف کیا کرو۔

شَطۡرَهٗ ۙ لِئَلَّا یَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡكُمۡ حُجَّةٌ ٭ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ

تا ان لوگوں کے سوا جو ان (مخالفوں) میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں (باقی) لوگوں کی طرف سے تم پر الزام

ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ ٭ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَ اخۡشَوۡنِیۡ ٭ وَ لِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ

نہ رہے سو تم ان (ظالموں) سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو (یہ حکم میں نے اس لئے دیا ہے کہ تم پر لوگوں کا الزام

عَلَیۡكُمۡ وَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾ۙ

نہ رہے) اور تا کہ مَیں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

حلّ لُغات۔ خَرَجْتَ عربی زبان میں خَرَجَ کا لفظ نکلنے کے علاوہ اور معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ (۱) جب خَرَجَ عَلَیْهِ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ بَرَزَ لِقِتَالِهٖ وہ اس سے جنگ کرنے کے لئے نکلا۔ اگر اس آیت میں یہ معنے مراد لئے جائیں تو یہ لفظ جنگ کرنے کے معنوں میں استعمال ہوگا۔ (۲) پھر اس لفظ کے معنے اطاعت ترک کر دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ خَرَجَتِ الرَّعِیَّةُ عَلَی الْوَالِیْ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ

خَلَعَتِ الطَّاعَةَ یعنی رعیت نے والی کی اطاعت چھوڑ دی اور بغاوت اختیار کر لی۔ (۳) اسی طرح خَرَجَ الْوَالِیْ عَلَی السُّلْطَانِ کے معنے ہوتے ہیں تَمَرَّدَ یعنی والی نے سلطان کے خلاف سرکشی کی۔ (اقرب)

قتال کے معنوں میں قرآن کریم میں بعض دوسرے مقامات پر بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ آیت ۸۳ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ یعنی اگر اللہ تعالیٰ تجھ کو اُن میں سے ایک گروہ کی طرف لوٹا لائے اور وہ لوگ تجھ سے خروج کی یعنی کسی آئندہ جنگ میں شامل ہونے کی اجازت مانگیں تو تُو اُن سے کہہ دے کہ تم کو کبھی بھی آئندہ ہمارے ساتھ جنگ پر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور کبھی بھی تم دشمن سے میرے ہمراہ ہو کر لڑنے نہیں پاؤ گے۔ کیونکہ تم پہلی دفعہ پیچھے بیٹھ رہنے پر راضی ہو گئے تھے۔ پس آئندہ ہمیشہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ ہی بیٹھ رہا کرو۔ یہاں خروج بمعنے قتال آیا ہے جیسا کہ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا سے واضح ہے۔

حُجَّةٌ اس لفظ کے معنے عربی زبان میں اس دلیل کے ہوتے ہیں جو انسان کو دوسرے پر غالب کر دے۔ قَالَ الْاَزْهَرِيُّ اَلْوَجْهُ الَّذِيْ يَكُوْنُ بِهِ الظَّفَرُ يُسَمّٰى حُجَّةً۔ (لسان العرب) وَفِيْ اَبِي الْبَقَاءِ وَمِنْ حَيْثُ الْغَلَبَةِ عَلَى الْخَصْمِ يُسَمّٰى حُجَّةً (کلّیاتِ ابی البقاء)۔ یعنی ازہری کہتے ہیں کہ وہ دلیل جس سے انسان کو کامیابی حاصل ہو اسے حجت کہتے ہیں اور کلیات ابوالبقاء میں لکھا ہے کہ اس کا نام حُجَّةٌ اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے دشمن پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ غالب کر دینے والی دلیل کے معنے میں حجۃ کا لفظ حدیث میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے دجال کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنْ يَّخْرُجْ وَاَنَا فِيْكُمْ فَاَنَا حَجِيْجُهٗ (ابن ماجہ کتاب الفتن باب فتنة الدجّال و خروج عیسٰی بن مریم)۔ یعنی اگر دجال نے خروج کیا اور میں تم میں موجود ہوا تو میں وہ دلائل اس کے سامنے پیش کروں گا اور ایسی باتیں اس کے سامنے رکھوں گا کہ وہ شکست کھا جائے گا۔ اس حدیث سے ایک طرف تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حجت کے معنے اس دلیل کے ہوتے ہیں جس سے دشمن ہار جائے اور شکست کھا جائے۔ اور دوسری طرف اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دجال سے تلوار کی لڑائی نہیں ہوگی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اُس سے بحث کر کے دلائل کے لحاظ سے فتح پاؤں گا نہ کہ تلوار کے زور سے۔ پس معلوم ہوا کہ دجال پر حجت کے لحاظ سے غلبہ حاصل کیا جانا مقدر ہے نہ کہ تلوار کے ساتھ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر غیر احمدی علماء اعتراض کیا کرتے ہیں کہ انہوں نے دجال سے تلوار کے ساتھ جنگ کر کے اس کو ہلاک

نہیں کیا بلکہ جہاد بالسیف قطعی طور پر منسوخ کر دیا۔ حالانکہ اگر وہ احادیث پر تھوڑا سا بھی غور کریں تو ان پر واضح ہو جائے کہ دجال پر دلائل کے ذریعے ہی غلبہ حاصل کرنا ضروری ہے ورنہ تلوار کے ذریعہ دجال کی ہلاکت کی خبر کسی حدیث میں نہیں دی گئی۔ حُجَّةٌ کا لفظ کبھی غلط یا کمزور دلیل کے معنے میں بھی استعمال ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی قرینہ موجود ہو۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الشوریٰ:۱۷) یعنی ان کی دلیل ان کے رب کے حضور باطل اور ضائع ہونے والی ہے۔

حُجَّةٌ کے معنے خالص دلیل کے بھی ہوتے ہیں جیسے قرآن کریم میں آتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ (البقرۃ:۲۵۹) یعنی کیا تجھے اس شخص کا حال معلوم نہیں جس نے ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں بحث کی تھی۔ یہاں صرف دلیل کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ دونوں فریق غالب نہیں ہو سکتے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِلَّا کبھی لٰكِنْ کے معنے میں بھی آتا ہے چنانچہ عربی محاورہ ہے مَالَكَ عَلَيَّ حُجَّةٌ اِلَّا اَنْ تَظْلِمَنِيْ اَيْ مَالَكَ عَلَيَّ حُجَّةٌ وَلٰكِنَّكَ تَظْلِمُنِيْ (بحر محیط و تفسیر فتح البیان زیر آیت ھٰذا) یعنی تجھے مجھ پر کوئی حجت تو حاصل نہیں ہاں اگر تُو مجھ پر ظلم کرے اور خواہ مخواہ اپنے باطل دعوے کو سچا سمجھے تو اور بات ہے۔

(۲) کبھی اِلَّا عاطفہ ہوتا ہے یعنی واوٗ کے قائم مقام ہو کر آتا ہے اور ماقبل کو مابعد کے ساتھ شریک کرتا ہے جیسے لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ اور لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ میں ہے (مغنی اللبیب) اس لحاظ سے اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کے معنے ہوں گے وَلَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اور اِلَّا مَنْ ظَلَمَ کے معنے ہوں گے وَلَا مَنْ ظَلَمَ۔ یعنی اس صورت میں اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کے معنے یہ ہوں گے کہ نہ معقول اور نہ غیر معقول لوگ کوئی بھی ایسی دلیل پیش نہیں کر سکتے جس سے وہ لوگوں میں مسلمانوں کے حق پر ہونے کو مشتبہ کر سکیں۔

تفسیر۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ کے معنے مفسرین نے یہ کئے ہیں کہ تم جہاں کہیں بھی ہو ہر حالت میں اپنا قبلہ مسجد حرام کو ہی رکھو اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ پہلے حکم سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید یہ قبلہ صرف مدینہ والوں کے لئے ہی ہو باقی لوگوں کے لئے نہ ہو اس لئے خدا تعالیٰ نے فرما دیا کہ تم جہاں کہیں سے بھی نکلو اپنے منہ مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواہ اس آیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہو خواہ تمام مسلمانوں کو اس کے معنے قبلہ کی طرف منہ کرنے کے ہو ہی نہیں سکتے۔ اوّل تو اس لئے کہ وہ نمازیں جو کسی شہر یا گاؤں میں رہتے ہوئے ادا کی جاتی ہیں شہر سے نکلتے وقت کی نمازوں سے بالعموم زیادہ ہوتی ہیں۔ ایسی صورت

میں حکم وہ دینا چاہیے تھا جس کا زیادہ نمازوں پر اطلاق ہوسکتا۔ نہ کہ ایسا حکم دیا جاتا جس پر عمل کرنے کا امکان سفر کی حالت میں بہت ہی کم ہوتا ہے مثلاً ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص شہر سے دس بجے صبح نکلے یا عصر اور مغرب کے درمیان نکلے یا آدھی رات کے وقت نکلے اور یہ سارے کے سارے اوقات ایسے ہیں جن میں نماز کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ان حالات میں وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا حکم بے معنی بن جاتا ہے۔ کیونکہ کسی شہر سے نکلتے وقت شاذ ہی نماز کا موقعہ ہوتا ہے۔ بالعموم یا تو انسان اس وقت نماز ادا کر چکا ہوتا ہے یا اگر ادا کرنی ہوتی ہے تو کچھ دیر کے بعد بھی وہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ بہر حال خروج کے ساتھ نماز کا تعلق نہیں۔ پھر ان معنوں کو اس صورت میں بھی درست تسلیم کیا جاسکتا تھا جب کوئی نماز خروج کے وقت سے بھی خاص طور پر تعلق رکھتی لیکن سب لوگ جانتے ہیں کہ کوئی نماز خروج کے وقت سے تعلق نہیں رکھتی ایسی صورت میں اس آیت کو بارادہ سفر گھر سے نکلنے پر چسپاں کرنا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ مزید دلیل اس بات کی کہ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ سے مراد نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنا نہیں یہ ہے کہ سفر کی حالت میں تو بعض دفعہ جہت کا سوال بھی اُڑ جاتا ہے اور جدھر منہ ہو اُدھر ہی نماز جائز ہوجاتی ہے۔ مثلاً جب انسان سواری سے اُتر نہ سکے تو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہی ثابت ہے کہ اس وقت اس کا جدھر منہ ہو جائے اُدھر ہی نماز جائز ہے۔ چاہے قبلہ کی طرف منہ ہو یا کسی اور طرف اس وقت جہت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مشرق مغرب شمال جنوب سب ایک جیسے ہوتے ہیں صرف قلبی توجہ خانہ کعبہ کی طرف ہونی ضروری ہے (البقرۃ:۱۱۶ و مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین باب جواز صلوٰۃ النافلۃ علی الدبۃ فی السفر حیث توجّھت)۔ آجکل جب انسان ریل گاڑی میں بیٹھا ہوتا ہے تو اس وقت بھی جہت کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی کیونکہ گاڑی کبھی شمال کی طرف کبھی جنوب کی طرف کبھی مشرق کی طرف اور کبھی مغرب کی طرف مڑتی اور چکر کھاتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو شخص اس میں بیٹھا نماز پڑھ رہا ہوتا ہے اس کی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اگر مفسرین کے معنوں کو درست سمجھا جائے تو اس حکم پر نہ سوار عمل کرسکتا ہے اور نہ ریل گاڑی پر بیٹھنے والا عمل کرسکتا ہے۔ پس جب خروج میں جہت کی تخصیص بھی قائم نہیں رہتی تو پھر اس آیت سے یہ مراد لینا کہ جہاں کہیں سے بھی تم نکلو خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔ کیسے درست ہوسکتا ہے؟

پھر یہ معنے اس لئے بھی درست نہیں کہ اس آیت کے لفظی معنے یہ بنتے ہیں کہ تم جہاں سے بھی نکلو اپنے منہ مسجد حرام کی طرف کرلو۔ یا جہاں سے بھی تُو نکلے تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لے۔ اب یہ تو ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ چلتے وقت نماز نہیں پڑھی جاسکتی بلکہ نماز ٹھہر کر ہی پڑھی جاسکتی ہے ہاں اگر اس آیت کے یہ الفاظ ہوتے کہ

حَيْثُ مَا كُنْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تو جہاں کہیں بھی ہو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لے۔ تب تو یہ معنے صحیح ہو سکتے تھے لیکن یہاں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) یا اے مسلمانو! جہاں سے بھی تم نکلو تم اپنے منہ مسجد حرام کی طرف کر لو۔ اب یہ صاف بات ہے کہ نماز نکلتے وقت نہیں پڑھی جاتی بلکہ کسی جگہ ہوتے ہوئے نماز پڑھی جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں نماز پڑھنے کے معنے کرنا کسی صورت میں بھی درست نہیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اگر نماز اور خروج کا کوئی تعلق تسلیم نہ کیا جائے تو پھر تکرار لازم آتا ہے حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ انہیں قرآن مجید میں تکرار صرف اس لئے نظر آتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے صحیح مطالب اور مضامین کے باہمی ربط کو نہیں سمجھ سکے۔ انہیں جہاں بھی کوئی اعتراض نظر آتا ہے فوراً ناسخ و منسوخ کی بحث شروع کر دیتے ہیں اور ایک آیت کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دے کر اعتراض سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کے جو حقائق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دنیا کو بتائے ہیں اگر ان کو مدِّنظر رکھا جائے تو نہ قرآن کریم میں کوئی تکرار نظر آ سکتا ہے اور نہ کسی آیت کو منسوخ قرار دینا پڑتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مکہ مکرمہ سے نکالا گیا اس وقت دشمنانِ اسلام کو یہ اعتراض کرنے کا موقعہ ملا کہ جب آپ دُعائے ابراہیمی کے موعود تھے اور خانہ کعبہ کے ساتھ آپ کا تعلق تھا تو آپ کو مکہ سے کیوں نکال دیا گیا۔ جب آپ کو مکہ سے نکال دیا گیا ہے تو آپ دُعائے ابراہیمی کے کس طرح مصداق ہو سکتے ہیں؟ اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تمہارا مکہ سے یہ نکلنا عارضی ہے ہم تم سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم دوبارہ تمہیں یہ موقعہ دیں گے اور تم مکہ پر قابض ہو جاؤ گے۔ لیکن جہاں اللہ تعالیٰ کے مومن بندوں سے یہ وعدے ہوتے ہیں وہاں وہ ان سے یہ بھی اُمید کرتا ہے کہ وہ اس وعدے کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے یہ نہیں کہ خدا اُن سے وعدہ کرے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور وہ اس وعدہ کو پورا کرنے کی کوشش نہ کریں اور یہ سمجھ لیں کہ جب خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے تو وہ اُسے خود پورا کرے۔ ہمیں اُس کے پورا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ اُسے کنعان کا ملک دیا جائے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر چل پڑے۔ جب وہ ملک سامنے آ گیا تو آپ نے اپنی قوم سے کہا۔ جاؤ اور لڑائی کر کے اس ملک پر قبضہ کر لو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے غلطی سے یہ خیال کر لیا کہ خدا تعالیٰ نے یہ ملک ہمیں دینے کا وعدہ کیا ہے اس لئے وہ خود ہی اس وعدے کو پورا کرے گا اور یہ ملک ہمارے قبضہ میں دے دے گا۔ ہم نے اگر اس ملک کو فتح کیا تو پھر وعدے کا کیا فائدہ ہوا۔

وعدہ تو خدا نے کیا ہے اس لئے وہ اسے خود پورا کرے۔ ہمیں اس کے لئے کسی قسم کی کوشش کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدۃ: ۲۵ و خروج باب ۳ آیت ۸ تا ۱۷) اے موسیٰ! تُو ہم سے کہا کرتا تھا کہ یہ ملک خدا تعالیٰ تمہیں دے دے گا۔ اب تمام ذمہ داری تجھ پر ہے یا تیرے خدا پر۔ ہم نے اگر ملک فتح کیا تو پھر تیرے اور تیرے خدا کے وعدوں کا کیا فائدہ؟ چونکہ تُو ہمیں بتایا کرتا تھا کہ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ یہ ملک ہمیں ضرور ملے گا اس لئے اب تُو اور تیرا رب دونو جا کر لڑو۔ ہم یہیں بیٹھیں گے۔ جب تم ملک فتح کر کے ہمیں دے دو گے تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔ اب بظاہر ان کا کہنا درست معلوم ہوتا ہے اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں تمہیں فلاں چیز دوں گا۔ اور وہ اس سے آ کر وہ چیز مانگے اور وہ آگے سے کہہ دے کہ جاؤ بازار سے خرید لو۔ تو سارے لوگ یہی کہیں گے کہ اگر اُس نے وہ چیز بازار سے ہی خریدنی تھی تو پھر اس کے ساتھ وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پس بظاہر یہ بات معقول نظر آتی ہے لیکن الٰہی سلسلوں میں یہ اوّل درجہ کی غیر معقول بات ہے چنانچہ خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تعریف نہیں کی۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ تمہیں لڑنے کی ضرورت نہیں یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم یہ ملک لے کر تمہیں دیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم نے ہماری ہتک کی ہے اس لئے تمہیں اس ملک سے محروم کیا جاتا ہے۔ جاؤ چالیس سال تک جنگلوں میں بھٹکتے پھرو۔ تم اس ملک کے وارث نہیں بن سکتے۔ تمہاری نئی نسل اس ملک کی وارث ہوگی (المائدۃ: ۲۷ و گنتی باب ۱۴ آیت ۳۳)۔ کیونکہ تم نے ہماری ہتک کی ہے۔ تو دیکھو یہ چیز انسانی لحاظ سے تو درست اور معقول کہلا سکتی ہے لیکن الٰہی سلسلہ کے لحاظ سے نہایت ہی غیر معقول ہے اور انسان کو عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی انسان وعدہ کرتا ہے تو اُسے تغیرات سماوی اور تغیرات ارضی پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس لئے جب بھی وہ وعدہ کرتا ہے تو ایسی چیز کا کرتا ہے جو اس کے اختیار میں ہوتی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے جو وعدہ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اگرچہ اُس چیز کا حصول تمہارے لئے ناممکن ہے مگر یہ تمہیں ہماری مدد سے حاصل ہو جائے گی۔ وہ قوم جو فرعون کی سینکڑوں سال تک غلام رہی اس کے لئے اینٹیں بناتی رہی لکڑیاں کاٹتی رہی اور ذلیل سے ذلیل کام کرتی رہی وہ اتنے بڑے عظیم الشان ملک پر جس پر عاد قوم حکمران تھی کیسے قبضہ کر سکتی تھی؟ اُسے یہ ملک مل جانا آسان نہیں تھا۔ لیکن خدا نے کہا کہ گو یہ ملک حاصل کرنا تمہیں ناممکن نظر آتا ہے لیکن ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم یہ ملک تمہیں دیں گے اور تم یہ ملک ہماری مدد سے حاصل کر لو گے۔ پس خدا تعالیٰ کے وعدے کے یہ معنے نہیں ہوا کرتے کہ چونکہ اس نے وعدہ کر دیا ہے اس لئے بندے کو کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تم اس چیز کو حاصل کرنے کے

لئے تدبیر اختیار کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے وعدے اَور رنگ کے ہوتے ہیں اور بندے کے وعدے اور رنگ کے ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے وہ وعدے جن میں تدبیر شامل ہوتی ہے بندے کو ان میں دخل دینا پڑتا ہے اور ان کو پورا کرنے کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اگر بندہ ان میں دخل نہیں دے گا اور ان کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن بندے کے وعدہ میں یہ نہیں ہوتا۔ بندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تمہارے لئے خدا تعالیٰ کی تقدیر بدل دوں گا۔ کیونکہ وہ اس کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ اگر وہ ایسا کہے گا تو ہم اس سے پوچھیں گے کہ تم تقدیر کو بدلنے والے کون ہو؟ لیکن خدا تعالیٰ یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو میں تمہاری مدد کروں گا اور اپنی تقدیر کو بدل دوں گا۔ کیونکہ تقدیر ایسی چیز ہے جو اس کے قبضہ میں ہے اور وہ جب چاہے اُسے بدل سکتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کا وعدہ دیا گیا تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ کہا گیا کہ اے مسلمانو! تم موسیٰ ؑ کی قوم کی طرح یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا نے مکہ دے دینے کا وعدہ کیا ہے وہ خود اُسے پورا کرے گا۔ ہمیں اس کے لئے تدبیر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ تمہیں بھی اس کے پورا کرنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ خدائی وعدے کے یہ معنے ہیں کہ تم کمزور ہو اگر تم کمزور نہ ہوتے تو تم مکہ کو چھوڑ کر کیوں آتے مکہ کو چھوڑنے کے معنے ہی یہ تھے کہ تم کمزور ہو اور تمہارا دشمن مضبوط اور طاقتور ہے لیکن خدا تعالیٰ تمہیں طاقت دے گا اور تم دشمن سے مکہ چھین لو گے پس وَمِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کے معنے یہ ہوئے کہ تم جہاں سے بھی نکلو یا جس جگہ سے بھی نکلو تمہارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم نے مکہ فتح کرنا ہے۔

پھر خروج کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے لشکر کشی کے بھی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ تم جہاں بھی لشکر کشی کرو کسی جگہ بھی لڑائی کے لئے جاؤ۔ چاہے تم مشرق کی طرف نکلو یا جنوب کی طرف نکلو۔ مغرب کی طرف نکلو یا شمال کی طرف نکلو تمہارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ تمہارا یہ خروج فتح مکہ کی بنیاد قائم کرنے والا ہو۔ مثلاً تم اگر جنوب کی طرف دشمن پر حملہ کرنا چاہو لیکن تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس ملک کے مغرب کی طرف اس کے دوست موجود ہیں اور اُن کے متعلق یہ شبہ ہے کہ وہ کہیں پیچھے سے حملہ نہ کر دیں اور تم پہلے مغرب کی طرف حملہ کر کے اُن کو صاف کر لو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ مغرب کی طرف حملہ اصل میں جنوب کے حملہ کا پیش خیمہ ہے۔ اسی طرح اگر اس قوم کے ساتھی شمال میں بستے ہوں اور پہلے تم اُن پر حملہ کرو تو تمہارا یہ حملہ اصل میں جنوب پر ہی ہوگا کیونکہ اصل مقصد تمہارا جنوب کے دشمن پر حملہ کرنا ہوگا۔ اسی اصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! تم کسی قوم کسی ملک اور کسی علاقے پر چڑھائی کرو تمہارا رخ مکہ کی طرف ہونا

چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے ہاتھوں پر فتح کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یہ رنگ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور آپ کی سب لڑائیوں کا مقصد اعلیٰ فتح مکہ ہی تھا۔ جس جنگ میں آپ یہ مقصد فوت ہوتا دیکھتے یا جس قوم کے متعلق آپ محسوس فرماتے کہ اس سے جنگ کرنے کے نتیجہ میں فتح مکہ میں تاخیر ہو جائے گی۔ وہاں باوجود اُکسائے جانے کے آپ خاموشی اور چشم پوشی اختیار فرماتے۔ چنانچہ کئی قومیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کے لئے اُٹھیں اور انہوں نے چھیڑ چھاڑ بھی کی مگر آپ ہمیشہ اغماض سے کام لیتے رہے لیکن جب کوئی ایسی قوم کھڑی ہوئی جس کو شکست دینے سے فتح مکہ قریب ہو سکتی تھی تو اُس کے ساتھ آپؐ نے ضرور جنگ کی۔ اگر تمام اسلامی غزوات پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے اندر ایک حکیمانہ رنگ رکھتی تھیں بالخصوص فتح مکہ سے پہلے جس قدر جنگیں ہوئیں۔ اُن سب کا مقصد صرف یہی تھا کہ فتح مکہ کا راستہ صاف کیا جائے۔ اگر اس آیت کے یہ معنے ہوتے کہ تم جہاں سے بھی نکلو قبلہ کی طرف اپنا منہ کرو تو جیسا کہ بتایا جا چکا ہے مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ کے الفاظ اس آیت میں نہ ہوتے بلکہ ان الفاظ کی بجائے یہ الفاظ ہوتے کہ تم جہاں کہیں ہو قبلہ کی طرف اپنا منہ رکھو۔ قبلہ کی طرف منہ کرنے کے لئے جہاں کہیں کے الفاظ ہونے چاہیے تھے۔ نہ یہ کہ تم جہاں سے بھی نکلو قبلہ کی طرف اپنا منہ پھیر دو۔ کیونکہ لوگ کہیں سے نکلتے وقت نمازیں نہیں پڑھا کرتے۔ نکلتے وقت تو لوگ چلا کرتے ہیں۔ پس اس آیت کا نمازوں کی ادائیگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ تم جہاں سے بھی نکلو۔ چاہے تم اس مقام سے نکلو جس کا منہ مشرق کی طرف ہو۔ چاہے اس مقام سے نکلو جس کا منہ مغرب کی طرف ہو۔ چاہے اس مقام سے نکلو جس کا منہ شمال کی طرف ہو چاہے اس مقام سے نکلو جس کا منہ جنوب کی طرف ہو بہر حال تمہارا منہ مکہ کی طرف ہونا چاہیے۔ یعنی تمہاری توجہ اور تمہارا خیال اور تمہارا ذہن صرف اسی بات کی طرف رہنا چاہیے کہ تم نے مکہ فتح کرنا ہے۔ اور وہاں اسلام کو قائم کر کے سارے عرب کو زیر اثر لانا ہے۔ وُجُوْہٌ کے معنے توجہات کے بھی ہوتے ہیں (المفردات) پس اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارا ایک ہی مقصد ہونا چاہیے کہ تم نے خانہ کعبہ کو فتح کر کے اُسے اسلام کا مرکز بنانا ہے کیونکہ جب تک مکہ میں اسلام پھیل نہیں جاتا جب تک مکہ مسلمانوں کے ماتحت نہیں آ جاتا اس وقت تک باقی تمام عرب مسلمان نہیں ہو سکتا۔ یہ پروگرام تھا جو مسلمانوں کا مقرر کیا گیا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پروگرام ان کی طاقت سے بہت بالا تھا۔ بے شک عرب کی حکومت کوئی منظم حکومت نہ تھی مگر وہ طوائف الملوکی بھی نہیں تھی۔ مختلف بادشاہ اس کے ساتھ تعلق رکھتے اور معاہدات وغیرہ کرتے تھے۔ اسی طرح مکہ گو پوری طرح منظم نہ ہو مگر بہر حال وہ ایک ایسے

ملک کا دارالحکومت تھا جس کی آبادی پندرہ بیس لاکھ تھی۔ اردگرد کے تمام قبائل کی نگاہیں اس کی طرف اٹھتی تھیں اور وہ اس کے فیصلوں اور حکموں کو واجب الاطاعت سمجھتے تھے۔ پھر اس زمانہ کے لحاظ سے وہ ایک بہت بڑا شہر تھا۔ پندرہ سولہ ہزار اس کی آبادی تھی اور نہ صرف اس کی تمام کی تمام آبادی بلکہ ملک بھر کے پندرہ بیس لاکھ آدمی سب کے سب سپاہی تھے۔ فنونِ جنگ میں بہت بڑی مہارت رکھتے تھے۔ جنگجو بہادر اور لڑاکے تھے اور مسلمانوں کے لئے ان کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جس وقت یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اُس وقت مسلمانوں میں صرف چار پانچ سو سپاہی تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہزار سمجھ لو اور عورتوں اور بچوں وغیرہ کو ملا کر ان کی کل تعداد گیارہ بارہ ہزار ہو گی۔ اس سے زیادہ مسلمانوں کی تعداد نہیں تھی اور ان کی جنگی طاقت تو بہرحال ناقابلِ ذکر تھی۔ مگر ایسی حالت میں جبکہ مسلمان سخت کمزور تھے۔ جب اُن کی تعداد کفار کے مقابلے میں کوئی نسبت ہی نہیں رکھتی تھی۔ جب ان کے پاس لڑائی کا کوئی سامان نہ تھا۔ اور جب اُن کی جنگی طاقت کفار کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی تھی اللہ تعالیٰ تمام کفار کو چیلنج دیتا ہے کہ یہ مسلمان گو تمہیں تھوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ تمہیں کمزور اور ناطاقت نظر آتے ہیں مگر یہی مسلمان ایک دن تمہارے ملک کو فتح کریں گے۔ تمہارے دارالحکومت پر قابض ہوں گے اور وہاں ان کو اس قدر غلبہ میسر آجائے گا کہ یہ اسلام کے احکام کو وہاں جاری کریں گے اور کفر کو عرب کی سرزمین سے بالکل مٹا دیں گے۔ یہ دعویٰ مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے ایک مجنونانہ دعویٰ تھا اور پھر یہ دعویٰ ایسا تھا جو کسی خاص علاقہ سے مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ اس دعویٰ کا اثر وسیع سے وسیع تر تھا کیونکہ نہ صرف اس میں مکہ کو فتح کرنے کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ نہ صرف عرب پر غالب آجانے کا اعلان کیا گیا تھا بلکہ عیسائیت کو بھی چیلنج دیا گیا تھا۔ یہودیت کو بھی چیلنج دیا گیا تھا۔ مجوسیت کو بھی چیلنج دیا گیا تھا۔ اور بڑے زور سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ان تمام مذاہب کو شکست دے کر اسلام ساری دنیا پر غالب آجائے گا۔ یہ دعویٰ ایک مجنونانہ دعویٰ تھا۔ اسی وجہ سے کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پاگل کہا کرتے تھے اور صحابہؓ کو بھی وہ پاگل سمجھتے تھے کیونکہ وہ ایک ایسا دعویٰ کر رہے تھے جس کے پورا ہونے کے اس مادی دنیا میں انہیں کوئی اسباب نظر نہیں آتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک غیر معمولی کاموں کے لئے ہر انسان کے اندر وہ حالت پیدا نہ ہو جائے جسے بعض حالتوں میں طب مانومینیا کہتی ہے۔ جب تک وہ اَور تمام مقاصد کو بھول نہ جائے جب تک اس کے اندر ہر وقت ایک خلش اور بے تابی نہ پائی جائے اور جب تک غیر معمولی کاموں کے لئے اس کے اندر جنون کا سا رنگ پیدا نہ ہو جائے اُس وقت تک ان کاموں میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اسی کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں توجہ دلائی ہے کہ تم باقی تمام مقاصد کو بھول جاؤ اور

صرف اس مقصد کو اپنے سامنے رکھو کہ ہم نے مکہ کو اسلام کے لئے فتح کرنا ہے۔ جب تک یہ مرکز اور یہ قلعہ تمہیں حاصل نہیں ہوگا سارے عرب اور پھر ساری دنیا پر تمہیں غلبہ میسر نہیں آ سکے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں کہا کہ تم جس جگہ سے بھی نکلو اپنی توجہ مسجد حرام کی طرف رکھو۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ تم جس طرف بھی حملہ کرو اپنی توجہ مسجد حرام کی طرف رکھو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خروج کے وقت ہی یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ہمارا اس حملہ سے کیا مقصد ہے؟ یہ نہیں ہوتا کہ انسان لڑائی تو پہلے شروع کر دے اور اس کا مقصد بعد میں سوچے۔ پس چونکہ یہاں فتح مکہ کے مقصد کو سامنے رکھنے کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا اس لئے فرمایا کہ تم نکلتے وقت یہ دیکھ لیا کرو کہ ہماری اس جنگ کا اثر فتح مکہ پر کیا پڑے گا؟ اگر وہ جنگ فتح مکہ میں مدنہ ہو تو اسے چھوڑ دو۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو جارحانہ جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان آیات کے نزول سے پہلے ہی کفار سے جنگیں شروع ہو چکی تھیں۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس رنگ میں فتح مکہ کی ضرورت باقی نہیں رہنی تھی کیونکہ آپؐ کے بعد مکہ پر کوئی حملہ نہیں ہونا تھا بلکہ اس نے کامل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں ہی رہنا تھا۔ گویا اس میں آئندہ کے لئے یہ پیشگوئی کر دی کہ مکہ مکرمہ کی دوبارہ جسمانی فتح نہیں ہوگی کیونکہ مکہ کی عظمت قائم کرنے والی ایک فعال جماعت پیدا کر دی جائے گی۔ اور وہ ہمیشہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہے گا۔

وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ۔ فرماتا ہے کہ یہ بات تو تیرے رب کی طرف سے ہو کر رہنے والی ہے۔ ان آیات کے نزول کا زمانہ ہجرت کے سولہ ماہ بعد کا ہے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشکلات ابھی کامل طور پر دُور نہیں ہوئی تھیں اور ابھی کامل طور پر آپ کا رعب اور دبدبہ اور حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں بظاہر یہ ایک ہنسی کی بات تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ فتح کر لیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ باتیں بنانے والے اور مخالفین وغیرہ بے شک استہزاء سے کام لیں۔ یہ بات تیرے رب کی طرف سے ہو کر رہے گی اور ان کو بھی توجہ دلائی ہے کہ تم لوگ اس کو ناممکن خیال کرتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھوں کے سامنے اس پیشگوئی کو پورا کر کے دکھا دے گا۔ پھر یہ فقرہ اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ انسان جنگ سے ڈرتا اور گھبراتا ہے اُسے یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ معلوم نہیں فتح نصیب ہوگی یا شکست۔ لیکن جہت مخصوصہ کی طرف ہر وقت متوجہ رہنا انسان کی ہمت کو بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہوتی یہ آیت اس کے لئے تسلّی کا موجب ہو جاتی کہ

اِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ یہ بات تمہارے رب کی طرف سے ہوکر رہنے والی ہے۔ اور وہ اس کام میں تمہارا حامی اور مددگار ہوگا۔ اسی طرح رَبِّكَ کہہ کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر کام کے کچھ محرک ہوا کرتے ہیں اور بہترین محرک کسی کام کا یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس بات کا احساس ہو کہ میرا محسن مجھ سے یہ خواہش رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ بسا اوقات اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ تمہیں بھی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تمہارا رب جو تمہارا محسن ہے اُس کی یہ خواہش ہے کہ تم مکہ کو فتح کرو۔ پس گو یہ بات ایک دن پوری ہو کر رہے گی مگر محسن کے احسان کا بدلہ اتارنا بھی تمہارا کام ہے اس لئے تمہیں اس کے متعلق اپنے سردھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے اور اس عظیم الشان مقصد کے حصول کے لئے کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ تمہیں سزا دے گا بلکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری قربانیوں کو دیکھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اسلام اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک مکہ فتح نہ ہو جائے اس لئے تم اپنی کوشش اور جدوجہد کو جاری رکھو اور فتح مکہ کو کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ خدا تعالیٰ تمہارے اعمال کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اس میں مسلمانوں کو قربانیوں کے لئے اُبھارا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہاری قربانیوں کو دیکھتا ہے مگر تمہارے انعام اس وقت تک کمال کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم مکہ فتح نہ کر لو۔ سو کوشش کرو کہ مکہ جلد فتح ہو جائے۔ اس میں جتنی دیر ہوگی اتنی ہی تمہاری ترقی پیچھے پڑ جائے گی۔

وَ مِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ۔ یورپین مستشرق کہتے ہیں کہ اس جگہ قرآنی آیات میں تکرار پایا جاتا ہے۔ جو فصاحت کے خلاف ہے۔ (Introduction to the Quran, Richard Bell)۔ جب اس سے پہلے غیر مبہم الفاظ میں یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ مِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ تو اس کے معاً بعد پھر انہی الفاظ کا کیوں تکرار کیا گیا ہے؟ اس اعتراض کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ مخالفینِ اسلام کی اتنی بات تو درست ہے کہ ان دونوں آیات کے معنوں میں کوئی فرق نہیں لیکن یہ بات درست نہیں کہ ان دونوں کو ایک ہی غرض کے ماتحت بیان کیا گیا ہے بلکہ ان دونوں کے بیان کرنے کی اغراض مختلف ہیں۔ اگر دونوں جگہ ایک ہی غرض کام کر رہی ہوتی تو پھر تو بے شک تکرار کا اعتراض درست ہوتا لیکن جب کسی نئی غرض کے لئے پہلے کلام کو دہرایا جائے تو وہ حُسنِ کلام کے منافی نہیں ہوتا۔ صرف وہ تکرار قابلِ اعتراض ہوتا ہے جو بغیر غرض اور فائدہ کے ہو لیکن اگر ایک حکم کو بیان کیا جائے اور پھر اس کے دُہرانے کی کوئی نئی غرض پیدا ہو جائے تو اُسے تکرار نہیں کہا جاتا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ہم بعض دفعہ مجلس میں کہتے ہیں

''بیٹھ جاؤ'' پھر تھوڑی دیر کے بعد کہتے ہیں ''بیٹھ جاؤ'' پھر کچھ وقفہ کے بعد کہتے ہیں ''بیٹھ جاؤ'' اب بظاہر ان الفاظ میں تکرار نظر آتا ہے لیکن جب ہم پہلی مرتبہ یہ الفاظ کہتے ہیں تو ہمارے مخاطب وہ تمام لوگ ہوتے ہیں جو اس وقت کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن جب دوبارہ یہی الفاظ کہتے ہیں تو وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو ابھی تک نہیں بیٹھے ہوتے۔ اور جب ہم تیسری دفعہ کہتے ہیں تو وہ پانچ دس لوگ مخاطب ہوتے ہیں جو ابھی تک کھڑے ہوتے ہیں۔ اب یہاں ایک جملے کا کئی دفعہ بولنا غیر فصیح نہیں اور نہ ہی اسے تکرار کہا جاتا ہے بلکہ ہر فقرہ اپنی ذات میں الگ الگ غرض کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح اس آیت میں بھی تکرار نہیں کیونکہ یہاں خدا تعالیٰ کا دوسری دفعہ وہی فقرہ لانا اپنے اندر ایک نئی حکمت رکھتا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں تو صرف یہ بتایا تھا کہ تمہاری لڑائیوں کا نقطہ مرکزی مکہ کی فتح ہونا چاہیے اور دوسری آیت میں فتح مکہ اور تحویل قبلہ کے بارہ میں دونوں حکموں کو جمع کر کے ان کی وجہ بتائی ہے اور وہ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ہے۔ اور حجت سوائے اس کے کہ کوئی قرینہ ہو ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو غالب کر دینے والی ہو۔ پس یہ تکرار نہیں بلکہ فقرہ مکمل ہی نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ یہ دونوں باتیں دہرائی نہ جائیں۔ یعنی مکہ فتح نہ ہوا تب بھی تم پر لوگوں کی حجت ہو گی اور اگر ادھر منہ نہ کیا تب بھی حجت ہو گی۔ پس اس کا خیال رکھنا ضروری ہے اگر تم نے مکہ فتح نہ کیا تو تمہاری ترقی کے راستہ میں کئی قسم کی روکیں پیدا ہو جائیں گی۔ اور اسلام پر دشمنوں کے اعتراضات کا دروازہ کھلا رہے گا۔ غرض دونوں آیات الگ الگ مقاصد رکھتی ہیں اور دوسری جگہ اس مضمون کو جسے پہلی آیت میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا تھا وسیع کر دیا گیا ہے۔ اور ان فوائد کو واضح کیا گیا ہے جو فتح مکہ اور تحویل قبلہ کے ساتھ وابستہ تھے۔

اسی طرح دوسری آیت میں دنیا کے تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اے مسلمانو! تم جہاں کہیں بھی ہو تمہارا فرض ہے کہ تم خانہ کعبہ کی حفاظت کرو۔ اور اُسے دشمنوں کے حملوں سے بچاؤ۔ یہ مضمون پہلی آیت میں نہیں تھا پس گو اس آیت میں بھی فتح مکہ کا ہی ذکر ہے مگر پھر بھی اسے تکرار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں نئے اسلوب اور نئے انداز سے فتح مکہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فوائد بیان کئے گئے ہیں۔

پھر ایک اور نقطۂ نگاہ بھی تکرار کے اعتراض کو باطل ثابت کرتا ہے اور وہ یہ کہ پہلی آیت اُن اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے ہے جو اخلاقی اور روحانی لحاظ سے دوسرے لوگوں سے بہت بڑھے ہوئے اور اپنے اندر خاص فوقیت رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر وہ آیت ایسے لوگوں کے لئے ہے جو اخلاق اور رُوحانیت کے لحاظ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں مدغم ہیں۔ اور کامل طور پر آپ کے ظل کہلا سکتے ہیں۔ ایسے وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جُدا نہیں

بلکہ آپؐ میں ہی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا ذکر آپؐ سے علیحدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ لوگ ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے متعلق یہ علم تھا کہ ان کے لئے اِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ کہہ دینا ہی کافی محرک ہوسکتا ہے چنانچہ اگر غور سے کام لیا جائے تو دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ دکھائی دیتے ہیں ایک تو وہ جو اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو ادنیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے انسانوں کے لئے باریک باتیں ہی کافی محرک ہوجاتی ہیں لیکن ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے قریب کا محرک کام کرتا ہے مثلاً اعلیٰ درجہ کے لوگ جب نماز پڑھتے ہیں تو وہ اس بات کو اپنے دل کے کسی گوشہ میں بھی نہیں لاتے کہ ان کو نماز کے بدلہ میں کیا ملے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری نماز خدا تعالیٰ کے احسانات کے شکریہ کے طور پر ہے کسی جزا کے لئے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہم پر پہلے ہی کیا کم احسانات ہیں کہ ہم نماز پڑھ کر اس سے بدلہ کی خواہش رکھیں۔ وہ لوگ اسی کو بہت بڑا احسان اور اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھتے ہیں کہ اس نے ہمیں اپنے احسانات کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے لیکن اس کے مقابل پر ادنیٰ درجہ کے لوگ اگر چند دن بھی نمازیں پڑھتے ہیں اور اس کے بعد ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جھٹ کہنے لگ جاتے ہیں کہ نمازوں میں کیا رکھا ہے ہم نے تو نمازیں پڑھ پڑھ کر دیکھ لیا ہے کہ ان میں کچھ بھی نہیں۔ ایسے لوگ سودے کے طور پر نمازیں پڑھتے ہیں یہ لوگ بھول جاتے ہیں اس بات کو کہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کے دل میں محبت رکھی۔ وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کی ماں کی چھاتیوں سے دودھ کے چشمے جاری کر دیئے تھے اور وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے باپ کے دل میں رافت پیدا کر دی تھی اور اسے روزی کمانے کی توفیق دی وہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دینی و دنیوی ترقی کے لئے انہیں ناک کان آنکھیں دل اور دماغ وغیرہ عطا فرمائے ہیں۔ وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی زندگی کے قیام کے لئے سورج چاند ستارے آگ ہوا پانی زمین اور غذائیں وغیرہ پیدا کی ہیں۔ وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ سب انعامات کسی عمل کے نتیجہ میں نہیں ملے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے نتیجہ میں ملے ہیں غرض ایک طرف تو بعض لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے اور دوسری طرف ایسے انسان بھی ہیں جو اپنے دل میں بدلے کا خیال تک نہیں لاتے۔ وہ سوالی بن کر اللہ تعالیٰ سے اپنی ضرورت کے مطابق مانگ تو لیتے ہیں مگر اپنے عمل کے بدلہ میں انعام کے طالب نہیں ہوتے۔ یہ لوگ نماز روزہ زکوٰۃ حج اور غریب پروری کے بدلے میں اللہ تعالیٰ سے انعام کے طالب نہیں ہوتے بلکہ اسی کو وہ لوگ انعام سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شکریہ ادا کرنے کا موقعہ اور توفیق عطا فرمائی۔ یہ لوگ کنگال ہو کر بھی اپنے عمل کے بدلہ میں کسی انعام کے طالب نہیں ہوتے وہ

اللہ تعالیٰ سے مانگنا پسند کرتے ہیں مگر عمل کے بدلہ میں انعام طلب نہیں کرتے۔ میں نے کئی دفعہ ایک بزرگ کا واقعہ سنایا ہے جو متواتر بیس سال ایک ہی دعا کرتے رہے اوران کی دعا قبول نہ ہوئی اس عرصہ میں ان کا ایک مرید بھی آ گیا۔ وہ بزرگ رات کو اُٹھ کر دُعا مانگ رہے تھے کہ انہیں الہام ہوا کہ تمہاری یہ دعا قبول نہیں ہوگی۔ یہ الہام ان کے مرید نے بھی سن لیا مگر وہ شرم کے مارے چپ رہا اوراس نے زبان سے کچھ نہ کہا دوسری رات پھراس بزرگ نے دعا کی تو پھر الہام ہوا کہ تمہاری یہ دُعا قبول نہیں ہوگی اور ساتھ ہی مرید کو بھی اس کا پتہ لگ گیا۔ مگر وہ پھر بھی شرم کے مارے چپ رہا تیسری رات پھر وہ بزرگ مصلّے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ الہام ہوا تمہاری یہ دعا قبول نہیں ہوگی۔ اور مرید نے بھی یہ آواز سن لی۔ وہ خاموش نہ رہ سکا اوراس نے کہا کہ ایک دفعہ دعا قبول نہ ہو یا دو دفعہ قبول نہ ہوتو کوئی بات نہیں مگر آپ کوتو کئی بار کہا گیا کہ یہ دُعا قبول نہیں ہوسکتی مگر پھر بھی آپ مانگتے چلے جاتے ہیں۔ اُس بزرگ نے کہا کہ تم تو ابھی سے تھک گئے ہو میں تو یہ دعا بیس سال سے متواتر کر رہا ہوں اور بیس سال سے ہی مجھے یہ جواب مل رہا ہے۔ لیکن پھر بھی میں مانگتا چلا جاتا ہوں لیکن تم تین دن سے ہی یہ آواز سن کر کہتے ہو کہ بس کرو۔ میرا کام اللہ تعالیٰ سے مانگنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کام ماننا اور قبول کرنا ہے میں اپنا کام کرتا جاؤں گا اللہ تعالیٰ اپنا کرے گا۔ وہ مانے یا نہ مانے اس کا اپنا اختیار ہے۔ پس اعلیٰ درجہ کے لوگ گھبراتے نہیں وہ اعمال بجالاتے ہیں مگر اس کے بدلے میں انعام کے طالب نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کے لئے اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ کہنا ہی کافی تھا۔ یعنی تمہارے رب کی یہ خواہش ہے کہ تم ایسا کرو۔ لیکن دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اعلیٰ ایمان والے نہیں یہ لوگ چونکہ کام کرنے سے پہلے یہ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں کیا ملے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی اس کا ذکر کر دیا کہ فتح مکہ کے نتیجہ میں ان پر کیا کیا انعامات نازل ہوں گے چنانچہ فرمایا۔

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۔ یہ حکم تمہیں اس لئے دیا گیا ہے تا کہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ مل جائے۔ یعنی اگر تم مکہ فتح کرنے کے لئے نکلو گے تو سب سے پہلا انعام تم پر خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ ہوگا کہ آئندہ تم پر لوگ اعتراض نہیں کرسکیں گے اور نہ ہی تمہارے خلاف کوئی دلیل قائم کرسکیں گے۔

دوسرا انعام جو ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے بیان کیا گیا ہے وہ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ ہے۔ یعنی اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تمہیں حکومت اور بادشاہت عطا فرمادے گا۔ اس کا بیان کرنا صرف ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے ہی ہے۔ ورنہ اعلیٰ درجہ کے لوگ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کو کچھ ملے گا بھی یا نہیں۔

تیسرا انعام لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ کے الفاظ میں بیان فرمایا کہ اس کی غرض یہ ہے کہ تم ہدایت پاؤ۔ ہدایت دراصل

مقصود تک پہنچنے کو کہتے ہیں پس ان الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو مل جاؤ گے۔ پہلے تم میں سے خاوند اپنی بیوی سے بیوی اپنے خاوند سے۔ بیٹا اپنے باپ سے اور باپ اپنے بیٹے سے جُدا تھا۔ اب مکہ کی طرف نکلنے میں تمہارا یہ بھی فائدہ ہے کہ تم ان کو مل جاؤ گے۔ اور وہ سارا جھگڑا جس کے باعث تم ایک دوسرے سے جُدا تھے دُور ہو جائے گا۔ پس ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے جو کام کرنے سے پہلے یہ پوچھتے ہیں کہ اس میں فائدہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے انعامات بیان فرمائے (۱) لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ (۲) وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ (۳) لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ پہلا انعام ذہنی ہے اس کے ذریعہ انسان کو دماغی طور پر اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسرا انعام مادی ہے یعنی حکومت اور بادشاہت تم کو مل جائے گی ۔ تیسرا انعام دل کے اطمینان کے لئے ہے کہ جب تم رشتہ داروں کو مل جاؤ گے تو تم کو اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے گا۔ غرض پہلا حکم اَور غرض سے ہے اور دوسرا اَور غرض سے۔ پہلے تو جنگ کا ذکر تھا اور اس کی غرض یہ بتائی تھی کہ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یعنی خدا کا چونکہ وعدہ ہے اس لئے اپنے محبوب کے وعدہ کو پورا کرنے کے لئے تمہیں کوشش کرنی چاہیے۔ گویا ایک اعلیٰ غرض بتائی جو صرف کامل الایمان لوگوں کے سامنے ہوتی ہے مگر ساتھ ہی فرما دیا کہ جس طرح تمہارا اعلیٰ مقصد یہ ہو کہ ہمیں انعامات سے کیا تعلق ہے ہم نے تو اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنی ہے اور اس کی مرضی کو پورا کرنا ہے۔ اسی طرح میرا اعلیٰ تعلق بھی تو یہ ہے کہ میں تمہارے اعمال سے غافل نہ رہوں اور کسی عمل کو ضائع نہ جانے دوں یعنی جب تم کوشش کرو گے تو میری غیرت بھی جوش میں آئے گی اور میں اعلیٰ سے اعلیٰ برکات تم پر نازل کروں گا اس کے بعد دوسری دفعہ اس حکم کو اُن لوگوں کے لئے دُہرایا ہے جو ایمان کے لحاظ سے اس اعلیٰ مقام پر فائز نہیں تھے جس پر پہلا گروہ قائم تھا اور بتایا کہ فتح مکہ کے نتیجہ میں یہ تین فائدے تمہیں حاصل ہوں گے اوّل دشمن کا اعتراض جاتا رہے گا۔ دوم فتح دنیوی حاصل ہو کر تمہیں امن میسر آ جائے گا۔ سوم تمہارے وہ عزیز اور رشتہ دار جو اب بوجہ اختلاف مذہب تم سے جدا ہیں وہ تمہارے ساتھ آ ملیں گے۔ گویا روحانی مادی اور قلبی تینوں قسم کے آرام تمہیں نصیب ہو جائیں گے۔ پس چونکہ اس جگہ پہلی غرض کی نسبت ادنیٰ فوائد مذکور تھے اور پہلی جماعت کی نسبت ایک کمزور جماعت کو شامل کرنا مقصود تھا اس لئے اس کو الگ بیان کیا۔ اور چونکہ یہی فوائد پہلی جماعت کو بھی ملنے والے تھے اس لئے اس کو بھی ساتھ شامل کر دیا۔ پس یہ تکرار نہیں بلکہ دوسری آیت میں ان کمزوروں کا ذکر کیا گیا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل ظل نہ تھے اور پہلے حکم میں شامل نہ ہو سکتے تھے اور پھر ان کے لئے وہ فوائد بیان کئے جو ان کے شایانِ شان تھے اور ساتھ ہی پہلوں کو بھی شامل کر لیا کیونکہ ان کو بھی وہ چیزیں ملنے والی تھیں۔ اگر انہیں شامل نہ کیا جاتا تو یہ سوال

پیدا ہوسکتا تھا کہ جب یہ انعامات ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو ملیں گے تو کیا اعلیٰ درجہ کے لوگ ان انعامات سے محروم رہیں گے؟ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ٹکڑہ میں ان کامل الایمان لوگوں کا ذکر کر دیا اور بتا دیا کہ گو وہ انعامات کے لالچ میں کوئی کام نہیں کرتے مگر جہاں تک ان فوائد کا تعلق ہے جو فتح مکہ سے وابستہ ہیں وہ ان سے محروم نہیں رہیں گے بلکہ جس طرح دوسرے لوگ فائدہ اٹھائیں گے اسی طرح وہ بھی فائدہ اُٹھائیں گے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ حَيْثُ مَا خَرَجْتُمْ نہیں بلکہ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض کمزور اور معذور لوگ بھی تھے جن کی جسمانی کمزوریاں اُن کے نکلنے میں مانع تھیں جیسے لنگڑے یا اپاہج وغیرہ پس ان کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حَيْثُ مَا خَرَجْتُمْ کی بجائے حَيْثُ مَا كُنْتُمْ کے الفاظ استعمال فرما کر یہ ظاہر کیا کہ اس ثواب میں صرف وہی لوگ شریک نہیں ہوں گے جو خروج کی طاقت رکھتے ہیں بلکہ وہ بیمار جو چارپائیوں سے ہل نہیں سکتے۔ وہ اپاہج جو چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ بیمار اور کمزور جو اپنی بیماری اور کمزوری جسم کی وجہ سے لڑائی کے ناقابل ہیں اگر وہ فتح مکہ کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں اور ان کے دل اس حسرت سے پُر ہیں کہ کاش اُن میں طاقت ہوتی اور وہ بھی جنگ میں شریک ہو سکتے تو اللہ تعالیٰ ان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا اور ان کو بھی ویسا ہی ثواب دیا جائے گا جیسے عملی طور پر جنگ میں حصہ لینے والوں کو دیا جاتا ہے غرض کمزور اور معذور لوگوں کو جو صدمہ ہوتا ہے کہ ہم اس ثواب سے محروم رہے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس صدمہ کو دور کرنے کے لئے وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ کے الفاظ استعمال فرمادئے تا کہ ان کو تسلی ہوجائے کہ ہم بھی اس میں شامل ہیں۔ ایک اپاہج اور کمزور آدمی جنگ میں شامل نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ رات دن دُعائیں کرسکتا ہے کہ یا اللہ! مسلمانوں کو فتح دے اور انہیں مکہ میں فاتحانہ طور پر داخل فرما یا اگر اس کے پاس کوئی غیر مسلم آجاتا ہے اور وہ اُسے تبلیغ کرکے مسلمان بنا لیتا ہے تو وہ بھی ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسے عملی طور پر جنگ میں شامل ہونے والا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حَيْثُ مَا خَرَجْتُمْ نہیں بلکہ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فرمایا ہے اور یا پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کو بھی شامل کر لیا ہے جب جنگ نہ ہو۔ اور ہدایت دی ہے کہ جب جنگ کو نکلو تب بھی اور جب گھروں میں ہو تب بھی مکہ کی فتح کو اپنی آنکھوں سے کبھی اوجھل نہ ہونے دو۔ اسی طرح ان الفاظ میں مسلمانوں کو اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ تم جہاں کہیں ہو تمہارا منہ ہمیشہ مکہ ہی کی طرف رہنا چاہیے۔ یعنی تمہیں ہمیشہ اپنے مرکز کی ترقی اور وہاں کے رہنے والوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کی طرف توجہ رکھنی چاہیے اور یہ امر مدِّ نظر رکھنا چاہیے کہ اگر مکہ مکرمہ میں کوئی خرابی پیدا ہوئی تو اس کا سارے عالم اسلام پر اثر پڑے گا اور اگر مکہ کی ترقی ہوئی تو اس کا اثر بھی تمام عالمِ اسلام پر

پڑے گا۔ کیونکہ لوگوں نے وہاں بار بار حج اور عمرہ کے لئے جانا ہے اور دنیا کے کناروں سے وہاں اکٹھا ہونا ہے۔ پس تمہیں کوشش کرنی چاہیے کہ وہاں کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔ اگر وہاں خرابی پیدا ہوئی تو لازماً ساری دنیا پر اس کا اثر پڑے گا۔ چنانچہ دیکھ لو اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق اب تک بعض مخالف یہ کہتے ہیں کہ ہم ان کو اپنے دعوے میں کس طرح سچا سمجھ لیں جبکہ مکہ کے علماء نے بھی آپؑ پر کفر کے فتوے لگائے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مکہ والوں کی اصلاح کی طرف توجہ رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے فضل سے بیت اللہ کبھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں نہیں جا سکتا۔ مگر اس پر شیطانی حملے تو ہر وقت ہو سکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں اسی طرح وہاں کے رہنے والوں میں بھی کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ پس اس آیت میں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ اے مسلمانو! تم خواہ دنیا کے کسی گوشہ میں رہتے ہو تمہیں ہمیشہ مکہ کی طرف اپنی توجہ رکھنی چاہیے اور اس کی اصلاح اور ترقی کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ گذشتہ دور میں مسلمانوں نے اس اہم فرض کو نظر انداز کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود ان میں بھی کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ میں جب اسلامی تاریخ کو پڑھتا ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت آتی ہے کہ مکہ اور مدینہ کی آبادی تو چند ہزار یا ایک لاکھ کے ارد گرد گھومتی رہی۔ مگر بغداد، دمشق اور قاہرہ کی آبادی اور ایران اور ہندوستان کے اسلامی شہروں کی آبادیاں بیس بیس لاکھ تک پہنچ گئیں۔ میں سمجھتا ہوں اسلام کے تنزل میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ مسلمانوں میں اپنے مذہبی مرکز میں بسنے کی خواہش اتنی نہ رہی جتنی خواہش انہیں دارالحکومت میں بسنے کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنیاد چھوٹی رہی اور عمارت بڑی ہو گئی اور چھوٹی بنیاد پر بڑی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ ہر انسان کے اندر بعض خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور بعض برائیاں بھی۔ اگر وہ بعض غلطیاں کر جاتا ہے تو وہ بعض اچھی باتیں بھی کرتا ہے۔ ہٹلر جو جرمنی کا سابق لیڈر تھا اور جس نے اپنی قوم کی ترقی کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ اگر اس کے اندر اسلام ہوتا تو وہ یقیناً بہت بڑا آدمی ہوتا مگر بوجہ اس کے کہ اس کی تربیت کرنے والا مذہب نہیں تھا وہ بہت سے غلطیوں کا شکار ہوا اور وہ قوم کو ترقی کی طرف لے جانے کی بجائے اُسے تنزل میں دھکیلنے کا موجب ہو گیا۔ وہ چونکہ انجینیئر تھا اس لئے تعمیر سے تعلق رکھنے والی باتیں اس کے لئے زیادہ نصیحت کا موجب ہوا کرتی تھیں اس نے اپنی کتاب ''مائینے کامف'' (Mein Kampf صفحہ ۸۰ تا ۹۶) میں جس میں وہ اپنا پروگرام پیش کرتا ہے لکھا ہے اور اس بات پر لمبی بحث کی ہے کہ یورپ میں اگر کوئی قوم بڑھنے کا حق رکھتی ہے تو وہ صرف جرمن قوم ہے اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ جو بڑی عمارت ہو وہ بڑی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتی ہے۔ تم اگر چار فٹ چوڑی بنیاد رکھو اور اُس پر چھ فٹ چوڑی دیوار بنا دو تو دیوار گر جائے گی لیکن اگر چار فٹ بنیاد رکھو اور تین فٹ چوڑی دیوار

بناؤ تو وہ زیادہ مضبوط ہوگی۔ مضبوط عمارتیں بنانے کے لئے ضروری ہے کہ بنیادیں چوڑی رکھی جائیں سو مربع فٹ میں عمارت کھڑی کرنی ہو تو سوا سو مربع فٹ میں بنیاد رکھنی چاہیے۔ چنانچہ دیکھ لو اہرام مصر ہزاروں سال سے کھڑے ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ وہ مثلث شکل میں بنائے گئے ہیں ان کی چوٹی صرف چند مربع گز کی ہے لیکن بنیاد ہزاروں مربع گز میں ہے۔ یہ عمارتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی سینکڑوں سال قبل کی بنی ہوئی ہیں اور کسی نے ان کی مرمت تک نہیں کی لیکن وہ اب تک قائم ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ مثلث شکل میں بنائی گئی ہیں۔ نیچے بنیادیں پچاس پچاس ایکڑ زمین میں ہیں۔ اور اوپر چوٹی صرف چند مربع گز کی ہے۔ بوجھ توازن کے ساتھ قائم رہتا ہے اور عمارتیں گرتی نہیں۔ ہٹلر کہتا ہے کہ جرمن اور ملکوں سے بڑا ہے۔ اس کی آبادی آٹھ کروڑ ہے۔ انگلینڈ کی آبادی چار کروڑ ہے۔ سپین کی آبادی چار کروڑ ہے۔ فرانس کی آبادی چار کروڑ ہے۔ اٹلی کی آبادی چار کروڑ ہے۔ اگر یہ ممالک پھیلنا شروع کریں تو چار کروڑ سے اوپر نکل کر ان کی طاقت کمزور ہو جائے گی اور باہر کی آبادیاں ان سے طاقتور ہونے لگیں گی۔ لیکن جرمن کی بنیاد بڑی ہے اور اس کا خیال تھا کہ اس بنیاد کو بڑا کرنے کے لئے روس کے بھی چند حصے لے لئے جائیں تا کہ دوسرے ممالک کو جب فتح کیا جائے تو وہ اس کے حصے بن سکیں اس پر غالب نہ آسکیں۔ مگر یہ گُر مسلمانوں نے نہیں پہچانا حالانکہ قرآن کریم نے انہیں یہ گُر بتا دیا تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف خانہ کعبہ کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھوائی اور دوسری طرف حکم دے دیا کہ لوگ چاروں طرف سے یہاں آئیں اور حج کریں۔ اسی طرح عمرہ کا حکم دیا اور اس طرح انہیں سال کے سارے حصوں میں مکہ آنے کی طرف توجہ دلائی۔ اسی طرح مدینہ کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر جگہ کے رہنے والے اپنے نمائندے مدینے بھیجا کریں تا وہ یہاں رہ کر دینی تعلیم حاصل کریں۔ مگر مسلمانوں نے اس گُر کو نہ سمجھا اور ان کا ہر سیاسی مرکز مذہبی مرکز سے زیادہ آباد رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا کثیر طبقہ سیاسی مرکز کی طرف جاتا تھا اور مذہبی مرکز کمزور رہتا تھا۔ میرے نزدیک اسلام کو اتنا نقصان اور کسی چیز نے نہیں پہنچایا جتنا نقصان قاہرہ دمشق اور بغداد نے پہنچایا یا جتنا نقصان اصفہانؔ اور رےّ نے پہنچایا، یا جتنا نقصان بخاراؔ اور مروؔ نے پہنچایا۔ ان شہروں نے لوگوں کی توجہ مذہبی مراکز سے ہٹا کر اپنی طرف کر لی۔ اگر سب سے بڑے شہر مکہ اور مدینہ ہوتے تو یہ خرابی پیدا نہ ہوتی یونیورسٹیاں بغداد میں بنیں حالانکہ ان کا صحیح مقام مدینہ تھا جامعہ ازہر قاہرہ میں بنا حالانکہ اس کا صحیح مقام مکہ تھا۔ پس جو قوم اپنی روحانیت اور علمی طاقت کو پھیلانا چاہتی ہے اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کا مرکز زیادہ سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہو۔ اسی امر کی طرف حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ میں اشارہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو نصیحت کی

گئی ہے کہ تم ہمیشہ اپنی توجہ مکہ کی طرف رکھو اور وہاں کے رہنے والوں کی اصلاح کی کوشش کرتے رہو۔ کیونکہ مکہ مکرمہ حج اور عمرہ اور دوسرے دینی اغراض و مقاصد کے لئے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ اگر وہاں فساد ہوا یا لوگ اچھے نہ رہے تو وہاں آنے والے بھی بُرا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ درحقیقت مرکز جتنا زیادہ مضبوط ہو اسی قدر جماعت کی تنظیم مضبوط ہوتی ہے اور جماعت روحانی لحاظ سے بھی ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ پس باہر کے لوگوں کو مرکز کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اور مرکز والوں کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور ہمیشہ نیکی اور روحانیت میں ترقی کرنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اس کے بعد فرماتا ہے ہمارے ان احکام کی غرض یہ ہے کہ کفار کو کوئی ایسی دلیل نہ مل جائے جس کی وجہ سے تمہیں ان کے مقابلہ میں شرمندگی اٹھانی پڑے۔ بے شک روحانی لوگوں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں اگر لوگ اعتراض کرتے ہیں تو بے شک کریں ہمیں ان کے اعتراضوں کی کیا پروا ہے مگر جو ادنیٰ درجہ کے لوگ ہوتے ہیں ان کے لئے یہ بڑی بات ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ ہم پر فلاں اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح وہ بعض دفعہ بد دل ہو کر علیٰحدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کو فرمایا اچھا ہم تمہارے سپرد یہ کام کرتے ہیں تم اسے ہمت کے ساتھ سرانجام دو تا کہ دشمنوں کی طرف سے تم پر کوئی الزام باقی نہ رہے۔ یہ الزام پانچ وجوہ کی بنا پر لگایا جا سکتا ہے۔

اوّل یہود کی کتب میں لکھا تھا کہ آنے والا موعود دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ کو فتح کرے گا۔ (استثناء باب ۳۳ آیت ۲) اگر مسلمان مکہ فتح نہ کرتے تو یہود کہہ سکتے تھے کہ یہ پیشگوئی اس نبی کے ذریعہ پوری نہیں ہوئی اس لئے ہم اسے کس طرح مان لیں (۲) پھر وہ یہ بھی اعتراض کر سکتے تھے کہ اس بارہ میں خود قرآن کریم کی پیشگوئیاں بھی غلط گئیں۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کہا تھا اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (القصص:۸۶) یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر یہ قرآن فرض کیا ہے اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ تجھے اس مقام کی طرف ضرور لَوٹا کر لائے گا۔ جس کی طرف لوگ حج اور عمرہ کے لئے بار بار لَوٹ کر آتے ہیں۔ پس اگر مکہ فتح نہ ہوتا تو مخالفین اسلام کو اس اعتراض کا موقعہ ملتا۔ کہ علاوہ توریت کی پیشگوئی کے خود قرآن کریم کی وہ پیشگوئیاں بھی پوری نہ ہوئیں جو فتح مکہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ (۳) اگر تحویل قبلہ نہ ہوتی تو یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس نبی کے لئے دعا کی تھی اس کا تعلق تو بیت اللہ سے ضروری تھا اور اس نے اس گھر کی آبادی کے لئے آنا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک غیر جگہ پر بیٹھا ہے اور کعبہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر ہم یہ کیونکر سمجھیں کہ وہ دعائے ابراہیمی کا

مصداق ہے؟ (۴) اگر مکہ فتح نہ ہوتا تو لوگ اعتراض کر سکتے تھے کہ اس نبی کی غرض تو توحید پھیلانا تھی مگر خانہ کعبہ میں تو تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے ہیں (بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی الرأیة یوم الفتح) پھر یہ پیشگوئی کس طرح پوری ہوئی کہ وہ اس گھر کو پاک کرے گا؟ (۵) اگر مکہ فتح نہ ہوتا تو یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (البقرۃ:۱۳۰) والی پیشگوئی کے پورا نہ ہونے پر بھی اعتراض ہوتا اور کہا جاتا کہ اس رسول نے تو مکہ کے لوگوں کی اصلاح کرنی تھی پھر یہ پیشگوئی کسی طرح پوری ہوئی؟ غرض اگر فتح مکہ یا اصلاحِ مکہ نہ ہوتی تو دشمن کے لئے کئی قسم کے اعتراضات کا موقعہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ حکم دے دیا کہ تم مکہ فتح کرو۔ اور یہ خیال رکھو کہ وہاں کوئی خرابی پیدا نہ ہو ورنہ دشمن کے ہاتھ میں ایسی دلیل آجائے گی جس کا تم کوئی جواب نہیں دے سکو گے۔ ہاں اگر تم مکہ فتح کر لو تو پھر اُس کا منہ بند ہو جائے گا اور وہ تم پر کوئی اعتراض نہیں کر سکے گا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ یہ استثناء متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی۔ اگر متصل مانا جائے تو اِس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم مکہ کو فتح کرو تا کہ لوگوں کی طرف سے تم پر کوئی الزام نہ رہے سوائے اُن لوگوں کے جو ظالم ہیں یعنی وہ لوگ تو پھر بھی شرارتوں میں حصہ لیتے رہیں گے۔ اور باتیں بناتے رہیں گے مگر ان کی وہ باتیں قابل اعتناء نہیں ہوں گی۔ اور اگر حجت کے معنے غلبہ کے کئے جائیں تو پھر یہ استثناء منقطع ہوگا۔ اور اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جو لوگ اِن میں سے ظالم ہوں تم اُن سے مت ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ہی ڈرو کیونکہ تمہارے غلبہ کی وجہ سے وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

(ج) عربی زبان میں اِلَّا کے معنے وَلٰكِنْ کے بھی ہوتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں۔ مَالَكَ عَلَيَّ حُجَّةٌ اِلَّا اَنْ تَظْلِمَنِيْ یعنی تجھے میرے خلاف کسی قسم کی کوئی حجت حاصل نہیں ہاں اگر تو مجھ پر ظلم کرے تو یہ علیحدہ بات ہے۔ اس لحاظ سے اِس کے معنے یوں ہوں گے کہ فتح مکہ کے بعد لوگوں کے ہاتھ میں کوئی حجت تو نہیں رہے گی لیکن اگر وہ پھر بھی اعتراض کریں گے تو ظلماً ہی کریں گے ورنہ اس میں کوئی معقولیت نہیں ہوگی۔

جیسا کہ حلِ لغات میں بتایا جا چکا ہے۔ اِلَّا واؤ عاطفہ کے معنے بھی دیتا ہے اور مابعد کو پہلے کے ساتھ شریک کرتا ہے اس لحاظ سے اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وَلَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ یعنی فتح مکہ کے ذریعہ مخالفین اسلام پر ایسی حجت ہو جائے گی کہ ظالموں کے منہ بھی بند ہو جائیں گے اور وہ بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکیں گے۔

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ ۔ فرماتا ہے یہ حکم میں نے اس غرض کے لئے بھی دیا ہے تا کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں۔ اس جگہ نعمت سے مراد اسلام ہے اور اُس کے اتمام سے مراد اُسے مستحکم طور پر قائم کر دینا ہے یہ پروگرام

بھی فتح مکہ کی اغراض میں سے تھا۔ چنانچہ جونہی مکہ فتح ہوا۔تمام عرب سے وفود آنے شروع ہو گئے۔اور صلح کا ہاتھ بڑھانے لگے (بخاری کتاب المغازی باب مقام النبیؐ بمکۃ زمن الفتح)۔آخر اِسی فتح کے نتیجہ میں سارا عرب مسلمان ہو گیا۔اور پھر عربوں نے ایک قلیل ترین مدت میں ساری دنیا میں اسلام پھیلا دیا۔اور وہ نعمت اسلام جو خدا تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے نازل فرمائی تھی دنیا میں مستحکم طور پر قائم ہوگئی۔

پھر فرمایا۔ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ فتح مکہ کا ایک فائدہ تمہیں یہ بھی ہوگا کہ تم ہدایت پا جاؤ گے۔یعنی تمہاری قوم داخل اسلام ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہدایت کے دروازے کھول دے گا۔ورنہ بلحاظ افراد تو فتح مکہ سے پہلے ہی کئی لوگ ایمان لا چکے تھے۔مگر باقی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اگر اس نبی نے مکہ فتح کر لیا تو یہ اور اس کا مذہب سچا ہے اور اگر یہ مکہ فتح نہ کر سکا تو جھوٹا ہوگا (بخاری کتاب المغازی باب مقام النبیؐ بمکۃ زمن الفتح)۔ چنانچہ جب فتح مکہ ہوئی تو عرب کی تمام اقوام سمجھ گئیں کہ اسلام سچا مذہب ہے اور اسلام قبول کرنے کے لئے دُور دُور سے وفود آنے شروع ہو گئے۔حتّٰی کہ اشد ترین دشمنوں میں سے بھی بعض فتح مکہ کے بعد بیعت میں داخل ہو گئے اِس کی بیّن مثال ہمارے سامنے ہندہ کی ہے جو فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے شدید ترین دشمنوں میں سے تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو سزا کے طور پر قتل کرنے کا حکم دیا تھا اُن میں وہ بھی شامل تھی۔مگر وہ بڑی ہوشیار عورت تھی۔گھر میں چھپ کر بیٹھ گئی اور باہر نہ نکلی۔جب عورتوں کی بیعت ہونے لگی تو چونکہ اس وقت تک پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔اس لئے اُس نے بھی چادر اوڑھ لی اور اُن کے ساتھ شامل ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کے لئے آ گئی۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہ تھا کہ اِن عورتوں میں ہندہ بھی موجود ہے۔آپ نے بیعت لیتے وقت یہ فقرہ فرمایا کہ کہو ہم شرک نہیں کریں گی۔اس پر ہندہ جھٹ بول اٹھی کہ یا رسول اللہ! کیا اب بھی ہم شرک کر سکتی ہیں؟ آپ اکیلے تھے اور مقابل پر آپ کی ساری قوم اور تمام عرب مع اپنے بتوں کے تھے جن سے وہ بزعم خود مدد لیتے تھے۔لیکن آپ نے اکیلے ہونے کے باوجود اپنے ایک معبود کی مدد سے مکہ فتح کر لیا۔اب کیسے ممکن ہے کہ ہم شرک کریں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کیا ہندہ ہے؟ ہندہ فوراً بول اٹھی کہ یا رسول اللہ! اب آپ کچھ نہیں کر سکتے۔اب میں آپ کی بیعت کر چکی ہوں (السیرۃ الحلبیۃ الجزء الثالث فتح مکۃ شرفھا اللہ تعالیٰ)۔
غرض فتح مکہ ایک ایسا نشان تھا کہ جس کو دیکھتے ہوئے ہندہ جیسی شدید دشمن عورت نے بھی سمجھ لیا کہ اب سچائی بالکل عیاں ہو گئی ہے۔

دوسری وجہ اقوام عرب کے اسلام قبول کرنے کی یہ تھی کہ عرب کے لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ مکہ کو کوئی

جھوٹے مذہب والا آدمی فتح نہیں کر سکتا اور اگر کوئی کوشش کرے گا تو تباہ ہو جائے گا اور اس کی تائید میں اُن کے سامنے ایک تازہ واقعہ بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیدائش سے پہلے یمن کے گورنر ابرہہ نے مکہ فتح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن باوجود ایک کثیر فوج اپنے ساتھ رکھنے کے ناکام رہا۔ اور آخر اس کی فوج میں ایسی وبا پھیلی کہ تمام فوج تباہ ہوگئی اور وہ ناکامی اور نامرادی کی حالت میں واپس چلا گیا (السيرة النبوية لابن هشام أمر الفيل و قصة النساء)۔ غرض عرب کے رہنے والے چونکہ قریب کے زمانہ میں اس بات کا تجربہ کر چکے تھے کہ بیت اللہ کی اللہ تعالیٰ حفاظت کر رہا ہے اور کوئی شخص اسے بزور فتح نہیں کر سکتا۔ اس لئے جب آپ نے مکہ والوں کو مغلوب کر لیا تو اس کامیابی نے انہیں یقین دلا دیا کہ یہ شخص سچا ہے اور اس کا مذہب بھی سچا ہے اور وہ جوق در جوق آپ پر ایمان لے آئے۔ بخاری کی ایک حدیث جو حضرت عمرو بن سلمہ سے مروی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لوگ فتح مکہ کے منتظر تھے۔ چنانچہ لکھا ہے كَانَتِ الْعَرَبُ تُلَوِّمُ بِإِسْلَامِهِمُ الْفَتْحَ فَيَقُوْلُوْنَ أُتْرُكُوْهُ وَقَوْمَهٗ فَإِنَّهٗ إِنْ ظَهَرَ عَلَيْهِمْ فَهُوَ نَبِيٌّ صَادِقٌ فَلَمَّا كَانَتْ وَقْعَةُ أَهْلِ الْفَتْحِ بَادَرَ كُلُّ قَوْمٍ بِإِسْلَامِهِمْ (بخاری کتاب المغازی باب مقام النبیؐ بمكة زمن الفتح) یعنی عرب لوگ فتح مکہ کا انتظار کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اے لوگو! اس نبی اور اس کی قوم کو چھوڑ دو۔ اگر یہ نبی دوسروں پر غالب آ گیا تو پھر یہ ضرور سچا ہے۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم پر غالب آ گئے تو ہر قوم نے دوڑتے ہوئے اسلام کو قبول کر لیا اور وفود در وفود لوگ بیعت میں داخل ہو گئے۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ کہ تمہاری قوم کا اسلام لانا فتح مکہ کے ساتھ وابستہ ہے جب مکہ فتح ہو گیا تو تمہاری ساری قوم اسلام میں داخل ہو جائے گی۔ پھر جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ تھا کہ فتح مکہ کے نتیجہ میں تمہیں اپنے رشتہ دار اور دوست سب مل جائیں گے اور آپس کی لڑائیاں اور تفرقہ دور ہو جائے گا۔ گویا تین قسم کے انعامات تم پر نازل ہوں گے۔

اوّل ۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۔ تمہیں فتح مکہ کے بعد ذہنی طور پر اطمینان حاصل ہو جائے گا۔ اور دشمن کا مونہہ ہر قسم کے اعتراضات سے بند ہو جائے گا۔

دوم ۔ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ ۔ یہ مادی انعام ہے کہ تمہیں حکومت مل جائے گی۔ بادشاہت تمہارے ہاتھ میں آ جائے گی۔ اور اسلام مستحکم طور پر پہلے عرب اور پھر عرب سے نکل کر ساری دنیا میں قائم ہو جائے گا۔

سوم ۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ اس میں قلبی انعام کا ذکر کیا کہ رشتہ داروں کی جدائی کی وجہ سے جو تمہارے دلوں

میں بے اطمینانی اور اضطراب ہے وہ بھی دور ہو جائے گا اور تمہاری قوم بھی اسلام میں داخل ہو جائے گی۔غرض بتایا کہ یہ تین قسم کے انعامات تمہیں ملیں گے کیونکہ وہ لوگ جو روحانیت میں اعلیٰ مقام نہیں رکھتے بالعموم پوچھا کرتے ہیں کہ اگر ہم نے فلاں کام کیا تو ہمیں کیا ملے گا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تین قسم کے انعامات تمہیں اس کے بدلہ میں ملیں گے۔اور پہلے گروہ کو اس گروہ کے ساتھ اس لئے شامل کر لیا گیا ہے کہ یہ انعامات انہیں بھی ملنے والے تھے۔ ورنہ وہ کسی بدلہ کے لئے کام نہیں کرتے اور نہ انہیں انعامات کی کوئی لالچ ہوتی ہے۔وہ صرف اس لئے کام کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔پس یہ تکرار نہیں بلکہ ایک زائد مضمون بیان کرنے کے لئے اسے دُہرایا گیا ہے۔اور یہ آیت بھی اپنے اندر فتح مکہ کا ہی مضمون رکھتی ہے۔چنانچہ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سورۃ فتح میں فتح مکہ کی جو اغراض بتائی گئی ہیں وہی اس جگہ بھی بیان کی گئی ہیں۔وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا۔لِّيَـغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا (الفتح:۲،۳)

یعنی ہم نے تجھے ایک کھلی کھلی فتح بخشی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تیرے متعلق کئے گئے وہ گناہ بھی جو پہلے گذر چکے ہیں ڈھانک دے گا اور جواب تک ہوئے نہیں لیکن آئندہ ہونے کا امکان ہے اُن کو بھی ڈھانک دے گا۔اور تجھ پر اپنی نعمت پوری کرے گا اور تجھے سیدھا راستہ دکھائے گا۔اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ فتح مکہ کی تین اغراض ہیں۔اوّل دشمن کے اعتراضوں کو دور کرنا۔جیسے فرمایا لِيَـغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ اس جگہ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ سے اعتراضات ہی مراد ہیں۔کیونکہ کبھی غیر کے خیال کو بھی دوسرے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔جیسے کہتے ہیں۔میرا قصور یہ ہے یعنی تمہارے خیال میں میرا قصور یہ ہے۔قرآن کریم میں آتا ہے وَلَهُمۡ عَلَيَّ ذَنۡۢبٌ (الشعراء:۱۵) اُن کے نزدیک میں نے ایک گناہ کیا ہے۔پس لِيَـغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کا مطلب یہ ہے کہ اس پیشگوئی کے پورا ہونے سے دشمن جو تم پر اعتراض کیا کرتا تھا کہ جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ پردہ ڈال دے گا اور وہ الزام دُور ہو جائے گا۔اور صرف اسی وقت نہیں بلکہ آئندہ بھی یہ دلیل ہمیشہ تجھ پر اعتراض کرنے والوں کے منہ بند کرتی رہے گی۔

فتح مکہ کی دوسری غرض اتمام نعمت بتائی ہے اور تیسری غرض يَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا میں یہ بتائی کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت میں ترقی عطا فرمائے گا۔

یہی تین اغراض اس جگہ بھی بیان فرمائی گئی ہیں اور کہا گیا ہے کہ تم مکہ کو فتح کرو تا کہ دشمنوں کا تم پر کوئی الزام نہ

رہے۔اور تا کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تا کہ تم ہدایت پاؤ۔ سورۃ فتح اور اِن آیات کے تقابل سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے اور دونوں میں فتح مکہ پر زور دینا اور اُس کے فوائد کو بیان کرنا مقصود ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ

(اُسی طرح) جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے۔

يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا

اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے

لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ؁ ﴿۱۵۲﴾

جو تم (پہلے) نہیں جانتے تھے۔

حل لغات۔ كَمَا کے ایک معنے تو وہ ہیں جو عام طور پر کئے جاتے ہیں۔یعنی ’’جیسا کہ‘‘ یہ مشابہت کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے ایک دوسرے معنی لِمَا کے بھی ہیں یعنی ’’اس لئے‘‘ (بحر محیط) جیسے ایک شاعر کہتا ہے ؏

لَا تَشْتُمِ النَّاسَ كَمَا لَا تُشْتَمْ

یعنی تو لوگوں کو گالی نہ دے اس لئے کہ وہ تجھ کو گالی نہ دیں۔

تفسیر۔ كَمَا کے معنے اگر ’’جیسا کہ‘‘ کے سمجھے جائیں تو اس آیت کے یہ معنے بنتے ہیں کہ جس نعمت کا پیچھے ذکر ہوا ہے اُس کا ہم تم پر ویسے ہی اتمام کریں گے جیسا کہ ہم نے تم میں اپنے اس رسول کو جو دعائے ابراہیمی کا موعود ہے بھیج کر اپنے احسان کو مکمل کیا ہے۔

درحقیقت ابراہیمی دعا کے دو حصے تھے۔ایک حصہ تو اُن میں رسول بھیجنے کے ساتھ تعلق رکھتا تھا اور دوسرا حصہ ایک پاکیزہ اور مقدس جماعت تیار کرنے کے متعلق تھا۔ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ مطلب نہ تھا کہ رسول تو آجائے مگر قوم بے شک گمراہ ہی رہے یا رسول تو آجائے مگر قوم کو تقدیس حاصل نہ ہو۔پس ضروری تھا کہ ابراہیمی دعا کو پورا کرنے کے لئے جہاں رسول بھیجا گیا وہاں دعا کے دوسرے حصوں کو بھی پورا کیا جاتا اور ایک ایسی پاکیزہ

جماعت قائم کی جاتی جو خدا تعالیٰ کے دین کے لئے ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ رہنے والی ہو۔

اور اگر كَمَا بمعنے لِمَا ہو تو اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے یہ حکم تمہیں اس لئے دیا ہے کہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا ہے جو تمہیں میں سے ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ وہ تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور اس طرح تم کو پاک کرتا اور مدارج عالیہ کی طرف بڑھاتا ہے اور تم کو شریعت سکھاتا ہے اور پھر وہ احکام شریعت کی باریک در باریک حکمتوں اور پوشیدہ اسرار سے واقف کرتا ہے۔ اور صرف وہی تعلیم نہیں دیتا جو پہلے صحیفوں میں پائی جاتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایسی تعلیم دیتا ہے جو تم لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھی۔ پس تم لوگ میرا ذکر کرو تا کہ میں بھی تمہیں اپنے دربار میں جگہ دوں اور میرے انعامات پر جو اس رسول کے ذریعہ تم پر کئے گئے ہیں شکر بجالاتے رہو اور میری ناشکری نہ کرو۔

یوں تو دنیا کے تمام مذاہب کی ابتداء انبیاءؑ کی ذات سے ہی ہوئی ہے لیکن کوئی مذہب بھی ایسا نہیں جس نے ایسے نبی کو پیش کیا ہو جو تمام امور دینیہ کی حکمتوں کو بیان کرنے کا مدعی ہو اور جسے تمام بنی نوع انسان کے لئے اُسوۂ حسنہ کے طور پر پیش کیا گیا ہو۔ عیسائیت جو سب سے قریب کا مذہب ہے۔ وہ تو مسیح کو ابن اللہ قرار دے کر اِس قابل ہی نہیں چھوڑتی کہ اُس کے نقش قدم پر کوئی انسان چلے کیونکہ انسان خدا جیسا نہیں ہوسکتا۔ باقی رہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سو تورات انہیں اسوۂ حسنہ کے طور پر پیش نہیں کرتی۔ نہ تورات اور انجیل حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو مذہبی حکمتوں کے بیان کرنے کا ذمہ دار قرار دیتی ہے۔ لیکن قرآن کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔ کہ یہ نبی تمہیں احکام الٰہیہ اور اس کی حکمتیں بتاتا ہے۔ پس اسلام ممتاز ہے اس بات میں کہ اس کا نبی دنیا کے لئے اسوۂ حسنہ بھی ہے اور جبر سے اپنے احکام نہیں منواتا بلکہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اپنے اتباع کے ایمانوں کو مضبوط کرنے اور اُن کے جوش کو زیادہ کرنے کے لئے یہ بھی بتاتا ہے کہ اُس نے جو احکام دیئے ہیں اُن کے اندر ملت افراد ملت اور باقی نوع انسان کے لئے کیا کیا فوائد مخفی ہیں۔ یہ وہی دعائے ابراہیمی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مگر اس میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں دو فرق ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے الفاظ یہ تھے کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (البقرۃ: ۱۳۰) یعنی اے خدا! تو ان میں انہی سے ایک رسول بھیج جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے۔ انہیں کتاب کی تعلیم دے ان پر احکام الٰہیہ کی حکمت

واضح کرے۔ اوران کے نفوس کا تزکیہ کرے۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے تلاوتِ آیات پھر تعلیم کتاب پھر تعلیم حکمت اور پھر تزکیہ کو رکھا تھا۔مگر یہاں پہلے تلاوت آیات پھر تزکیہ پھر تعلیم کتاب وحکمت کو بیان کیا گیا ہے۔ پس طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا؟ سو یادرکھنا چاہیے کہ دعائے ابراہیمی کی ترتیب اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا میں جب بھی خدا تعالیٰ کا کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ تلاوت آیات سے کام لیتا ہے یعنی اس وحی کو پیش کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔اور اُن معجزات اور نشانات کو پیش کرتا ہے جو اُس کی تائید میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوتے ہیں اس کے بعد آہستہ آہستہ احکام نازل ہوتے ہیں تو اُن احکام کی حکمتیں بیان کی جاتی ہیں اور آخر معجزات ونشانات دیکھنے، دلائل و براہین پر غور کرنے اور اُن کی حکمتوں کو سمجھ لینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کی جماعت کو ایک تقدس عطا فرماتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ دوسروں پر غالب آجاتی ہے۔مگر یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری ترتیب کو مدِ نظر رکھا ہے۔یعنی ایمانیات اور روحانیات سے تعلق رکھنے والی باتوں کو اس نے پہلے لے لیا ہے اور علوم ظاہری سے تعلق رکھنے والی باتوں کو بعد میں بیان کر دیا ہے۔تزکیہ چونکہ قلب سے تعلق رکھتا ہے اور تلاوت آیات بھی ایمان سے تعلق رکھتی ہے اس لئے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کو لے لیا جو ایمانیات اور روحانیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ معرفت کے لحاظ سے سب سے پہلی چیز یہی ہے کہ انسان کو ایسی آنکھیں عطا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے نشانات کا مشاہدہ کرنے والی ہوں۔اور دوسری چیز یہ ہے کہ ان نشانات کا مشاہدہ اُس کے اندر ایسا تزکیہ پیدا کر دے کہ اس کا دل خدا تعالیٰ کا عرش بن جائے۔اور صفات الٰہیہ اس کے آئینہ قلب میں منعکس ہوجائیں۔ جب معرفت کا نور انسانی قلب کو ایسا جلا بخشتا ہے کہ اُس میں کوئی نفسانی کدورت اور آلائش باقی نہیں رہتی تو اس وقت وہ خدا کی صفات کا مظہر ہو جاتا ہے اور یہی انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہاں تلاوت آیات کے بعد تزکیہ نفوس کو دوسرے امور پر مقدم رکھا ہے۔ تزکیہ کے بعد تعلیم کتاب اور حکمت کا ذکر فرمایا ہے۔ جو ظاہری علوم سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں اور انہیں آخر میں رکھ کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ احکام اور اُن کی حکمتیں اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود تزکیہ نفس اور اللہ تعالیٰ کی صفات اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا نبی کسی شخص کو آواز دے اور وہ جسے بلایا گیا ہو اُس وقت نماز بھی پڑھ رہا ہو تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اُسی وقت نماز توڑ دے اور خدا تعالیٰ کے نبی کی خدمت میں حاضر ہوجائے کیونکہ وہ صفات الٰہیہ کا کامل مظہر ہوتا ہے اور اس کی آواز گویا خدا کی آواز ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک شخص کو آواز دی۔ وہ اس وقت نماز پڑھ

رہا تھا۔ اُس نے نماز توڑ دی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ لوگوں نے اعتراض کیا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور خدا کا نبی اُسے بلائے تو وہ نماز بھی توڑ سکتا ہے۔ اِسی طرح حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کو بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک دفعہ ایسی حالت میں آواز دی جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے تو آپ نے بھی نماز توڑ دی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ استدلال قرآن کریم کی اس آیت سے کیا تھا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال: ۲۵) یعنی اے مومنو! تم اللہ اور اس کے رسول کی بات سننے کے لئے فوراً حاضر ہو جایا کرو جبکہ وہ تمہیں زندہ کرنے کے لئے پکارے۔ غرض نماز اصل مقصود نہیں اور نہ ہی روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ مقصود ہیں۔ یہ سب ذرائع ہیں خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے اور یہ سب ذرائع ہیں نفس انسانی کو ہر قسم کی روحانی آلائشوں سے پاک کرنے کے۔ اگر کسی کا دل پاک نہیں تو خواہ زبان سے وہ ہزار بار کتاب اللہ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرے اس کا یہ دعویٰ ایک رائی کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتا۔

تزکیہ کے بعد تعلیم کتاب اور حکمت میں بھی تعلیم کتاب کو اس لئے مقدم رکھا گیا ہے کہ اعلیٰ ایمان والا شخص صرف یہ دیکھتا ہے کہ آیا اُس کے محبوب نے فلاں کام کرنے کو کہا ہے یا نہیں۔ اگر کہا ہو تو وہ بغیر سوچے سمجھے اس کام کو اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جو اعلیٰ ایمان نہیں رکھتا وہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس کام کی غرض کیا ہے اور اس میں حکمت کیا ہے؟ جب تک مجھے اس کی حکمت نہ بتائی جائے گی میں عمل نہیں کروں گا۔ غرض ایک سچے اور مخلص مومن کے لئے صرف یہی کافی ہوتا ہے کہ اُس کا ربّ اُسے حکم دے رہا ہے۔ وہ خدا کی آواز سنتا اور اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ لیکن فلسفی حکمت کا سراغ لگاتا ہے اور جب تک اُس کا دماغ تسلی نہ پائے اس کا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک ماں کو اس کے بچہ کی خدمت کے لئے اگر صرف دلائل دیئے جائیں اور کہا جائے کہ اگر تم خدمت نہیں کرو گی تو گھر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور یہ ہوگا اور وہ ہوگا تو یہ دلائل اُس پر ایک منٹ کے لئے بھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر خدمت کرتی ہے تو صرف اس جذبہ محبت کے ماتحت جو اس کے دل میں کام کر رہا ہوتا ہے۔ اِسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ ایمان العجائز ہی انسان کو ٹھوکروں سے بچاتا ہے۔ ورنہ وہ لوگ جو حیل و حجت سے کام لیتے ہیں اور قدم قدم پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں حکم کیوں دیا گیا ہے اور فلاں کام کرنے کو کیوں کہا گیا ہے وہ بسا اوقات ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اور اُن کا رہا سہا ایمان بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن کامل الایمان شخص اپنے ایمان کی بنیاد مشاہدہ پر رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے دلائل کو تو سن لیتا ہے مگر ان کے اعتراضات کا اثر قبول نہیں کرتا

کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کو اپنی روحانی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوتا ہے۔منشی اروڑے خان ؓ صاحب جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک صحابی تھے اُن کا ایک لطیفہ مجھے یاد ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے بعض لوگوں نے کہا کہ اگر تم مولوی ثناء اللہ صاحب کی ایک دفعہ تقریر سن لو تب تمہیں پتہ لگے کہ مرزا صاحب سچے ہیں یا نہیں؟ وہ کہنے لگے میں نے ایک دفعہ اُن کی تقریر سنی۔ بعد میں لوگ مجھ سے پوچھنے لگے۔اب بتاؤ کیا اتنے دلائل کے بعد بھی مرزا صاحب کو سچا سمجھا جا سکتا ہے؟ میں نے کہا میں نے تو مرزا صاحب کا مونہہ دیکھا ہوا ہے۔اُن کا مونہہ دیکھنے کے بعد اگر مولوی ثناء اللہ صاحب دو سال تک بھی میرے سامنے تقریر کرتے رہیں تب بھی اُن کی تقریر کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ جھوٹے کا مونہہ تھا۔ بے شک مجھے اُن کے اعتراضات کے جواب میں کوئی بات نہ آئے میں تو یہی کہوں گا کہ حضرت مرزا صاحب سچے ہیں۔غرض حکمت کا معلوم ہونا ایک کامل مومن کے لئے ضروری نہیں ہوتا کیونکہ اس کا ایمان عقل کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہوتا ہے۔اسی لئے اُسے احکام کی حکمت سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں جس کا ایمان صرف دلائل کی حد تک ہو اُسے حکمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔غرض ایمان کامل مشاہدہ کی بنا پر ہوتا ہے اور ایمان ناقص حکمت کی بنا پر۔کامل الایمان لوگوں کے لئے نبی کا تلاوتِ آیات اور تزکیہ ہی کافی ہوتا ہے۔اور آیات کی حکمت اور اس کی غرض معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ وہ نبی کی آواز کافی سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے حصول کے لئے دیوانہ وار کام شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرما رہے تھے کہ آپ ؐ نے دوران تقریر میں فرمایا۔ بیٹھ جاؤ۔ کیونکہ اُس وقت کناروں پر کئی لوگ کھڑے تھے۔ اُس وقت حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ گلی میں تھے اور مسجد کی طرف آ رہے تھے جونہی یہ آواز آپ کے کان میں پہنچی آپ وہیں بیٹھ گئے اور پھر گھسٹتے گھسٹتے دروازہ کی طرف چل پڑے۔ یہ اچنبھے کی بات تھی کسی نے انہیں بچوں کی طرح گھسٹتے دیکھ کر کہا۔ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا تو یہ تھا کہ اندر والے بیٹھ جائیں یہ مطلب تو نہیں تھا کہ گلی میں چلنے والے بھی بیٹھ جائیں۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ کہ اگر وہاں پہنچتے پہنچتے میری جان نکل جائے تو میں خدا تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا کہ خدا تعالیٰ کے رسول کی طرف سے ایک آواز آئی تھی جس پر میں نے عمل نہ کیا۔ (کنز العمال باب فی فضائل الصحابة......) اب بظاہر یہ بات حکمت کے خلاف نظر آئے گی مگر عشق کا رنگ ہی اَور ہوتا ہے۔ عاشق حکمتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ جو کچھ محبوب کہے اُسے ماننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔تو یاد رکھنا چاہیے کہ حکمت تابع ہے تعلیم کے اور تعلیم تابع ہے تزکیہ کے اور تزکیہ تابع ہے آیات اللہ کے۔ اصل خدا تعالیٰ کی ذات ہے پھر اُس کا مقام ہے جو خدا نما ہو۔ پھر اُس سے اتر کر وہ ذرائع ہیں جو انسان کو خدا نما بنانے والے ہیں۔ پھر اُن سے اتر کر وہ

محرکات ہیں جو لوگوں کو عمل کی ترغیب دلاتے ہیں۔ پس یہ ترتیب چھوٹے بڑے درجہ کے لحاظ سے ہے۔ لیکن دعائے ابراہیمی میں اس ترتیب کو مدِّنظر رکھا گیا ہے جس سے انسان ترقی کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے اُسے دلائل دیئے جاتے ہیں۔ پھر ان کے بعد فرائض بتائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فرائض کی حکمتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اور پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ ان باتوں پر عمل کریں گے انہیں تزکیہ حاصل ہو جائے گا۔

دعائے ابراہیمی اور اس آیت میں دوسرا فرق یہ ہے کہ وہاں دعا کے بعد کہا تھا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اور اس جگہ ہے وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عزیز و حکیم صفات کے واسطہ سے دعا کی تھی۔ کہ جو کچھ میں مانگ رہا ہوں اپنے خیالات کے مطابق مانگ رہا ہوں۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ اُس وقت کی ضرورت کیا ہوگی؟ پس تو اپنی طاقت اور حکمت سے کام لے کر جس چیز کی اس وقت ضرورت ہو وہ دیجیئو۔ لیکن یہاں خدا تعالیٰ نے وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ فرما کر اس دعا کی قبولیت کا ذکر کر دیا کہ ابراہیمؑ نے عزیز اور حکیم دو صفات کے واسطہ سے جو دعا مانگی تھی وہ پوری ہوگئی۔ اور نہ صرف یہ نبی وہ کام کر رہا ہے جو ابراہیمؑ نے کہے بلکہ ایسے رنگ میں کر رہا ہے کہ پہلے کسی نبی نے نہیں کئے۔ کیونکہ اس زمانہ کی ضرورت ایسی ہی اعلیٰ درجہ کی تعلیم چاہتی تھی۔ پس دعائے ابراہیمی کامل طور پر پوری ہوگئی۔

وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ رسول تم کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔ یعنی اس کی تعلیم صرف اُنہی اچھی تعلیمات پر مشتمل نہیں جو پہلی کُتب میں پائی جاتی ہیں بلکہ اس سے زائد اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو پہلے دنیا کو معلوم نہیں تھیں۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ اس امر کو محکمات اور متشابہات کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں فرماتا ہے کہ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (آل عمران:۸) یعنی تجھ پر جو کتاب نازل کی گئی ہے اِس کی بعض آیتیں تو محکم ہیں جو اس کتاب کی جڑ ہیں اور کچھ اور ہیں جو متشابہ ہیں۔ اس میں متشابہات سے مراد وہ باتیں بھی ہیں جو پہلی تعلیموں سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً روزہ رکھنا۔ یہ حکم اپنی ذات میں متشابہ ہے کیونکہ یہ تعلیم پہلے بھی پائی جاتی تھی۔ اسی طرح قربانیوں کا حکم بھی متشابہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (الحج:۳۵) یعنی دنیا کی ہر قوم کے لئے ہم نے قربانی کا ایک طریق مقرر کیا تھا تاکہ وہ اُن جانوروں پر جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو بخشے ہیں اللہ کا نام لیں اور انہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کریں۔ غرض قرآن کریم کی کچھ تعلیمیں تو ایسی ہیں جو پچھلی تعلیموں سے ملتی ہیں اور لازماً ملنی چاہئیں۔ مثلاً پہلے نبیوں نے کہا تھا کہ سچ بولا

کرو۔ تو کیا قرآن یہ کہتا کہ سچ نہ بولا کرو جھوٹ بولا کرو؟ پس اس میں لازماً کچھ ایسی تعلیمیں ہیں جو پہلی تعلیموں سے ملتی ہیں۔ اور انہی کا نام متشابہات رکھا گیا ہے لیکن کچھ تعلیمیں ایسی بھی ہیں جن میں اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں ایک یگانہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے اور وہی محکمات ہیں۔ اگر وہ تعلیمیں بھی جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ لائے محکم ہوتیں تو پھر قرآن کریم کے نزول کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پس يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ میں قرآن کریم کی اسی فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ صرف وہی تعلیم نہیں دیتا جو پہلے صحیفوں میں پائی جاتی ہے بلکہ ایسی تعلیم بھی دیتا ہے جو اُن سے زائد ہے اور جو تمہیں پہلے معلوم نہیں تھی۔

فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۳﴾ ع ۱۸/۵/۲

پس (جب میں اس قدر فضل کرنے والا ہوں تو) تم مجھے یاد رکھو۔ میں (بھی) تمہیں یاد کرتا رہوں گا۔
اور میرے شکر گزار بنو اور میری ناشکری نہ کرو۔

تفسیر۔ ذکر کے معنے یاد کرنے کے ہوتے ہیں لیکن ہر یاد ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی بلکہ الگ الگ رنگ اپنے اندر رکھتی ہے۔ جس کے اندر طاقت نہیں ہوتی اس کی یاد صرف تمنا اور خواہش اور التجاء کا حکم رکھتی ہے۔ جیسے ایک شخص کا رشتہ دار دور گیا ہوا ہو۔ اور وہ اُس کو یاد کرے تو چونکہ اُس میں طاقت نہیں ہوتی کہ اُس کو بلا سکے۔ خواہ بسبب احتیاج کے خواہ بسبب مصالح کے اس لئے یہ یاد صرف التجاء اور خواہش ہی ہوگی یا ایک بچہ جو پنگھوڑے میں پڑا ہوا اپنی ماں کو یاد کرتا اور روتا ہے تو اس کی یاد بھی صرف اس تمنا اور خواہش تک ہی محدود ہوتی ہے کہ اُس کی ماں اُس کے پاس آئے۔ اور اسے اپنی گود میں اُٹھا لے لیکن ایک یاد ایسے شخص کی ہوتی ہے جس میں کچھ طاقت تو ہوتی ہے لیکن پوری طاقت نہیں ہوتی۔ ایسا شخص اپنے مقصد کے حصول کے لئے کچھ کوشش بھی کرتا ہے۔ جیسے بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے اور چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اُس وقت اپنی ماں کو یاد کرتا ہے تو وہ اپنی ماں سے ملنے کی صرف خواہش ہی نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر اس کے لئے کوشش بھی کرتا ہے۔ پھر ایک یاد وہ ہے جو بادشاہ کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی رعایا کے کسی فرد کو یاد کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اُس کی یاد التجاء نہیں ہوتی بلکہ ایک زبردست طاقت ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اُس کی یاد عملاً پوری ہو جاتی ہے۔ غرض جب ایک ادنیٰ آدمی بڑے کو یاد کرے تو اُس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ بڑا اسے اپنے پاس بلا لے۔ اور یہ التجاء ہوتی ہے۔ لیکن

جب بڑا آدمی ادنیٰ کو یاد کرے تو اس کے معنے اس کو بلانے کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُس کے اندر ایک طاقت ہوتی ہے۔اس کی ایسی ہی مثال ہے۔جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ جنتیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حٰمٓ السجدة: ۳۲) یعنی جنت میں جو کچھ تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گا اور جو کچھ تم مانگو گے وہ تم کو عطا کیا جائے گا۔ یہ خواہش بھی ایک طاقت اور قوت پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ اِدھر خواہش پیدا ہوگی اور اُدھر اللہ تعالیٰ اُس خواہش کو پورا کرنے کا سامان پیدا فرما دے گا۔دنیا میں اگر کسی کو کہا جائے کہ بادشاہ سلامت تمہیں یاد کرتے ہیں تو کیا مجال ہے کہ وہ فوراً اپنا کام نہ چھوڑ دے اور بادشاہ کی ملاقات کے لئے نہ چل پڑے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نہ گیا تو میری خیر نہیں۔پس اس یاد میں ایک زبردست کشش اور طاقت ہوتی ہے اور جسے یاد کیا جاتا ہے وہ اس کی طرف کھچا چلا جاتا ہے۔پس اگر بادشاہ کی یاد عام یاد کے علاوہ معنی رکھتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی یاد کے بھی اَور معنے ہو سکتے ہیں۔پس فَاذْكُرُوْنِيْٓ کے یہ معنے ہیں کہ تم میرے ملنے کی خواہش کرو مجھے یاد رکھو اور میرے قرب کے حصول کے لئے کوشش کرو اور جب تم ایسا کرو گے تو اَذْكُرْكُمْ میں بھی تمہیں یاد کروں گا۔جس کے یہ معنے ہیں کہ تم میری طرف کھچے چلے آؤ گے۔میرے قرب کے دروازے تمہارے لئے کھل جائیں گے۔دنیا میں جب ایک معمولی بادشاہ بھی اس طرح یاد نہیں کرتا کہ وہ دوسرے کا نام لینا شروع کر دے تو خدا تعالیٰ کی یاد کے یہ معنے کس طرح ہو سکتے ہیں کہ وہ اس کے نام کا وظیفہ پڑھنے لگ جائے۔پس اَذْكُرْكُمْ کے یہ معنے ہیں کہ تم ہمارے حضور کھچے چلے آؤ گے اور ہمارے مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔ یہ مراد نہیں کہ ہم تمہارا نام لینے لگ جائیں گے۔عربی زبان میں بھی کہتے ہیں کہ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ يَذْكُرُكَ۔یعنی امیر المومنین آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ پُرانے زمانہ میں جب کسی کو پیغام دینا ہوتا تھا تو یہی الفاظ کہتے تھے۔اور اس سے یہ مراد نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہے۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم فوراً اُن کے حضور پہنچ جاؤ۔پس فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ کے یہ معنے ہیں کہ تم میرا قرب حاصل کرنے کی پوری کوشش کرو۔ جب تمہاری محبت اپنے کمال کو پہنچ جائے گی تو اس کے نتیجہ میں میں بھی تمہیں اپنا قرب دے دوں گا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بندہ کا ذکر عموماً تین قسم کا ہوتا ہے۔اوّل کسی اچھی یا بری بات کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کو یاد کر لینا۔ جیسے گناہ کی تحریک ہو تو اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ کہنا۔کوئی مصیبت پہنچے تو اِنَّا لِلّٰهِ کہنا۔خوشی کی خبر ملے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہنا۔ دوم دوسرے کی بات سن کر اللہ تعالیٰ کو یاد کر لینا۔جیسے کسی مصیبت زدہ کا واقعہ سُنا تو اُس کے لئے دعا کی اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے اپنے فضل سے ہمیں اس قسم کے مصائب سے بچا رکھا ہے۔سوم خدا تعالیٰ کے متعلق باتیں کرنا یعنی اپنی مجالس میں خدا تعالیٰ کے رحم اور کرم کے متعلق گفتگو کرنا۔ دشمنوں کے اعتراضات کا

جواب دینا۔ اُس کے نام کی عظمت قائم کرنے کی کوشش کرنا۔ اور بار بار اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کرنا تا کہ اس کے نتیجہ میں (۱) خدا تعالیٰ کی صفات انسان کے دل پر نقش ہوں (۲) اور پھر وہ مٹیں نہیں بلکہ ہمیشہ قائم رہیں (۳) اور انسان کے ہر قول و عمل سے ان کا ظہور ہو۔

پھر ذکر کے ایک معنے چونکہ عزت اور شہرت کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اَذْكُرْكُمْ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کو یاد رکھیں گے اور اس کے احکام پر عمل کرتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی انہیں عزت اور شہرت عطا فرمائے گا۔ اور آخرت میں بھی انہیں اپنے لازوال قرب سے نوازے گا۔

پھر فرماتا ہے وَاشْكُرُوْا لِيْ۔ تم میرا شکر کرو۔ یعنی تمہیں صرف اس بات پر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے کہ تم خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہو بلکہ تمہارا یہ کام بھی ہے کہ تم گذشتہ انعامات پر اُس کا شکر ادا کرتے رہو اور تمہارے اعمال اور تمہاری عبادات ان انعامات پر مبنی ہوں جو ہم پہلے تم پر کر چکے ہیں۔

وَلَا تَكْفُرُوْنِ اور ہم نے جو تم پر انعامات نازل کئے ہیں۔ ان کی ناقدری مت کرو۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ عورتوں کی نسبت فرمایا کہ وہ دوزخ میں مردوں کی نسبت زیادہ جائیں گی۔ عورتوں نے پوچھا۔ یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا اِس کی یہ وجہ ہے کہ تم میں ناشکری کا مرض زیادہ پایا جاتا ہے (بخاری کتاب الایمان باب کفران العشیر و کفر دون کفر)۔ ناشکری کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں اُن کو موقعہ اور محل پر استعمال نہ کیا جائے۔ خدا تعالیٰ نے کان اس لئے دیئے ہیں کہ خدائے رحمٰن کی باتیں سُنی جائیں لیکن لوگ ان کو گناہ کی باتیں سننے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ آنکھیں اُن کو اس لئے دی گئی ہیں کہ وہ ان کے ذریعہ علم و عرفان حاصل کریں۔ مگر کوئی ان کے ذریعہ یہ دیکھتا ہے کہ فلاں کے پاس اتنی دولت کیوں ہے؟ اور کوئی کسی اور ناجائز جگہ پر ان کو استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح زبان ان کو اس لئے دی گئی ہے کہ وہ اُس سے اچھی گفتگو کریں۔ اور خدا تعالیٰ کا ذکر کریں مگر اُسے بُری اور ناپسندیدہ باتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً گالیاں دیتے ہیں۔ چغل خوری کرتے ہیں۔ غیبت کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں اور اس طرح خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کرتے ہیں۔ پس فرمایا کہ تم میری نعمتوں کی قدر کرو۔ اور جو انعامات میں نے تم پر کئے ہیں اُن کو عظمت کی نگاہ سے دیکھو اور یہ اقرار کرو کہ ہم ان انعامات کو صحیح طور پر استعمال کریں گے۔ ان کا غلط استعمال کر کے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی بے حرمتی نہیں کریں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ صبر اور دُعا کے ذریعہ سے (اللہ کی) مدد مانگو۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۴﴾

صابروں کے ساتھ (ہوتا) ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلصَّبْرُ صبر کے اصل معنے تو رُکنے کے ہیں۔ مگر اس لفظ کے استعمال کے لحاظ سے اس کے مختلف معانی ہیں۔ چنانچہ اس کے ایک معنے تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنْ اَلَمِ الْبَلْوٰى لِغَيْرِ اللّٰهِ (اقرب)۔ یعنی جب کوئی مصیبت اور ابتلاء وغیرہ انسان کو پہنچے اور اسے تکلیف ہو تو خدا تعالیٰ کے سوا دوسروں کے پاس اس کی شکایت نہ کرنا صبر کہلاتا ہے۔ ہاں اگر وہ خدا تعالیٰ کے حضور اپنی بے کسی کی شکایت کرتا ہے تو یہ صبر کے منافی نہیں۔ چنانچہ لغت کی کتاب اقرب الموارد میں لکھا ہے۔ اِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِيْ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْهُ لَا يُقْدَحُ فِيْ صَبْرِهٖ ۔ جب بندہ خدا تعالیٰ سے اپنی مصیبت کے دور کرنے کے لئے دعا کرتا ہے تو اُس پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ اُس نے بے صبری دکھائی ہے۔

کُلّیاتِ ابی البقاء میں لکھا ہے کہ صبر انسان کی ایک اعلیٰ درجہ کی صفت ہے اور مختلف حالات میں اس کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں۔ اَمَّا فِي الْمُحَارَبَةِ فَشَجَاعَةٌ اگر لڑائی میں انسان استقامت سے کام لے اور مشکلات سے نہ گھبرائے تو اُسے شجاعت کہتے ہیں۔ وَفِيْ اِمْسَاكِ النَّفْسِ عَنِ الْفُضُوْلِ اَيْ عَنْ طَلَبِ مَا يَفْضَلُ عَنْ قَوَامِ الْمَعِيْشَةِ فَقَنَاعَةٌ وَعِفَّةٌ (اقرب) اور اگر ضروریات زندگی سے زائد چیزوں کے متعلق انسان اپنی خواہشات کو ترک کر دے اور نفس کو روک لے تو اُسے قناعت اور عفت کہتے ہیں۔ چونکہ صبر کے اصل معنے رُکنے کے ہوتے ہیں۔ اس لئے محققین لغت نے لکھا ہے کہ اَلصَّبْرُ صَبْرَانِ صَبْرٌ عَلٰى مَا تَهْوٰى وَصَبْرٌ عَلٰى مَا تَكْرَهُ (اقرب)۔ یعنی صبر کی دو قسمیں ہیں۔ جس چیز کی انسان کو خواہش ہو اس سے باز رہنا بھی صبر کہلاتا ہے۔ اور جس چیز کو ناپسند کرتا ہو لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ آجائے۔ اُس پر شکوہ نہ کرنا بھی صبر کہلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہے صبر اصل میں تین قسم کا ہوتا ہے۔ (۱) پہلا صبر تو یہ ہے کہ انسان جزع فزع سے بچے۔ جیسے قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ (لقمان: ۱۸) تجھے جو کچھ تکلیف

پہنچے اس پر تو صبر سے کام لے۔ یعنی جزع فزع نہ کر (۲) دوسرے نیک باتوں پر اپنے آپ کو روک رکھنا۔ یعنی نیکی کو مضبوط پکڑ لینا۔ اِن معنوں میں یہ لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا۔ (الدھر:۲۵) یعنی اپنے رب کے حکم پر قائم رہ اور انسانوں میں سے گنہگار اور ناشکر گذار کی اطاعت نہ کر۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس قدر احکام قرب الٰہی کے حصول کے لئے دیئے گئے ہیں۔ اُن پر استقلال سے قائم رہنا اور اپنے قدم کو پیچھے نہ ہٹانا بھی صبر کہلاتا ہے۔ (۳) تیسرے معنے اس کے بدی سے رکے رہنے کے ہیں۔ ان معنوں میں یہ لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الحجرات:۶) یعنی اگر وہ تجھے بلانے کے گناہ سے باز رہتے اور اس وقت تک انتظار کرتے جب تک کہ تو باہر نکلتا تو یہ ان کے لئے بہت اچھا ہوتا مگر اب بھی وہ اصلاح کر لیں تو بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ زیر تفسیر آیت میں چونکہ کوئی قرینہ نہیں اس لئے یہاں تینوں معنے مراد لئے جائیں گے۔ اور اِس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہر ایک کام کے دو ذرائع ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی اور ایک روحانی اور دونوں ذریعوں کو استعمال کرنے سے کامیابی ہوتی ہے۔ پس تم دونوں ذریعوں کو استعمال کرو۔ یعنی (۱) خدا تعالیٰ کی راہ میں جو تکالیف پہنچیں اُن کو بہادری سے برداشت کرو (۲) جو ذرائع کسی کام کے حصول کے لئے مقرر ہیں۔ اُن کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے میں کوشاں رہو۔ (۳) جو باتیں اِس کام میں روک ہوتی ہوں۔ اُن سے بچنے کی کوشش کرتے رہو۔ دوسرا ذریعہ روحانی بتایا کہ دعا کرو۔ اور عبادت میں لگ جاؤ۔

اَلصَّلٰوۃ صَلٰوۃٌ کے اصل معنے عبادت الٰہی کے ہیں۔ لیکن چونکہ نماز بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ اس لئے نماز کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں۔ (۲) صَلٰوۃٌ کا لفظ دعا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (۳) دین کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں۔ (۴) رحمت کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں۔ (۵) استغفار کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں۔ (۶) حسنِ ثنا کے معنوں میں بھی صلوٰۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ (۷) صلوٰۃ کے معنے درود بھیجنے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب)۔

صَلّٰی سے مشتق ہے اور اس کا وزن فَعْلَةٌ ہے۔ الف واؤ سے منقلب ہے۔ صَلّٰی (يُصَلِّيْ) کے معنے دعا کرنے کے ہیں اور اَلصَّلٰوۃُ کے اصطلاحی معنے عِبَادَةٌ فِيْهَا رُكُوْعٌ وَسُجُوْدٌ کے ہیں یعنی اس مخصوص طریق سے دعا کرنا جس میں رکوع و سجود ہوتے ہیں جس کو ہماری زبان میں نماز کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اور بھی کئی معانی ہیں جو بے تعلق نہیں بلکہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے دوسرے معنے مندرجہ ذیل ہیں اَلرَّحْمَةُ رحمت۔ اَلدِّيْنُ شریعت۔ اَلْاِسْتِغْفَارُ بخشش مانگنا۔ اَلدُّعَاءُ دعا (اقرب)

اَلتَّعْظِیْمُ بڑائی کا اظہار۔ اَلْبَرَکَۃُ برکت (تاج) وَالصَّلٰوۃُ مِنَ اللّٰہِ اَلرَّحْمَۃُ ، وَمِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ اَلْاِسْتِغْفَارُ، وَمِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ الدُّعَاءُ۔ وَمِنَ الطَّیْرِ وَالْھَوَامِّ اَلتَّسْبِیْحُ۔ اور صَلٰوۃ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے رحم کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور جب ملائکہ کیلئے استعمال ہو تو اس وقت اس کے معنے استغفار کے ہوتے ہیں اور جب مومنوں کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے دعا یا نماز کے ہوتے ہیں اور جب پرند اور حشرات کیلئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے تسبیح کرنے کے ہوتے ہیں۔ وَھِیَ لَا تَکُوْنُ اِلَّا فِی الْخَیْرِ بِخِلَافِ الدُّعَاءِ فَاِنَّہٗ یَکُوْنُ فِی الْخَیْرِ وَالشَّرِّ۔ اور لفظ صلٰوۃ صرف نیک دعا کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن لفظ دعا، بد دعا اور نیک دعا دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ صلٰوۃ کے ایک معنے حُسْنُ الثَّنَاءِ مِنَ اللّٰہِ عَلَی الرَّسُوْلِ کے بھی ہیں یعنی جب صَلّٰی فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو اور مفعول آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہو تو اس وقت اس کے معنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کریم کی بہترین تعریف کے ہوتے ہیں۔ (اقرب) وَیُسَمّٰی مَوْضِعُ الْعِبَادَۃِ الصَّلٰوۃُ اور عبادت گاہ کو بھی اَلصَّلٰوۃ کہہ دیتے ہیں (مفردات) پس یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے معنے ہوں گے (۱) نماز کو باجماعت ادا کرتے ہیں (۲) نماز کو اس کی شرائط کے مطابق اور اس کے اوقات میں صحیح طور پر ادا کرتے ہیں (۳) لوگوں کو نماز کی تلقین کر کے مساجد کو بارونق بناتے ہیں (۴) نماز کی محبت اور خواہش لوگوں کے دلوں میں پیدا کرتے ہیں (۵) نماز پر دوام اختیار کرتے ہیں اور اس پر پابندی اختیار کرتے ہیں (۶) نماز کو قائم رکھتے ہیں یعنی گرنے سے بچاتے رہتے اور اس کی حفاظت میں لگے رہتے ہیں۔

تفسیر۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ سے مراد وہی جنگیں ہیں جن کا فتح مکہ کے ساتھ تعلق تھا کیونکہ صبر اور صلٰوۃ کا تعلق تکلیفوں کے وقت سے ہی ہوتا ہے۔ پہلے یہود کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف کے موقعہ پر فرمایا تھا کہ صبر اور صلٰوۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اِس کی مدد مانگو (البقرۃ:۴۶) اب فتح مکہ کے ذکر پر فرماتا ہے کہ جنگ میں تمہیں تکلیفیں تو بے شک ہوں گی اور تمہارے اقرباء بھی شہید ہوں گے لیکن اس تکلیف پر بزدلی نہ دکھانا بلکہ استقلال سے قربانیاں کرتے چلے جانا اور تکالیف کے مواقع پر اپنے خدا سے صبر اور دعا کے ذریعے مدد مانگنا۔

اس آیت میں یہ عظیم الشان مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان کے لئے کسی تکلیف پر رونا یا اس کے دل میں مدد کا احساس پیدا ہونا منع نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور تم اُن کو محسوس بھی کرو گے لیکن مَیں تمہیں اس درد کا علاج یہ بتاتا ہوں کہ صبر اور دعا کو کام میں لاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ قطعی طور پر

کسی تکلیف کو محسوس ہی نہ کرو۔ احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نواسہ فوت ہونے لگا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ بھی روتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میرا دل سخت نہیں بنایا (بخاری کتاب المرضٰی باب عیادۃ الصبیان)۔ غرض درد کا احساس منع نہیں۔

ہاں ہمت ہار کر کام چھوڑ دینا اور جزع فزع کرنا منع ہے۔ اِسی لئے فرمایا کہ تکالیف تو ہوں گی اور تلوار تو چلے گی اور تمہاری گردنیں بھی کٹیں گی لیکن ان پر صبر سے کام لینا اور استقلال سے اپنے کام میں لگے رہنا۔ ہم تمہیں یہ نہیں کہتے کہ تمہیں غم کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک طبعی جذبہ ہے جو روکا نہیں جا سکتا۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ ان قربانیوں میں استقلال سے حصہ لو اور اپنے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آنے دو۔ مگر پھر فرمایا کہ یہ تو دنیوی تدابیر ہیں۔ تمہارا اصل کام یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو۔ اور دعاؤں سے اُس کی مدد چاہو۔ جب تک تم خدا تعالیٰ پر کامل توکل نہیں کرو گے اور اُس سے دعائیں کرنا اپنا معمول نہیں بناؤ گے اُس وقت تک تمہیں فتح حاصل نہیں ہو گی۔ دیکھو ایک نادان اور کم عقل بچہ بھی جب اُسے کوئی ڈراتا ہے تو فوراً اپنی ماں کے پاس بھاگ جاتا ہے اور ماں خواہ کتنی ہی کمزور ہو وہ اس کے پاس جا کر اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتا ہے۔ اِسی طرح ایک مومن پر بھی جب کوئی دشمن حملہ کرتا ہے تو اس کی پناہ صرف خدا تعالیٰ کا ہی وجود ہوتا ہے۔ اسی لئے صلوٰۃ کا تعلق روحانی ہونے کے لحاظ سے خدا تعالیٰ سے ہے۔ اور صبر کا تعلق جسمانی ہونے کے لحاظ سے انسانی تدابیر سے ہے۔ صبر میں جبری طور پر خدا تعالیٰ کی محبت کا اظہار ہوتا ہے اور صلوٰۃ میں عشقیہ طور پر خدا تعالیٰ سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ مشکلات اور مصائب ہم خود پیدا نہیں کرتے بلکہ دشمن مشکلات اور مصائب لاتا ہے۔ اور ہم انہیں برداشت کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو نہیں چھوڑتے لیکن نماز اور دعا طوعی عبادت ہے۔ نماز ہمیں کوئی جبری نہیں پڑھاتا بلکہ ہم خود پڑھتے ہیں۔ پس صبر میں ہم جبری طور پر خدا تعالیٰ کی محبت کا ثبوت دیتے ہیں اور صلوٰۃ میں طوعی طور پر اس کا اظہار کرتے ہیں اور جب یہ دونوں چیزیں مل جاتی ہیں تو محبت کامل ہو جاتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا فیضان جاری ہو جاتا ہے۔

صبر کے جو معنے اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ اُن کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ (۱) اے مومنو! جب تم پر خدا تعالیٰ کی راہ میں مصائب اور مشکلات آئیں تو تم گھبرایا نہ کرو اور نہ اُن پر شکوہ کا اظہار کیا کرو۔ (۲) اے مومنو! جو باتیں خدا تعالیٰ کے قرب میں روک ہیں تم اُن سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہا کرو۔ (۳) اے مومنو! جب تم کو وہ احکام دیئے جائیں جن کے ذریعہ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ تو تم ان پر عمل کرنے میں سستی نہ دکھایا کرو بلکہ استقلال سے اُن پر عمل کیا کرو۔

یہ تین باتیں روحانی مدارج کے حصول کے لئے ممد ہیں تم ان باتوں کو مدِّ نظر رکھو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو جو کام تمہارے سامنے ہیں اُن کے پورا کرنے میں تمہیں کامیابی ہوگی اور تمہارا مقصد تمہیں حاصل ہو جائے گا۔ اسی طرح صلوٰۃ کے معنوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ (۱) اے مومنو! تم نماز کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی مدد حاصل کرو۔ (۲) اے مومنو! تم دعاؤں کے ذریعہ اس کی مدد حاصل کرو۔ (۳) اے مومنو! دین پر استقلال کے ساتھ قائم ہو جانے کے ذریعے سے اس کی مدد حاصل کرو۔ (۴) اے مومنو! تم خدا تعالیٰ کی مخلوق پر رحم اور شفقت کر کے اس کی مدد حاصل کرو۔ (۵) اے مومنو! تم خدا تعالیٰ کے حضور استغفار اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کر کے اس کی مدد حاصل کرو۔ (۶) اے مومنو! تم خدا تعالیٰ کے رسول پر درود بھیج کر اُس کی مدد حاصل کرو۔ گویا یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد کے حصول کے ذرائع ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ تم اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہا کرو۔ یعنی اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ گُر بتایا ہے کہ مدد کس طریق سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ فرماتا ہے وہ ذرائع یہ ہیں کہ **ایک** تو دین کے راستہ میں جو مشکلات اور مصائب پیش آئیں اور جو قربانیاں تمہیں کرنی پڑیں اُن سے گھبرایا نہ کرو۔ **دوسرے** ان امور سے جن سے اللہ تعالیٰ تم کو روکتا ہے رُکے رہو۔ **تیسرے** وہ قربانیاں جو قربِ الٰہی کے حصول کے لئے ضروری ہیں ان کو ترک نہ کرو۔ اور ان پر استقلال اور دوام اختیار کرو۔ **چوتھے** دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری قربانیوں کے بہترین نتائج پیدا کرے اور اُن کو قبول فرماتے ہوئے تمہیں غلبہ بخشے۔ **پانچویں** غرباء سے ہمدردی اور شفقت کا سلوک کرو تا مخلوقِ خدا کو آرام پہنچانے کی وجہ سے خدا تعالیٰ بھی تم سے خوش ہو۔ **چھٹے** خدا تعالیٰ سے اپنے قصوروں کی معافی طلب کرتے رہو۔ **ساتویں** انبیاء پر درود بھیجا کرو۔ کیونکہ اُن کے ذریعے سے ہی تم کو خدا تعالیٰ تک پہنچنے کی توفیق ملی ہے۔ **آٹھویں** خدا تعالیٰ کے دین پر استقلال کے ساتھ قائم رہنے کی کوشش کیا کرو۔ **نویں** عبادت پر مضبوطی سے قائم رہو۔ یہ سب امور خدا تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے بیان فرمائے ہیں۔ پس جو شخص چاہتا ہے کہ اُسے خدا تعالیٰ کی مدد اور نصرت حاصل ہو اس کے لئے اِن نو باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ بندے کا صرف اپنے مونہہ سے خدا تعالیٰ کو یہ کہنا کہ الٰہی میری مدد کر کوئی معنے نہیں رکھتا۔ مدد حاصل کرنے کے لئے پہلے ان ذرائع پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جو شخص گھبرا کر مایوس ہو جاتا ہے اور پھر یہ امید رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے اُس کی مدد کے لئے آسمان سے نازل ہوں گے وہ اُس کی مدد حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص خدا تعالیٰ کے احکام کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ اُمید رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے اس کے لئے نازل ہوں گے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

جو شخص قربانیوں سے ہچکچاتا اور خدا تعالیٰ کی عاید کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص دعا نہیں کرتا اور خدا تعالیٰ کے حضور عاجزانہ طور پر گڑگڑاتا نہیں اور اس کے باوجود اس کی معجزانہ تائید کا امیدوار رہتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص دین کے معاملے میں غیرت سے کام نہیں لیتا اور اس کی ترقی میں مد نہیں ہوتا وہ دشمنوں کے مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص غرباء اور مساکین پر شفقت نہیں کرتا اور اُن کی مشکلات کو دُور کرنے میں ہاتھ نہیں بٹاتا وہ اپنی مشکلات کے وقت خدا تعالیٰ کی تائید حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر درود نہیں بھیجتا۔ اُن کے لئے دعائیں نہیں کرتا اور ان کے احسانات کے شکریہ کا احساس اپنے دل میں نہیں رکھتا وہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص عبادت اور خدمت دین کے لئے اپنی ساری عمر وقف نہیں کرتا۔ وہ قرب الٰہی کے اعلیٰ مدارج پانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ پھر باوجود ان سب باتوں پر عمل کرنے کے جو شخص یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور اپنے عمل پر اِتراتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ لوگ منہ سے تو کہہ دیتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ لیکن یہ نہیں جانتے کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہنے کے ساتھ کن کن باتوں کی ضرورت ہے۔ وہ ڈاکخانہ میں روپے منی آرڈر کرانے کے لئے جاتے ہیں تو منی آرڈر فارم ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب تک منی آرڈر فارم پُر نہیں کیا جائے گا روپیہ پوسٹ نہیں ہوسکتا۔ یا وہ ڈاکخانہ میں خط ڈالنے جاتے ہیں تو اس پر ٹکٹ لگاتے ہیں ورنہ وہ بیرنگ کر دیا جاتا ہے۔ مدرسہ میں داخل ہونے کے وقت وہ فارم پُر کرتے ہیں جو داخلہ کے لئے محکمہ تعلیم کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔ امتحان کے لئے یونیورسٹی کا فارم پُر کرتے ہیں اور اس میں ذرا سی غلطی ہونے سے بھی اُن کا دل دھڑکنے لگ جاتا ہے۔ اور وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں کام خراب نہ ہو جائے۔ مگر خدا تعالیٰ سے بغیر کوئی فارم پُر کرنے کے اور بغیر کسی شرط پر عمل کرنے کے یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ حضور اپنے ملائکہ کی فوج بھیج کر ہماری مدد کیجیئے حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ یہاں بھی ایک فارم کی ضرورت ہے۔ جب تک وہ فارم پُر کر کے اُس پر دستخط نہ کئے جائیں اُس وقت تک خدا تعالیٰ کی نصرت شامل حال نہیں ہوسکتی اور وہ صبر اور صلوٰۃ کا فارم ہے۔ جب تک صبر اور صلوٰۃ کے فارم پر دستخط نہ کرو گے تب تک خدا تعالیٰ کی مدد تمہیں حاصل نہیں ہو سکے گی۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ کے لفظ کو اُڑا دیا ہے۔ اور صرف مَعَ الصّٰبِرِیْنَ کے الفاظ رکھے ہیں۔ مَعَ الْمُصَلِّیْنَ نہیں فرمایا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں صابر کا لفظ اپنے اندر استقلال کے معنے رکھتا ہے اور صابر کا لفظ صرف صبر کا قائم مقام نہیں بلکہ صبر اور صلوٰۃ دونوں کا قائم مقام ہے۔ پس اس کے صرف یہ معنے نہیں کہ

اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ صبر وصلوٰۃ دونوں پر استقلال کے ساتھ قائم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ کیونکہ دعا بھی وہی قبول ہوتی ہے جو استقلال سے کی جائے۔ پس اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے کے یہ معنے ہیں کہ اگر صبر اور صلوٰۃ کے ذرائع کو استقلال سے استعمال کرو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔

اِس آیت میں اُن لوگوں کو نصیحت کی گئی ہے جو کچھ عرصہ تکلیف برداشت کرتے اور یہ کہنے لگے جاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ تو ہماری سُنتا ہی نہیں۔ ہم تو اُسے پکار پکار کر تھک گئے اب دعا کرنے کا کیا فائدہ۔ اور بعض لوگوں کو تو اس قدر ٹھوکر لگتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کے ہی منکر ہو جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ کہہ کر بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اسی کو حاصل ہوگی جو مشکلات کے وقت استقامت دکھائے گا اور صبر اور صلوٰۃ کے ذرائع کو استقلال سے استعمال کرتا چلا جائے گا۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کے متعلق (یہ) مت کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ (وہ مردہ) نہیں بلکہ زندہ

وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

ہیں مگر تم نہیں سمجھتے۔

حل لغات ۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ۔ جب قَالَ کے بعد صلہ کے طور پر لام آئے تو اُس کے معنے خطاب کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب قَالَ لِفُلَانٍ کہیں تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اُس نے فلاں کو کہا۔ اِسی طرح قَالَ لِفُلَانٍ کے یہ بھی معنے ہوتے ہیں کہ اُس کے حق میں کہا۔ پس اس آیت میں دونوں معنے ہیں۔ یہ بھی کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں مارے جاتے ہیں ان کو مردہ مت کہو اور یہ بھی کہ تم اُن کے بارہ میں یہ نہ کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ اس آیت میں اَمْوَاتٌ سے پہلے اور بَلْ کے بعد دونوں جگہ هُمْ محذوف ہے۔ پس عبارت یوں ہوگی هُمْ اَمْوَاتٌ بَلْ هُمْ اَحْيَآءٌ۔

اَمْوَاتٌ ۔ **اَمْوَاتًا** مَيِّتٌ اور مَيْتٌ کی جمع ہے اور مَيِّتٌ اور مَيْتٌ کے معنے ہیں اَلَّذِيْ فَارَقَ الْحَيٰوةَ جو زندگی سے علیحدہ ہو جاوے (اقرب) اور میّت اسے کہتے ہیں جس پر موت وارد ہو اور موت حیات کے مقابل کا لفظ

ہے جو معنی حیات کے ہوں اس کے الٹ معنے موت کے ہوتے ہیں۔

تَشْعُرُوْنَ شَعَرَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔شَعَرَہٗ کے معنے ہیں عَلِمَ بِہٖ اس کو جانا۔ شَعَرَ لِکَذَا فَطِنَ لَہٗ اس کو خوب سمجھ لیا۔ عَقَلَہٗ اس کو جان لیا۔ وَاَحَسَّ بِہٖ اس کو محسوس کیا (اقرب) تاج العروس میں ہے اَلشِّعْرُ ھُوَ الْعِلْمُ بِدَقَائِقِ الْاُمُوْرِ وَقِیْلَ ھُوَ الْاِدْرَاکُ بِالْحَوَاسِ کہ شعر علم کی وہ قسم ہے جس کے ذریعہ سے امور کی باریکیاں معلوم ہو سکیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حواس کے ذریعہ سے کسی امر کو معلوم کر لینا شِعْر کہلاتا ہے۔ پس لَا تَشْعُرُوْنَ کے معنے ہوں گے تم نہیں جانتے۔

تفسیر۔ اِس آیت میں خدا تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو اس لئے زندہ کہا گیا ہے کہ اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جو لوگ مارے جائیں اور اُن کا بدلہ لے لیا جائے اُن کے لئے تو وہ اَحْیَاءٌ کا لفظ استعمال کرتے تھے اور اُن کو زندہ کہتے تھے۔ لیکن جن مقتولوں کا بدلہ نہ لیا جائے وہ انہیں اَمْوَاتٌ یعنی مردے کہا کرتے تھے۔ یہ محاورہ اُن میں اس لئے رائج ہوا کہ عربوں میں یہ مشہور تھا کہ جو شخص مارا جائے اور اس کا بدلہ نہ لیا جائے اُس کی روح اُلّو کی شکل میں آ کر چیختی رہتی ہے اور جب اس کا بدلہ لے لیا جائے تب وہ آرام کرتی ہے۔ اس سے ان میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس مقتول کا بدلہ لے لیا جائے وہ زندہ ہوتا ہے۔ اور جس کا بدلہ نہ لیا جائے وہ مردہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انہی معنوں میں ایک شاعر حارث بن حلزہ نے کہا ہے کہ ؎

اِنْ نَبَشْتُمْ مَا بَیْنَ مِلْحَةَ فَالصَّا ۔۔۔ قِبِ فِیْهِ الْاَمْوَاتُ وَ الْاَحْیَآءُ

(سبعۃ معلقات قصیدہ نمبر ۷)

اس میں شاعر فریق مخالف کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تم بڑے شریف اور معزز ہو مگر ایسا ہرگز نہیں تم ملحہ اور صاقب کے درمیان جہاں ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہوئی تھی جاؤ اور وہاں قبریں کھود کر دیکھو تو اُن میں تمہیں کچھ مردے دکھائی دیں گے اور کچھ زندہ۔ یعنی تم نے اپنی قوم کے مقتولوں کا بدلہ نہیں لیا۔ اس لئے وہ مردہ ہیں مگر ہمارے جو آدمی نکلیں گے وہ بزبان حال بتاتے جائیں گے کہ وہ زندہ ہیں کیونکہ ان کا بدلہ لے لیا گیا ہے۔ اُن میں اس بارہ میں اتنی غیرت تھی کہ اگر کسی مقتول کا بدلہ نہ لیا جاتا تو وہ اُسے حد درجہ کی بے غیرتی سمجھتے تھے کیونکہ ان میں یہ روایت چلی آتی تھی کہ جس مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے اس کی رُوح اُلّو بن کر رات دن چیختی رہتی ہے اور جب اس کا بدلہ لے لیا جائے تب وہ نجات پاتی ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ تم ہمارے باپ دادوں کی قبریں کھود کر دیکھو اور ان سے پوچھو کہ ان کا بدلہ لے لیا گیا ہے یا نہیں ہم نے ان کی بجائے دشمن قبیلہ کے کئی کئی اشخاص مار دیئے

ہیں۔ پس ہمارے باپ دادا مرے نہیں بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اگر اُن میں کچھ لوگ مرے ہوئے نظر آئیں تو ہمارے باپ دادا نہیں ہوں گے بلکہ تمہارے باپ دادا ہوں گے۔ غرض جس مقتول کا بدلہ لے لیا جائے اہل عرب کے محاورہ کے مطابق وہ زندہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ جو مسلمان شہید ہو گئے ہیں تم انہیں مُردہ مت کہو وہ خدا تعالیٰ کے زندہ سپاہی ہیں۔ اور خدا تعالیٰ ان کا ضرور بدلہ لے گا۔ چنانچہ اگر ایک صحابیؓ مارا گیا تو اس کے مقابلہ پر مشرکوں کے پانچ پانچ آدمی مارے گئے۔ اور ہر جنگ میں کفار مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہلاک ہوئے سوائے جنگِ اُحد کے کہ اس میں بہت سے مسلمان مارے گئے تھے مگر اُن کا بدلہ بھی اللہ تعالیٰ نے دوسری جنگوں میں لے لیا۔

دوسرے معنی محاورہ میں اس کے یہ ہوتے ہیں کہ جس شخص کا کام جاری رکھنے والے لوگ پیچھے باقی ہوں اس کی نسبت بھی کہتے ہیں۔ مَامَاتَ کہ وہ مرا نہیں اور مردہ اسے کہتے ہیں جو مرے اور اس کا کوئی اچھا اور نیک قائم مقام نہ ہو۔ چنانچہ عبدالملک بادشاہ نے زہری کے ایک مدرسہ کا معائنہ کیا تو اس مدرسہ کے طلباء میں اصمعی بھی تھے جو بہت بڑے مشہور نحوی گذرے ہیں۔ بادشاہ نے اصمعی کا امتحان لیا اور اُس سے کوئی سوال پوچھا تو اصمعی نے اس کا نہایت معقول جواب دیا۔ بادشاہ نے اس کا جواب سن کر خوش ہو کر زہری سے کہا کہ مَامَاتَ مَنْ خَلَفَ مِثْلَكَ کہ وہ شخص نہیں مرا جس نے ایسے لوگ پیچھے چھوڑے ہوں جیسا کہ تو نے چھوڑے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ یہ لوگ مردہ نہیں کہلا سکتے کیونکہ جس کام کے لئے انہوں نے جان دی ہے اس کے چلانے والے لوگ موجود ہیں اور ایک کے مرنے پر دو اس کی جگہ لینے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ پس ان کے متعلق یہ نہ کہو کہ وہ مردہ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اچھے قائم مقام پیدا کر دیئے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنی تعداد میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ مردہ تو وہ ہوتا ہے جس کا بعد میں کوئی اچھا قائم مقام نہ ہو مگر ان کے تو بہت سے قائم مقام پیدا ہو گئے ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا کہ ہم ان میں سے ایک ایک کی جگہ کئی کئی قائم مقام پیدا کرتے چلے جائیں گے اور وہ قوم کبھی مرتی نہیں جس کے افراد اپنے شہداء کی جگہ لیتے چلے جائیں جو قوم اپنے قائم مقام پیدا کرتی چلی جاتی ہے وہ خواہ کتنی بھی چھوٹی ہو اسے کوئی مار نہیں سکتا۔ پس فرماتا ہے کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مسلمان مارے گئے ہیں مسلمان مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اگر ان میں سے ایک مرتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اگر جنگ بدر میں کچھ مسلمان مارے گئے تو اُحد میں اس سے زیادہ کھڑے ہو گئے۔ اُحد میں کچھ تکلیف پہنچی اور کچھ مسلمان مارے گئے تو غزوۂ خندق میں اس سے زیادہ کھڑے ہو گئے۔ اور غزوۂ خندق کے مقابلہ میں فتح مکہ کے موقعہ پر زیادہ لوگ آئے اور اگر فتح مکہ

کے موقعہ پر ان کو کچھ نقصان پہنچا تو جنگ تبوک میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس سے کہیں زیادہ تعداد لے گئے۔ غرض ہر قدم پر پہلے سے زیادہ قربانی کرنے والے لوگ اُن میں موجود ہوتے تھے۔ اور جو قوم قربانی کے اس مقام پر پہنچ جاتی ہے اُسے کوئی تباہ نہیں کر سکتا اور ایسی قوم وہی ہوتی ہے جسے خدا تعالیٰ خود کھڑا کرتا ہے۔

تیسرے معنے محاورہ میں اس کے یہ ہوتے ہیں کہ وہ رنج و غم سے آزاد ہیں۔ یعنی جس کا آخری حال یہ ہوا کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا گیا۔ اُسے اگلے جہان میں کیا دُکھ پہنچنا ہے۔ پس چونکہ وہ خوش و خرم ہیں اور اس زندگی سے اعلیٰ زندگی پا چکے ہیں اس لئے ان کو مردہ نہ کہو۔ کیونکہ موت غم کی حالت پر دلالت کرتی ہے ورنہ قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد زندگی تو کافر و مومن سب کو ملے گی پس اُن کو مردہ نہ کہنے سے یہ منشاء ہے کہ مردہ کہنے میں دُکھ کا مفہوم پایا جاتا ہے حالانکہ وہ سُکھ میں ہیں اور اُن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے انعامات مل رہے ہیں پھر انہیں مردہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

چوتھے معنے اس کے یہ ہیں کہ شہید کو ایک اعلیٰ حیات مرنے کے بعد ہی مل جاتی ہے جبکہ دوسرے لوگوں کو عرصہ تک ایک درمیانی حالت میں رہنا پڑتا ہے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہید تین دن کے اندر اندر زندہ ہو جاتا ہے اور اس کمال کو حاصل کر لیتا ہے جسے دوسرا شخص ایک لمبے عرصے میں حاصل کرتا ہے۔ پس فرماتا ہے ان لوگوں نے مر کر فوراً وہ زندگی حاصل کر لی ہے جس میں رُوح کو کمال حاصل ہو جاتا ہے ورنہ عام زندگی میں تو سب لوگ شریک ہوتے ہیں حتیٰ کہ ابوجہل کو بھی وہ زندگی حاصل ہو گئی اگر وہ زندگی اُسے حاصل نہیں تو وہ جہنم میں کیسے جائے گا۔ پس زندگی تو مومن اور کافر دونوں کو حاصل ہوگی۔ لیکن شہید چونکہ خدا تعالیٰ کی خاطر اپنی زندگی دے دیتا ہے۔ اس لئے اُسے مرنے کے بعد ہی ایک اعلیٰ حیات مل جاتی ہے۔

پھر اس آیت میں شہید کو زندہ قرار دینے کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے میں مومن کو صرف یہی خدشہ ہوتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو اعمال صالحہ سے محروم رہ جاؤں گا۔ مثلاً ایک شخص کی عمر چالیس سال ہے۔ اگر ساٹھ سال تک وہ اور زندہ رہتا تو اس عرصہ میں وہ اور بہت سی نیکیاں کر سکتا تھا۔ پس موت کے راستہ میں صرف یہی ایک خیال اس کے لئے روک بن سکتا ہے ورنہ اگر وہ صحیح طور پر آخرت کو مقدم کرتا ہے تو کوئی دنیوی خیال اس کے راستہ میں روک بن ہی نہیں سکتا۔ یہی ایک خیال ہے جو اُسے جان دینے سے روک سکتا ہے کہ اتنی مدت کی نمازوں، روزوں، جہاد اور تبلیغ سے محروم رہ جاؤں گا۔ اس شبہ کی معقولیت کو اللہ تعالیٰ نے بھی تسلیم کیا ہے اور پھر اس کا جواب بھی دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ۔ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے

والوں کو مُردہ مت کہو وہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں۔یعنی شہید کے اعمال کبھی ختم نہیں ہو سکتے وہ زندہ ہے اور اس کے اعمال ہمیشہ بڑھتے رہتے ہیں۔اس نے خدا کے لئے اپنی جان قربان کردی اور خدا نے نہ چاہا کہ اُس کے اعمال ختم ہو جائیں۔کوئی دن نہیں گذرتا کہ تم نمازیں پڑھو اور ان کا ثواب تمہارے نام لکھا جائے اور شہید اُن سے محروم رہے۔کوئی رمضان نہیں گذرتا کہ تم اُس کے روزے رکھو اور اُن کا ثواب تمہارے نام لکھا جائے اور شہید اس سے محروم رہے۔کوئی حج نہیں کہ تم تکلیف اٹھا کر اس کا ثواب حاصل کرو اور شہید اس ثواب سے محروم رہے۔غرض وہ لوگ وہی برکتیں حاصل کر رہے ہیں جو تم کر رہے ہو اور اس طرح خدا تعالیٰ کے قرب میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں جس طرح تم بڑھتے جا رہے ہو۔پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فلسفۂ موت وحیات پر نہایت لطیف رنگ میں روشنی ڈالی ہے۔اور بتایا ہے کہ شہادت کا مقام حاصل کرنے والوں کو دائمی حیات حاصل ہوتی ہے۔چنانچہ دیکھ لو! جس دن حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کی فوجوں نے مارا ہوگا۔وہ کس قدر خوش ہوئی ہوں گی اور انہوں نے کس مسرت سے کہا ہوگا کہ لو یہ قصّہ ختم ہو گیا۔مگر کیا واقعہ میں وہ قصہ ختم ہو گیا؟ دنیا دیکھ رہی ہے کہ امام حسینؓ آج بھی زندہ ہیں۔مگر یزید کو اس وقت بھی مردہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے رستہ میں قربان ہوتا ہے تو اس کا خون رائیگاں نہیں جاتا بلکہ اس کی جگہ اللہ تعالیٰ ایک قوم لاتا اور اپنے سلسلہ میں داخل کرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں تم انہیں مردہ مت کہو کیونکہ وہ زندہ ہیں۔خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کو زندہ اس لئے بھی کہا کہ جب ایک شخص کی جگہ دس کھڑے ہو گئے تو وہ مرا کہاں۔اور جب وہ مرا نہیں تو اُسے مردہ کہنا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ پس اللہ تعالیٰ کے مقربین اور اس کی راہ میں شہید ہونے والے کبھی نہیں مرتے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر لٹکائے گئے اور پھر وہ زندہ ہی صلیب سے اُتارے گئے۔گو جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے بعض نے یہ بھی سمجھا کہ آپ مر گئے ہیں (النساء:۱۵۸)۔مگر آپ کو صلیب پر لٹکانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ اس صلیب پر لٹکانے کے جرم میں آج بھی جب کہ اس واقعہ پر انیس سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے یہود صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں۔حالانکہ پچاس ساٹھ سال کے بعد لوگ اپنے دادوں پڑدادوں کا نام تک بھول جاتے ہیں۔بیسیوں آدمی ہیں جو مجھ سے ملتے ہیں اور میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ کے دادا کا کیا نام تھا تو وہ بتا نہیں سکتے اور کہتے ہیں پتہ نہیں کیا نام تھا اور اگر دادا کا نام لوگ جانتے بھی ہوں تو سو سال پہلے کے آباء کو تو لاکھوں کروڑوں میں سے کوئی ایک جانتا ہے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مارنے کی کوشش پر انیس سو سال گذر گئے اور آج تک یہودیوں کو پھانسیاں مل رہی ہیں۔

اسی طرح مکہ کے جن اکابر نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مارنا چاہا۔کیا آج دنیا میں ان لوگوں کا کوئی نام لیوا ہے؟ اُحد کے مقام پر ابوسفیان نے آواز دی تھی اور کہا تھا کیا تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے؟ اور جب اس کا جواب نہ ملا تو اس نے کہا ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مار ڈالا ہے۔ پھر اس نے آواز دی۔کیا تم میں ابوبکرؓ ہے؟ اور جب اس کا بھی جواب نہ ملا تو اس نے کہا ہم نے ابوبکرؓ کو بھی مار ڈالا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کیا تم میں عمرؓ ہے؟ جب اس کا بھی جواب نہ ملا تو اس نے کہا ہم نے عمرؓ کو بھی مار ڈالا ہے۔(بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ احد) لیکن آج جاؤ اور دنیا کے کناروں پر اس آواز دینے والے کے ہمنوا کفار کے سردار ابوجہل کو بلاؤ اور آواز دو۔کہ کیا تم میں ابوجہل ہے؟ تو تم دیکھو گے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر تو کروڑوں آوازیں بلند ہونا شروع ہو جائیں گی اور ساری دنیا بول اُٹھے گی کہ ہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود ہیں کیونکہ آپ کی نمائندگی کا شرف ہمیں حاصل ہے۔لیکن ابوجہل کو بلانے پر تمہیں کسی گوشہ سے بھی آواز اٹھتی سنائی نہیں دے گی۔ابوجہل کی اولاد آج بھی دنیا میں موجود ہے مگر کسی کو جرأت نہیں کہ وہ یہ کہہ سکے کہ میں ابوجہل کی اولاد میں سے ہوں۔شاید عتبہ اور شیبہ کی اولاد بھی آج دنیا میں موجود ہو۔مگر کیا کوئی کہتا ہے کہ میں عتبہ اور شیبہ کی اولاد ہوں۔پس خدا تعالیٰ کی راہ میں مارے جانے والے کبھی نہیں مرتے بلکہ وہ قیامت تک زندہ رہتے ہیں اور آئندہ نسلیں ان کا نام لے لے کر ان کے لئے دعائیں کرتی ہیں ان کی خوبیوں کو یاد رکھتی ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی ہیں۔اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ کے متعلق مفسرین سے جو میں اختلاف رکھتا ہوں اس میں میں حق پر ہوں۔اگر وہاں فتح مکہ مراد نہ لی جائے بلکہ تحویل قبلہ مراد لیں تو اس آیت کا یہاں کوئی تعلق ہی معلوم نہیں ہوتا۔نماز اور قبلہ کے ذکر میں شہداء کا ذکر کیسے آ گیا؟ جنگ کے ساتھ شہداء کا ذکر قابلِ تسلیم بھی ہے لیکن تحویل قبلہ کے ساتھ اس کا ذکر بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔پس یہ آیت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ پہلی آیت **وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ** سے مُراد فتح مکہ ہی ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اگر فتح مکہ کی غرض سے تمہیں لڑائیاں کرنی پڑیں تو گھبرانا نہیں کیونکہ اس میں تمہاری زندگی ہے اور جو لوگ مارے جائیں ان کو مردہ مت کہو۔کیونکہ وہ زندہ ہیں اور جو لوگ اپنی نادانی سے اُن کو مردہ کہتے ہیں ان کے نفس میں اتنی حِس ہی نہیں کہ وہ اس کی اہمیت کو محسوس کریں اس میں ان معترضین کا بھی جواب ہے جو کہتے ہیں کہ لڑائیوں کی اور اپنی جانوں کو قربان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو فرماتا ہے کہ تمہاری آنکھیں اس بینائی سے جو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو عطا کی ہے محروم ہیں۔تم کو کیا معلوم کہ اسلام کی فتح کی بنیاد انہی لوگوں کے ہاتھ سے رکھی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جاتے ہیں۔ہاں!

مارے جانے والے اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ ہمارے شہید ہونے سے اسلام کو کیا فائدہ ہوگا۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت جابر بن عبد اللہؓ کو دیکھا کہ وہ بہت افسردہ اور غمگین کھڑے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم کیوں غمگین ہو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے والد اُحد کی جنگ میں مارے گئے ہیں اور انہوں نے اپنے پیچھے بہت بڑا عیال اور قرضہ چھوڑا ہے اس لئے میں افسردہ ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تمہیں خوشخبری نہ دوں کہ موت کے بعد تمہارے والد کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جب زندہ ہو کر حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے خوش ہو کر بالمشافہ کلام کیا اور فرمایا۔ اے میرے بندے! تو مجھ سے جو کچھ مانگنا چاہتا ہے مانگ میں تجھے دوں گا۔ انہوں نے عرض کیا حضور میری صرف اتنی ہی خواہش ہے کہ میں پھر زندہ ہو کر دنیا میں جاؤں اور آپ کی راہ میں مارا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ایسا کر تو سکتا ہوں مگر میں یہ قانون بنا چکا ہوں کہ جو ایک دفعہ مر جائے اس کو دنیا میں واپس نہیں بھیجوں گا۔ (ترمذی کتاب التفسیر سورۃ آل عمران)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو سچا ایمان لاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارا مرنا قوم کو زندہ کرنے کا موجب ہوگا اور آخرت میں بھی ہمارے لئے بہت بڑے ثواب کا موجب ہوگا اس لئے وہ موت کو کوئی خوف والی چیز نہیں سمجھتے۔ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دے کر بھی زندہ ہوتے ہیں اور جانیں نہ دینے والے زندہ رہ کر بھی مردہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ڈپٹی عبد اللہ آتھم کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو انذاری پیشگوئی فرمائی تھی جب اس کی میعاد گذر گئی اور آتھم نہ مرا تو ظاہر بین لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مرزا صاحب کی پیشگوئی جھوٹی نکلی۔ ایک دفعہ نواب صاحب بہاولپور کے دربار میں بھی بعض لوگوں نے ہنسی اڑانی شروع کر دی کہ مرزا صاحب کی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی اور آتھم ابھی تک زندہ ہے۔ اُس وقت دربار میں خواجہ غلام فرید صاحب چاچڑاں والے بھی بیٹھے ہوئے تھے جن کے نواب صاحب مرید تھے۔ باتوں باتوں میں نواب صاحب کے مونہہ سے بھی یہ فقرہ نکل گیا کہ ہاں! میرزا صاحب کی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ اس پر خواجہ غلام فرید صاحب جوش میں آ گئے اور انہوں نے بڑے جلال سے فرمایا کہ کون کہتا ہے آتھم زندہ ہے مجھے تو اس کی لاش نظر آ رہی ہے (اشارات فریدی جلد سوم صفحہ ۱۵) اس پر نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ تو بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر زندہ معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً مردہ ہوتے ہیں۔ اور بعض مردہ نظر آتے ہیں لیکن حقیقتاً زندہ ہوتے ہیں۔ جو لوگ خدا کی راہ میں جان دیتے ہیں وہ درحقیقت زندہ ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ زندہ ہوتے ہیں ان میں سے ہزاروں روحانی نگاہ رکھنے والوں کو مردہ دکھائی

دیتے ہیں۔ کسی بزرگ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قبرستان میں رہتے تھے ایک دفعہ کسی نے ان سے کہا کہ آپ زندوں کو چھوڑ کر قبرستان میں کیوں آ گئے ہیں۔ انہوں نے کہا مجھے تو شہر میں سب مردے ہی مردے نظر آتے ہیں اور یہاں مجھے زندہ لوگ دکھائی دیتے ہیں (تذکرۃ الاولیاء از حضرت فرید الدین عطّار۔ ابراہیم ادھم)۔ پس رُوحانی مردوں اور رُوحانی زندوں کو پہچاننا ہر ایک کا کام نہیں۔ مگر اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ایک ظاہری علامت ایسی بتا دی ہے جس سے روحانی مردوں اور زندوں کو پہچاننے میں بڑی حد تک آسانی ہو جاتی ہے۔

وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ شعور وہ علم ہوتا ہے جو انسان کے اندر کی طرف سے باہر کو آتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے کوئی بات سن کر ایک نتیجہ قائم کرے تو وہ شعور نہیں کہلائے گا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں نے شعور حاصل کر لیا۔ بلکہ یہ کہے گا کہ مجھے علم ہو گیا۔ لیکن اگر اس کے نفس کے اندر سے وہ بات پیدا ہو تو وہ کہے گا مجھے فلاں بات کا شعور ہوا۔ چنانچہ جب ایک بچہ بالغ ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ شعور کی عمر تک پہنچ گیا حالانکہ اس کو علم پہلے بھی حاصل ہوتا ہے۔ بالوں کو شعار اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اندر سے باہر کی طرف آتے ہیں اور شعار اس لباس کو کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ چمٹا ہوا ہوتا ہے اور شعر کو بھی اسی لئے شعر کہتے ہیں کہ اس کے الفاظ اندر سے باہر آتے ہیں اور اس کا مضمون ایسا ہوتا ہے جو انسان کے اندرونی احساسات کا ترجمان ہوتا ہے اور اُسے پڑھ کر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ بات تو میرے اندر بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ غالب اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ باتیں کہ شہداء کو ایک اعلیٰ درجہ کی حیات حاصل ہے۔ یا ایک ایک شہید کی جگہ لینے کے لئے پچاس پچاس اور سو سو آدمی آئیں گے یا وہ رنج و غم سے کلی طور پر آزاد ہیں۔ یا ان کے خون رائیگاں نہیں جائیں گے انسانی شعور سے تعلق رکھتی ہیں اگر کوئی شخص فطرتِ صحیحہ پر غور کرنے کا عادی ہو تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز بھی قربانی کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ ماں جب تک اپنی جان کی قربانی پیش نہیں کرتی اُسے بچہ حاصل نہیں ہوتا۔ دانہ جب تک خاک میں مل کر اپنی جان کو نہیں کھوتا وہ ایک سے سات سو دانوں میں تبدیل نہیں ہوتا۔ اسی طرح کوئی قوم زندہ نہیں ہو سکتی جب تک اس کے افراد جانوں کو ایک بے حقیقت شے سمجھ کر اُسے قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار نہ ہوں اور کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے افراد کے دلوں میں اپنے شہداء کا پورا احترام نہ ہو۔ یہ ایک فطرتی آواز ہے جو شعور کے کانوں سے سنی جا سکتی ہے مگر جن لوگوں کو شعور حاصل نہیں۔ وہ بات بات پر اعتراض کرتے رہتے ہیں اور جب بھی کسی مالی یا جانی قربانی کا مطالبہ کیا جائے ان کے قدم لڑکھڑانے

لگ جاتے ہیں۔ اور وہ ان لوگوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں جو اپنے آپ کو قربانیوں کی آگ میں جھونکنے کے لئے آگے نکل آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو نصیحت کرتا ہے کہ تم اپنے شعور سے کام لو اور شہداء کو مردہ کہہ کر ان کی بے حرمتی مت کرو۔ وہ مردہ نہیں بلکہ حقیقتاً وہی زندہ ہیں۔ کیونکہ تاریخ ان کے نام کو زندہ رکھے گی اور آئندہ آنے والی نسلیں انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گی اور ان کے کارناموں کو یاد رکھیں گی اور ہمیشہ ان کی بلندی درجات اور مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دُعائیں کرتی رہیں گی۔ تم اُسے زندہ سمجھتے ہو جو جسد عنصری کے ساتھ زندہ ہو حالانکہ زندہ وہ ہے جس نے مر کر اپنی قوم کو زندہ کر دیا۔ اگر تمہیں شہداء بھی مُردہ نظر آتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تمہارا شعور ناقص ہے تم اس کی اصلاح کرو اور زندگی اور موت کے سلسلہ کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ

اور ہم تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک (سے) اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی کے ذریعہ (سے) ضرور آزمائیں

الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ﴿۱۵۶﴾

گے اور (اے رسول!) تو (ان) صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنادے۔

حلّ لُغات ۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بَلَاءٌ کسی کے خیر اور شر کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور یہ ظاہر کرنا تین اغراض کے لئے ہوتا ہے۔ **اول** اپنا علم بڑھانے کے لئے جیسے اُستاد اپنے شاگرد کا اس غرض کے لئے امتحان لیتا ہے کہ اُسے معلوم ہو کہ طالب علم نے اپنا سبق یاد کیا ہے یا نہیں۔ **دوم** اس لئے کہ جس کو ابتلاء میں ڈالا گیا ہے اس کو معلوم ہو جائے کہ اس کی کیسی حالت ہے کیونکہ عام لوگ خود بھی نہیں جانتے کہ فلاں بات ہم میں ہے یا نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ منافقوں کے متعلق فرماتا ہے۔ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (البقرۃ:۱۰) یعنی منافق فسادی ہیں مگر وہ اس امر کو سمجھتے نہیں کہ ہم فساد کر رہے ہیں۔ **سوم**۔ اس لئے کہ دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ اس شخص کی ایمانی حالت کیسی ہے؟ یہ مثال اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ سے سوال کیا تو اس کی غرض یہ تھی کہ فرشتوں کو معلوم ہو کہ آدمؑ میں کیا کیا طاقتیں ہیں؟ خدا تعالیٰ چونکہ علیم و خبیر ہے اس لئے جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوتا ہے تو پچھلے دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نہ کہ پہلے میں۔ اگر ابتلاء نہ آئے تو انسان ایمان میں ترقی نہ کر سکے۔ اور اسے معلوم ہی نہ ہو کہ اس کے ایمان کی کیا حالت ہے؟

بَلَوْتُ الرَّجُلَ (بَلَاءً وَبَلْوًا) وَابْتَلَيْتُهٗ کے معنے ہیں اِخْتَبَرْتُهٗ میں نے اس کا امتحان لیا اور اِبْتَلَاهُ اللّٰهُ کے معنے ہیں اِمْتَحَنَهٗ اللہ نے اس کا امتحان لیا۔ اور اس سے اِسْم اَلْبَلْوٰی۔ اَلْبَلْوَةُ اَلْبَلِيَّةُ اور اَلْبَلَاءُ آتا ہے یعنی امتحان۔ نیز لکھا ہے اَلْبَلَاءُ يَكُوْنُ فِي الْخَيْرِ وَ الشَّرِّ کہ بلاء کے اندر دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ بلائے خیر بھی اور بلائے شر بھی۔ چنانچہ کہتے ہیں اِبْتَلَيْتُهٗ بَلَاءً حَسَنًا وَّبَلَاءً سَيِّئًا کہ میں نے اس کا اچھا امتحان لیا اور بُرا امتحان لیا۔ پھر لکھا ہے وَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَبْلِي الْعَبْدَ بَلَاءً حَسَنًا وَيَبْلِيْهِ بَلَاءً سَيِّئًا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کا امتحان ہر دو طرح سے لیتا ہے بلاءِ انعام سے بھی اور بلاءِ تکلیف سے بھی۔ نیز اَلْبَلَاءُ کے معنے انعام کے بھی لکھے ہیں (لسان) اَلْبَلَاءُ کے اصل معنے امتحان کے ہوتے ہیں۔ لیکن امتحان چونکہ کبھی انعام کے ذریعہ سے اور کبھی سزا کے ذریعہ سے لیا جاتا ہے اس لئے بَلَاء کے اندر دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ انعام کا امتحان بھی اور تکلیف کا امتحان بھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ (الاعراف:۱۶۹)

ثَمَرَات اس کے معنے پھلوں کے بھی ہوتے ہیں اور کوششوں کے نتائج کے بھی۔ (اقرب)

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ بشارت ایسی خبر کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے چہرہ پر اثر پڑے۔ خواہ وہ خوشی کی خبر ہو یا غم کی۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ قسم کے ابتلاؤں کا ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ ہم اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ان ابتلاؤں میں سے گذرے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔ ایک ابتلاء تو یہ ہوگا کہ دشمنوں کے حملوں کا خوف تمہیں لاحق ہوگا۔ ساری قومیں تمہارے خلاف کھڑی ہو جائیں گی۔ اور تم پر حملہ کریں گی۔ حکومتیں تم سے ناراض ہو جائیں گی۔ اور تمہیں مٹانے کی کوشش کریں گی۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن سے بزدل لوگ ڈر جاتے ہیں اور کہتے ہیں خدا جانے اب کیا ہوگا؟ اور بہت سے لوگوں کے حوصلے اس خوف کی وجہ سے پست ہو جاتے ہیں ان کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ پبلک اور حکومت نے ہمارے خلاف جتھہ بنا لیا ہے یا پنچائت نے ہمارے خلاف فیصلہ کر دیا ہے۔

پھر اس سے ترقی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھوک کے ذریعے مومنوں کے ثباتِ قدم کا امتحان لیتا ہے۔ بھوک کی تکلیف سے یہ مراد ہے کہ جب خدا تعالیٰ کے مامور کی آواز پر ایک گروہ جمع ہو جاتا ہے تو لوگ ان کا بائیکاٹ کر دیتے ہیں۔ ملازمتوں سے برخواست کر دیتے ہیں۔ دوکانوں سے سودا نہیں دیتے۔ پیشہ وروں سے کام لینا بند کر دیتے ہیں گویا پہلے تو صرف دھمکیاں دیتے ہیں جن کی وجہ سے خوف لاحق ہوتا ہے کہ وہ کہیں نقصان نہ پہنچا دیں مگر دوسرے قدم پر

وہ عملی رنگ میں بھوک اور افلاس کے سامان پیدا کر دیتے ہیں مثلاً یہ کہ ان کو کوئی سودا نہیں دینا۔ ان کے پاس غلہ نہیں بیچنا جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا تو ہر قسم کے کھانے پینے کی چیزیں روک لی گئیں اور یہ بائیکاٹ کا سلسلہ ایک لمبے عرصے تک جاری رہا (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، خبر الصحیفۃ)۔

پھر فرماتا ہے کہ ان مصائب کا سلسلہ یہیں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ تمہارے مالوں کا لُوٹنا بھی جائز قرار دے دیا جائے گا۔ گویا پہلے تو اپنے پاس سے مال و اسباب اور سودا اور غلہ وغیرہ دینا بند کیا جائے گا اور پھر مومنوں کے پاس جو کچھ اندوختہ ہوگا اُسے بھی لُوٹنا جائز قرار دے دیا جائے گا۔ لیکن جب اس سے بھی کچھ نہیں بنتا تو پھر وہ مومنوں کی جانوں پر حملہ شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ جان دینے سے بھی باز نہیں آتے تو ان کی اولادوں پر حملے کرنے لگ جاتے ہیں۔ مَیں نے دیکھا ہے ہمارے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر بعض خبیث الطبع لوگ ایسے بھی آتے ہیں جو احمدیوں کے بچے اُٹھا کر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اس ذریعہ سے جماعت کو دکھ پہنچائیں۔ اسی طرح ثمرات کے نقصان سے یہ بھی مراد ہے کہ دشمن ان کی کوششوں میں رخنہ ڈالیں گے اور انہیں مختلف قسم کے منافع سے محروم کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ ادنیٰ درجہ کے مومنوں پر جو ابتلاء آتے ہیں وہ تو اس لئے آتے ہیں کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کی ایمانی حالت کیسی ہے؟ اور جو اعلیٰ درجہ کے مومنوں پر آتے ہیں وہ اس لئے آتے ہیں کہ دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ ان کی کیا حالت ہے؟ عام طور پر لوگ اپنے متعلق خیال کرتے ہیں کہ انہیں ایمان میں ثباتِ قدم حاصل ہے مگر موقعہ آنے پر ان سے کمزوری ظاہر ہو جاتی ہے اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے اندر یہ کمزوری ہے اور وہ اس کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ابتلاء آتا ہے تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر فلاں نقص بھی موجود ہے اور وہ اُسے دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ درجہ کے لوگوں پر اس لئے ابتلاء لائے جاتے ہیں تا کہ دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ یہ کیسے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ کوئی مصیبت ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کرتی۔ غرض بتایا کہ ہم تمہارے اندرونہ کو ظاہر کرنے کے لئے پانچ قسم کے ابتلاء تم پر وارد کریں گے۔ جن میں سے ایک خوف ہوگا جو بیرونی دکھ کا نام ہے۔ دوسرا ابتلاء بھوک کا ہوگا۔ جو اندرونی تکلیف ہے۔ گویا بعض کو بیرونی دکھوں اور تکالیف کے ذریعہ اور بعض کو اندرونی تکلیفوں کے ذریعہ سے ہم آزمائیں گے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لڑائی کے لئے تو تیار ہو جاتے ہیں مگر بھوک کو برداشت نہیں کر سکتے۔ فوجوں میں سپاہی لڑتے ہیں مگر چونکہ وہ بھوک کو برداشت نہیں کر سکتے اس لئے انہیں چنے وغیرہ دیئے جاتے

ہیں۔ مگر مومن کی یہ حالت نہیں ہوتی وہ خدا کے لئے بھوکا رہنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہؓ کو باہر بھیجا تو ان میں سے کسی نے بھی یہ نہ پوچھا کہ ہم کھائیں گے کیا۔ چنانچہ وہ پتے کھا کر گذارہ کرتے تھے۔ اسی طرح ایک دفعہ انہوں نے کھجوروں کی گٹھلیاں کھا کر گذارہ کیا (نسائی کتاب الصید والذبائح باب میتة البحر)۔ پس فرمایا ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ تم بہادر ہو یا نہیں اور یہ بھی کہ تم بھوک برداشت کرتے ہو یا نہیں۔

پھر بعض لوگ بھوک اور خوف تو برداشت کر لیتے ہیں مگر مال کے خطرہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ بعض مال کے خطرہ کو برداشت کر لیتے ہیں مگر جان کے خطرہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ پس فرماتا ہے تمہیں مالی اور جانی نقصانات بھی برداشت کرنے پڑیں گے اور بعض دفعہ اپنی کوششوں کے نتائج سے بھی محروم رہنا پڑے گا۔ ثمرات کے کم ہونے کی مثال اُحد کی جنگ ہے کہ وہ کفار سے لڑے بھی اور شہید بھی ہوئے مگر انہیں اس کا ثمرہ نہ ملا۔ اسی طرح ثمرات کے نقصان میں تجارت اور صنعت وحرفت وغیرہ کی بربادی بھی شامل ہے۔ جو جنگ کا ایک لازمی نتیجہ ہوتی ہے غرض بتایا کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوگا کہ تم کام کرو گے مگر اس کے فوائد تمہاری امیدوں کے مطابق نہیں نکلیں گے۔ مگر فرمایا وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ وہ لوگ جو ان تمام ابتلاؤں کو برداشت کر لیں گے اور ایمان پر مضبوطی سے قائم رہیں گے۔ ان کو کوئی ڈر نہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر لوگ ہمیں ڈراتے ہیں تو بے شک ڈرائیں۔ اگر ہمارا مقاطعہ کرتے ہیں تو بے شک کریں۔ اگر وہ ہمیں سودا سلف نہیں دیتے تو بے شک نہ دیں ہم تو خدا تعالیٰ کے رستے میں قربانیاں کرتے چلے جائیں گے۔ اسی طرح اگر وہ ہمارے مال لُوٹنے پر آئے ہیں تو بے شک لُوٹ لیں اور پھر جب وہ ان کی جانوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم ہمیں قتل کر کے بھی دیکھ لو اور جب وہ ان کی اولادوں پر حملہ کر کے ان کی تباہی کا سامان پیدا کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اچھا تم یہ کام بھی کر کے دیکھ لو۔ ہمیں تمہارے ان کاموں کی بھی پروا نہیں۔ غرض ابتداء سے انتہا تک وہ اُن کے ہر حملہ کے مقابلہ میں قائم رہتے ہیں اور یہی کہتے رہتے ہیں کہ جو کچھ تمہاری مرضی ہے کر کے دیکھ لو۔ تم ہمیں صداقت سے منحرف نہیں کر سکتے۔ جب وہ پانچوں قسم کے ابتلاؤں سے پیچھے نہیں ہٹتے بلکہ ان میں ثابت قدم رہتے ہیں اور استقلال سے ان کو برداشت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں بشارت دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ مبارک ہو! تمہارے ایمان کی پختگی ثابت ہوگئی۔ تم امتحان میں پاس ہو گئے اب تم اگلی جماعت کی تیاری کرو۔

صبر سے یہ مراد نہیں کہ انسان کو غم نہ ہو بلکہ صبر سے مراد یہ ہے کہ ایسا غم نہ ہو جس سے حواس جاتے رہیں اور عقل اور قوتِ عملیہ باطل ہو جائے۔ یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی فطرت انسانی کے مطابق تعلیم ہے۔ نہ غم سے روکا کہ وہ فطرتی امر

ہے۔ نہ جزع فزع اور کام چھوڑ دینے کی اجازت دی کہ یہ بزدلی اور کم ہمتی کی علامت ہے۔

اس آیت سے بھی پتہ لگتا ہے کہ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں قبلہ کی طرف منہ کرنے کا ذکر نہ تھا بلکہ فتح مکہ کا ذکر تھا۔ ورنہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مارے جانے اور ان ابتلاؤں میں پڑنے کا کیا تعلق تھا۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس آیت میں یہی حکم دیا گیا تھا کہ تم نے مکہ فتح کرنا ہے۔ مگر وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ میں بتایا کہ کام آسانی سے نہیں ہوگا بلکہ تمہیں سخت تکالیف میں سے گذرنا ہوگا۔ لیکن یہ تکالیف تمہارے لئے بہتر ہوں گی کیونکہ ان سے تمہارے ایمانوں کی پختگی ظاہر ہو جائے گی۔

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ

جن پر جب (بھی) کوئی مصیبت آئے (گھبراتے نہیں بلکہ یہ) کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں

وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ﴿۱۵۷﴾

اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

حلّ لُغات۔ مُصِيْبَةٌ ہمارے ملک میں مصیبت ان تکلیف دہ واقعات کو کہتے ہیں جو انسان کو پیش آتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں مصیبت ایسی چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو بہرحال پہنچنے والی ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مشکلات سے بھاگتا اور ناپسندیدہ باتوں سے کنارہ کشی کرتا ہے۔ اور جو چیزیں اس کی خوشی اور مسرت کا باعث ہوتی ہیں اُن کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے پس جس چیز کی طرف انسان خود بخود جائے وہ پہنچنے والی نہیں کہلا سکتی۔ لیکن جس سے انسان بھاگے اور وہ اُسے پکڑ لے وہ پہنچنے والی کہلاتی ہے۔ اور چونکہ مصیبت سے ہر انسان بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی مصیبت اسے آ چمٹتی ہے۔ اس لئے عربی زبان میں ایسی چیز کو جو انسان کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس کے پاس پہنچ کر رہے مصیبت کہتے ہیں۔ لیکن اُردو میں خالص اس کے وہی معنے رہ گئے ہیں جو عربی میں ضمنی تھے اور مصیبت صرف اس بات کو کہتے ہیں جو تکلیف دہ ہو۔

تفسیر۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب مومن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ جزع فزع کرنے کی بجائے پورے یقین اور ایمان کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں۔ یہ وہ نمونہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں سے امید رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ گھبرانے

اور جزع فزع کرنے کی بجائے خدا تعالیٰ پر توکل رکھیں اور اُسی کو حاضر ناظر سمجھتے ہوئے سچے دل سے یہ کہیں کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا فقرہ ہے مگر اپنے اندر نہایت وسیع مطالب رکھتا ہے۔

(۱) اس فقرے میں دو جملے ہیں۔ ایک تو اِنَّا لِلّٰہِ ہے یعنی ہم اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔ اور دوسرا اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ہے۔ یعنی ہم اُسی کی طرف لَوٹنے والے ہیں۔ پہلا جملہ اس مضمون پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی مالک اپنی چیز کو اپنے ہاتھوں تباہ نہیں کرتا بلکہ اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ مالک بڑا ہی بیوقوف ہوگا جو اپنی چیز کو آپ تباہ کرنے کی کوشش کرے۔ پس اگر بندہ محض خدا کا ہو جائے اور اُسی کو اپنا حقیقی مالک سمجھے تو اس کے دل میں یہ وہم بھی نہیں آسکتا ہے کہ وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے واپس لے لی ہے۔ یا وہ مصائب جو مجھ پر نازل ہو رہے ہیں ان میں میری تباہی اور بربادی مقصود ہے۔ جو مومن یہ یقین رکھتا ہے کہ میں اللہ کا ہوں اور جس طرح ماں اپنے بچہ کو گود میں رکھتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی مجھے اپنی گود میں اٹھایا ہوا ہے وہ یہ تصور بھی کس طرح کر سکتا ہے کہ میں تباہ کیا جاؤں گا اور میری تکالیف مجھ سے دور نہیں کی جائیں گی۔ محافظ کا تو فرض ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کو ہر نقصان سے بچائے پھر اللہ تعالیٰ جو تمام محافظوں سے بڑا محافظ ہے کب کسی مومن کو تباہ کر سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ جب کوئی چیز اپنے بندے سے واپس لیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اس چیز کو تباہ کرنا چاہتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اسے پہلے سے زیادہ بہتر جگہ میں رکھتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے عورتیں اپنے گھروں کی صفائی کرتے وقت سامان وغیرہ کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتی ہیں۔ تم کبھی نہیں دیکھو گے کہ عورتیں اپنی چیزوں کو اِدھر اُدھر رکھیں تو وہ رونے لگ جائیں۔ یا مثلاً زمیندار کھیت میں بیج ڈالتا ہے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیج کو ضائع کر رہا ہے مگر وہ روتا نہیں اس لئے کہ اس کا نتیجہ تباہی نہیں بلکہ ترقی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہی بیج جب کچھ عرصہ کے بعد اُسے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی شکل میں واپس ملتا ہے تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بندہ اگر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرے گا اُس میں میری بہتری ہوگی تو کبھی بھی جزع فزع اور بے صبری کا اظہار نہ کرے۔ جب انسان ایک خوبصورت عمارت بناتا اور پہلی عمارت کو توڑتا پھوڑتا ہے تو اُس پر روتا نہیں بلکہ خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کپڑے کا دل اور اس کی آنکھیں ہوتیں تو جب درزی اُسے کاٹتا تو وہ رونے کی بجائے خوش ہوتا کہ یہ مجھے اچھا بنانے لگا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے اگر انسان یہ یقین رکھے کہ خدا تعالیٰ میرا مالک ہے اور وہ جو تبدیلی بھی کرے گا میرے فائدہ کے لئے کرے گا تو وہ جزع فزع نہیں کر سکتا۔ ہاں غم کا اظہار کرنا صبر کے خلاف نہیں ہوتا۔ شادی کے وقت لڑکیاں اپنے گھروں کو رخصت ہوتی ہیں تو ماں باپ رونے لگ جاتے ہیں مگر یہ جزع فزع نہیں کہلاتا کیونکہ غم

درحقیقت ایک قدرتی احساس ہے۔ جو مصیبت کے وقت ہر انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی علامت دل پر بوجھ ہونا اور آنکھوں میں آنسو آ جانا ہے لیکن جزع فزع کرنے والا اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ خدا نے اُسے تباہ کر دیا ہے اور یہ چیز مومنانہ توکل اور ایمان کے بالکل خلاف ہے۔ پس اِنَّا لِلّٰہِ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مصیبت یا ابتلاء کے آنے پر کافر تو یہ سمجھتا ہے کہ میں مارا گیا لیکن مومن یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بلا میں بھی میرے لئے کوئی خیر اور برکت کا پہلو پوشیدہ رکھا ہوگا۔

(۲) اِنَّا لِلّٰہِ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ مومن کو جب کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ جھٹ کہتا ہے کہ میرا تو اس چیز کے ساتھ صرف ایک عارضی تعلق تھا اصل تعلق تو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اُسی کی خاطر اس چیز سے بھی میرا تعلق تھا اب اگر اُس نے اپنی کسی حکمت کے باعث یہ چاہا ہے کہ میرا اس چیز سے تعلق ٹوٹ جائے تو میں اس کے فعل پر کیوں اعتراض کروں؟ اس کی مثال حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ ہمارا چھوٹا بھائی مبارک احمد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ ماں باپ کو عموماً چھوٹے بچے بہت پیارے ہوتے ہیں اس لحاظ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اس سے بہت اُنس تھا اور پھر اس لئے بھی آپ اس سے زیادہ پیار کرتے تھے کہ وہ عموماً بیمار رہتا تھا۔ میری عمر جب وہ فوت ہوا اٹھارہ سال کے قریب تھی اس کی آخری بیماری کے ایام میں اس کا علاج کرنے میں بہت سے معالج مصروف تھے مثلاً حضرت خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ عنہ۔ ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب۔ ڈاکٹر سید عبدالستار شاہ صاحب۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس روز صبح کی نماز پڑھ کر گھر آئے تو ساتھ ہی حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ اور ڈاکٹر صاحبان بھی آ گئے۔ اس وقت اسے ضعف کی شکایت تھی لیکن چہرہ سے اچھی حالت معلوم ہوتی تھی ڈاکٹروں نے اُسے دیکھ کر کہا کہ اب افاقہ معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ مطمئن ہو گئے لیکن حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ چونکہ زیادہ تجربہ کار تھے اس لئے آپ نے فوراً معلوم کر لیا کہ بچہ کی حالت نازک ہے۔ انہوں نے گھبرا کر فوراً نبض دیکھنی شروع کر دی۔ لیکن نبض کی حرکت معلوم نہ ہوئی۔ کیونکہ جوں جوں انسان موت کے قریب ہوتا جاتا ہے اس کی نبض پیچھے ہٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر آپ نے اس کی بغل میں ہاتھ رکھا وہاں بھی نبض نہ ملی۔ جب حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ نبض نہیں ملتی تو آپ نے گھبرا کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے عرض کیا کہ حضور جلدی مشک دیجیئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام ٹرنک میں سے مشک نکالنے کے لئے تشریف لے گئے تو چونکہ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بہت زیادہ محبت تھی اور آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام مبارک احمد سے بہت پیار رکھتے ہیں اس لئے آپ نے جب دیکھا کہ مبارک احمد فوت

ہو رہا ہے تو آپ کو اتنی گھبراہٹ ہوئی کہ آپ کھڑے بھی نہ رہ سکے۔ زمین پر بیٹھ گئے اور فرمایا حضور جلدی مشک لا یئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس فقرہ سے سمجھ گئے کہ بچے کی حالت اچھی نہیں اور ویسے ہی بغیر مشک لئے واپس آ گئے۔ اور فرمایا کیا بچہ فوت ہو گیا ہے؟ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہاں حضور فوت ہو گیا ہے۔ آپ نے فوراً اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔ اور بجائے کسی گھبراہٹ کا اظہار کرنے کے باہر کے احمدیوں کو خط لکھنے شروع کر دیئے کہ مومنوں پر ابتلاء آیا ہی کرتے ہیں۔ ان سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ بلکہ اپنے ایمان کو پختہ رکھنا چاہیے اور پھر لکھا کہ مبارک احمد کی وفات کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے مجھے خبر دے دی تھی کہ یہ چھوٹی عمر میں ہی اُٹھا لیا جائے گا۔ پس اس کے فوت ہونے سے خدا تعالیٰ کی پیشگوئی پوری ہو گئی ہے۔ پھر آپ نے اس کے کتبہ کے لئے جو اشعار لکھے۔ اُن میں سے ایک یہ بھی مصرع ہے کہ ع

بُلانے والا ہے سب سے پیارا
اُسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

یہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا ہی ایک رنگ میں مفہوم رکھتا ہے۔ غرض مومن کو جب کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرا تو خدا سے تعلق ہے اگر میرے کسی عزیز کو خدا تعالیٰ نے اپنے پاس بُلا لینا مناسب سمجھا ہے تو مجھے اس پر کیا شکوہ ہو سکتا ہے؟ اُسی کی چیز تھی اور وہی بلانے کا حق دار تھا پس۔ اِنَّا لِلّٰهِ کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تباہ نہیں کرے گا اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ ہمارا تعلق صرف خدا کی وجہ سے ہے پس جس بات میں ہمارا خدا راضی ہے اس میں ہم بھی راضی ہیں۔

(۳) تیسری بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اَنَا لِلّٰهِ نہیں فرمایا بلکہ اِنَّا لِلّٰهِ فرمایا ہے تا کہ یہ اقرار صرف انفرادی رنگ میں نہ ہو بلکہ ہر انسان علیٰ وجہ البصیرت اس یقین پر قائم ہو کہ دنیا کی ہر چیز خدا تعالیٰ کی ہے اور ہمارا ان سے محض عارضی تعلق ہے۔ پس نہ صرف مجھے بلکہ دنیا کے کسی انسان کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے کسی فعل پر اعتراض کرے یا اس کی کسی تلخ قاش پر اپنا مونہہ بنانا شروع کر دے۔ مثنوی رومیؒ میں حضرت لقمانؑ کے متعلق جن کو بعض لوگ نبی بھی سمجھتے ہیں ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ انہیں کسی نے ان کے والدین کی وفات کی وجہ سے غلام بنا لیا اور ایک تاجر کے پاس بیچ دیا۔ اس تاجر نے انہیں ذہین اور ہوشیار سمجھ کر ان سے غلاموں والا سلوک ترک کر دیا اور اُن سے محبت کرنے لگا۔ ایک دن کسی نے اس کو تحفۃً ایک خربوزہ پیش کیا جو بظاہر بہت اچھا تھا۔ اس نے ایک قاش کاٹ کر حضرت لقمان کو دی۔ انہوں نے چکھی تو نہایت

کڑوی تھی لیکن بڑے مزے لے لے کر کھانی شروع کر دی۔ مالک نے ایک اور قاش کاٹ کر دے دی۔ حضرت لقمان نے پھر مزے لے لے کر کھائی۔ حتّٰی کہ تاجر نے یہ سمجھ کر کہ یہ بڑا میٹھا خربوزہ ہے ایک قاش خود بھی چکھی تو اسے معلوم ہوا کہ نہایت کڑوا خربوزہ ہے۔ اس پر وہ حضرت لقمان کو خفا ہوا کہ تم نے بتایا کیوں نہیں۔ اگر تم بتاتے تو میں تمہیں اور کڑوی قاشیں تو نہ کھلاتا۔ حضرت لقمان نے کہا کہ جس ہاتھ سے اتنی میٹھی قاشیں مَیں نے کھائی ہوئی تھیں کیا میں اتنا ہی بے شرم تھا کہ اس کی ایک دو قاشوں کو کڑوی سمجھ کر ردّ کر دیتا۔ تو اِنَّا لِلّٰہِ کا بھی یہی مفہوم ہے کہ وہ خدا جس نے ہمیں اتنی بڑی نعمتیں عطا کی ہوئی ہیں اگر اس نے کسی حکمت کے ماتحت ایک نعمت واپس لے لی ہے یا ہزاروں خوشیوں کے ہوتے ہوئے ایک مصیبت ہم پر آ گئی ہے تو کیا ہوا سب کچھ تو اسی کا دیا ہوا ہے۔ اگر وہ اپنی مرضی سے ایک چیز واپس لے لیتا ہے تو اس پر جزع فزع کرنے سے زیادہ اور کیا حماقت ہو سکتی ہے؟

(۴) چوتھے معنے جو اس سے زیادہ اعلیٰ اور مومن کے مقام کے مطابق ہیں وہ یہ ہیں کہ نہ صرف سب کی سب نعمتیں اُسی کی ہیں اور وہی اس کا حقیقی مالک ہے اگر ایک نعمت اس نے واپس لے لی تو کیا ہوا؟ بلکہ ہمارے پاس جو کچھ باقی ہے اگر وہ بھی ہم سے لے لینا چاہے تو ہم باقی چیزیں بھی اس کی راہ میں دینے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ صحابہؓ کرام میں اس کی بہت سے مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ ایک بڑے مخلص صحابی تھے اور مکی زندگی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ان کی وفات کے بعد جب آپؐ کے بیٹے حضرت ابراہیمؓ فوت ہوئے تو آپؐ نے انہیں فرمایا کہ جا اپنے بھائی عثمان بن مظعونؓ کے پاس (الاستیعاب باب حرف العین)۔ گویا ان کو بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بیٹا قرار دیا۔ وہ کسی رئیس کے بیٹے تھے۔ ان کے والد فوت ہو گئے تو ان کے باپ کے کسی دوست نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا اور اعلان کر دیا کہ یہ میرے بھائی کا بیٹا ہے کوئی شخص اسے تکلیف نہ دے۔ چند دن تو وہ آزادانہ طور پر پھرتے رہے اور انہیں کسی نے کوئی تکلیف نہ دی لیکن ایک دن انہوں نے دیکھا کہ بعض کمزور مسلمانوں اور غلاموں کو کفار سخت تکلیف دے رہے ہیں اور انہیں تپتی ریت پر لٹا کر دکھ دے رہے ہیں ان سے یہ نظارہ برداشت نہ ہو سکا اور فوراً گھر آ کر اُس رئیس سے کہا کہ چچا مہربانی کر کے اپنی پناہ واپس لے لو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ دوسرے مسلمانوں کو تو لوگ سخت سے سخت سزائیں دیں اور میں مزے سے اِدھر اُدھر پھروں۔ چنانچہ اُس رئیس نے اپنی پناہ کا اعلان منسوخ کر دیا۔ اسی اثناء میں لبید جو ایک بہت بڑا شاعر تھا (اور جو بعد میں مسلمان بھی ہو گیا) وہ مکہ میں آیا اور لوگوں نے اس کے اعزاز میں ایک مجلس مشاعرہ قائم کی۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ اور وہ رئیس بھی وہیں تھے۔ اکثر شعراء نے

اپنے اپنے شعر پڑھے۔ پھر لبید کی باری آئی تو انہوں نے یہ شعر پڑھا کہ

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ

یعنی سُنو! کہ ہر ایک چیز اللہ تعالیٰ کے سوا فنا ہونے والی ہے ابھی انہوں نے یہ مصرع پڑھا ہی تھا کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ بول اُٹھے کہ خوب کہا ٹھیک کہا۔ اس پر لبید کو غصہ آیا کہ کیا میں اتنا ہی حقیر ہوں کہ اس چھوٹے سے بچے کی تصدیق کا محتاج ہوں۔ اور اس نے اہل مجلس کو غیرت دلائی کہ یہ کیا بد تہذیبی ہے جو تم لوگوں نے اختیار کر لی ہے کہ ایک بچہ مجھے داد دیتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو ڈانٹا اور کہا کہ خبردار آئندہ ایسا نہ کرنا۔ اس کے بعد انہوں نے دوسرا مصرع پڑھا ع

وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ

یعنی ہر نعمت ایک دن زائل ہونے والی ہے۔ اس پر حضرت عثمان بن مظعون پھر بول اُٹھے اور کہنے لگے۔ یہ درست نہیں جنت کی نعمتیں کبھی زائل نہیں ہوں گی۔ لبید کو سخت غصہ آیا اور اس نے پھر لوگوں کو غیرت دلائی کہ تم نے میری بے عزتی کی ہے۔ اب میں کوئی شعر نہیں پڑھوں گا۔ اس پر ایک شخص کو اتنا جوش آیا کہ اس نے اُٹھ کر حضرت عثمان بن مظعونؓ کے منہ پر ایک مکا مارا جس کی وجہ سے ان کی ایک آنکھ نکل گئی۔ ان کے وہ ہمدرد رئیس جنہوں نے ان کو پناہ دے رکھی تھی وہ بھی وہیں پاس بیٹھے تھے۔ چونکہ وہ اتنی طاقت نہیں رکھتے تھے کہ دوسروں کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکیں اس لئے انہوں نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ اور جس طرح کسی غریب عورت کے بچے کو کوئی امیر آدمی کا بچہ مار جائے تو وہ اپنے بچے کو ہی ڈانٹتی ہے اور کہتی ہے کہ تو گھر سے کیوں باہر نکلا تھا۔ اسی طرح انہوں نے بھی حضرت عثمان بن مظعونؓ کو ڈانٹنا شروع کیا کہ تجھے میں نے نہیں کہا تھا کہ میری پناہ سے نہ نکلو۔ اب دیکھا اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ اس پر حضرت عثمان بن مظعونؓ نے جواب میں کہا چچا! آپ کو تو میری ایک آنکھ کے نکلنے کا افسوس ہے اور میری تو دوسری آنکھ بھی خدا تعالیٰ کے راستے میں نکلنے کے لئے تیار ہے (اسد الغابۃ ذکر عثمان بن مظعون)۔ تو حقیقی مومن قربانی سے گھبراتا نہیں بلکہ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا اس کی کوئی قیمتی متاع ضائع ہو جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ مرنے والا اور باقی رہنے والے سب اس کے ہی ہیں۔ پس اگر وہ اللہ کی چیز تھی اور ہم بھی اسی کے ہیں تو اللہ تعالیٰ اگر اپنے ایک غلام کے پاس رکھوائی ہوئی امانت واپس لے گیا تو اسے شکوہ کا کیا حق ہے۔ میں تو سب کچھ اس کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

(۵) مگر یہ پہلا حصہ کچھ استغناء ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم فرما کر دوسرا حصہ اس

کے ساتھ لگا دیا کہ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ اور اس طرح اس تعزیت کو مکمل فرما دیا۔ پہلے فرمایا تھا کہ اگر ہم تم کو کوئی انعام دیتے ہیں اور پھر وہ انعام تم سے لے لیتے ہیں تو تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ میرے محسن نے فلاں چیز مجھے دی تھی اور میں اس سے پانچ سال یا دس سال یا بیس سال یا تیس سال یا چالیس سال یا پچاس سال تک فائدہ اٹھاتا رہا اس کے بعد وہ اپنی امانت مجھ سے کیوں لے گیا؟ اس بات پر اُسے شکوے کا کیا حق ہے؟ یہ تو اس کا احسان تھا کہ جتنی مدت وہ چیز اس کے پاس رہی اس سے وہ پوری طرح فائدہ اُٹھاتا رہا۔ اب اس کے بعد فرماتا ہے کہ یاد رکھو اگر تمہارا کوئی عزیز ہم نے تم سے جُدا کر دیا ہے تو مومن کو یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ دنیا سے کسی کا اُٹھ جانا دائمی جُدائی کا موجب تو نہیں ہوتا۔ اگر یہ دائمی جُدائی ہوتی اور فرض کرو کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہ ہوتی۔ تب بھی کیا خدا کا حق نہیں تھا کہ جو چیز اُس نے دی ہے وہ اُسے واپس لے لے؟ لیکن وہ زائد وعدہ یہ کرتا ہے کہ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ایک شخص اگر خدا کی طرف گیا ہے تو ہم بھی ایک دن اُسی کی طرف چلے جائیں گے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی نے پہلے سفر طے کر لیا اور کوئی بعد میں سفر کے لئے چل پڑے گا ورنہ منزل مقصود سب کی ایک ہی ہے اور جب منزل مقصود ایک ہی ہے تو اس میں گھبراہٹ کی کونسی بات ہے؟ بچے بعض دفعہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اب کسی کی زندگی کا کیا اعتبار ہوتا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک یا دو دن بھی اور زندہ رہے گا۔ نہ والدین جانتے ہیں کہ انہوں نے اتنا عرصہ زندہ رہنا ہے نہ لڑکے جانتے ہیں کہ ان کی زندگی کب تک ہے؟ مگر باوجود اس کے جب لڑکوں کو پڑھنے کے لئے ولایت بھیجا جاتا ہے تو پانچ پانچ چھ چھ دس دس سال تک مائیں صبر کرتی ہیں باپ صبر کرتے ہیں اور وہ گھبراہٹ سے کام نہیں لیتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آخر ہمارے بچے ایک دن آجائیں گے۔ یا اگر کسی سفر پر کوئی شخص پہلے چل پڑتا ہے اور دوسروں نے بھی وہیں جانا ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم چند دن کے بعد اُس سے جا ملیں گے۔ جانا تو ہے ہی۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پہلے یہ اقرار کرو کہ خدا نے ہم پر جو احسان کیا ہے ہم اس کے شکر گذار ہیں پھر یہ بھی سمجھ لو کہ تم سارے ایک دن خدا کے پاس جمع ہونے والے ہو اور اس کے پاس پہنچ کر اکٹھے ہو جاؤ گے۔ پس فرماتا ہے جب تم سارے ایک دن اکٹھے ہونے والے ہو تو خدا کے فعل پر شکوہ یا جزع فزع کتنی بڑی نادانی ہے۔ اگر تم جزع فزع کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا اپنے عزیزوں سے آخری اتصال کمزور ہو جائے گا کیونکہ جس خدا کے اختیار میں یہ ہے کہ وہ اگلے جہان میں سب کو اکٹھا کر دے اس کے اختیار میں یہ بھی ہے کہ وہ اگلے جہان میں بعض کو جُدا جُدا رکھے۔ پس مومن کی اصل تعزیت اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہی ہے۔ باقی جہاں تک جسم کا تعلق ہے جسم جب کٹتا ہے تو ضرور دکھ پاتا ہے۔ صحابہؓ جنگوں میں شہید ہوئے اور اپنی خوشی

سے شہید ہوئے۔ لیکن جہاں تک جسم کے کٹنے کا سوال ہے ان کو ضرور تکلیف ہوئی پس جسم بے شک دُکھ پاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہوتا ہے اُس بندے پر جس کی رُوح خدا کے آستانہ پر جُھکی رہے اور اس سے کہے کہ اے میرے رب! مجھے کوئی شکوہ نہیں تُو نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ یہی عین مصلحت تھی اور یہی چیز میرے لئے بہتر تھی۔ تیرا فعل بالکل درست ہے اور گو مجھے سمجھ میں نہ آئے مگر میں یہی کہتا ہوں کہ تیرا کوئی کام حکمت کے بغیر نہیں۔

(۶) پھر اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ میں ایک اور مضمون بھی بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب کوئی رنج انسان کو پہنچتا ہے۔ تو فطرت کہتی ہے کہ میرے اندر آخر کوئی کمزوری تھی۔ تبھی تو مجھے یہ دُکھ پہنچا۔ اگر میں طاقتور ہوتا تو یہ دُکھ کیوں پہنچتا۔ اب اس دُکھ کو کوئی طاقتور ہی دُور کر سکتا ہے۔ غرض رنج ہمیشہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی بیرونی طاقت مدد کرے۔ اور جب انسانی ذہن کو فطرت اس طرف لے جاتی ہے کہ اب کوئی غیر طاقت ہی مدد کرے تو معاً اس کا دل اِدھر مائل ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو اس دُکھ کو دُور کرے۔ چنانچہ اُس وقت وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا ہی ہوں اور میں اسی سے مدد مانگتا ہوں اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جو میری مدد کرے؟ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کے بے شک یہ بھی معنے ہیں کہ آخر ہم نے بھی اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے لیکن اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ اگر ہم نے لَوٹنا ہے تو خدا تعالیٰ کی طرف لَوٹنا ہے۔ اگر ہم نے گریہ وزاری کرنی ہے تو اس کے سامنے ہی کرنی ہے۔ پس اسلام نے یہ سبق فطرت کے تقاضا کے عین مطابق دیا ہے جب کوئی رنج پہنچتا ہے تو یہ انسان کی کمزوری کی علامت ہوتی ہے اس لئے وہ اُسے خود دُور نہیں کر سکتا۔ وہ طبعاً یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے دوست اور عزیز اس کی مدد کریں۔ مگر فرمایا یاد رکھو تمہارا سب سے بڑا عزیز اور دوست خدا تعالیٰ ہے۔ تم اس کے سامنے جھکو اور اس سے مدد طلب کرو۔ جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سبق پر عمل کرتے ہیں وہ ناکام و نامراد نہیں رہتے۔ ناکام و نامراد وہی ہوتا ہے جو غیر طبعی فعل کرتا ہے۔ مثلاً رات کو ڈاکہ پڑتا ہے تو عقلمند شخص اپنے عزیزوں اور دوستوں کے پاس جاتا ہے اور ان سے مدد طلب کرتا ہے لیکن بیوقوف انسان دوڑ کر جنگل کی طرف چلا جاتا ہے حالانکہ جنگل میں اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اسی طرح روحانی دنیا میں ایک عقلمند انسان تو خدا تعالیٰ کی طرف جاتا ہے لیکن بیوقوف یونہی ہائے اماں ہائے اماں! کہتا رہتا ہے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ اماں نے کیا کرنا ہے جو کچھ کرنا ہے خدا تعالیٰ نے ہی کرنا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے پاس جاتا نہیں۔ وہ اس کے پاس جاتا ہے جو کچھ نہیں کر سکتا۔ پس انسان کا فرض ہے کہ جب اُسے کوئی رنج پہنچے تو وہ فوراً اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہے۔ یعنی اگر مجھ پر مصیبت آ گئی ہے تو بقول پنجابی بزرگوں کے ’’مُلّاں کی دوڑ مسیت تک‘‘ میں نے تو خدا تعالیٰ کی طرف جانا ہے اور

اس سے مدد طلب کرنی ہے اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اپنی برکات سے حصہ دیتا اور اس کے مصائب کو دور فرما دیتا ہے۔

(۷) اسی طرح وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ میں یہ لطیف مضمون بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے غلام ہیں اور اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پس اگر ہم صبر سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس صدمہ کا بہتر بدلہ مل جائے گا۔ پھر ہمیں کسی جزع فزع کی کیا ضرورت ہے؟ گھبراہٹ صرف اسے ہوسکتی ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ دُکھوں اور تکالیف کے بدلہ میں کوئی جزا مقدر نہیں۔ مگر مومن تو سمجھتے ہیں کہ جب ہم خدا تعالیٰ کے پاس جائیں گے تو وہ ہمارے دکھوں کا بدلہ اپنے غیر معمولی انعامات کی شکل میں ہمیں عطا فرمائے گا۔ اور جب کوئی ایمان اور یقین کے اس اعلیٰ مقام پر فائز ہو تو اسے بے صبری دکھانے کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صابرین کی تعریف فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ ہمارے نزدیک کون لوگ صابر ہیں۔ اسلام کے نزدیک صابرین کی یہ تعریف ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو ان کی توجہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف پھر جاتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہے تو پھر مایوسی کیسی؟ ایک بچہ جب ماں کی گود میں ہوتا ہے تو وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ اسی طرح وہ بھی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی گود میں سمجھتے ہیں اس لئے کسی مصیبت کے آنے پر مایوس نہیں ہوتے۔ اور اگر صبر کے معنے بدی سے رُکنے کے سمجھے جائیں تو پھر اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ جب اُن پر کوئی ایسی تکلیف آتی ہے جس سے انسان بدی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جیسے قحط ہے کہ اس میں لوگ چوریاں وغیرہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ تب بھی وہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اگر صبر سے مراد نیکی پر قائم رہنا ہو تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جب کوئی شیطانی تحریک انہیں نیکی سے منحرف کرنا چاہے تو اس وقت بھی وہ فوراً خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اسی سے اپنے روحانی پیوند کا اظہار کرتے ہیں۔

غرض یہ بظاہر ایک چھوٹا سا جملہ ہے مگر اپنے اندر بڑے وسیع مطالب رکھتا ہے۔ اور جو لوگ صاحب حال ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس فقرہ کے کہنے سے جن تکالیف کا ازالہ ممکن ہو اُن کا تو ازالہ ہو جاتا ہے اور جن کا ازالہ ناممکن ہو ان کا نسان کو کسی اور رنگ میں بدلہ مل جاتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ مردے اس دنیا میں واپس نہیں آتے۔ پس اگر کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس سنت اور فیصلہ کے ماتحت وہ زندہ ہو کر اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ لیکن اگر یہ فقرہ پورے ایمان اور اخلاص کے ساتھ کہا جائے تو کہنے والے کو کسی نہ کسی رنگ میں اس کا بدلہ ضرور مل جاتا ہے۔ اور اگر انسان کا کوئی ایسا نقصان ہو جائے جس کا بدلہ ملنا ممکن ہو مگر وہ پھر بھی نہ ملے تو اس کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ

اللہ تعالیٰ کی تقدیر خاص اس میں روک بن رہی ہے ورنہ اس کا بدلہ ضرور مل جاتا۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ

یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے برکتیں (نازل ہوتی) ہیں اور رحمت (بھی)

هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

حل لغات۔صَلٰوۃٌ جیسا کہ اوپر حل لغات میں بتایا جا چکا ہے صَلٰوۃٌ کے کئی معنے ہیں۔مگر جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے صرف مغفرت اور حسنِ ثناء کے ہوتے ہیں۔عبادت کے معنے اس لئے چسپاں نہیں ہو سکتے کہ عبادت خدا تعالیٰ کی کی جاتی ہے اس کی طرف سے آتی نہیں۔اسی طرح رحمت کے معنے بھی یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے۔کیونکہ صَلٰوۃ کے ساتھ ہی رحمت کا لفظ بھی آ گیا ہے۔پس اس جگہ اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ ان لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے مغفرت حاصل ہو گی یا انہیں ثنائے جمیل عطا کی جائے گی۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ارضی اور سماوی آفات پر سچے دل سے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی مغفرت سے حصہ دیتا ہے یعنی وہ ان کے نقصانات کا ازالہ کرتا اور ان کی ناکامی کو کامیابی میں اور تکلیف کو راحت میں بدل دیتا ہے۔اسی طرح اُن پر اللہ تعالیٰ کا فضل حسن ثناء کی صورت میں نازل ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی نیک شہرت دنیا میں قائم کر دیتا ہے اور لوگوں کی زبانوں پر ان کا ذکر خیر جاری ہو جاتا ہے۔چنانچہ دیکھ لو! مسلمانوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے کتنی بڑی قربانیوں سے کام لیا تھا۔انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں اور اولادوں کو بلا دریغ قربان کر دیا اور کسی بڑی سے بڑی مصیبت کی بھی پرواہ نہ کی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دشمنانِ اسلام تک بھی ان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔وہ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں مگر جب صحابہؓ کی قربانیوں کا ذکر آتا ہے تو وہ یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے جو نمونہ دکھایا وہ یقیناً بے مثال تھا۔ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر آتی ہے کہ ہمیں چند آدمی پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس مدینہ کی ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد میں جس پر کھجور کی شاخوں کی چھت پڑی ہوئی تھی اور جو ذرا سی بارش سے بھی ٹپکنے لگ جاتی تھی آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اور جب ہم ان

کے قریب پہنچ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں؟ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں کہ ہم قیصر و کسریٰ کو کس طرح شکست دیں اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ چند سالوں کے اندر اندر واقعہ میں ایسا ہی ہو گیا۔ اور ان بے سروسامان اور کمزور درویشوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو پاش پاش کر دیا۔ غرض اشد ترین دشمنوں نے بھی تسلیم کر لیا کہ مسلمانوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور وہ ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہاں صلوٰۃ اور رحمۃ کو اکٹھا کرنے میں یہ حکمت ہے کہ دنیا میں حکومتوں کی طرف سے عزت افزائی کے دو ہی طریق مقرر ہیں۔ یا تو کوئی خاص اعزاز بخشا جاتا ہے یا مادی رنگ میں کوئی انعام دیا جاتا ہے جیسے اعزازی طور پر لوگوں کو خطابات دیئے جاتے ہیں اور مادی طور پر انہیں مربعے وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ مگر گورنمنٹ کے خطابات تو بے حقیقت ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ ایک ایسے شخص کو خان بہادر کا خطاب دے دیتی ہے جو بزدل ہوتا ہے اور چوہے سے بھی ڈر جاتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے جسے کوئی خطاب دیا جاتا ہے وہ اس کا سچ مچ اہل ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ دونوں طرف دھوکا کھا جاتے ہیں۔ وہ گورنمنٹ کے خان بہادروں کو واقعی خان بہادر سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے خان بہادروں کو کچھ بھی نہیں سمجھتے حالانکہ جب خدا تعالیٰ کسی کو کوئی خطاب دیتا ہے تو اس کے اوصاف بھی اس میں پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص جو احمدی تھا مگر اس کے دماغ میں کچھ نقص تھا قادیان آیا۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کہنے لگا کہ مجھے الہام ہوتا ہے کہ تو محمد ہے تو موسیٰ ہے تو عیسیٰ ہے۔ آپ نے فرمایا کیا اس کے بعد تمہیں وہ کچھ ملتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا تھا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا۔ وہ کہنے لگا ملتا تو کچھ نہیں آپ نے فرمایا پھر یہ شیطانی الہام ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ تو یہ تمسخر نہیں کرتا کہ کسی کو کوئی خطاب دے اور اس کے اوصاف اس میں پیدا نہ کرے۔ خدا تعالیٰ تو جب کسی کو کوئی خطاب بخشتا ہے تو اس کے مطابق اُسے طاقتیں بھی دے دیتا ہے۔ یہ شیطان ہے جو تمہیں دیتا تو کچھ نہیں مگر تمہارا نام موسیٰ اور عیسیٰ اور محمد رکھتا چلا جاتا ہے۔ غرض صلوٰۃ کا تعلق روحانی انعامات سے ہوتا ہے اور رحمت کا تعلق ان مادی انعامات سے ہوتا ہے جو ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ پس بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ ابتلاؤں میں ثابت قدم رہنے والوں کو روحانی برکات سے بھی مستفیض کرتا ہے اور انہیں مادی فوائد اور ترقیات جو ماحول سے تعلق رکھتی ہیں وہ بھی عطا کرتا ہے۔

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ اس جگہ ہدایت سے مراد صرف صراطِ مستقیم پر چلنا نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی ہدایت یافتہ

اور صراطِ مستقیم پر قائم ہوتے ہیں۔ یہاں یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کے راستہ پر لئے جائے گا اور وہ اپنے اخلاص اور ایمان میں آگے ہی آگے بڑھتے جائیں گے۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ مشکلات اور مصائب میں اللہ تعالیٰ انہیں صحیح راستہ بتاتا جائے گا اور مشکلات کے ساتھ ساتھ ان کا حل بھی انہیں نظر آتا جائے گا۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ بندہ جب سچے دل سے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہتا ہے اور مصائب پر صبر سے کام لیتا ہے تو مومن کی یہ حالت دیکھ کر اللہ تعالیٰ بھی عرش پر بیتاب ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس محبت اور اخلاص کی جزا دینے کے لئے اُسے اپنی ہدایت کی راہوں پر چلاتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔ گویا صبر اور استقامت کے نتیجہ میں وہ منعم علیہ گروہ میں شامل ہو جاتا ہے اور وصلِ الٰہی کے دروازے اس پر کھول دیئے جاتے ہیں۔ غرض تین قسم کے انعامات کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (۱) اول ہدایت کی راہوں میں ترقی (۲) دوم مشکلات میں صحیح راہنمائی (۳) سوم خدا تعالیٰ کا دائمی وصال۔ اور جن کو یہ فوائد حاصل ہوں ان کو اپنے کسی عارضی نقصان کا خیال بھی کس طرح آ سکتا ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ

صفا اور مروہ یقیناً اللہ (تعالیٰ) کے نشانات میں سے ہیں۔ سو جو شخص اس گھر (یعنی کعبہ) کا حج یا

اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ

عمرہ کرے تو اسے اِن کے درمیان تیز چلنے پر کوئی گناہ نہیں۔ اور جو شخص خوشی سے کوئی نیک کام کرے (وہ سمجھ لے کہ)

خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۹﴾

اللہ (نیک کاموں کا) قدر دان ہے (اور وہ) بہت جاننے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ **صَفَا** صَفَاةٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں سخت موٹے پتھر جن پر مٹی نہ ہو۔ اور کھیتی بھی نہ ہو سکے۔ صفا بیت اللہ کے پاس بڑے بڑے پتھروں کی ایک پہاڑی کا بھی نام ہے۔ (اقرب)

اَلْمَرْوَةَ یہ مَرْوٌ کا مفرد ہے اور مروہ ان سفید چھوٹے چھوٹے چمکتے ہوئے چقماقی صفت رکھنے والے

پتھروں کو کہتے ہیں جن سے لوگ آگ نکالتے ہیں۔ مروہ بھی ایک پہاڑی کا نام ہے جو بیت اللہ کے پاس ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ غرض صفا اور مروہ دو پہاڑیوں کا نام ہے جو خانہ کعبہ کے پاس ہیں۔ اور اب خانہ کعبہ وسیع ہو کر اُن کو آ لگا ہے اور ایک دروازہ ان میں آ کر کھلتا ہے ان پر ایک بازار ہے جو سوقِ صفا کہلاتا ہے اور شہر کا حصہ ہے اور اسی بازار میں اب سعی ہوتی ہے پہلے دونوں پہاڑیاں الگ الگ تھیں لیکن اب بھرتی پڑ کر مل گئی ہیں اور ایک ہی معلوم ہوتی ہیں صرف دو نشان لوگوں نے سعی کے لئے بنا رکھے ہیں جن سے سعی شروع کرنے اور ختم کرنے کا حال انسان کو معلوم ہوتا ہے۔ (اقرب)

شَعَائِر شَعِيْرَةٌ کی جمع ہے اس کے معنے علامت آیت اور نشان کے ہوتے ہیں اور عبادات کے مقررہ طریقوں کو بھی شعیرۃ کہتے ہیں۔ یہاں علامت کے معنی مراد ہیں۔

حَجَّ حج کے اصل معنے قصد کے ہیں مگر اصطلاح شریعت میں اس کے معنے ذوالحجہ میں بیت اللہ جانے اور وہاں خاص احکام بجالانے کے ہیں۔

اِعْتَمَرَ اِعْتَمَرَ الْمَكَانَ کے معنے ہوتے ہیں قَصَدَهٗ وَزَارَهٗ۔ کسی بزرگی رکھنے والے مکان کی طرف جانے کا قصد کیا۔ اور اس کی زیارت کی۔ اسی طرح کہتے ہیں اِتَّخَذْنَا نَادِيًا نَعْتَمِرُهٗ۔ کہ ہم نے ایک ایسی مجلس قائم کی ہے جس میں ہم بار بار جاتے ہیں اور ہماری آپس میں ملاقات ہوتی ہے پس اعتمار کے اصل معنے کسی شہر کی زیارت یا کسی ایسے مکان کی طرف جانے کے ہیں جو اپنی بزرگی یا دوستوں کی ملاقات کے لحاظ سے قابلِ اعزاز ہو۔ لیکن شریعت میں طواف بیت اللہ اور صفا اور مروہ کی سعی کا نام ہے۔ اور یہ عبادت سال کے ہر حصہ میں ہوسکتی ہے لیکن حج کا ایک خاص وقت مقرر ہے اسی طرح حج اور عمرہ میں یہ فرق ہے کہ عمرہ میں وہیں سے احرام باندھ لیتے اور سر منڈا لیتے ہیں۔ لیکن حج میں مقررہ جگہوں سے احرام باندھنا ضروری ہوتا ہے۔

جُنَاحٌ جَنَحَ کے معنے ہوتے ہیں مَالَ یعنی جُھک گیا۔ پروں کو بھی اور بازوؤں کو بھی اسی لئے جناح کہتے ہیں اور گناہ کو بھی جناح اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں انسان بدی کی طرف جُھک جاتا ہے۔ گناہ کا لفظ دراصل جناح کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

يَطَّوَّفَ طَوَّفَ حَوْلَ الشَّيْءِ وَبِهٖ کے معنے ہیں طَافَ وَاَكْثَرَ الْمَشْيَ حَوْلَهٗ اس نے کسی چیز کے اردگرد چکر لگایا اور کثرت کے ساتھ گھوما (اقرب) طَافَ يَطُوْفُ بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں لکھا ہے طَافَ بِالْقَوْمِ وَ عَلَيْهِمْ کے معنے ہیں اِسْتَدَارَ وَجَآءَ مِنْ نَوَاحِيْهِ اس نے چکر لگایا اور کناروں کی

طرف سے اس کے پاس آیا انہی معنوں میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ جنتیوں کی نسبت فرماتا ہے یَطُوْفُ عَلَیْھِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (الواقعۃ:۱۸) یعنی اُن کے پاس بار بار نوجوان خادم اُن کی خدمت کے لئے آئیں گے اس جگہ صفا اور مروہ کے گرد گھومنا مراد نہیں بلکہ بار باراُن کے پاس جانا مراد ہے۔

تَطَوَّعَ کے معنے ہیں تَبَرَّعَ بِلَا قَصْدِ اُجْرَۃٍ بِاِحْتِمَالِ مُشَقَّۃٍ کسی نیکی کو بغیر اُجرت اور بدلہ کی خواہش کے کرنا (۲) تکلیف اٹھا کر کوئی کام کرنا۔ اسی لئے والنٹیر کو عربی زبان میں مطاوع کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بغیر تنخواہ کے آنریری طور پر کام کرتا ہے۔ (مفردات)

شَاکِرٌ جب یہ لفظ خدا تعالیٰ کے لئے آئے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ انعام نازل کرتا ہے یا حکم بجالانے پر جزا دیتا ہے۔ اور جب یہ بندہ کے لئے آئے تو اُس وقت اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکر گذار ہوتا ہے۔ (مفردات)

تفسیر ۔ اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ فرماتا ہے۔ صفا اور مروہ دونوں پہاڑیاں یقیناً اللہ تعالیٰ کے نشانات میں سے ہیں۔ یہ وہ پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حج اور عمرہ میں خانہ کعبہ کے طواف کے بعد سعی کی جاتی ہے اور سات دفعہ چکر لگایا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ چودہ دفعہ دوڑنا چاہیے۔ مگر یہ کمزور خیال ہے۔ اصل میں سات دفعہ ہی سعی ہے اور یہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے (بخاری کتاب الحج باب ما جاء فی السعی بین الصفا و المروۃ)۔ صفا سے شروع کر کے مروہ پر جاتے ہیں اور وہاں سے صفا پر آتے ہیں۔ یہ سعی چونکہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی یادگار ہے اس لئے یہ پہاڑیاں اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا نشان ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنی بیوی ہاجرہ اور بچے اسمٰعیل کو عرب کی بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ آؤ۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی اور حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل کو انہوں نے خانہ کعبہ کے پاس لا کر بسا دیا جہاں پانی کا ایک قطرہ اور گھاس کی ایک پتی تک نہ تھی۔ صرف ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجوروں کی آپ نے انہیں دی اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ جب پانی ختم ہوا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پیاس لگی۔ اور آخر شدت پیاس کی وجہ سے وہ تڑپنے لگ گئے حضرت ہاجرہ سے اُن کی پیاس کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ اور وہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑیں۔ مگر پانی نہ ملا۔ قریب ہی صفا پہاڑی تھی وہ دوڑ کر اُس پر چڑھ گئیں۔ کہ شاید کوئی شخص نظر آئے اور وہ اُس سے پانی مانگیں۔ مگر جب وہاں سے کوئی شخص دکھائی نہ دیا تو دوسری پہاڑی مروہ پر دوڑ کر چڑھ گئیں اور وہاں سے بھی کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ تو پھر صفا کی طرف آئیں اور

اس طرح انہوں نے سات چکر کاٹے۔ آخری چکر میں جب وہ مروہ پر تھیں ان کو ایک آواز آئی۔ حضرت ہاجرہ نے پکار کر کہا۔ کہ اے شخص! جس کی یہ آواز ہے اگر تو ہماری مدد کر سکتا ہے تو کر۔ یہ آواز اللہ تعالیٰ کے ایک فرشتہ کی تھی۔ اُس نے کہا ہاجرہ جا اور دیکھ کہ اسمٰعیل کے پاؤں کے نیچے خدا تعالیٰ نے ایک چشمہ پھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ واپس آئیں اور انہوں نے دیکھا کہ جہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شدتِ پیاس کی وجہ سے تڑپ رہے تھے۔ وہاں پانی کا ایک چشمہ پھوٹ رہا ہے اور بڑے زور سے اس میں سے پانی نکل رہا ہے۔ زمزم کا کنوآں وہی چشمہ ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے معجزانہ طور پر پھوڑا گیا تھا۔ چنانچہ اس چشمہ کی وجہ سے پھر اس قدر ترقی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں عظیم الشان شہر قائم کر دیا۔

غرض صفا اور مروہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو لوگ صبر کرتے اور استقامت کے ساتھ خدمت دین میں حصہ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ وہ ہاجرہ اور اسمٰعیل کی طرح انہیں اپنے آسمانی نشانات دکھاتا اور دائمی زندگی اور غیر معمولی انعامات عطا کرتا ہے۔ اگر تم بھی صبر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی ایسے ہی انعامات سے نوازے گا اور تمہیں بھی شعائر اللہ میں داخل کر دے گا۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِ اَنۡ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ چونکہ بعض لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ صفا اور مروہ پر جانا گناہ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَا جُنَاحَ ورنہ یہ مراد نہیں کہ جاؤ یا نہ جاؤ تمہارا اختیار ہے۔ کیونکہ حج اور عمرہ میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی ضروری ہوتی ہے اسی طرح فَلَا جُنَاحَ کے یہ بھی معنے ہیں کہ طواف جائز ہے۔ کیونکہ جب اس چیز کے متعلق جسے لوگ حرام جانیں فتویٰ دیا جائے تو اس وقت اس فقرہ کے معنے صرف اس خیال کی نفی کرنی ہوتی ہے نہ کہ اس کا جواز بتانا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہی مذہب تھا کہ طواف ضروری ہے چنانچہ بخاری جلد اوّل باب وجوب الصفا و المروۃ وجعل من شعائر اللہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے عروہ بن زبیر سے ایک روایت مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طواف جائز ہے ضروری نہیں۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ بِئۡسَمَا قُلۡتَ يَا ابۡنَ اُخۡتِيۡ اِنَّ هٰذِهٖ لَوۡ كَانَتۡ كَمَا اَوَّلۡتَهَا عَلَيۡهِ كَانَتۡ لَا جُنَاحَ عَلَيۡهِ اَنۡ لَا يَتَطَوَّفَ بِهِمَا (بخاری کتاب الحج باب وجوب الصفا المروۃ)۔ یعنی اے میرے بھانجے! تو نے یہ بہت ہی غلط استدلال کیا ہے۔ اگر یہ بات اسی رنگ میں ہوتی جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو عبارت یوں ہوتی کہ لَا جُنَاحَ عَلَيۡهِ اَنۡ لَا يَطَّوَّفَ بِهِمَا اور پھر فرمایا وَقَدۡ سَنَّ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ الطَّوَافَ بَيۡنَهُمَا فَلَيۡسَ لِاَحَدٍ اَنۡ يَّتۡرُكَ الطَّوَافَ بَيۡنَهُمَا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہی

تھی کہ آپ صفا اور مروہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ پس کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سنّت کے خلاف معنی کرے بہر حال حضرت عروہ بن زبیر جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے ان کا یہی مذہب تھا کہ طواف ضروری نہیں۔ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ حضرت انسؓ عطا اور مجاہد کا بھی یہی قول ہے کہ طواف ضروری نہیں۔ امام احمد بن حنبل کا یہ مذہب ہے کہ یہ ضروری تو نہیں مگر کسی شخص کو نہیں چاہیے کہ وہ جان بوجھ کر طواف چھوڑے ہاں اگر بلا ارادہ چھوٹ جائے تو کوئی گناہ نہیں۔ مگر مناسب یہی ہے کہ نہ چھوڑے۔ امام شافعیؒ اور مالکؒ کے نزدیک صفا اور مروہ کا طواف واجب ہے اور ارکانِ حج میں سے ہے اور ثوری اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر کوئی چھوڑ دے اور بغیر طواف کئے حج پورا کرے تو اُس پر قربانی لازم ہے (جامع البیان زیر آیت ھذا)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا کہنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انصار مسلمان ہونے سے پہلے منات بُت کے لئے احرام باندھا کرتے تھے جس کی مشلّل کے پاس لوگ عبادت کیا کرتے تھے اور اس زمانہ میں جو شخص احرام باندھتا وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو گناہ سمجھتا تھا۔ جب وہ لوگ مسلمان ہو گئے تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں دریافت کیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم صفا اور مروہ کی سعی گناہ سمجھا کرتے تھے لیکن اب اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (بخاری کتاب الحج باب وجوب الصفا و المروۃ) پس چونکہ اس وقت ایک جماعت ایسی تھی جو صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے کو جائز نہیں سمجھتی تھی اس لئے اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ اس میں کوئی گناہ تو نہیں۔ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ کوئی گناہ نہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ سعی صرف جائز ہے یا واجب تو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم نے صرف یہ بحث اُٹھائی ہے کہ جو لوگ اس کام کو غلطی اور گناہ قرار دیتے ہیں وہ درست نہیں کہتے ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اس کا ضروری ہونا ثابت ہے۔ پس لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا کے یہ معنے نہیں ہیں کہ یہ کام اختیاری ہے کوئی کرے یا نہ کرے بلکہ درحقیقت یہ نصیحت کا ایک طریق ہے کہ جب کسی ضروری بات کی طرف انسان توجہ نہ کرے تو کہتے ہیں کہ یہ بات گناہ نہیں۔ یعنی تم نے جو ادھر توجہ نہیں کی تو شاید گناہ سمجھ کر نہیں کی حالانکہ یہ تو ضروری بات تھی ان معنوں کو سورۃ نساء کی یہ آیت بالکل حل کر دیتی ہے کہ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء: ۱۲۹) یعنی اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے نشوز یا اعراض سے ڈرتی ہو تو اگر وہ آپس میں کسی طریق پر صلح کر لیں تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں اور صلح بہت اچھی چیز ہے۔ اس آیت میں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کا بھی یہی مطلب ہے کہ میاں بیوی سوچیں کہ صلح سے رہنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر

عورت کے قصور کی وجہ سے مرد کو غصہ ہے۔ تو وہ چھوڑ دے اور اگر عورت کا قصور نہیں تو مرد اپنی اصلاح کر لے۔ پس جس طرح اس آیت میں صلح کے متعلق فَلَا جُنَاحَ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اسی طرح فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا میں جہاں اسے ناجائز سمجھنے والوں کے خیال کی نفی کی گئی ہے وہاں لوگوں کو نصیحت بھی کی گئی ہے کہ صفا اور مروہ کا طواف کوئی گناہ کی بات نہیں یعنی تم جو ادھر توجہ نہیں کر رہے تو شاید گناہ سمجھ کر نہیں کر رہے حالانکہ یہ تو ضروری بات ہے۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص نیکی کے کاموں میں اس لئے حصہ لیتا ہے کہ ان کے بدلہ میں اُسے کوئی چیز مل جائے تو یہ ایک سودا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے سودا کرنا کوئی پسندیدہ فعل نہیں۔ عبادت تو انسان کو اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کے شکر کے طور پر بجا لانی چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے اُس پر کئے ہیں۔ نہ اس لئے کہ اگر میں نے عبادت نہ کی تو مجھے کوئی انعام نہیں ملے گا۔ عبادت کے مقابلہ میں انعام کی خواہش ایک ادنیٰ خواہش ہے۔ اصل مقام یہی ہے کہ انسان محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے بے پایاں احسانات کے شکر کے طور پر اپنا سر اُس کے حضور جھکائے اور رات دن اُس کی عبادت میں مشغول رہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا کے الفاظ سے وجوب طواف کی نفی نہیں کی گئی بلکہ مراد یہ ہے کہ عمرہ جتنی بار کرو اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔ اسی طرح حج بھی اگر ایک سے زیادہ دفعہ کر سکو تو یہ بھی تمہارے لئے موجب ثواب ہوگا۔ گویا اس آیت میں وجوبِ طواف کی نفی نہیں بلکہ یہ تحریک کی گئی ہے کہ حج اور عمرہ دونوں بار بار کرنے چاہئیں اور بار بار ان مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے آتے رہنا چاہیے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ۔ فرمایا تم خدا تعالیٰ سے سودا نہ کرو بلکہ اُسی پر سچا توکل رکھو۔ وہ تمہاری نیکیوں کو کبھی ضائع نہیں کرے گا اور تمہیں خود ان کی بہتر سے بہتر جزا دے گا۔ وہ بہت قدر دان اور بہت جاننے والا ہے۔ شاکر کے ساتھ علیم کا اضافہ اس لئے فرمایا کہ انسان کو جو جزائیں ملتی ہیں اُن کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ بعض جزائیں انسان کو تباہ کر دینے والی ہوتی ہیں اور بعض اس کے لئے مفید اور بابرکت ہوتی ہیں۔ اگر کسی اندھے کو عینک لگانے کے لئے دی جائے یا کسی جذامی کو اچھے کپڑے دے دیئے جائیں تو وہ چیزیں اُن کے کسی کام نہیں آسکتیں۔ خواہ وہ کتنی قیمتی کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے فرمایا میں تمہارے حالات کو خوب جانتا ہوں اُنہی کے مطابق میں تمہیں انعام دوں گا اور تمہیں ایسی جزا دوں گا جو تمہیں دائمی طور پر فائدہ پہنچانے والی ہوگی۔

ترتیب وربط: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ والی آیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وَمِنْ حَيْثُ

خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے جو استدلال میں نے کیا تھا وہی صحیح ہے ۔ کیونکہ تحویلِ قبلہ کے مسئلہ سے صفا اور مروہ کے شعائر ہونے کا کوئی تعلق نہیں اور پھر مسلمان تو وہاں جا ہی نہیں سکتے تھے کہ صفا اور مروہ کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ۔ دراصل اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم فتح مکہ کی کوشش کرو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے لئے حج کا راستہ کھل جائے گا ۔ اور صفا اور مروہ پر جانا بھی تمہارے لئے ممکن ہو جائے گا ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ

جو لوگ اس (کلام) کو جو ہم نے کھلے نشانوں اور ہدایت پر مشتمل نازل کیا ہے ۔ بعد اس کے کہ ہم نے اسے لوگوں

بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ

کے لئے اس کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے چھپاتے ہیں ۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور

وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ﴿۱۶۰﴾

(دوسرے) لعنت کرنے والے (بھی) لعنت کرتے ہیں ۔

حل لغات ۔ بَيِّنٰتٌ بَيِّنَةٌ کی جمع ہے اور بَيِّنٰتٌ اُن براہین اور نشانات کو کہتے ہیں جو اپنی صداقت پر آپ شاہد ہوتے ہیں ۔ البینة کے معنے ہیں الدلیل الحجّة دلیل ۔ (اقرب)

هُدًى وہ تعلیمات جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں ۔ اور انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچاتی ہیں ۔

لَعْنَةٌ دُور کرنے کو کہتے ہیں ۔ یعنی کسی کو دھتکار یا جھڑک کر دُور کر دینا ۔ یا اُسے پاس نہ آنے دینا ۔

تفسیر ۔ لَاعِنٌ کے معنے لعنت کرنے والے کے ہوتے ہیں ۔ مگر لعنت کرنے والے دو قسم کے ہو سکتے ہیں ۔ اوّل وہ شخص جسے دوسروں پر لعنتیں ڈالنے اور بُرا بھلا کہنے کی عادت ہو ۔ یہ معنی یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے کیونکہ جو شخص اپنے بھائیوں پر لعنتیں ڈالنے والا ہو وہ بداخلاق اور منافق ہوتا ہے اور قرآن کریم کے خلاف عمل کرتا ہے ۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کے بداخلاق اور منافق طبع لوگ خدا تعالیٰ کا ساتھ دیں ۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا ظل نہیں ہوتے ۔

لَاعِنٌ سے ایسا شخص بھی مراد ہو سکتا ہے جس کے سپرد اللہ تعالیٰ نے یہ کام کیا ہو اور وہ لوگ جن کو ایسے فرائض سپرد کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور مامورین ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام پا کر یہ اعلان کر

دیتے ہیں کہ فلاں شخص پر لعنت پڑے گی اور فلاں اُس کے غضب کا شکار ہوگا۔ پس لَاعِنُوْن سے مراد وہ ہستیاں ہیں جنہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے لعنت کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔

اَلْکِتٰب سے مراد اس جگہ قرآن کریم ہے اور اَلنَّاس سے مراد یہودی نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جنگ کے اعلان کے ساتھ جو ابھی ہوا نہیں بلکہ اس کی طرف اشارے ہو رہے ہیں منافقوں کی منافقت ظاہر ہو جائے گی۔ چنانچہ فرماتا ہے یہ دشمن ایمان لوگ جن کے دلوں میں منافقت ہے جب ان کو قربانی کے احکام سنائے جاتے ہیں تو وہ ایسی تعلیموں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ ان باتوں کو مخالفوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس قسم کے لوگ ہمیشہ علیحدگی میں کہا کرتے ہیں کہ مانا کہ یہ باتیں درست ہیں مگر ان کو دشمنوں کے سامنے پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے لوگوں کی طرف سے خواہ مخواہ مخالفت ہوگی۔ غرض الٰہی سلسلوں میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے احکام نازل ہوتے ہیں جن پر عمل کرنا مخالفوں کی ناراضگی کا موجب ہوتا ہے تو ایسا طبقہ جو دوسروں کی ناراضگی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے مداہنت سے کام لے کر ان کو چھپانا شروع کر دیتا ہے تاکہ نہ لوگوں کو صحیح تعلیم کا علم ہو اور نہ ان کا جذبۂ مخالفت بھڑکے۔ اس قسم کی مداہنت کمزوری کے دور میں نہیں ہوتی۔ بلکہ طاقت اور غلبہ کے دَور میں ہوتی ہے۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں رہے منافقین کا کوئی فتنہ نہیں اُٹھا لیکن جب مدنی زندگی آئی اور اسلام نے طاقت پکڑنی شروع کر دی اور یہ اعلان ہونے لگے کہ جب تک مکہ فتح نہ ہو تم نے جنگ کو جاری رکھنا ہے تو جو لوگ کمزور ایمان والے تھے انہوں نے کافروں سے اپنی حفاظت کی طرح ڈالنی شروع کر دی اور کفار کے پاس جا جا کر اس رنگ میں باتیں کرنی شروع کیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بڑے اچھے آدمی ہیں وہ تو نہیں چاہتے کہ لڑائی ہو مگر جوشیلی طبائع والے ان کو اُکساتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لڑائی ہو جائے۔ اسی طرح بعض لوگ کلام الٰہی پر پردہ ڈالتے اور اُسے چُھپاتے اور دشمنوں کو جا جا کر کہتے کہ تم تسلّی رکھو تم پر کوئی تباہی نہیں آسکتی۔ حالانکہ اگر کفار کے متعلق کوئی خبر دی جائے اور ان کو یہ بتایا نہ جائے کہ تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ نے فلاں انذاری پیشگوئی کی ہے تو پیشگوئی کی شان اور اس کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی۔ لیکن اگر پہلے سے کہہ دیا جائے کہ تم پر عذاب آئے گا۔ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تم توبہ کر لو تو عذاب کے آنے پر ان پر حجت قائم ہو سکتی ہے۔ اور عقلمندوں کے لئے ایک بہت بڑا نشان بن جاتا ہے لیکن منافق محض اس لئے کہ ہمارے تعلقات خراب نہ ہو جائیں ایسی باتوں کو چھپاتے ہیں اور ڈر کے مارے ظاہر نہیں کرتے ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ برکتوں سے کلّی طور پر محروم رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کے علاوہ

جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے لعنت کا اختیار دیا ہوا ہے وہ بھی اُن پر لعنت ڈالیں گے۔ جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور دوسرے مامورین نے بھی اپنے دشمنوں پر لعنتیں ڈالیں بلکہ اب تک لوگ ان پر لعنتیں ڈالتے رہتے ہیں اور قیامت تک ان پر لعنتیں پڑتی رہیں گی۔

بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتب میں بعض جگہ کئی کئی صفحوں میں مخالفین پر لعنت ڈالی ہے۔ اور آپ متواتر لعنت لعنت لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ خیال کرتے ہیں کہ آپ نے نعوذ باللہ انہیں گالیاں دی ہیں۔ حالانکہ آپ نے گالیاں نہیں دیں بلکہ ایک خدائی فیصلہ کا اعلان کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ اپنے بُرے اعمال کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی رحمت سے دُور چلے گئے ہیں۔ جس طرح ایک مجسٹریٹ اگر کسی مجرم کو چھ ماہ قید کی سزا دے تو اس سزا کو درست اور قابلِ قبول قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا شخص جسے گورنمنٹ نے فیصلہ کا کوئی اختیار نہ دیا ہو کسی مجرم کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ اُسے قید کر دیا جائے تو سب لوگ اُسے پاگل تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے انبیاء بھی رُوحانی عالم کے مجسٹریٹ ہوتے ہیں۔ اگر وہ مجرموں کو مجرم قرار نہ دیں اور اُن کے بارہ میں اپنا فیصلہ نافذ نہ کریں تو وہ خود مجرم بنتے ہیں۔ پس اُن کا کسی پر لعنت ڈالنا قانون کے تابع ہوتا ہے اور ایسا کہنا اُن کے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے ضروری ہوتا ہے لیکن دوسرے لوگ جو بلا وجہ لعنتیں ڈالتے رہتے ہیں وہ اپنی بداخلاقی اور کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اُنہیں دوسروں پر لعنت ڈالنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۱﴾

ہاں! مگر جنہوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی اور (خدا کے احکام کو) کھول کر بیان کر دیا تو ایسے لوگوں پر میں فضل کے ساتھ توجہ کروں گا۔ اور میں (اپنے بندوں کی طرف) بہت توجہ کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہوں۔

تفسیر ۔ ہمارے ملک میں عام طور پر لوگ توبہ صرف اس بات کا نام سمجھتے ہیں کہ زبان سے ایک دو دفعہ یہ فقرہ دہرا دیا جائے کہ میری توبہ اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم ایسا کہہ دیں تو ہمارے سارے گناہ بخشے گئے۔ حالانکہ صرف منہ سے توبہ توبہ کہہ دینا اور اپنے اعمال میں کوئی تغیر پیدا نہ کرنا کسی انسان کو مغفرت کا مستحق نہیں

بنا سکتا۔ توبہ درحقیقت تین باتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اول زبان سے اپنے قصور کا اعتراف کرنا۔ دوم اپنی غلطی کے متعلق دل میں ندامت پیدا ہونا۔ سوم جو قصور کیا ہے اس کا عملاً ازالہ کرنا۔ گویا جس مقام پر انسان غلطی کرنے سے پہلے کھڑا ہوا اُسی مقام پر وہ رجوع کر کے آجائے اس قسم کی توبہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ ایک بہت بڑا انقلاب ہے جو انسانی روح میں واقع ہوتا ہے کیونکہ انسان کے دل میں اپنے گناہوں سے شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہونا۔ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت اور روحانیت کے حصول کی خواہش پیدا ہونا اس کے دل کا اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرتے ہوئے پگھل جانا۔ اس کی سفلی خواہشات پر ایک موت کا وارد ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے اُس نے اپنے آپ کو خدا کے لئے صلیب پر لٹکا لیا۔ اور اپنی پہلی زندگی پر موت وارد کر لی۔ عیسائی لوگ جو اسلامی توبہ کی حقیقت سے ناواقف ہیں بالعموم اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اسلام نے توبہ کا دروازہ کھول کر گناہ کا دروازہ کھول دیا ہے۔ حالانکہ اسلام جس توبہ کو پیش کرتا ہے وہ مکمل ہی نہیں ہو سکتی جب تک انسان زبان سے اپنے قصور کا اقرار اور دل سے اپنے فعل پر ندامت کا اظہار نہ کرے اور آئندہ اس سے مجتنب رہنے کا پختہ عہد کرتے ہوئے گذشتہ قصور کا ازالہ بھی نہ کرے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی توبہ گناہ پر دلیری پیدا کر دیتی ہے۔ گناہ پر دلیری تو اُن کا یہ عقیدہ پیدا کرتا ہے کہ ہمارے تمام گناہ مسیح نے اٹھا لئے ہیں۔ اب ہمیں کسی فکر کی ضرورت نہیں لیکن وہ توبہ جسے اسلام پیش کرتا ہے اور جو گذشتہ افعال کے کلّی ترک اور آئندہ کے لئے کلّی طور پر نیکی کے راستہ کو اختیار کرنے اور خدا تعالیٰ کی طرف صدق دل سے رجوع کرنے کا نام ہے وہ گناہ پر دلیری پیدا نہیں کرتی بلکہ گناہ کو بیخ و بُن سے اکھیڑ دیتی ہے اور انسان کو ایک نیا روحانی انسان بنا دیتی ہے۔ اس قسم کی توبہ کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو پوری طرح خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور دل میں ندامت پیدا کرتے اور اپنے گناہ کو دُور کرتے ہیں اور پھر یہیں تک بس نہیں کرتے بلکہ اَصْلَحُوْا وہ دوسروں سے بھی عیوب دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا ان میں اتنا تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور انہیں بدیوں سے اتنا بُغض ہو جاتا ہے کہ وہ صرف اپنی ہی اصلاح نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی بدیوں کو بھی دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں وَبَيَّنُوْا اور نہ صرف اپنے گردوپیش کی اصلاح کرتے ہیں بلکہ علی الاعلان دُنیا کے سامنے اس بات کو پیش کرتے ہیں کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے اور اسی میں دنیا کی نجات ہے فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ فرماتا ہے جب کوئی شخص ایسی توبہ کرتا ہے تو میں بھی فضل کے ساتھ اُس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

توبہ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے رجوع برحمت ہونے اور فضل نازل کرنے کے

ہوتے ہیں۔لیکن جب بندے کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتو اس کے معنی ندامت کا اظہار کرنے اور جرم کا اقرار کرنے اور خدا تعالیٰ کی طرف جھک جانے کے ہوتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنے جرم کا اقرار کر کے ندامت کا اظہار کریں اور خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور دوسروں کی بھی اصلاح کریں اور اسلام پر پوری مضبوطی سے قائم ہوجائیں۔ ایسے لوگوں کے قصور کو معاف کر کے میں پھر ان کو اس مقام پر لا کھڑا کرتا ہوں جہاں وہ پہلے ہوتے ہیں اور پھر میں اپنے پُرانے طریق پر ان کے لئے فضلوں کا سلسلہ شروع کر دیتا ہوں کیونکہ میں بڑا شفقت کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓىِٕكَ عَلَيْهِمْ

جن لوگوں نے انکار کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے ایسے لوگوں پر یقیناً اللہ کی اور فرشتوں کی

لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ خٰلِدِيْنَ

اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔ وہ اس میں (پڑے) رہیں گے نہ (تو)

فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

ان (پر) سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں (سانس لینے کی) مہلت دی جائے گی۔

تفسیر۔ فرماتا ہے ان توبہ کرنے والوں کے بالمقابل جو لوگ کفر کی حالت میں ہی مر گئے۔ ان پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہوگی۔ اسی طرح ملائکہ اور سارے انسانوں کی لعنت ہوگی۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ سارے انسانوں کی اُن پر لعنت ہوگی اس میں اور پہلی آیت میں جس لعنت کا ذکر کیا گیا ہے اس میں یہ فرق ہے کہ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے صرف خاص لوگوں کو لعنت کرنے کی اجازت دی تھی۔ کیونکہ وہاں لعنت سے مراد اُن کی تباہی کی پیشگوئی تھی جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء ہی کیا کرتے ہیں مگر یہاں اُن کے متعلق پیشگوئی کرنا مقصود نہیں کیونکہ یہاں لعنت کرنے والوں میں سب لوگوں کو شامل کر لیا گیا ہے۔ اور سارے کے سارے لوگ تباہی کی پیشگوئیاں نہیں کیا کرتے۔ پس یہاں وہ لعنت مراد ہے جو فطرتی طور پر انسان کے دل سے اٹھتی ہے مثلاً اگر ایک چور کے سامنے بھی اگر چوری کا ذکر ہو تو وہ فوراً کہہ اُٹھتا ہے کہ چور بہت بُرے ہوتے ہیں

حالانکہ وہ خود اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اُس کی فطرت اسے بُرا قرار دیتی ہے۔ اسی طرح یہاں لعنت کرنے سے یہ مراد ہے کہ کفار کے افعال پر ہر ایک شخص خواہ نیک ہو خواہ بدفطرتی طور پر لعنت کرتا ہے بلکہ ایک مجرم خواہ اپنی ذات کو بُرا نہ کہے مگر جرم کو ضرور بُرا کہے گا اور اسی کا نام لعنت ہے۔ خدا اور ملائکہ صفت انسان تو علی الاعلان لعنت کرتے ہیں لیکن باقی دنیا فطری اور اصولی طور پر لعنت کرتی ہے۔ جیسے کوئی قوم جھوٹ کو اچھا نہیں سمجھتی۔ کوئی قوم غیبت چوری اور قتل وغیرہ کو اچھا نہیں سمجھتی۔ ہاں انفرادی طور پر اگر کوئی ان کا ارتکاب کرے تو خود اس کا اپنا نفس اسے شرمندہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نے بے ایمانی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس جگہ اسی قسم کی لعنت مراد ہے کہ خواہ اپنے فعل کو وہ بُرا نہ کہیں مگر دوسروں کے اُسی قسم کے فعل کو دیکھ کر وہ ضرور بُرا کہتے ہیں چنانچہ کسی سے پوچھ کر دیکھ لو وہ یہی کہے گا کہ جھوٹ بُرا ہے غیبت بُری ہے چوری بُری ہے قتل بُرا ہے ظلم بُرا ہے حالانکہ بعض دفعہ وہ خود ان جرائم کا مرتکب ہوتا ہے اسی طرح کوئی قوم بحیثیت قوم اندھیرے میں چھپ کر کسی کو مار ڈالنے کو اچھا نہیں سمجھتی۔ کوئی قوم بحیثیت قوم چوری کو اچھا فعل نہیں سمجھتی۔ کوئی قوم بحیثیت قوم غیبت کو اچھا خیال نہیں کرتی۔ اسی طرح وہ افراد جو اس قسم کے کاموں کو کرتے وقت انہیں اچھا خیال کرتے ہیں وہ بھی دوسرے موقعہ پر انہیں بُرا اور ناجائز سمجھتے ہیں۔ غرض یہ لعنت ایسی ہے جو کہیں نہیں مٹتی کیونکہ انسانی فطرت اس کی ہمنوا ہوتی ہے۔

پھر فرماتا ہے خٰلِدِیْنَ فِیْهَا یہ قانون ایسا ہے جو ہمیشہ قائم رہے گا۔ کئی فلسفے اور تہذیبیں بدل گئیں مگر یورپ آج بھی یہی کہتا ہے کہ جھوٹ بُرا ہے ظلم بُرا ہے چوری بُری ہے غیبت بُری ہے۔ یہ لعنت قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ یونانی اور ایرانی فلسفہ بھی یہی کہتا ہے۔ یوروپین فلسفہ بھی یہی کہتا ہے غرض یہ ایک نہ مٹنے والا اصل ہے اس میں کبھی تغیر نہیں آسکتا۔ کل اگر کوئی اور تہذیب آئے گی تو وہ بھی یہی کہے گی اس کے خلاف کوئی بات نہیں کہہ سکتی۔

لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ فرماتا ہے کہ جب منکرین انبیاء کا پیمانۂ عمل لبریز ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ آسمانی عذاب میں جکڑے جاتے ہیں اور یہ عذاب ایسا ہوتا ہے کہ نہ تو اسے ہلکا کیا جاتا ہے اور نہ انہیں ڈھیل دی جاتی ہے۔ ہاں عذاب کے آنے سے پہلے پہلے ان کے لئے موقع ہوتا ہے کہ وہ توبہ کرلیں۔ لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں اور انکار پر کمربستہ رہیں اور خدائی نشانات کی تضحیک کرتے رہیں تو ایک دن عذاب الٰہی کے کوڑے ان پر برسنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی چیخ و پکار بالکل عبث ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو وہ لوگ جنہوں نے خدا تعالیٰ کے فرستادوں کا مقابلہ کیا۔ ہزاروں سال گذرنے کے باوجود آج بھی ان پر لعنت پڑ رہی ہے۔ نمرود کو ہلاک ہوئے ہزاروں سال گذر گئے۔ فرعون کو

سمندر میں ڈوبے ہزاروں سال گذر گئے۔ وہ فقیہی اور فریسی جنہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر لٹکایا تھا ان پر بھی دو ہزار سال گذر گئے۔ ابو جہل کو جنگِ بدر میں ہلاک ہوئے بھی چودہ سو سال ہو گئے۔ مگر آج بھی ہر شریف انسان نمرؔود کا نام لیتا ہے تو اس پر لعنت ڈالتا ہے۔ فرعون کا نام لیتا ہے تو اس پر لعنت ڈالتا ہے۔ فقیہیوں اور فریسیوں کا ذکر آتا ہے تو ان پر لعنت ڈالتا ہے ابو جہل کا ذکر آتا ہے تو اس پر لعنت ڈالتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے والوں کا ذکر آتا ہے تو ان پر لعنت ڈالتا ہے اور پھر اگلے جہان میں جو انہیں عذاب دیا جا رہا ہے اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غرض یہ عذاب برابر جاری ہے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرستادوں کا مقابلہ کیا۔

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۴﴾ ع ۱۹/۱۱/۳

اور تمہارا معبود (اپنی ذات میں) واحد معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے تمہارا خدا تو ایک ہی خدا ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور پھر وہ رحمٰن اور رحیم ہے ایسی کامل صفات رکھنے والے خدا پر ایمان رکھتے ہوئے تمہیں اپنے دشمنوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری حفاظت کے لئے تمہارا خدا موجود ہے۔ پس تم اس پر توکل رکھو اور اُسی سے مدد مانگتے رہو۔ وہ تمہارے دشمن کو تم پر کبھی غالب نہیں آنے دے گا۔ اور خواہ تمہاری کشتی مشکلات کے بھنور میں کتنے بھی چکر کھائے پھر بھی وہ تمہیں اس میں سے نکال کر ساحل کامیابی پر پہنچا دے گا۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ میں بہشتی مقبرہ سے ایک کشتی پر آ رہا ہوں اور میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ راستہ میں کثرت سے پانی ہے اور ایک طوفان سا آیا ہوا معلوم ہوتا ہے جب ہم پُل والی جگہ کے قریب پہنچے۔ جہاں پہلے صرف دو لکڑیاں لوگوں کے آنے جانے کے لئے رکھی رہتی تھیں تو وہاں میں کیا دیکھتا ہوں کہ کشتی بھنور میں پھنس گئی ہے اور چکر کھانے لگی ہے اس سے سب لوگ جو کشتی میں بیٹھے تھے ڈرنے لگے جب ان کی حالت مایوسی تک پہنچ گئی تو یکدم پانی میں سے ایک ہاتھ نکلا جس میں ایک تحریر تھی اور اس میں لکھا تھا کہ یہاں ایک پیر صاحب کی قبر ہے ان سے درخواست کرو تو کشتی بھنور میں سے نکل جائے گی۔ میں نے کہا۔ یہ تو شرک ہے میں اس کے لئے ہرگز تیار نہیں خواہ ہماری جان چلی جائے میں جوں جوں انکار کرتا گیا چکر بڑھتے گئے۔ اس پر میرے

ساتھیوں میں سے بعض نے کہا کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اور انہوں نے پیر صاحب کے نام ایک رقعہ لکھ کر بغیر میرے علم کے پانی میں ڈال دیا جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے جوش سے کہا کہ یہ شرک ہے اور میں نے فوراً پانی میں چھلانگ لگا دی اور کود کر وہ کاغذ پکڑ لیا اور اُسے باہر لے آیا اور جونہی میں نے ایسا کیا کشتی بھنور میں سے نکل گئی۔ پس مومن پر خواہ کتنی بھی مشکلات آئیں اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ پر توکل رکھے اور اُس کے سوا کسی اور کا خوف اپنے دل میں نہ پیدا ہونے دے۔

یہاں سوال ہو سکتا تھا کہ اچھا اگر وہی ایک معبود ہے تو ہمیں کیا معلوم کہ وہ ہم سے کیا معاملہ کرے گا؟ اس لئے فرمایا کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ وہ ہمیشہ محبت کا ہی معاملہ کرتا ہے اور بندہ کو نہیں چھوڑتا۔ سوائے اس کے کہ بندہ اُسے خود چھوڑ دے۔ وہ پہلے بغیر کسی عمل کے انسان پر اپنے بے انتہا فضل نازل کرتا ہے اور جب بندہ ان سامانوں سے فائدہ اٹھاتا ہے تو رحیمیت کے ماتحت اس پر مزید احسان کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے رحمٰن و رحیم ہونے کی مثال درحقیقت اس بوڑھے کے کھجور لگانے کی سی ہے جس نے بادشاہ سے دو تین دفعہ کئی ہزار روپیہ انعام کے طور پر لے لیا تھا۔ بادشاہ کا خزانہ تو محدود تھا اس لئے وہ منہ پھیر کر چلا گیا مگر ہمارے خدا کا خزانہ محدود نہیں۔ ہمارا بادشاہ تو خود کہتا ہے کہ مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا۔ اور پھر مانگتے چلے جاؤ تا کہ میں تمہیں دیتا چلا جاؤں۔ غرض اللہ تعالیٰ بے انتہا فضل کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ اس کے خزانے غیر محدود ہیں وہ کہتا ہے کہ تم پھر کام کرو تو میں پھر تمہیں انعام دوں گا۔ پھر کرو تو مَیں پھر دوں گا۔ اور ہمیشہ تمہیں اپنے انعامات سے حصہ دیتا چلا جاؤں گا۔

اس جگہ اِلٰـهُكُمْ سے جو شبہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید کسی اور کا خدا بھی ہو گا یا کئی خدا ہوتے ہوں گے اس کا ازالہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سے کر دیا اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ سے اس کی کامل صفات بیان کر کے عقلاً بھی کسی اور اِلٰہ کی ضرورت نہ رہنے دی۔

ترتیب و ربط: اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ ابراہیمی دعا کے مطابق ہم نے تمہارا منہ بیت اللہ کی طرف کر دیا اور پھر فتح مکہ پر اس نے خاص طور پر زور دیا اور بتایا کہ لوگ فتح مکہ کا انتظار کر رہے ہیں فتح ہونے پر وہ اسلام میں جوق در جوق داخل ہو جائیں گے اور چونکہ جنگوں میں کئی قسم کی تکالیف پیش آتی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے صبر کی تلقین کی اور دعائیں مانگنے کی طرف توجہ دلائی اور ساتھ ہی حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کی قربانیوں کی مثال بیان کر کے اس حقیقت کو واضح کیا کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو

کبھی ضائع نہیں کرتا۔ پھر حج اور عمرہ اور صفا اور مروہ کے طواف کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ فرمایا کہ ہم نے جو تمہیں حج کا حکم دیا ہے تو ضرور ہے کہ وہ وقت آئے کہ جس میں تم آسانی سے حج کر سکو اور صفا اور مروہ کا طواف کر سکو۔ غرض ان آیات میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ مکہ ایک دن ضرور فتح ہوگا کیونکہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت کفار مسلمانوں کو بیت اللہ کے قریب بھی نہیں آنے دیتے تھے۔ بلکہ اس کے کئی سال بعد بھی کفار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو طواف نہیں کرنے دیا۔ مگر بتایا کہ ایک وقت آئے گا کہ مکہ پر تمہارا قبضہ ہوگا اور تمہیں حج اور عمرہ میں کسی قسم کی دقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اور پھر آخر میں فرمایا کہ تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور وہ رحمٰن اور رحیم ہے پس تمہیں اُسی سے تعلق رکھنا چاہیے۔ اور دشمنوں کی کثرت کو دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنی توحید کو دنیا میں قائم کرے گا اور تمہیں اپنی رحمانیت اور رحیمیت کے نظارے دکھائے گا۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ

آسمانوں اور زمین کی پیدائش رات اور دن کے آگے پیچھے آنے اور

وَ الۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ

ان کشتیوں میں جو انسانوں کو نفع دینے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں۔ اور اس پانی میں جسے اللہ (تعالیٰ)

اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ

نے بادل سے اتارا پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کیا

مَوۡتِهَا وَ بَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ

اور اس میں ہر ایک قسم کے جانور پھیلائے۔ اور ہواؤں کے ادھر اُدھر پھیلانے میں اور ان بادلوں میں

السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۵﴾

جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں (یقیناً) اس قوم کے لئے جو عقل سے کام لیتی ہے کئی (قسم کے) نشان ہیں۔

حل لغات۔ اِخۡتِلَافٌ یہ اِخۡتَلَفَ کا مصدر ہے اور اِخۡتَلَفَ زَیۡدٌ عَمۡرًوا کے معنے ہیں کَانَ

خَلِيْفَتُهٗ یعنی زید عمرو کا قائم مقام ہوا۔ وَجَعَلَهٗ خَلْفَهٗ اُسے اپنے پیچھے کیا۔ اسی طرح اس کے ایک معنے ہیں اَخَذَهٗ مِنْ خَلْفِهٖ۔ اُسے پیچھے سے پکڑا۔ (اقرب)

مفردات امام راغب میں لکھا ہے اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ کے معنے ہیں فِيْ مَجِيْءِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا خَلْفَ الْاٰخِرِ وَتَعَاقُبِهَا۔ یعنی رات اور دن کا ایک دوسرے کے آگے پیچھے آنا۔ (مفردات)

اَلْفُلْكُ کے معنے ہیں اَلسَّفِيْنَةُ۔ کشتی (اقرب) یہ لفظ مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی۔ اسی طرح یہ لفظ واحد اور جمع دونوں طرح بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں دونوں کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک جگہ آتا ہے اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (الصافات: ۱۴۱) یہ واحد کی مثال ہے۔ دوسری جگہ فرماتا ہے حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ (یونس: ۲۳) اس میں فُلْك کی طرف هُمْ جو جمع کی ضمیر ہے پھیری گئی ہے گویا یہاں یہ لفظ جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

تفسیر۔ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ یعنی تمہارا معبود اپنی ذات میں اکیلا اور واحد خدا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور وہ بے انتہا کرم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ اب اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمانیت اور رحیمیت کے مختلف نظائر کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ہستی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کی طرف بنی نوع انسان کو توجہ دلاتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ اس پیدائش میں عقلمند قوم کے لئے بڑے بھاری نشان ہیں۔ یعنی اگر وہ سوچیں اور غور سے کام لیں تو اس امر کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کا انسانی زندگی کے ساتھ تعلق نہ ہو۔ اور یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کے پیچھے صرف اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ انسان کی کسی کوشش اور عمل کا اس میں دخل نہیں چنانچہ دیکھ لو۔ ہوا اور پانی اور سورج اور چاند اور ستارے انسان کے کسی عمل کے نتیجہ میں اسے نہیں ملے بلکہ محض اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحمانیت کے ظہور کے طور پر ان کو بنی نوع انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو انسان ایک لحمہ کے لئے بھی دنیا میں زندہ نہ رہ سکتا۔ پھر آسمانوں اور زمین میں اگر ایک معین قانون کام نہ کر رہا ہوتا اور ایک غیر متبدل نظام جاری نہ ہوتا تب بھی انسانی زندگی بے کار ہو کر رہ جاتی مگر اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیا کی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے بنائی وہاں اس نے ہر چیز کو ایک قانون کا بھی پابند بنا دیا تا کہ انسان بغیر کسی خطرہ کے ترقی کر سکے۔ اور زمین اور آسمان کی ہر چیز اس کی خدمت میں مصروف رہے۔ اس حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا

تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (الملک: ۴،۵) یعنی بہت برکت والا ہے۔ وہ خدا جس نے سات آسمان درجہ بدرجہ بنائے اور تو رحمٰن خدا کی پیدائش میں کوئی رخنہ نہیں دیکھتا۔ تو اپنی آنکھ کو اِدھر اُدھر پھیر کر اچھی طرح دیکھ۔ کیا تجھے خدا کی مخلوق میں کسی جگہ بھی کوئی نقص نظر آتا ہے؟ پھر بار بار اپنی نظر کو چکر دے آخر وہ تیری طرف ناکام ہو کر لَوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔ یعنی اُسے نظامِ عالم میں کوئی بھی خلافِ قانون بات یا نقص نظر نہیں آئے گا۔ غرض کارخانہ عالم کا ایک معین قانون سے وابستہ ہونا اور زمین و آسمان اور سورج اور چاند اور ستاروں کا اس قانون کے ماتحت ہمیشہ چلتے چلے جانا اور کبھی اس میں کوئی انحراف واقع نہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ اس کائنات کو بنانے والا یقیناً ایک خدا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ بنانے والے ہوتے جیسا کہ عیسائی تین خداؤں کے قائل ہیں تو ایک ہی قانون ہر جگہ کام کرتا دکھائی نہ دیتا بلکہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی رخنہ واقع ہو جاتا۔ پس آسمانوں اور زمین کی پیدائش کی طرف توجہ دلا کر اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کا ثبوت بھی پیش کر دیا اور اپنی وحدانیت کا بھی اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ رحمٰن ہے یعنی اپنی مخلوق پر بے انتہا کرم کرنے والا اور انہیں ایسے انعامات سے فیضیاب کرنے والا ہے جن میں بندوں کی کسی کوشش یا عمل کا دخل نہیں۔ اسی طرح آسمانوں اور زمین کی پیدائش اس کی صفت رحیمیت کا بھی ثبوت ہے کیونکہ دنیا میں جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بہتر سے بہتر نتائج پیدا کرتا ہے یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے زمین میں ہل چلایا ہو اور بیج ڈالا ہو اور پانی دیا ہو اور نگرانی کی ہو اور پھر اسے ایک دانہ کے بدلہ میں کئی کئی سو دانے نہ ملے ہوں۔ یا کسی نے صحیح محنت کی ہو اور وہ اپنی محنت کے پھل سے محروم رہا ہو۔ یہ دونوں صفات پہلو بہ پہلو چل رہی ہیں۔ رحمانیت کا بھی ظہور ہو رہا ہے اور رحیمیت کا بھی ظہور ہو رہا ہے اور ہر چیز اپنے وجود سے خدا تعالیٰ کی طرف انگلی اُٹھا کر اس کی ہستی کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہستی کا علم ایسا ہے جو دوسری چیزوں کے علم اور معرفت کے بعد حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ کلّی علم ہے۔ بعض چیزیں اپنی ذات میں نظر آنے والی ہوتی ہیں ان کے دیکھنے سے انسان کو ان کا علم ہو جاتا ہے۔ مثلاً بچہ کے سامنے اگر ہم انگلی رکھیں اور قطع نظر اس سے کہ وہ اس قسم کی تفصیلات معلوم کرے کہ اُس انگلی کے پیچھے ایک پنجہ ہے اور اس پنجہ کے پیچھے ایک بازو ہے اور اس بازو کے پیچھے ایک کندھا ہے۔ وہ کندھا گردن کے واسطہ سے سر سے ملتا ہے اور اس سر میں ایک دماغ ہے جس کے حکم سے ان چیزوں نے حرکت کی ہے اور پھر یہ انگلی میرے سامنے آئی ہے۔ وہ یہ سمجھ لے گا کہ اتنی لمبی اور اتنی موٹی ایک چیز میرے سامنے آ گئی ہے پس انگلی کا علم باقی علم کی

ضرورت کا پابند نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کا علم کلی علم کے طور پر ہے اور جب تک جزئیات کا علم نہ ہو اس وقت تک کُلّی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہم خدا تعالیٰ تک اس کی مخلوقات کے ذریعے سے پہنچتے ہیں اور پھر اس میں بھی تکمیل کے بعد تکمیل اور وسعت کے بعد وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک چیز کے علم کے بعد دوسری چیز کا علم حاصل ہوتا ہے اور دوسری چیز کے بعد تیسری چیز کا۔ اور تیسری کے بعد چوتھی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مخلوق کی جزئیات کا علم ہوتے ہوتے انسان خدا تعالیٰ تک معرفت پیدا کرتا جاتا ہے۔ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ انسان بھی اگر غور کرے تو اس کے لئے بھی خدا تعالیٰ کی ہستی کی دلیل موجود ہے۔ جیسے ایک اعرابی سے کسی نے پوچھا کہ تم خدا کو کیوں مانتے ہو تو وہ ہنس پڑا کہ میں اتنا پاگل تو نہیں ہوں کہ خدا کو بھی نہ پہچان سکوں۔ بکریوں کی مینگنیاں راستہ میں پڑی ہوئی ہوتی ہیں تو میں ان کو دیکھ کر سمجھ لیتا ہوں کہ یہاں سے بکری گذری ہے اونٹ کا پاخانہ پڑا ہوا ہو تو اُسے دیکھ کر میں سمجھ لیتا ہوں کہ ادھر سے اُونٹ گذرا ہے تو کیا اتنی وسیع دنیا کو دیکھ کر میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک خدا موجود ہے جو اس ساری دنیا کا خالق اور اس نظام کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ ایک بسیط علم ہے جس پر فلسفیوں نے اعتراض کیا ہے کہ آخر اتفاقات بھی تو ہوتے ہیں۔ اس لئے خالی زمین وآسمان کی پیدائش اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ ان کا کوئی خالق ہے۔ بعض چیزیں اتفاقاً بھی ہوجاتی ہیں اور تمام لوگ کہتے ہیں کہ یہ اتفاقی بات ہے۔ قرآن مجید نے فلسفیوں اور مفکرین یورپ کے اس اعتراض کی تردید میں یہ دلیل دی ہے کہ خالی اس دنیا کا وجود بیشک خدا تعالیٰ کے خالق ہونے کی مکمل دلیل نہیں اور تم اس کو اتفاقی کہہ سکتے تھے مگر اس تمام عالم میں ایک ترتیب کا پایا جانا اور ہر چیز کا دوسری چیز کے ساتھ جوڑ موجود ہونا اور ہر چیز اور اس کے ذرہ ذرہ میں حکمت کا پایا جانا یہ سب کچھ اتفاقی نہیں بلکہ اس دنیا کی ترتیب اور ہر چیز کا دوسری چیز کے ساتھ جوڑ اور ہر ذرہ کی حکمت یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اس سارے نظام اور ساری دنیا کا پیدا کرنے والا خدا موجود ہے جس نے حکمت کے ماتحت اس ساری دنیا کو پیدا کیا ہے اُس نے انسان کی آنکھ پیدا کی جس میں دیکھنے کی طاقت رکھی تو اس کے مقابل میں سورج کے اندر روشنی پیدا کی جس کے ذریعہ سے انسان دیکھتا ہے۔ ناک پیدا کی جس سے انسان سونگھتا ہے تو اس کے مقابل میں خوشبو پیدا کی۔ کان پیدا کیا جس سے انسان سنتا ہے تو اس کے مقابل میں ہوا میں یہ خصوصیت رکھی کہ وہ جنبش کرتی ہے اور اس کے ذریعہ سے کان تک آواز پہنچتی ہے۔ اب کیا دیکھنے کے لئے آنکھ اگر اتفاقاً پیدا ہوگئی ہے تو اس کے مقابل میں سورج کی روشنی بھی اتفاقاً پیدا ہوگئی؟ سونگھنے کے لئے اگر ناک اتفاقاً پیدا ہوگئی تو کیا اس کے مقابل میں خوشبو بھی اتفاقاً پیدا ہوگئی؟ اگر سننے کے لئے کان اتفاقاً پیدا ہوگئے تو کیا اس کے مقابل میں ہوا کے اندر بھی جنبش کر کے کانوں تک آواز پہنچانے کی قابلیت

اتفاقاً پیدا ہو گئی؟ پس ان چیزوں کے اندر اگر کوئی جوڑ نہ ہوتا۔ کوئی ترتیب نہ ہوتی اور کوئی حکمت نہ ہوتی تو ان کو اتفاق کہا جا سکتا تھا لیکن دنیا کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جس میں کوئی ترتیب نہ ہو کوئی ذرہ ایسا نہیں جس میں حکمت نہ ہو۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کا کسی دوسری چیز سے جوڑ اور وابستگی نہ ہو تو ہم کس طرح مان لیں کہ یہ ساری کی ساری چیزیں اور یہ سارے کا سارا نظام خود بخود اور اتفاقی ہے۔ مگر یہ دلیل اُسی صورت میں فائدہ دے سکتی ہے جب انسان بڑا ہو اور ان چیزوں پر غور کرے۔ آنکھوں سے دیکھے؟ دل و دماغ سے سوچے۔ ادھر ان چیزوں پر نگاہ ڈالے ادھر اپنے دل کے جذبات پر غور کرے۔ سورج اور چاند کی روشنی کو دیکھے ہوا اور اس کے اثرات پر غور کرے۔ گرمی اور سردی کے اثرات کو دیکھے۔ سبزیوں اور ترکاریوں کے پیدا ہونے اور ان کی خاصیتوں پر غور کرے۔ جب تک وہ ان چیزوں پر غور کرنے اور ان سے نتیجہ نکالنے کی اہلیت نہیں رکھتا اس وقت تک وہ خدا تعالیٰ تک کس طرح پہنچ سکتا ہے؟ یہ بات خلافِ عقل ہے کہ ایک بچہ ان تمام چیزوں پر غور کر کے اس نتیجہ تک پہنچ جائے کہ ایک خدا موجود ہے۔ بچہ تو سب سے پہلے اپنی ماں سے روشناس ہوتا ہے اور اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے پھر جب اس کو پتہ لگتا ہے کہ ماں کو بھی سب چیزیں باپ ہی لا کر دیتا ہے تو پھر وہ باپ سے محبت کرتا ہے۔ بڑا ہو کر جب اپنی گلی کے بچوں سے کھیلتا ہے تو پھر ان سے محبت کرتا ہے اگر اس کا کوئی دوست نہ ملے تو رونے لگ جاتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ میرے دوست کو بلاؤ اس کے بغیر میرا گذارہ نہیں۔ پھر کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں کا شوق پیدا ہوتا ہے تو ان سے محبت کرتا ہے۔ اگر اُس کی مرضی کے مطابق کھانا نہ ملے یا مرضی کے مطابق کپڑا نہ ملے تو روٹھ جاتا ہے کہ میرا اس کے بغیر گذارہ نہیں پھر اور بڑا ہوتا ہے تو سیر و شکار سے محبت کرتا ہے اور ان چیزوں کے بغیر اپنی زندگی بے لطف سمجھتا ہے۔

غرض یہ چیزیں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آتی ہیں اور ہر ایک کے متعلق وہ یہی اندازہ لگاتا ہے کہ اس کے بغیر میرا گذارہ نہیں۔ گویا وہی اس کا خدا ہوتا ہے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ ان چیزوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ پہلے ماں سے محبت ہوتی ہے تو اُسی کو اپنا خدا سمجھتا ہے پھر باپ سے محبت ہوتی ہے تو اسی کو اپنا خدا سمجھتا ہے۔ پھر بھائیوں اور دوستوں سے محبت ہوتی ہے تو ان کو اپنا خدا سمجھتا ہے پھر کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں سے محبت ہوتی ہے تو ان کو اپنا خدا سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب عاقل و بالغ ہو جاتا ہے تو پھر اگر اس پر خدا کا فضل ہو جائے اچھا استاد مل جائے جو اسے علم سکھائے اور ماں باپ بھی اچھی طرح تربیت کرنے والے ہوں تب وہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر حقیقی خدا کی طرف آ جائے گا اور سمجھ لے گا کہ یہ سب نقلی خدا تھے جن کو میں نے اپنی خواہشات کے ماتحت سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ اصل خدا تو وہ ہے جو ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ غرض پہلے غیر اللہ کی محبت انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور

وہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی کا سارا انحصار انہی پر ہے۔لیکن ایک ایک کر کے پھر ان کو چھوڑتا چلا جاتا ہے پہلے ماں کی گود کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے اور اس سے الگ ہونے میں اپنی ہلاکت سمجھتا ہے۔ پھر بڑا ہوتا ہے تو بھائیوں اور دوستوں سے محبت کرنے لگتا ہے اور اپنی زندگی کا تمام سُکھ اور راحت انہیں کے ساتھ کھیلنے میں سمجھتا ہے جب ان کے ساتھ مل کر کھیل رہا ہو تو ماں کے بلانے پر بھی نہیں جاتا۔اس کی ساری خوشی کھیلنے میں ہوتی ہے۔پھر اور بڑا ہوتا ہے تو سیر و شکار سے محبت ہوتی ہے پھر صحن اور گلی میں کھیلنے کو بھول جاتا ہے اور اس کی ساری خوشیاں سیر و شکار میں مرکوز ہو جاتی ہیں اگر اس کو ان چیزوں سے روکا جائے تو اس میں اپنی ہلاکت سمجھتا ہے لیکن آہستہ آہستہ آپ ہی آپ ان سب کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔یہاں تک کہ جب بلوغت کو پہنچ جاتا ہے تو غور و فکر کے بعد خدا کی حقیقی شکل اس کو نظر آجاتی ہے اور ان تمام چیزوں کو لغو سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے اسی ترتیب طبعی کے ماتحت مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے ایک ستارہ کو چمکتا ہوا دیکھا تو اس کو اپنا خدا سمجھ لیا۔پھر چاند کو دیکھا کہ ستارہ سے بڑا اور اس سے زیادہ روشن ہے تو اس کو اپنا خدا سمجھ لیا۔پھر سورج کو دیکھا کہ ستارے اور چاند دونوں سے بہت بڑا اور بہت زیادہ روشن ہے تو اس کو اپنا خدا سمجھ لیا۔مگر جب ایک ایک کر کے سب چُھپ گئے تو آپ نے فرمایا اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (الانعام:۹) یعنی میں نے تمام کج راہوں سے بچتے ہوئے اپنی توجہ اس خدا کی طرف پھیر دی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آخر میں آپ خدا تعالیٰ پر ایمان لے آئے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ واقعہ تو درست نہیں مگر مفسّرین کا دماغ اس بات تک صحیح پہنچا ہے کہ انسانی دماغ بغیر الہام کے جب ہدایت پاتا ہے تو ادنیٰ سے اعلیٰ تک جاتا ہے۔ بچے کے نزدیک ابتداء میں اُس کی ماں ہی سب کچھ ہوتی ہے یا دوسرے لفظوں میں اُس کا خدا ہوتی ہے بلکہ اس کو ماں کی بھی خبر نہیں ہوتی وہ سب سے پہلے پستان ہی کو خدا سمجھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے اس سے دودھ ملتا ہے اگر پستان نہ ملے تو روتا ہے۔پھر ماں کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے۔پھر باپ کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے۔پھر بھائی سے محبت کرتا ہے پھر ساتھ کھیلنے والوں سے محبت کرتا ہے گلی اور محلے والوں سے محبت کرتا ہے پھر دوسری ضروریات کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں سے محبت کرنے لگتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر اپنا مقصود سمجھتا ہے۔مگر آہستہ آہستہ ان سب کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ چیزیں اسے خدا تک پہنچا دیتی ہیں۔اگر سال یا چھ مہینے کے بچہ کے اندر بولنے اور سمجھنے کی طاقت ہوتی اور اُسے کہا جاتا کہ تُو بڑا ہو کر اپنی ماں کی گود کو چھوڑ دے گا تو وہ اس بات سے اتنا ہی حیران ہوتا جتنا کہ ایک سائنس دان اس بات سے حیران ہوتا کہ اُسے کہا جائے آگ جلاتی نہیں بلکہ بجھاتی ہے یا سورج روشنی نہیں دیتا۔یا چاند کی روشنی

مکتسب نہیں بلکہ آپ ہی آپ ہے۔ غرض جس طرح ایک سائینسدان ان اوپر کی باتوں سے حیران ہوگا وہ بچہ بھی اگر اس کو یہ بات سمجھائی جاسکتی کہ ایک دن وہ اپنی ماں کی گود سے اُتر جائے گا اور اس کی رغبت اپنی ماں سے کم ہو جائے گی حیران ہوتا۔ اگر سات آٹھ سال کے بچہ کو یہ بات کہہ دی جائے کہ بڑا ہو کر تُو ایک عورت سے شادی کرے گا اور اس سے تیری رغبت زیادہ ہو جائے گی اور تو اپنی ماں کو چھوڑ دے گا تو وہ کہے گا کہ میں ایسا پاگل تو نہیں ہوں کہ اپنی ماں کو چھوڑ دوں۔ وہ اور ہوں گے جو ایسا کرتے ہیں میں تو کبھی اس طرح نہیں کروں گا۔ پس یہ ایک فطرتی چیز ہے کہ انسان مختلف وقتوں میں مختلف چیزوں سے رغبت کرتا ہے اور جس وقت وہ اس چیز سے رغبت کر رہا ہوتا ہے اس وقت وہ یہ وہم بھی نہیں کر سکتا کہ ایک دن میں اس چیز کو چھوڑ دوں گا۔ اور جب بڑا ہوتا ہے تو پھر اس بات کا اسے خیال بھی نہیں آتا کہ کسی وقت میں اس چیز سے رغبت رکھتا تھا اور اس کے بغیر اپنی زندگی حرام سمجھتا تھا۔ یہی معنے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ہیں کہ پہلے انسان غیر اللہ کی طرف توجہ کرتا ہے جو بظاہر غیر اللہ کا راستہ ہے مگر اللہ تک پہنچنے کا اصل راستہ یہی ہے۔ اگر بچہ کے اندر پستان کی محبت نہ ہوتی تو اُس کے اندر ماں کی محبت بھی کبھی نہ ہوتی۔ اگر بچہ کو ماں سے محبت نہ ہوتی تو اس کو باپ سے بھی کبھی محبت نہ ہوتی۔ اگر بچہ کو باپ سے محبت نہ ہوتی تو اس کو بھائی اور بہنوں سے بھی کبھی محبت نہ ہوتی اگر بچہ کو بھائی بہنوں سے محبت نہ ہوتی تو اس کو دوستوں اور ساتھ کھیلنے والوں سے بھی کبھی محبت نہ ہوتی۔ اور اگر اس کو اپنے اپنے وقت پر ان اشیاء سے رغبت نہ ہوتی تو سچی بات یہ ہے کہ وہ خدا کو بھی اپنے وقت پر نہ پا سکتا۔ بات یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت میں جو خلا محسوس کرتا ہے اُس کو پُر کرنے کے لئے وہ مختلف وقتوں میں مختلف چیزوں سے رغبت کرتا ہے کہ شاید یہ چیز میری ضرورت کو پورا کر دے۔ جب اُس چیز سے اس کی تسلّی نہیں ہوتی تو پھر دوسری چیز سے رغبت کرتا ہے کہ شاید اس چیز سے میری ضرورت پوری ہو جائے۔ پھر جب اس چیز سے بھی اس کا خلا پُر نہیں ہوتا تو تیسری چیز سے رغبت کرتا ہے کہ شاید یہاں میرا مقصد مل جائے جب اس سے بھی اسے طمانیت حاصل نہیں ہوتی تو پھر چوتھی چیز سے رغبت کرتا ہے کہ شاید یہی میرا مقصود ہو۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے ان تمام چیزوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے اور آخر خدا تک جا پہنچتا ہے اور جب اس کو اللہ مل جاتا ہے تو اس کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر اس مقام سے نہیں ہلتا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (النجم: ۴۳) کہ ان تمام چیزوں میں سے جو غیر اللہ ہیں گذر کر ایک دن انسان اپنی منزل مقصود یعنی خدا تک جا پہنچتا ہے اور وہ فوراً ہی اس منزل پر نہیں پہنچ جاتا بلکہ راستہ میں کئی چیزیں آتی ہیں جن کو بچپن کی وجہ سے خدا سمجھ لیتا ہے مگر آہستہ آہستہ اُن سب کو چھوڑتا چلا جاتا ہے اور ہر چیز اس کی انگلی پکڑ کر اُس کو خدا کے قریب کر دیتی ہے۔

زیرتفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر تم نظامِ عالم پر غور کرو تو تمہیں ذرہ ذرہ میں خدا تعالیٰ کا وجود نظر آئے گا۔اور تمہیں اقرار کرنا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان جس قدر اشیاء پیدا کی ہیں ان تمام کو حق و حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے یعنی ان کی پیدائش بلا وجہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے کوئی بہت بڑا مقصد کام کر رہا ہے اور چونکہ وہ مقصد اس دنیا میں پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔اس لئے ضروری ہے کہ انسانی زندگی اسی دنیا تک محدود نہ ہو تا کہ وہ اس نظام کی عظمت کے مطابق اس اعلیٰ مقام کو حاصل کرلے جس کے لئے اس کی پیدائش معرضِ وجود میں آئی ہے۔اگر انسان کی زندگی صرف اس دنیا تک ختم ہو جانے والی ہوتی تو اس کے لئے اتنا بڑا انظام جاری کرنا جس کے اسرار کو علوم کی انتہائی ترقی کے باوجود ابھی تک سائینس دان بھی معلوم نہیں کر سکے ایک لغو اور خلافِ عقل فعل قرار پاتا ہے۔

مجھے یاد ہے ۱۹۴۶ء میں جب ہم نے قادیان میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے افتتاح کے لئے ڈاکٹر سر شانتی سروپ صاحب بھٹنا گر ڈائریکٹر سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ گورنمنٹ آف انڈیا کو بلوایا تو انہوں نے تقریر کرتے ہوئے یہی کہا کہ آج سائینس دان کے غرور کا سر اس قدر نیچا ہو چکا ہے کہ وہ ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ سائینس ان اشیاء کی بھی مناسب تشریح کر سکتی ہے جو ظاہری طور پر ہمیں نظر آتی ہیں اور جب زمین و آسمان میں اس قدر اسرار پائے جاتے ہیں کہ سائینس اپنی تمام ترقی کے باوجود ابھی مادیات میں سے بھی ایک بہت چھوٹے سے حصے کی تشریح کر سکی ہے تو پھر اس وسیع کائنات کو جس وجود کے لئے ایک خادم کے طور پر پیدا کیا گیا ہے اس کی پیدائش کو عبث قرار دینا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔

پھر فرماتا ہے وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۔رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں بھی عقلمند لوگوں کے لئے بڑے بھاری نشان ہیں ۔ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے پھر اپنی رحمانیت کا ثبوت پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کئے اور سورج اور چاند اور ستارے وغیرہ بنائے۔اسی طرح اُس نے اپنی رحمانیت کے ماتحت یہ بھی انتظام کیا ہوا ہے کہ رات اور دن کا ایک تسلسل جاری ہے۔اور ہر رات کے بعد ایک دن کا ظہور ہوتا ہے۔اگر رات نہ آتی تو انسان اپنی طاقتوں کو کھو بیٹھتا۔اور اگر دن نہ چڑھتا تو انسانی زندگی بے کار ہو کر رہ جاتی۔پس اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے ماتحت رات اور دن بنا دیئے تا کہ انسان اپنی نیند پوری کر کے قویٰ میں تازگی حاصل کرے اور دن بھر کام کر کے اپنے آپ کو مفید وجود بنائے۔رات اور دن کی طرف توجہ دلا کر اللہ تعالیٰ نے روحانی رنگ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے مادی ظلمت کو دور کرنے کے لئے انتظام کر

رکھا ہے روحانی طور پر بھی ظلمت اور نور کا ایک سلسلہ جاری ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کر رکھے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں روحانی ظلمتیں کافور ہوتی رہتی ہیں۔ ان سامانوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ ملائکہ انسانی قلوب میں نیک تحریکات کرتے رہتے ہیں اور انہیں ظلمات سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب بنی نوع انسان کی اکثریت ظلمت میں گرفتار ہو جائے اور ملکی تحریکات ان پر اثر نہ کریں اور شیطان اُن پر تسلّط جما لے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء اور مامورین کے ذریعہ ان کی ظلمتوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ لوگ روحانی عالم کے آفتاب و ماہتاب ہوتے ہیں اور ان پر ایمان لانے والے ستاروں کی طرح دنیا کی ہدایت کا موجب بنتے ہیں۔ غرض اِخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّھَارِ میں اللہ تعالیٰ نے رحمانیت کے اس فیضان کی طرف توجہ دلائی ہے جس کے ذریعہ ملائکہ اور انبیاء اور مامورین اور مجدّدین اور اولیاء وغیرہ بنی نوع انسان کو ظلمات سے نور کی طرف لے جاتے ہیں اور دنیا کو تباہ ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں۔

وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ جیسے کشتیوں اور جہازوں کے بغیر تم سمندروں میں نہ ایک طرف کا مال دوسری طرف پہنچا سکتے ہو اور نہ وہاں سے کوئی مال اپنے استعمال کے لئے لا سکتے ہو۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے رُوحانی دنیا میں بھی بعض ایسے وجود بنائے ہیں جو لوگوں کے لئے کشتی کا کام دیتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے فیضان لاتے ہیں اور تمہیں زمین سے اُٹھا کر خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتے ہیں پھر جس طرح وہی شخص سمندری طوفانوں سے محفوظ رہ سکتا ہے جو کشتی میں سوار ہو اسی طرح روحانی بلاؤں اور آفات سے بھی وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو اپنے زمانہ کے روحانی نجات دہندہ کی کشتی میں سوار ہو۔

وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ زمین کو حیاتِ تازہ بخشنے کے لئے آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے اسی طرح وہ لوگوں کی روحانی تشنگی فرو کرنے کے لئے آسمان سے ہی وحی نازل کیا کرتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ جسمانی بارش کو تو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن جب آسمان سے وحی الٰہی کی بارش نازل ہو تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہؓ سے وحی الٰہی کی بارش سے فائدہ اُٹھانے اور نہ اُٹھانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا میں تین قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی مثال اچھی زمین کی طرح ہوتی ہے۔ جو نرم ہو۔ پانی کو اپنے اندر جذب کرنے کی قابلیت رکھتی ہو اور پھر اچھی کھیتی اُگا سکتی ہو۔ جب بارش نازل ہوتی ہے تو وہ زمین بارش کے پانی کو سمیٹ لیتی اور اُسے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور پھر زمین سے کھیتی نکلتی اور لوگوں کے کام آتی ہے گویا وہ خود بھی پانی پیتی

ہے اور باقی لوگوں کے لئے بھی غذا مہیا کرتی ہے۔ اور دوسری قسم کے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی مثال اس زمین کی طرح ہوتی ہے جو سخت ہو لیکن اپنے اندر نشیب رکھتی ہو۔ جب پانی گرتا ہے تو وہ اس زمین میں جمع ہو جاتا ہے اور گو ایسی زمین خود پانی نہیں پیتی لیکن چونکہ وہ پانی کو جمع کر لیتی ہے اس لئے وہ پانی جانور پیتے ہیں آدمی استعمال کرتے ہیں اور اپنے کھیتوں کو اس پانی سے سیراب کرتے ہیں لیکن ایک تیسری قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی مثال اس سخت اور پتھریلی زمین کی طرح ہوتی ہے جو نہ صرف سخت اور پتھریلی ہو بلکہ مسطّح اور ہموار بھی ہو۔ اس میں کوئی گڑھا نہ ہو جب آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے تو نہ وہ آپ پانی پیتی ہے کیونکہ وہ سخت اور پتھریلی ہوتی ہے اور نہ پانی جمع کرتی ہے کیونکہ وہ مسطّح اور ہموار ہوتی ہے (بخاری کتاب العلم باب فضل من عَلِمَ و عَلَّمَ)۔ پھر فرمایا پہلی مثال تو اس شخص کی ہے جو عالم باعمل ہو۔ وہ دین حاصل کرتا ہے اور نہ صرف خود اس کے احکام پر عمل کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور ان کو عامل بنانے کی کوشش کرتا ہے گویا وہ عالم بھی ہوتا ہے اور عامل بھی ہوتا ہے۔ وہ تعلیم بھی حاصل کرتا ہے اور معلّم بھی ہوتا ہے۔ لیکن تیسری قسم کا آدمی نہ عامل ہوتا ہے اور نہ معلم ہوتا ہے نہ خود فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ دوسری مثال بوجہ اس کے کہ دونوں مثالوں سے حل ہو جاتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی مگر ہر شخص ادنیٰ غور سے سمجھ سکتا ہے کہ دوسری مثال اس شخص کی ہے جو معلم تو ہے مگر عامل نہیں۔ وہ دین سیکھتا ہے اُس کے احکام سنتا ہے اس کی تعلیموں سے واقفیت رکھتا ہے مگر خود دین دار نہیں ہوتا۔ ایسا شخص چونکہ خدا اور اس کے رسول کی باتیں دوسروں تک پہنچاتا رہتا ہے اس لئے وہ بھی ایک مفید وجود ہوتا ہے گو ذاتی طور پر وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین قسم کے انسانوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کے آنے پر یہی تین گروہ دنیا میں نظر آتے ہیں یعنی کچھ تو ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ان کی تعلیموں پر عمل کرتے اور وحی الٰہی کی بارش سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اعراض سے کام لیتے اور انبیاء کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو دین کو سمجھتے تو ہیں مگر اپنی غفلت اور سستی کی وجہ سے اس پر عمل نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ مادی بارش کا ذکر فرما کر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ جس طرح تم بارش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہو۔ اسی طرح تمہارا فرض ہے کہ تم اس روحانی بارش سے بھی فائدہ اُٹھاؤ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل ہوئی ہے اور ان پتھروں کی طرح مت بنو جو بارش کا کوئی قطرہ اپنے اندر جذب نہیں کرتے۔ پھر جس طرح آسمان سے بارش برستی ہے تو زمین کی اندرونی تہوں میں جو پانی مخفی ہوتا ہے اس میں بھی جوش پیدا ہوتا ہے اور کنوؤں کا پانی بھی چڑھ آتا ہے اسی طرح انبیاء پر جب وحی الٰہی کی بارش نازل ہوتی ہے تو

عوام النّاس کو بھی کثرت کے ساتھ خوابیں آنی شروع ہو جاتی ہیں اور ان کی توجہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف پھر جاتی ہے چنانچہ اس زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت میں ہزار ہا لوگوں کو خوابیں آئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس قسم کی خوابیں اکٹھی کی جائیں تو ایک بہت بڑی کتاب بن سکتی ہے۔

اسی طرح وحی الٰہی کے فیضان کے دائرہ کو اللہ تعالیٰ اس رنگ میں بھی وسیع کر دیتا ہے کہ جو لوگ انبیاء پر ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ ان کے دماغوں میں بھی ایک نئی روشنی پیدا کر دیتا ہے اور ان کی عقلیں تیز ہو جاتی ہیں ان کا فکر بلند ہو جاتا ہے ان کی فراست ترقی کر جاتی ہے اور ان کی دماغی صلاحیتیں زیادہ تیزی سے اُبھرنے لگتی ہیں۔

پھر فرماتا ہے خدا تعالیٰ کے نشانوں میں سے ایک یہ بھی نشان ہے کہ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۔ اس نے زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے ہیں اس میں مادی جانوروں کے علاوہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو انبیاء کے آنے سے پہلے مُردہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں روحانی زندگی کی کوئی رمق تک نظر نہیں آتی لیکن جب آسمانی صُور پھُونکا جاتا ہے تو اس وقت ایسے مُردہ بھی زندہ ہو جاتے ہیں اور لولے لنگڑے بھی چلنے پھرنے لگ جاتے ہیں۔ پھر یہ لوگ جو مختلف ملکوں اور مختلف قوموں اور مختلف رنگوں اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف علوم وفنون اور مختلف قابلیتوں کے مالک ہوتے ہیں نبی کی آواز پر لبیک کہنے کے بعد دین کی اشاعت کے لئے دنیا میں چاروں طرف پھیل جاتے ہیں اور اپنی تبلیغی جدوجہد سے لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں کو دین کی طرف کھینچ لاتے ہیں جو اس کے دین کی رونق اور تازگی کا موجب بنتے ہیں۔ ان معنوں کے لحاظ سے دَآبَّةٍ سے اُن مومنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو زمین کی روحانی رونق اور آبادی کا باعث ہوتے ہیں اور جن سے موجودہ اور آئندہ نسلیں ہزاروں قسم کے مادی اور روحانی فوائد اُٹھاتی ہیں۔

وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ رحیمیت کا ثبوت پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ صفتِ رحمانیت کے ماتحت اللہ تعالیٰ کے جس قدر فیضان ہیں ان میں تو کافر بھی برابر کے شریک ہیں لیکن رحیمیت کے دائرہ میں جب مومن اور کافر کا مقابلہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تائید مومنوں کو کامیاب کرتی اور کفار کو ان کے بدارادوں میں ناکام کر دیتی ہے اس جگہ استعارہ کے طور پر ہواؤں سے وہ ہوائیں مراد ہیں جو خاص خاص وقتوں میں چلا کرتی ہیں خصوصاً وہ ہوائیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے چلیں اور جنہوں نے آپ کے انوار کو ساری دنیا میں پھیلا دیا مثلاً جنگِ بدر کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریت اور کنکریوں کی ایک مٹھی پھینکی تو اُسی وقت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسی تیز ہوا چلی جس نے مومنوں کی تائید کی۔ اور کفار کو ایسا بے دست و پا

کر دیا کہ تھوڑی دیر میں ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور کفار کے بڑے بڑے لیڈر خاک وخون میں تڑپنے لگے اور ان کے مسلّح اور آزمودہ کار سپاہی میدان سے منہ پھیر کر بھاگ نکلے۔

(السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ذکر رؤیا عاتکۃ بنت عبد المطلب رمی الرسول للمشرکین بالحصباء)۔

پھر غزوۂ احزاب میں بھی ایسا ہی ہوا اور خدا تعالیٰ نے آپ کی تائید میں ہوا چلائی اور کفار بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک رات سخت آندھی چلی جس نے قناطوں کے پردے توڑ دیئے۔ چولھوں پر سے ہنڈیاں گرا دیں اور بعض قبائل کی آگیں بُجھ گئیں۔ مشرکین عرب میں یہ رواج تھا کہ وہ ساری رات آگ جلائے رکھتے تھے اور اس کو نیک شگون سمجھتے تھے اور جس کی آگ بُجھ جاتی تھی وہ خیال کرتا تھا کہ آج کا دن میرے لئے منحوس ہے اور وہ اپنا خیمہ اٹھا کر لڑائی کے میدان سے پیچھے ہٹ جاتا تھا جن قبائل کی آگ بجھی انہوں نے اس رواج کے مطابق اپنے خیمے اٹھائے اور پیچھے کو چل پڑے۔ ان کو دیکھ کر ارد گرد کے قبائل نے سمجھا کہ شاید یہود نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر شبخون مار دیا ہے اور ہمارے آس پاس کے قبائل بھاگ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی جلدی جلدی اپنے ڈیرے سمیٹے اور میدان سے بھاگنا شروع کر دیا۔ ابوسفیان اپنے خیمہ میں آرام سے لیٹا تھا کہ اس واقعہ کی خبر اُسے بھی جا پہنچی وہ گھبرا کر اپنے بندھے ہوئے اونٹ پر چڑھ بیٹھا اور اس کو ایڑیاں مارنی شروع کر دیں۔ آخر کسی نے اُسے توجہ دلائی کہ وہ یہ کیا حماقت کر رہا ہے اس پر اس کے اونٹ کی رسیاں کھولی گئیں اور وہ بھی اپنے ساتھیوں سمیت میدان سے بھاگ گیا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام، غزوۃ خندق)۔

پھر ہواؤں کی طرح بارشیں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید میں برسیں اور بادلوں نے بھی آپ کا ساتھ دیا چنانچہ جنگِ بدر کے موقعہ پر جبکہ صحابہؓ کو پانی کی سخت ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے بارش نازل کر دی جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو پانی بھی مل گیا اور ان کی زمین بھی جو ریتلی تھی اور میدان جنگ بننے والی تھی سخت ہو گئی۔ اُدھر کافروں کی زمین جو سخت تھی بارش کی وجہ سے ایسی خراب ہوگئی کہ وہ اُس پر پھسلنے لگ گئے (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ذکر رؤیا عاتکۃ بنت عبد المطلب)۔ اسی طرح مدینہ میں آپ کی دُعا کی برکت سے ایک دفعہ کئی دن بارش ہوتی رہی لیکن جب وہ بارش تکلیف کی صورت اختیار کرنے لگی اور مومنوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا تو آپ ہی کی دُعا کی برکت سے وہ رُکی اور مدینہ سے ہٹ کر ارد گرد کے علاقوں پر برسنے لگ گئی۔ (بخاری کتاب الدعوات، باب الدعاء غیر مستقبل القبلۃ)۔

اسی طرح جب مکہ والوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شدید مخالفت کی اور بار بار عذاب کا مطالبہ کیا

تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان پر ویسا ہی سات سالہ قحط نازل فرمائے جیسا کہ اس نے یوسفؑ کے زمانہ میں نازل کیا تھا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ آپ کی اس بددُعا کی وجہ سے حجاز میں ایسا شدید قحط پڑا کہ لوگوں کو مرداراور ہڈیاں اور چمڑے تک کھانے پڑے اوران کی صحتیں اس قدر کمزور ہوگئیں کہ انہیں ہر وقت آنکھوں کے سامنے دھواں سا نظر آتا تھا اور یہ عذاب پورے سات سال تک ممتد رہا۔ آخر لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے درخواست کی کہ مضر یعنی قبائلِ حجاز کے لئے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تکلیف کو دُور کرے۔ چنانچہ آپؐ نے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے بارشیں نازل فرمائیں اور قحط دُور ہوا بلکہ ایک روایت میں ذکر آتا ہے کہ خود ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیری قوم ہلاک ہوگئی۔ دعا کر کہ اللہ تعالیٰ اس کی تکلیف کو دُور کرے۔ چنانچہ آپ نے دُعا فرمائی اور یہ عذاب دُور ہوا (بخاری کتاب تفسیر القرآن سورۃ دُخان باب ثم تولوا عنه وقالوا معلم مجنون)۔

یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوائیں بھی مسخر کر دی تھیں اور بادل بھی مسخر کر دیئے تھے اور کامل مومنوں کے لئے بھی وہ ایسا ہی کیا کرتا ہے۔ بے شک ہوائیں ہمیشہ چلتی رہتی ہیں اور بارشیں ہمیشہ برستی رہتی ہیں مگر بدر اور احزاب کی ہواؤں نے بتا دیا کہ وہ مومنوں کے لئے بشارت اور کافروں کے لئے عذاب تھیں۔ اسی طرح بارشیں بھی بے شک عام طور پر ہوتی رہتی ہیں مگر بدر اور مدینہ کی بارشوں نے بتا دیا کہ وہ مسخر شدہ تھیں اور مسخر شدہ بارشیں اور ہوائیں ہمیشہ مومنوں کی تائید اور کفار کی تذلیل کے لئے جاری ہوتی ہیں اور ایسے امور تقدیر خاص کے ماتحت جاری ہوتے ہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ (میں) سے (اللہ کے) ہمسر بناتے ہیں۔ وہ ان سے اللہ کی محبت کی طرح

يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ

محبت کرتے ہیں۔ اور جو لوگ مومن ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ (ہی) سے محبت کرتے ہیں۔

وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ

اور جو لوگ (اس) ظلم کے مرتکب ہوئے (ہیں) اگر وہ (اس گھڑی کو) جب وہ عذاب کو (سامنے) دیکھیں گے

لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۶﴾

(کسی طرح اب) دیکھ لیتے (تو جان لیتے) کہ سب قوت اللہ ہی کو ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب (دینے) والا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَنْدَادًا ۔ یہ نِدٌّ کی جمع ہے اور اَلنِّدُّ کے معنے ہیں اَلْمِثْلُ وَلَا یَکُوْنُ اِلَّا مُخَالِفًا ۔ نِدّ مثل کو کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ ہمیشہ مدّمقابل کے لئے بولا جاتا ہے۔ یُقَالُ مَالَهٗ نِدٌّ اَیْ مَالَهٗ نَظِیْرٌ کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی نِد نہیں یعنی اس کا کوئی نظیر نہیں۔ اس کی جمع انداد آتی ہے۔ (اقرب)

یہاں اِذْ ۔ حِیْنَ کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور حِیْن کے معنے وقت کے ہیں۔

اسی طرح اس جگہ لَوْ کی جزاء محذوف ہے جو کہ یَعْلَمُوْا ہے۔ معنے اس طرح ہوں گے کہ اگر یہ ظالم لوگ اس گھڑی کو جس میں اُن پر عذاب نازل ہوگا دیکھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ سب قوت اللہ ہی کے لئے ہے۔

تفسیر۔ قرآن کریم میں مشرکوں کے معبودوں کے لئے چار الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ (۱) نِدّ (۲) شریک (۳) اِلٰہ (۴) ربّ۔ اور یہ چاروں نام چار قسم کے شرکوں پر دلالت کرتے ہیں۔ نِدّ شریک فی الجوہر کو کہتے ہیں یعنی ایسی ہستی کو جس کی محض عبادت ہی مدِّنظر نہ ہو بلکہ جیسے خدا تعالیٰ کی ذات ہے ویسے ہی اس چیز کو ازروئے ذات سمجھا جائے اور شریک وہ ہے جسے کاموں میں شریک باری تعالیٰ قرار دیا جائے خواہ بعض صفات میں یا کل صفات میں۔ خواہ اس کی عبادت کی جائے یا نہ کی جائے اور اِلٰہ یعنی معبود کا لفظ جب خدا تعالیٰ مشرکوں کی نسبت استعمال کرے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ یہ لفظ بھی نِد سے وسیع ہے کیونکہ عام طور پر وہ بھی اِلٰہ قرار دیئے جاتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے شریک فی الجوہر تسلیم نہیں کیے جاتے۔ جیسے ہندوؤں وغیرہ کے دیوتا ہیں۔ اور ربّ ان ہستیوں کو کہا جاتا ہے جن کی ہر ایک بات بلاتمیز خیر و شر مان لی جائے بغیر اس کے کہ لوگ ان کی عبادت کریں یا انہیں خدا تعالیٰ کی صفات میں شریک قرار دیں۔ ان چاروں قسم کے شرکوں کی مثالیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ نِدّ قرار دینے والی وہ مسیحی اقوام ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا قرار دیتی ہیں وہ انہیں صفاتِ الوہیت کی وجہ سے خدا قرار نہیں دیتیں بلکہ اس وجہ سے خدا قرار دیتی ہیں کہ ان کے نزدیک وہ ازلی ابدی ہیں۔ یعنی وہ انہیں شریک فی الجوہر ہونے کے لحاظ سے خدا مانتی ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ خدائی کی وہ تمام صفات جو ذات کے لحاظ سے خدا تعالیٰ میں موجود ہونی ضروری ہیں ان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یا جیسے پارسی لوگ دو الگ الگ خداؤں کے قائل ہیں۔ یزدان کو وہ روشنی کا خدا سمجھتے ہیں اور اہرمن کو تاریکی کا خدا قرار دیتے ہیں (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین اینڈ

آنتھکس زیر لفظ Zoroastrianism)۔اس کے مقابلہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو بعض ہستیوں کو صرف شریک قرار دیتے ہیں یعنی بعض کاموں پر انہیں متصرف تو تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کی پرستش نہیں کرتے۔ گویا انہیں صرف شریک فی الصفات مانتے ہیں جیسا کہ عرب کے لوگ تھے وہ جنّات وغیرہ کو حکم اور تصرف میں تو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے مگر انہیں معبود یا رب یا نِدّ خیال نہیں کرتے تھے صرف اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ فلاں وادی میں جسے وہ سید الوادی قرار دیتے تھے جِنّ متصرف ہے اور وہ اس میں آتا جاتا ہے۔ وہ اس کا ادب بھی کرتے تھے اور خدا تعالیٰ کی طرح اس سے ڈرتے بھی تھے لیکن اس کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ (تفسیر قرطبی سورۃ الجن زیر آیت ۴ تا ۷)

اِلٰہ یعنی معبود کا لفظ نِدّ سے وسیع ہے۔ چنانچہ کئی لوگ ایسے ہیں جو بعض ہستیوں کو معبود تو سمجھتے ہیں اور اُن کی عبادت بھی کرتے ہیں مگر انہیں خدا تعالیٰ کا شریک فی الجوہر تسلیم نہیں کرتے۔ جیسے ہندو اپنے دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہیں مگر اُن کو متصرف یا شریک فی الجوہر قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح ان میں ماں باپ کی عبادت بھی پائی جاتی ہے مگر ان کو شریک یا رب یا نِدّ نہیں سمجھا جاتا۔ چوتھا نام ربّ ہے اور گو اس کے اصل معنے پیدا کر کے کمال تک پہنچانے والے کے ہیں۔ مگر اصطلاح مذاہب میں ہر ایک مربی اور سردار کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اس سے ایسے لوگ مراد ہوتے ہیں جن کی ہر ایک بات بلا تمیز خیر و شر مان لی جائے۔ جیسے گم گشتہ اقوام میں پیروں فقیروں کے متعلق اعتقاد رکھا جاتا ہے۔ اسلام اجتہادی مسائل میں دوسروں کی اطاعت جائز قرار دیتا ہے لیکن جس شخص کی خدا اور انبیاء کے حکم کے خلاف نصوص صریحہ میں اطاعت کی جائے وہ گویا ربّ سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبۃ:۳۱) یعنی یہود نے اپنے احبار اور راہبوں کو خدا کے سوا اپنا ربّ بنا لیا ہے۔

ان چاروں الفاظ میں سے اِلٰہ اور ربّ کے الفاظ تو خدا تعالیٰ کے لئے بھی استعمال کر لئے جاتے ہیں لیکن نِدّ اور شریک کے الفاظ صرف معبودانِ باطلہ کے لئے ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ جہاں نِدّ کا لفظ استعمال ہوگا وہاں شریک فی الجوہر مراد ہوگا۔ (اگر جوہر میں مشابہت نہ ہو تو وہ چیز مثل کہلائے گی نِدّ نہیں) اور جس جگہ شریک کا لفظ استعمال ہوگا وہاں شریک فی الصفات مراد ہوگا خواہ اس کی عبادت کی جائے یا نہ کی جائے اور جہاں اِلٰہ یعنی معبود کا لفظ ہوگا وہاں صرف عبادت کو مدِّ نظر رکھا جائے گا۔ خواہ انہیں خدا کا شریک فی الجوہر تسلیم نہ کیا جائے۔ اور جہاں ربّ کا لفظ استعمال ہوگا وہاں ایسی ہستیاں مراد ہوں گی جن کی ہر ایک بات خیر و شر کی تمیز کے بغیر مان لی جائے اور خدا اور اس کے رسول کے احکام کی پرواہ نہ کی جائے۔ قرآن کریم میں ان سب اقسام کے شرک کا

ذکراس آیت میں کیا گیا ہے کہ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔(آل عمران:۶۵) یعنی تو کہہ دے کہ اے اہل کتاب! کم سے کم ایک ایسی بات کی طرف تو آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ہم آپس میں ایک دوسرے کو ربّ نہ بنایا کریں۔ لیکن اگر اس دعوتِ اتحاد کے بعد بھی وہ لوگ پھر جائیں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم خدا تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں۔ اس آیت میں (۱) لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ (۲) وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا (۳) وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فرما کر اِلٰہ یعنی معبود اور شریک اور ربّ تینوں اقسامِ شرک کی نفی تو صراحتاً کی گئی ہے۔ مگر نِدّ کی ضمنی طور پر نفی کی گئی ہے۔ کیونکہ نِدّ ان تینوں کے اندر شامل ہے۔ یعنی جو نِدٌّ ہوگا۔ وہ بغیر عبادت اور شرک فی الصّفات اور اطاعتِ کامل کے نہیں ہوگا۔ اور جب غیر اللہ کی عبادت اور شرک فی الصفات اور رب بنانے کو گناہ قرار دے دیا گیا تو نِدّ کی خود بخود نفی ہوگئی لیکن اس کے علاوہ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ سے بھی نِدّ کی نفی ہو جاتی ہے۔

غرض اسلام توحید کے جس بلند ترین مقام پر بنی نوع انسان کو پہنچانا چاہتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان نہ تو کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک فی الجوہر سمجھے۔ نہ کسی کو اس کے کام میں شریک قرار دے خواہ اس کی عبادت کی جائے یا نہ کی جائے۔ نہ غیر اللہ میں سے کسی کی پرستش کی جائے اور نہ خدا اور اس کے انبیاء کے احکام کے خلاف کسی کی اس طرح اطاعت کی جائے جس طرح خدا تعالیٰ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ تمام چیزیں توحید حقیقی کے منافی ہیں۔

يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ کے دو معنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ان انداد سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا تعالیٰ سے کرنی چاہیے۔ دوسرے جتنی محبت انہیں خدا تعالیٰ سے کرنی چاہیے اتنی ہی وہ اپنے انداد سے بھی کرتے ہیں۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ خدا تعالیٰ سے بھی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے دلوں میں خدا تعالیٰ سے کوئی حقیقی محبت نہیں پائی جاتی۔ پہلے معنے کے لحاظ سے تو دونوں سے ان کی محبت یکساں معلوم ہوتی ہے لیکن دوسرے معنے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا خدا تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ محض ایک لاف زنی ہے ورنہ ان دونوں محبتوں میں بڑا بھاری فرق ہوتا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کے بھی دو معنے ہیں ایک تو یہ کہ مومن مشرکوں کی نسبت خدا تعالیٰ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یعنی جو محبت مشرکوں کو خدا تعالیٰ سے ہے اس سے بہت زیادہ محبت مومن اپنے خدا سے کرتے ہیں۔ یا

مشرک اپنے بتوں سے جو محبت کرتے ہیں اس سے بہت زیادہ محبت مومن خدا تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ مومن خدا تعالیٰ کے سوا دوسری چیزوں سے جو محبت کرتے ہیں ان تمام چیزوں کی محبت کی نسبت وہ خدا تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اور اگر دونوں محبتوں کا مقابلہ ہو جائے تو خدا تعالیٰ کی محبت کا پہلو ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر اس محبت کی ان الفاظ میں تشریح فرمائی ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (التوبۃ: ۲۴) یعنی کہہ دے کہ اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں یا تمہارے خاوند اور تمہارے رشتہ دار اور تمہارے اموال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے بگڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ خدا اور اس کے رسول سے اور خدا کے راستہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ پیارے ہیں تو تم کو خدا سے کوئی محبت نہیں۔ تب تم اللہ تعالیٰ کے عذاب کا انتظار کرو اور خدا تعالیٰ ایسے نافرمانوں کو کبھی اپنا راستہ نہیں دکھاتا۔ یعنی کامل محبت کی علامت یہ ہے کہ انسان اس کی خاطر ہر ایک چیز کو قربان کر دے۔ اگر اس بات کے لئے وہ تیار نہیں تو منہ کی باتیں اس کے لئے کچھ بھی مفید نہیں۔ یوں تو ہر شخص کہہ دیتا ہے کہ مجھے خدا سے محبت ہے اور اس کے رسول سے محبت ہے بلکہ مسلمان کہلانے والا کوئی بھی شخص نہیں ہوگا جو یہ کہتا ہو کہ مجھے خدا اور اس کے رسول سے محبت نہیں ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس اقرار کا اثر اس کے اعمال پر اس کے جوارح پر اور اس کے اقوال پر کیا پڑتا ہے۔ وہ لوگ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنے آپ کو سرشار بتاتے ہیں اور آپ کی تعریف میں نعتیں پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں بلکہ بعض تو خود بھی نعتیں کہتے ہیں۔ آپ کے احکام کی فرمانبرداری کی طرف ان کو کچھ بھی توجہ نہیں ہوتی وہ خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اس سے ملنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کا کوئی عزیز آجائے تو وہ سو کام چھوڑ کر اس سے ملنے کے لئے جاتا ہے۔ اپنے دوستوں اور پیاروں کی ملاقات کا موقعہ ملے تو پھُولا نہیں سماتا۔ حکام کے حضور شرف باریابی حاصل ہو تو اس کی گردن فخر سے اونچی ہو جاتی ہے لیکن لوگ خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور نماز کے قریب بھی نہیں جاتے۔ یا نماز پڑھتے ہیں تو اس طرح کہ کبھی پڑھی کبھی نہ پڑھی۔ یا اگر باقاعدہ بھی پڑھی تو ایسی جلدی جلدی پڑھتے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا کہ سجدہ سے انہوں نے کب سر اٹھایا اور کب دوبارہ سجدہ کیا۔ جس طرح مرغا چونچیں مار کر دانہ اٹھاتا ہے اسی طرح وہ بھی سجدہ کر لیتے ہیں نہ خشوع ہوتا ہے نہ خضوع۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے روزہ کا بدلہ اپنے آپ

کو قرار دیا ہے۔مگر لوگ خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے اس کا دامن پکڑنے کے لئے نہیں جاتے اور اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ کی محبت ظاہر کرتے ہیں لیکن لوگوں کے حقوق دباتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ بہتان باندھتے ہیں غیبتیں کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے عشق کا اظہار کرتے ہیں لیکن قرآن کریم کا مطالعہ اور اس پر غور کرنے کی توفیق ان کو نہیں ملتی۔غرض محبت کا دعویٰ اور شے ہے اور حقیقی محبت اور شے ہے۔قرآن کریم بتاتا ہے کہ انسان اس وقت تک کبھی سچا مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ عملاً خدا تعالیٰ سے ایسی محبت نہ کرے کہ اس کے مقابلہ میں نہ ماں باپ کی محبت ٹھہر سکے۔ نہ بیٹوں کی محبت ٹھہر سکے۔ نہ بھائیوں کی محبت ٹھہر سکے۔ نہ بیویوں کی محبت ٹھہر سکے نہ قبیلہ اور قوم کی محبت ٹھہر سکے۔خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ ثَلَاثٌ مَنْ کُنَّ فِیْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِیْمَانِ اَنْ یَکُوْنَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ یَکْرَهَ اَنْ یَعُوْدَ فِی الْکُفْرِ کَمَا یَکْرَهُ اَنْ یُقْذَفَ فِی النَّارِ (بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان) یعنی جس شخص میں یہ تین باتیں پائی جائیں اس کے متعلق سمجھ لو کہ اُسے حلاوتِ ایمان حاصل ہوگئی ہے۔ اول یہ کہ خدا اور اس کا رسول اس کی نگاہ میں تمام ماسوا سے زیادہ محبوب ہو۔ دوم انسان دوسرے سے محض اللہ کے لئے محبت کرے سوم۔ ایمان لانے کے بعد وہ کفر کی طرف لوٹنا ایسا ہی ناپسند کرے جیسے آگ میں ڈالا جانا۔

وَ لَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ آج تو یہ لوگ اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں اور بتوں کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دے رہے ہیں لیکن اگر یہی لوگ اس وقت کا نظارہ اپنے ذہنوں میں لا سکیں جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو انہیں سب کچھ بھول جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا کوئی معمولی گناہ نہیں۔ اس وقت تو یہ لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں لیکن اگر یہ اُس وقت کا تصور کر سکیں جب ان پر اپنے معبودوں کی بے بضاعتی روشن ہوجائے گی تو وہ ایسا کبھی نہ کریں جیسا کہ فتح مکہ کے موقع پر تمام کفار نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اُن کے معبود اُن کے کسی کام نہ آئے بلکہ وہ توڑ پھوڑ کر پھینک دیئے گئے اور بیت اللہ کو خدائے واحد کی عبادت کے لئے پاک کر دیا گیا۔

اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ کی تشریح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس اُخروی عذاب کی بھی تفصیل بیان فرمائی ہے جو کفار کو ملے گا اور بتایا ہے کہ انہیں تمثیلی طور پر سانپ اور بچھو اور اسی قسم کی اور خوفناک چیزیں نظر آئیں گی (مسند احمد بن حنبل مسند عبد اللہ بن عمر الجزء ۱۰ صفحہ ۴۸۰)۔ جو درحقیقت انہی کے اعمال کی ایک شکل ہوں گی کیونکہ دنیا میں انہوں نے سانپوں کی طرح لوگوں کو ڈسا اور بچھوؤں کی طرف نیش زنی سے کام لیا اور درندوں کی طرح لوگوں کو

چیرا پھاڑا۔ اس لئے خدا تعالیٰ ان کی سزا کے لئے سانپوں اور بچھوؤں کو ہی اُن پر مسلّط کر دے گا اور انہیں اپنے اعمال کی سزا دے گا۔

یہ آیت اپنے مضمون کے لحاظ سے پہلی آیت سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ دونوں آیات ایک ہی مضمون کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ باوجود ان دلائل کے جو حق و باطل میں فرق کرنے والے ہیں اور باوجود اس کے کہ دنیا کا ذرہ ذرہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا ثبوت دے رہا ہے اور باوجود اس کے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی تقدیر خاص کو بھی دیکھ رہے ہیں جو مومنوں کے حق میں جاری ہے پھر بھی یہ لوگ خدا تعالیٰ کے نِدّ قرار دے رہے ہیں اور ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا تعالیٰ سے کرنی چاہیے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ تباہ ہونے والے ہیں۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ

(اور کاش کہ وہ لوگ اس وقت کو دیکھ لیتے) جب وہ لوگ جن کی فرمانبرداری کی جاتی تھی ان لوگوں سے جو فرمانبردار

وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۷﴾

تھے الگ ہو جائیں گے اور عذاب کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے۔ اور ان کے (شرک کی وجہ سے نجات کے) سب ذریعے منقطع ہو جائیں گے۔

حلّ لُغات۔ تَبَرَّاَ باب تَفَعُّل سے ماضی کا صیغہ ہے اور اس کے معنے ہیں تَخَلَّصَ یعنی اُس نے چھٹکارا حاصل کرلیا (اقرب) اور اَلتَّبَرِّیْ (مصدر) کے معنے ہیں اَلتَّفَصِّی مِمَّا یُکْرَہُ مُجَاوَرَتُہٗ یعنی ناپسندیدہ چیز سے چھٹکارا حاصل کرنا (مفردات) پس آیت کے معنے یہ ہیں کہ وہ معبودان باطلہ یا وہ ہستیاں جنہیں خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیا جاتا ہے عبادت کرنے والوں کو ناپسندیدہ قرار دیں گے۔ اور اپنے آپ کو پاک ٹھہرائیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو ایسے اعمال کرنے والوں کے ساتھ نہ تھے۔

اَلْاَسْبَابُ سَبَبٌ کی جمع ہے اور اَلسَّبَبُ کے معنے ہیں مَا یُتَوَصَّلُ بِہٖ اِلٰی غَیْرِہٖ۔ وہ چیز جس کے ذریعہ سے غیر تک پہنچا جائے۔ اسی طرح اس کے معنے رستہ۔ محبت اور قرابت کے بھی ہیں۔ (لسان العرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جن کو یہ لوگ نِدّ قرار دیتے ہیں وہ بھی اس وقت کہہ اُٹھیں

گے کہ خدایا ہمارا ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اس طرح ان سے اپنی برأت اور نفرت کا اظہار کریں گے اور خدائی عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ۔ اوران کی نجات کے تمام ذرائع منقطع ہو جائیں گے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ باء بمعنے عَنْ بھی آتی ہے اور باء بمعنے سبب بھی آتی ہے۔ اور باء تعدیہ کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے یعنی فعل لازم کو متعدی بنانے کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ پہلی صورت میں عَنْ کے مفہوم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ ان کے اسباب ان سے کٹ جائیں گے یعنی وہ چیزیں جو ان کے پاس تھیں اور جن کی نسبت وہ خیال کیا کرتے تھے کہ ہم ان کی وجہ سے خدا تعالیٰ تک پہنچ جائیں گے یا وہ قرابتیں اور محبتیں جو رشتہ داری کی وجہ سے انہیں حاصل تھیں وہ سب کی سب کٹ جائیں گی اور ان کے تمام سہارے جاتے رہیں گے۔

باء کے معنے سبب لینے کی صورت میں یہاں ایک محذوف ماننا پڑے گا اور عبارت یوں ہوگئی کہ وَتَقَطَّعَتْ بِسَبَبِ كُفْرِهِمُ الْاَسْبَابُ کہ ان کے کفر کی وجہ سے اُن کے تمام ذرائع کامیابی جاتے رہیں گے۔ اور وہ تباہ ہو جائیں گے۔

تیسری صورت میں اس کا یہ مطلب ہوگا کہ جن چیزوں کو وہ خدا تعالیٰ کے وصال کا ذریعہ قرار دیتے ہیں یا وہ ذرائع جن کو وہ خدا تعالیٰ تک پہنچانے والا سمجھتے ہیں وہی ان کو کاٹ دیں گے اور ان کی تباہی کا موجب بن جائیں گے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ (الانعام: ۱۵۴) کہ تم مختلف راستوں کے پیچھے نہ پڑو۔ ورنہ وہ تمہیں صحیح راستہ سے منحرف کر دیں گے اور تمہیں ادھر اُدھر لے جا کر تباہ کر دیں گے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا

اور جو لوگ (ائمہ کفر کے) فرمانبردار تھے کہیں گے کہ کاش! ہمیں ایک دفعہ (پھر دنیا میں) واپس جانا (نصیب) ہوتا

تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ

تو ہم بھی ان (ائمہ کفر) سے الگ ہو جاتے جس طرح (آج) یہ ہم سے الگ ہو گئے۔ اس طرح اللہ انہیں بتائے گا

عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۸﴾ ع

کہ ان کے اعمال (کا نتیجہ چند) حسرتیں ہیں (جو) ان (ہی) پر (وبال ہو کر پڑیں گی) اور وہ (دوزخ کی) آگ سے ہرگز نہیں نکل سکیں گے۔

حل لغات۔ كَرَّةً اَلْكَرَّةُ بِالْفَتْحِ اَلْمَرَّةُ یعنی کرۃ کے معنے ایک دفعہ کے ہیں (اقرب) اَلْكَرُّ (مصدر) اَلْعَطْفُ عَلَى الشَّيْءِ کسی چیز کی طرف لَوٹنا (مفردات) پس آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک دفعہ اور لَوٹنے کا موقعہ مل جائے۔

تفسیر۔ فرمایا اس دنیا میں تو تم خدا تعالیٰ کے شریک بناتے اور اس کے نِدّ قرار دیتے ہو مگر وہاں جا کر تمہارا یہ حال ہوگا کہ تم واپس اس دنیا میں آنے کی خواہش کرو گے اور کہو گے کہ ہم تو خیال کرتے تھے کہ یہ معبود ہمارے کام آئیں گے مگر انہوں نے تو موقعہ پر آ کر دھوکا دے دیا۔ اس لئے ہمیں ایک بار پھر دنیا میں لَوٹایا جائے تا کہ ہم بھی اُن سے ایسا ہی بے وفائی کا سلوک کر سکیں۔

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ فرماتا ہے ہم اُن کے اعمال انہیں اس حال میں دکھائیں گے کہ وہ حَسَرَاتٍ ہوں گے۔ یعنی وہ اعمال انہیں حسرتیں ہی حسرتیں نظر آئیں گے اور وہ حسرتیں ایسی ہوں گی کہ جن کا وبال انہیں پر پڑے گا بعض حسرتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا غیروں پر اثر پڑتا ہے مگر فرماتا ہے وہ ایسی حسرتیں ہوں گی جن کا اثر خود انہیں پر پڑے گا دوسروں پر نہیں۔ اس جگہ اگر حَسَرَاتٍ کو حال قرار دیا جائے تو رأی سے مراد رؤیت عینی ہوگی اور اگر حَسَرَاتٍ کو مفعول قرار دیا جائے تو رؤیت قلبی مراد ہوگی اور معنے یہ ہوں گے کہ وہ خدا تعالیٰ سے کہیں گے کہ اگر ہمیں مبلّغ بنا کر دنیا میں بھیج دیا جائے تو ہم وہاں جا کر شور برپا کر دیں گے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔

وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیے کہ دوزخی آگ سے نکالے نہیں جائیں گے کیونکہ اس جگہ خدا تعالیٰ کے سلوک کا ذکر نہیں بلکہ ان کی اپنی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ خود اپنی ذاتی جدوجہد اور کوشش سے اس میں سے نکل نہیں سکیں گے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے اگر ہم کہیں کہ بیمار ایک قدم بھی نہیں چل سکتا اور پھر اسے دوسرے دن ہسپتال لے جایا جائے تو کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ کل تو تم نے یہ کہا تھا کہ بیمار ایک قدم بھی نہیں چل سکتا اور آج تم اسے ہسپتال داخل کر آئے ہو۔ کیونکہ ہمارا یہ مطلب نہیں تھا کہ غیر بھی اُسے وہاں نہیں لے جا سکتے اسی طرح اس آیت میں جس چیز کی نفی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود دوزخ سے نہیں نکل سکیں گے۔ یعنی اگر وہ

اپنے زور کے ساتھ نکلنا چاہیں گے تو نہیں نکل سکیں گے چنانچہ اس کی وضاحت قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہو جاتی ہے کہ کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (السجدۃ:۲۱) یعنی جب کبھی وہ دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو پھر اُسی کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے اور انہیں کہا جائے گا کہ اب دوزخ کا وہ عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ پس اس جگہ جس چیز کی نفی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود اس عذاب سے نکل نہیں سکیں گے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ خدا تعالیٰ بھی انہیں دوزخ سے نہیں نکالے گا اور انہیں دائمی عذاب میں مبتلا رکھے گا۔

دراصل اس بارہ میں بھی مومنوں اور کافروں میں بہت بڑا فرق رکھا گیا ہے۔ مومنوں کے لئے تو جنّت حق قرار دیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبۃ:۱۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال اس وعدہ کے ساتھ خرید لئے ہیں کہ ان کو جنّت ملے گی گویا یہ ایک سودا ہے جو ان کا خدا تعالیٰ سے ہو چکا۔ یوں تو کسی کا بھی خدا تعالیٰ پر کوئی ذاتی حق نہیں مگر جس حق کو خدا تعالیٰ خود تسلیم کر لے وہ تو حق ہی سمجھا جائے گا۔ مگر کافروں کے لئے فرمایا کہ اگر وہ دوزخ کی تکالیف کو برداشت نہ کرتے ہوئے اس میں سے نکلنا چاہیں گے تو نہیں نکل سکیں گے۔ عربی زبان میں جو باء تاکید کے لئے آتی ہے اس کے معنے ہرگز کے ہوتے ہیں۔ پس اس جگہ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ میں تاکید کے معنے پائے جاتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی ذاتی جدوجہد کے ساتھ جہنم میں سے ہرگز نکل نہیں سکیں گے۔ ہاں جب خدا تعالیٰ چاہے گا تو انہیں دوزخ سے نکال لے گا۔ جیسا کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ جہنم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جب کہ اُس میں کوئی بھی نہیں رہے گا اور ہوا اس کے دروازوں کو کھٹکھٹائے گی۔ (کنز العمال کتاب القیمۃ ذکر النار و صفتها)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا

اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے جو کچھ حلال اور پاکیزہ ہے (اسے) کھاؤ۔ اور

تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۹﴾

شیطان کے قدم بقدم نہ چلو یقیناً وہ تمہارا کھلا (کھلا) دشمن ہے۔

حل لغات۔ طَيِّبًا طَابَ سے صفت مشبّہ ہے اور طَيِّبٌ کے معنے ہیں اَلْحَلَالُ حلال۔ اور جب

مَالٌ طَيِّبٌ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں ایسا مال جو شرعی لحاظ سے حلال ہو۔(اقرب)

پھر لکھا ہے وَاَصْلُ الطَّيِّبِ مَاتَسْتَلِذُّهُ الْحَوَاسُ وَمَا تَسْتَلِذُّهُ النَّفْسُ (مفردات)۔اور درحقیقت طیّب اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسانی حواس لذیذ قرار دیں اور جس سے انسان کا دل لطف اندوز ہو۔پس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ایسی چیزیں کھاؤ جو شرعی لحاظ سے حلال ہوں اور ظاہری لحاظ سے بھی تم انہیں لذیذ اور پسندیدہ سمجھو۔

خُطُوَاتٌ کے معنے ہیں طُرُقٌ وَسُبُلٌ رستے اور طریق۔اس کا مفرد خُطْوَةٌ ہے جس کے معنے مَا بَيْنَ الْقَدَمَيْنِ کے ہیں یعنی دو قدموں کے درمیان کی جگہ اور فاصلہ۔(اقرب)

تفسیر ۔اس رکوع سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیمی پیشگوئی کے اس دوسرے پہلو کو بیان کرنا شروع کیا ہے کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ یعنی وہ نبی انہیں شریعت اور اس کے اسرار سے آگاہ کرے گا۔چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے سب سے پہلے حلال اور طیّب کھانے کی تعلیم کو لیا ہے۔کیونکہ انسانی اعمال اس کی ذہنی حالت کے تابع ہوتے ہیں اور ذہنی حالت غذا سے متاثر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اُس میں سے حلال اور طیّب اشیاء کا استعمال کرو۔یعنی تم صرف یہی نہ دیکھا کرو کہ جو کچھ تم کھا رہے ہو وہ حلال ہے یا نہیں بلکہ یہ بھی دیکھ لیا کرو کہ وہ طیّب بھی ہے یا نہیں اگر کسی چیز کا کھانا تمہارے مناسب حال نہ ہو خواہ اس لحاظ سے کہ وہ تمہاری صحت کے لئے مضر ہو یا اس لحاظ سے کہ ملکی اور قومی حالات کی وجہ سے تمہیں اس کے کھانے کی عادت نہ ہو یا اس وجہ سے کہ تمہاری طبیعت اس سے انقباض محسوس کرتی ہو تو تم محض یہ دیکھ کر کہ شریعت نے اسے حلال قرار دیا ہے اسے مت کھاؤ۔کیونکہ تمہارے لئے کھانے میں صرف حرام وحلال کا امتیاز مدِّنظر رکھنا ہی ضروری نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ تم ایسی چیزوں کا انتخاب کیا کرو جو تمہاری طبیعت اور تمہارے ماحول اور تمہارے معمول کے مطابق ہوں اور جن کا کوئی مضر اثر تم پر پڑنے کا امکان نہ ہو۔مثلاً نزلہ اور زکام اور کھانسی میں تُرش اشیاء کا استعمال کھانسی کو اور بھی بڑھا دیتا ہے اب اگر کوئی شخص کھانسی میں تُرش میوے استعمال کرتا ہے یا اسہال میں گوشت روٹی استعمال کرتا ہے یا جگر کی خرابی میں قابض اور نفاخ غذاؤں کا استعمال کرتا ہے تو خواہ یہ چیزیں حلال ہی کیوں نہ ہوں اس وجہ سے کہ وہ اس کے لئے طیّب نہیں ہیں ان کا استعمال اسے نقصان پہنچائے گا پس اس جگہ طیّب کو حلال کے ساتھ لگا کر یہ بتایا ہے کہ صرف حلال کھانا ہی مومن کا کام نہیں بلکہ یہ دیکھنا بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ چیز طیّب ہو یعنی گندی اور سڑی ہوئی نہ ہو۔مضر صحت نہ ہو۔جو ساتھ کھانا کھانے والے لوگ ہوں ان کی طبائع کے خلاف نہ ہو۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۔ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ یعنی ایسا نہ کرو کہ جس طرف شیطان جا رہا ہے اُسی طرف تم بھی چلنا شروع کر دو۔ وہ تمہارا دشمن ہے اور دشمن سے ہمیشہ دُور رہنا چاہیے نہ کہ اُس کی پیروی کرنی چاہیے۔

کھانے پینے کے ذکر کے بعد شیطان کا ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اگر تم حلال اور پھر حلال میں سے بھی طیّب رزق چھوڑ دو گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم شیطان کے پیچھے چل پڑو گے کیونکہ انسان جو کچھ کھاتا ہے اس سے جسم تیار ہوتا ہے اور ناجائز یا مضر اشیاء کے استعمال سے تیار شدہ جسم یقیناً انسان کو بدی کی طرف لے جائے گا نیکی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ

وہ تمہیں صرف بدی اور بے حیائی اور اس (بات) کی کہ تم اللہ (تعالیٰ) کے متعلق جھوٹ باندھ کر وہ بات کہو

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

جو تم نہیں جانتے تلقین کرتا ہے۔

حل لغات۔ اِنَّمَا (اِنَّ کے ساتھ مَا زائدہ ہے) لغت میں لکھا ہے اِذَا اُدْخِلَ عَلَيْهِ مَا يَبْطُلُ عَمَلُهٗ وَيَقْتَضِيْ اِثْبَاتَ الْحُكْمِ وَصَرْفِهٖ عَمَّا عَدَاهُ۔ جب اِنَّ پر مَا داخل ہو جائے تو اس کا عمل باطل ہو جاتا ہے اور بعد میں مذکور چیز کے لئے کسی بات کو ثابت کرنے اور باقی (غیر مذکور) چیزوں سے اس بات کی نفی کرنے کا مقتضی ہوتا ہے۔ (مفردات)

اَلسُّوْٓءُ كُلُّ مَا يُغَمُّ الْاِنْسَانَ مِنَ الْاُمُوْرِ الدُّنْيَوِيَّةِ وَالْاُخْرَوِيَّةِ وَمِنَ الْاَحْوَالِ النَّفْسِيَّةِ وَالْبَدَنِيَّةِ وَالْخَارِجِيَّةِ (مفردات)۔ یعنی اَلسُّوْٓءُ سے مراد وہ تمام غمزدہ کر دینے والی تکالیف ہیں جو انسان کو دنیوی اور اُخروی امور نیز رُوحانی اور جسمانی اور دوسرے حالات کی وجہ سے زندگی میں پیش آتی ہیں۔

اَلْفَحْشَآءُ اَلْفَحْشَاءُ وَالْفَاحِشَةُ مَا يَشْتَدُّ قُبْحُهٗ مِنَ الذُّنُوْبِ ۔ وَالْبُخْلُ فِيْ اَدَاءِ الزَّكٰوةِ وَقِيْلَ كُلُّ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ (اقرب)۔ یعنی فَحْشَاء اور فَاحِشَة سے مراد سخت بُرائی والا گناہ۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل کرنا۔ اور بعض کے نزدیک ہر وہ کام ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہو۔

اَلْفُحْشُ وَالْفَحْشَاءُ وَالْفَاحِشَةُ مَا عَظُمَ قُبْحُهٗ مِنَ الْاَفْعَالِ وَالْاَقْوَالِ۔ فحش۔ فحشاء اور فاحشہ سے ہر ایسا قول یا فعل مراد ہے جو بہت ہی بُرا ہو۔ (مفردات)

تفسیر ۔شیطان کے پیچھے چلنے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ذاتی طور پر انسان کو مختلف قسم کی بُرائیوں میں مبتلا کر دیتا ہے جیسے بدظنی ہے یا جھوٹ ہے یا کینہ ہے یا جہالت ہے یا سُستی اور غفلت ہے یا بُزدلی ہے یا تکبر ہے یا بے غیرتی ہے یا ناشکری ہے یہ وہ بُرائیاں ہیں جن سے صرف انسان کی اپنی ذات کو نقصان پہنچتا ہے اور جن کی طرف سوء کے لفظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن جب انسان اپنی اصلاح نہیں کرتا تو دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فحشاء یعنی ایسی بدیاں کرواتا ہے جن کا دوسرے لوگوں پر بھی اثر پڑتا ہے جیسے خیانت اور تہمت اور ظلم اور دھوکا اور قتل اور چوری اور مار پیٹ اور گالی اور ناواجب طرف داری اور رشوت وغیرہ ایسے جرائم ہیں جو دوسروں سے تعلق رکھتے ہیں پھر وہ بدیوں میں اور زیادہ بڑھاتا ہے اور آخر انسان کو خدا کے مقابلہ میں کھڑا کر دیتا ہے یا انسان کے اندر ایسی بے حیائی پیدا کر دیتا ہے کہ اُسے دوسروں کے سامنے بھی برائیوں کے ارتکاب میں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔ اور وہ برملا خدائی احکام کے خلاف لب کشائی شروع کر دیتا ہے یا اُس پر افتراء پردازی شروع کر دیتا ہے۔ گویا پہلے تو وہ ایسی بدیاں کرواتا ہے جن کا ضرر صرف اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ پھر غیرتِ انسانی مٹتی ہے تو ایسی بدیاں کرواتا ہے جن سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوں۔ پھر اور ترقی کر کے اس کی زبان سے ایسی باتیں نکلواتا ہے جو خدا تعالیٰ کی ہتک کرنے والی اور اس کا مضحکہ اڑانے والی ہوتی ہیں۔ اور اس طرح وہ درجہ بدرجہ انسان کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ غرض شیطان کبھی یکدم بڑے گناہ پر انسان کو آمادہ نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے وساوس کی یہ ترتیب ہوتی ہے کہ وہ پہلے چھوٹی بدی کا حکم دیتا ہے پھر بے حیائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اور پھر خدا پر جھوٹ باندھنے کے لئے تیار کر دیتا ہے۔ گویا چھوٹی نافرمانی سے شروع کر کے اُسے انتہا تک لے جاتا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ

اور جب ان سے کہا جائے کہ اس (کلام) کی جو اللہ نے اتارا ہے پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ (نہیں) ہم تو

اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ

اسی (طریقہ) کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ بھلا اگر ان کے باپ دادے کچھ بھی عقل

شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

نہ رکھتے اور نہ راہ راست پر چلتے ہوں (تو پھر بھی وہ ایسا ہی کریں گے)۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا کہ شیطان کی پیروی کرنے کا ایک یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اگر لوگوں کو خدا تعالیٰ کی بات ماننے کے لئے کہا جائے تو ان کی عقل ایسی ماری جاتی ہے کہ وہ کہہ دیتے ہیں ہم تو اپنے باپ دادا کی بات مانیں گے اور اُنہیں کے پیچھے چلیں گے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٔ نبوت فرمایا تو مکہ والوں نے آپ کا شدید مقابلہ کیا۔ وہ لوگ آخر کیوں مقابلہ کرتے تھے اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ کیا ہم اس مذہب کو چھوڑ دیں جس پر ہمارے آباؤ اجداد قائم تھے۔ گویا وہ کسی چیز کے ذاتی حُسن کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ صرف حسنِ اضافی اُن کے پیش نظر تھا اور باوجود اس کے کہ وہ جاہلانہ باتیں تھیں اُن لوگوں نے ان کے لئے اپنا مال اور اپنے عزیزوں اور اقرباء تک قربان کر دیئے تا کہ وہ چیزیں جو ان کی ہیں بچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ اگر تمہارے باپ دادا بیوقوف ہوں تو کیا پھر بھی تم وہی کچھ کرو گے جو وہ کرتے چلے آئے ہیں یعنی تمہارے باپ دادا تو اپنی بیوقوفی کی وجہ سے تباہ ہوئے تھے کیا تم بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر تباہ ہونا چاہتے ہو۔

ہمارے سلسلہ میں بھی لوگوں کے داخل ہونے میں سب سے بڑی روک یہی ہے کہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کیا وہ باتیں جنہیں پہلے لوگ سالہا سال سے مانتے چلے آئے ہیں ہم انہیں چھوڑ دیں یہ تو بڑی مشکل بات ہے۔ غرض اس آیت میں مخالفین اسلام کا سب سے بڑا اعتراض یہ بیان فرمایا ہے کہ ہم تو اسی طریق کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا تھا اس جگہ قَالُوْا سے یہ مراد نہیں کہ وہ منہ سے بھی ایسا کہتے ہیں۔ بہت لوگ منہ سے بھی کہتے ہیں لیکن بہت ہیں جو منہ سے نہیں کہتے مگر پھر بھی ان کے انکار کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ اور قول کا لفظ ان معنوں میں عربی زبان میں استعمال ہوجاتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِیْ (اقرب) یعنی حوض بھر گیا اور اس نے زبان حال سے یہ کہا کہ بس بس۔ اس آیت میں بھی اسی محاورہ کے مطابق قول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مخالفین اسلام کے اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ اتنا تو سوچیں کہ اگر اُن کے باپ دادے ایسے ہوں کہ وہ کچھ بھی عقل نہ رکھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں تو کیا پھر بھی وہ ان کے پیچھے چلتے چلے جائیں گے یعنی کسی کی اتباع دو ہی طرح ہوتی ہے یا تو وہ بڑا عقلمند ہو اور یا پھر خدا تعالیٰ سے اُس نے ہدایت پائی ہوئی ہو۔ لیکن اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی نہ ہو تو کیا پھر بھی اُس کی اِتباع کی جاتی ہے؟ اور تمہارے باپ دادوں

کی تعلیم ان دونوں امور سے خالی ہے۔ نہ عقل کے مقابلہ میں ٹھہرتی ہے اور نہ آسمانی شہادت اُس کی تائید میں ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ لوگ اپنے باپ دادا سے دین کے بارے میں تو اختلاف نہیں کرنا چاہتے لیکن دنیوی امور کے بارہ میں وہ روزانہ اُن سے اختلاف کرتے ہیں۔ ہزار ہا مثالیں اس امر کی پائی جاتی ہیں کہ دنیوی امور میں لوگوں نے اپنے باپ دادا کی اقتداء نہیں کی بلکہ انہوں نے صرف یہ دیکھا کہ اُن کا فائدہ کس امر میں ہے۔ وہ روزانہ ریلوں میں چڑھتے ہیں اور کبھی یہ نہیں کہتے کہ ہمارے باپ دادا تو گدھوں پر سوار ہوتے تھے ہم ریل گاڑیوں پر کیوں سوار ہوں؟ اسی طرح عقلی اور علمی باتوں میں ان کی پیروی نہیں کرتے بلکہ نئی روشنی کے علوم سے فائدہ اُٹھاتے اور ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ مگر دین کا معاملہ ہو تو ان کے باپ دادے بڑے عقلمند بن جاتے ہیں۔ حالانکہ خود اُن کا عمل اس طریق کے خلاف گواہی دے رہا ہوتا ہے مگر ایسی صاف اور موٹی بات بھی جب ان کے سامنے رکھی جاتی ہے تو وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے اور صداقت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ

اور ان لوگوں کا حال جنہوں نے کفر کیا ہے اس شخص کے حال کے مشابہ ہے جو اس چیز کو پکارتا ہے جو سوائے پکار اور

اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

آواز کے کچھ نہیں سنتی۔ (یہ لوگ) بہرے گونگے اور اندھے ہیں اس لئے سمجھتے نہیں۔

حلّ لُغات۔ یَنْعِقُ نَعَقَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور نَعَقَ الرَّاعِیْ بِغَنَمِہٖ کے معنے ہیں صَاحَ بِهَا وَ زَجَرَهَا۔ چرواہے نے اپنی بکریوں کو آواز دی اور اُن کو ڈانٹا۔ اور جب نَعَقَ الْغُرَابُ کہیں تو معنے ہوں گے صَاحَ کوّے نے کائیں کائیں کی۔ اور نَعَقَ الْمُؤَذِّنُ کے معنے ہیں رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالْاَذَانِ۔ مؤذن نے اذان کے لئے اپنی آواز بلند کی۔ (اقرب)

نِدَآءً اَلنِّدَاءُ کے معنے ہیں رَفْعُ الصَّوْتِ وَ ظُهُوْرُهٗ۔ آواز کا بلند اور واضح ہونا۔ (اقرب)

تفسیر۔ زیر تفسیر آیت ایک تمثیلِ مرکب ہے جس میں حذفِ مضاف سے کام لیا گیا ہے اور دَاعِی کا لفظ اس میں محذوف ہے۔ یعنی اصل عبارت یوں ہے کہ مَثَلُ دَاعِی الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کفار کے داعی ہیں۔ آپ کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو جانوروں کو اپنی طرف بلانے

کے لئے آواز دیتا ہے۔ مگر وہ جانور اُس کی آواز کے سوا اور کچھ نہیں سُنتے گویا یہ کفار بھی رات اور دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سُنتے ہیں اور صبح وشام انہیں وحی الٰہی سنائی جاتی ہے۔ ہر وقت ان کے کانوں میں نیکی اور تقویٰ اور خدا ترسی کی باتیں ڈالی جاتی ہیں مگر یہ لوگ جانوروں کی طرح الفاظ تو سنتے ہیں اور آواز تو ان کے کانوں میں پڑتی ہے لیکن اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اپنی پُرانی ڈگر پر چلتے چلے جاتے ہیں۔

اس تمثیل میں بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے لئے ایک داعی کے طور پر ہیں۔ اور کفار آپ کے لئے ریوڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپؐ ان کو اپنی طرف بلاتے ہیں اور آپؐ کی دُعا اور نداء بھی وہ سنتے ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ گویا جانوروں کو بلانے والے کا سا حال ہمارے نبی کا ہوتا ہے کہ اس کی بات کو یہ لوگ سمجھتے نہیں۔ اس تشریح پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مشبّہ اور مشبّہ بہٖ کے کل اجزاء میں مطابقت ہونی ضروری ہوتی ہے مگر وہ یہاں موجود نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ تمثیلِ مرکب میں مشبّہ اور مشبّہ بہٖ کے تمام افراد میں مطابقت نہیں دیکھی جاتی بلکہ صرف اتنی بات دیکھی جاتی ہے کہ آیا ان میں کسی خاص بات میں مشابہت پائی جاتی ہے یا نہیں اور اگر ہو تو تشبیہ درست سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ سیبویہ کا یہی قول ہے کہ مرکب تمثیل میں تمام اجزاء مشبّہ کا مشبّہ بہٖ کے اجزاء کے مطابق ہونا ضروری نہیں بلکہ اس کے صرف بعض اجزاء کی مطابقت ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔ (املاء ماامنّ بہ الرّحمٰن زیر آیت ھٰذا)۔

ان معنوں پر ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کفار کی مثال بھیڑ بکریوں کی سی ہے تو بھیڑ بکریاں تو داعی کی آواز سنتی ہیں اور کفار بھی سُنتے ہیں پھر اُن کو صُمٌّ کیوں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صُمٌّ سے یہاں یہ مراد نہیں کہ وہ جسمانی طور پر بہرے ہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ ان کے کان حق بات سننے سے قاصر ہیں اور صُمٌّ کے بعد بُکْمٌ اور عُمْیٌ کا لفظ اس مفہوم کی وضاحت کرتا ہے کیونکہ جس طرح بُکْمٌ کے یہ معنے ہیں کہ وہ حق بات کہہ نہیں سکتے اور عُمْیٌ کے یہ معنے ہیں کہ وہ حق بات کو دیکھ نہیں سکتے۔ اسی طرح صُمٌّ سے مراد یہ ہے کہ وہ حق بات کو سن نہیں سکتے گویا وہ آواز تو سنتے ہیں لیکن اس کی حقیقت نہیں سمجھتے اور نہ اس کے مطابق اپنے اندر تغیر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس جہاں سُننے کا ذکر ہے وہاں یہ مراد ہے کہ وہ صرف الفاظ سُنتے ہیں اور جہاں نہ سُننے کا ذکر ہے وہاں حقیقت کا سُننا مراد ہے اور حقیقت کے سمجھنے کی نفی سے دُعا اور نداء کے سننے کی نفی نہیں ہوسکتی۔ اور یا پھر صُمٌّ سے ایسے لوگ مراد ہیں جن سے کسی فائدہ کی امید نہ کی جاتی ہو کہ یہ معنے بھی لُغتاً ثابت ہیں چنانچہ اقرب الموارد جو لُغت کی مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے اَلْاَصَمُّ اَیْضًا اَلرَّجُلُ لَا یُطْمَعُ فِیْہِ یعنی ایسے شخص کو بھی اَصَم کہتے ہیں جس سے کسی بھلائی کی اُمید نہ کی جاسکے۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ ان کفار کی مثال جانوروں کی طرح ہے جن کو بلانے والا اپنی طرف بلاتا ہے اور جانور بلانے والے کی آواز سُن کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ گو اس کے الفاظ کا مطلب اور مفہوم نہیں سمجھتے اسی طرح یہ لوگ بھیڑ چال کے طور پر ایک دوسرے کی اتباع کرتے ہیں اور یہ کبھی غور نہیں کرتے کہ کہنے والا کیا کہتا ہے اور آیا اس پر عمل کرنا ان کے لئے مفید ہے یا مضر؟ وہ صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ ہمارے سردار یا ہمارے لیڈر نے فلاں بات کہی ہے یا ہماری قوم یا برادری ایسا کہتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی عقل وفہم اور تدبّر کے تمام دروازے بند کر لیتے ہیں اور اندھا دھند اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ پس ان کی مثال جانوروں کی سی ہے کہ دوسرے کی بات سن کر یہ لوگ اس پر غور کرنے کے عادی نہیں بلکہ اندھی تقلید کے خوگر ہیں۔ گویا ان کے کان بھی ہیں مگر یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ انہیں جس طرف بلایا جارہا ہے وہ ہلاکت اور بربادی کی جگہ ہے یا امن اور سلامتی کا مقام ہے۔ ان کی زبانیں بھی ہیں مگر دلیری سے حق بات کہنے کی جرأت کھو بیٹھی ہیں اور ان کی آنکھیں بھی ہیں مگر سلامتی کی راہ ان کو دکھائی نہیں دیتی۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ ان کفار کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو چیختا اور چلاتا اور بتوں کو اپنی مدد کے لئے بلاتا ہے اور اس کا بلانا دو طرح ہے ایک دعا کے ذریعہ سے دوسرا نداء کے ذریعہ سے۔ نداء ایسی آواز کو کہتے ہیں جو سنی جائے یا نہ سُنی جائے اور دعا اس آواز کو کہتے ہیں جو سنی جائے۔ فرماتا ہے وہ بُت جن کو یہ لوگ اپنی مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ وہ نہ ان کی دُعا سنتے ہیں نہ نداء۔ گویا ان کفار کا کام محض دعا اور نداء ہی ہے ورنہ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں سُنتے۔ نہ دُعا سنتے ہیں نہ نداء سنتے ہیں۔ اس لئے اُن کے بلانے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس صورت میں اِلَّا کو زائدہ تسلیم کرنا پڑے گا یا پھر یہ فقرہ اس طرح ہوگا کہ لَا يَسْمَعُ اِلَّا هُوَ يَدْعُوْا دُعَآءً وَنِدَآءً۔ یعنی وہ بُت تو کچھ نہیں سنتے مگر وہ پکارنے والا برابر دُعائیں کئے چلا جاتا ہے اور آوازیں دیتا چلا جاتا ہے۔ ان معنوں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ چیختے چلاتے ہیں تو پھر وہ بُكْمٌ کیسے ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بُكْمٌ کے یہ معنے ہیں کہ وہ حقیقت کا اپنی زبان سے اقرار کرنے کے لحاظ سے گونگے ہیں۔ اور اس کی دلیل صُمٌّ اور عُمْيٌ کے الفاظ ہیں جیسے صُمٌّ سے ایسے لوگ مراد ہیں جن کے کان حق بات کے سُننے سے بہرے ہیں اور عُمْيٌ سے مراد حق کو نہ دیکھنے والے لوگ ہیں اسی طرح بُكْمٌ سے مراد وہ لوگ ہیں جو روحانی نقطہ نگاہ سے گونگے ہیں۔ اور جو سچائی کا برملا اظہار کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اگر یہاں صرف بُكْمٌ کا لفظ ہوتا تو اعتراض درست ہوتا۔ لیکن صُمٌّ اور عُمْيٌ کے الفاظ نے صحیح معنے واضح کر دیئے۔

ترتیب وربط: اس آیت کا آیت ماقبل سے پہلے معنوں کے لحاظ سے یہ تعلق ہے کہ پہلی آیت میں خدا تعالیٰ

نے فرمایا تھا وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا کہ جب انہیں خدا تعالیٰ کی طرف بلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا اس کی اتباع کرو تو وہ اُسے سن کر اعراض اختیار کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو اُسی طریق کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انہیں دعوتِ حق دینا ایسا ہی ہے جیسے جانوروں کو اپنی طرف بلانا۔ یہ لوگ بھی آپ کی آواز سُنتے ہیں مگر سمجھتے نہیں کہ اس آواز پر لبیک کہنا کس قدر ضروری ہے اور وہ اپنے باپ دادا کے طریق پر چلتے چلے جاتے ہیں۔

دوسرے معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا پہلی آیت سے یہ تعلق ہے کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اَوَ لَوْ کَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ کہ یہ لوگ اپنے باپ دادا کے پیچھے چلنے کے تو بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن ان کے باپ دادا اپنے بُتوں کو پکارتے اور آوازیں دیتے تھک گئے اور کچھ بھی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ایسی صورت میں ان کا یہ کہنا کہ ہم اپنے باپ دادا ہی کی پیروی کریں گے ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی بُتوں کو بلائے اور اس کا بلانا بالکل بیکار ثابت ہو اور اُسے کوئی جواب نہ ملے پس ان لوگوں کا بھی اپنے بُتوں کے سامنے چیخنا چلانا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں کھاؤ۔ اور اگر تم (واقعہ میں)

اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر (بھی ادا) کرو۔

تفسیر جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اسلامی شریعت نے صرف حلال چیزوں کے کھانے کا ہی حکم نہیں دیا بلکہ حلال میں سے بھی طیّب اشیاء کے استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اور یہ اسلام کی ایسی امتیازی خصوصیت ہے جس میں کوئی اور مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس نے حلال کے مقابلہ میں صرف حرام کا درجہ ہی نہیں رکھا بلکہ اس سے اُتر کر اس نے بعض چیزوں کو مکروہ بھی قرار دیا ہے اور مومنوں کے لئے ان کا استعمال ناپسند فرمایا ہے۔ گویا چار مختلف مدارج ہیں جن کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے اوّل طیّب دوم حلال سوم حرام چہارم مکروہ۔ حلال ترقی کرتے کرتے طیّب تک پہنچ جاتا ہے اور حرام گرتے گرتے مکروہ تک آ جاتا ہے۔ غرض اسلام اور دیگر مذاہب میں یہ

فرق ہے کہ دوسرے مذاہب صرف حلال حرام تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں اور اسلام حلال اور حرام کے علاوہ بعض چیزوں کو طیّب یا مکروہ بھی قرار دیتا ہے۔ اور یہ بھی بتاتا ہے کہ کونسی چیزیں بعض حالات میں حلال ہو جاتی ہیں گو اصل میں حرام ہوں اور کون سی چیزیں بعض حالات میں حرام ہو جاتی ہیں گو اصل میں حلال ہوں اور اس طرح موازنہ اشیاء کو قائم کرتا اور ایک لطیف باب گناہ اور نیکی کے امتیاز کے لئے کھول دیتا ہے مثلاً ہماری شریعت میں لوگوں کو ایذاء دینے سے منع کیا گیا ہے۔ اب اگر حلال چیز سے کسی وقت دوسروں کو ایذاء پہنچ جائے تو اس وقت اس کا استعمال کرنا بھی حرام ہو جائے گا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرِ يَعْنِي الثُّوْمَ فَلَا يَأْتِيَنَّ الْمَسَاجِدَ (مسلم کتاب المساجد باب نھی من أکل ثومًا۔۔۔)۔ یعنی جو شخص کچے لہسن کا استعمال کرے اسے چاہیے کہ مسجد میں نہ آئے۔ ایک دوسری حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے کہ فَاِنَّ الْمَلَآئِكَةَ تَتَاَذّٰى مِمَّا يَتَاَذّٰى مِنْهُ الْاِنْسُ کہ ملائکہ بھی ان چیزوں سے تکلیف محسوس کرتے ہیں جن سے انسان تکلیف محسوس کرتے ہیں (مسلم کتاب المساجد باب نھی من أکل ثومًا۔۔۔)۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ باوجود اس کے کہ لہسن کھانا جائز ہے پھر بھی مساجد میں آنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لہسن اور پیاز وغیرہ کا کھانا ممنوع قرار دے دیا۔ اور ایسے شخص کو نماز باجماعت سے بھی روک دیا۔ ورنہ نماز تو کسی صورت میں بھی چھوڑی نہیں جا سکتی وہ اگر مسجد میں نماز نہیں پڑھے گا تو بہر حال اُسے گھر پر نماز پڑھنی پڑے گی۔ لیکن اس وجہ سے کہ وہ دوسروں کے لئے دُکھ اور تکلیف کا موجب نہ بنے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ایسا شخص اجتماعی عبادت سے الگ رہے تا کہ مومنوں کو تکلیف نہ ہو۔ غرض یہ اسلام کی ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ اس نے نہ صرف حلّت وحرمت کے مسائل بیان کئے بلکہ اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کھانے کی چیزوں میں سے ادنیٰ درجہ حلال کا ہے اور حرام چیزوں میں سے ادنیٰ درجہ کراہت کا ہے پس مومنوں کو حلال اور حرام پر ہی نظر نہیں رکھنی چاہیے بلکہ انہیں تقویٰ کی باریک راہیں اختیار کرتے ہوئے حلال میں سے بھی طیّب چیزوں کو اختیار کرنا چاہیے اور حرام چیزیں تو الگ رہیں مکروہ چیزوں کے پاس پھٹکنے سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حلال کی بجائے صرف طیّب کا لفظ رکھا ہے جس کی یہ وجہ ہے کہ یہاں خاص طور پر مومنوں کو مخاطب کیا گیا ہے یعنی اعلیٰ درجہ کے مومنوں کو۔ ورنہ اس رکوع کے شروع میں بھی يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا میں اَلنَّاسُ سے مراد مومن ہی تھے کیونکہ کفار کو قرآن کریم مسائل تفصیلی میں حکم نہیں دیتا۔ لیکن وہاں اَلنَّاسُ سے ادنیٰ درجہ کے مومن مراد تھے جو طبعی خواہشات کی طرف جھکنے والے تھے۔ اسی لئے وہاں ان کی

کمزوریوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ حکم دیا کہ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا یعنی جو کچھ حلال اور طیّب ہے کھاؤ۔ کیونکہ ہوسکتا تھا کہ وہ صرف طیّبات تک اپنے آپ کو محدود نہ رکھ سکتے بلکہ خالص حلّت وحرمت کے دائرہ کے اندر ہی رہنا چاہیں اور زیادہ پابندیاں اپنے لئے برداشت نہ کرسکیں لیکن یہاں خاص درجہ کے مومنوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے حکم دیا کہ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ تم صرف وہ طیبات استعمال کرو جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پہلے حکم کے نتیجہ میں فرمایا تھا کہ تم شیطان کے پیچھے چلنے سے بچ جاؤ گے لیکن یہاں یہ فرمایا کہ اگر تم صرف طیبات ہی استعمال کرو گے تو اس کے نتیجہ میں تم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالا سکو گے۔یعنی تمہیں ایسے نیک اعمال کی توفیق ملے گی جو تمہاری روح کو اللہ تعالیٰ کے آستانہ کی طرف کھینچ کرلے جائیں گے۔جیسے دوسرے مقام پر وضاحتاً فرمایا کہ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا (المؤمنون:۵۲) یعنی اے ہمارے رسولو! تم طیبات کھاؤ اور مناسب حال اعمال بجالاؤ۔گویا اسلام نے انسانی اعمال اور اخلاق پر غذا کے اثرات کو واضح طور پر تسلیم فرمایا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اس نقطہ کو ہمیشہ مدِّنظر رکھیں اور غذائی معاملات میں طیّبات کو ترجیح دیا کریں تاکہ ان کے اخلاق بھی متوازن رہیں اور ان میں ناواجب اونچ نیچ کا کوئی پہلو دکھائی نہ دے۔غرض یہاں اعلیٰ درجہ کے ایمان کے مناسب حال كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ فرمایا۔اور جب انسان طیبات پر حصر کرلے گا تو نہ صرف یہ کہ وہ منہیات سے بچ جائے گا بلکہ وہ صالحات کی بھی توفیق پائے گا۔پس اعلیٰ درجہ کے مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر حلال بھی نہ کھائے بلکہ خاص طور پر طیّب کو مدنظر رکھے یا پھر اس آیت میں صرف طیب کو اس لئے بیان کردیا کہ حلال اسی میں آجاتا ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ

اس نے تم پر صرف مردار، خون، سؤر کے گوشت کو اور ان چیزوں کو جنہیں اللہ کے سوا کسی اور سے نامزد کردیا

مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ

ہو حرام کردیا ہے۔مگر جو شخص (ان اشیاء کے استعمال پر) مجبور ہو جائے اور وہ نہ تو قانون کا مقابلہ کرنے والا ہو

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾

اور نہ حدود سے آگے نکلنے والا ہو اس پر کوئی گناہ نہیں۔اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حل لغات۔اَلْمَيْتَةُ اَلْمَيْتَةُ مَا لَمْ تَلْحَقْهُ الذَّكٰوةُ۔وَالْحَيَوَانُ الَّذِيْ يَمُوْتُ حَتْفَ اَنْفِهٖ (اقرب)

اَلْمَيْتَةُ مَيْتٌ کا مؤنث ہے۔اور مَيْتَةٌ سے مراد ہر ایسی چیز ہے جو بغیر کسی بیرونی سبب کے مرے اور اُسے ذبح نہ کیا جائے۔

اور شریعت اسلام کے نزدیک اُسے بھی مُردار ہی کہتے ہیں جو ذبح نہ ہو خواہ ایسا جانور خود بخود مر جائے یا کوئی دوسرا اُسے مار دے۔

دَمٌ کے معنے خون کے ہیں اور اس سے مراد دمِ مسفوح ہے جو ذبح کرنے سے بہہ جاتا ہے۔اندر کا خون مراد نہیں۔

اُهِلَّ اَهَلَّ سے فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور اَهَلَّ الْهِلَالُ وَاُهِلَّ (مجهولاً) کے معنے ہیں ہلال ظاہر ہو گیا (۲) اَهَلَّ الْقَوْمُ الْهِلَالَ رَفَعُوْا اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رُؤْيَتِهٖ۔لوگوں نے ہلال پر آواز بلند کی (چاند کو ہلال اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے دیکھنے پر آواز بلند کی جاتی ہے) (۳) اور اَهَلَّ الصَّبِيُّ کے معنے ہیں رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالْبُكَاءِ یعنی بچہ رونے لگا۔(۴) اور جب اَهَلَّ الرَّجُلُ کہیں تو معنے ہوں گے نَظَرَ اِلَى الْهِلَالِ آدمی نے ہلال دیکھا (۵) اور اَهَلَّ الشَّهْرُ کے معنے ہیں ظَهَرَ هِلَالُهٗ نئے مہینے کا ہلال نکلا (۶) اَهَلَّ السَّيْفُ بِفُلَانٍ کے معنے ہیں قَطَعَ فِيْهِ تلوار نے اُسے کاٹ دیا۔(۷) اَهَلَّ الْعَطْشَانُ کے معنے ہیں رَفَعَ لِسَانَهٗ اِلٰى لُهَاتِهٖ لِيَجْتَمِعَ لَهٗ رِيْقُهٗ یعنی پیاسے نے اپنی زبان تھوک سے تر کرنے کے لئے حلق کے قریب کی۔(۸) اَهَلَّ اللّٰهُ السَّحَابَ کے معنے ہیں خدا تعالیٰ نے بادل برسایا (۹) اَهَلَّ الشَّهْرَ کے معنے ہیں رَأَى الْهِلَالَ چاند دیکھا۔(۱۰) اَهَلَّ الْمُلَبِّيُّ کے معنے ہیں رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالتَّلْبِيَةِ. يُقَالُ اَهَلَّ الْمُحْرِمُ بِالْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ لَبّٰى وَرَفَعَ صَوْتَهٗ۔محرم نے حج اور عمرہ کے لئے تلبیہ کیا اور آواز بلند کی۔(۱۱) اَهَلَّ فُلَانٌ بِذِكْرِ اللّٰهِ کے معنے ہیں رَفَعَ صَوْتَهٗ بِهٖ عِنْدَ نِعْمَةٍ اَوْ رُؤْيَةِ شَيْءٍ يُعْجِبُهٗ فلاں شخص نے کوئی نعمت دیکھ کر ذکر الٰہی کے لئے اپنی آواز بلند کی (۱۲) اَهَلَّ بِالتَّسْمِيَةِ عَلَى الذَّبِيْحَةِ کے معنے ہیں قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا۔وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے معنے ہیں نُوْدِيَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اسْمِ اللّٰهِ عِنْدَ ذَبْحِهٖ۔ جو جانور خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔(اقرب)

اُضْطُرَّ ضَرَّ سے باب افتعال کا ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور اِضْطَرَّهٗ اِلَيْهِ کے معنے ہیں اَحْوَجَهٗ وَاَلْجَاهُ فَاضْطُرَّ بِصِيْغَةِ الْمَجْهُوْلِ اَيْ اُلْجِيءَ (اقرب) اضطرار کسی شخص کو ایسے کام پر مجبور کر دینے کو کہتے ہیں جو اس کے لئے باعث ضرر ہو یا اُسے ناپسند ہو۔یہ مجبوری خواہ بیرونی ہو جیسے تہدید و تخویف یا اندرونی ہو جیسے قدرتی مطالبات اور طبعی حوائج یعنی بھوک وغیرہ۔ان دونوں میں سے کسی قسم کی مجبوری کے ماتحت انسان کام کرے تو اُسے اضطرار کہتے ہیں۔

بَاغٍ بَغَیَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اَلْبَغْیُ کے معنے ہیں (۱) اَلظُّلْمُ ظلم (۲) اَلْجُرْمُ وَالْجِنَایَۃُ قصور (۳) اَلْعِصْیَانُ نافرمانی (۴) کُلُّ مُجَاوَزَۃٍ وَاِفْرَاطٍ عَلَی الْمِقْدَارِ الَّذِیْ ھُوَ حَدُّ الشَّیْءِ فَھُوَ بَغْیٌ کسی مقررہ حد سے تجاوز کرنا بھی بغی ہے۔ (اقرب)

اور اَلْبَاغِی سے مراد ہے (۱) اَلطَّالِبُ چاہنے والا (۲) اَلظَّالِمُ ظالم (۳) وَالْعَاصِیْ عَلَی اللّٰہِ وَالنَّاسِ اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور لوگوں کی مخالفت میں کھڑا ہو جائے۔

عَادٍ حدّ سے گذر جانے والا یعنی جو قانون پر عمل کرتے کرتے کچھ زیادتی یا کمی کر دے۔

اِثْمٌ اس جگہ اس کے معنے سزا کے ہیں۔ سبب کو مسبب کی جگہ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ سزا کا سبب گناہ ہوتا ہے۔ (۲) اِثْمٌ کے معنے گناہ کے بھی ہو سکتے ہیں۔

تفسیر۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت اسلامیہ میں جن اشیاء کے کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ وہ دو قسم کی ہیں اول حرام دوم ممنوع۔ لُغَۃً تو حرام کا لفظ دونوں قسموں پر حاوی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس آیت میں صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ یعنی مُردار، خون۔ سؤر کا گوشت اور وہ تمام چیزیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے نام سے نامزد کر دیا گیا ہو۔ ان کے سوا بھی شریعت میں بعض اور چیزوں کے استعمال سے روکا گیا ہے۔ لیکن وہ چیزیں اشیاءِ ممنوعہ کی فہرست میں تو آئیں گی۔ قرآنی اصطلاح کے مطابق حرام نہیں ہوں گی۔ جیسے حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نَہٰی عَنْ کُلِّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَعَنْ کُلِّ ذِیْ مِخْلَبٍ مِنَ الطَّیْرِ (مسلم کتاب الصّید والذبائح باب تحریم أکل کل ذی ناب من السباع۔۔۔) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کچلیوں والے درندے اور پنجوں والے پرندے کو کھانا ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ نَہٰی عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاِنْسِیَّۃِ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم کتاب الصید والذبائح باب تحریم أکل لحم الحمر الإنسیة)۔

یہ احکام اس آیت یا دوسری آیات کے مضمون کے مخالف نہیں ہیں۔ کیونکہ جس طرح اوامر کئی قسم کے ہیں بعض فرض ہیں بعض واجب ہیں اور بعض سنت ہیں۔ اسی طرح نہی بھی کئی اقسام کی ہے۔ ایک نہی محرّمہ ہے اور ایک نہی مانعہ ہے اور ایک نہی تنزیہی ہے۔ پس حرام چار اشیاء ہیں باقی ممنوع ہیں اور ان سے بھی زیادہ وہ ہیں جن کے متعلق نہی تنزیہی ہے۔ یعنی بہتر ہے کہ انسان اُن سے بچے۔ حرام اور ممنوع میں وہی نسبت ہے جو فرض اور واجب میں ہے۔ پس جن اشیاء کو قرآن کریم نے حرام کہا ہے ان کی حرمت زیادہ سخت ہے اور جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے منع کیا ہے وہ حرمت میں ان سے نسبتاً کم ہیں اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے احکام میں ان کی مثال فرض اور واجب اور سنت کی سی ہے حرام تو بمنزلہ فرض کے ہے اور منع بمنزلہ واجب کے۔ جس طرح فرض اور واجب میں فرق ان کی سزاؤں کے لحاظ سے کیا جاتا ہے اسی طرح جن اشیاء کی حرمت قرآن کریم میں آئی ہے اگر انسان اُن کو استعمال کرے گا تو اس کی سزا زیادہ سخت ہوگی اور جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے ان کے استعمال سے اس سے کم درجہ کی سزا ملے گی لیکن بہر حال دونوں جرم قابل گرفت اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہوں گے۔ حرام فعل کا ارتکاب کرنے سے انسان کے ایمان پر اثر پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ لازماً بدی ہوتی ہے۔ لیکن دوسری چیزوں کے استعمال کا نتیجہ لازماً بدی اور بے ایمانی کے رنگ میں نہیں نکلتا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ مسلمانوں میں سے بعض ایسے فرقے جو ان اشیاء کو مختلف تاویلات کے ذریعے جائز سمجھتے اور انہیں کھا لیتے ہیں جیسے مالکی ان کا اثر ان کے ایمان پر نہیں پڑتا اور اُن میں بے ایمانی اور بدی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ گذشتہ دور میں تو ان میں اولیاء اللہ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن خنزیر کا گوشت یا مُردار کھانے والا کوئی شخص ولی اللہ نظر نہیں آئے گا۔ پس حرمت کے بھی مدارج ہیں اور ان چاروں حرام چیزوں کے سوا باقی تمام ممنوعات ہیں جن کو عام اصطلاح میں حرام کہا جاتا ہے ورنہ قرآنی اصطلاح میں وہ حرام نہیں ہیں۔ دراصل ایک حرمت ایسی ہے۔ جو صرف لُغتاً حرمت کہلاتی ہے اس لحاظ سے ہر وہ چیز جس سے کسی دوسرے کو منع کر دیا جائے حرام کہلائے گی۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منع کی ہوئی چیزیں ہیں۔ لیکن قرآنی اصطلاح میں صرف یہی چار چیزیں حرام ہیں۔

اس آیت میں مُردار کھانے سے اللہ تعالیٰ نے اس لئے روکا ہے کہ مردار کا خون بہت سی زہروں پر مشتمل ہوتا ہے اور مُردار کی نسبت اغلب گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ بیماری سے یا زہر سے یا زہریلے جانوروں کے کاٹے سے مرا ہو۔ یا بالکل بوڑھا ہو کر مرا ہو۔ اور یہ سب حالتیں ایسی ہیں کہ ان میں جانور کا گوشت استعمال کرنے کے قابل نہیں رہتا اور اگر گر کر یا کسی اور صدمہ سے مرا ہو تب بھی قاعدہ ہے کہ سخت صدمہ کا اثر فوراً خون میں زہر پیدا کر دیتا ہے۔ پس درحقیقت کھانے کے قابل صرف وہی گوشت ہوتا ہے جو ذبح کئے ہوئے جانور کا ہو ورنہ اُس کا لازماً بد اثر ہوگا اور یہ چیز صرف خیالی نہیں بلکہ موجودہ طبّ نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ خواہ کوئی جانور عمر طبعی پا کر بوجہ بڈھا ہونے کے مرے یا کسی اونچے مقام سے گر کر ہلاک ہو یا کسی صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے یا کسی بیماری کا شکار ہو اس کے خون میں کئی قسم کے خطرناک جراثیم اور کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میڈیکل جیورس پروڈنس Medical Jurisprudence جو ڈاکٹری کی ایک مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ مردہ کے گوشت میں بہت جلد کیڑے

پیدا ہو جاتے ہیں جن سے ایسے زہر پیدا ہوتے ہیں جنہیں Cadaveric Alkalies, یا Ptomaines کہتے ہیں۔ یہ زہر سخت مہلک ہوتے ہیں اور ان کا اثر کچلا اور ایڑوپین کے مشابہ ہوتا ہے۔

اِسی طرح خون بھی مختلف قسم کی زہروں پر مشتمل ہوتا ہے اور صحت کے لئے سخت مضر چیز ہے۔ فزیالوجی والے لکھتے ہیں کہ خون انسانی بدن میں ایک ایسے گڑھے کی طرح ہوتا ہے جس میں بے حد مچھلیاں اور مینڈک اور کیڑے ہر وقت اپنی غذا بھی اُس سے لیتے ہوں اور اپنا فضلہ بھی اس میں پھینکتے ہوں۔ کیونکہ اس میں بے انتہا سیلز تیر رہے ہیں اور ہر وقت اُسے خراب کر رہے ہیں۔ یہ خون کا ہی کام ہے کہ وہ ٹشوز سے مردہ مادہ کو ان آرگنز تک لے جاتا ہے جو اُسے خون سے صاف اور علیٰحدہ کرتے ہیں۔ پس خون مختلف قسم کے زہروں اور ردی مادوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور جسم کے اندر خدا تعالیٰ نے اُس کے صاف کرنے کے لئے کئی سامان بنائے ہوئے ہیں لیکن جب وہ جسم سے باہر آجائے تو اُس کے زہر اُس کے اندر ہی رہ جاتے ہیں اور اس کا استعمال صحت کے لئے سخت مضر ہوتا ہے اور چند منٹ میں خراب ہو جاتا ہے بلکہ ہوا کے کیڑے مل کر بہت جلد نشوونما پا جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ گوشت جس سے خون دھویا جائے دیر تک رہتا ہے بہ نسبت اس کے جسے خون لگا ہوا ہو۔ پس خون کا بداثر بھی ظاہر ہے۔

خنزیر کے گوشت کا اثر بھی انسان کے جسم اور اُس کے اخلاق پر نہایت بُرا پڑتا ہے۔ جسم پر تو اُس کا اس طرح گندہ اثر پڑتا ہے کہ اس کے گند اور کیچڑ میں رہنے اور گندی ذہنیت کو پسند کرنے کے سبب سے اس کے گوشت سے کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مسٹر Jonathan Nicholson اپنی کتاب Swine Flesh میں لکھتے ہیں۔

> "It is exceptional evidence against the hateful Hog when we say Tape worm, Scrofula, Cancer and Eneyster Trichina are unknown amoung strict Jews. They never touch the Hog flesh."

یعنی سؤر کے گوشت کے متعلق ایک غیر معمولی عجیب شہادت یہ ہے کہ کدو دانے اور سِل کا مادہ یہودیوں کے اندر اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سؤر کا گوشت نہیں کھاتے۔ اگر ان کی یہ بات پورے طور پر تسلیم نہ بھی کی جائے تب بھی اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ سؤر خور قوموں میں یہ بیماریاں زیادہ ہوتی ہیں۔

سؤر کے گوشت سے ایک مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے جسے ’’Trichinosis‘‘ کہتے ہیں۔ اس میں پہلے

ہیضہ کی علامات ظاہر ہوتی ہیں پھر بخار ہو جاتا ہے پھر بدن میں درد شروع ہو جاتا ہے اور آخر میں نمونیا ہو جاتا ہے۔ میڈیکل جیورس پروڈنس میں لکھا ہے کہ اس مرض کا کوئی علاج نہیں۔

اسی طرح سؤر کے گوشت سے آنتوں میں کیڑے پڑ جاتے ہیں جو کدّو دانہ کے مشابہ ہوتے ہیں اور سالہا سال تک رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ایف بٹلر ایم۔ڈی۔ ایف۔ آر۔ سی۔ پی اپنی کتاب ''پریکٹس آف میڈیسن'' میں لکھتے ہیں کہ سؤر میں یہ بیماری پاخانہ کھانے سے پیدا ہوتی ہے لیکن ان ضرروں سے بھی بڑھ کر بلکہ اصل باعث اس کی حرمت کا وہ خرابیاں ہیں جو اخلاق میں پیدا ہوتی ہیں۔ صرف سؤر ہی ایک ایسا جانور ہے جس میں نر کو نر پر پھاندنے کی عادت ہے پس وہ لوگ جو سؤر کا گوشت کھانے کے عادی ہیں ان میں بھی دیوّثی بڑھ جاتی ہے اور حیا کا مادہ کم ہو جاتا ہے۔

پھر اُس میں شجاعت بھی نہیں ہوتی بلکہ تہور کی عادت ہوتی ہے جس وقت اسے غصہ آ جائے وہ آگے پیچھے نہیں دیکھتا بلکہ سیدھا حملہ کرتا ہے اور اسی عادت کی وجہ سے شکاری اسے جلد مار لیتا ہے۔ جب شکاری اُسے گولی مارتا ہے تو وہ غصہ میں سیدھا حملہ کرتا ہے اور اس طرح جلدی گر جاتا ہے۔ اسی طرح جو قوم سؤر کا گوشت کھانے والی ہوگی اس میں بھی شجاعت نہیں پائی جائے گی بلکہ تہوّر پایا جائے گا۔

بانی سلسلہ احمدیہ اپنی مشہور تصنیف ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' میں خنزیر کی حرمت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

''ایک نکتہ اس جگہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ خنزیر جو حرام کیا گیا ہے خدا نے ابتداء سے اس کے نام میں ہی حرمت کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ خنزیر کا لفظ خنز اور اَر سے مرکب ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ میں اس کو فاسد اور خراب دیکھتا ہوں۔ خنز کے معنے بہت فاسد۔ اَرْ کے معنے دیکھتا ہوں پس اس جانور کا نام جو ابتداء سے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے وہی اس کی پلیدی پر دلالت کرتا ہے اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ ہندی میں اس جانور کو سور کہتے ہیں یہ لفظ بھی سوء اور اَر سے مرکب ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ میں اس کو بہت بُرا دیکھتا ہوں۔ .... اور یہ معنے جو اس لفظ کے ہیں یعنی بہت فاسد اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اول درجہ کا نجاست خور اور نیز بے غیرت اور دیّوث ہے۔ اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانونِ قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بدن اور روح پر پلید ہی ہو۔ کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ غذاؤں کا بھی انسان کی روح پر ضرور اثر ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے

کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی پڑے گا جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصیت حیا کی قوت کو کم کرتا ہے اور دیّوثی کو بڑھاتا ہے‘‘۔

چوتھی چیز جسے حرام قرار دیا گیا ہے وہ ہے جو شرک کے طور پر ذبح کی جائے اور اس کے قربان کرنے کا باعث خدا تعالیٰ کے سوا اور ہستیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش ہو۔ چونکہ اس میں خدائے وحدہٗ لاشریک کی ہتک کی جاتی ہے اور اس کی صفات دوسری ہستیوں کو دی جاتی ہیں اس لئے اس کو استعمال کرنا انسان کو بے غیرت بناتا ہے بلکہ درحقیقت ایسے جانور کو کھانا دلی ناپاکی اور بے غیرتی کی علامت ہے۔ پس اسلام نے اس کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ یہ حرمت اس کے طبعی نقصانات سے نہیں بلکہ دینی نقصانات کی وجہ سے ہے کیونکہ جو شخص کسی ایسے جانور کا گوشت کھاتا ہے جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو وہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ اُسے خدا تعالیٰ کی توحید سے کوئی محبت نہیں۔ وہ بظاہر خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے مگر اپنے باطن میں اس نے اور بھی کئی بُت چُھپا رکھے ہیں جن کی وہ پرستش کرتا ہے۔ پس اس کا کھانا اس کے دل کو ناپاک کرتا اور اُسے مشرکوں کا ہمرنگ بنا دیتا ہے۔

عیسائی لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اسلام نے تورات کی نقل کرتے ہوئے ان اشیاء کو حرام قرار دیا ہے کسی حکمت کی وجہ سے ان کو حرام قرار نہیں دیا۔ مگر ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو تورات نے حرام کیا ہے مگر قرآن نے حرام نہیں کیا مثلاً اونٹ کو تورات میں حرام قرار دیا گیا ہے (احبار باب ۱۱ آیت ۴) لیکن اسلام میں اس کا کھانا جائز ہے اگر کہو کہ عربوں کی خاطر اُسے حرام نہیں کیا گیا۔ تو میں کہتا ہوں کہ خرگوش کو بھی تورات میں حرام کیا گیا ہے (احبار باب ۱۱ آیت ۶) لیکن اسلام میں اس کا کھانا بھی جائز ہے۔ اگر اونٹ عربوں کی خاطر حلال کیا گیا تھا تو خرگوش کو حلال قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ پھر اگر یہ احکام تورات کی ہی نقل ہوتے تو چاہیے تھا کہ تورات کے تمام احکام کو نقل کر لیا جاتا مگر قرآن کریم نے اس کے بہت سے احکام کو چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً تورات نے مُردار کھانے والے کے لئے یہ سزا مقرر کی ہے کہ وہ ناپاک ہو جائے گا اور کپڑے دھونے کے بعد بھی شام تک ناپاک رہے گا (احبار باب ۱۱ آیت ۳۹، ۴۰) لیکن قرآن کریم نے اس بے معنی بات کو چھوڑ دیا ہے۔ پس یہ کہنا کہ قرآن نے تورات کی نقل کی ہے واقعات کے لحاظ سے بالکل غلط بات ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ تورات نے تو حرمت کی کوئی وجہ بیان نہیں کی لیکن قرآن کریم حرمت کی وجہ بھی بتاتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ

رَّحِيْمٌ (الانعام:۶:۱۴۶) یعنی تُو ان سے کہہ دے کہ جو کچھ میری طرف نازل کیا گیا ہے میں تو اس میں اُس شخص پر جو کسی چیز کو کھانا چاہے سوائے مردار یا بہتے ہوئے خون یا سؤر کے گوشت کے کوئی چیز حرام نہیں پاتا۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک چیز نجس ہے یا میں فسق کو حرام پاتا ہوں۔ یعنی اس چیز کو جس پر خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ لیکن جو شخص اس کے کھانے پر مجبور ہو جائے بغیر اس کے کہ وہ شریعت کا مقابلہ کرنے والا ہو یا حد سے نکلنے والا ہو یعنی وہ جان بوجھ کر ایسے موقع پر نہ گیا ہو یا کھاتے وقت ضرورت سے زیادہ نہ کھائے تو وہ یاد رکھے کہ تیرا ربّ یقیناً بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے یعنی ایسا شخص اگر ان کھانوں کو کھالے تو اللہ تعالیٰ اُس کو اُن کے بد اثرات سے بچالے گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ مردہ اور بہا ہوا خون اور سؤر کا گوشت حرام کرنے کی وجہ ان کا تکلیف دہ ہونا ہے کیونکہ رجس کے معنے گند اور عذاب کے ہوتے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ یہ چیزیں گندی ہیں اور انسان کے لئے رُوحانی اور جسمانی طور پر موجب دکھ ہیں۔

اس کے علاوہ سورۃ مائدہ آیت ۴ اور سورۃ نحل آیت ۱۱۶ میں بھی حلال اور حرام اشیاء کا ذکر ہے اور سب میں یہی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ سوائے سورۃ مائدہ کے کہ وہاں مَيْتَةٌ کی تشریح کر کے بتایا ہے کہ اس میں گلا گھونٹا ہوا یا لاٹھی سے مارا ہوا بھی شامل ہے اسی طرح بلندی سے گر کر مرنے والا جانور یا سینگ لگنے سے مرا ہوا جانور یا وہ جانور جسے کسی درندے نے کھا لیا ہو وہ بھی مردار کے حکم میں شامل ہے۔

اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کو اس لئے علیحدہ بیان کیا ہے کہ اگرچہ اس سے ظاہری طور پر کوئی نقصان معلوم نہیں ہوتا مگر اس کے استعمال کرنے سے روحانی رنگ میں یہ بُرا نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے اندر اباحت اور بے دینی پیدا ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ سے اس کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ پس بائیبل نے تو بغیر کوئی حکمت واضح کرنے کے بعض چیزوں کو حرام قرار دے دیا۔ مگر قرآن کریم نے حرام کرنے کی وجہ بھی بتائی ہے پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حلّت و حرمت کے مسائل تورات سے نقل کر لئے گئے ہیں۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ میں **پہلی** شرط تو یہ رکھی کہ یہ استثناء صرف اس شخص کے لئے ہے جو مضطر ہو جائے اور اضطرار کے معنے کسی شخص کو کسی ایسے کام پر مجبور کر دینے کے ہیں جو اس کے لئے باعثِ ضرر ہو یا جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ اور یہ مجبوری دو قسم کی ہوتی ہے ایک بیرونی تہدید و تخویف اور ایک اندرونی جیسے ہیجانِ جذبات اور مطالبات نیچر وغیرہ (مفردات راغب) **دوسری** شرط یہ رکھی کہ وہ باغی یعنی سرکش اور قانون شکن نہ ہو۔ **تیسری** شرط یہ رکھی کہ وہ عادی یعنی حد سے گذرنے والا نہ ہو۔ باغی کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی اپنے کسی عیسائی دوست کے گھر میں بیٹھا ہوا ہو اور

وہ بےتکلفی سے گھر والوں سے کہے کہ مجھے کچھ کھانے کے لئے دو اور وہ سؤر کا گوشت سامنے رکھ دیں تو وہ اُسے بےتکلف کھانے لگ جائے یہ بغاوت اور نافرمانی ہوگی۔ سؤر کا گوشت کھانا صرف اُس وقت جائز ہوگا جب وہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہو اور اُسے کھانے کے لئے سؤر کے گوشت کے سوا اور کوئی چیز کھانے کی میسر نہ آ رہی ہو۔ کیونکہ اس وقت اس کے استعمال میں نقصان کم اور عدمِ استعمال میں نقصان زیادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وَلَا عَادٍ فرما کر بتا دیا کہ مضطر کو بھی کُلّی طور پر اجازت نہیں دی گئی کہ وہ پیٹ بھر کر کھانا کھالے بلکہ صرف اتنا کھانے کی اجازت دی گئی ہے جس سے اس کی زندگی قائم رہ سکے۔ اگر وہ ان حدود کا خیال رکھے گا تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس خیال سے کہ آج تو پہلی مرتبہ سؤر کا گوشت کھانے کا موقعہ ملا ہے خوب سیر ہو کر کھالے تو یہ ناجائز ہوگا۔ بہرحال اضطرار تاویلی نہیں بلکہ حقیقی ہونا چاہیے تب ان چیزوں کا استعمال اس کے لئے جائز ہوگا۔

آخر میں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایسی مجبوری کی حالت میں کھانے والے پر کوئی گناہ نہیں تو بخشنے کے کیا معنے ہوئے اور اگر ایسی حالت میں کھانا بھی گناہ ہے تو پھر فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ کا کیا مطلب ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی دوسری آیات سے پتہ لگتا ہے کہ انسان سے جو کمزوریاں سرزد ہوتی ہیں وہ بھی اس کی کسی مخفی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ چونکہ اس جگہ ایسے لوگوں کا ذکر کیا جا رہا تھا جنہیں مجبوری کی حالت میں لحمِ خنزیر وغیرہ استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ تمہارا اس حالت کو پہنچنا بتاتا ہے کہ تم تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز نہیں تھے ورنہ خدا تعالیٰ تمہیں اس حالت سے بچا لیتا اور تمہارے رزق کے لئے غیب سے کوئی اور صورت پیدا فرما دیتا۔ آخر آج تک اُمتِ محمدیہ میں لاکھوں اولیاء اللہ گذرے ہیں کیا کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ولی کے متعلق بھی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اُس پر ایسا فاقہ آیا کہ وہ مردار یا سؤر کا گوشت کھانے پر مجبور ہو گیا۔ اگر نہیں تو پھر ایسے شخص کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ اُس سے اپنی پہلی زندگی میں کوئی نہ کوئی قصور ایسا ضرور سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں اُسے یہ دن دیکھنا پڑا کہ وہ مومن کہلاتے ہوئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ہوتے ہوئے سؤر کا گوشت کھانے پر مجبور ہو گیا۔ بےشک ایسی حالت میں اُس کا بقدرِ ضرورت چند لقمے لے لینا اور موت سے اپنے آپ کو بچا لینا جائز ہے لیکن چونکہ اس کی یہ حالت کسی مخفی شامت اعمال کا نتیجہ ہوگی اس لئے اُسے چاہیے کہ وہ اپنے اعمال کا جائزہ لے کر اپنی گذشتہ کمزوریوں پر ندامت کے آنسو بہائے۔ خدا تعالیٰ کے حضور توبہ اور استغفار سے کام لے اور دُعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی کمزوریوں کو معاف فرمائے اور ان پر پردہ ڈالے اور اُسے

اپنی مغفرت کے دامن میں لے لے۔ اگر وہ سچے دل سے ایسا کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو غفور اور رحیم پائے گا اور آئندہ اس قسم کے حالات میں مبتلا ہونے سے محفوظ ہو جائے گا۔

ایک صحابیؓ کا واقعہ ہے انہیں جنگ میں پکڑ کر اور قید کر کے قیصر کے پاس بھیجا گیا۔ اس نے چاہا کہ انہیں قتل کر دے مگر اس کے مصاحبوں نے کہا کہ قتل نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ مسلمان بھی ہمارے قیدیوں کو قتل نہیں کرتے اور اگر عمرؓ کو پتہ لگ گیا کہ اُن کے ایک آدمی کو قتل کیا گیا ہے تو وہ اس کا سختی سے انتقام لیں گے۔ قیصر نے کہا میں تو چاہتا ہوں کہ اسے ایسی سزا دوں جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔ اس پر انہوں نے کہا۔ اسے سؤر کا گوشت کھلانا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اس صحابیؓ کو چند دن بھوکا رکھا اور پھر سؤر کا گوشت کھانے کو دیا اس نے کھانے سے سختی سے انکار کر دیا وہ اُسے کھانے پر مجبور کر رہے تھے کہ قیصر کے سر میں شدید درد شروع ہو گئی جس کا اُن سے کوئی علاج نہ ہو سکا۔ اس کے مصاحبوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ اس شخص کو تکلیف دینے کی وجہ سے ہے۔ آخر یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے خلیفہ کو دُعا کے لئے لکھا جائے۔ اور چونکہ ایسی صورت میں ان کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ ایک مسلمان پر وہ ایسی سختی کریں ورنہ دعا مشکل تھی۔ اس لئے وہ مجبور ہو کر اُسے کھانا دینے لگ گئے پس جو لوگ ایمان میں پختہ ہوتے ہیں خدا تعالیٰ ان پر ایسا موقعہ ہی نہیں لاتا کہ انہیں حرام چیز کھانی پڑے۔ خدا تعالیٰ خود ان کے لئے ہر قسم کی خیر و برکت کے سامان مہیا کر دیتا ہے۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر کسی موقعہ پر انتہائی مجبوری کی وجہ سے مردار یا سؤر کا گوشت استعمال کر لیا جائے تو جن زہریلے اثرات کی وجہ سے شریعت نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ بہرحال ایک مومن کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان نتائج کا تدارک اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان غفور اور رحیم خدا کا دامن مضبوطی سے پکڑ لے اور اُسے کہے کہ اے خدا! میں نے تو تیری اجازت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی جان بچانے کے لئے اس زہریلے کھانے کو کھا لیا ہے لیکن اب تو ہی فضل فرما اور ان مہلک اثرات سے میری روح اور جسم کو بچا جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی حکمت کے باعث آخر میں اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ کہا گیا ہے۔ تا کہ انسان مطمئن نہ ہو جائے بلکہ بعد میں بھی وہ اس کی تلافی کی کوشش کرتا رہے اور خدا تعالیٰ سے اُس کی حفاظت طلب کرتا رہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غالباً شریعت کی اسی رخصت کو دیکھتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا کہ اگر کسی حاملہ عورت کی حالت ایسی ہو جائے کہ مرد ڈاکٹر کی مدد کے بغیر اُس کا بچہ پیدا نہ ہو سکتا ہو اور وہ ڈاکٹر کی مدد نہ لے اور اُسی حال میں مر جائے تو اس عورت کی موت خودکشی سمجھی جائے گی اسی طرح اگر انسان کی ایسی حالت ہو جائے کہ

وہ بھوک کے مارے مرنے لگےاور وہ سؤر یا مُردار کا گوشت کسی قدر کھالےتو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ

جولوگ اس (تعلیم) کو جو اللہ نے (الٰہی) کتاب (میں) نازل کی ہے چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی سی

بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا

قیمت لیتے ہیں وہ یقیناً اپنے پیٹوں میں صرف آگ ڈالتے ہیں

النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَ

اور قیامت کے دن اللہ نہ ان سے کلام کرے گا اور نہ ان کو پاک قرار دے گا اور

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۵﴾

ان کے لئے دردناک عذاب (مقدر) ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو اس عظیم الشان تعلیم کو چھپاتے ہیں جسے خدا نے لوگوں کی ہدایت کے لئے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے اور اس کے بدلہ میں دنیوی فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ انڈیلتے ہیں۔ یہ آیت حلت و حرمت کے مسائل کے بیان کرنے کے معاً بعد لاکر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس طرح مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت تم پر حرام ہے اور جس طرح غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور کھانا تمہارے لئے گناہ ہے اسی طرح یاد رکھو کہ خدا اور اس کے رسول کے احکام کو چھپانا اور دنیوی مال و جاہ یا عہدوں کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے دینا اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ دینا بھی مُردار اور سؤر کا گوشت کھانے سے کم نہیں۔ جس طرح وہ حرام خوری ہے اسی طرح یہ بھی حرام خوری ہے کہ انسان دین سے واقف ہوتے ہوئے کلمہ حق کہنے سے احتراز کرے۔ اور ڈرے کہ اگر میں نے اپنے عقیدہ کو نہ چھپایا یا خدا اور اس کے رسول کے احکام کا برملا اظہار کر دیا تو میری ملازمت جاتی رہے گی یا میری تجارت ماری جائے گی یا میرے دوستوں کے حلقہ میں میری عزت کم ہو جائے گی۔ فرماتا ہے جو لوگ صحیح علم رکھنے کے بعد بھی منافقت سے کام لیتے ہیں اور

دنیوی مفاد کو دینی مفادات پر ترجیح دیتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ وہ اپنے پیٹوں میں انگارے ڈال رہے ہیں۔

مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ اِلَّا النَّارَ ۔ اس آیت میں بُطُوْن کا لفظ تاکید کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور فِیْ بُطُوْنِھِمْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کے بطون کے اندر آگ کا عذاب پیدا کیا جائے گا۔ یعنی انہیں اندرونی عذاب دیا جائے گا جو بیرونی عذاب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کو ایک شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ؎

دُخُوْلُ النَّارِ لِلْمَھْجُوْرِ خَیْرٌ مِنَ الْھِجْرِ الَّذِیْ ھُوَ یَتَّقِیْہِ

لِاَنَّ دُخُوْلَہٗ فِی النَّارِ اَدْنٰی عَذَابًا مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ فِیْہِ

یعنی ایک مہجور انسان جو اپنے محبوب کے فراق میں نالہ و فریاد کر رہا ہو اس کا آگ میں داخل ہو جانا اس جدائی کی آگ سے زیادہ آسان ہوتا ہے جس سے وہ بچنا چاہتا ہے ۔ کیونکہ اس کا آگ کے اندر داخل ہونا اس سے کم تکلیف دہ ہے کہ آگ اس کے اندر داخل ہو جائے اور وہ اس کے رگ و ریشہ کو جلا کر راکھ کر دے۔ اسی محاورہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ آگ میں داخل کئے جائیں گے بلکہ فرمایا کہ وہ آگ اپنے پیٹوں میں ڈال رہے ہیں۔ یعنی وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے لئے ایک اندرونی جہنم تیار کر رہے ہیں۔ گویا اس آیت میں سبب کی جگہ مسبّب استعمال ہوا ہے۔

وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۔ پھر فرماتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے قیامت کے دن کلام تک نہیں کرے گا۔ یہ ایک عظیم الشان نکتہ تھا جسے افسوس کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے فراموش کر دیا۔ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اُن سے نہیں بولے گا حالانکہ قیامت کا دن وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کافروں سے بھی کلام کرے گا۔ جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں آتا ہے وَ یَوْمَ یُنَادِیْھِمْ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِیْنَ (القصص: ٦٦) یعنی اس دن خدا تعالیٰ کفار کو پکارے گا اور کہے گا تم نے میرے رسولوں کے پیغام کا کیا جواب دیا تھا؟ پس قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کا کفار سے بھی کلام کرنا ثابت ہے تو بعض لوگوں سے اس کا منہ پھیر لینا اور ان سے کلام تک نہ کرنا بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے شدید ناراض ہوگا۔ اور وہ نہیں چاہے گا کہ ان سے زجر کے رنگ میں بھی کلام کرے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا کلام نہ کرنا اُس کی ناراضگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر اس زمانہ کے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا اپنے بندوں سے کلام نہ کرنا نعوذ باللہ ایک بڑی نعمت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل امتِ محمدیہ کو حاصل ہوئی حالانکہ خیرِ اُمت کی علامت یہ ہونی چاہیے تھی کہ اللہ تعالیٰ اس نعمت کا دروازہ ان پر زیادہ سے زیادہ کھولتا اور پہلی قوموں سے بھی زیادہ

انہیں شرفِ مکالمہ ومخاطبہ عطا فرماتا۔ مگر انہوں نے زحمت کو رحمت سمجھ لیا اور خدا تعالیٰ سے دُوری کو ایک انعام سمجھ کر اُسے حرز جان بنالیا۔

اس آیت کا ایک یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کا کلام نہیں کرے گا۔ اور یہ عام محاورہ ہے۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ میں تم سے دوستانہ کلام نہیں کروں گا پس اس کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس روز ان سے دوستانہ کلام نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کا کلام ایسا ہی ہوگا جیسے ایک جج کسی مجرم کو سزا کا حکم سُناتے وقت کلام کرتا ہے۔ مگر بہر حال خواہ کوئی معنے لئے جائیں خدا تعالیٰ کا ترک گفتگو اس کی ناراضگی کی نشانی ہے۔ مگر مسلمان بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کا اُمت محمدیہ پر یہ انعام نازل ہوا کہ اس نے ان سے کلام کرنا ترک کر دیا اور وحی اور الہام کے سلسلہ کو منقطع کر دیا۔

پھر فرمایا وَ لَا یُزَکِّیۡهِمۡ ۔ چونکہ اسلام کی رو سے کفار کو دوزخ میں ڈالنے کی غرض ہی یہی ہے کہ ان کا تزکیہ ہو اس لئے وَ لَا یُزَکِّیۡهِمۡ کے یہ معنے نہیں کہ وہ انہیں پاک نہیں کرے گا۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک قرار نہیں دے گا۔

ترتیب وربط: ان آیات میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ساتھ ہی یہود کو بھی مدِّنظر رکھا گیا ہے چنانچہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَةَ میں ان کے اس اعتراض کو دُور کیا گیا ہے کہ یہ نبی ان چیزوں کو کیوں حلال کرتا ہے جو شریعت موسویہ میں حرام تھیں؟ اگر یہ ان پیشگوئیوں کا مصداق ہے تو اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ اعتراض قلّتِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ جو احکام کسی خاص وقت کے مناسب حال تھے ان کو دوام کا رنگ نہیں دیا جاسکتا تھا اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے یہود کے ہاں اونٹ حرام تھا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت حلال تھا۔ پس جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے قبل بعض چیزیں حلال تھیں اور کئی انبیاء تک ان کو استعمال کرتے رہے مگر بعد میں ان کو حرام کر دیا گیا۔ اسی طرح موسوی شریعت کے بعد بھی خدا تعالیٰ اختیار رکھتا تھا کہ وہ بعض حرام سمجھی جانے والی چیزوں کو حلال کر دیتا۔ پس اس پر اعتراض کرنا نادانی کی علامت ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اور مغفرت چھوڑ کر عذاب اختیار کر لیا ہے۔

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۶﴾

پس آگ (کے عذاب) پر ان کی برداشت تعجب انگیز ہے۔

حل لغات۔ اِشْتَرَوْا اِشْتَرٰی سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِشْتَرَاہُ کے معنے ہیں مَلَكَهٗ بِالْبَيْعِ کسی چیز کا خرید کے ذریعہ سے مالک ہو گیا۔ بَاعَهٗ نیز اس کے معنے ہیں اس کو بیچا یعنی یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ اور متضاد معنے دیتا ہے خریدنے کے بھی اور بیچنے کے بھی۔ وَكُلُّ مَنْ تَرَكَ شَيْئًا وَ تَمَسَّكَ بِغَيْرِهٖ فَقَدِ اشْتَرَاهُ ۔ ہر وہ شخص جو ایک چیز کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کو اس کی بجائے اختیار کر لے اس پر اِشْتَرٰی کا لفظ بولیں گے۔ گویا اس نے ایک چیز دے کر دوسری لے لی۔ (اقرب) عام طور پر شَرَا کسی چیز کو خریدنے اور لفظ بَيْع کسی چیز کے بیچنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جب سامان کو سامان کے بدلہ میں تبادلہ کیا جائے تو دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال کر لیا کرتے ہیں۔ لیکن لفظ شَرَا اور اِشْتَرٰی کا استعمال اس طرح بھی جائز ہے کہ جو شخص ایک چیز کو ترک کر دے اور دوسری کو اختیار کرے تو اس کی نسبت کہیں گے کہ شَرَاهُ یا اِشْتَرَاهُ۔ (مفردات)

اَلضَّلٰلَةُ ضَلَّ يَضِلُّ کے معنے ہیں ضِدُّ اِهْتَدٰى یعنی ہدایت کے خلاف حالت پر ہو گیا اور دین اور حق نہ پایا۔ ضَلَّ عَنْهُ يَضِلُّ : لَمْ يَهْتَدِ اِلَيْهِ اس طرف راہ نہ پائی۔ ضَلَّ يَضَلُّ (ضاد کی زبر سے) فُلَانٌ الطَّرِيْقَ وَعَنِ الطَّرِيْقِ لَمْ يَهْتَدِ اِلَيْهِ راستہ نہ پایا۔ جب دار یا منزل یا ہر اپنی جگہ پر قائم رہنے والی چیز کا اس کے بعد ذکر ہو تو اس کے یہی معنے ہوتے ہیں۔ ضَلَّ الرَّجُلُ فِي الدِّيْنِ ضَلَالًا وَضَلَالَةً : ضِدُّ اِهْتَدٰى ۔ اس شخص نے دین کے معاملہ میں درست راہ نہ پائی۔ ضَلَّ فُلَانٌ الْفَرَسَ فلاں شخص نے اپنا گھوڑا گم کر دیا۔ ضَلَّ عَنِّيْ كَذَا : ضَاعَ مجھ سے فلاں چیز ضائع ہو گئی۔ ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّبَنِ. خَفِيَ وَغَابَ پانی دودھ میں مل گیا اور غائب ہو گیا۔ ضَلَّ فُلَانٌ فُلَانًا: نَسِيَهٗ اس شخص کو بھول گیا۔ ضَلَّ النَّاسِيْ : غَابَ عَنْهُ حِفْظُ الشَّيْءِ۔ بھول گیا۔ اس کے ذہن سے بات نکل گئی۔ ضَلَّ سَعْيُهٗ : عَمِلَ عَمَلًا لَمْ يَعُدْ عَلَيْهِ نَفْعُهٗ ایسا کام کیا کہ جس کا

اسے کوئی نفع نہ ہوا۔(اقرب)

هُدٰی اَلرَّشَادُ۔ سیدھے راستہ پر ہونا۔ اَلْبَیَانُ بیان کرنا۔ اَلدَّلَالَۃُ۔ کسی امر کی طرف رہبری کرنا (اقرب) اَلْهِدَایَۃُ الدَّلَالَۃُ بِلُطْفٍ یعنی ہدایت (جو هُدًی کا ہم معنی دوسرا مصدر ہے) کے معنی محبت اور نرمی سے کسی امر کی طرف رہبری کرنے کے ہیں۔(مفردات)

یہ مصدر ہے اور فاعل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی لوگوں کو ہدایت دینے والا۔

امام راغب کے نزدیک ہدایت کا لفظ قرآن کریم میں مندرجہ ذیل چار معنوں میں آتا ہے (۱) ہر عقل یا سمجھ یا ضروری جزوی ادراک کی طاقت رکھنے والی شے (جیسے حیوانات وغیرہ کہ اِدراکِ کامل ان کو حاصل نہیں ہوتا صرف جزوی یا سطحی اِدراک ایسے ضروری امور کا جو ان کی حیات اور محدود عمل سے تعلق رکھتے ہیں ان کو حاصل ہوتا ہے) کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام کا طریق بتانا۔ اس کی مثال قرآن کریم میں یہ ہے رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ:۵۱) یعنی ہر چیز کو پیدا کر کے اس کی عقل یا سمجھ یا اس کے ضروری تقاضوں کے مطابق اسے رہنمائی کی (میرے نزدیک اس جگہ ھدی کے معنے یہ ہیں کہ ہر شے میں مناسب قوتیں پیدا کر کے پھر انہیں کام پر لگا دیا کیونکہ صرف قوتوں کا موجود ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ انہیں ابتدائی حرکت دے کر کام پر لگانا ان کی حیات کے شروع کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے بچہ پیدا ہوتا ہے تو گو پیدائش سے پہلے آلاتِ تنفّس کامل طور پر موجود ہوتے ہیں مگر باہر نکلنے کے بعد جب تنفّس کے آلات کو ہوا لگنے یا پانی کا چھینٹا دینے سے ان میں حرکت پیدا ہوتی ہے بچہ کی عملی زندگی درحقیقت اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جس طرح ایک گھڑی کے اندر سب ہی پُرزے موجود ہوتے ہیں مگر جب تک اُسے کُنجی دے کر حرکت نہ دی جائے پُرزے کام کرنا شروع نہیں کرتے غرض حیات کو شروع کرنے سے پہلے ایک ابتدائی دھکے کی ہر شے کو ضرورت ہوتی ہے اور ہدایت سے مراد وہی حرکت اُولیٰ ہے اور اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو مناسب قویٰ کے ساتھ پیدا کیا ہے اور پھر حرکتِ اُولیٰ دے کر اسے مفوضہ کام پر لگا دیا ہے) علّامہ راغب کے نزدیک ہدایت کے دوسرے معنے اس ارشاد کے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچاتا ہے اس کی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (السجدۃ:۲۵) ہم نے بنی اسرائیل میں سے ایسے امام مقرر کئے جو ہمارے الہام سے لوگوں کو ہماری طرف بلاتے تھے۔ ہدایت کے تیسرے معنے ان کے نزدیک اس توفیق کے ہیں جو ہدایت پانے والوں کو ملتی ہے یعنی ہدایت ملنے کے بعد جو عمل کی توفیق یا فکر

کی بلندی پیدا ہوتی ہے یا مزید ہدایت کے حصول کی خواہش پیدا ہوتی ہے وہ بھی ہدایت کہلاتی ہے اس کی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد:۱۸) جو لوگ ہدایت پاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت میں اور بڑھا دیتا ہے (یعنی عمل کی توفیق اور ہدایت کے سلسلہ میں مزید فکر کر کے اور علوم حاصل کرنے کا موقعہ عطا کرتا ہے)۔ چوتھے معنی ہدایت کے انجام بخیر کے اور جنت کو پا لینے کے ہیں اس کی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (محمد:۶) اللہ تعالیٰ ان کا انجام بخیر کر کے انہیں جنت تک پہنچا دے گا اور ان کے حالات کو درست کر دے گا اور قرآن کریم میں جہاں یہ آتا ہے يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (الانبیاء:۷۴) وہ ہمارے حکم کے مطابق ہدایت دیتے تھے یا لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد:۸) ہر قوم میں ہادی آیا ہے اس جگہ ہدایت سے مراد لوگوں کو ہدایت کی دعوت دینے کے ہیں اور ایسی آیات جیسے کہ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ (القصص:۵۷) اور ایسی آیات جن میں یہ ذکر ہے کہ کافروں اور ظالموں کو ہدایت نہیں مل سکتی۔ اس سے مراد تیسری اور چوتھی قسم کی ہدایتیں ہیں یعنی ہدایت پا جانے کے بعد توفیقِ عمل کا ملنا یا نورِ ایمان کا عطا ہونا یا جنت میں داخلہ کی نعمت کا حصول۔ پس ان آیات کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کفار کو مذکورہ بالا انعامات نہیں مل سکتے۔(مفردات راغب)

تفسیر ۔فرماتا ہے یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی اور مغفرت کی بجائے عذاب کو اختیار کر لیا ہے۔ پس آگ کے عذاب پر ان کی برداشت تعجب انگیز ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر کوئی جبر نہیں کیا بلکہ اُسے نیکی اور بدی کے اختیار کرنے پر کامل مقدرت بخشی ہے۔ اور پھر انبیاء کے ذریعہ اس نے بنی نوع انسان کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا ہے؟ اب یہ انسان کا اختیار ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ عقل اور اس کے کلام سے فائدہ اٹھا کر ہدایت کی راہ اختیار کرے یا شیطان کے پیچھے چل کر ضلالت کو اختیار کر لے۔ اگر وہ ضلالت کو ہدایت پر ترجیح دیتا ہے تو اس کے نتائج بھی طبعی طور پر اسے عذاب کی صورت میں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اس جسارت اور نابینائی پر تعجب کا اظہار کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۔ جب انہوں نے مغفرت پر عذاب کو ترجیح دی ہے تو ان کی عذاب کو برداشت کر لینے کی جرأت بڑی تعجب انگیز ہے۔

اس آیت کے متعلق یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا خدا تعالیٰ بھی تعجب کا اظہار کیا کرتا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات کلام میں حقیقی تعجب مراد نہیں ہوتا بلکہ اس سے یہ بتلانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ کیسی بے وقوفی کر رہے ہیں۔

کیا یہ بھی کوئی ایسی چیز تھی جسے اپنے اوپر وارد کر کے وہ صبر کرتے ۔ پس فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ واقعہ میں بڑے صبر کرنے والے ہیں اور خدا تعالیٰ ان کے صبر کی تعریف کر رہا ہے یا ان کے صبر پر تعجب کا اظہار کر رہا ہے بلکہ یہ تعریض ہے اور اس سے لوگوں کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان بیوقوفوں کی موجودہ حالت بتاتی ہے کہ یہ لوگ عذاب پر بہت ہی صبر کرنے والے ہیں ۔ نہ یہ کہ عذاب پر وہ واقعہ میں صبر کریں گے کیونکہ معمولی عذاب بھی انسان کی قوتِ برداشت سے باہر ہو جاتا ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ اگر مَا کو استفہامیہ قرار دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کس چیز نے انہیں آگ پر صبر کرنے والا بنا دیا؟ اور اگر مَا کو نافیہ قرار دیا جائے تو پھر اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ مَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۔ اللہ تعالیٰ انہیں آگ پر صبر نہ دے ۔ یعنی خوب سزا دے اور وہ سزا ان کو اچھی طرح محسوس ہو ۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ

یہ (عذاب) اس سبب سے ہوگا کہ اللہ نے اس کتاب کو (مشتمل) برحق اتارا ہے اور جن لوگوں نے اس کتاب کے

اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۷﴾ ع

بارہ میں اختلاف کیا ہے وہ یقیناً پرلے درجہ کی عداوت میں (مبتلا) ہیں ۔

حل لغات ۔ شِقَاقٌ شَاقَّ کا مصدر ہے اور شَاقَّهٗ کے معنے ہیں خَالَفَهٗ وَعَادَاهُ ۔ وَحَقِيْقَتُهٗ اَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا فِيْ شِقٍّ غَيْرِ شِقِّ صَاحِبِهٖ یعنی اس نے اس کی مخالفت اور دشمنی کی اور اس کے حقیقی معنے یہ ہیں کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی مخالف جانب سے آیا ۔ (اقرب)

تفسیر ۔ فرماتا ہے یہ عذاب انہیں اس وجہ سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بڑے بھاری احسانات سے کام لیتے ہوئے انہیں ایک ایسا قانون بخشا تھا جس کا ایک ایک حرف صداقت پر مشتمل ہے ۔ مگر ان لوگوں نے انتہا درجہ کی عداوت اور دشمنی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اسے ٹھکرا دیا ۔ اور خدائی پیغام کے منکر بن گئے ۔

شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ سے ایسی عداوت مراد ہے جو اپنی شدت میں انتہا درجہ تک پہنچی ہوئی ہو اور جس کا سلسلہ ایک طویل مدت تک بھی منقطع نہ ہو ۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ

تمہارا مشرق اور مغرب کی طرف منہ پھیرنا کوئی بڑی نیکی نہیں ہے

وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ

لیکن کامل نیک وہ شخص ہے جو اللہ، روز آخرت، ملائکہ، (الٰہی) کتاب

الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ

اور سب نبیوں پر ایمان لایا۔ اور اس (یعنی اللہ) کی محبت کی وجہ سے رشتہ داروں اور

الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي

یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کو اور سوالیوں کو نیز غلاموں (کی آزادی) کے لئے

الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ

(اپنا) مال دیا۔ اور نماز کو قائم رکھا اور زکوۃ کو ادا کیا اور اپنے عہدوں کو جب بھی کوئی عہد کرلیں

بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ

پورا کرنے والے اور (خاص کر) تنگی اور بیماری میں اور جنگ کے وقت برداشت سے کام لینے والے

الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ

(کامل نیک ہیں)۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے قول کے) سچے نکلے۔

هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

اور یہی لوگ کامل متقی ہیں۔

حل لغات۔ اَلْبِرُّ اَلصِّلَةُ وَ الطَّاعَةُ وَالصِّدْقُ ۔ بِرّ کے معنے صلہ رحمی، اطاعت اور سچائی کے ہیں۔ (اقرب)

مفرداتِ امام راغب میں لکھا ہے اَلْبِرُّ: اَلتَّوَسُّعُ فِیْ فِعْلِ الْخَیْرِ۔ پھر لکھا ہے بَرَّ الْعَبْدُ رَبَّهٗ اَیْ تَوَسَّعَ فِیْ طَاعَتِهٖ فَمِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی اَلثَّوَابُ وَفِی الْعَبْدِ اَلطَّاعَةُ۔ یعنی بِرّ کے معنے ہیں نیکی میں وسعت اختیار کرنا۔ چنانچہ بَرَّ الْعَبْدُ رَبَّهٗ کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وسعت اختیار کی۔ برّ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو اس سے مراد ثواب دینا ہے اور اگر بندے کی طرف منسوب ہو تو اس سے مراد اطاعت کرنا ہے۔

اَلْبَاسَآءُ کے معنے ہیں اَلشِّدَّةُ شدت (۲) اِسْمٌ لِلْحَرْبِ جنگ (۳) اَلْمَشَقَّةُ وَالضَّرْبُ مشقت اور مار۔ (اقرب)

اَلضَّرَّآءُ کے معنے ہیں (۱) اَلزَّمَانَةُ قحط (۲) اَلشِّدَّةُ سختی و مصیبت (۳) اَلنَّقْصُ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ۔ مال اور افراد میں کمی (۴) نَقِیْضُ السَّرَّآءِ یہ سَرَّاء یعنی فراخی کا اُلٹ ہے۔ (اقرب)

اَلْبَأْسُ کے معنے ہیں (۱) اَلْفَقْرُ مالی مشکلات۔ (۲) اَلْعَذَابُ عذاب (۳) اَلشِّدَّةُ فِی الْحَرْبِ جنگ کی سختی (۴) اَلْقُوَّةُ قوت۔ قرآن کریم میں آتا ہے وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں بڑی قوت ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نیکی اور تقویٰ کے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ حقیقی نیکی کس چیز کا نام ہے؟ اگر غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں نیکی اور تقویٰ کے متعلق بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور مختلف جماعتوں اور مختلف قوموں اور مختلف زمانہ کے لوگوں کے نزدیک نیکی کی تعریف مختلف رہی ہے۔ غرباء نیکی کی کچھ اور تعریف کرتے ہیں اور اُمراء کچھ اور کرتے ہیں۔ پھر ممالک کے لحاظ سے بھی نیکی کی تعریف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں حاجی بڑے نیک شمار ہوتے ہیں یہاں تک کہ ایک شخص خواہ صوم وصلوٰۃ اور دوسرے احکام شرعی کا کتنا ہی پابند کیوں نہ ہو لوگ اس کے مقابلہ میں حاجی کو ترجیح دیں گے خواہ اس نے سفر حج میں اپنے اوقات فضول اور لغو طور پر ہی ضائع کئے ہوں اور حج کرنے کے بعد بھی اپنے اندر کوئی تغیر پیدا نہ کیا ہو۔ اور صوم وصلوٰۃ کا بھی چنداں پابند نہ ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ ایک ریل کے سٹیشن پر ایک نابینا بڑھیا بیٹھی تھی کہ ایک شخص نے اس کی چادر اُٹھالی۔ بڑھیا کو جب پتہ لگا کہ چادر غائب ہے تو اس نے آواز دے کر کہا۔ کہ بھائی حاجی! مجھ غریب کی چادر کیوں لی ہے؟ میرے پاس تو اَور کوئی کپڑا نہیں میں تو سردی سے ٹھٹھر کر مر جاؤں گی۔ وہ چادر تو اس شخص نے لا کر رکھ دی مگر پوچھا کہ تجھے کس طرح پتہ لگا کہ میں حاجی ہوں۔ بڑھیا نے جواب دیا کہ ایسے کام حاجی ہی کیا کرتے ہیں۔ اب دیکھو! وہ عورت اس سے واقف نہ

تھی اور نہ اس کی آنکھیں سلامت تھیں مگر اس نے پہچان لیا کہ ایسی سنگدلی حاجی میں ہی پائی جاسکتی ہے لیکن باوجود اس کے پھر بھی عام طور پر ہمارے ملک میں حاجیوں کو بڑا نیک سمجھا جاتا ہے لیکن عرب میں جاؤ تو وہ لوگ حج کو نیکی قرار نہیں دیں گے بلکہ ان میں نیکی سخاوت کو سمجھا جائے گا۔ وہ لوگ اگر کسی کی نیکی کی تعریف کریں گے تو کہیں گے کہ فلاں شخص بڑا نیک ہے کیونکہ بڑا سخی ہے۔ اسی طرح اب یورپ میں اسلام پھیلے تو وہاں روزے کو بڑی نیکی سمجھا جائے گا کیونکہ وہ لوگ کثرت سے کھانے پینے والے ہیں۔ پس جب ان کو کھانے پینے سے رکنا پڑے گا تو وہ حج اور زکوٰۃ اور نماز وغیرہ احکام شرعی کی بجا آوری کو اعلیٰ نیکی قرار دینے کی بجائے صرف روزہ رکھنے کو سب سے بڑی نیکی قرار دیں گے۔ پھر ہمارے ملک میں یہ بھی بڑی نیکی خیال کی جاتی ہے کہ کوئی شخص نماز کا پابند ہو۔ ایسے شخص کے متعلق بھی لوگ کہتے ہیں کہ بڑا نیک ہے کیونکہ نماز کا پابند ہے۔ لیکن صحابہؓ کے نزدیک کسی شخص کی نیکی کا معیار محض پابندیٔ نماز نہیں تھا کیونکہ وہ لوگ نیکی کے اس اعلیٰ مقام پر کھڑے تھے جہاں صرف پابندیٔ نماز کو بڑی نیکی قرار دینا ایسی ہی بات تھی جیسے کہا جائے فلاں شخص بڑا بہادر ہے کیونکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا ہے یا فلاں شخص بڑا تیز نظر ہے کیونکہ اس کی ماں جو اس کے پاس بیٹھی تھی اسے اُس نے پہچان لیا ہے۔ یا فلاں شخص کا معدہ بڑا ہی مضبوط ہے کیونکہ اس نے ایک چنا ہضم کر لیا۔ پس جیسا کہ بہادری تیز نظری اور مضبوطی معدہ کے یہ معیار نہایت مضحکہ خیز ہیں اسی طرح صحابہؓ کے نزدیک کسی شخص کی نیکی کا معیار محض پابندیٔ نماز مضحکہ خیز تھا۔ کیونکہ وہ لوگ دین کے لئے بڑی بڑی قربانیاں اور سخت آزمائشوں کو نیکی سمجھتے تھے اور جس شخص میں یہ باتیں زیادہ پاتے تھے اس کو نیک سمجھتے تھے۔ پس نیک اور نیکی کی تعریف ہر زمانہ ہر ملک اور ہر قوم میں جُدا جُدا اور مختلف رہی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ پھیرنا کوئی نیکی نہیں۔ اگر کوئی شخص قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے اور اُس کی نماز میں وہ اخلاص نہیں جو حقیقی نماز میں ہوتا ہے تو اسے قبلہ کی طرف منہ کر کے بھی کچھ حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ نیکی منہ کے کسی طرف پھیر لینے کا نام نہیں۔ بلکہ نیکی نام ہے اس کیفیت کا جو دل کے اندر پیدا ہوتی ہے اور ظاہری حرکات اُس کیفیت کا ایک نشان ہیں۔ پس اگر ان ظاہری حرکات میں وہ چیز نہیں جس کا دل سے تعلق ہے تو یہ ظاہری حرکات کچھ چیز نہیں۔ محض قبلہ کی طرف رُخ کرنا یا نماز پڑھنا یا روزہ رکھنا یا حج کرنا یہ تمام باتیں دلی کیفیت نہ ہونے کے باعث ہیچ ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ وہ ہتھیار ہیں جو بغیر اس قلبی کیفیت کے کُند اور ناکارہ ہوتے ہیں۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ایک شخص کے پاس تلوار تو ہو مگر کُند ہو یا ہتھیار تو ہوں مگر زنگ خوردہ ہوں۔ پس جس طرح ہتھیاروں کی قیمت ان کی تیزی اور صفائی سے وابستہ ہے اسی طرح ان اعمال کی قدر و قیمت خدا تعالیٰ کی نظر میں اُسی وقت ہوتی

ہے جبکہ ان کے ذریعے خدا تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود ہو۔

اس آیت میں نیکی کی علامات بیان کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک حقیقی نیکی کیا چیز ہے؟ فرماتا ہے مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا نیکی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاص اور سوز و گداز کی کیفیت بھی ہونی چاہیے۔ اگر اس کے نتیجہ میں دُعاؤں اور ذکرِ الٰہی کی عادت پیدا نہیں ہوتی، اگر اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی مخلوق سے ہمدردی پیدا نہیں ہوتی، اگر اس کے نتیجہ میں یتیموں اور غریبوں اور بیکسوں کی محبت ترقی نہیں کرتی تو محض مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لینا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مشرق و مغرب کی طرف منہ پھیرنے کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس لئے ذکر فرمایا ہے کہ چند رکوع قبل اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرۃ:۱۱۶) یعنی اے مسلمانو! بے شک آج تم کمزور سمجھے جاتے ہو لیکن یاد رکھو مشرق و مغرب سب اللہ کا ہی ہے ہم ایک دن ان لوگوں سے حکومت چھین کر تمہیں مشرق و مغرب کا حکمران بنا دیں گے اور تم جس طرف بھی اپنے لشکر لے کر نکلو گے تم اللہ کے وجود کو جلوہ گر پاؤ گے یعنی قدم قدم پر تمہیں فتوحات نصیب ہوں گی اور قدم قدم پر خدا تعالیٰ تمہارے لئے اپنے نشانات ظاہر فرمائے گا۔ پس چونکہ مسلمانوں کی دنیوی فتوحات کی پہلے پیشگوئی کی جا چکی ہے جس کے مطابق انہوں نے مشرق و مغرب کا حکمران بننا تھا۔ اور جب کسی قوم کو دنیوی فتوحات حاصل ہو جائیں تو اس بات کا شدید خطرہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں دنیا کی طرف ہی نہ جھک جائے اور خدا تعالیٰ سے مخلصانہ تعلق جو اس کی فتوحات کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے اس کو نظر انداز نہ کر دے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کو ان کی اعتقادی اور عملی اصلاح کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ۔ یعنی کامل نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق و مغرب کے ملکوں پر اپنا تسلّط جما لو اور فتوحات پر فتوحات حاصل کرتے چلے جاؤ۔ بے شک یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا بھاری انعام ہے مگر کامل نیکی صرف مادی فتوحات کا نام نہیں بلکہ نام ہے اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر اور ملائکہ پر اور قرآن کریم پر اور تمام نبیوں پر سچے دل سے ایمان لانے کا اور کامل نیکی نام ہے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سائلوں اور غلاموں کی آزادی کے لئے اپنے اموال خرچ کرنے کا۔ اسی طرح کامل نیکی نام ہے نمازیں قائم کرنے کا اور زکوٰۃ دینے کا اور اپنے عہدوں کو پورا کرنے کا اور مالی مشکلات اور بیماریوں اور جنگ میں صبر اور استقامت سے کام لینے کا۔ پس بے شک دنیوی فتوحات بھی حاصل کرو مگر اس بات کو مت بھولو کہ صرف ملکوں پر غلبہ حاصل کرنا تمہارا مقصود نہیں بلکہ تمہارا مقصد اللہ تعالیٰ سے کامل تعلق پیدا کرنا اور اس کی مخلوق کی سچی خدمت کرنا ہے اور یہی وہ غرض ہے جو ہر وقت

تمہاری نظروں کے سامنے رہنی چاہیے۔ اس کے بعد فرماتا ہے وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ اس حصۂ آیت کا لفظی ترجمہ یہ بنتا ہے کہ ’’نیکی وہ ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا‘‘ لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنے درست نہیں۔ اَلْبِرَّ اسم ہے اور اس کے بعد ایسی خبر آنی چاہیے جو اس کے مطابق ہو۔ لیکن مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اس کے مطابق نہیں۔ اس لئے یہاں بعض الفاظ محذوف سمجھے جائیں گے۔ چنانچہ نحویوں نے اس کی تین توجیہات کی ہیں۔ اوّل مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں مَنْ سے پہلے بِرُّ کا لفظ محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے کہ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ یعنی کامل نیکی تو اس شخص کی نیکی ہے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر سچے دل سے ایمان لایا۔ عربی زبان میں بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ مضاف کو حذف کر دیا جاتا ہے جیسے سورۂ یوسف میں آتا ہے وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ (آیت: ۸۳) اس کے لفظی معنے یہ ہیں کہ بستی سے پوچھو۔ حالانکہ بستی سے کوئی نہیں پوچھا کرتا بلکہ بستی والوں سے پوچھا کرتا ہے۔ پس جس طرح وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ سے مراد وَاسْئَلْ اَهْلَ الْقَرْيَةِ ہے اور اس جملہ میں اھل کا لفظ محذوف ہے۔ اسی طرح مَنْ اٰمَنَ سے پہلے بِرُّ کا لفظ محذوف ہے۔ (سیبویہ جلد اوّل صفحہ ۱۰۸)

دوسری صورت یہ ہے کہ اَلْبِرُّ کو مصدر سمجھ کر اس کے معنے اسم فاعل کے کئے جائیں اور عبارت کا مفہوم یہ نکالا جائے کہ وَلٰكِنَّ الْبَآرَّ مَنْ اٰمَنَ یعنی بڑا نیک اور محمد رسول اللہؐ کا کامل متبع وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر اور کتبِ سماویہ پر اور سارے نبیوں پر ایمان لاتا ہے اور اپنے مال کو باوجود تنگی کے اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے غریبوں میں تقسیم کرتا رہتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اَلْبِرُّ کے لفظ سے پہلے ذُوْ کا کلمہ محذوف سمجھا جائے اور عبارت یوں ہو کہ وَلٰكِنَّ ذَاالْبِرِّ مَنْ اٰمَنَ یعنی کامل نیکی رکھنے والا وہ شخص ہے جو اللہ پر ایمان لایا۔ گویا اس آیت کے مفہوم کو تین صورتیں واضح کرتی ہیں اور آیت کے اگلے حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں صورتیں ہی اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہیں۔ کیونکہ اس آیت کے بعد وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ کے الفاظ آتے ہیں اور اَلْمُوْفُوْنَ حالتِ رفع میں ہے اور اَلصَّابِرِيْنَ حالتِ نصب میں۔ اگر اَلْبَآرَّ مَنْ اٰمَنَ یا ذَاالْبِرِّ مَنْ اٰمَنَ والی ترکیب صحیح سمجھی جائے تو اَلْمُوْفُوْنَ مرفوع نہیں آسکتا۔ اور اگر بِرُّ مَنْ اٰمَنَ صحیح سمجھا جائے تو اَلصَّابِرِيْنَ حالت نصبی میں استعمال نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت دو مختلف کلمات کو دو صورتوں میں استعمال کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ یہاں تینوں صورتیں ترکیب کے لحاظ سے درست ہیں اور تینوں معنے ہی خدا تعالیٰ کے منشا کے مطابق ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نیکی کے لئے پہلی شرط جو کسی صورت میں بھی بدل نہیں سکتی یہ ہے کہ انسان کو ایمان باللہ حاصل ہو۔

کبھی کوئی زمانہ ایسا نہیں آ سکتا جس میں یہ کہا جا سکے کہ ایمان باللہ کی اب ضرورت نہیں رہی۔ دوسرے یوم آخرت پر ایمان ہو۔ یہ حکم بھی کبھی نہیں بدل سکتا۔ تیسرے ملائکہ پر ایمان ہو یہ صداقت بھی ہمیشہ سے چلی آئی ہے اور چلی جائے گی۔ چہارم کتاب یعنی وحی الٰہی پر ایمان ہو۔ اس جگہ الکتاب کا لفظ اللہ تعالیٰ نے واحد رکھا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ کسی ایک کتاب پر بھی ایمان لانا کافی ہے بلکہ الکتاب سے مراد یہ ہے کہ وہ ساری وحیٔ الٰہی پر ایمان لانے والا ہو۔ خواہ کسی پہلے زمانہ میں نازل ہو چکی ہو۔ یا آئندہ نازل ہو۔ پنجم اسے نبیوں پر ایمان ہو۔ یہ پانچوں نیکیاں ایسی ہیں جن کے بغیر کبھی کوئی شخص روحانیت کا ادنیٰ سے ادنیٰ مقام بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اعمال کی طرف توجہ کی ہے اور سب سے پہلے مال خرچ کرنے کا ذکر فرمایا ہے مگر اس کے لئے بھی صرف اٰتَی الْمَالَ نہیں فرمایا کیونکہ اگر انسان ناجائز طور پر مال خرچ کر دے تو یہ نیکی نہیں بلکہ بدی ہے۔ اس لئے اٰتَی الْمَالَ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے عَلٰی حُبِّہٖ رکھا اور حُبِّہٖ کی ضمیر مال کی طرف جا سکتی ہے اور اِیْتَاء مال کی طرف بھی جا سکتی ہے اور اس شخص کی طرف بھی جا سکتی ہے جسے مال دیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف بھی جا سکتی ہے۔ پہلی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّ الْمَالِ یعنی باوجود مال کی محبت کے وہ اُسے خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے۔ دوسری صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّ اِیْتَاءِ الْمَالِ۔ یعنی وہ اپنا مال چٹی سمجھ کر نہ دے بلکہ اُسے صدقہ و خیرات دینے کا شوق ہو۔ اور وہ اس نیکی میں ایک لذت محسوس کرتے ہوئے اپنا مال پیش کرے۔ تیسری صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ جسے مال دے اسے ذلیل سمجھ کر نہ دے بلکہ اپنا بھائی سمجھ کر دے۔ اسی طرح اس کی عادات بگاڑنے کے لئے نہ دے بلکہ اس لئے دے کہ وہ اُسے اچھے کاموں میں لگائے۔ اور ترقی کرے۔ چوتھی صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّ اللّٰہِ وہ اللہ کی رضا اور اس کی محبت کے حصول کے لئے مال دے کوئی دنیوی مفاد یا شہرت اس کے پیچھے کام نہ کر رہی ہو۔ ان چار شرائط کے ساتھ مال خرچ کرنا کبھی ناپسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ یا یوں سمجھ لو کہ یہ مال خرچ کرنے کے چار مدارج ہیں۔ پہلا درجہ ادنیٰ ہے جس کی طرف قریب کی ضمیر پھر سکتی ہے۔ دوسرا درجہ اس سے اعلیٰ ہے۔ تیسرا درجہ اس سے بھی اعلیٰ ہے اور چوتھا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں مال کی محبت ہو اور پھر بھی وہ اسے خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ نیک کاموں میں روپیہ خرچ کرنے کی اُسے عادت ہو گئی ہو اور اس کا مزہ اس نے چکھا ہوا ہو جس کی وجہ سے وہ خود دلی شوق اور محبت سے اس قسم کی نیکیوں کی تلاش میں رہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ جسے مال دیا جائے اُسے اپنا بھائی سمجھ کر دیا جائے تا کہ وہ اُسے اچھے کاموں میں لگائے اور ترقی کرے لیکن پھر اس سے بھی

اوپر ایک اور درجہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے اس انفاق میں خالص اللہ تعالیٰ کی محبت کام کر رہی ہو۔ وہ اس وجہ سے مال خرچ نہ کرے کہ اسے مال خرچ کرنے کی عادت ہو چکی ہے یا اُسے اپنے غریب بھائیوں سے محبت ہے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا اس کے پیشِ نظر ہو اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لئے وہ دوسروں سے حسنِ سلوک کرے۔ یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے اور اسے صوفیاء نے اتنا بڑھایا ہے کہ ان میں سے بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ ہمیں نہ جنت کی ضرورت ہے نہ دوزخ کی بلکہ صرف خدا تعالیٰ کی ضرورت ہے۔ اگر خدا تعالیٰ دوزخ میں پڑنے سے ملتا ہو تو ہم اس میں بھی جانے کے لئے تیار ہیں۔ یہ بہت بلند مقام ہے۔ کیونکہ اس مقام پر سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی چیز انسان کے سامنے نہیں رہتی صرف خدا ہی خدا رہ جاتا ہے اور اس کا حُسن انسان پر اس قدر مستولی ہو جاتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور چیز اُسے نظر ہی نہیں آتی۔

اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ خدا کی محبت کے لئے کہاں خرچ کرے۔ سو اس کی تشریح بھی کر دی اور بتایا کہ (۱) وہ قرابت والوں کو دے اس لئے کہ انسان پر ان کا بڑا حق ہوتا ہے۔ مثلاً ماں باپ ہیں جو بچوں کی پرورش اور ان کی نگہداشت کے لئے اتنی بڑی قربانیاں کرتے ہیں جن کی مثال کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ اسی طرح دوسرے رشتہ دار اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ اگر وہ حاجت مند ہوں تو ان کی امداد کی جائے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ (۲) پھر فرمایا کہ وہ یتامیٰ کو دے چونکہ ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اس لئے ان کے حقوق کو مدِّنظر رکھنے کی تعلیم دی۔ (۳) تیسرے نمبر پر مساکین کو رکھا جن کے پاس اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مال بھی نہیں ہوتا۔ اور وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال بھی دراز نہیں کرتے۔ گویا وہ اس آیت کے مصداق ہوتے ہیں کہ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (البقرۃ: ۲۷۴)۔ وہ غربت کے باوجود اپنے اندر اخلاقی بلندی رکھتے ہیں اور اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے دوسروں سے مانگنے کی ذلت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ (۴) چوتھے نمبر پر مسافر کو رکھا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے غربت کی شرط نہیں لگائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں غریب مسافروں کی امداد کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں اگر کسی آسودہ حال مسافر کی مدد کرنی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے وہ مالدار تو ہو مگر راستہ میں اس کا مال ضائع ہو گیا ہو۔ اگر ایسا ہو تو وہ بطور حق بھی لے سکتا ہے اور کوئی چیز گرو رکھ کر بھی اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ اسی طرح حکومت کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ ملکی اور غیر ملکی مسافروں اور سیاحوں کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائے اور ان کی مشکلات کو دُور کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد پانچویں نمبر پر سائل کو رکھا۔ اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ غریب اور مفلس ہے تو اُسے ابن السبیل کے بعد

کیوں رکھا ہے؟

سو یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے سوال کرنا پسندیدہ قرار نہیں دیا بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ جس شخص کے پاس ایک وقت کا کھانا ہے اور پھر بھی وہ سوال کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی مول لیتا ہے(ابو داؤد کتاب الزکٰوۃ من یوتی من الصدقۃ) اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایک سائل کو دیکھا جس کی جھولی آٹے سے بھری ہوئی تھی اور پھر بھی وہ لوگوں سے مانگتا پھرتا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور آپ نے اس سے آٹا چھین کر اونٹوں کے آگے ڈال دیا اور فرمایا۔ اب مانگ۔(سیرت عمر ابن الخطاب لابن الجوزی باب ۶۰ صفحہ ۱۷۰) آپ کی اس سے غرض یہ تھی کہ وہ لوگوں کے لئے بار نہ بنے بلکہ خود کام کرے اور دوسروں سے مانگ کر کھانے کی ذلّت سے بچے۔ پس چونکہ اسلام نے مانگ کر کھانا ناپسند کیا ہے اس لئے یہ بتانے کے لئے کہ سوال کرنا ایک ناپسندیدہ امر ہے سائل کو سب سے آخر میں رکھا۔ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمانوں میں اعلیٰ درجہ کے اخلاق پیدا ہوں اور بجائے اس کے کہ لوگ سوال کرتے پھریں۔ وہ خود لوگوں کی ضروریات کا پتہ لگا کر ان کو پورا کیا کریں تا کہ ان کے لئے سوال کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

وَ فِي الرِّقَابِ۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر روپیہ خرچ کرنے کا ذکر کیا ہے جو قید میں پڑے ہوئے ہوں۔ اس جملہ میں ایک مضاف محذوف ہے جو فَکٌّ کا لفظ ہے۔ یعنی اصل عبارت یوں ہے کہ وَفِيْ فَكِّ الرِّقَابِ۔ اس گروہ کو پیچھے رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں زیادہ تر غیر مذاہب کے ہی قیدی ہو سکتے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ اقرب کا حق دوسروں سے مقدم ہوتا ہے۔ ابن السبیل کو تو مہمان کے طور پر رکھا ہے کہ خواہ وہ کافر ہو اُسے بھی دو مگر قیدی تو ایسے ہی لوگ ہوں گے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں لڑائی کے لئے آئے ہوں گے اس لئے فِي الرِّقَابِ کو بعد میں رکھا۔ لیکن یہ بھی اسلام کا کتنا بڑا احسان ہے کہ وہ اُسی شخص کے متعلق جو مسلمانوں کو مارنے کے لئے آیا تھا کہتا ہے کہ اسے روپیہ دے کر آزاد کرا دو۔ اسی طرح فِي الرِّقَابِ میں قرضدار اور ضامن کو امداد دینا بھی شامل ہے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ہر قسم کے صدقات دیئے لیکن غلام آزاد کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ میں جب حج کے لئے مکہ گیا تو آپ نے مجھے فرمایا کہ اگر سو دو سو روپیہ میں کوئی غلام مل جائے تو میری طرف سے آزاد کر دینا مگر مجھے کوئی غلام نہ ملا لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی بھی توفیق عطا فرما دی۔ چنانچہ مرزا محمد اشرف صاحب محاسب صدر انجمن احمدیہ کی روایت ہے کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے دو غلام آزاد کروا دیئے تھے۔

پھر فرماتا ہے وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ کامل نیک وہ شخص ہے جس نے نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ دی۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے وسیع معنے ہیں۔ مگر شریعت نے ان کو اپنی ایک مخصوص اصطلاح بھی بنالیا ہے اس جگہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ سے اصطلاحی نماز اور زکوٰۃ ہی مراد ہے۔ جن میں سے ایک خدا اور انسان کے تعلقات کو استوار کرتی اور دوسری انسان اور انسان کے باہمی تعلقات میں رابطہ قائم کرتی ہے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ صرف مال خرچ کرنے سے تم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں کر سکتے بلکہ تمہارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ تم نمازیں قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ گویا حقوق اللہ اور حقوق العباد کو جب تک ایک منظّم رنگ میں ادا نہ کیا جائے اُس وقت تک انسان نیکی کا اعلیٰ مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

پھر فرمایا وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ ۔ نیکی اور تقویٰ کا اعلیٰ مقام جن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے ان کی ایک علامت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ معاہدات کی پابندی کرتے ہیں اور اگر لوگ ان پر سختی کریں یا ظلم سے کام لیں تو وہ صبر سے کام لیتے ہیں۔ گویا ایک طرف تو وہ اسلامی تمدن کو قائم کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور کبھی بدعہدی یا دھوکا بازی سے کام نہیں لیتے اور دوسری طرف اگر مذہبی قومی اور ملکی ضروریات کے لئے انہیں سختیاں بھی برداشت کرنی پڑیں تو وہ استقلال کے ساتھ ان کو برداشت کرتے ہیں اور استقامت کا اعلیٰ نمونہ دکھاتے ہیں۔ اس جگہ عہد سے مراد صرف زبانی عہد ہی نہیں بلکہ تمدن سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مسائل بھی اس میں شامل ہیں۔ کیونکہ متمدّن دنیا میں ایک دوسرے کے حقوق کی اسی رنگ میں حفاظت ہوتی ہے کہ ہر شخص سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے دائرہ سے تجاوز نہ کرے اور دوسروں کے حقوق کو سلب کرنے کی کوشش نہ کرے اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تو تمدن کو قائم کرنے والے سمجھے جاتے ہیں اور اگر اس کے خلاف عمل کریں تو فتنہ وفساد پیدا کرنے والے قرار پاتے ہیں۔ اسلام چونکہ صلح وآشتی اور محبت کی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے اس نے کامل الایمان لوگوں کی یہ علامت بیان فرمائی ہے کہ وہ معاہدات کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بتایا کہ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ۔ وہ فقر وفاقہ اور تنگیوں میں بھی صبر سے کام لیتے ہیں اور جسمانی دکھوں اور مصائب میں بھی صبر سے کام لیتے ہیں۔ اس جگہ اَلْبَاْسَآءِ سے مالی مشکلات اور ضَرَّاء سے جسمانی مشکلات اور امراض وغیرہ مراد ہیں اور بَأْس سے شدتِ حرب مراد ہے۔ گویا ادنیٰ سے اعلیٰ ابتلاؤں کی طرف ترقی کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ یہ لڑائیاں جن کا اس جگہ ذکر کیا گیا ہے دو قسم کی ہوسکتی ہیں ایک وہ جو بھائیوں بھائیوں میں ہوں اور دوسری وہ جو غیروں سے ہوں۔ اگر آپس میں جھگڑا ہو تو وہ

اَلصَّابِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ کے مطابق اپنے حقوق کو خود چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور سچے ہو کر جھوٹوں کا سا تذلّل اختیار کرتے ہیں اور اگر غیروں سے ہو تو وہ بھاگتے نہیں بلکہ دلیری کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے اور قیام امن کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا۔ فرماتا ہے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے صدق و وفا کا نمونہ دکھایا۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ اور یہی لوگ مصائب اور دکھوں سے نجات پانے والے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت اس لئے بیان کی کہ انسان کو سب سے زیادہ تکلیف اپنے حقوق کو پامال ہوتے دیکھ کر ہوتی ہے۔ دوسرے سے حسن سلوک کو تو وہ احسان سمجھتا ہے مگر جب کوئی شخص اُسے دکھ پہنچاتا ہے تو وہ اپنی ہتک محسوس کرتا ہے۔ پس چونکہ یہ ان کی غیر معمولی قربانی تھی کہ انہوں نے خدا کے لئے دوسروں کے مظالم سہے اس لئے فرمایا کہ ایسے لوگوں کو میں خصوصیت کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ یہ سچے اور راستباز لوگ ہیں جو مجھ پر ایمان لائے ہیں یعنی انہوں نے اپنے ایمان کو عملی طور پر سچا کر کے دکھا دیا ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو مصائب سے بچنے والے ہیں۔ کیونکہ مصائب اگر آسمانی ہوں تو اُن کا علاج یہ ہوتا ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ پر ایمان لائیں اور اس کی عبادت کریں اور اگر تمدنی مصائب ہوں تو ان کا علاج یہ ہوتا ہے کہ تمدنی قوانین کو مدّنظر رکھیں۔ اور یہ لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر بھی عمل کرنے والے ہیں اور تمدنی خرابیوں سے بھی بچنے والے ہیں۔ پس یہ لوگ دنیا میں کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے۔ جو قوم ذلیل یا ہلاک ہو گی وہ یا تو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر ہلاک ہو گی یا تمدنی قوانین کو نظر انداز کر کے اپنی ہلاکت مول لے گی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ؕ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر مقتولوں کے بارہ میں برابر کا بدلہ لینا فرض کیا گیا ہے۔ آزاد (قاتل) آزاد

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ

(مقتول) کے بدلہ میں۔ غلام (قاتل) غلام (مقتول) کے بدلہ میں۔ عورت (قاتل) عورت (مقتولہ) کے بدلہ

عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ

میں (قصاص کی مستحق) ہے۔ جس (قاتل) کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو (مقتول کا

اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ

وارث بقیہ تاوان کو صرف) مناسب طور پر وصول کر سکتا ہے اور (قاتل پر) عمدگی کے ساتھ (بقیہ تاوان) اس کو ادا کر

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

دینا (واجب) ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ پھر جو شخص اس (حکم) کے بعد بھی زیادتی کرے اس کے لئے دردناک عذاب (مقدر) ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْقِصَاصُ اَنْ يُّفْعَلَ بِهٖ مِثْلَ مَا فَعَلَهٗ مِنْ قَتْلٍ اَوْقَطْعٍ اَوْضَرْبٍ اَوْ جُرْحٍ (لسان) عربی زبان میں قصاص کے معنے یہ ہیں کہ کسی شخص سے وہی سلوک کیا جائے جو اس نے قتل یا قطع یا ضرب یا زخم کرنے کی صورت میں دوسرے سے کیا ہے۔

تاج العروس میں لکھا ہے اَلْقِصَاصُ اَلْقَتْلُ بِالْقَتْلِ وَالْجُرْحُ بِالْجُرْحِ کہ قصاص اس چیز کا نام ہے کہ قتل کے مقابلہ میں قتل اور زخم کے مقابلہ میں زخم کیا جائے۔

تَخْفِيْفٌ کے معنے (۱) سہولت اور (۲) معافی کے ہیں۔

تفسیر۔ بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے قتل کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا ہے صرف بائیبل کے تتبّع میں کیا ہے خود اصولی رنگ میں اس بارہ میں کوئی ہدایت نہیں دی۔ ان کے نزدیک یہودیوں کو جو یہ کہا گیا تھا کہ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدة:۴۶) یعنی جان کے بدلہ میں جان اور آنکھ کے بدلہ میں آنکھ اور ناک کے بدلہ میں ناک اور کان کے بدلہ میں کان اور دانت کے بدلہ میں دانت اور زخموں کے بدلہ میں زخم برابر کا بدلہ ہیں اس حکم کو قرآن کریم نے اس جگہ دُہرا دیا ہے مگر ان کا یہ خیال محض قلّتِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ میرے نزدیک بنی نوع انسان کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور عائلی زندگی کے ساتھ تعلق رکھنے والا کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں جسے اسلام نے پوری وضاحت کے ساتھ بیان نہ کیا ہو۔ بیشک وہ پہلے مذاہب کی تعلیموں کا بھی بعض مقامات پر ذکر کرتا ہے مگر نفس مسئلہ پر وہ پہلے خود روشنی ڈالتا ہے اور اس کے متعلق ایک جامع اور کامل تعلیم لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کے بعد وہ غیر مذاہب والوں پر حجت تمام کرنے یا انہیں شرمندہ کرنے کے لئے ان کی تعلیموں کو بھی ان کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ ان کے دلوں میں یہ

احساس پیدا ہو کہ مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہوئے انہوں نے اس کے احکام کو کس طرح پسِ پشت پھینک رکھا ہے۔ اس جگہ بھی قصاص کی بنی نوع انسان کو جو تعلیم دی گئی ہے یہ یہودیوں کی اتباع میں نہیں دی گئی بلکہ ان احکام کے سلسلہ میں دی گئی ہے جو اکیسویں رکوع سے دیئے جا رہے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو پچھلی آیات میں بتلایا گیا تھا کہ کامل الایمان لوگوں کی علامات یہ ہوتی ہیں کہ وہ بَأْسَآءِ میں بھی صبر کرتے ہیں اور ضَرَّآءِ میں بھی صبر کرتے ہیں اور حِيْنَ الْبَأْس بھی صبر کرتے ہیں یعنی خواہ ان پر مالی مشکلات آئیں اور فقر و فاقہ تک ان کی نوبت پہنچ جائے تب بھی وہ جادۂ استقامت پر قائم رہتے ہیں اور خواہ جسمانی مشکلات آئیں اور بیماریاں ان کو گھیر لیں تب بھی وہ صبر کرتے ہیں۔ اور خواہ لڑائیوں میں مارے جائیں تب بھی وہ دشمن سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ صبر کا سلسلہ کب تک چلے گا۔ کیا لوگ ہمیں مارتے ہی چلے جائیں اور ہم خاموش بیٹھے رہیں اور اگر ایسا ہو تو ہماری زندگی کی کیا صورت ہوگی؟ اس لئے فرمایا کہ تمہارا کام تو یہی ہے کہ تم صبر کرو لیکن کچھ اور لوگ جن کے سپرد حکومت کا نظام کیا گیا ہے ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ظالموں سے بدلہ لیں اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچائیں چنانچہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى میں انہی لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے اس جگہ ''تم'' سے صرف حکّام مراد ہیں جو لاء اینڈ آرڈر یعنی نظم و ضبط کے ذمہ وار ہوتے ہیں عام لوگ مراد نہیں۔ اور كُتِبَ کہہ کر بتایا ہے کہ حکّام کا فرض ہے کہ وہ قصاص لیں۔ حکّام کو یہ اختیار نہیں کہ وہ معاف کر دیں۔

اَلصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ میں تو عوام مخاطب تھے مگر كُتِبَ عَلَيْكُمُ میں صرف حکام سے خطاب کیا گیا ہے کہ وہ قصاص لیں۔ اور فِي الْقَتْلٰى کہہ کر تصریح کر دی گئی ہے کہ اس میں جروح شامل نہیں۔ اور درحقیقت یہی وہ آیت ہے جس میں قتل کی سزا کے متعلق اسلامی تعلیم بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قتل کی سزا قتل ہے۔ اور یہ عام حکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فِي الْقَتْلٰى فرمایا ہے کہ مقتولوں کے متعلق یہ حکم ہے یہ کوئی سوال نہیں کہ وہ مقتول کون ہو اور کس قوم سے تعلق رکھتا ہو؟ اس آیت کے سوا قتلِ عمد کی دنیوی سزا کا ذکر قرآن کریم کی کسی اور آیت میں نہیں ہے پس یہی آیت ہے جس پر اسلامی فقہ کی بنیاد ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلمان میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ نہ اس میں یہ ذکر ہے کہ کس کس آلہ سے قتل کرنے والے کی سزا قتل ہے بلکہ خواہ کسی آلہ سے کوئی شخص قتل کرے۔ اُس کو قتل کیا جائے گا۔ بلکہ حدیثوں سے تو یہاں تک ثابت ہے کہ ایک قتل کے کیس میں بعض دفعہ ایک سے زیادہ افراد کو بھی مارا گیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ صَنْعَاء میں ایک شخص کو کئی لوگوں نے مل کر قتل کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کو جو تعداد میں سات تھے قتل کروا دیا اور فرمایا کہ اگر سارا شہر قتل میں شریک ہوتا تو میں سب کو قتل

کرا دیتا۔(مؤطا کتاب العقول باب ما جاء فی العیلۃ و السحر) اسی طرح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ لَا یَحِلُّ دَمُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ یَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَّا بِاِحْدَیٰ ثَلَاثٍ اَلثَّیِّبُ الزَّانِیْ وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالتَّارِکُ لِدِیْنِہٖ اَلْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَۃِ (مسلم کتاب القسامۃ و القصاص باب ما یباح بہ دم المسلم) یعنی صرف تین گناہ ایسے ہیں جن کی بنا پر مسلمان کو قتل کرنا جائز ہے۔اوّل۔شادی شدہ شخص ہو اور پھر زنا کرے۔دوم۔کوئی شخص قاتل ثابت ہو جائے۔سوم۔جو شخص اسلام کو چھوڑ کر جماعت مسلمہ سے الگ ہو جائے۔یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ صحیح مسلم میں تو صرف یہی الفاظ بیان کئے گئے ہیں مگر نسائی میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ رَجُلٌ یَخْرُجُ مِنَ الْاِسْلَامِ یُحَارِبُ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ وَرَسُوْلَہٗ فَیُقْتَلُ اَوْ یُصَلَّبُ اَوْ یُنْفٰی مِنَ الْاَرْضِ۔(النسائی کتاب تحریم الدم باب الصلب) یعنی وہ شخص جو اسلام کو چھوڑ کر مسلمانوں سے جنگ شروع کر دے۔اس کے متعلق جائز ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے یا صلیب پر لٹکا دیا جائے یا اُسے جلاوطن کر دیا جائے۔یہ حدیث بتاتی ہے کہ عورت مرد کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ جو بھی قتل کرے گا اسے قتل کیا جائے گا اور جان کے بدلہ جان لی جائے گی۔اسی طرح مسند احمد بن حنبل، بخاری، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَتَلَ مُعَاھِدًا لَمْ یَرِحْ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ (ابن ماجہ کتاب الدّیات باب من قتل معاھدا) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کافر معاہد کو مار دے وہ جنّت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔اور یہی سزا قرآن کریم میں ایک مسلمان کے قاتل کی بیان کی گئی ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ خٰلِدًا فِیْھَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا (النساء: ۹۴) یعنی جو شخص کسی مومن کو دیدہ دانستہ قتل کر دے اس کی سزا جہنم ہوگی وہ اس میں دیر تک رہتا چلا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا اور اُسے اپنے قرب سے محروم کر دے گا اور اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کرے گا۔خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے۔چنانچہ ابوجعفر طحاوی اپنی کتاب ’’شرح معانی الآثار‘‘ میں لکھتے ہیں اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُتِیَ بِرَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ قَدْ قَتَلَ مُعَاھِدًا مِنْ اَھْلِ الذِّمَّۃِ فَاَمَرَ بِہٖ فَضُرِبَ عُنُقُہٗ وَقَالَ اَنَا اَوْلٰی مَنْ وَفٰی بِذِمَّتِہٖ (شرح معانی الآثار کتاب الجنایات باب المؤمن یقتل الکافر متعمدا) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مسلمان لایا گیا جس نے ایک معاہد کافر کو جو اسلامی حکومت کی رعایا بن چکا تھا قتل کر دیا تھا۔آپ نے اس کے قتل کئے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میں عہد پورا کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ عہد کی نگہداشت رکھنے والا ہوں اسی طرح طبرانی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت روایت کی

ہے کہ ایک مسلمان نے ایک ذمّی کو قتل کر دیا تو آپ نے اس مسلمان کے قتل کئے جانے کا حکم دے دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ لَا یُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِکَافِرٍ کہ کوئی مومن کسی کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ مگر ساری حدیث دیکھنے سے بات حل ہو جاتی ہے۔ حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں کہ لَا یُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِکَافِرٍ وَلَا ذُوْعَھْدٍ فِیْ عَھْدِہٖ (ابن ماجہ کتاب الدیات باب لا یقتل مسلم بکافر)۔ اس حدیث کا یہ دوسرا فقرہ کہ وَلَا ذُوْعَھْدٍ فِیْ عَھْدِہٖ اس کے معنوں کو حل کر دیتا ہے اگر اس کے یہ معنے ہوں کہ کافر کے بدلہ میں مسلمان نہ مارا جائے تو پھر ذُوْعَھْدٍ کے یہ معنے کرنے ہوں گے کہ وَلَا ذُوْعَھْدٍ بِکَافِرٍ کہ کسی ذوعہد کو بھی کافر کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے۔ حالانکہ اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ پس یہاں کافر سے مراد محارب کافر ہے نہ کہ عام کافر۔ تبھی فرمایا کہ ذمّی کافر بھی محارب کافر کے بدلہ میں نہیں مارا جائے گا۔

اب ہم صحابہؓ کا طریق عمل دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ بھی غیر مسلم کے مسلم قاتل کو قتل کی سزا ہی دیتے تھے۔ چنانچہ طبری جلد ۵ صفحہ ۴۴ میں قماذبان ابن ہرمزان اپنے والد کے قتل کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ ہرمزان ایک ایرانی رئیس اور مجوسی المذہب تھا اور حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کا شبہ اس پر کیا گیا تھا۔ اس پر بلا تحقیق جوش میں آ کر عبید اللہ بن عمرؓ نے اس کو قتل کر دیا وہ کہتا ہے کَانَتِ الْعَجَمُ بِالْمَدِیْنَۃِ یَسْتَرُوْحُ بَعْضُھَا اِلٰی بَعْضٍ فَمَرَّ فَیْرُوْز بِاَبِیْ وَمَعَہٗ خَنْجَرٌ لَہٗ رَأْسَانِ فَتَنَاوَلَہٗ مِنْہُ۔ وَقَالَ مَا تَصْنَعُ بِھٰذَا فِیْ ھٰذِہِ الْبِلَادِ فَقَالَ اٰبُسُّ بِہٖ فَرَاٰہُ رَجُلٌ فَلَمَّا اُصِیْبَ عُمَرُ قَالَ رَاَیْتُ ھٰذَا مَعَ الْھُرْمَزَانِ دَفَعَہٗ اِلٰی فَیْرُوْزَ فَاَقْبَلَ عُبَیْدُ اللّٰہِ فَقَتَلَہٗ فَلَمَّا وُلِّیَ عُثْمَانُ دَعَانِیْ فَاَمْکَنَنِیْ مِنْہُ ثُمَّ قَالَ یَا بُنَیَّ ھٰذَا قَاتِلُ اَبِیْكَ وَاَنْتَ اَوْلٰی بِہٖ مِنَّا فَاذْھَبْ فَاقْتُلْہُ فَخَرَجْتُ بِہٖ وَمَا فِی الْاَرْضِ اَحَدٌ اِلَّا مَعِیَ اِلَّا اِنَّھُمْ یَطْلُبُوْنَ اِلَیَّ فِیْہِ فَقُلْتُ لَھُمْ أَلِیَ قَتْلُہٗ قَالُوْا نَعَمْ وَسَبُّوْا عُبَیْدَ اللّٰہِ فَقُلْتُ اَفَلَکُمْ اَنْ تَمْنَعُوْہُ قَالُوْا لَا وَسَبُّوْہُ فَتَرَکْتُہٗ لِلّٰہِ وَلَھُمْ۔ فَاحْتَمَلُوْنِیْ فَوَاللّٰہِ مَا بَلَغْتُ الْمَنْزِلَ اِلَّا عَلٰی رُءُوْسِ الرِّجَالِ وَاَکُفِّھِمْ۔ (تاریخ الطبری، سنۃ ۲۴ھ)

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ایرانی لوگ مدینہ میں ایک دوسرے سے ملے جُلے رہتے تھے (جیسا کہ قاعدہ ہے کہ دوسرے ملک میں جا کر وطنیت نمایاں ہو جاتی ہے) ایک دن فیروز (قاتلِ عمرؓ خلیفہ ثانی) میرے باپ سے ملا اور اس کے پاس ایک خنجر تھا جو دونوں طرف سے تیز کیا ہوا تھا۔ میرے باپ نے اس خنجر کو پکڑ لیا اور اس سے دریافت کیا کہ اس ملک میں تو اس خنجر سے کیا کام لیتا ہے (یعنی یہ ملک تو امن کا ملک ہے اس میں ایسے ہتھیاروں کی کیا ضرورت ہے؟) اُس نے کہا کہ میں اس سے اونٹ ہنکانے کا کام لیتا ہوں۔ جب وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے اُس وقت

کسی نے ان کو دیکھ لیا اور جب حضرت عمرؓ مارے گئے تو اس نے بیان کیا کہ میں نے خود ہرمزان کو یہ خنجر فیروز کو پکڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اِس پر عبید اللہ (حضرت عمرؓ کے چھوٹے بیٹے) نے جا کر میرے باپ کو قتل کر دیا۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مجھے بلایا اور عبید اللہ کو پکڑ کر میرے حوالے کر دیا اور کہا کہ اے میرے بیٹے! یہ تیرے باپ کا قاتل ہے اور تو ہماری نسبت اس پر زیادہ حق رکھتا ہے پس جا اور اس کو قتل کر دے میں نے اس کو پکڑ لیا اور شہر سے باہر نکلا۔ راستہ میں جو شخص مجھے ملتا میرے ساتھ ہو جاتا لیکن کوئی شخص مقابلہ نہ کرتا۔ وہ مجھ سے صرف اتنی درخواست کرتے تھے کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ پس میں نے سب مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ کیا میرا حق ہے کہ میں اسے قتل کر دوں؟ سب نے جواب دیا کہ ہاں تمہارا حق ہے کہ اسے قتل کر دو اور عبید اللہ کو بھلا بُرا کہنے لگے کہ اس نے ایسا بُرا کام کیا ہے پھر میں نے دریافت کیا کہ کیا تم لوگوں کو حق ہے کہ اسے مجھ سے چھڑا لو انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں اور پھر عبید اللہ کو بُرا بھلا کہا کہ اس نے بلاثبوت اس کے باپ کو قتل کر دیا۔ اس پر میں نے خدا اور ان لوگوں کی خاطر اس کو چھوڑ دیا۔ اور مسلمانوں نے فرطِ مسرت سے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور خدا تعالیٰ کی قسم! میں اپنے گھر تک لوگوں کے سروں اور کندھوں پر پہنچا اور انہوں نے مجھے زمین پر قدم تک نہیں رکھنے دیا۔ اس روایت سے ثابت ہے کہ صحابہؓ کا طریق عمل بھی یہی رہا ہے کہ وہ غیر مسلم کے مسلم قاتل کو سزائے قتل دیتے تھے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خواہ کسی ہتھیار سے کوئی شخص مارا جائے وہ مارا جائے گا۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قاتل کو گرفتار کرنے والی اور اس کو سزا دینے والی حکومت ہی ہے۔ کیونکہ اس روایت سے ظاہر ہے کہ عبید اللہ بن عمرؓ کو گرفتار بھی حضرت عثمانؓ نے کیا اور اس کو قتل کے لئے ہرمزان کے بیٹے کے سپرد بھی انہوں نے ہی کیا۔ نہ ہرمزان کے کسی وارث نے اس پر مقدمہ چلایا اور نہ اس نے گرفتار کیا۔

اس جگہ اس شبہ کا ازالہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قاتل کو سزا دینے کے لئے آیا مقتول کے وارثوں کے سپرد کرنا چاہیے جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے کیا یا خود حکومت کو سزا دینی چاہیے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ معاملہ ایک جزوی معاملہ ہے اس لئے اس کو اسلام نے ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق عمل کرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ قوم اپنے تمدن اور حالات کے مطابق جس طریق کو زیادہ مفید دیکھے اختیار کر سکتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں طریق ہی خاص خاص حالات میں مفید ہوتے ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى۔ آزاد آزاد کے بدلہ میں۔ غلام غلام کے بدلہ میں اور عورت عورت کے بدلہ میں قتل کی جائے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ آزاد مقتول کے بدلہ میں کسی آزاد کو

ہی قتل کیا جائے خواہ اس کا قاتل کوئی غلام ہی ہو۔ اور غلام مقتول کے بدلہ میں کسی غلام کو ہی قتل کیا جائے خواہ اس کا قاتل کوئی حُرّ ہو اور عورت مقتول کے بدلہ میں کسی عورت کو ہی قتل کیا جائے خواہ اس کا قاتل کوئی مرد ہو کیونکہ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى میں حکم پہلے بیان ہو چکا ہے۔ درحقیقت یہ جملہ مستأنفہ ہے اور جملہ مستانفہ اس لئے آتا ہے کہ پہلے جملہ میں جو سوال مقدّر ہو اس کو بیان کئے بغیر نئے جملہ میں جواب دیا جائے اور بغیر عطف کے اس کو بیان کیا جائے (شرح مختصر معانی مؤلفہ ابن یعقوب و بہاؤالدین جلد ۳ مطبوعہ مصر صفحہ ۵۴) اس جگہ بھی یہ جملہ ایک سوال مقدّر کے جواب کے لئے لایا گیا ہے۔ اور اس میں عرب کی ان رسوم کا قلع قمع کیا گیا ہے جو ان میں عام طور پر رائج تھیں۔ اور وہ سوال مقدّر یہ ہے کہ کیا اس حکم سے عرب کا پہلا طریق موقوف ہو جائے گا؟ سو فرمایا کہ ہاں اور اس کی چند مثالیں بیان کر دیں کہ یہ سب موقوف ہیں۔ چنانچہ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى میں ان کی صرف چند مثالیں بیان کی گئی ہیں نہ کہ کل رسوم۔ گویا هَلُمَّ جَرًّا کی طرح کا یہ فقرہ ہے اور مراد یہ ہے کہ اس حکم کے ذریعہ وہ تمام امتیاز مٹا دیئے گئے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ عربوں میں بعض خاندانوں کو بڑا سمجھا جاتا تھا اور بعض کو چھوٹا۔ بعض کو آزاد سمجھا جاتا تھا اور بعض کو غلام اور جب کسی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تو وہ لوگ یہ دیکھا کرتے تھے کہ آیا مجرم غلام ہے یا آزاد۔ اور اگر غلام ہے تو کسی بڑے آدمی کا غلام ہے یا چھوٹے کا۔ مرد ہے یا عورت۔ اعلیٰ خاندان میں سے ہے یا ادنیٰ خاندان میں سے امیر ہے یا غریب۔ اور سزا میں ان تمام امور کو ملحوظ رکھا جاتا اور آزاد مردوں اور عورتوں کو وہ سزائیں نہ دی جاتیں جو غلام مردوں اور عورتوں کو دی جاتی تھیں۔ اسی طرح اعلیٰ خاندانوں کے افراد کو وہ سزائیں نہیں دی جاتی تھیں جو ادنیٰ خاندانوں کے افراد کو دی جاتی تھیں۔ چونکہ اسلام نے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى میں یہ عام حکم دے دیا تھا کہ ہر ایک شخص جو قتل کیا جائے اس کا قاتل لازماً قتل ہو خواہ عورت مرد کو مارے یا مرد عورت کو مارے۔ خواہ آزاد غلام کو مارے یا غلام آزاد کو مارے۔ خواہ ایک شخص کو جماعت مارے اور خواہ کافر معاہد کو مسلمان مارے اس لئے طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آئندہ قصاص کیا پہلے طریق پر بھی جو جاہلیت میں رائج تھا لیا جائے گا یا نہیں۔ سو اس کا جواب دیا کہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ وہ امتیازات اب مٹائے جاتے ہیں۔ اور اس کے لئے صرف تین مثالیں دے دیں۔ باقی مثالیں اس نے چھوڑ دی ہیں۔ کیونکہ عربی زبان میں قاعدہ ہے کہ اگر کسی جگہ تین مثالیں بیان ہوں۔ تو اس جگہ هَلُمَّ جَرًّا ساتھ مل جاتا ہے اور سب مثالیں انہی تین مثالوں میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔ اس جگہ بھی تین مثالوں سے مراد ہر قسم کی مثال ہے اور یہ ہدایت دی گئی ہے کہ خواہ قاتل حُر اور مقتول عبد ہو یا قاتل مرد اور

مقتول عورت ہو یا قاتل عورت اور مقتول مرد ہو جو بھی قتل کرے اسے قتل کی سزا دو چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔آپؐ نے ایک عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کیا(مسلم کتاب القصاص باب ثبوت القصاص فی القتل بالحجر وغیرہ) اسی طرح غلام کے بدلہ میں آزاد کے مارے جانے کا حکم دیا۔ جیسے سمرۃ ابن جندب کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَنۡ قَتَلَ عَبۡدَہٗ قَتَلۡنَاہُ وَمَنۡ جَدَعَہٗ جَدَعۡنَاہُ (ابن ماجه ابواب الدیات باب هل يقتل الحر بالعبد) یعنی جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اسے اس کے بدلہ میں قتل کریں گے اور جو شخص اپنے غلام کے ہاتھ پاؤں کاٹے گا۔ہم اس کے بدلہ میں اس کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔

اس کے بعد فرماتا ہے فَمَنۡ عُفِیَ لَہٗ مِنۡ اَخِیۡہِ شَیۡءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیۡہِ بِاِحۡسَانٍ یعنی اگر کسی مقتول کے وارث کسی مصلحت کے ماتحت قاتل کو اس کے جرم کا کچھ حصہ معاف کردیں تو ان کو اختیار ہے۔

بعض لوگ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ حکومت کو قاتل کے گرفتار کرنے یا اس کو سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں بلکہ یہ تمام اختیار مقتول کے ورثاء کو حاصل ہے۔مگر یہ درست نہیں اس جگہ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول کے ورثاء احسان کے طور پر قاتل کو معاف کر دیں تو حکومت کو اُن کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے اس حقِّ معافی کے سوا رشتہ داروں کا کوئی تعلق قاتل کے ساتھ نہیں۔قاتل کو گرفتار کرنا یا اس پر مقدمہ چلانا حکومت ہی کا کام ہے اور اُسی کے ذمہ ہے جیسا کہ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی میں حکومت کے ذمّہ وار افسران کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ قتل کے واقعات کی چھان بین کریں اور مجرم کو قرار واقعی سزا دلوائیں۔

اسلام نے مقتول کے وارثوں کو عفو کا جو اختیار دیا ہے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بعض دفعہ نقصانات کا بھی احتمال ہوسکتا ہے۔مثلاً ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کو اس کے وارث ہی قتل کروادیں اور پھر قاتل کو معاف کردیں۔ یہ شبہ ایک معقول شبہ ہے۔مگر اسلام نے اس قسم کے خدشات کا بھی ازالہ کر دیا ہے اور گو ایک طرف اس نے دو مخالف خاندانوں میں صلح کرانے کے لئے عفو کی اجازت دی ہے مگر دوسری طرف ایسی ناجائز کارروائیوں کی بھی روک تھام کردی ہے۔ چنانچہ عفو کے ساتھ اس نے اصلاح کی شرط لگادی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ عفو اسی وقت جائز ہوتا ہے جب اس کے نتیجہ میں اصلاح کی اُمید ہو۔اگر عفو باعثِ فساد ہے تو ایسا عفو ہرگز جائز نہیں اور حکومت باوجود وارثوں کے عفو کر دینے کے اپنے طور پر سزا دے سکتی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا ایک واقعہ جو طبری نے لکھا ہے بتاتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے اس احتیاط پر عمل ہوتا چلا آیا ہے وہ واقعہ اس طرح ہے کہ

عدل بن عثمان بیان کرتے ہیں۔ رَاَیْتُ عَلِیًّا عَمَّ خَارِجًا مِنْ ھَمْدَانَ فَرَأَی فِئَتَیْنِ تَقْتُلَانِ فَفَرَّقَ بَیْنَھُمَا ثُمَّ مَضٰی فَسَمِعَ صَوْتًا یَا غَوْثًا بِاللّٰہِ فَخَرَجَ یَحُضُّ نَحْوَہٗ حَتّٰی سَمِعْتُ خَفْقَ نَعْلِہٖ وَھُوَ یَقُوْلُ اَتَاکَ الْغَوْثُ فَاِذَا رَجُلٌ یُلَازِمُ رَجُلًا فَقَالَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِعْتُ مِنْ ھٰذَا ثَوْبًا بِتِسْعَۃِ دَرَاھِمَ وَشَرَطْتُ عَلَیْہِ اَنْ لَّا یُعْطِیَنِیْ مَغْمُوْرًا وَلَا مَقْطُوْعًا وَکَانَ شَرْطُھُمْ یَوْمَئِذٍ فَاَتَیْتُہٗ بِھٰذِہِ الدَّرَاھِمِ لِیُبَدِّلَھَا لِیْ فَاَبٰی فَلَزِمْتُہٗ فَلَطَمَنِیْ فَقَالَ اَبْدِلْ لَہٗ فَقَالَ بَیِّنَتَکَ عَلَی اللَّطْمَۃِ فَاَتَاہُ بِالْبَیِّنَۃِ فَاَقْعَدَہٗ ثُمَّ قَالَ دُوْنَکَ فَاَقِصّ فَقَالَ اِنِّیْ قَدْ عَفَوْتُ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ قَالَ اِنَّمَا اَرَدْتُ اَنْ اَحْتَاطَہٗ فِیْ حَقِّکَ ثُمَّ ضَرَبَ الرَّجُلَ تِسْعَ دُرَّاتٍ وَقَالَ ھٰذَا حَقُّ السُّلْطَانِ۔ (تاریخ الطبری سنة ۴۰ھ) یعنی میں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ ہمدان سے باہر مقیم تھے کہ اسی اثناء میں آپ نے دو گروہوں کو آپس میں لڑتے ہوئے دیکھا اور آپ نے ان میں صلح کرادی لیکن ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ آپ کو کسی شخص کی آواز آئی کہ کوئی خدا کے لئے مدد کو آئے۔ پس آپ تیزی سے اُس آواز کی طرف دوڑے حتّٰی کہ آپ کے جوتوں کی آواز بھی آرہی تھی اور آپ کہتے چلے جاتے تھے کہ ''مدد آ گئی مدد آ گئی۔'' جب آپ اس جگہ کے قریب پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ ایک آدمی دوسرے سے لپٹا ہوا ہے۔ جب اُس نے آپ کو دیکھا تو عرض کیا کہ اے امیر المومنین! میں نے اس شخص کے پاس ایک کپڑا نو درہم کو بیچا تھا اور شرط یہ تھی کہ کوئی روپیہ مشکوک یا کٹا ہوا نہ ہو۔ اور اس نے اس کو منظور کر لیا تھا۔ لیکن آج جو میں اس کو بعض ناقص روپے دینے کے لئے آیا تو اس نے بدلانے سے انکار کر دیا۔ جب میں پیچھے پڑا تو اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ آپ نے مشتری سے کہا کہ اس کو روپے بدل دے پھر دوسرے شخص سے کہا کہ تھپڑ مارنے کا ثبوت پیش کر۔ جب اس نے ثبوت دے دیا تو آپ نے مارنے والے کو بٹھا دیا اور اُسے کہا کہ اس سے بدلہ لے۔ اس نے کہا اے امیر المومنین! میں نے اس کو معاف کر دیا۔ آپ نے فرمایا تُو نے تو اس کو معاف کر دیا مگر میں چاہتا ہوں کہ تیرے حق میں احتیاط سے کام لوں۔ معلوم ہوتا ہے وہ شخص سادہ تھا اور اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھ سکتا تھا اور پھر اس شخص کو سات کوڑے مارے اور فرمایا اس شخص نے تو تجھے معاف کر دیا تھا مگر یہ سزا حکومت کی طرف سے ہے۔

غرض اسلام نے مظلوم کو یا بصورت مقتول اس کے ورثاء کو مجرم کا جرم معاف کر دینے کی تو اجازت دی ہے مگر ساتھ ہی حکومت کو بھی اختیار دیا ہے کہ اگر وہ یہ محسوس کرے کہ مظلوم کم فہم ہے یا ظالم کو معاف کر دینے سے اس کی دلیری اور شوخی اور بھی بڑھ جائے گی یا مقتول کے ولی اپنے نفع نقصان کو یا پبلک کے نفع نقصان کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا خود شریک جرم ہیں تو اس صورت میں باوجود ان کے معاف کر دینے کے خود مجرم کو سزا دے اور اس سے بہتر

اور کونسی تجویز دنیا میں امن اور صلح کے قیام کی ہو سکتی ہے۔ اگر ایک طرف مجرموں کو معاف کر دینے سے خطرات بڑھ جاتے ہیں تو دوسری طرف ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص جرم تو کر لیتا ہے مگر بعد میں وہ خود بھی سخت پشیمان ہوتا ہے اور اس کے رشتہ داروں کی بھی ایسی نازک حالت ہوتی ہے کہ رحم کا تقاضا ہوتا ہے کہ اُسے چھوڑ دیا جائے اور خود جن لوگوں کے خلاف وہ جرم ہوتا ہے وہ بھی یا اُن کے ولی بھی چاہتے ہیں کہ اُس سے درگذر کریں ایسی صورت میں دونوں کے تقاضا کو پورا کرنے کے لئے موجودہ تمدن نے کوئی علاج نہیں رکھا۔ صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے تیرہ سو سال پہلے سے ساتویں صدی کے تاریک تمدن میں ایسے اعلیٰ درجہ کے تمدن کی بنیاد رکھی جس کی نظیر بیسویں صدی کا دانا مدبّر بھی پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے عفو سے کام لینا حاکم کا کام نہیں بلکہ مقتول کے اولیاء اور ورثاء کا کام ہے۔ ہاں اگر حاکم مجاز دیکھے کہ عفو اپنے اندر مضرّات کے بعض پہلو رکھتا ہے تو وہ معافی کو کالعدم بھی قرار دے سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ کے واقعہ سے ثابت کیا جا چکا ہے لیکن اگر وہ شخص جس کا حق ہے قصاص لے معاف نہ کرنا چاہے تو حکام کا فرض ہے کہ وہ لازماً قصاص لیں۔ مِنْ اَخِيْهِ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض اوقات دشمنی اور عداوت اور بُغض سے قتل نہیں ہوتا بلکہ کسی وقتی جوش اور اشتعال کے نتیجہ میں بھی قتل ہو جاتا ہے اس لئے اَخِیْ کہہ کر قاتل کے لئے رحم کی تحریک کر دی کہ آخر وہ تمہارا بھائی ہے۔ اگر اُس سے نادانستہ طور پر غلطی ہو گئی ہے تو تم جانے دو اور اُسے معاف کر دو۔ اِدھر قاتل کو بھی شرمندہ کیا کہ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے۔

شَيْءٌ اس جگہ نکرہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور عربی زبان میں نکرہ تعظیم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور تحقیر کے لئے بھی۔ پس فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ سے مراد کُلّی معافی بھی ہو سکتی ہے اور جزوی بھی یعنی قتل نہ کرنا اور دیّت لے لینا یا دیّت میں بھی کمی کر دینا جائز ہے اور قتل نہ کرنا اور دیت بھی نہ لینا جائز ہے۔ دونوں صورتوں میں سے جو بھی کوئی چاہے اختیار کر سکتا ہے اور اگر بعض ورثاء معاف کر دیں اور بعض نہ کریں تو قاتل کو قتل کی سزا نہیں دی جائے گی جیسے مقتول کے دو بیٹے ہوں ان میں سے ایک معاف کر دے اور دوسرا نہ کرے تو قاتل قتل نہیں ہوگا لیکن اگر حاکم سمجھے کہ چونکہ وارث ہی شرارت سے مروانے والے ہیں۔ اس لیے وہ معاف کرتے ہیں تو حاکم معاف نہیں کرے گا۔ بلکہ انہیں سزا دے گا۔ اور وارثوں کی شرارت ثابت ہو جانے کی وجہ سے ان کی وراثت کا حق بھی زائل ہو جائے گا۔

فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ میں یہ بتایا کہ دیّت لینے والے کو چاہیے کہ مناسب رنگ میں

دیّت وصول کرے۔ یعنی اگر قاتل یکدم ادا نہیں کرسکتا تو وصول کرنے میں سختی نہ کرے بلکہ اُسے کچھ مہلت دے دے اور دیّت دینے والے کو چاہیے کہ وہ ادا کرنے میں سُستی یا شرارت نہ کرے بلکہ تکلیف اٹھا کر بھی دیت ادا کر دے اور کسی ناواجب تاخیر یا شرارت سے کام نہ لے۔

ذٰلِكَ تَخۡفِيۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٌ ۔فرمایا یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے آسانی پیدا کردی گئی ہے اور اس ذریعہ سے اس نے تمہارے لئے اپنی رحمت کا سامان مہیّا کیا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اسے مدِّنظر رکھو اور خدا تعالیٰ کے اس احسان کی قدر کرو۔

فَمَنِ اعۡتَدٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ فرماتا ہے کہ اگر اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے گا اور اِعۡتَدٰی سے کام لے گا تو اس کے لئے دردناک عذاب مقدّر ہے۔ یعنی اگر مقتول کے ورثاء دیّت بھی لے لیں اور موقعہ پا کر دوسرے کو بھی قتل کردیں تو وہ کسی رحم کے مستحق نہیں ہوں گے بلکہ انہیں لازماً سزا دی جائے گی۔ یعنی حکومت دوسرے فریق کو انہیں معاف کرنے کی اجازت بھی نہیں دے گی تاکہ اس قسم کی وحشیانہ حرکات قومی اخلاق کو نہ بگاڑیں اور لوگوں کے اندر قانون کا احترام قائم ہو۔

وَلَكُمۡ فِى الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۰﴾

اور اے عقلمندو! تمہارے لئے (اس) بدلہ لینے میں زندگی (کا سامان) ہے (اور یہ حکم اس لئے ہے) تاکہ تم بچ جاؤ۔

حلّ لُغات۔ اَلۡاَلۡبَابُ جمع ہے۔ اس کا مفرد لُبٌّ ہے اور لُبٌّ کے معنے مغز کے ہیں۔ لیکن مراد عقل ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اے عقلمندو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے اسے کبھی نہ چھوڑنا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے والا تو مر گیا اب اگر اس کے قاتل کو قتل کردیا جائے گا تو مقتول تو زندہ نہیں ہوسکتا پھر قصاص میں حیات کس طرح ہوئی؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر قاتل کو قتل نہ کیا جائے تو بالکل ممکن ہے کہ کل وہ کسی دوسرے کو قتل کر دے اور پرسوں کسی اور کو مار ڈالے۔ اس لئے فرمایا کہ قصاص میں زندگی ہے۔ یعنی اگر قاتل سے قصاص نہ لیا جائے گا تو وہ تم میں سے کسی اور کی زندگی کا خاتمہ کردے گا لیکن اگر قاتل کو موت کی سزا دی جائے تو آئندہ قتل کے جرم کم ہو جائیں گے اور اس طرح کئی لوگوں کی جانیں بچ جائیں گی۔

پھر اس رنگ میں بھی قصاص حیات کا موجب ہے کہ جب قاتل کو سزا مل جاتی ہے تو رشتہ داروں کے دلوں میں

سے بُغض اور کینہ نکل جاتا ہے اور مقتول کی عزت قائم ہو جاتی ہے۔ اگر قاتل کو سزا نہ ملے تو رشتہ داروں کے دل میں بغض اور کینہ رہتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے آدمی کو قتل کر کے اس کی ذلّت کی گئی ہے۔ پس قصاص مقتول کی عزّت قائم کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے لیکن اس کے علاوہ میرے نزدیک اس آیت میں موجودہ زمانہ کے متعلق ایک پیشگوئی بھی پائی جاتی ہے۔ عرب تو قصاص کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ یہاں تک کہ اگر باپ مارا جائے تو وہ پوتے سے بھی اس کا بدلہ لے لیتے تھے۔ پس یہ ہدایت صرف ان کو نہیں ہو سکتی بلکہ درحقیقت یہ آئندہ زمانہ کے لئے پیشگوئی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک وقت آنے والا ہے جبکہ قصاص کو اُڑانے کی تلقین کی جائے گی اُس وقت تم مضبوطی سے اس تعلیم پر قائم رہنا جیسے آج کل بعض یوروپین ممالک میں اس قسم کی تحریکات وقتاً فوقتاً اُٹھتی رہتی ہیں کہ موت کی سزا منسوخ ہونی چاہیے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے عقلمندو! ان تحریکات کو کبھی قبول نہ کرنا ورنہ اس کے بہت سے مفاسد ظاہر ہوں گے۔ اور تمہاری جانوں کی کوئی قیمت باقی نہیں رہے گی۔

آخر میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ ہم نے یہ حکم اسی لئے دیا ہے کہ تم قتل سے بچو اور اس زندگی کو پاؤ جو قصاص کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے اگر تم قصاص کو چھوڑ دو گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا تمدن درہم برہم ہو جائے گا۔ پس تم اس بات سے بچو کہ تمہارا تمدن ٹوٹ جائے اور تمہارا انظام درہم برہم ہو جائے اور تمہاری جانوں اور مالوں کی کوئی قیمت باقی نہ رہے۔

پھر اس کے علاوہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے ایک اور معنے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے سمجھائے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ان الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی کی تمہیں اس لئے ضرورت ہے کہ تم اور تقویٰ حاصل کر لو۔ گویا بتایا کہ بے فائدہ جان گنوانا اس لئے قابلِ احتراز ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے اس میں رہنے سے آخرت کا توشہ انسان جمع کر لیتا ہے۔ پس اس کی حفاظت بھی ضروری ہے تا کہ تم تقویٰ حاصل کر سکو۔ غرض ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے وجہ بتا دی کہ مومن باوجود آخرت پر ایمان رکھنے کے زندگی کی کیوں قدر کرتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ

جب تم میں سے کسی پر موت (کا وقت) آجائے تو تم پر بشرطیکہ وہ (یعنی مرنے والا) بہت سا مال چھوڑے۔

اۨلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا

والدین اور قریبی رشتہ داروں کو (امر) معروف کی وصیت کر جانا فرض کیا گیا ہے۔

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٨١﴾

(یہ بات) متقیوں پر واجب ہے۔

حل لغات۔ خَيْرًا مفردات میں لکھا ہے وَقَوْلُهٗ تَعَالٰى اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اَیْ مَالًا وَقَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ لَا يُقَالُ لِلْمَالِ خَيْرٌ حَتّٰى يَكُوْنَ كَثِيْرًا وَمِنْ مَكَانٍ طَيِّبٍ ۔یعنی اس آیت میں خَیْراً سے مراد مال ہے اور بعض علماء کے نزدیک مال کو خَيْرٌ اس وقت کہیں گے جب وہ زیادہ ہو اور نیک ذرائع سے کمایا ہوا ہو۔(مفردات)

تفسیر۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے متعلق مرنے والے کو جو وصیت کرنے کا حکم دیا ہے اس کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسی وصیت ہے جس کی تعلیم دی گئی ہے۔جبکہ شریعت نے خود احکام وراثت کو سورۃ نساء میں تفصیلاً بیان کر دیا ہے اور ان کے نزول کے بعد رشتہ داروں کے نام وصیت کرنا بے معنی بن جاتا ہے؟ سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ وصیت کے احکام چونکہ دوسری آیات میں نازل ہو چکے ہیں اس لئے یہ آیت منسوخ ہے اب اِس پر کسی عمل کی ضرورت نہیں۔مگر ہمارے نزدیک قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔قرآنی آیات کی منسوخی کا عقیدہ محض قلّتِ تدبّر کی بنا پر ظہور میں آیا ہے۔ جب مسلمانوں کو کسی آیت کا مفہوم پوری طرح سمجھ میں نہ آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ وہ منسوخ ہے اور اس طرح کئی کئی سو آیات تک انہوں نے منسوخ قرار دے دیں۔اگر وہ سمجھتے کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف قابلِ عمل ہے تو وہ ہر آیت پر غور کرتے۔اور اگر اسے حل کرنے سے قاصر رہتے تو خدا تعالیٰ کے حضور جھکتے اور اس سے دعائیں کرتے کہ وہ اُن کی مدد کرے اور اپنے کلام کی حقیقت سمجھنے کی انہیں توفیق عطا فرمائے اور اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُن کی رہنمائی کے سامان پیدا فرما دیتا اور انہیں مشکل آیات کا حل نظر آ جاتا مگر انہوں نے بدقسمتی سے یہ آسان رستہ اختیار کر لیا کہ جس آیت کا مطلب سمجھ میں نہ آیا اُسے منسوخ قرار دے دیا۔یہی طریق انہوں نے یہاں بھی اختیار کر لیا ہے مگر اس آیت کے جو معنے ہم کرتے ہیں۔اگر اس کو مدّنظر رکھا جائے تو یہ حکم بڑا ہی پُرحکمت نظر آتا ہے اور اسے منسوخ قرار دینے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔درحقیقت یہاں وصیت کا لفظ صرف عام تاکید کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے والدین اور اقربین کے متعلق تو وصیت کرنے کا حکم دیا ہے مگر اولاد کو ترک کر دیا ہے۔حالانکہ قلبی تعلق کے لحاظ سے اولاد کا ذکر بھی ضرور ہونا چاہیے تھا

۔یہ بات بتاتی ہے کہ یہاں مال کی تقسیم کا مسئلہ بیان نہیں کیا جارہا بلکہ ایک عام تاکید کی جارہی ہے اور اولاد کی بجائے والدین اور اقربین کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اس آیت کا سیاق وسباق بتا رہا ہے کہ یہ حکم جنگ اور اس کے مشابہ دوسرے حالات کے متعلق ہے۔ چنانچہ اس سے چند آیات پہلے وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ میں لڑائی کا ذکر آ چکا ہے۔اسی طرح آگے چل کر وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ میں پھر جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور چونکہ جنگ میں بالعموم نوجوان شامل ہوتے ہیں۔جن کے ہاں یا تو اولاد ہوتی ہی نہیں یا چھوٹی عمر کی ہوتی ہے۔اس لئے والدین اور اقربین کے حق میں وصیت کرنے کا حکم دیا اور اولاد کا ذکر چھوڑ دیا اور یہ ہدایت فرمائی کہ جب کسی شخص کی موت کا وقت قریب آ جائے یا وہ کسی ایسے خطرناک مقام کی طرف جانے لگے جہاں جانے کا نتیجہ عام حالات میں موت ہوا کرتا ہے۔اور پھر اُس کے پاس مال کثیر بھی ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ وصیت کر دے کہ اُس کی جائیداد احکام الٰہیّہ کے مطابق تقسیم کی جائے تا کہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔اور یہ تاکید بجائے اس کے کہ کسی اور کو کی جائے اپنے رشتہ داروں کو کرے۔اور اگر مال کا کوئی حصہ صدقہ کرنا ہو تو اس کا بھی اظہار کر دے۔ میں سمجھتا ہوں اگر مسلمان اِس تعلیم پر عمل کرتے تو وہ رواج جو شرعی تقسیم وراثت کے خلاف اُن میں جاری رہا کبھی جاری نہ ہوتا۔جس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو وہاں تو کسی رواج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔لیکن ایسے ممالک جہاں رواج کا سوال پیدا ہو وہاں اس امر کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ مرنے والا اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں یہ وصیت کر جائے کہ اُن میں معروف کے مطابق جائیداد تقسیم کی جائے ورنہ اُس کا مال رواجی مستحقوں کو مل جائے گا اور اصل مستحقین محروم رہ جائیں گے۔رہا یہ سوال کہ معروف کیا ہے؟ سو ایک تو احکام وراثت معروف ہیں اُن پر عمل کرنے کی تاکید ہونی چاہیے۔دوسرے بعض حقوق ایسے ہیں جو احکامِ وراثت سے باہر ہیں۔اور جن کو قاعدہ میں تو بیان نہیں کیا گیا مگر مذہبی اور اخلاقی طور پر انہیں پسند کیا گیا ہے اور اُن کے لئے شریعت نے 1/3 تک وصیت کر دینے کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔مثلاً اگر وہ چاہے تو کچھ روپیہ غرباء کی بہبودی کے لئے وقف کر دے اور اس کی اپنے رشتہ داروں کو تاکید کر جائے۔

اَلْوَصِیَّۃُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے ورثاء کافر ہوں تو اُن کے لئے حُسنِ سلوک کی وصیت کر جائے۔کیونکہ ایسی صورت میں وصیت کے بغیر کافر والدین یا دوسرے قریبی رشتہ داروں کو کچھ نہیں مل سکتا۔اگر وہ دیکھے کہ انہیں کچھ مال دے دینے سے فائدہ ہوگا تو اُن کے متعلق تاکید کر دے کہ فلاں فلاں شخص کو میرے مال میں سے اس قدر حصّہ ضرور دے دیا جائے اور اگر دیکھے کہ وہ اس روپیہ کو اسلام کے خلاف خرچ کریں

گے تو نہ دے۔ کافر والدین یا اقربین کے لئے ورثہ نہیں رکھا گیا۔ ہاں وصیت کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ اگر وہ اسلام کے خلاف اپنے مال کو استعمال کرنے والے ہوں تو انہیں مال نہ پہنچ سکے اور اگر جائز طور پر مدد کے مستحق ہوں تو اُن کی مدد کی جاسکے۔

اِس آیت کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ مرنے والا اپنے پوتوں اور اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے لئے بھی کچھ وصیت کر جائے تاکہ اُن کی مدد ہو جائے۔ اور شریعت کے کسی حکم کی بھی خلاف ورزی نہ ہو۔ کیونکہ اسلامی قانون کی رُو سے اگر دادا کی زندگی میں اس کا بیٹا فوت ہو جائے تو پوتوں اور پوتیوں کو وراثت سے حصہ نہیں ملتا۔ پس ایسی صورت میں اگر وہ اپنی جائیداد کے 1/3 حصہ میں سے اپنے پوتوں، پوتیوں یا بھائیوں کے بیٹوں کو کچھ روپیہ دینا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔

(۴) جن ممالک میں اپنے اپنے قانون رائج ہیں وہاں دو صورتیں ہیں۔ بعض تو ایسی جگہیں ہیں جہاں مرنے کے وقت کی وصیت کو ہی معتبر سمجھا جاتا ہے۔ جیسے روس کا ملک ہے اور بعض جگہیں ایسی ہیں جہاں مرنے والے کی وصیت پر عمل نہیں ہوتا بلکہ حکومت نے جو قانون مقرر کیا ہوا ہو اس کے مطابق ورثہ تقسیم ہوتا ہے۔ اگر ایسے ممالک ہوں جہاں مرنے والے کی وصیت تسلیم کی جاتی ہے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جن ورثاء کو رواج کے مطابق ورثہ نہیں مل سکتا انہیں وصیت کی وجہ سے شریعت کے مطابق حصہ مل جائے گا اور اسلامی تعلیم اُن ممالک میں بھی زندہ ہو جائے گی جن میں گو اسلامی حکومت نہیں مگر وہ مرنے والے کی وصیت پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور جہاں اسلامی قانون کے مطابق ورثہ تقسیم نہ ہو سکتا ہو وہاں خواہ جائز ورثاء کو ورثہ نہ مل سکے پھر بھی اس کے نتیجہ میں مسلمان اس گناہ سے بچ جائیں گے جو اس حکم کی خلاف ورزی کے ساتھ وابستہ ہے اور صرف وصیت تبدیل کرنے والے گنہگار قرار پائیں گے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس وصیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی وارث کو جس کا شریعت نے حصّہ مقرر کر دیا ہے اس کے حق سے زیادہ دے دے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بڑی سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے اِنَّ اللّٰہَ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ وَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ (ترمذی ابواب الوصایا باب ما جاء لا وصیة لوارث) اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کا حق مقرر کر دیا ہے۔ اس لئے کسی وارث کے لئے جس کا اللہ تعالیٰ نے حصہ مقرر کر دیا ہے۔ وصیت نہیں ہو سکتی۔ پس یہ آیت نہ منسوخ ہے نہ بلا ضرورت۔ بہت دفعہ مرنے کے بعد ورثاء میں تقسیم مال پر جھگڑا ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ غیر رشتہ دار بھی کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں اتنا روپیہ دینے کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی کہ مرنے والے کو وصیت کر دینی چاہیے تاکہ کوئی جھگڑا نہ ہو اور یہ سوال نہ اُٹھے کہ

مرنے والے نے علاوہ رشتہ داروں کے اوروں کے حق میں بھی وصیت کی ہے اور یہ وصیت رشتہ داروں کے سامنے ہونی چاہیے۔

اس آیت میں مال کے لئے خیر کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نیک ذرائع سے کمایا ہوا مال ہی درحقیقت مال ہے۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم ہمیشہ جائز طور پر کماؤ اور حلال مال جمع کرنے کی کوشش کرو۔ اگر ناجائز ذرائع اختیار کرو گے تو پھر وہ مال خیر نہیں رہے گا بلکہ شر بن جائے گا۔

اسی طرح اِنۡ تَرَکَ خَیۡرًا میں یہ نصیحت فرمائی کہ انسان اپنا تمام مال آخر پچھلوں کے لئے ہی چھوڑ جاتا ہے اور خود خالی ہاتھ دنیا سے اُٹھ جاتا ہے اور جب حالت یہ ہے تو اسے سوچنا چاہیے کہ وہ کیوں ناجائز مال کمائے جسے دوسرے کھائیں اور وہ خود دوزخ میں جائے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اِنۡ تَرَکَ خَیۡرًا کے الفاظ استعمال فرما کر نصیحت کی ہے کہ ناجائز ذرائع سے کما کر اپنے پچھلوں کے لئے مال نہ چھوڑو بلکہ جائز ذرائع سے کماؤ۔ ورنہ ناجائز ذرائع سے کمایا ہوا مال تو تمہارا ہے ہی نہیں تم نے اُس کی وصیت کیا کرنی ہے۔

فَمَنۡۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ

مگر جو شخص اس (وصیت) کو اس کے سننے کے بعد بدل دے۔ تو اس کا گناہ صرف انہی پر ہوگا جو اسے

يُبَدِّلُوۡنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ؕ ﴿۱۸۲﴾

بدل دیں۔ اللہ یقیناً خوب سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

تفسیر۔ فرمایا۔ اگر کوئی شخص وصیت کرے اور بعد میں کوئی دوسرا شخص اس میں تغیّر و تبدّل کر دے تو اس صورت میں تمام تر گناہ اس شخص کی گردن پر ہے جس نے وصیت میں ترمیم و تنسیخ کی۔ یہ تغیّر دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ لکھانے والا تو کچھ اور لکھائے۔ مگر لکھنے والا شرارت سے کچھ اور لکھ دے۔ یعنی لکھوانے والے کی موجودگی میں ہی اُس کے سامنے تغیّر و تبدّل کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وصیت کرنے والے کی وفات کے بعد اس میں تغیّر و تبدّل کر دے۔ یعنی وصیت میں جو کچھ کہا گیا ہو اس کے مطابق عمل نہ کرے بلکہ اُس کے خلاف چلے۔ اِن دونوں صورتوں میں اس گناہ کا وبال صرف اُسی پر ہوگا جو اسے بدل دے۔ (اِثۡمُهٗ میں سبب مسبّب کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور مراد گناہ نہیں بلکہ گناہ کا وبال ہے) یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اس میں کسی قرآنی حکم کی طرف

اشارہ ہے اور وہ حکم وراثت کا ہی ہے ورنہ اس کا کیا مطلب کہ بدلنے کا گناہ بدلنے والوں پر ہوگا وصیت کرنے والے پر نہیں ہوگا کیونکہ اگر اس وصیت کی تفصیلات شرعی نہیں تو بدلنے والے کو گناہ کیوں ہو؟ اُس کے گناہ گار ہونے کا سوال تبھی ہوسکتا ہے جبکہ کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی ہورہی ہو۔ اور وہ اسی طرح ہوسکتی ہے کہ مرنے والا تو یہ وصیت کر جائے کہ میری جائیداد احکام اسلام کے مطابق تقسیم کی جائے لیکن وارث اس کی وصیت پر عمل نہ کریں۔ ایسی صورت میں وصیت کرنے والا تو گناہ سے بچ جائے گا لیکن وصیت تبدیل کرنے والے وارث گناہ گار قرار پائیں گے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ

پھر جو شخص کسی وصیت کرنے والے سے طرف داری یا گناہ (کے سرزد ہونے) کا خوف کرے اور ان کے درمیان

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۱۸۳ ع

صلح کرادے۔ تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ جَنَفًا جَنَفَ کا مصدر ہے اور جَنَفَ فِي الْوَصِيَّةِ کے معنے ہیں مَالَ وَجَارَ یعنی اُس نے وصیت کرتے ہوئے ناانصافی کی اور عدل کے راستہ سے ہٹ گیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اب بتایا کہ اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ موصی کی وصیّت میں کوئی نقص ہے اور خوف ہو کہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا تو وہ ورثاء کو جمع کر کے اگر ان کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ جب اس نے شریعت کے مطابق اپنی جائیداد تقسیم کرنے کی ہدایت کی ہے تو ورثاء کو نقصان پہنچنے کا احتمال کس طرح ہوسکتا ہے؟ کیونکہ شریعت پر عمل کرنے کے باوجود وصیّت کرنے کی صورت میں بعض نقصانات کا بھی احتمال ہو سکتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص 1/3 حصّہ کی وصیّت کردے اور باقی وارث اتنے ہوں کہ بقیہ مال میں سے ان کو بہت کم حصہ ملتا ہو تو ایسی صورت میں اگر وصیّت کرنے والے اور ان رشتہ داروں کے درمیان جن کو نقصان پہنچنے یا جن کے نظر انداز کئے جانے کا امکان ہو صلح کرادی جائے یا وہ شخص جن کے حق میں وصیّت ہے ان کو باہمی سمجھوتے سے اس بات پر راضی کرلیا جائے کہ باوجود وصیت کے وہ ایک دوسرے کو اس کا حق ادا کردیں گے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں۔ اسے چاہیے کہ وصیت کرنے والے اور اس کے محبوب یا مبغوض ورثاء میں صلح کرادے تاکہ کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وصیت کرتے وقت اگر وصیت کرنے والا کسی فریق کو نقصان پہنچا رہا ہو اور جسے وصیت لکھوائی جا رہی ہو وہ سمجھتا ہو کہ بعض ورثاء سے اُس کی اَن بَن ہے اور اس ناراضگی کی وجہ سے یہ ایسی وصیت کر رہا ہے تو اُسے سمجھا دے۔ اور مرنے والے اور اس کے وارثوں میں صلح کرا دے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں اور اللہ تعالیٰ یقیناً بڑا بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیے کہ اس قسم کی اصلاح اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں بلکہ صرف ایک منفی نیکی ہے جس میں انسان کے گنہگار رہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ الفاظ اس فعل کو صرف ایک منفی نیکی قرار دینے کے لئے استعمال نہیں کئے گئے بلکہ اس لئے استعمال کئے گئے ہیں کہ اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت سے فرمایا تھا کہ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَمَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ یعنی جو شخص وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل دے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور گناہ گار ہوگا۔ پس چونکہ اس سے پہلے وصیت میں تبدیلی کرنا اللہ تعالیٰ نے گناہ کا موجب قرار دیا تھا اس لئے لازماً یہ خطرہ پیدا ہوسکتا تھا کہ بعض محتاط طبیعتیں کہیں اس طرف مائل نہ ہو جائیں کہ وصیت میں غلطی واقع ہونے کے باوجود پھر بھی اس کو تبدیل نہیں کرنا چاہیے تا کہ یہ تبدیلی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب نہ ہو۔ پس اس قسم کے خدشات کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے زیر تفسیر آیت میں بتا دیا کہ اگر واقعہ میں کوئی غلطی واقع ہوگئی ہو تو اس کو دُور کر دینا ہرگز کوئی گناہ کی بات نہیں بلکہ ایک ایسی نیکی ہے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے فضل کا مستحق بنا دے گی۔ چنانچہ آخر میں اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو وصیت کرنے والے کو تسلّی دی کہ اگر وہ اپنی غلطی کی اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دے گا اور دوسری طرف رَحِيْمٌ فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص مداخلت کر کے وصیت کے نقائص کو دُور کروانے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کرے گا اور اُسے اپنے فضلوں کا مورد بنائے گا۔ پس غَفُوْرٌ کا لفظ ان وصیت کرنے والوں کو بشارت دیتا ہے جو اپنی غلطی کی اصلاح کر لیں۔ اور رَحِيْمٌ کا لفظ ان لوگوں کے موردِ انعام ہونے پر دلالت کرتا ہے جو وصیت کی کسی غلطی کو درست کرنے کی کوشش کریں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر (بھی) روزوں کا رکھنا (اسی طرح) فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۟ۙ (۱۸۴)

گیا تھا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تا کہ تم (روحانی اور اخلاقی کمزوریوں سے) بچو۔

حلّ لُغات۔ تَتَّقُوْنَ اِتَّقٰى سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور تَقْوٰی کے معنے ہیں جَعْلُ النَّفْسِ فِيْ وَ قَايَةٍ مِمَّا يُخَافُ۔۔۔ وَفِيْ تَعَارُفِ الشَّرْعِ حِفْظُ النَّفْسِ عَمَّا يُؤْثِمُ (مفردات) یعنی اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے ایک ڈھال کے پیچھے محفوظ کر لیا جن سے خوف محسوس کیا جاتا ہے۔ اور شرعی نقطہ نگاہ سے تقوٰی سے مراد گناہوں سے بچنا ہے۔

اِتَّقٰى وَقٰى سے بابِ اِفتعال کا فعل ماضی ہے وَقٰى کے معنے ہیں بچایا، حفاظت کی۔ اور اِتَّقٰى کے معنے ہیں۔ بچا۔ اپنی حفاظت کی (اقرب) مگر اس لفظ کا استعمال دینی کتب کے محاورہ میں معصیت اور بُری اشیاء سے بچنے کے ہیں اور خالی ڈر کے معنوں میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ وَقَايَةٌ کے معنی ڈھال یا اس ذریعہ کے ہیں جس سے انسان اپنے بچاؤ کا سامان کرتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اتقاء جب اللہ تعالیٰ کے لئے آئے تو انہی معنوں میں آتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنی نجات کے لئے بطور ڈھال بنا لیا۔

قرآن کریم میں تقویٰ کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کے بارہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے کسی نے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ کانٹوں والی جگہ پر سے گزرو تو کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا یا اس سے پہلو بچا کر چلا جاتا ہوں یا اس سے پیچھے رہ جاتا ہوں یا آگے نکل جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بس اسی کا نام تقویٰ ہے یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے مقام پر کھڑا نہ ہو اور ہر طرح اس جگہ سے بچنے کی کوشش کرے ایک شاعر (ابنُ المُعتز) نے ان معنوں کو لطیف اشعار میں نظم کر دیا ہے وہ کہتے ہیں۔

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَ كَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى

وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى

لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

(ابن کثیر)

یعنی گناہوں کو چھوڑ دے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے یہ تقویٰ ہے اور تو اُس طریق کو اختیار کر جو کانٹوں والی زمین پر چلنے والا اختیار کرتا ہے یعنی وہ کانٹوں سے خوب بچتا ہے اور تو چھوٹے گناہ کو حقیر نہ سمجھ کیونکہ پہاڑ کنکروں سے ہی بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔اے مومنو! تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزے رکھنے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح پہلی امتوں پر روزے رکھنے فرض کئے گئے تھے۔

دنیا میں بعض تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں جو منفرد ہوتی ہیں۔اکیلے انسان پر آتی ہیں اور وہ ان سے گھبراتا ہے۔شکوہ کرتا ہے کہ میں ان تکالیف کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔لیکن بعض تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں جن میں سارے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ان تکالیف پر جب کوئی انسان گھبراتا یا شکوہ کا اظہار کرتا ہے تو لوگ اُسے یہ کہہ کر تسلّی دیا کرتے ہیں کہ میاں یہ دن سب پر آتے ہیں اور کوئی شخص یہ امید نہیں کرسکتا کہ وہ ان تکلیفوں سے بچ جائے۔ مثلاً موت ہے موت ہر انسان پر آتی ہے۔دنیا میں کوئی احمق سے احمق انسان بھی ایسا نہیں مل سکتا جو کہے کہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ مجھ پر موت نہ آئے۔موت اس پر ضرور آئے گی چاہے جلدی آجائے یا دیر میں۔پس كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کہہ کر خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ روزے ایسی نیکی، ثواب اور قربانی ہیں جن میں سارے ہی ادیان شریک ہیں اور انہوں نے خدا تعالیٰ کے اس حکم کو پورا کیا ہے۔پھر کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ جس کے حصول کے لئے ساری قومیں کوشش کرتی رہی ہیں تم اس سے بچنے کی کوشش کرو! اگر یہ کوئی نیا حکم ہوتا اگر روزے صرف تم پر ہی فرض ہوتے تو تم دوسرے لوگوں سے کہہ سکتے تھے کہ تم اسے کیا جانو! تم نے تو اس کا مزہ ہی نہیں چکھا۔لیکن وہ لوگ جو اس دروازہ میں سے گذر چکے ہیں۔اور جو اس بوجھ کو اٹھا چکے ہیں انہیں تم کیا جواب دو گے؟ لازماً مسلمانوں پر حجت اُنہی احکام میں ہوسکتی ہے جو پہلی قوموں کو بھی دیئے گئے اور انہوں نے ان احکام کو پورا کیا۔پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔اے مسلمانو! تم ہوشیار ہو جاؤ ہم تم پر روزے فرض کرتے ہیں۔اور ساتھ ہی تمہیں بتا دیتے ہیں کہ روزے پہلی قوموں پر بھی فرض کئے گئے تھے۔اور انہوں نے اس حکم کو اپنی طاقت کے مطابق پورا کیا تھا اگر تم اس حکم کو پورا کرنے میں سستی دکھاؤ گے تو وہ قومیں تم پر اعتراض کریں گی اور کہیں گی کہ ہمیں بھی خدا تعالیٰ نے روزوں کا حکم دیا تھا اور ہم نے اُسے پورا کیا اب تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں تو تم اس حکم کو صحیح طور پر ادا نہیں کر رہے۔غرض مسلمانوں کی غیرت اور ہمت بڑھانے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ روزے صرف تم پر ہی فرض نہیں کئے گئے بلکہ پہلی قوموں پر بھی فرض کئے گئے تھے۔اور ان قوموں نے اپنی طاقت

کے مطابق اس حکم کو پورا کیا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روزوں کی شکل میں اختلاف تھا اور وہ اختلاف آج تک نظر آتا ہے۔ کہیں اس قسم کے روزے ہوا کرتے تھے جنہیں وصال کہتے ہیں کہ درمیان میں سحری نہ کھانا۔ اس قسم کے روزوں میں صرف شام کے وقت روزہ کشائی کی جاتی اور دوسری سحری نہ کھا کر متواتر آٹھ پہر روزہ رکھا جاتا۔

کہیں ایسے روزے ہوتے کہ روزہ کشائی بھی نہ ہوتی اور تین تین چار چار پانچ پانچ دن متواتر روزہ رکھا جاتا۔ ایسے روزے بھی پائے جاتے ہیں جن میں لوگوں کو ہلکی غذا کھانے کی اجازت دی گئی ہے مگر ٹھوس غذاؤں سے منع کیا گیا ہے جیسے ہندوؤں یا عیسائیوں میں روزے ہوتے ہیں۔

ہندوؤں کے روزوں کے متعلق تو عام طور پر مشہور ہے کہ ان کا روزہ یہ ہوتا ہے کہ آگ کی پکی ہوئی چیز نہیں کھانی۔ اس کے علاوہ اگر وہ کئی سیر آم، کیلے، اور نارنگیاں وغیرہ کھا جائیں تو ان کے روزہ میں فرق نہیں آتا۔ روٹی اور سالن کو چھوڑ کر باقی جو چیز چاہیں کھالیں۔

پھر اس سے بھی آسان روزے رومن کیتھولک عیسائیوں میں پائے جاتے ہیں۔ آخر انہوں نے بھی کسی مذہبی روایت کی بنا پر ہی یہ روزے رکھنے شروع کئے ہوں گے یا کسی حواری سے کوئی بات پہنچی ہوگی۔ اُن کا روزہ یہ ہوتا ہے کہ گوشت نہیں کھانا۔ اگر وہ آلو اُبال کر یا کدو کا بھرتہ بنا کر اس کے ساتھ روٹی کھالیں تو ان کا روزہ نہیں ٹوٹتا البتہ اگر گوشت کی بوٹی ان کے معدہ میں چلی جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Fasting) پس روزوں کے متعلق بھی مختلف اقوام میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اور اپنے اپنے زمانہ میں ان احکام میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں بھی پوشیدہ ہوں گی۔ مثلاً جو قومیں کثرت سے گوشت کھانے والی ہوں وہ ان اخلاق سے رفتہ رفتہ محروم ہوجاتی ہیں جو سبزی کے استعمال کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اخلاقی اصلاح کے لئے اور انہیں یہ بتانے کے لئے کہ سبزی بھی غذا میں ضروری ہوتی ہے اگر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے دیا ہو کہ ہفتہ میں کم از کم ایک دن تم پر ایسا آنا چاہیے جب تم گوشت نہ کھاؤ۔ تو یہ نہایت پُر حکمت روزہ ہوجاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نے ہماری غذا کے متعلق یہ ایک عام حکم دے دیا ہے کہ گوشت بھی کھاؤ اور سبزیاں بھی کھاؤ۔ آگ پر پکی ہوئی چیزیں بھی استعمال کرو اور جنہیں آگ نے نہ چُھوا ہو وہ بھی استعمال کرلو۔ غرض ہماری غذا میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی احتیاطیں جمع کر دی ہیں۔ لیکن پہلی قوموں کے لئے ممکن ہے اس قسم کی احتیاطیں ناقابلِ برداشت پابندیاں ہوں اور ان کے اخلاق کی اصلاح کے لئے اس قسم کے روزے تجویز کئے گئے ہوں۔ مثلاً وہ قومیں جو جنگی ہوتی ہیں اور جن کا شکار پر گذارہ

ہوتا ہے وہ ایک عرصہ تک گوشت کھانے کی وجہ سے ایسے اخلاق سے عاری ہو جاتی ہیں جو سبزی کھانے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دے دیا گیا ہو کہ وہ ہفتہ میں ایک دن گوشت کھانا چھوڑ دیں تو یقیناً یہ روزہ ان کے لئے بہت مفید تھا۔ پس پہلی قوموں میں روزے تو تھے مگر شکل وہ نہ تھی جو اسلام میں ہے پس كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں جو مشابہت پہلے لوگوں کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ کمیّت اور کیفیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف فرضیت کے لحاظ سے ہے یعنی كَمَا كُتِبَ سے یہ مراد نہیں کہ وہ ویسے ہی روزے رکھتے تھے جیسے مسلمان رکھتے ہیں۔ یا اُتنے ہی روزے رکھتے تھے جتنے مسلمان رکھتے تھے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان پر بھی روزے فرض تھے اور تم پر بھی فرض کئے گئے ہیں گویا صرف فرضیت میں مشابہت ہے نہ کہ تفصیلات میں۔ چنانچہ انسا ئیکلو پیڈیا برٹینیکا میں ’’روزہ‘‘ کے ماتحت لکھا ہے کہ۔

It would be difficult to name any religious system of any description in which it is wholly unrecognised.

یعنی دنیا کا کوئی با قاعدہ مذہب ایسا نہیں جس میں روزہ کا حکم نہ ملتا ہو۔ بلکہ ہر مذہب میں روزوں کا حکم موجود ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں سب سے پہلے ہم یہودی مذہب کو دیکھتے ہیں۔ تورات میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر گئے تو انہوں نے چالیس دن رات کا روزہ رکھا اور ان ایام میں انہوں نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ چنانچہ لکھا ہے۔

’’سو وہ (یعنی موسیٰ) چالیس دن اور چالیس رات وہیں خداوند کے پاس رہا اور نہ روٹی کھائی نہ پانی پیا۔‘‘ (خروج باب ۳۴ آیت ۲۸)

اسی طرح احبار باب ۱۶ آیت ۲۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو ایک روزہ رکھنا یہود کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل ہمیشہ یہ روزے رکھتے رہے اور انبیاء بنی اسرائیل بھی اس کی تاکید کرتے رہے۔ زبور میں حضرت داؤدؑ فرماتے ہیں۔

’’میں نے تو ان کی بیماری میں جب وہ بیمار تھے ٹاٹ اوڑھا اور روزے رکھ رکھ کر اپنی جان کو دُکھ دیا۔‘‘ (زبور باب ۳۵ آیت ۱۳)

یسعیاہ نبی فرماتے ہیں۔

’’دیکھو تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ جھگڑا رگڑا کرو اور شرارت کے مکے مارو۔ پس اب تم

اس طرح کا روزہ نہیں رکھتے ہو کہ تمہاری آواز عالمِ بالا پر سُنی جائے۔'' (یسعیاہ باب ۵۸ آیت ۴)

دانی ایل فرماتے ہیں۔

''میں نے خداوند خدا کی طرف رخ کیا اور میں منت اور مناجات کر کے اور روزہ رکھ کر اور ٹاٹ اوڑھ کر اور راکھ پر بیٹھ کر اُس کا طالب ہوا۔'' (دانی ایل باب ۹ آیت ۳)

یوایل نبی فرماتے ہیں۔

''خداوند کا روزِ عظیم نہایت خوفناک ہے۔ کون اس کی برداشت کر سکتا ہے؟ لیکن خداوند فرماتا ہے اب بھی پورے دل سے اور روزہ رکھ کر اور گریہ وزاری و ماتم کرتے ہوئے میری طرف رجوع لاؤ اور اپنے کپڑوں کو نہیں بلکہ دلوں کو چاک کر کے خداوند اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو کیونکہ وہ رحیم و مہربان قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے باز رہتا ہے۔''

(یوایل باب ۲ آیت ۱۱ تا ۱۳)

یہودیت کے بعد عیسائیت کو دیکھا جائے تو اس میں بھی روزوں کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ کے متعلق انجیل بتاتی ہے کہ انہوں نے چالیس دن اور چالیس رات کا روزہ رکھا۔ متی میں لکھا ہے۔

''اور چالیس دن اور چالیس رات فاقہ کر کے آخر کو اُسے بھوک لگی''

(متی باب ۴ آیت ۲)

اسی طرح حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو ہدایت دی کہ۔

''جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اُداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ ان کو روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔'' (متی باب ۶ آیت ۱۶ تا ۱۸)

اِسی طرح ایک دفعہ جب حواری ایک بدروح کو نہ نکال سکے تو

''اُس کے شاگردوں نے تنہائی میں اس سے پوچھا کہ ہم اسے کیوں نہ نکال سکے تو اس نے ان سے کہا کہ یہ قسم دعا اور روزہ کے سوا کسی اور طرح نہیں نکل سکتی۔''

(مرقس باب ۹ آیت ۲۸، ۲۹)

بدرُوح نکالنا حواریوں کی ایک اصطلاح تھی۔ وہ بیماریوں اور مختلف قسم کی خرابیوں کو دیو کہا کرتے تھے اور حضرت مسیحؑ ناصری کے پاس آ کر درخواست کیا کرتے تھے کہ یہ دیو نکال دیں۔ ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یہ بیماریاں یا خاص قسم کی دماغی خرابیاں دُور کر دی جائیں۔ اس قسم کے بعض بیمار تھے جن کا حضرت مسیحؑ ناصری نے علاج کیا اور وہ اچھے ہو گئے۔ اور جب ایک موقعہ پر حواری ایک بدرُوح کو نہ نکال سکے تو آپ نے فرمایا۔ کہ یہ دیو روزوں اور دعاؤں کے بغیر نہیں نکلتے۔ یعنی کمالاتِ رُوحانیہ کا حصول روزوں اور دُعاؤں کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہی مسیحؑ ناصری جنہوں نے یہ کہا تھا کہ بڑی بڑی بیماریاں روزوں اور دعاؤں کے بغیر نہیں نکل سکتیں۔ انہی کی اُمّت آج روزوں سے اتنی بے خبر ہے اور وہ اتنا کھاتے ہیں کہ شاید ایشیائی ہفتہ بھر میں بھی اتنا نہیں کھاتے جتنا وہ ایک دن میں کھا جاتے ہیں۔ پس انہوں نے روزہ کیا رکھنا ہے وہ تو روزوں کے قریب بھی نہیں جاتے۔ سال بھر میں صرف تین دن ایسے ہوتے ہیں جن میں وہ روزہ رکھتے ہیں لیکن ہندوؤں کی طرح جیسے وہ روزہ میں صرف چولھے کی پکی ہوئی چیز نہیں کھاتے۔ مثلاً وہ پھلکا نہیں کھائیں گے لیکن دودھ دو دو سیر پی جائیں گے۔ عیسائی بھی صرف چند چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں باقی سب کچھ کھاتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ روزے ہو گئے۔ حالانکہ حضرت مسیحؑ یہودیوں میں سے تھے اور یہودیوں میں روزہ بڑا اکمل ہوتا ہے اور پھر حضرت مسیحؑ خود مانتے ہیں کہ کئی قسم کے دیو یعنی روحانی یا جسمانی بیماریاں ایسی ہیں جو روزہ رکھنے والے کی دعا سے دُور ہوتی ہیں اس کے بغیر نہیں ہوتیں۔

یہودیت اور عیسائیت کے بعد ہندو مذہب کو دیکھا جائے تو ان میں بھی کئی قسم کے برت پائے جاتے ہیں اور ہر قسم کے برت کے متعلق الگ الگ شرائط اور قیود ہیں جن کا تفصیلی ذکر ان کی کتاب ''دھرم سندھو'' میں پایا جاتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں بھی ہندو اور جین مت کے روزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور زرتشتی مذہب کے متعلق بھی لکھا ہے کہ زرتشت نے اپنے پیروؤں کو روزے رکھنے کی تلقین کی تھی۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Fasting)

غرض روزہ روحانی ترقی کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمام مذاہب میں مشترک طور پر نظر آتا ہے اور تمام اُمتیں روزوں سے برکتیں حاصل کرتی رہی ہیں بلکہ آجکل تو ایک نئی قسم کا روزہ نکل آیا ہے کہ اگر کسی سے جھگڑا ہوا تو کھانا پینا چھوڑ دیا۔ گاندھی جی نے انگریز کے مقابلہ میں اس قسم کے کئی مرن برت رکھے تھے۔ بہرحال مذاہب کی ایک لمبی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے جس کی اہمیت مذہبی دنیا میں ہمیشہ تسلیم کی جاتی رہی ہے مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جس صورت اور جس شکل میں اسلام نے اس کو پیش

کیا ہے وہ باقی مذاہب سے نرالی ہے۔ اسلام میں روزوں کی یہ صورت ہے کہ ہر بالغ عاقل کو برابر ایک مہینہ کے روزے رکھنے کا حکم ہے سوائے اس صورت کے کہ کوئی شخص بیمار ہو یا اُسے بیماری کا یقین ہو یا سفر پر ہو یا بالکل بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہو۔ ایسے لوگ جو بیمار ہوں یا سفر پر ہوں ان کے لئے حکم ہے کہ وہ دوسرے اوقات میں روزہ رکھیں۔ اور جو بالکل معذور ہو گئے ہوں ان کے لئے کوئی روزہ نہیں۔

روزہ کی صورت یہ ہے کہ پَو پھٹنے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک انسان کوئی چیز نہ کھائے نہ پیئے نہ کم نہ زیادہ اور نہ مخصوص تعلقات کی طرف توجہ کرے۔ پَو پھٹنے سے پہلے وہ کھانا کھالے تا کہ اس کے جسم پر غیر معمولی بوجھ نہ پڑے اور غروبِ آفتاب پر روزہ افطار کر دے۔ صرف شام کو ہی کھانا کھا کر متواتر روزے رکھنا ہماری شریعت نے ناپسند کیا ہے۔

اس جگہ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے متعلق ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف کسی قوم میں کسی رواج کا پایا جانا یا پہلوں میں کسی دستور کا ہونا اس امر کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ آئندہ نسلیں بھی ضرور اس کا لحاظ رکھیں۔ بیسیوں باتیں ایسی ہیں جو پہلے لوگوں میں موجود تھیں لیکن دراصل وہ غلط تھیں۔ اور بیسیوں باتیں ایسی ہیں جو آج لوگوں میں پائی جاتی ہیں حالانکہ وہ بھی غلط ہیں۔ پس محض اس وجہ سے کہ پہلی قومیں کوئی عبادت کرتی رہی ہیں یہ نتیجہ نکالنا کہ آئندہ بھی وہ کی جائے صحیح نہیں۔ قرآن کریم نے اس اعتراض کے وزن کو قبول کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلی اُمّتوں میں روزہ کا وجود اس کی فضیلت کی کوئی دلیل ہے بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ تم پر یہ کوئی زائد بوجھ نہیں ڈالا گیا بلکہ پہلوں پر بھی یہ بوجھ ڈالا گیا تھا۔ پس یہ روزوں کی فضیلت کی دلیل نہیں بلکہ روزوں کی اہمیت کی دلیل ہے۔ روزوں کی فضیلت اور اس کے فوائد پر لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ روزے تم پر اس لئے فرض کئے گئے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تا کہ تم بچ جاؤ۔ اس کے کئی معنے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک معنیٰ تو یہی ہیں کہ ہم نے تم پر اس لئے روزے فرض کئے ہیں تا کہ تم ان قوموں کے اعتراضوں سے بچ جاؤ جو روزے رکھتی رہی ہیں۔ جو بھوک اور پیاس کی تکلیف برداشت کرتی رہی ہیں۔ جو موسم کی شدت کو برداشت کر کے خدا تعالیٰ کو خوش کرتی رہی ہیں۔ اگر تم روزے نہیں رکھو گے تو وہ کہیں گی تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم باقی قوموں سے روحانیت میں بڑھ کر ہیں لیکن وہ تقویٰ تم میں نہیں جو دوسری قوموں میں پایا جاتا تھا۔ غرض اگر اسلام میں روزے نہ ہوتے تو باقی مسلمان دوسری قوموں کے سامنے ہدفِ ملامت بنے رہتے۔ عیسائی کہتے یہ بھی کوئی مذہب ہے اس میں روزے تو ہیں ہی نہیں جن سے قلوب کی صفائی ہوتی ہے جن کے ساتھ روحانی ساکھ بیٹھتی ہے جن کے ذریعہ انسان بدی سے بچتا ہے۔

یہودی کہتے کہ ہم نے سینکڑوں سال روزے رکھے لیکن مسلمانوں میں روزے نہیں۔ اسی طرح زرتشتی ہندو اور دوسری سب قومیں کہتیں۔ اسلام بھی کوئی مذہب ہے اس میں روزے نہیں۔ ہم روزے رکھتے ہیں اور اس طرح خدا تعالیٰ کو خوش کرتے ہیں۔ غرض ساری دنیا مسلمانوں کے مقابلہ میں آجاتی اور کہتی مسلمانوں میں روزے کیوں نہیں؟ پس فرمایا۔ اے مسلمانو! ہم تم پر روزے فرض کرتے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تا کہ تم دشمن کے اعتراضات سے بچ جاؤ۔ اگر اسلام میں روزہ نہ ہوتا یا تم روزے نہ رکھتے تو غیر مذاہب والے تم پر جائز طور پر اعتراض کرتے اور تم ان کی نگاہوں میں حقیر ہو جاتے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں دوسرا اشارہ اس امر کی طرف کیا گیا ہے کہ اس ذریعہ سے خدا تعالیٰ روزہ دار کا محافظ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اِتِّقَاء کے معنے ہیں ڈھال بنانا۔ وقایہ بنانا۔ نجات کا ذریعہ بنانا۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ تم پر روزے رکھنے اس لئے فرض کئے گئے ہیں تا کہ تم خدا تعالیٰ کو اپنی ڈھال بنا لو اور ہر شر سے اور ہر خیر کے فقدان سے محفوظ رہو۔ ضعف دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کو کوئی شر پہنچ جائے اور دوسرے یہ کہ کوئی نیکی اس کے ہاتھ سے جاتی رہے۔ جیسے کسی کو کوئی مار بیٹھے تو یہ بھی ایک شر ہے۔ اور یہ بھی شر ہے کہ کسی کے ماں باپ اس سے ناراض ہو جائیں حالانکہ اگر کسی کے والدین ناراض ہو کر اس کے گھر سے نکل جائیں تو بظاہر اس کا کوئی نقصان نظر نہیں آتا بلکہ ان کے کھانے کا خرچ بچ سکتا ہے۔ لیکن ماں باپ کی رضامندی ایک خیر اور برکت ہے اور جب وہ ناراض ہو جائیں تو انسان ایک خیر سے محروم ہو جاتا ہے۔ اِتِّقَاء ان دونوں باتوں پر دلالت کرتا ہے اور متقی وہ ہے جسے ہر قسم کی خیر مل جائے اور وہ ہر قسم کی ذلّت اور شر سے محفوظ رہے۔

اس سے آگے پھر شر کا دائرہ بھی ہر کام کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص گاڑی میں سفر کر رہا ہے تو اس کا شر سے محفوظ رہنا یہی ہے کہ اسے کوئی حادثہ پیش نہ آئے اور وہ بحفاظت منزلِ مقصود پر پہنچ جائے۔ اسی طرح روزے کے سلسلہ میں بھی ایسے ہی خیر و شر مراد ہو سکتے ہیں جن کا روزے سے تعلق ہو۔ روزہ ایک دینی مسئلہ ہے یا بلحاظ صحتِ انسانی دنیوی امور سے بھی کسی حد تک تعلق رکھتا ہے پس لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے یہ معنے ہوئے کہ تا تم دینی اور دنیوی شُرور سے محفوظ رہو۔ دینی خیر و برکت تمہارے ہاتھ سے نہ جاتی رہے یا تمہاری صحت کو نقصان نہ پہنچ جائے کیونکہ بعض دفعہ روزے کئی قسم کے امراض سے نجات دلانے کا بھی موجب ہو جاتے ہیں۔

آجکل کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بڑھاپا یا ضعف آتے ہی اس وجہ سے ہیں کہ انسان کے جسم میں زائد مواد جمع ہو جاتے ہیں اور ان سے بیماری یا موت پیدا ہوتی ہے۔ بعض نادان تو اس خیال میں اس حد تک ترقی کر گئے

ہیں کہ کہتے ہیں کہ جس دن ہم زائد مواد کو فنا کرنے میں کامیاب ہو گئے اس دن موت بھی دنیا سے اُٹھ جائے گی۔ یہ خیال اگرچہ احمقانہ ہے تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تھکان اور کمزوری وغیرہ جسم میں زائد مواد جمع ہونے ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور روزہ اس کے لئے بہت مفید ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ صحت کی حالت میں جب روزے رکھے جائیں تو دورانِ رمضان میں بے شک کچھ کوفت محسوس ہوتی ہے مگر رمضان کے بعد جسم میں ایک نئی قوت اور تروتازگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ فائدہ تو صحتِ جسمانی کے لحاظ سے ہے مگر روحانی لحاظ سے اس کا یہ فائدہ ہے کہ جو لوگ روزے رکھتے ہیں خدا تعالیٰ ان کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی لئے روزوں کے ذکر کے بعد خدا تعالیٰ نے دعاؤں کی قبولیت کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میں اپنے بندوں کے قریب ہوں اور ان کی دعاؤں کو سنتا ہوں پس روزے خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کرنے والی چیز ہیں اور روزے رکھنے والا خدا تعالیٰ کو اپنی ڈھال بنا لیتا ہے جو اسے ہر قسم کے دکھوں اور شرور سے محفوظ رکھتا ہے۔

پھر روزے کے ذریعہ دکھوں سے انسان اس طرح بھی بچتا ہے کہ (۱) جب وہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے لئے تکلیف میں ڈالتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے گناہوں کی سزا سے اُسے بچا لیتا ہے۔ (۲) جب وہ فاقے رہ کر بھوک کی تکلیف محسوس کرتا ہے تو اپنے غریب بھائیوں کی خبر گیری کرتا ہے اور ان کا ہلاکت سے بچنا خود اُسے بھی ہلاکت سے بچا لیتا ہے کیونکہ بعض افرادِ قوم کے بچنے سے آخر ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے دنوں میں بہت کثرت سے صدقہ و خیرات کیا کرتے تھے۔ احادیث میں آتا ہے کہ رمضان کے دنوں میں آپ تیز چلنے والی آندھی کی طرح صدقہ کیا کرتے تھے (بخاری کتاب الصوم باب اجود ما کان النبیؐ یکون فی رمضان) اور درحقیقت یہ قومی ترقی کا ایک بہت بڑا گُر ہے کہ انسان اپنی چیزوں سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ تمام قسم کی تباہیاں اُسی وقت آتی ہیں جب کسی قوم کے افراد میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ان کی چیزیں انہی کی ہیں دوسروں کا ان میں کوئی حق نہیں اور ان سے فائدہ اُٹھانے کا حق اُنہی کو ہے جن کو وہ چیزیں دی گئی ہیں۔ دنیا کے نظام کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ میری چیز دوسرا استعمال کرے اور رمضان اس کی عادت ڈالتا ہے۔ روپیہ ہمارا ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں ہماری ہیں مگر حکم یہ ہے کہ دوسروں کو ان سے فائدہ پہنچاؤ اور کھلاؤ کیونکہ اس سے دنیا کے تمدن کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

پھر روزوں کے ذریعہ انسان ہلاکت سے اس طرح بھی محفوظ رہتا ہے کہ روزے انسان کے اندر مشقت برداشت کرنے کا مادہ پیدا کرتے ہیں اور جو لوگ ہر قسم کی مشقت برداشت کرنے کے عادی ہوں وہ مشکلات کے

آنے پر ہمّت نہیں ہارتے بلکہ دلیری سے ان کا مقابلہ کرتے اور کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

دنیوی گورنمنٹوں میں بھی ایک ریزروفوج ہوتی ہے جو سال میں ایک یا دو مہینے کام کرتی ہے اور جب جنگ کا موقعہ آتا ہے تو چونکہ اس کو مشق کروائی ہوئی ہوتی ہے اس لئے فوراً اسے بلوالیا جاتا ہے۔ چونکہ عام طور پر تمام مسلمان بارہ مہینے روزے نہیں رکھتے اور نہ ہی تہجد پڑھتے ہیں اس لئے رمضان میں خصوصیت کے ساتھ ہدایت فرما دی کہ تمام مسلمان اس ماہ میں روزوں کی مشق کریں جس طرح وہ فوج جو مشق کرتی رہتی ہے دشمن کی فوج سے شکست نہیں کھاتی اسی طرح جس قوم کے لوگ متّقی اور نیک ہوتے ہیں اور جو خدا تعالیٰ کے لئے ہر ایک چیز کو چھوڑنے والے ہوتے ہیں شیطان کی مجال نہیں ہوتی کہ ان کو زک دے سکے یہی وجہ ہے کہ جب تک تمام مسلمان روحانی سپاہی تھے شیطان نے ان پر کوئی حملہ نہیں کیا لیکن جب خال خال رہ گئے تو اس وقت ان پر حملہ کیا گیا اور شیطان نے ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈال کر ان کو تباہ کر دیا۔

پس روزے قوم میں قربانی کی عادت پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ دین کی خدمت کے لئے بالعموم مومنوں کو گھروں سے نکلنا پڑتا ہے۔ اور تبلیغی جہاد میں کھانے پینے کی تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غرباء کو تو ایسی تکالیف برداشت کرنے کی عادت ہوتی ہے مگر امراء کو اس کی عادت نہیں ہوتی۔ پس روزوں کے ذریعہ ان کو بھی بھوک اور پیاس کی برداشت کی مشق کرائی جاتی ہے تا کہ جس دن خدا تعالیٰ کی طرف سے آواز آئے کہ اے مسلمانو! آؤ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو تو وہ سب اکٹھے اُٹھ کھڑے ہوں اور خدا تعالیٰ کی راہ میں بغیر کسی قسم کا بوجھ محسوس کئے اپنے آپ کو پیش کر دیں۔

پس روزوں کا یہ ایک بہت بڑا فائدہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کو نیکی کے لئے مشقّت برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان دنیا میں کئی قسم کے کام کرتا ہے۔ وہ محنت و مشقّت بھی کرتا ہے۔ وہ آوارگی بھی کرتا ہے وہ اِدھر اُدھر بھی پھرتا ہے وہ گپیں بھی ہانکتا ہے۔ بالکل فارغ نہ انسانی دماغ رہتا ہے نہ اس کا جسم۔ کچھ نہ کچھ کام انسان ضرور کرتا رہتا ہے۔ مگر بعض لغو کام ہوتے ہیں بعض مضر اور بعض مفید اور بعض بہت ہی اچھے۔ لیکن رمضان انسان کو ایک ایسے کام کی عادت ڈالتا ہے جس کے نتیجہ میں اسے نیک کاموں میں مشقّت برداشت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے انسانی زندگی کی راحت اور آرام کی چیزیں کیا ہوتی ہیں یہی کھانا پینا سونا اور جنسی تعلقات۔ تمدن کا اعلیٰ نمونہ جنسی تعلقات ہیں۔ جن میں دوستوں سے ملنا اور عزیزوں سے تعلقات رکھنا بھی شامل ہے مگر جنسی تعلقات میں سب سے زیادہ قریبی تعلق میاں بیوی کا ہے پس انسانی آرام انہی چند باتوں میں مضمر ہے کہ وہ کھاتا ہے۔

وہ پیتا ہے۔ وہ سوتا ہے۔ اور وہ جنسی تعلقات قائم رکھتا ہے۔ کسی صوفی نے کہا ہے کہ تصوّف کی جان کم بولنا، کم کھانا اور کم سونا ہے اور رمضان اس تصوّف کی ساری جان کا نچوڑ اپنے اندر رکھتا ہے کم سونا آپ ہی اس میں آ جاتا ہے کیونکہ رات کو تہجد کے لئے اُٹھنا پڑتا ہے۔ کم کھانا بھی ظاہر بات ہے کیونکہ سارا دن فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ اور جنسی تعلقات کی کمی بھی ظاہر ہے پھر کم بولنا بھی رمضان میں آ جاتا ہے۔ اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا۔ روزہ یہ نہیں کہ انسان اپنا منہ کھانے پینے سے بند رکھے بلکہ روزہ یہ ہے کہ تُو لغو باتیں بھی نہ کرے۔ (بخاری کتاب الصوم باب من لم یدع قول الزور والعمل بہ فی الصوم)۔ پس روزہ دار کے لئے بیہودہ باتوں سے بچنا لڑائی جھگڑے سے بچنا اور اسی طرح کی اَور لغو باتوں سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح کم بولنا بھی رمضان میں آ گیا۔ گویا کم کھانا۔ کم بولنا۔ کم سونا اور جنسی تعلقات کم کرنا یہ چاروں باتیں رمضان میں آ گئیں اور یہ چاروں چیزیں نہایت ہی اہم ہیں۔ اور انسانی زندگی کا ان سے گہرا تعلق ہے پس جب ایک روزہ دار اِن چاروں آرام و آسائش کے سامانوں میں کمی کرتا ہے تو اس میں مشقّت برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کے ہر دور میں مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا اور کامیابی حاصل کرتا ہے۔

پھر لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں ایک اور فائدہ یہ بتایا کہ روزہ رکھنے والا برائیوں اور بدیوں سے بچ جاتا ہے اور یہ غرض اس طرح پوری ہوتی ہے کہ دنیا سے انقطاع کی وجہ سے انسان کی روحانی نظر تیز ہو جاتی ہے اور وہ ان عیوب کو دیکھ لیتا ہے جو اُسے پہلے نظر نہ آتے تھے۔ اسی طرح گناہوں سے انسان اس طرح بھی بچ جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے روزہ اس چیز کا نام نہیں کہ کوئی شخص اپنا منہ بند رکھے اور سارا دن نہ کچھ کھائے اور نہ پیئے بلکہ روزہ یہ ہے کہ مونہہ کو کھانے پینے سے ہی نہ روکا جائے بلکہ اُسے ہر روحانی نقصان دہ اور ضرر رساں چیز سے بھی بچایا جائے۔ نہ جھوٹ بولا جائے۔ نہ گالیاں دی جائیں۔ نہ غیبت کی جائے۔ نہ جھگڑا کیا جائے۔ اب دیکھو زبان پر قابو رکھنے کا حکم تو ہمیشہ کے لئے ہے لیکن روزہ دار خاص طور پر اپنی زبان پر قابو رکھتا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اگر کوئی شخص ایک مہینہ تک اپنی زبان پر قابو رکھتا ہے تو یہ امر باقی گیارہ مہینوں میں بھی اس کے لئے حفاظت کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور اس طرح روزہ اُسے ہمیشہ کے لئے گناہوں سے بچا لیتا ہے۔

پھر لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں روزوں کا ایک اَور فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے نتیجہ میں تقویٰ پر ثباتِ قدم حاصل ہوتا ہے اور انسان کو روحانیت کے اعلیٰ مدارج حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ روزوں کے نتیجہ میں صرف امراء ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کرتے بلکہ غرباء بھی اپنے اندر ایک نیا روحانی انقلاب محسوس کرتے ہیں۔ اور وہ بھی اللہ تعالیٰ

کے وصال سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔غرباء بیچارے سارا سال تنگی سے گذارہ کرتے ہیں اور بعض دفعہ انہیں کئی کئی فاقے بھی آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے ذریعہ انہیں توجہ دلائی ہے کہ وہ ان فاقوں سے بھی ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔اور خدا تعالیٰ کے لئے فاقوں کا اتنا بڑا ثواب ہے کہ حدیث میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ یعنی ساری نیکیوں کے فوائد اور ثواب الگ الگ ہیں لیکن روزہ کی جزاء خود میری ذات ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے ملنے کے بعد انسان کو اور کیا چاہیے! غرض روزوں کے ذریعہ غرباء کو یہ نکتہ بتایا گیا ہے کہ ان تنگیوں پر بھی اگر وہ بے صبر اور ناشکرے نہ ہوں اور حرف شکایت زبان پر نہ لائیں جیسا کہ بعض نادان کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہمیں خدا تعالیٰ نے کیا دیا ہے کہ نمازیں پڑھیں اور روزے رکھیں تو یہی فاقے ان کے لئے نیکیاں بن جائیں گی۔اور ان کا بدلہ خود خدا تعالیٰ ہو جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے روزوں کو غرباء کے لئے تسکین کا موجب بنایا ہے تاکہ وہ مایوس نہ ہوں اور یہ نہ کہیں کہ ہماری فقر و فاقہ کی زندگی کس کام کی! اللہ تعالیٰ نے روزہ میں انہیں یہ گُر بتایا ہے کہ اگر وہ اس فقر و فاقہ کی زندگی کو خدا تعالیٰ کی رضاء کے مطابق گذاریں تو یہی انہیں خدا تعالیٰ سے ملا سکتی ہے۔ دنیا میں اس قدر لوگ امیر نہیں جتنے غریب ہیں اور تمام دینی سلسلوں کی ابتداء بھی غرباء سے ہی ہوئی ہے اور انتہا بھی غرباء پر ہی ہوئی۔ بلکہ قریباً تمام انبیاء بھی غرباء میں سے ہی ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی بڑے آدمی نہ تھے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی بڑے آدمی نہ تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی کوئی امیر کبیر نہ تھے۔آپ کی جائیداد کی قیمت قادیان کے ترقی کرنے کے باعث بڑھ گئی۔ ورنہ اس کی قیمت خود آپ نے دس ہزار روپیہ لگائی تھی اور اتنی مالیت کی جائیداد سے کونسی بڑی آمد ہو سکتی ہے؟ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام بھی بڑے آدمی نہ تھے۔ اگرچہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ بعد میں بڑا بنا دیتا ہے لیکن یہ سب کچھ بعد میں فضل کے طور پر ہوا۔ ابتداء میں تمام سلسلوں کے بانی غریب ہی ہوئے امراء اور بادشاہ نہیں ہوئے۔ بیشک درمیانی طبقہ کے لوگوں میں سے بھی بعض دفعہ انبیاء ہوتے رہے لیکن بادشاہ صرف چند ایک ہی ہوئے۔ جیسے حضرت داوٗد علیہ السلام یا حضرت سلیمان علیہ السلام۔مگر یہ بھی ایسے نہیں ہیں کہ کسی سلسلہ کے بانی ہوں۔ پھر دنیا کی اسّی فیصدی آبادی غریب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی کثرت کی دلجوئی رمضان کے ذریعہ کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ مت سمجھو کہ فاقہ کش کو خدا تعالیٰ نہیں مل سکتا اگر ایسا ہوتا تو رمضان کے نتیجہ میں کیوں ملتا؟ پس وہ غرباء جو سمجھتے ہیں کہ ان کی عمر رائیگاں گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں رمضان کے ذریعہ بتایا ہے کہ وہ انہی فاقوں میں سے گذر کر اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے فیوض حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ فاقہ میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کو نہ بھولیں اور اس کے متعلق اپنی زبان پر کوئی حرفِ شکایت نہ لائیں۔

اس کے مقابلہ میں روزہ امیر لوگوں کے لئے تقویٰ کے حصول کا ذریعہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب ایک انسان جس کے پاس کھانے پینے کے تمام سامان موجود ہوتے ہیں محض اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے اپنے آپ کو فاقہ میں ڈالتا ہے اور خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے کچھ نہیں کھاتا اور جو حلال چیزیں خدا تعالیٰ نے اُسے دی ہیں انہیں بھی استعمال نہیں کرتا۔ اس کے گھر میں گھی، گوشت، چاول وغیرہ کھانے کی تمام ضروریات موجود ہوتی ہیں مگر وہ خدا تعالیٰ کے لئے انہیں ترک کر دیتا ہے تو اس کے دل میں خود بخود یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب میں نے حلال چیزوں کو بھی خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے چھوڑ دیا ہے تو میں ان چیزوں کی کیوں خواہش کروں جنہیں خدا تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہوا ہے؟ اس طرح اس کے اندر ضبطِ نفس کی قوت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے قدم کو نیکیوں کے میدان میں بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

روزوں کا ایک روحانی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان خدا تعالیٰ سے مشابہت اختیار کر لیتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ نیند سے پاک ہے۔ انسان ایسا تو نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی نیند کو بالکل چھوڑ دے مگر وہ اپنی نیند کے ایک حصہ کو روزوں میں خدا تعالیٰ کے لئے قربان ضرور کرتا ہے۔ سحری کھانے کے لئے اُٹھتا ہے۔ تہجد پڑھتا ہے۔ عورتیں جو روزہ نہ بھی رکھیں وہ سحری کے انتظام کے لئے جاگتی ہیں۔ کچھ وقت دعاؤں میں اور کچھ نماز میں صرف کرنا پڑتا ہے اور اس طرح رات کا بہت کم حصہ سونے کے لئے باقی رہ جاتا ہے اور کام کرنے والوں کے لئے تو گرمی کے موسم میں دو تین گھنٹے ہی نیند کے لئے باقی رہ جاتے ہیں۔ اس طرح انسان کو اللہ تعالیٰ سے ایک مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کھانے پینے سے پاک ہے۔ انسان کھانا پینا بالکل تو نہیں چھوڑ سکتا مگر پھر بھی رمضان میں اللہ تعالیٰ سے وہ ایک قسم کی مشابہت ضرور پیدا کر لیتا ہے پھر جس طرح اللہ تعالیٰ سے خیر ہی خیر ظاہر ہوتا ہے اسی طرح انسان کو بھی روزوں میں خاص طور پر نیکیاں کرنے کا حکم ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جو شخص غیبت، چغلخوری اور بدگوئی وغیرہ بُری باتوں سے پرہیز نہیں کرتا اس کا روزہ نہیں ہوتا۔ گویا مومن بھی کوشش کرتا ہے کہ اس سے خیر ہی خیر ظاہر ہو۔ اور وہ غیبت اور لڑائی جھگڑے سے بچتا رہے۔ اس طرح وہ اس حد تک خدا تعالیٰ سے مشابہت پیدا کر لیتا ہے جس حد تک ہو سکتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر چیز اپنی مثل کی طرف دوڑتی ہے۔ فارسی میں ضرب المثل ہے کہ

''کند ہم جنس با ہم جنس پرواز''

پس روزہ کا ایک روحانی فائدہ یہ ہے کہ انسان کا خدا تعالیٰ سے اعلیٰ درجہ کا اتصال ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ خود اس کا محافظ بن جاتا ہے۔

پھر روزوں کا روحانی رنگ میں ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا الہام انسانی قلب پر نازل ہوتا ہے اور اس کی کشفی نگاہ میں زیادہ جلا اور نور پیدا ہو جاتا ہے۔ درحقیقت اگر غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی عادت تو نہیں مگر اس میں عادت سے ایک مشابہت ضرور پائی جاتی ہے۔ انسان کی طرح اس کی آنکھیں تو نہیں مگر وہ بصیر ضرور ہے اس کے کان نہیں مگر وہ سمیع ضرور ہے اسی طرح گو اس میں کوئی عادت نہیں پائی جاتی مگر اس میں یہ بات ضرور پائی جاتی ہے کہ جب وہ ایک کام کرتا ہے تو اُسے دوہراتا ہے۔ انسان میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو ہاتھ یا پیر ہلانے کی عادت ہوتی ہے اور وہ انہیں بار بار ہلاتے ہیں اور عادت کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ کوئی بات بار بار کی جائے اور یہ بات اللہ تعالیٰ میں بھی ہے کہ جب وہ ایک خاص موقعہ پر اپنا فضل نازل کرتا ہے تو اس موقعہ پر بار بار فضل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت کے ماتحت چونکہ رمضان کے مہینہ میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ اس لئے اگر اس رسولؐ کی اتباع کی جائے جس پر قرآن کریم نازل ہوا تو اللہ تعالیٰ کی عادت سے مشابہت رکھنے والی صفت کے ماتحت ان لوگوں کو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی وجہ سے دنیا سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں اور دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس سے تعلقات نہیں رکھتے۔ کھانے پینے اور سونے میں کمی کرتے ہیں۔ بے ہودہ گوئی وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے الہام سے نوازتا اور ان پر رؤیا صادقہ اور کشوفِ صحیحہ کا دروازہ کھول دیتا ہے اور اسرار غیبیہ سے مطلع کرتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی ایک الہام ہے کہ

پھر بہار آئی خدا کی بات پھر پوری ہوئی

اس میں بھی وہی عادت والی بات بیان کی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ نے ایک دفعہ بہار میں اپنی رحمت کی شان دکھائی تھی اس لئے جب پھر موسم بہار آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کہتی ہے کہ اب کے میرے بندے کیا کہیں گے اس لئے ہم پھر اپنی شان دکھاتے ہیں۔ اور اگر بندے اس سے فائدہ اٹھائیں تو اگلی بہار میں پھر وہی انعام نازل ہوتا ہے۔ غرض کلامِ الٰہی کو اگر درخت تصوّر کر لیا جائے تو جو صفتِ الٰہی عادت کے مشابہ ہے وہ ہر رمضان میں اسے جھنجھوڑتی ہے اور اس سے مومنوں کو تازہ بتازہ پھل حاصل ہوتے ہیں۔

پھر روزوں سے اس رنگ میں بھی روحانیت ترقی کرتی ہے کہ جب انسان خدا تعالیٰ کے لئے کھانا پینا ترک کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے لئے اس کی راہ میں مرنے کو تیار ہے۔ اور جب وہ اپنی بیوی سے مخصوص تعلقات قطع کرتا ہے تو اس بات پر آمادگی کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے لئے اپنی نسل کو بھی قربان کر

دینے کے لئے تیار ہے اور جب وہ روزوں میں ان دونوں اقسام کے نمونے پیش کر دیتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کی لقاء کا مستحق ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ سے تعلق قائم ہونے اور روحانیت کے مضبوط ہو جانے کی وجہ سے وہ شخص ہمیشہ کے لئے گمراہی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

پھر رمضان کے ذریعہ استقلال کی عادت بھی ڈالی جاتی ہے کیونکہ یہ نیکی متواتر ایک عرصہ تک چلتی ہے۔ انسان دن میں کئی کئی مرتبہ کھانے کا عادی ہوتا ہے۔غرباء اور امراء شہری اور دیہاتی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق عام ایام میں کئی دفعہ کھاتے پیتے ہیں مگر رمضان میں تمام کھانے سمٹ سمٹا کر صرف دو بن جاتے ہیں۔اسی طرح جہاں دوسرے ایام میں وہ ساری رات سوئے رہتے ہیں وہاں رمضان کے ایام میں انہیں تہجد اور سحری کے لئے اُٹھنا پڑتا ہے اور دن کو بھی قرآن کریم کی تلاوت میں اپنا کافی وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔غرض رمضان کے ایام میں اپنی عادت کی بہت کچھ قربانی کرنی پڑتی ہے اور یہ قربانی ایک دن نہیں دو دن نہیں بلکہ متواتر ایک مہینہ تک بغیر ناغہ کے کرنی پڑتی ہے۔پس روزوں سے استقلال کا عظیم الشان سبق ملتا ہے۔اور درحقیقت بغیر مستقل قربانیوں کے کوئی شخص خدا تعالیٰ کو نہیں پا سکتا کیونکہ حقیقی محبت جوش دلانے سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ وہ عارضی ہوتی ہے بلکہ حقیقی محبت استقلال سے تعلق رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا کہ آپ کی ایک بیوی نے چھت سے ایک رسّہ اس لئے لٹکا رکھا ہے کہ جب نماز پڑھتے پڑھتے انہیں اونگھ آنے لگے تو اس کا سہارا لے لیں تو آپ نے فرمایا یہ کوئی عبادت نہیں۔عبادت وہی ہے جسے انسان بشاشت سے ادا کر سکے۔اور جس کے نتیجہ میں ایسا ملال پیدا نہ ہو۔جو اس کے دوام اور استقلال کو قطع کرنے کا موجب بن جائے۔

(بخاری کتاب التہجد باب مایکرہ من التشدید فی العبادۃ).

اسی طرح روزوں کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مومنوں کو ایک مہینہ تک اپنے جائز حقوق کو بھی ترک کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔انسان گیارہ مہینے حرام چھوڑنے کی مشق کرتا ہے مگر بارھویں مہینہ میں وہ حرام نہیں بلکہ حلال چھوڑنے کی مشق کرتا ہے۔یعنی روزوں کے علاوہ دوسرے ایام میں ہم یہ نمونہ دکھاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے لئے ہم کس طرح حرام چھوڑ سکتے ہیں۔مگر روزوں کے ایام میں ہم یہ نمونہ دکھاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے لئے کس طرح حلال چھوڑ سکتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حلال چھوڑنے کی عادت پیدا کئے بغیر دنیا میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔دنیا میں اکثر فساد اس لئے نہیں ہوتے کہ لوگ حرام چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ اکثر فساد اس لئے ہوتے ہیں کہ لوگ حلال کو بھی ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔وہ لوگ بہت ہی کم ہیں جو ناجائز

طور پر کسی کا حق دبائیں مگر وہ لوگ دنیا میں بہت زیادہ ہیں جو لڑائی اور جھگڑے کو پسند کرلیں گے مگر اپنا حق چھوڑنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ سینکڑوں پاگل اور نادان دنیا میں ایسے ہیں جو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے دنیا میں عظیم الشان فتنہ وفساد پیدا کردیتے ہیں۔ اور اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ دنیا کا امن برباد ہورہا ہے۔ حالانکہ اگر وہ ذاتی قربانی کریں تو بہت سے جھگڑے اور فساد مٹ سکتے ہیں اور نہایت خوشگوار امن قائم ہوسکتا ہے۔ پس رمضان کا مہینہ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم صرف حرام ہی نہ چھوڑو بلکہ خدا تعالیٰ کے لئے اگر ضرورت پڑ جائے تو حلال یعنی اپنا حق بھی چھوڑ دو۔ تا کہ دنیا میں نیکی قائم ہو اور خدا تعالیٰ کا نام بلند ہو۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی عبادتیں اپنے اندر کئی قسم کے سبق رکھتی ہیں۔ بعض سبق ایسے ہوتے ہیں جو ہر عبادت سکھاتی ہے اور بعض سبق ایسے ہوتے ہیں جو ایک سے زیادہ عبادتوں کی نسبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعض سبق ایسے ہیں جو ساری عبادتوں کی مجموعی حالت سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ عالم میں ہمیں یہ نقشہ نظر آتا ہے کہ اس کا ہر فرد اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا ہے پھر دو افراد مل کر اپنے اندر حقیقت رکھتے ہیں۔ پھر دو سے زیادہ افراد مل کر ایک حقیقت پیدا کرتے ہیں۔ پھر سارا عالم اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا ہے یہی حال عبادتوں کا ہے۔ اور جس طرح قانونِ قدرت میں ایک ترتیب اور ربط موجود ہے اسی طرح عبادتوں میں بھی ربط ہے مگر یہ بات صرف شریعتِ اسلامیہ میں ہی پائی جاتی ہے باقی شرائع میں نہیں۔ ان میں نماز۔ زکوٰۃ اور روزہ کی قسم کی عبادتیں ہیں مگر ان کا آپس میں کوئی ربط نہیں۔ وہ ایسی ہی ہیں جیسے بکھری ہوئی اینٹیں۔ لیکن شریعت اسلامیہ کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا ہر حکم اپنے اندر حقیقت رکھتا ہے پھر سارے کے سارے احکام مل کر اپنے اندر ایک اور حکمت رکھتے ہیں۔ اس کی ایک مثال نماز اور روزہ ہے۔ نماز اپنی ذات میں ایک سبق رکھتی ہے اور روزہ بھی اپنی ذات میں ایک سبق رکھتا ہے مگر پھر نماز اور روزہ مل کر ایک اور سبق رکھتے ہیں۔ اگر نماز نہ ہوتی صرف روزے ہوتے تو یہ سبق رہ جاتا۔ اور اگر روزے نہ ہوتے صرف نماز ہی ہوتی تب بھی یہ سبق رہ جاتا۔ بیشک روزے اپنی ذات میں مفید ہیں اور نماز اپنی ذات میں مفید ہے جس طرح اسلام کی ساری عبادتیں اپنی اپنی ذات میں مفید ہیں لیکن نماز اور روزہ مل کر ایک نیا سبق دیتے ہیں جس کا میں اس موقعہ پر ذکر کررہا ہوں۔

نماز کا اصل مقام طہارت ہے جسے وضو کی حالت کہتے ہیں۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص وضو کرکے نماز کے لئے بیٹھ جاتا ہے وہ نماز ہی کی حالت میں ہوتا ہے (**مسلم کتاب المساجد باب فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ فی جماعۃ و فضل انتظار الصلوٰۃ۔۔۔**)۔ نماز اس حالت کا انتہائی مقام ہے۔ ورنہ اصل نماز

مومن کی وہ قلبی کیفیت ہے جو وضو سے تعلق رکھتی ہے۔اب یہ دیکھنا چاہیے کہ وضو کی کیا حقیقت ہے؟ وضو کے ذریعہ جو فعل ہم کرتے ہیں وہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ کوئی چیز جسم سے خارج نہ ہو خواہ وہ پیشاب پاخانہ کے رنگ میں خارج ہو خواہ مرد عورت کے تعلقات کے ذریعہ سے خارج ہو یا اور ایسے رنگوں سے خارج ہو جن سے طہارت کو نقصان پہنچتا ہے۔غرض وضو کا مدار کسی چیز کے جسم سے نہ نکلنے پر ہے۔اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نماز کی طہارت کا مدار اس امر پر ہے کہ کوئی چیز جسم سے خارج نہ ہو۔لیکن روزہ کی طہارت کا مدار اس امر پر ہے کہ کوئی چیز جسم کے اندر داخل نہ ہو۔ بیشک روزہ میں مرد وعورت کے تعلقات سے بھی روکا گیا ہے مگر یہ اس لئے ہے کہ روزہ کی حالت میں انسان کی کلّی توجہ اور طرف نہ ہو۔ ورنہ روزہ کا اصل مدار کسی چیز کے جسم میں داخل نہ ہونے پر ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ روزہ کا مدار اس امر پر ہے کہ کوئی چیز جسم میں داخل نہ ہو۔ اگر صرف نماز ہی ہوتی اور وضو صرف ظاہری صفائی ہوتا تو کہا جاتا کہ اس سے مراد صرف ہاتھ منہ اور پاؤں کا دھونا ہے۔ اسی طرح اگر روزہ ہوتا اور کوئی چھوٹی موٹی چیز کھالی جاتی تو کہا جاسکتا تھا کہ روزہ سے مراد فاقہ کرانا ہے۔لیکن جسم سے کچھ خارج ہونے سے وضو کا باطل ہو جانا اور کسی چیز کے جسم میں داخل ہونے سے روزہ کا ٹوٹ جانا بتاتا ہے کہ کسی چیز کے خارج ہونے کا نماز سے اور کسی چیز کے اندر داخل ہونے کا روزہ سے تعلق ہے۔اور ان دونوں کو ملا کر یہ لطیف بات نکلتی ہے کہ انسان طہارت میں اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک وہ دو احتیاطیں نہ کرے۔یعنی بعض چیزیں اپنے جسم سے نکلنے نہ دے اور بعض چیزیں داخل نہ ہونے دے۔ اگر ہم ان دو باتوں کا لحاظ رکھ لیں کہ بعض چیزوں کو جسم سے نکلنے نہ دیں اور بعض کو داخل نہ ہونے دیں تو طہارت کامل ہو جاتی ہے۔نماز اور روزہ سے مجموعی طور پر انسان کو یہ گُر سکھایا گیا ہے کہ ہر انسان کو یہ امر مدِّ نظر رکھنا چاہیے کہ بعض چیزوں کے جسم سے نکلنے کی وجہ سے وہ ناپاک ہو جاتا ہے ان کو نکلنے نہ دے اور بعض چیزوں کے جسم میں داخل ہونے کی وجہ سے وہ ناپاک ہو جاتا ہے انہیں داخل نہ ہونے دے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی گندی چیزیں ہیں جن کا نکلنا روحانیت کے لحاظ سے مضر ہوتا ہے۔ دنیا میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ گند کا نکلنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ کیا ایسے گند بھی ہیں جن کا نہ نکلنا اچھا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہمیں قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گند ایسے بھی ہیں جن کا نہ نکلنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کی طبیعت میں غصہ زیادہ ہے۔ اگر کسی موقعہ پر اسے سخت غصہ آ گیا مگر وہ اسے نکلنے نہیں دیتا تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ (اٰل عمران:۱۳۵) نیک اور متقی انسان کو بھی غصہ آ جاتا ہے مگر وہ اسے

روک لیتا ہے۔ جیسے نماز کے وقت اس بات کا لحاظ رکھ لیتا ہے کہ اس وقت ایسی چیزیں ظاہر نہ ہوں جو وضو کو باطل کر دیں۔ بعض کیفیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ روک دینے سے کم نکلتی ہیں اور اگر انہیں نکلنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو بڑھ جاتی ہیں غصہ بھی ایسی ہی کیفیات میں سے ہے۔ ہمارے ہاں محاورہ بھی یہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اب تو آپ نے غصہ نکال لیا ہے اب جانے دو۔ یعنی گالی گلوچ یا مار پیٹ کے ذریعہ سے غصہ کا اظہار کر لیا ہے۔ لیکن اگر وہ اسے دبا لیتا اور روک لیتا تو وہ اس کے لئے نیکی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر کسی کے دل میں کوئی بُرا خیال پیدا ہو مگر وہ اسے روک لے اور اس پر عمل نہ کرے تو یہ اس کے لئے نیکی ہو جاتی ہے (مسلم کتاب الایمان باب اذاھم العبد بحسنة کتبت و اذاھمّ بسیئة لم تکتب) غرض قلب کے بعض ایسے حالات ہوتے ہیں کہ اگر انہیں ظاہر کیا جائے تو طہارت باطل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ان کو دل ہی میں رکھیں تو نیکی بن جاتی ہے۔ یہ سبق نماز سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی چیز جسم میں داخل نہ ہونے دی جائے اس کی مثال جھوٹ استہزاء چغلخوری اور غیبت وغیرہ کی باتیں ہیں۔ ان کا نہ سننا بھی نیکی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی باتیں انسان کو روحانیت سے عاری کر دیتی ہیں۔ پس اخلاقِ فاضلہ مکمل کرنے کے لئے ان دونوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ کہ بعض قسم کے گندوں کو باہر نہ نکلنے دیا جائے اور بعض کو اندر داخل نہ ہونے دیا جائے۔ روزہ ہمارے لئے یہ سبق رکھتا ہے کہ ہم ان تمام ناپاک اور گندی باتوں سے بچیں جن کو اپنے اندر داخل کرنے سے ہماری روحانیت باطل ہو جاتی ہے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے قرب سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس سوال کا جواب کہ روزے صرف رمضان کے مہینہ میں ہی کیوں رکھوائے جاتے ہیں۔ سارے سال پر ان کو کیوں نہ پھیلا دیا گیا یہ ہے کہ جب تک تواتر اور تسلسل نہ ہو صحیح مشق نہیں ہو سکتی۔ ہر مہینہ میں اگر ایک دو دن کا روزہ رکھ دیا جاتا تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک وقت کے کھانے میں تو بعض اوقات سیر وغیرہ کے باعث بھی دیر ہو جاتی ہے یا بعض اوقات اور مصروفیتوں کے باعث بھی کھانا نہیں کھایا جا سکتا۔ مگر کیا اس سے بھوک اور پیاس کو برداشت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے؟ حکومت بھی فوجیوں سے متواتر مشق کراتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر مہینہ میں ایک دن ان کی مشق کے لئے رکھ دے۔ غرض جو کام کبھی کبھی کیا جائے اس سے مشق نہیں ہو سکتی۔ مشق کے لئے مسلسل کام کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پورے ایک ماہ کے روزے مقرر فرما دیئے تاکہ مومنوں کو خدا تعالیٰ کے لئے بھوکا پیاسا رہنے اور رات کو عبادت کے لئے اُٹھنے اور دن کو ذکرِ الٰہی اور تلاوتِ قرآن کرنے کی عادت ہو اور ان کی روحانی صلاحیتیں ترقی کریں۔

غرض رمضان کا مہینہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص برکات اور خاص رحمتیں لے کر آتا ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کے انعام اور احسان کے دروازے ہر وقت ہی کھلے رہتے ہیں اور انسان جب چاہے ان سے حصہ لے سکتا ہے صرف مانگنے کی دیر ہوتی ہے ورنہ اس کی طرف سے دینے میں دیر نہیں لگتی کیونکہ خدا تعالیٰ اپنے بندہ کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ ہاں بندہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بعض دفعہ دوسروں کے دروازہ پر چلا جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر کے بعد ایک عورت کو دیکھا کہ وہ پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ اُسے جو بچہ بھی نظر آتا وہ اُسے اُٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیتی اور پیار کر کے چھوڑ دیتی۔ آخر اسی طرح تلاش کرتے کرتے اُسے اپنا بچہ مل گیا اور وہ اُسے لے کر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اس عورت کو اپنا بچہ ملنے سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اللہ تعالیٰ کو اپنے گمشدہ بندہ کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے (مسلم کتاب التوبۃ باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ و انھا تغلب غضبہ)۔ سو اس رحیم و کریم ہستی سے تعلق پیدا کرنا کوئی مشکل امر نہیں۔ ہر گھڑی رمضان کی گھڑی ہو سکتی ہے اور ہر لمحہ قبولیت دُعا کا لمحہ بن سکتا ہے۔ اگر دیر ہوتی ہے تو بندہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی اس کے احسانات میں سے ہی ہے کہ اس نے رمضان کا ایک مہینہ مقرر کر دیا۔ تا کہ وہ لوگ جو خود نہیں اُٹھ سکتے ان کو ایک نظام کے ماتحت اُٹھنے کی عادت ہو جائے اور ان کی غفلتیں ان کی ہلاکت کا موجب نہ ہوں۔

پس یاد رکھو کہ روزے کوئی مصیبت نہیں ہیں۔ اگر یہ کوئی دکھ کی چیز ہوتی تو انسان کہہ سکتا تھا کہ میں دکھ میں کیوں پڑوں؟ لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے روزے دکھوں سے بچانے اور گناہوں سے محفوظ رکھنے اور اللہ تعالیٰ کی لِقاء حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ اور گو بظاہر یہ ہلاکت کا باعث معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسان فاقہ کرتا ہے۔ جاگتا ہے۔ بے وقت کھانا کھاتا ہے جس سے معدہ خراب ہو جاتا ہے اور پھر ساتھ ہی اس کے یہ احکام بھی ہیں کہ صدقہ و خیرات زیادہ کرو۔ اور غرباء کی پرورش کا خیال رکھو۔ مگر یہی قربانیاں ہیں جو اُسے خدا تعالیٰ کا محبوب بناتی ہیں۔ اور یہی قربانیاں ہیں جو قومی ترقی کا موجب بنتی ہیں۔

اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ

(سو تم روزے رکھو) چند گنتی کے دن۔ اور تم میں سے جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو (اسے) اور دنوں میں تعداد

فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيۡنَ يُطِيۡقُوۡنَهٗ فِدۡيَةٌ

(پوری کرنی) ہوگی۔ اور ان لوگوں پر جو اس کی (یعنی روزہ کی) طاقت نہ رکھتے ہوں ایک مسکین کا کھانا دینا (بطور

طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنْ

فدیہ رمضان کے) واجب ہے۔اور جو شخص پوری فرمانبرداری سے کوئی نیک کام کرے گا تو یہ اس کے لئے بہتر ہوگا۔

تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

اور اگر تم علم رکھتے ہو تو (سمجھ سکتے ہو کہ) تمہارا روزے رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے چند گنتی کے دن ہیں جن میں روزے رکھنا تم پر فرض کیا گیا ہے۔ہاں جو تم میں سے بیمار یا مسافر ہو اس کے لئے اور دنوں میں اس تعداد کا پورا کرنا ضروری ہوگا۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ اور فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کے الفاظ صاف طور پر بتاتے ہیں کہ یہ روزے جن کا حکم دیا جا رہا ہے نفلی نہیں بلکہ واجب ہیں۔اسی لئے فرمایا کہ اگر کوئی بیمار یا مسافر ہو تو اُسے بہر حال بعد میں اس تعداد کو پورا کرنا ہوگا۔وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب رمضان کے دنوں میں مَیں بیمار تھا یا سفر پر گیا ہوا تھا تو اب رمضان کے بعد مَیں کیوں روزے رکھوں۔جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ میں رمضان المبارک کے روزوں کا ذکر نہیں بلکہ صرف عام طور پر روزے رکھنے کا ذکر ہے وہ غلطی پر ہیں۔اگر ان کی یہ بات صحیح ہو تو فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا۔اول تو اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف ایسے ہی روزوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کے لئے شریعت کی طرف سے بعض ایام مقرر ہیں۔دوسرے اَيَّامٍ اُخَرَ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایام کسی خاص مہینہ سے متعلق ہیں۔پس كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ سے عام نفلی روزے مراد لینا کسی طرح بھی درست نہیں ہوسکتا۔

پھر اس بارہ میں اللہ تعالیٰ یہ ہدایت دیتا ہے کہ جو شخص بیمار یا مسافر ہو اُسے بیماری اور سفر کی حالت میں روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔بلکہ اَور دنوں میں اس کمی کو پورا کرنا چاہیے۔میں نے اپنے تجربہ کی بنا پر یہ بات دیکھی ہے کہ رمضان کے بارہ میں مسلمانوں میں افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔کئی تعلیم یافتہ لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ رمضان کی برکات کے قائل ہی نہیں اور بغیر کسی بیماری یا اور عذرِ شرعی کے روزہ کے تارک ہیں۔اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو سارا اسلام روزہ میں ہی محدود سمجھتے ہیں۔اور ہر بیمار، کمزور، بوڑھے، بچے، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت سے بھی یہی امید رکھتے ہیں کہ وہ ضرور روزہ رکھے خواہ بیماری بڑھ جائے یا صحت کو نقصان پہنچ جائے۔یہ دونوں افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔اسلام کا یہ ہرگز منشا نہیں کہ وہ انسان کو اس راستہ سے ہٹا دے جو اس کی کامیابی کا ہے۔

اگر تو شریعت چٹی ہوتی یا جرمانہ ہوتا تو پھر بے شک ہر شخص پر خواہ وہ کوئی بوجھ اُٹھا سکتا یا نہ اٹھا سکتا اس کا اُٹھانا ضروری ہوتا۔ جیسے حکومت کی طرف سے جرمانہ کر دیا جائے تو اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس پر جرمانہ کیا گیا ہے اس میں ادا کرنے کی استطاعت بھی ہے یا نہیں بلکہ جس پر جرمانہ ہوا سے خواہ گھر بار بیچنا پڑے۔ بھوکا رہنا پڑے جرمانہ کی رقم ادا کرنا اس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مگر قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام چٹی نہیں بلکہ وہ انسان کے اپنے فائدہ کے لئے ہیں۔ اور ان پر عمل کرنے سے خود انسان کو ہی آرام میسّر آتا اور اُس کی ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔ جن مذاہب نے شریعت کو چٹی قرار دیا ہے ان کے ماننے والوں کے لئے تو ضروری ہے کہ خواہ کچھ ہو وہ اپنے مذہبی احکام کو ضرور پورا کریں۔ لیکن جس مذہب کے احکام کی غرض محض انسانی فائدہ ہو اس میں نفع ونقصان کا موازنہ ہوتا ہے اور جو صورت زیادہ مفید ہو اسے اختیار کر لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے بعض احکام کے سلسلہ میں بعض شرائط مقرر کر دی ہیں تا کہ اگر وہ شرائط کسی میں پائی جائیں تو وہ اس حکم پر عمل کرے اور اگر نہ پائی جائیں تو نہ کرے۔ یہ شرائط صرف جسمانی عبادت کے لئے ہی نہیں بلکہ مالی عبادات کے لئے بھی ہیں۔ جیسے زکوٰۃ ہے اور وطنی قربانی اور اتّصال واتّحاد کی کوشش کے لئے بھی ہیں۔ جیسے حج ہے اسی طرح اور جتنے مسائل اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اور جتنے احکام فرض ہیں ان سب کے لئے یہ شرط ہے کہ جب انسان کو طاقت ہو انہیں ضرور ادا کرے لیکن جب اس کی طاقت سے بات بڑھ جائے تو وہ معذور ہے اگر حج انسان کے مالدار ہونے اور امن وصحت کی شرط سے مشروط ہے۔ اگر زکوٰۃ کے لئے یہ شرط ہے کہ ایک خاص مقدار میں کسی کے پاس ایسا مال ہو جو اس کی ضروریات سے ایک سال بڑھا رہے۔ اگر نماز کے لئے یہ شرط ہے کہ جو کھڑا نہ ہو سکے بیٹھ کر اور جو بیٹھ نہ سکے لیٹ کر نماز ادا کرے تو رمضان کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ اگر انسان مریض ہو۔ خواہ اسے مرض لاحق ہو چکا ہو یا ایسی حالت میں ہو جس میں روزہ رکھنا اسے یقینی طور پر مریض بنا سکتا ہو۔ جیسے حاملہ ہے یا دودھ پلانے والی عورت ہے یا ایسا بوڑھا شخص ہے جس کے قویٰ میں انحطاط شروع ہو چکا ہے یا اتنا چھوٹا بچہ ہے جس کے قویٰ نشوونما پا رہے ہیں تو اسے روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ مسافر اور بیمار کا روزہ رکھنا ایسا ہی لغو ہے جیسے حائضہ کا روزہ رکھنا۔ کون نہیں جانتا کہ حائضہ کا روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں بلکہ بیوقوفی اور جہالت ہے۔ یہی حال بیمار اور مسافر کا ہے اس کے لئے بھی روزہ رکھنا نیکی نہیں۔ اسی طرح وہ بوڑھا جس کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہوں اور روزہ اسے زندگی کے باقی اشغال سے محروم کر دیتا ہو اس کے لئے بھی روزہ رکھنا نیکی نہیں۔ پھر وہ بچہ جس کے قویٰ نشوونما پا رہے ہیں اور آئندہ پچاس ساٹھ سال کے لئے وہ طاقت کا ذخیرہ اپنے اندر جمع کر رہا ہے اس کے لئے بھی روزہ رکھنا نیکی نہیں ہو سکتا مگر جس میں طاقت ہے اور جو رمضان کا صحیح معنوں میں مخاطب

ہے وہ اگر روزہ نہیں رکھتا تو گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت نے چھوٹی عمر کے بچوں کو روزہ رکھنے سے منع کیا ہے لیکن بلوغت کے قریب انہیں کچھ روزے رکھنے کی مشق ضرور کرانی چاہیے۔ مجھے جہاں تک یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مجھے پہلا روزہ رکھنے کی اجازت بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں دی تھی۔ لیکن بعض بے وقوف چھ سات سال کے بچوں سے روزے رکھواتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس کا ثواب ہوگا۔ یہ ثواب کا کام نہیں بلکہ ظلم ہے۔ کیونکہ یہ عمر نشوونما کی ہوتی ہے۔ ہاں ایک عمر وہ ہوتی ہے کہ بلوغت کے دن قریب ہوتے ہیں اور روزہ فرض ہونے والا ہی ہوتا ہے اس وقت ان کو روزہ کی ضرور مشق کرانی چاہیے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اجازت اور سنت کو اگر دیکھا جائے تو بارہ تیرہ سال کے قریب کچھ کچھ مشق کرانی چاہیے اور ہر سال چند روزے رکھوانے چاہئیں۔ یہاں تک کہ اٹھارہ سال کی عمر ہو جائے جو میرے نزدیک روزہ کی بلوغت کی عمر ہے۔ مجھے پہلے سال صرف ایک روزہ رکھنے کی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اجازت دی تھی۔ اس عمر میں تو صرف شوق ہوتا ہے۔ اس شوق کی وجہ سے بچے زیادہ روزے رکھنا چاہتے ہیں مگر یہ ماں باپ کا کام ہے کہ انہیں روکیں۔ پھر ایک عمر ایسی ہوتی ہے کہ اس میں چاہیے کہ بچوں کو جرأت دلائیں کہ وہ کچھ روزے ضرور رکھیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے رہیں کہ وہ زیادہ نہ رکھیں۔ اور دیکھنے والوں کو بھی اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیے کہ یہ سارے روزے کیوں نہیں رکھتا کیونکہ اگر بچہ اس عمر میں سارے روزے رکھے گا تو آئندہ نہیں رکھ سکے گا۔ اسی طرح بعض بچے خلقی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگ اپنے بچوں کو میرے پاس ملاقات کے لئے لاتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ اس کی عمر پندرہ سال ہے حالانکہ وہ دیکھنے میں سات آٹھ سال کے معلوم ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ایسے بچے روزہ کے لئے شاید اکیس سال کی عمر میں بالغ ہوں۔ اس کے مقابلہ میں ایک مضبوط بچہ غالباً پندرہ سال کی عمر میں ہی اٹھارہ سال کے برابر ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ میرے ان الفاظ ہی کو پکڑ کر بیٹھ جائے کہ روزہ کی بلوغت کی عمر اٹھارہ سال ہے تو نہ وہ مجھ پر ظلم کرے گا اور نہ خدا تعالیٰ پر بلکہ اپنی جان پر آپ ظلم کرے گا۔ اسی طرح اگر کوئی چھوٹی عمر کا بچہ پورے روزے نہ رکھے اور لوگ اس پر طعن کریں تو وہ اپنی جان پر ظلم کریں گے۔

بہرحال ان باتوں میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے جہاں شریعت روکتی ہے وہاں رُک جانا چاہیے اور جہاں حکم دیتی ہے وہاں عمل کرنا چاہیے مگر مسلمان اس وقت اعتدال کو ترک کر بیٹھے ہیں ان میں یا تو وہ لوگ ہیں جو روزہ ہی نہیں رکھتے اور یا وہ لوگ ہیں جو روزہ کے ایسے پابند ہیں کہ بیماری اور سفر میں بھی اسے ضروری سمجھتے ہیں۔

اور بعض تو اس میں اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں سے بھی روزے رکھواتے ہیں اور اگر وہ توڑنا چاہیں تو توڑنے نہیں دیتے۔ ایسے کئی واقعات ہوئے ہیں کہ سات سات آٹھ آٹھ سال کے بچوں نے روزے رکھے تو ماں باپ نے ان کی نگرانی کی کہ وہ روزہ توڑ نہ دیں یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ بے شک روزہ کا ادب واحترام ان کے دلوں میں پیدا کرنا ضروری ہے اور انہیں بتانا چاہیے کہ اگر وہ سارا دن روزہ نہیں رکھ سکتے تو روزہ رکھیں ہی نہیں۔ لیکن یہ کہ اگر وہ رکھ لیں تو پھر توڑیں نہیں خواہ مرنے لگیں نہایت ظالمانہ فعل ہے اور اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔

غرض ایک طرف تو مسلمانوں میں ایسے لوگ ہیں جو روزہ کے بارہ میں اس قدر سختی کرتے ہیں اور دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جو روزوں کی ضرورت ہی کے قائل نہیں بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ اسی خیال کا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں میں نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ ایک شخص ٹرکی یا مصر سے یہاں آیا۔ وہ تقریریں کرتا پھرتا تھا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس زمانہ میں ہوتے تو ضرور روزہ کی شکل بدل دیتے۔ اس لئے ہمیں بھی بدل دینی چاہیے کیونکہ وہ زمانہ اور تھا اور یہ اور ہے۔ اور اس کی صورت وہ یہ پیش کرتا تھا کہ روزہ کی حالت میں روٹی نہ کھائی جائے بلکہ صرف کچھ کیک اور بسکٹ وغیرہ کھا لئے جائیں۔ غرض ایک طبقہ افراط کی طرف چلا گیا ہے تو دوسرا تفریط کی طرف۔ حالانکہ اسلام ایک وسطی مذہب ہے اور وہ جہاں بیمار اور مسافر کو اجازت دیتا ہے کہ وہ بیماری اور سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھیں وہاں ہر بالغ اور باصحت مسلمان پر یہ واجب قرار دیتا ہے کہ وہ رمضان کے روزے رکھے اور ان مبارک ایام کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح وتحمید اور قرآن کریم کی تلاوت اور دعاؤں اور ذکر الٰہی میں بسر کرے تا کہ اُسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو۔

بہرحال روزہ کے بارہ میں شریعت نے نہایت تاکید کی ہے۔ اور جہاں اس کے متعلق حد سے زیادہ تشدّد ناجائز ہے وہاں حد سے زیادہ نرمی بھی ناجائز ہے۔ پس نہ تو اتنی سختی کرنی چاہیے کہ جان تک چلی جائے اور نہ اتنی نرمی اختیار کرنی چاہیے کہ شریعت کے احکام کی ہتک ہو اور ذمہ داری کو بہانوں سے ٹال دیا جائے۔ میں نے دیکھا ہے کئی لوگ محض کمزوری کے بہانہ کی وجہ سے روزے نہیں رکھتے اور بعض تو کہہ دیتے ہیں کہ اگر روزہ رکھا جائے تو پیچش ہو جاتی ہے حالانکہ روزہ چھوڑنے کے لئے یہ کوئی کافی وجہ نہیں کہ پیچش ہو جایا کرتی ہے۔ جب تک پیچش نہ ہو انسان کے لئے روزہ رکھنا ضروری ہے۔ جب پیچش ہو جائے تو پھر بے شک چھوڑ دے۔ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں روزہ رکھنے سے ضعف ہو جاتا ہے مگر یہ بھی کوئی دلیل نہیں۔ صرف اُس ضعف کی وجہ سے روزہ چھوڑنا جائز ہے

جس میں ڈاکٹر روزہ رکھنے سے منع کرے۔ ورنہ یوں تو بعض لوگ ہمیشہ ہی کمزور رہتے ہیں تو کیا وہ کبھی بھی روزہ نہ رکھیں۔ میں اڑھائی تین سال کا تھا جب مجھے کالی کھانسی ہوئی تھی۔ اسی وقت سے میری صحت خراب ہے۔ اگر ایسے ضعف کو بہانہ بنانا جائز ہو تو میرے لئے تو شاید ساری عمر میں ایک روزہ بھی رکھنے کا موقع نہیں تھا۔ ضعف وغیرہ جسے روزہ چھوڑنے کا بہانا بنایا جاتا ہے اسی کی برداشت کی عادت ڈالنے کے لئے تو روزہ رکھایا جاتا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ نماز بدی اور بے حیائی سے روکتی ہے۔ اس پر کوئی شخص کہے کہ میں نماز اس لئے نہیں پڑھتا کہ اس کی وجہ سے بدی کرنے سے رک جاتا ہوں۔ پس روزہ کی تو غرض ہی یہی ہے کہ کمزوری کو برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو ورنہ یوں تو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں اس لئے روزہ نہیں رکھتا کہ مجھے بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے حالانکہ اس قسم کی تکالیف کی برداشت کی عادت پیدا کرنے ہی کے لئے روزہ مقرر کیا گیا ہے۔ جو شخص روزہ رکھے کیا وہ چاہتا ہے کہ فرشتے سارا دن اس کے پیٹ میں کباب ٹھونستے رہیں۔ وہ جب بھی روزہ رکھے گا اسے بھوک اور پیاس ضرور برداشت کرنی پڑے گی اور کچھ ضعف بھی ضرور ہوگا۔ اور اسی کمزوری اور ضعف کو برداشت کرنے کی عادت پیدا کرنے کے لئے روزہ رکھایا جاتا ہے۔ بے شک روزہ کی اور بھی حکمتیں ہیں جیسے ایک حکمت یہ ہے کہ روزہ رکھنے سے غرباء اور فاقہ زدہ لوگوں کی اعانت کی طرف توجہ پیدا ہو جاتی ہے مگر بہر حال روزہ اس لئے نہیں رکھایا جاتا کہ انسان کو کوئی تکلیف ہی نہ ہو اور وہ کوئی ضعف محسوس نہ کرے بلکہ اس لئے رکھایا جاتا ہے کہ اسے ضعف برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو۔ پس ضعف کے خوف سے روزہ چھوڑنا ہرگز جائز نہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی بوڑھا ہو چکا ہو یا ڈاکٹر اس کے ضعف کو بھی بیماری قرار دے چکا ہو۔ ایسی صورت میں بیشک روزہ نہیں رکھنا چاہیے مگر ضعف کے متعلق ظاہری ڈیل ڈول اور صورت سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے۔ بعض لوگ بظاہر موٹے تازے ہوتے ہیں اور چلتے پھرتے بھی ہیں۔ لیکن دراصل وہ بیمار ہوتے ہیں اور ان کے لئے روزہ رکھنا جائز نہیں ہوتا۔ بالخصوص جن لوگوں کو دل کی بیماری ہو۔ ایسے لوگوں کے لئے بھوک پیاس کا برداشت کرنا سخت خطرناک ہوتا ہے پس کمزوری یا ضعف کا فیصلہ بظاہر دیکھنے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں بہت سے ڈاکٹر بھی دیانت داری سے کام نہیں لیتے۔ ذرا کوئی شخص دو چار بار جھک کر سلام کر دے تو جو چاہے ڈاکٹر سے لکھوا لے ظاہر ہے کہ ایسے سرٹیفیکیٹ کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر حقیقی طور پر ڈاکٹر کسی کو مشورہ دے کہ اس کے لئے روزہ رکھنا مضر ہے تو گو وہ بظاہر تندرست بھی نظر آئے اس کے لئے روزہ رکھنا جائز نہیں ہوگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ بیمار اور مسافر کے لئے روزہ جائز نہیں۔

چنانچہ آپؑ نے ایک دفعہ فرمایا۔

''جو شخص مریض اور مسافر ہونے کی حالت میں ماہِ صیام میں روزہ رکھتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے صریح حکم کی نافرمانی کرتا ہے خدا تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ بیمار اور مسافر روزہ نہ رکھے۔ مرض سے صحت پانے اور سفر کے ختم ہونے کے بعد روزے رکھے۔ خدا کے اس حکم پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ نجات فضل سے ہے نہ کہ اپنے اعمال کا زور دکھا کر کوئی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مرض تھوڑی ہو یا بہت اور سفر چھوٹا ہو یا لمبا بلکہ حکم عام ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔ مریض اور مسافر اگر روزہ رکھیں گے تو ان پر حکم عدولی کا فتویٰ لازم آئے گا۔''

(فقہ المسیح صفحہ ۲۱۰ بحوالہ بدر ۱۷؍اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

پھر فرماتا ہے وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسّرین کو بڑی دقّت پیش آئی ہے اور انہوں نے اس کے کئی معنے کئے ہیں۔ یہ دقت زیادہ تر اس وجہ سے پیش آئی ہے کہ يُطِيْقُوْنَهٗ میں جو ہٗ کی ضمیر استعمال ہوئی ہے اس کے مرجع کی تعیین میں اختلاف پایا جاتا ہے بعض نے اس کا مرجع صوم کو قرار دیا ہے اور بعض نے فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کو۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس مشکل کو ''الفوز الکبیر'' میں اس طرح حل کیا ہے کہ يُطِيْقُوْنَهٗ میں ہٗ کی ضمیر فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کی طرف گئی ہے اس پر یہ اعتراض پڑتا تھا کہ یہ اضمار قبل الذکر ہے یعنی ضمیر پہلے آگئی ہے اور مرجع بعد میں ہے۔ حالانکہ مرجع پہلے ہونا چاہیے تھا اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ فدیہ کا مقام چونکہ نحواً مقدم ہے یعنی وہ مبتدا ہے اس لئے اس کی ضمیر اس کے ذکر سے پہلے آسکتی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ پڑتا تھا کہ فِدْيَةٌ مؤنث ہے اور ضمیر مذکر۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ فدیہ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کا قائم مقام ہے اور وہ مذکر ہے۔ اس لئے فدیہ کی طرف بھی مذکر کی ضمیر پھر سکتی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ ان لوگوں پر جو فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہوں ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دینا واجب ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت میں صدقۃ الفطر کی طرف اشارہ ہے جو اسلام میں نماز عید سے پہلے ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ غرباء بھی عید کی خوشی میں شریک ہوسکیں۔

دوسرے معنے اس کے یہ کئے جاتے ہیں کہ مومنوں میں سے جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں وہ روزوں کے ساتھ ساتھ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ بھی دے دیا کریں (قرطبی)۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور احادیث سے چونکہ یہ بات ثابت نہیں کہ روزہ دار فدیہ بھی دے اس لئے یہ معنے تسلیم نہیں کئے جاسکتے۔ اس کے علاوہ

عقلی طور پر یہ معنے اس لئے بھی نا قابلِ قبول ہیں کہ فدیہ تو اس پر ہونا چاہیے جو روزہ نہ رکھ سکے جو شخص با قاعدہ روزے رکھ رہا ہے اس پر فدیہ کیسا؟ ہاں اگر کوئی شخص اس شکریہ میں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس عبادت کے بجالانے کی توفیق بخشی ہے روزہ رکھ کر ایک مسکین کو کھانا بھی دے دیا کرے تو وہ زیادہ ثواب کا مستحق ہے کیونکہ اس نے روزہ بھی رکھا اور ایک مسکین کو کھانا بھی کھلایا۔ مگر بہرحال وہ ایک زائد نیکی ہوگی۔ قرآن کریم کسی کو اس بات کا پابند قرار نہیں دیتا کہ وہ روزہ بھی رکھے اور ایک مسکین کو کھانا بطور فدیہ بھی کھلائے۔

(۳) مفسّرین نے اس آیت کے ایک معنے یہ کئے ہیں کہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے پہلے لَا محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ لَا يُطِيْقُوْنَهٗ۔ اور ہٗ کی ضمیر کا مرجع وہ صوم کو قرار دیتے ہیں (بحر محیط زیر آیت ہذا) یعنی وہ لوگ جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے دیا کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس جگہ لَا اُسی طرح محذوف ہے جس طرح آیت يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء: ۱۷۷) میں تَضِلُّوْا سے پہلے بھی لَا محذوف ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ باتیں اس لئے بیان کرتا ہے تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔ گو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں لَا مقدر نہیں بلکہ ایک مضاف محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے کہ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ مَخَافَةَ اَنْ تَضِلُّوْا یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے لئے یہ باتیں تمہارے گمراہ ہو جانے کے خدشہ کی بناء پر بیان کرتا ہے۔

(۴) بعض نے اس آیت کا یوں حل کیا ہے کہ عربی زبان میں اَطَاقَ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ کسی شخص نے کام تو کیا مگر بہت مشکل اور مصیبت سے۔ (بحر محیط زیر آیت ہذا) گویا جب کوئی شخص اپنے نفس کو انتہائی مشقّت میں ڈالے بغیر کوئی کام سرانجام دینے کی اپنے اندر طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے اَطَاقَ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے وہ لوگ مراد ہیں جو روزہ سے سخت تکلیف اٹھاتے ہیں اور جن کی بدنی طاقت بالکل زائل ہو جاتی ہے بلکہ بعض دفعہ غشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے جیسے بوڑھے یا دل کے مریض یا اعصابی کمزوری کے شکار یا حاملہ اور مرضعہ۔ ایسے لوگ جو بظاہر تو بیمار نظر نہیں آتے لیکن روزہ رکھنے سے بیمار ہو جاتے ہیں ان کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ روزے رکھنے کی بجائے ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ اپنی طرف سے دے دیا کریں۔ ان معنوں کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ علامہ قرطبی نے يُطِيْقُوْنَ کی ایک قراءت يُطَوِّقُوْنَ بھی بیان کی ہے۔ یعنی جو لوگ صرف مشقت سے روزہ نبھا سکتے ہیں۔ اور جن کی صحت روزہ رکھنے سے غیر معمولی طور پر خراب ہو جاتی ہے وہ بیشک روزے نہ رکھیں ہاں ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے دیا کریں۔

میرے نزدیک چونکہ اَطَاقَ بابِ اِفعال میں سے ہے اور بابِ افعال کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ سلب کے معنے دیتا ہے اس لئے وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ لوگ جن کی طاقت کمزور ہوگئی ہے یعنی قریباً ضائع ہوگئی ہے وہ بیشک روزہ نہ رکھیں مگر چونکہ ان کا روزہ نہ رکھنا محض اجتہادی امر ہوگا مرض ظاہر کے نتیجہ میں نہیں ہوگا بلکہ صرف متوقع کمزوری کے نتیجہ میں ہوگا۔ اور اجتہاد میں غلطی بھی ہوسکتی ہے اس لئے ان کو چاہیے کہ اپنی اجتہادی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے اگر ان کو فدیہ دینے کی طاقت ہو تو ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ ان دنوں میں دے دیا کریں تا کہ ان کی غلطی کے امکان کا کفارہ ادا ہوتا رہے۔

(۵) ایک اور معنے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھ پر کھولے ہیں وہ یہ ہیں کہ يُطِيْقُوْنَهٗ میں ہٗ کی ضمیر روزہ کی طرف پھرتی ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی بیماری شدید ہے یا جن کا سفر پُر مشقت ہے وہ تو بہرحال فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کے مطابق دوسرے ایام میں روزے رکھیں گے۔ لیکن وہ لوگ جو کسی معمولی مرض میں مبتلا ہیں یا کسی آسانی سے طے ہونے والے سفر پر نکلے ہیں اگر وہ طاقت رکھتے ہوں تو ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ بھی دے دیا کریں۔ اس وجہ سے کہ ممکن ہے انہوں نے روزہ چھوڑنے میں غلطی کی ہو۔ وہ اپنے آپ کو بیمار سمجھتے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی بیماری ایسی نہ ہو کہ وہ روزہ ترک کرسکیں۔ یا وہ اپنے آپ کو مسافر سمجھتے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا سفر سفر ہی نہ سمجھا گیا ہو۔ پس چونکہ ان کی رائے میں غلطی کا ہر وقت امکان ہے اس لئے ایسے بیماروں اور مسافروں کو چاہیے کہ ان میں سے جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں وہ دوسرے ایام میں فوت شدہ روزوں کو پورا کرنے کے علاوہ ایک مسکین کو کھانا بھی دے دیا کریں۔ تا کہ ان کی اس غلطی کا کفارہ ہوجائے۔ اور اگر يُطِيْقُوْنَهٗ میں ہٗ کی ضمیر کا مرجع فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کو ہی قرار دیا جائے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے تو پھر بجائے اس کے کہ اس حکم کو صدقۃ الفطر پر محمول کیا جائے۔ اس آیت کا فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ سے تعلق ہوگا اور اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اگرچہ مریض اور مسافر کو یہ اجازت ہے کہ وہ اَور دنوں میں روزہ رکھ لیں لیکن ان میں سے وہ لوگ جن کو آسودگی حاصل ہو اور وہ ایک شخص کو کھانا کھلا سکتے ہوں انہیں چاہیے کہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ رمضان دے دیا کریں۔ اگر طاقت نہ ہو تو پھر تو فدیہ رمضان دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر طاقت ہو تو خواہ وہ بیمار ہوں یا مسافر انہیں ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ رمضان دینا چاہیے۔ اگر روک عارضی ہو اور وہ بعد میں دور ہوجائے تو روزہ تو بہرحال رکھنا ہوگا۔ فدیہ دے دینے سے روزہ اپنی ذات میں ساقط نہیں ہوجاتا بلکہ یہ محض اس بات کا فدیہ ہے کہ ان مبارک ایام میں وہ کسی جائز شرعی عذر کی بنا پر باقی

مسلمانوں کے ساتھ مل کر یہ عبادت ادا نہیں کر سکے۔ آگے یہ عذر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک عارضی اور ایک مستقل۔ فدیہ بشرطِ استطاعت ان دونوں حالتوں میں دینا چاہیے۔ پھر جب عذر دور ہو جائے تو روزہ بھی رکھنا چاہیے۔ غرضیکہ خواہ کوئی فدیہ بھی دے دے۔ بہرحال سال دوسال یا تین سال کے بعد جب بھی اس کی صحت اجازت دے اسے پھر روزے رکھنے ہوں گے سوائے اس صورت کے کہ پہلے مرض عارضی تھا اور صحت ہونے کے بعد وہ ارادہ ہی کرتا رہا کہ آج رکھتا ہوں کل رکھتا ہوں کہ اس دوران میں اس کی صحت پھر مستقل طور پر خراب ہو جائے۔ باقی جو بھی کھانا کھلانے کی طاقت رکھتا ہو اگر وہ مریض یا مسافر ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ رمضان میں ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے اور دوسرے ایام میں روزے رکھے یہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مذہب تھا اور آپ ہمیشہ فدیہ بھی دیتے تھے اور بعد میں روزے بھی رکھتے تھے اور اسی کی دوسروں کو تاکید فرمایا کرتے تھے۔

اس آیت میں جو اَلَّذِیْنَ کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ دو کا بدل یعنی قائم مقام ہوسکتا ہے۔ اوّل ان مومنوں کا جن کا ذکر یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ میں کیا گیا ہے۔ دوم اُن لوگوں کا جن کا ذکر فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ میں ہے۔ اگر اسے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا بدل سمجھا جائے تو اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ لوگ جو ضعف کی وجہ سے روزے سے سخت تکلیف اُٹھاتے ہیں اور اپنے نفس پر بڑی مشقّت برداشت کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ روزہ رکھنے کی بجائے ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے دیا کریں۔ اور اگر دوسرا بدل لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ مریض اور مسافر جو فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں وہ فدیہ دے دیں اور پھر دوسرے دنوں میں روزے بھی رکھیں۔ کیونکہ بعض امراض ایسی ہوتی ہیں یا بعض سفر ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ آیا اس میں روزہ ترک کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ حدیث میں آیا ہے کہ مشکوک اشیاء بھی محارم ہی کے نیچے ہوتی ہیں کیونکہ جو مشکوک تک پہنچتا ہے وہ آہستہ آہستہ محارم تک بھی پہنچ جاتا ہے (بخاری کتاب البیوع باب الحلال بیّن و الحرام بیّن و بینھما مشتبھات)۔ پس اگر یہ دونوں باتیں مشکوک ہوں تو ایسے مسافر اور مریض کو چاہیے کہ فدیہ دے دے اور رخصت سے فائدہ اٹھائے اور بعد میں روزے بھی رکھ لے۔ اس میں ایسی بیماری والا جس کی بیماری مشتبہ ہو یا ایسا سفر والا جس کا سفر مشتبہ ہو مراد ہیں۔ ان میں سے جو لوگ طاقت رکھتے ہوں اُن پر فدیہ دینا لازم ہے کیونکہ ممکن ہے انہوں نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی ہو۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہی مذہب تھا کہ ایسے لوگ دوسرے ایام میں روزہ رکھیں۔ اور رمضان کے دنوں میں فدیہ دیں۔

پھر فرماتا ہے فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ جو شخص پوری بشاشت اور شوق کے ساتھ نیکی کا کوئی کام کرتا ہے

تو خواہ وہ ابتداء میں تکلّف کے ساتھ ہی ایسا کرے اور اسے اپنے نفس پر ایک رنگ میں بوجھ ہی محسوس ہو تب بھی اس کا نتیجہ اس کے لئے اچھا نکلے گا۔ یعنی وہ نیکی اس کے لئے بہترین نتائج پیدا کرنے والی ثابت ہوگی۔ عربی زبان میں تَطَوُّع کا لفظ اُس وقت استعمال ہوتا ہے جب اپنے نفس پر بوجھ ڈال کر کسی حکم کی اطاعت کی جائے۔ اور تکلّف سے بشاشت کا اظہار کیا جائے (مفردات)۔ پس فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو شخص پورے شرح صدر کے ساتھ کسی نیکی میں حصہ نہ لے سکے اُسے چاہیے کہ کم از کم اپنے نفس پر بوجھ ڈالتے ہوئے ہی اس میں حصہ لے اور اپنے چہرہ پر تکلّف سے بشاشت پیدا کرے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس کیلئے خیر اور برکت کے رستے کھول دے گا۔ یعنی نیکیوں میں ترقی کرتے کرتے اُسے ایسا مقام میسّر آجائے گا کہ نیکی اس کی غذا بن جائے گی اور نیک تحریکات پر عمل اس کے لئے ایسا ہی آسان ہو جائے گا جیسے اعلیٰ درجہ کے مومنوں کے لئے آسان ہوتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ تَطَوُّع کے معنے محاورہ میں غیر واجب کام کے نفلی طور پر کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور امام راغب نے اپنی مشہور کتاب مفردات میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ جو شخص نفلی طور پر کوئی نیک کام کرے گا تو یہ اس کے لئے بہت بہتر ہوگا۔ یعنی رمضان میں روزے رکھنے یا ایک مسکین کو کھانا کھلانے کا حکم تو ہم نے دے دیا ہے لیکن اگر کوئی شخص ثواب کی نیت سے اس میں کوئی زیادتی کرنا چاہے تو اسے اس کا اختیار ہے۔ مثلاً وہ اختیار رکھتا ہے کہ ایک کی بجائے دو مساکین کا کھانا بطور فدیہ دے دے۔ یا وہ اختیار رکھتا ہے کہ روزہ بھی رکھے اور حصول ثواب کے لئے ایک مسکین کو کھانا بھی کھلاتا رہے۔ یا رمضان کے روزوں کے علاوہ نفلی طور پر دوسرے ایام میں بھی روزے رکھے۔ یہ سب حصول ثواب کے ذرائع ہیں جن میں ہر مومن اپنی اپنی طاقت کے مطابق حصہ لے کر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔

پھر فرمایا وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ۔ اس کے بعض لوگ یہ معنے کرتے ہیں کہ اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اگر یہ معنے ہوتے تو اِنْ تَصُوْمُوْا کہنا چاہیے تھا۔ نہ کہ اَنْ تَصُوْمُوْا۔ اس کے صحیح معنے یہ ہیں کہ اگر تم علم رکھتے ہو تو سمجھ سکتے ہو کہ روزہ رکھنا تمہارے لئے بہر حال بہتر ہے۔ یعنی ہم نے جس حکم کے لئے یہ تمہید اُٹھائی ہے۔ وہ کوئی معمولی حکم نہیں بلکہ ایک غیر معمولی خیر اور برکت رکھنے والا حکم ہے۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم اسے پوری توجہ سے سُنو اور اس پر عمل کرو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ

رمضان کا مہینہ وہ (مہینہ) ہے جس کے بارہ میں قرآن (کریم) نازل کیا گیا ہے۔(وہ قرآن) جو تمام انسانوں

بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ

کے لئے ہدایت (بنا کر بھیجا گیا) ہے اور جو کھلے دلائل اپنے اندر رکھتا ہے (ایسے دلائل) جو ہدایت پیدا کرتے ہیں

الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ

اور اس کے ساتھ ہی (قرآن میں) الٰہی نشانات بھی ہیں۔اس لئے تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو (اس حال میں)

فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا

دیکھے (کہ نہ مریض ہو نہ مسافر) اسے چاہیے کہ وہ اس کے روزے رکھے۔جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو اس پر

یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی

اور دنوں میں تعداد (پوری کرنی واجب) ہوگی۔اللہ (تعالیٰ) تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے تنگی

مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

نہیں چاہتا (یہ حکم اس نے اس لئے دیا ہے کہ تم تنگی میں نہ پڑو) اور تا کہ تم تعداد کو پورا کرلو۔اور اس (بات) پر اللہ کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے اور تا کہ تم (اس کے) شکر گذار بنو۔

حل لغات۔ هُدًی یہ مصدر ہے اور فاعل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔یعنی لوگوں کو ہدایت دینے والا۔مزید تشریح کے لئے دیکھیں سورۃ بقرۃ آیت نمبر ۱۷۹ جلد ھذا۔

بَیِّنَاتٍ جمع ہے اس کا مفرد اَلْبَیِّنَةُ ہے۔جس کے معنے ہیں اَلدِّلَالَةُ الْوَاضِحَةُ عَقْلِیَّةً كَانَتْ اَوْ مَحْسُوْسَةً یعنی واضح دلیل خواہ وہ عقلی ہو یا حس سے تعلق رکھتی ہو۔(مفردات)

تفسیر۔ رمضان کا مہینہ ان مقدس ایام کی یاد دلاتا ہے جن میں قرآن کریم جیسی کامل کتاب کا دنیا میں نزول ہوا۔وہ مبارک دن۔وہ دنیا کی سعادت کی ابتداء کے دن۔وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اُس کی برکت کے

دروازے کھولنے والے دن جب دنیا کی گھناؤنی شکل اس کے بدصورت چہرے اور اس کے اذیت پہنچانے والے اعمال سے تنگ آ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں جا کر اور دنیا سے منہ موڑ کر اور اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر صرف اپنے خدا کی یاد میں مصروف رہا کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ دنیا سے اس طرح بھاگ کر وہ اپنے فرض کو ادا کریں گے جسے ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا ہے۔ انہی تنہائی کی گھڑیوں میں انہی جدائی کے اوقات میں اور انہی غور و فکر کی ساعات میں رمضان کا مہینہ آپ پر آ گیا۔ اور جہاں تک معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے چوبیسویں رمضان کو وہ جو دنیا کو چھوڑ کر علیحدگی میں چلا گیا تھا اسے اس کے پیدا کرنے والے اُس کی تربیت کرنے والے، اُس کو تعلیم دینے والے اور اس سے محبت کرنے والے خدا نے حکم دیا کہ جاؤ اور جا کر دنیا کو ہدایت کا راستہ دکھاؤ۔ اور بتایا کہ تم مجھے تنہائی میں اور غار حرا میں ڈھونڈتے ہو مگر میں تمہیں مکہ کی گلیوں اور ان کے شور و شغب میں ملوں گا۔ جاؤ اور اپنی قوم کو پیغام پہنچا دو کہ میں نے تم کو ادنیٰ حالت میں پیدا کر کے اور پھر ترقی دے کر اس لئے دنیا میں نہیں بھیجا کہ کھاؤ پیؤ اور مر جاؤ اور کوئی سوال تم سے نہ کیا جائے۔

آپ اس آواز کو سن کر حیران رہ گئے۔ آپ نے جبرائیل کو حیرت سے دیکھ کر کہا کہ مَآ اَنَا بِقَارِئٍ۔ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ یعنی اس قسم کا پیغام مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ الفاظ میرے منہ سے مکہ والوں کے سامنے زیب دیں گے؟ کیا میری قوم ان کو قبول کرے گی اور سُنے گی؟ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو متواتر حکم دیا گیا کہ جاؤ اور پڑھو۔ جاؤ اور پڑھو۔ جاؤ اور پڑھو۔ تب آپ نے اس آواز پر اس ارشاد کی تعمیل میں تنہائی کو چھوڑا اور جلوت اختیار کی۔ مگر وہ کیسی مجلس تھی۔ وہ ایسی نہ تھی کہ جس میں ایک دوست بیٹھ کر دوسرے دوست کے سامنے اپنے شکوے بیان کرتا ہے، وہ ایسی مجلس نہ تھی جس میں دوست اپنے دوست کے خوش کرنے والے حالات سنتا اور اس سے لطف اٹھاتا ہے، وہ ایسی مجلس نہ تھی جس میں انسان اپنی ذہنی کوفت اور تھکان دُور کرتا ہے۔ وہ قصوں اور کہانیوں والی مجلس نہ تھی، شعر و شاعری کی مجلس نہ تھی۔ وہ ایسی مجلس نہ تھی جس میں مباحثات اور مناظرات ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ مجلس ایسی تھی جس میں ایک طرف سے متواتر اور پیہم اخلاص کا اظہار ہوتا تھا تو دوسری طرف سے متواتر اور پیہم گالیاں، دُشنام، ڈراوے اور دھمکیاں ملتی تھیں۔ وہ ایسی مجلس تھی جس میں ایک دفعہ جانے کے بعد دوسرے دن جانے کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ وہ ایسی گالیاں اور ایسے ارادے اور ایسی دھمکیاں ہوتی تھیں کہ ایک طرف اُن کے دینے والے سمجھتے تھے کہ اگر اس شخص میں کوئی حِس باقی ہے تو کل اس کے منہ سے ایسی بات ہرگز نہیں نکلے گی۔ وہ خوش ہوتے تھے کہ آج ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان بند کر

دی اور دوسری طرف جب خدا تعالیٰ کا سورج چڑھتا تو خدا تعالیٰ کا یہ عاشق صادق خدا تعالیٰ کا پیغام مکہ والوں کو پہنچانے کے لئے پھر نکل کھڑا ہوتا۔ پھر تمام دن وہی گالیاں وہی دھمکیاں اور وہی ڈراوے ہوتے تھے اور اسی میں شام ہو جاتی۔ مگر جب رات کا پردہ حائل ہوتا تو وہ سمجھتے کہ شاید آج یہ خاموش ہو گیا ہوگا۔ مگر وہ جس کے کانوں میں خدائی آواز گونج رہی تھی۔ وہ مکہ والوں سے دب کر کیسے خاموش ہو جاتا؟ اگر تو اس کی رات سوتے گزرتی تو بے شک اس پیغام کو بھول جاتا مگر جب اُس کے سونے کی حالت جاگنے ہی کی ہوتی تو وہ کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ سبق جو دوہرایا نہ جائے بیشک بھول سکتا ہے مگر جب آپ کی یہ حالت تھی کہ جونہی سرہانے پر سر رکھا وہی اِقْرَاْ کی آواز آنی شروع ہو جاتی تو آپ کس طرح اس پیغام کو بھول جاتے؟ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو رمضان ہی میں یہ آواز آئی اور رمضان ہی میں آپ نے غارحرا سے باہر نکل کر لوگوں کو یہ تعلیم سنانی شروع کی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ یعنی رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اُترا۔ دوسری جگہ فرماتا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ۔ (القدر: ۲،۳) یعنی قرآن لیلۃ القدر میں اُتارا گیا ہے۔

رَمَضَان رَمَض سے نکلا ہے۔ جس کے معنے عربی زبان میں جلن اور سوزش کے ہیں (اقرب)۔ خواہ وہ جلن دھوپ کی ہو خواہ بیماری کی۔ اس لئے رَمَضَان کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا موسم جس میں سختی کے اوقات اور ایام ہوں۔ اور اِدھر فرمایا۔ ہم نے اسے رات کو اتارا ہے اور رات تاریکی اور مصیبت پر دلالت کرتی ہے۔ پس ان دونوں آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ الہام کا نزول تکالیف اور مصائب کے ایام میں ہوا کرتا ہے۔ جب تک کوئی قوم مصائب اور شدائد سے دوچار نہیں ہوتی، جب تک اُس کے دن راتیں نہیں بن جاتے، جب تک وہ بھوک اور پیاس کی شدّت سے تکلیف نہیں اُٹھاتی، جب تک انسانی جسم اندر اور باہر سے مصیبت نہیں اٹھاتا اُس وقت تک خدا تعالیٰ کا کلام اُس پر نازل نہیں ہو سکتا۔ اور اس ماہ کے انتخاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہی بتایا ہے کہ اگر تم اپنے اوپر الہام الٰہی کا دروازہ کھولنا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ تکالیف اور مصائب میں سے گذرو اِس کے بغیر الہام الٰہی کی نعمت تمہیں میسّر نہیں آسکتی۔ پس رمضان کلام الٰہی کو یاد کرانے کا مہینہ ہے۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اس مہینہ میں قرآن کریم کی تلاوت زیادہ کرنی چاہیے اور اسی وجہ سے ہم بھی اس مہینہ میں درسِ قرآن کا انتظام کرتے ہیں۔ دوستوں کو چاہیے کہ اس مہینہ میں زیادہ سے زیادہ تلاوت کیا کریں اور قرآن کریم کے معانی پر غور کیا کریں تاکہ اُن کے اندر قربانی کی روح پیدا ہو جس کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ بہر حال یہ مہینہ بتاتا ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا فتح کرے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غارحرا کی علیحدگیوں میں جائے۔ دنیا چھوڑے

بغیر نہیں مل سکتی۔ پہلے اس سے علیحدگی اختیار کرنی ضروری ہوتی ہے اور پھر وہ قبضہ میں آتی ہے مگر وہ قبضہ جسے الٰہی قبضہ وتصرّف کہتے ہیں۔ایک دنیوی قبضہ ہوتا ہے جیسے دجّال کا ہے۔اس کے ملنے کا بیشک یہی طریق ہے کہ اپنے آپ کو دنیا کے لئے وقف کر دیا جائے لیکن جو شخص خدا تعالیٰ کا ہو کر اس پر قبضہ کرنا چاہے وہ اُسی صورت میں کر سکے گا جب اُسے چھوڑ دے گا۔دیکھو ابوجہل نے دنیا کے لئے کوشش کی اور اُسے حاصل کیا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے چھوڑ دیا اور پھر بھی وہ آپ کو مل گئی۔ بلکہ ابوجہل سے زیادہ ملی۔ابوجہل زیادہ سے زیادہ مکہ کا ایک رئیس تھا مگر آپ اپنی زندگی میں ہی سارے عرب کے بادشاہ ہو گئے اور آج ساری دنیا کے شہنشاہ ہیں۔غرض جو دنیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی وہ ابوجہل کو کہاں حاصل ہوئی؟ مگر ابوجہل کو جو کچھ حاصل ہوا وہ دنیا کمانے سے ملا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ ملا وہ دنیا چھوڑنے سے ملا۔ پس روحانی جماعتوں کو دنیا چھوڑ دینے سے ملتی ہے۔اور دنیوی لوگوں کو دنیا کمانے سے ملتی ہے۔اور رمضان ہمیں توجہ دلاتا ہے کہ اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ پہلے شدائد اور مصائب قبول کرو۔راتوں کی تاریکیاں قبول کرو اور ان چیزوں سے مت گھبراؤ۔کیونکہ یہی قربانیاں تمہاری کامیابی کا ذریعہ ہیں۔

غرض رمضان ایک خاص اہمیت رکھنے والا مہینہ ہے۔اور جس شخص کے دل میں اسلام اور ایمان کی قدر ہوتی ہے وہ اس مہینہ کے آتے ہی اپنے دل میں ایک خاص حرکت اور اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی کپکپاہٹ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔کتنی ہی صدیاں ہمارے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان گذر جائیں، کتنے ہی سال ہمیں اور انکو آپس میں جُدا کرتے چلے جائیں کتنے ہی دنوں کا فاصلہ ہم میں اور ان میں حائل ہوتا چلا جائے لیکن جس وقت رمضان کا مہینہ آتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان صدیوں اور سالوں کو اس مہینہ نے لپیٹ لپاٹ کر چھوٹا سا کر کے رکھ دیا ہے اور ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گئے ہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی قریب نہیں چونکہ قرآن خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس لئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام فاصلہ کو رمضان نے سمیٹ سماٹ کر ہمیں خدا تعالیٰ کے قریب پہنچا دیا ہے۔وہ بُعد جو ایک انسان کو خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے، وہ بُعد جو ایک مخلوق کو اپنے خالق سے ہوتا ہے۔وہ بُعد جو ایک کمزور اور نالائق ہستی کو زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے خدا سے ہوتا ہے وہ یوں سمٹ جاتا ہے وہ یوں مٹ جاتا ہے وہ یوں غائب ہو جاتا ہے جیسے سورج کی کرنوں سے رات کا اندھیرا۔یہی وہ حالت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (البقرۃ:۱۸۷)۔ جب رمضان کا مہینہ آئے اور میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال کریں کہ میں انہیں کس

طرح مل سکتا ہوں تو تُو انہیں کہہ دے کہ رمضان اور خدا تعالیٰ میں کوئی فرق نہیں۔ یہی وہ مہینہ ہے جس میں خدا اپنے بندوں کے لئے ظاہر ہوا۔ اور اُس نے چاہا کہ پھر اپنے بندوں کو اپنے پاس کھینچ کر لے آئے۔ اس کلام کے ذریعہ جو حبل اللہ ہے۔ جو خدا کا وہ رسّہ ہے جس کا ایک سِرا خدا کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا مخلوق کے ہاتھ میں اب یہ بندوں کا کام ہے کہ وہ اس رسّہ پر چڑھ کر خدا تک پہنچ جائیں۔

اب میں بتاتا ہوں کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے تین معنے ہو سکتے ہیں۔

اوّل اس جگہ **فی تعلیلیہ** ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس کے بارہ میں قرآن کریم اتارا گیا ہے۔ یعنی رمضان المبارک کے روزوں کی اس قدر اہمیت ہے کہ ان کے بارہ میں قرآن کریم میں خاص طور پر احکام نازل کئے گئے ہیں۔ اور جس حکم کے بارہ میں قرآنی وحی نازل ہو اُس کے متعلق ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کتنا اہم اور ضروری ہوگا۔ فِیْ کے یہ معنے لغت سے بھی ثابت ہیں۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں تَكَلَّمْتُ مَعَكَ فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ میں نے تجھ سے اس امر کے متعلق گفتگو کی۔ اسی طرح قرآن کریم میں بھی اس کی مثال پائی جاتی ہے۔ سورۃ یوسف میں اِمْرَأَةُ الْعَزِيْزِ کے متعلق آتا ہے کہ اُس نے کہا فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (یوسف:۳۳) یہ وہ شخص ہے جس کے بارہ میں تم نے مجھے ملامت کی ہے۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِيْ هِرَّةٍ حَبَسَتْهَا (بخاری کتاب المساقاۃ باب فضل سقی الماء) ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا کیونکہ اُس نے اُسے بغیر کھلائے پلائے باندھ دیا تھا یہاں تک کہ وہ مر گئی۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ رمضان ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن کریم کے نزول کا آغاز ہوا۔ چنانچہ حدیثوں سے صاف طور پر ثابت ہے کہ قرآن کریم کا نزول رمضان کے مہینہ میں شروع ہوا۔ اور گو تاریخ کی تعیین میں اختلاف ہے لیکن محدثین عام طور پر ۲۴ تاریخ کی روایت کو مقدم بتاتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامہ زرقانی دونوں نے اس روایت کو ترجیح دی ہے کہ قرآن کریم رمضان کی ۲۴ تاریخ کو اُترنا شروع ہوا تھا۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ رمضان میں پورا قرآن اتارا گیا۔ جیسے احادیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا اَنَّ جِبْرِيْلَ كَانَ يُعَارِضُنِيَ الْقُرْاٰنَ فِيْ كُلِّ سَنَةٍ مَرَّةً وَاِنَّهٗ عَارَضَنِيَ الْعَامَ مَرَّتَيْنِ یعنی جبریل ہر سال رمضان کے مہینہ میں تمام قرآن کریم کا میرے ساتھ ایک دفعہ دَور کیا کرتے تھے۔ مگر اس سال انہوں نے دو دفعہ دَور کیا ہے جس سے میں سمجھتا ہوں کہ اب میری وفات کا وقت قریب ہے (شرح العلامۃ الزرقانی علی المواھب اللدنیۃ الفصل

الاول فی اتمامه تعالیٰ نعمته علیه بو فاته...) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی قرآن نازل ہوا ہے مگر رمضان المبارک کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں جس حد تک قرآن کریم نازل ہو چکا ہوتا تھا جبریل اس کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر دَور کیا کرتے تھے۔ گویا دوسرے الفاظ میں دوبارہ تمام قرآن کریم آپ پر نازل کیا جاتا۔ بخاری کتاب بدء الوحی میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ وَكَانَ اَجْوَدُ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ حِيْنَ يَلْقَاهُ جِبْرِيْلُ وَكَانَ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْاٰنَ فَلَرَسُوْلُ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) اَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ۔ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے بڑھ کر سخی تھے اور زیادہ تر سخاوت آپ رمضان میں فرمایا کرتے تھے جبکہ جبریل آپ سے ملتے تھے۔ اور جبریل رمضان کے مہینہ میں ہر رات آپ سے ملا کرتے تھے اور تمام قرآن کریم کا آپ کے ساتھ مل کر دَور کیا کرتے تھے۔ اُن دنوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بارش لانے والی ہوا سے بھی اپنے جود و کرم میں بڑھ جاتے تھے۔

ان حوالجات سے ثابت ہے کہ ابتدائے نزولِ قرآن بھی رمضان کے مہینہ میں ہوا اور پھر ہر رمضان میں جتنا قرآن اس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا جبریل دوبارہ نازل ہو کر اسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ مل کر دوہراتے تھے۔ اس روایت کو مدِّ نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ سارا قرآن کریم ہی رمضان میں نازل ہوا۔ بلکہ کئی حصے متعدد بار نازل ہوئے یہاں تک کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد اگر ۲۳ رمضان آئے تو بعض آیات ایسی تھیں جو ۲۳ بار نازل ہوئیں بعض ۲۲ بار نازل ہوئیں۔ بعض ۲۱ بار اور بعض ۲۰ بار۔ اسی طرح جو آیات آخری سال نازل ہوئیں وہ بھی دو دفعہ دہرائی گئیں۔ کیونکہ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آپ کی حیاتِ طیّبہ کے آخری سال میں جبریل علیہ السلام نے دو دفعہ قرآن کریم آپ کے ساتھ دہرایا اور یہ بات قرآن کریم سے ثابت ہے کہ ملائکہ جو بھی کام کرتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے حکم سے کرتے ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جبریل علیہ السلام کا رمضان میں آپ کے ساتھ مل کر قرآن کریم کا دَور کرنا نزول نہیں کہلا سکتا کیونکہ فرشتہ اُترتا ہی اسی وقت ہے جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو اور اسلامی زبان میں اس کے لئے نزول کی اصطلاح ہی استعمال ہوتی ہے۔ پس اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ اس مہینہ میں تمام قرآن کا نزول ہوا۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ رمضان اسلامی نام ہے اس مہینے کا پہلا نام زمانہ جاہلیت میں ناتق ہوا کرتا تھا۔ (فتح البیان)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى ۔ چونکہ هُدًى اور بَيِّنَاتٍ دونوں قرآن کریم کا حال ہیں۔ اس لئے اس کے معنے یہ ہوئے کہ یہ قرآن ایسا ہے کہ اوّل تو وہ هُدًى ہے یعنی لوگوں کے لئے ہدایت کا موجب ہے دوم اس میں ہدایت کے دلائل ہیں یعنی وہ یونہی لوگوں کو نہیں کہتا کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو بلکہ وہ دلائل بھی دیتا ہے۔ اور لِلنَّاسِ کا لفظ رکھ کر بتایا کہ یہ تمام دنیا کے لوگوں کے لئے ہدایت کا موجب ہے صرف بعض لوگوں کے لئے نہیں۔ وَالْفُرْقَانَ اور پھر اس میں ایسے دلائل ہیں جو حق اور باطل میں امتیاز کر دیتے ہیں۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ میں بتایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ رمضان کا مبارک مہینہ نصیب کرے اور وہ ان دنوں میں سفر میں بھی نہ ہو اور اس کی صحت بھی اچھی ہو اُسے چاہیے کہ وہ پورے مہینہ کے مسلسل روزے رکھے اور اپنے لئے خیر اور برکت کے زیادہ سے زیادہ سامان جمع کرے اور ان مبارک ایام کو سستی اور غفلت میں ضائع نہ کرے۔

پھر فرماتا ہے يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔ یعنی ہم نے رمضان میں روزے اس لئے مقرر کئے ہیں کہ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ تم ایمان لاؤ اور پھر اپنی زندگی تنگیوں میں بسر کرو۔ حالانکہ بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ ان دنوں مومنوں کو اپنے نفس پر زیادہ تنگی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ درحقیقت اس آیت میں یہ عظیم الشان نکتہ بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے بھوکا رہنا یا دین کے لئے قربانیاں کرنا انسان کے لئے کسی نقصان کا موجب نہیں بلکہ سراسر فائدہ کا باعث ہوتا ہے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ رمضان میں انسان بھوکا رہتا ہے وہ قرآن کریم کی تکذیب کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم بھوکے تھے ہم نے رمضان مقرر کیا تا کہ تم روٹی کھاؤ۔ پس معلوم ہوا کہ روٹی وہی ہے جو خدا کھلاتا ہے اور اصل زندگی اسی سے وابستہ ہے کہ انسان خدا کے لئے قربانی کرے اور پھر جو کچھ ملے اسے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوا کھائے۔ اس کے سوا جو روٹی ہے وہ دراصل کھانے والے کے لئے روحانی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔

پس مومن کا فرض ہے کہ جو لقمہ بھی اس کے مونہہ میں جائے اس کے متعلق پہلے دیکھ لے کہ وہ کس کے لئے ہے؟ اگر تو وہ خدا کے لئے ہے تو وہی روٹی ہے اور اگر نفس کے لئے ہے تو وہ روٹی نہیں بلکہ پتّھر ہیں۔ اسی طرح جو کپڑا خدا کے لئے پہنا جائے وہی لباس ہے اور جو نفس کے لئے پہنتا ہے وہ ننگا ہے۔ دیکھو! کیسے لطیف پیرایہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جب تک تم خدا کے لئے تکالیف اور مصائب برداشت نہ کرو تم کبھی سہولت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کا بھی ابطال ہو جاتا ہے جو بقول حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام رمضان کو موٹے ہونے کا

ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ بعض لوگوں کے لئے رمضان ایسا ہی ہوتا ہے جیسے گھوڑے کے لئے خوید۔ وہ ان دنوں خوب گھی مٹھائیاں اور مرغن اغذیہ کھاتے ہیں اور اس طرح موٹے ہو کر نکلتے ہیں جس طرح خوید کے بعد گھوڑا۔ یہ چیز بھی رمضان کی برکت کو کم کرنے والی ہے۔ اسی طرح افطاری میں تنوع اور سحری میں تکلّفات بھی نہیں ہونے چاہئیں اور یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ سارا دن بھوکے رہے ہیں اب پُرخوری کر لیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ افطاری کے لئے کوئی تکلّفات نہ کرتے تھے۔ کوئی کھجور سے کوئی نمک سے بعض پانی سے اور بعض روٹی سے افطار کر لیتے تھے۔ ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم اس طریق کو پھر جاری کریں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے نمونہ کو زندہ کریں۔

پھر فرماتا ہے وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرو۔ مفسّرین نے اس کے یہ معنے کئے ہیں اور میں خود بھی کبھی کبھی یہ معنے کیا کرتا ہوں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہینہ بھر کے روزے مقرر کرنے کی وجہ بتائی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کا مہینہ اس لئے مقرر کیا ہے تا دن پورے ہو جائیں۔ اگر یونہی حکم دے دیتا کہ روزے رکھو تو کوئی دس رکھ لیتا کوئی بیس رکھ لیتا اور کوئی رکھتا ہی چلا جاتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایک مہینہ مقرر کر دیا تا کہ روحانی تکمیل کے لئے جس مدت کی ضرورت ہے اس کو تم پورا کر لو۔ یہ معنے بھی اپنی جگہ درست ہیں مگر اس کا ایک یہ مطلب بھی ہے کہ اصل زندگی انسان کی وہی ہے جو نیکی میں گذرے۔ عمر کا وہ حصہ جو دنیا کے لئے گذر جاتا ہے ضائع چلا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے روزے اس لئے رکھے ہیں تا کہ تم اپنی حقیقی عمر پوری کر لو۔ جو لوگ دنیا حاصل کرنے میں ہی مصروف رہتے ہیں وہ قرآنی اصطلاح کے مطابق زندہ نہیں بلکہ مُردہ ہوتے ہیں۔ اور مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل: ۷۳) کے مطابق جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ اگلے جہاں میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ ہم نے روزے اس لئے مقرر کئے ہیں تا تم دنیا میں اپنی مقررہ عمر گذار لو۔ چونکہ بنی نوع انسان کے لئے کھانا پینا لازمی ہے اس لئے سارا سال تو روزے نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اصل کے مطابق کہ ایک نیکی کا ثواب کم سے کم دس گُنا ملتا ہے ایک ماہ کے روزے مقرر کر دیئے اور اس طرح رمضان سارے سال کے روزوں کا قائم مقام ہو گیا۔ گویا جس نے اس مہینہ میں روزے رکھ لئے اس نے سارے سال کے روزے رکھ لئے اور اس طرح اس کی زندگی واقعی زندگی ہو گئی۔

پھر فرماتا ہے وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ یہ روزے اس لئے مقرر کئے گئے ہیں کہ تم اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کی

فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے شَھْر کے مقابلہ میں وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ کے الفاظ رکھ دیئے اور بتایا کہ اگر ہم ایک مہینہ مقرر نہ کرتے تو کوئی کم روزے رکھتا اور کوئی زیادہ اور اس طرح وہ روحانی ترقی جو مہینہ بھر کے روزوں کے نتیجہ میں حاصل ہوسکتی ہے اسے وہ حاصل نہ کرسکتے۔

اس کے بعد اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ کے مقابلہ میں وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ کے الفاظ رکھ کر بتایا کہ ہم نے کوئی اور مہینہ اس لئے مقرر نہیں کیا کہ نزول قرآن کو یاد کر کے اس ماہ میں تمہارے دل میں خاص جوش پیدا ہوسکتا ہے۔ جب رمضان کا مہینہ آئے گا تو لازماً تمہیں یہ خیال بھی آئے گا کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں ہم پر خدا تعالیٰ کا ایک بہت بڑا فضل قرآن کریم جیسی مقدّس کتاب کی شکل میں نازل ہوا ہے اور تمہارا دل خود بخود اس مہینہ میں خدا تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کی طرف متوجہ ہوجائے گا۔

پھر وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ میں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ دن اس لئے ہیں کہ تا اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو یہ نہیں کہ تم شکوہ کرو کہ ہمیں بھوکا رکھا بلکہ یہ سمجھو کہ بڑا احسان کیا کہ روزہ جیسی نعمت ہمیں عطا کی۔ یہاں مومن کا نقطۂ نگاہ واضح کیا گیا ہے کہ اسے قربانی کا جو موقعہ بھی ملے وہ اسے اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھتا ہے اور جس قوم کا یہ نقطۂ نگاہ ہوجائے اسے کوئی تباہ نہیں کرسکتا۔ وہ ضرور کامیاب ہوکر رہتی ہے۔ ایسی قوم حقیقی معنوں میں زندہ قوم ہوجاتی ہے۔ جب ایک شخص کے دل میں یہ خیال ہو کہ مجھ پر جو دینی ذمہ واریاں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرے گا اور جو شخص خدا تعالیٰ کی بڑائی کرے خدا تعالیٰ اس کی بڑائی کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تمہیں جو کوئی تحفہ دے تم اسے اس سے بہتر تحفہ دو۔ اور جب ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے تو کیونکر ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ایسا نہ کرے۔ انسان اس کی خدمت میں تحفہ پیش کرے اور وہ اس سے بہتر تحفہ اسے نہ دے۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ کی بڑائی کرتا ہے خدا تعالیٰ اس کی بڑائی کرتا ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ تکبیر صرف منہ سے نہ ہو۔ جس تکبیر سے وہ خوش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ گالیاں کھاؤ۔ ماریں کھاؤ۔ پتھر کھاؤ اور پھر بھی خدا تعالیٰ کی تکبیر کرو کہ اس نے ہمیں یہ مواقع عطا کئے ہیں۔ گویا حقیقی تکبیر یہی ہے کہ جتنا زیادہ ظلم ہو اتنا ہی زیادہ انسان خدا تعالیٰ کی طرف جھکے اور کہے کہ مجھ پر اس کے کتنے احسان ہو رہے ہیں جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی تکبیر کرے اور اس کی بڑائی بیان کرے ایسے شخص کی تکبیر کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ یقیناً اس کو بڑھاتا ہے اور اس کی بڑائی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ ورنہ صرف مُنہ کی تکبیریں اس کے کسی کام نہیں آسکتیں۔

اس کے بعد فرمایا وَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۔ یہ روزے ہم نے اس لئے مقرر کئے ہیں تا کہ تم اس کے شکر گذار بنو۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے وَ مَنۡ كَانَ مَرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ کے مقابل میں رکھ کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ سہولت ہم نے اس لئے رکھی ہے کہ تم شکر گذار بنو کہ خدا تعالیٰ نے مدارجِ عالیہ کے حصول کے لئے ہمارے لئے کس قدر سہولتیں رکھ دی ہیں اور تمہاری جبینِ نیاز ہمیشہ اس کے حضور جھکی رہے۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تین احکام دیئے ہیں اور تین ہی حکمتیں بیان فرمائی ہیں تین احکام تو یہ دیئے کہ (۱) مہینہ کے روزے رکھو (۲) رمضان میں رکھو (۳) مریض اور مسافر کو ان دنوں میں رخصت ہے۔ اس کے مقابل میں تین ہی حکمتیں بیان فرمائیں (۱) کہا تھا کہ ایک مہینہ کے روزے رکھو اس کے لئے فرمایا کہ اگر ہم روزے مقرر نہ کرتے تو لوگ کم و بیش رکھتے اور اس طرح وہ تعداد پوری نہ ہوتی جو روحانی ترقی کے لئے ضروری ہے (۲) کہا تھا کہ رمضان میں روزے رکھو۔ اس پر کوئی کہہ سکتا تھا کہ رمضان کو کیوں مقرر کیا ہے جس مہینہ میں کوئی چاہتا روزے رکھ لیتا اس لئے فرمایا کہ اس مہینہ میں قرآن کریم کا نزول یاد آ کر خدا تعالیٰ کو یاد کرنے کا جوش پیدا ہوگا اور اس مبارک مہینہ میں خدا تعالیٰ کی عبادت اور ذکرِ الٰہی کی طرف تمہیں زیادہ توجہ پیدا ہوگی۔ (۳) کہا تھا کہ بعض کے لئے رخصت ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان آسانیوں کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا جذبہ تمہارے دلوں میں پیدا ہو کہ خدا تعالیٰ کو ہمارا کتنا خیال ہے اس نے ہمارے فائدہ کے لئے حکم دیا اور اس میں بھی ہمارے لئے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ عِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ کے مقابلہ میں فرمایا کہ یہ تخفیف اور سہولت اس لئے ہے کہ تم خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس کی محبت سے اپنے سینہ و دل کو منور کرو۔ اسی طرح لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ رمضان ہم نے اس لئے اُتارا ہے کہ تم شکر گذار بنو۔ یعنی ہر تکبیر کے بعد شکر کرو کہ خدا نے اپنی تکبیر کی توفیق دی اور پھر اس بات کا شکر کرو کہ خدا نے اپنے شکر کی توفیق دی۔ اور پھر شکر کی توفیق ملنے پر شکر کرو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے شکر کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا کہ انسان ہر وقت اس کے دروازہ پر گرا رہے گا اور اس غلام کی طرح ہو جائے گا جو کسی صورت میں بھی اپنے آقا کو نہیں چھوڑتا۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ

اور (اے رسول!) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو (تُو جواب دے کہ) میں (ان کے) پاس

الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ

(ہی) ہوں۔ جب دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ سو چاہیے کہ وہ (یعنی دعا کرنے

لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

والے بھی) میرے حکم کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا وہ ہدایت پائیں۔

حلّ لُغات۔ اُجِیْبُ اَجَابَ سے مضارع متکلّم کا صیغہ ہے اور اَلْاِجَابَةُ کے معنے ہیں اَلْعَطَاءُ مِنَ اللّٰہِ وَالطَّاعَةُ مِنَ الْعَبْدِ (مفردات) یعنی اجابت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو بخشش کرنے یا دینے کے معنے ہوتے ہیں اور اگر بندے کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنے اطاعت کے ہیں۔ پس اُجِیْبُ کے معنے ہوئے میں سن کر بدلہ دیتا ہوں یا اسے قبول کرتا ہوں۔

وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ اٰمَنَ بِہٖ کے معنے ہیں (۱) اُسے مان لیا (۲) اس کی صفات کو تسلیم کر لیا۔ پس وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ کے یہ معنے ہوئے کہ (۱) وہ مجھے مانیں اور (۲) میری صفات کو تسلیم کریں۔

لَعَلَّكُمْ لَعَلَّ مِنْ اَخَوَاتِ اِنَّ۔ لَعَلَّ اِنَّ کے اَخوات میں سے ہے۔ وَذَكَرَ بَعْضُ الْمُفَسِّرِیْنَ اَنَّ لَعَلَّ مِنَ اللّٰہِ وَاجِبٌ (مفردات) اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے آئے تو اس کے معنے یقین کے ہوتے ہیں۔

لَعَلَّ حروف مشبّہ بالفعل میں سے ہے اس کے ساتھ یاءِ متکلم بھی لگائی جاتی ہے جیسے لَعَلِّیْ اور کبھی لَعَلَّ اور یاءِ متکلم کے درمیان نون زائد کیا جاتا ہے جسے نونِ وقایہ کہتے ہیں جیسے لَعَلَّنِیْ۔ نون کے بغیر استعمال زیادہ ہے یہ اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے جیسے لَعَلَّ زَیْدًا قَائِمٌ۔ لیکن فرّاء اور بعض دیگر نحویوں کے نزدیک اسم اور خبر دونوں کو نصب دیتا ہے جیسے لَعَلَّ زَیْدًا قَائِمًا۔

لَعَلَّ کے کئی معنے ہیں (۱) پسندیدہ شے کی توقع اور ناپسندیدہ شے سے خوف ان معنوں میں یہ ایسے امر کے لئے

استعمال ہوتا ہے جس کا حصول ممکن ہو گو مشکل ہو۔ قرآن کریم میں جو فرعون کا قول نقل ہے لَعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ۔ (المؤمن: ۳۷،۳۸) اس کے متعلق مفسّرین کہتے ہیں یہ اس کی جہالت پر دلالت کرتا ہے وہ اپنی نادانی سے یہی سمجھتا ہوگا کہ میں اونچے مکان پر سے خدا تک پہنچنے کا راستہ پالوں گا مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ یا تو وہ یہ کہتا ہے کہ علم ہیئت کے ذریعہ سے موسیٰ کے مستقبل کو معلوم کر کے اس کا مقابلہ کروں گا اور یہ عُقدہ گو باطل ہے مگر کثرت سے رائج ہے۔ یا پھر اس کا قول بطور تمسخر ہے۔ چونکہ موسیٰؑ بار بار خدا کو آسمان پر بتاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ خدا اور فرشتے مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ اس پر وہ تمسخر سے کہتا ہے کہ لاؤ ایک مکان بناؤ شائد اس طرح ہم موسیٰ کے خدا کو پہنچ جائیں اور ہم بھی اس سے باتیں کر کے دیکھیں۔ مطلب یہ کہ ایک طرف خدا کو آسمان پر ماننا اور دوسری طرف اس سے باتیں کرنے کا دعویٰ یہ خلافِ عقل ہے الٰہی علوم سے ناواقف انسانوں کے لئے اس مسئلہ کو نہ سمجھ سکنا قابلِ تعجب نہیں (۲) اس کے معنے محض تعلیل کے بھی ہوتے ہیں جیسے فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ: ۴۵) یہی معنے ترجمہ میں استعمال کئے گئے ہیں (۳) کوفیوں کے نزدیک کبھی اس کے معنوں میں استفہام کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں ایک جگہ یعنی لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (الشعراء: ۱۳۰) کے سوا جہاں کہیں بھی لَعَلَّ استعمال ہوا ہے توقع کے معنوں میں نہیں بلکہ تعلیل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی ''تاکہ'' یا ''تا'' کے معنوں میں (۴) کلامِ مُلوک کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے یعنی بادشاہ کے لئے کوئی اور یا بادشاہ اپنی نسبت خود امید اور توقع کے الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن مراد اس سے یقینی بات یا حکم کے ہوتے ہیں۔

تفسیر ۔فرماتا ہے اے میرے رسول! جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے سوال کریں اور پوچھیں کہ ہمارا خدا کہاں ہے؟ جیسے عاشق پوچھتا پھرتا ہے کہ میرا محبوب کہاں ہے؟ تو تُو انہیں کہہ دے کہ تم گھبراؤ نہیں مَیں تو تمہارے بالکل قریب ہوں۔ یہاں عِبَادِیْ سے مراد عاشقانِ الٰہی ہی ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح عاشق ہر جگہ دوڑا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا معشوق کہاں ہے؟ اسی طرح جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو تُو انہیں کہہ دے کہ گھبراؤ نہیں میں تمہارے قریب ہی ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے عشاق کے دل کو توڑنا نہیں چاہتا۔

پھر فرماتا ہے۔ میرے قریب ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ جب کوئی شخص کامل تڑپ اور سوز و گداز کے ساتھ مجھ سے دُعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا کو قبول کر لیتا ہوں۔ اور یہ ثبوت ہوتا ہے اس بات

کا کہ میں قریب ہوں۔ اگر میں بعید ہوتا تو میں اس کی سجدے کی آہستہ آواز کو بھی کیسے سن سکتا؟ اور اگر میں بعید ہوتا تو اس کی گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر یا قیام کی صورت میں آہستہ آواز والی دُعا کیسے سُن لیتا۔ میرا اس دُعا کو سُن لینا بتاتا ہے کہ میں اس کے قریب ہوں۔

دوسری جگہ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق:۱۷) یعنی پاس ہونا تو الگ رہا جو انسان کی رگِ جان ہے ہم اس سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں اس کے معنے یہ ہوئے کہ وہ پاس ہی نہیں بلکہ انسان کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ پاس بیٹھنے والا صرف وہ آواز سنتا ہے جو منہ سے کہی جائے اور جو اندر بیٹھا ہو وہ وہ بات سنتا ہے جو دل سے کہی جائے۔ گویا خدا تعالیٰ نے لفظ قریب کی دوسری جگہ تشریح کر دی کہ قریب کا مفہوم یہ ہے کہ حبل الورید یعنی رگِ جان سے بھی میں زیادہ قریب ہوں اور میں ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں خواہ وہ زبان سے کی گئی ہو یا دل میں کوئی خواہش پیدا ہوئی ہو کیونکہ میرا اس سے تعلق ایسا قریب ہے کہ میں اس کے دل میں بیٹھا ہوا ہوں۔

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم نے تو بڑے اضطراب سے دعائیں کی تھیں مگر وہ قبول نہیں ہوئیں پھر یہ آیت کس طرح درست ثابت ہوئی؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ بے شک اَلدَّاعِ کے ایک معنے ہر پکارنے والے کے بھی ہیں مگر اس کے ایک معنے ایسے پکارنے والے کے بھی ہیں جس کا اوپر ذکر ہو رہا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ بندے جو مجھے ملنے کے اضطراب میں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں اور مجھ سے صرف میرا قرب اور وصال چاہتے ہیں میں ان کی دُعا کو سنتا اور انہیں اپنے قرب میں جگہ دیتا ہوں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فرمایا ہے۔ یعنی وہ میرے بارے میں سوال کرتے ہیں اس میں روٹی کا کہیں ذکر نہیں۔ نوکری کا کہیں ذکر نہیں بلکہ صرف عَنِّیْ فرمایا ہے عَنِ الْخُبْزِ یا عَنِ الْوَظِیْفَةِ نہیں فرمایا۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ کا قرب مانگے اور وہ اسے نہ ملے اسے تو بے شک اعتراض ہو سکتا ہے لیکن دوسروں کے لئے اس میں کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں۔

پھر اس آیت کی عبارت ایسی ہے کہ اس سے اضطراب اور گھبراہٹ کی طرف خاص طور پر اشارہ پایا جاتا ہے بعض مضامین الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتے لیکن وہ عبارت میں پنہاں ہوتے ہیں اور یہی حالت یہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرے بندے میری طرف دوڑتے ہیں۔ ان کے اندر ایک اضطراب اور عشق پیدا ہوتا ہے اور وہ چِلّاتے ہیں کہ ہمارا خدا کہاں ہے؟ تو تُو ان سے کہہ دے کہ میں تمہاری طرح کے پکارنے والے کی پکار کو کبھی ردّ نہیں کرتا بلکہ اُسے ضرور سنتا اور قبول کرتا ہوں۔ ایک دوسری جگہ قرآن کریم میں یہ مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

کہ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۷۰)۔یعنی وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی پوری کوشش کرتے ہیں ہمیں اپنی ذات ہی کی قسم ہے کہ ہم ضرور ان کو اپنے رستوں کی طرف آنے کی توفیق بخش دیتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مذہب اور علم کے آدمی کو اپنا رستہ دکھانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس کے لئے کوشش کرے۔ اور اس کی دُعا کو وہ ضرور سن لیتا ہے۔ باقی دعاؤں کی قبولیت میں وہ انسانی مصالح کو بھی مدِّنظر رکھتا ہے بعض دفعہ انسان جو چیز مانگتا ہے خدا تعالیٰ کے علم میں وہ اس کے لئے مہلک ہوتی ہے۔ پھر بعض دفعہ ملازمت ایک ہوتی ہے اور اسے مانگنے والے دو ہوتے ہیں اب ایک ملازمت دو کو تو نہیں مل سکتی وہ لازماً ایک ہی کو ملے گی۔ مگر وہ چیز جس کے بانٹنے کے باوجود اس میں کوئی کمی نہیں آسکتی وہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے باقی تمام اشیاء محدود ہیں۔ اگر ایک چیز کے دو مانگنے والے سامنے آجائیں تو وہ لازماً زیادہ حقدار کو دی جائے گی یا اگر وہ مضر ہو تو گو اس کا کوئی اور حقدار نہ ہو مگر پھر بھی وہ اپنے مومن بندہ کو نہیں دے گا۔ کیونکہ وہ دوست سے دشمنی کیونکر کر سکتا ہے اور کیسے ممکن ہے کہ جس چیز کے متعلق وہ جانتا ہے کہ آگ ہے وہ اپنے دوست کو دے دے؟ غرض سب دعاؤں کی قبولیت میں روکیں ہوتی ہیں مگر ایک دُعا ہے جس کے قبول ہونے میں کوئی روک نہیں اور جس کے لینے میں کوئی برائی نہیں۔ دنیا کی ہر چیز میں برائی ہوسکتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ (الماعون:۵) بعض نماز پڑھنے والوں کے لئے بھی ہلاکت ہے مگر خدا تعالیٰ کو مانگنے میں کوئی وَیل نہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ کسی سے اس لئے نہ ملے کہ وہ ہلاکت میں نہ پڑے یا اس لئے نہ ملے کہ خدا تعالیٰ کے وجود میں کمی نہ آجائے۔ جس طرح ہوا ہر ایک کے ناک میں جاتی ہے مگر اُس میں کمی نہیں ہوتی اسی طرح خدا تعالیٰ ہر بندہ کو مل سکتا ہے اور پھر بھی اس میں کمی نہیں ہوتی۔ سورج کی شعاعوں سے سب مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے۔ مگر ان میں کوئی کمی نہیں آتی چاند کی شعاعوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔ تم چاند کی روشنی میں گھنٹوں بیٹھ کر لطف اٹھاؤ مگر اس کا نور پھر بھی اُتنے کا اتنا ہی رہے گا۔ یہی حال خدا تعالیٰ کا ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ تو ان سے بھی کامل ہے۔ ان چیزوں میں بھی ممکن ہے کوئی خفیف سی کمی ہو جاتی ہو۔ مگر خدا تعالیٰ میں اتنی بھی نہیں ہوتی اسی لئے وہ اپنے بندوں سے کہتا ہے کہ تم میری طرف آؤ۔ پھر تم دیکھو گے کہ تم کس طرح تیزی سے قدم مارتے ہوئے اس راستہ پر چل پڑو گے جس سے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور باوجودیکہ وہ غیر مرئی ہے تم اس کو پالو گے اور اس کا وصال حاصل کر لو گے۔ درحقیقت اگر غور کیا جائے تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی روحانی ترقی اور بندوں اور خدا کے باہمی اتصال کے لئے تین تغیرات کا ذکر فرمایا ہے جن کے بغیر کوئی انسان خدا تعالیٰ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

سب سے پہلا تغیر جو کسی انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میں خدا تعالیٰ سے ملوں اور اس کا قرب حاصل کروں۔ مگر ظاہر ہے کہ صرف خواہش کا پیدا ہونا اسے خدا تعالیٰ کے دربار تک نہیں پہنچا سکتا بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ اسے کوئی ایسا ہادی اور رہنما میسر آئے جو اسے اس مقصد میں کامیابی کا طریق بتائے۔ اور اس کی مشکلات کو دُور کرے۔ اسلام اس فطری تقاضا کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ بیشک ان لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش تو پیدا ہو گئی ہے کہ انہیں خدا ملنا چاہیے لیکن اب دوسرا تغیر ان میں یہ بھی پیدا ہونا چاہیے کہ وہ تجھ سے پوچھیں یعنی ہدایت پانے اور خدا تعالیٰ کو تلاش کرنے کے لئے انہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف جانا چاہیے اور آپ سے اپنے محبوب حقیقی کا پتہ دریافت کرنا چاہیے جس طرح بیمار کی تندرستی کے لئے ایک تو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ سمجھ لے کہ وہ بیمار ہے اور دوسرے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس ڈاکٹر کے پاس جائے جو اعلیٰ درجہ کا تجربہ کار ہو۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کو پانے کے لئے بھی ضروری ہے کہ نہ صرف خدا تعالیٰ کو پانے کی سچی خواہش انسان کے دل میں پیدا ہو بلکہ وہ اس خواہش کے حصول کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء اختیار کرلے جو انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچانے والے ہیں۔

پھر تیسری بات جو قربِ الٰہی کے لئے ضروری ہے اور جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا سوال عَنِّیْ ہو۔ یعنی ان کی غرض محض خدا تعالیٰ کو پانا ہو۔ لوگ کئی اغراض کے ماتحت مذہب میں داخل ہوتے ہیں۔ بعض لوگ محض ایک جماعت میں منسلک ہونے کے لئے داخل ہوتے ہیں بعض اخلاقِ فاضلہ کے حصول کے لئے داخل ہوتے ہیں بعض معاشرت یا تمدّن کے خیال سے داخل ہوتے ہیں مگر فرمایا ان کا سچے مذہب میں داخل ہونا محض خدا تعالیٰ کے وصال اور اس کے قرب کے حصول کے لئے ہو۔ کوئی اور خواہش اس کے پیچھے کام نہ کر رہی ہو۔ ہاں اگر دوسرے فوائد ضمنی طور پر حاصل ہو جائیں تو اور بات ہے لیکن اصل غرض محض خدا تعالیٰ کا حصول ہونا چاہیے۔

پھر عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اِذَا کے بعد ف آتی ہے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ پہلے کام کے نتیجہ میں فلاں بات پیدا ہوئی۔ اس جگہ بھی اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کے یہ معنے ہیں کہ جب یہ تین باتیں جمع ہو جائیں۔ یعنی سوال کرنے والے سوال کریں کہ ہمیں خدا تعالیٰ کی ضرورت ہے۔ پھر تجھ سے سوال کریں فلاسفروں اور سائنس دانوں سے سوال نہ کریں۔ عیسیٰ یا موسیٰ سے سوال نہ کریں بلکہ تیرے پاس آئیں قرآن کے پاس آئیں یا تیرے خلفاء کے پاس آئیں اور پھر وہ میری ذات کے متعلق سوال کریں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں ان

کے قریب ہو جاتا ہوں اور انہیں اپنا چہرہ دکھا دیتا ہوں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب سورۃ قٓ میں جو کہ مکی سورۃ ہے خدا تعالیٰ یہ فرما چکا تھا کہ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (قٓ : ۱۷) ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں تو پھر سورۃ بقرہ میں جو مدنی سورۃ ہے یہ فرمانے کی کیا ضرورت تھی کہ جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے سوال کریں تو تُو اُن کو یہ جواب دے دے کہ مَیں قریب ہوں؟ جب مکی آیت کے ذریعہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ خدا تعالیٰ بہت ہی قریب ہے تو پھر یہ سوال ہی کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس آیت کے نازل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور اگر کوئی سوال کرتا بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے یہ فرما سکتے تھے کہ خدا تعالیٰ تو بتا چکا ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ لیکن قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور خدا تعالیٰ کا کلام بلا ضرورت نہیں ہوا کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں خدا تعالیٰ کا سوال بیان کرنا اور پھر اس کا جواب دینا کوئی اَور حکمت رکھتا ہے۔ اور یہاں جو قریب کا لفظ استعمال ہوا ہے اُس سے وہ قرب اور بُعد مراد نہیں جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق تو اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ اگر یہاں بھی یہی مراد ہوتی تو پھر یہ کیوں فرماتا کہ جب لوگ تجھ سے میرے متعلق سوال کریں تو یہ جواب دیجیؤ۔ پس معلوم ہوا کہ اس کے جواب میں جو قریب کہا گیا ہے وہ بھی کوئی اَور معنے رکھتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان دونوں آیتوں میں خدا تعالیٰ نے ایک عجیب فرق رکھا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرب اور بُعد ہمیشہ نسبت کے ساتھ ہوتا ہے ایک چیز ہمارے قریب ہوتی ہے مگر وہی دوسرے سے بعید ہوتی ہے۔ پس قریب اور بعید ایک نسبتی چیز ہے۔ جب ہم ایک چیز کو قریب کہتے ہیں تو ایک نسبت سے کہتے ہیں حالانکہ دوسری نسبت سے وہی چیز بعید ترین ہو سکتی ہے۔ سورۂ قٓ میں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ کہ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم اس کے دل میں جو وسوسہ ہوتا ہے اس کو بھی جانتے ہیں اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہیں۔ تو اس میں اِلَيْهِ کی نسبت سے اَقْرَبُ فرمایا ہے۔ لیکن آیت وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ میں قَرِيْبٌ کا لفظ کسی نسبت سے نہیں فرمایا۔ بلکہ بلا نسبت فرمایا ہے اور اس کی کوئی حد بندی نہیں کی۔ اس عدمِ حد بندی میں ایک لطیف نکتہ ہے اور وہ یہ کہ انسان جو اپنی ضرورت خدا تعالیٰ کے حضور پیش کرتا ہے وہ مختلف اوقات میں مختلف اشیاء کے متعلق ہوتی ہے کبھی تو وہ انسانوں کے متعلق ہوتی ہے اور کبھی حیوانوں کے متعلق۔ کبھی جانداروں کے متعلق ہوتی ہے اور کبھی بے جانوں کے متعلق۔ کبھی

خدا تعالیٰ کے متعلق ہوتی ہے اور کبھی ملائکہ کے متعلق۔ کبھی اس دنیا کے متعلق ہوتی ہے اور کبھی اگلے جہان کے متعلق۔ کبھی اس زمین پر رہنے والی چیزوں کے متعلق ہوتی ہے اور کبھی آسمان کی چیزوں کے متعلق۔ غرض انسان کی مختلف احتیاجیں ہیں اور ایسی وسیع ہیں کہ جن کی کوئی حد بندی نہیں ہوسکتی۔ لیکن انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جب اسے کسی چیز کی طلب ہوتی ہے تو اس کے حاصل کرنے کے متعلق وہ کوئی ایسا ذریعہ تلاش کرتا ہے جو قریب ہو پھر قریب کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ایک یہ بھی قریب ہے کہ کوئی ذریعہ جلدی سے میسّر آ جائے۔ چنانچہ ہر انسان اپنا مدّعا حاصل کرنے کے لئے جو ذریعہ قریب دیکھتا ہے اس کو لے لیتا ہے اور بعید کو چھوڑ دیتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ قریب ایک اور رنگ میں بھی ہوتا ہے یعنی وہ ذریعہ جو مدّعا اور منزل مقصود کے قریب تر پہنچا دے انسان اس ذریعہ کو اختیار کرتا ہے اور دوسروں کو چھوڑ دیتا ہے۔ غرض بہت سے قرب ہیں جن کا کسی چیز میں پایا جانا ہر انسان دیکھتا ہے اور جب وہ سارے قرب کسی میں پالیتا ہے تو اس کو اپنے مدّعا کے حصول کے لئے چُن لیتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کہ انسان اپنے مختلف مقاصد کے لئے کوشش کرتا ہے اور ان کے لئے دیکھتا ہے کہ کونسا ذریعہ اختیار کروں جس سے جلد کامیاب ہو جاؤں۔ جب انسان ذرائع کو سوچتے سوچتے یہاں تک پہنچے کہ مَیں دُعا کروں تو اس کو کہہ دو کہ اللہ قریب ہے۔ قَرِیْبٌ اِلَیْهِ نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نہ صرف اس انسان کے قریب ہے بلکہ ہر ایک چیز کے قریب ہے اور وہ مدعا حاصل کرنے کا سب سے قریب ترین ذریعہ ہے۔ یوں قریب ہونا اَور بات ہے لیکن جس مقصد کو حاصل کرنا ہو اس کے قریب کر دینا اور بات ہے۔ غرض خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہارے بھی قریب ہوں اور وہ مقصد جسے تم حاصل کرنا چاہتے ہو اس کے بھی قریب ہوں گویا اس آیت میں قربِ مکان کا ذکر نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ حصولِ مدّعا کے لئے جتنے قربوں کی ضرورت ہے وہ سب خدا تعالیٰ میں موجود ہیں مثلاً ایک شخص ولایت میں بیٹھا ہوا روپیہ کا محتاج ہے وہ وہاں سے ہمیں مدد کے لئے لکھتا ہے۔ اگر ہم اُسے روپیہ بھیجیں تو کئی دنوں کے بعد اُسے ملے گا لیکن اگر ہم اس کے لئے دُعا کریں تو ممکن ہے کہ ادھر ہمارے منہ سے اس کے لئے دعا نکلے اور ادھر اللہ تعالیٰ اس کا کوئی انتظام کر دے۔ تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں قریب ہوں اگر کوئی مدد حاصل کرنا چاہتے ہو تو مجھ سے کہو۔ اور خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے کے لئے نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت ہے نہ پاؤں سے چلنے کی۔ دل ہی دل میں انسان حاضر ہوسکتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں قریب ہوں۔ پھر وہ انسان ہی کے قریب نہیں بلکہ جس مدّعا اور مقصد کو حاصل کرنا ہو اس کے بھی قریب ہے۔ ادھر انسان یہ کہتا ہے کہ الٰہی فلاں چیز مجھے مل جائے اور ادھر وہ چیز خواہ لاکھوں میل کے فاصلہ پر ہو خدا تعالیٰ اس پر اسی

وقت قبضہ کر لیتا ہے کہ یہ ہمارے فلاں بندہ کے لئے ہے۔ کیونکہ جس طرح خدا تعالیٰ اس بندہ کے قریب ہے اسی طرح اس چیز کے بھی قریب ہے۔ غرض کامیابی کے حصول کے لئے یہ ذریعہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مفید ہے۔

پھر اِنِّیْ قَرِیْبٌ کہہ کر ایک اور لطیف مضمون کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اور وہ یہ کہ اگر میں تمہیں نظر نہیں آتا تو یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تم سے دور ہوں میں تو تمہارے بالکل قریب ہوں اور اسی وجہ سے تمہیں نظر نہیں آتا۔ کیونکہ صرف وہی چیز تمہیں نظر نہیں آتی جو زیادہ دور ہو بلکہ وہ چیز بھی نظر نہیں آتی جو زیادہ قریب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے اندر کی آواز کو نہیں سن سکتا کانشنس اور ضمیر کی آواز آتی ہے مگر کان اسے نہیں سن سکتے۔ اس لئے کہ آواز بھی دور کی سنائی دیتی ہے جب ہم کوئی آواز سنتے ہیں تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ یہ آواز باہر سے ہو کر آئی ہے۔ کیونکہ کان کا پردہ قدرتی طور پر اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہوا کا زور کان کے پردہ پر پڑتا ہے تو اس سے ایک حرکت پیدا ہوتی ہے ارتعاش کی لہریں یعنی وائی بریشنز (Vibration) پیدا ہوتی ہیں اور یہی وائی بریشنز دماغ میں جاتی ہیں اور دماغ ان کو الفاظ میں بدل ڈالتا ہے یہی وائی بریشن ہیں جو ریڈیو کے والوز میں پڑتی ہیں اور ریڈیو ان کو الفاظ میں بدل ڈالتا ہے۔ انسانی بناوٹ میں ریڈیو کان ہے اور اعصاب دماغی والوز ہیں۔ ان کے ذریعہ جو حرکات دماغ میں منتقل ہوتی ہیں وہ وہاں سے آواز بن کر سُنائی دیتی ہیں۔ پس آواز کے معنے ہی باہر والی چیز کے ہوتے ہیں۔ جب آواز آتی ہے تو اس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ یہ باہر سے آئی ہے کیونکہ آواز آ ہی باہر سے سکتی ہے۔ اندرونی آواز جو سنائی دیتی ہے۔ مثلاً پیٹ میں گُڑگُڑ کی آواز آتی ہے تو دراصل اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ وائی بریشن باہر اثر ڈالتی ہیں اور ہم وہ آواز سن لیتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ جو اندر کی آواز ہوتی ہے اسے تم نہیں سن سکتے۔ کیونکہ وہ تمہارے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ غرض جس طرح تم بہت بعید کی چیز کو نہیں دیکھ سکتے اور بہت قریب کی چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح تم بعید کی آواز کو بھی نہیں سن سکتے اور قریب کی آواز کو بھی نہیں سن سکتے جن لوگوں کو اس کا علم نہیں وہ اس پر تعجب کریں تو کریں ورنہ یہ سب کچھ حرکات پر مبنی ہوتا ہے۔ جو کچھ تم سنتے ہو وہ بھی حرکات ہیں جن کو کان آواز میں بدل ڈالتے ہیں اور جو کچھ تم دیکھتے ہو وہ بھی حرکات ہیں جن کو آنکھیں شکل میں تبدیل کر ڈالتی ہیں جو چیز تمہارے سامنے گڑی ہوتی ہے وہ تصویر نہیں ہوتی بلکہ وہ فیچرز (Features) یعنی نقش ہوتے ہیں جو آنکھوں کے ذریعہ دماغ میں جاتے ہیں اور وہ انہیں تصویر میں بدل ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل ریڈیو سیٹ کے ذریعہ تصویریں بھی باہر جانے لگ پڑی ہیں۔ ان حرکات کے متعلق قاعدہ ہے کہ تمام حرکات خواہ وہ کان کی ہوں یا آنکھ کی ایک حد بندی

کے اندر ہوتی ہیں یعنی ایک درجہ ان کا اعلیٰ ہوتا ہے اور ایک ادنیٰ ہوتا ہے ان دونوں کے درمیان جو چیز ہوتی ہے اسے آنکھ دیکھ سکتی ہے اور جو چیز اس حد بندی سے دور ہو اسے آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور جو اس حد بندی کے نیچے ہو اس کو بھی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح جو آواز اس حد بندی کے اندر ہوگی اسے کان سن لے گا اور جو آواز اس حد بندی سے دور ہوگی اسے کان نہیں سن سکے گا۔ اور جو آواز اس حد بندی سے نیچے ہو اسے بھی کان نہیں سن سکتا۔

جوّ میں بہت سی آوازیں پیدا ہوتی رہتی ہیں جیسے بادلوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز یا اجرام فلکی کے آپس میں ٹکرانے کی آواز لیکن وہ اتنی شدید ہوتی ہیں کہ ہم ان کی شدت کی وجہ سے انہیں نہیں سن سکتے۔ جس طرح کان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ ایسی آواز سن سکے جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ یا وہ ایسی آواز سن سکے جو اس کی طاقت سے کم ہو اسی طرح جو نظارہ آنکھ کی طاقت سے زیادہ ہو وہ آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور جو نظارہ اس کی طاقت سے کم ہو وہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ پس اِنِّیْ قَرِیْبٌ کہہ کر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مجھ کو نہ دیکھنے کی یہ وجہ نہیں کہ میں تم سے دور ہوں میں تم سے دور نہیں بلکہ تمہارے اتنا قریب ہوں کہ تم مجھے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے دیکھ بھی نہیں سکتے اور نہ تم میری آواز سن سکتے ہو۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہی نہیں تو پھر وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کہنے کا کیا مطلب ہوا؟ کیونکہ انسان پوچھتا تو اس کے متعلق ہے جو اُسے نظر آتا ہو۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ کبھی سوال مبہم بھی ہوتا ہے۔ جیسے رات کو کوئی شخص سفر پر جا رہا ہو اور اسے خطرہ محسوس ہو تو وہ آواز دیتا ہے کہ کوئی ہے؟ اب اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اسے کوئی انسان نظر آ رہا ہوتا ہے بلکہ وہ اس خیال سے آواز دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص وہاں ہو تو آئے اور اس کی مدد کرے اور جنگل میں تنہائی اور اندھیرے کی وجہ سے جو گھبراہٹ اس پر طاری ہے وہ دور ہو جائے۔ اسی طرح اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب دنیا میں انسان تنہائی محسوس کرے اور سمجھے کہ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت ہے اور خدا تعالیٰ جو غیر مرئی ہے اس کے متعلق وہ کہے کہ اگر کوئی خدا ہے تو آئے اور میری مدد کرے تو خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ تم میرے اُس بندے کو بتا دو کہ میں موجود ہوں اور پھر زیادہ دور بھی نہیں بلکہ میں تمہارے قریب ہی ہوں۔ دُنیا میں پاس رہنے والا شخص بھی بعض اوقات مدد نہیں کرتا۔ بعض دفعہ تو وہ مدد کا ارادہ ہی نہیں کرتا اور کہتا ہے مرتا ہے تو مرے مجھے اس کی مدد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور بعض اوقات وہ اپنے اندر زیادتی کرنے والے کے خلاف مدد کرنے کی طاقت نہیں پاتا۔ جیسے کوئی شیر گاؤں میں آ جائے اور کسی پر حملہ آور ہو تو دوسرے لوگ بجائے اس کی مدد کرنے کے بھاگ جاتے ہیں لیکن یہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی بندہ گھبرا کر آواز

دے اور کہے کہ کوئی ہے؟ تو وہاں خدا موجود ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے بندے نے اگر چہ مبہم طور پر آواز دی ہے کہ شاید کوئی موجود ہو تو وہ بول پڑے لیکن میں اس کی مبہم پکار کو بھی اپنی طرف منسوب کر لیتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے ہی بُلا رہا ہے۔ میں بھول جاتا ہوں کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے خیالی طور پر کہہ رہا ہے۔ میں اس وقت اگر مگر کو چھوڑ دیتا ہوں اور فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑتا ہوں۔ اس لئے اگر کوئی میرے متعلق سوال کرے تو اُسے بتا دو کہ میں قریب ہی ہوں، دور نہیں۔ بے شک دنیا میں بعض دفعہ کوئی دوسرا شخص قریب بھی ہوتا ہے تو پھر بھی وہ مدد کرنے کا ارادہ نہیں کرتا۔ یا اس کی مدد کی طاقت نہیں رکھتا لیکن میں تو یہ ارادہ کر کے بیٹھا ہوں کہ اس کی مدد کروں گا۔ اور پھر میرے اندر اس کی مدد کرنے کی طاقت بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ صرف مسلمانوں ہی کی دعائیں نہیں سنتا بلکہ خواہ کوئی ہندو ہو یا عیسائی، سکھ ہو یا آریہ اگر وہ خدا تعالیٰ کے حضور سچے دل سے گڑ گڑائے اور اپنی حالت زار پیش کر کے اس کی مدد چاہے تو خدا تعالیٰ اس کی دُعا کو سنتا اور اسے قبول کرتا ہے۔ بے شک وہ ایک سچے مسلمان کی دُعائیں دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ قبول کرتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ اس نے اپنی رحمت کا دروازہ دنیا کی باقی قوموں اور افراد کے لئے بند کر رکھا ہے بلکہ ہر شخص جو اس کے دروازہ پر جاتا ہے اور اس کے حضور گر جاتا ہے خدا تعالیٰ اس پر رحم کرتا اور اس کی حاجات کو پورا فرماتا ہے وہ واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ جب کوئی پکارنے والا اپنی مدد کے لئے مجھے آواز دیتا ہے تو میں اس کی پکار کا ضرور جواب دیتا ہوں اور اسے اپنی بارگاہ سے کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا۔

پھر فرماتا ہے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ۔ جب میں تمہاری باتیں سنتا ہوں اور تمہاری دُعائیں قبول کرتا ہوں تو تمہیں بھی ایسا بن جانا چاہیے کہ تمہاری دُعائیں قبول ہوں۔ یہ مت خیال کرو کہ میں ہر ایک دُعا کو سنتا ہوں۔ میرے احکام کے خلاف جو دُعائیں ہوں گی یا میرے مقرر کردہ فرائض کے خلاف ہوں گی یا اخلاقی نظام کے خلاف ہوں گی میں انہیں کیسے سن سکتا ہوں۔ کیا میں انہیں قبول کر کے اپنے رسول کو ہلاک کر دوں۔ یا کیا میں انہیں قبول کر کے اخلاقی نظام کو توڑ ڈالوں؟ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری دُعائیں بھی سنی جائیں تو چاہیے کہ تمہاری دُعا میرے نظام کے خلاف نہ ہو۔ تمہاری دُعا دین کے خلاف نہ ہو۔ تمہاری دُعا اخلاقی نظام کے خلاف نہ ہو۔

کہتے ہیں ایک عرب حج کے لئے گیا تو وہ خانہ کعبہ میں کھڑے ہو کہ ایک دُعا کر رہا تھا اور وہ ایسی گندی تھی کہ اُسے سن کر پولیس نے اس کو قید کر لیا۔ وہ دُعا یہ کر رہا تھا کہ اے خدا! تو ایسا کر کہ میری محبوبہ کا خاوند اس سے ناراض ہو جائے اور وہ مجھے مل جائے۔ گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ بھی اس کی بدکاری میں شریک ہو جائے۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک چور نے بیان کیا کہ میں جب سیندھ لگانے لگتا ہوں تو دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں تا کہ چوری سے پہلے اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کر لوں اور مجھے اس کام میں کامیابی حاصل ہو۔ اخبارات میں عموماً اشتہارات چھپتے رہتے ہیں کہ ایسے تعویذ ہیں جن کو پاس رکھنے سے تم جس عورت کو چاہو بلا سکتے ہو۔ اس تعویذ کے اثر سے وہ عورت خود بخود تمہارے پاس آ جائے گی۔ اور پھر کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ ہے اسے خدا تعالیٰ کا کلام آتا ہے۔ اس نے یہ تعویذ تیار کئے ہیں۔ یہ دین کے ساتھ تمسخر ہے۔ خدا تعالیٰ بدکاریوں میں کبھی شریک نہیں ہوتا۔ کہنے والے بیشک ایسا کہتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ۔ اگر میں نے کہا ہے کہ میں پکارنے والے کی پکار کو سُنتا ہوں تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں ہر ایک پکار کو سن لیتا ہوں جس پکار کو میں سُنتا ہوں اس کے لئے دو شرطیں ہیں۔ اول میں اس کی پکار کو سنتا ہوں جو میری بھی سنے (۲) میں اس کی پکار سنتا ہوں جسے مجھ پر یقین ہو مجھ پر بدظنّی نہ ہو۔ اگر دعا کرنے والے کو میری طاقتوں اور قوتوں پر یقین ہی نہیں تو میں اس کی پکار کو کیوں سنوں؟ پس قبولیت دعا کے لئے دو شرطیں ہیں جس دعا میں یہ دو شرطیں پائی جائیں گی وہی قبول ہوگی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں اَلدَّاعِ فرمایا ہے جس کے معنے ہیں ایک خاص دعا کرنے والا۔ اور اس کے آگے وہ شرائط بتا دیں۔ جو اَلدَّاعِ میں پائی جاتی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ وہ میری سُنے اور مجھ پر یقین رکھے۔ یعنی وہ دُعا میرے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق ہو۔ جائز ہو ناجائز نہ ہو۔ اخلاق کے مطابق ہو۔ سنت کے مطابق ہو۔ اگر کوئی شخص ایسی دعائیں کرے گا تو میں بھی اس کی دعاؤں کو سنوں گا۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ اے اللہ! میرا فلاں عزیز مر گیا ہے تو اُسے زندہ کر دے تو یہ دعا قرآن کے خلاف ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جب اس نے قرآن کی ہی نہیں مانی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہیں مانی تو خدا اس کی بات کیوں مان لے؟ پس فَلْيَسْتَجِيْبُوا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تمہیں چاہیے کہ تم میری باتیں مانو اور مجھ پر یقین رکھو اگر تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے تو میں تمہاری دُعا کیسے سُن سکتا ہوں؟ پس قبولیت دُعا کے لئے دو شرطیں ہیں۔ اول فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ تم میری باتیں مانو (۲) وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ اور مجھ پر یقین رکھو۔ جو لوگ ان شرائط کو پورا نہیں کرتے وہ دین دار نہیں۔ وہ میرے احکام پر نہیں چلتے اس لئے میں بھی یہ وعدہ نہیں کرتا کہ میں ان کی ہر دُعا سُنوں گا۔ بیشک میں ان کی دُعاؤں کو بھی سنتا ہوں مگر اس قانون کے ماتحت ان کی ہر دعا کو نہیں سنتا۔ لیکن جو شخص اس قانون پر چلتا ہے اور پھر دعائیں بھی کرتا ہے میں اس کی ہر دعا کو سنتا ہوں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ بازار میں چند بنیئے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ کیا کوئی ایک پاؤ تِل کھا سکتا ہے؟ وہ ایک پاؤ تِل کھانا بہت بڑا کام سمجھتے تھے ان

میں سے ایک نے کہا جو ایک پاؤ تل کھالے اس کو میں پانچ روپے انعام دوں گا۔ پاس سے ایک زمیندار گذر رہا تھا اس نے جب سُنا کہ پاؤ تل کھانے پر شرط لگی ہوئی ہے تو اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی اس نے خیال کیا کہ بھلا ایک پاؤ تل کھانا کون سی بڑی بات ہے جس پر انعام دیا جائے۔ ضرور اس کے ساتھ کوئی اور شرط ہوگی۔ وہ آگے بڑھا اور پوچھا شاہ جی! ’’تل سلیاں سمیت کھانے نے کہ بغیر سلیاں دے۔‘‘ یعنی چھلیوں سمیت تلِ کھانے ہیں یا الگ کئے ہوئے بیج کھانے ہیں۔ اس زمیندار کے نزدیک تو پاؤ تلِ کھانا کوئی چیز نہ تھی لیکن وہ سب بنئے تھے جو آدھا چھلکا کھانے کے عادی تھے۔ جب اس نے یہ کہا کہ شاہ جی کیا تل چھلیوں سمیت کھانے ہیں تو اس بنئے نے کہا چوہدری صاحب! آپ جایئے ہم تو آدمیوں کی باتیں کرتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ جہاں یہ کہتا ہے کہ میں پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں وہاں بھی وہ آدمیوں کا ہی ذکر کرتا ہے۔ جانوروں کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ ہر پکارنے والے کی پکار کو نہیں سنتا۔ وہ صرف اس شخص کی پکار کو سنتا ہے جسے یہ احساس ہو کہ اللہ تعالیٰ پر ہی سب ذمہ داری نہیں بلکہ مجھ پر بھی کچھ ذمہ داری ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ اے خدا! فلاں کی لڑکی مجھے اُدھال کر لا دے یا فلاں کا مال مجھے دے دے یا میرے فلاں شخص کی جان نکال دے تو خدا تعالیٰ اپنے آپ کو ان دُعاؤں کا مخاطب نہیں سمجھتا پس فرمایا فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ میں ہر اس دعا کو سنتا ہوں جس کا کرنے والا پورے طور پر میرے احکام پر عمل کرے اور پھر اُسے مجھ پر پورا یقین بھی ہو اور جو ایسا کرتے ہیں وہ غلط دُعائیں مانگتے ہی نہیں کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ ایسی دُعائیں مانگتے تھے کہ اے خدا! فلاں کا مال ظالمانہ طور پر ہمیں دے دے؟ پس خدا تعالیٰ بھی یہاں انسانوں کا ذکر کرتا ہے حیوانوں کا نہیں اور فرماتا ہے کہ میں دُعائیں سنتا ہوں لیکن اس کے لئے دو شرطیں ہیں۔ اوّل دُعا کرنے والا پورے طور پر میرے احکام پر عمل کرے۔ دوم۔ اسے مجھ پر یقین بھی ہو۔ جب اسے مجھ پر یقین ہوگا تو اس کا اعتماد بھی دعا کی قبولیت کے لئے اکسائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ سب سے زیادہ کس کے لئے دُعائیں کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا میں سب سے زیادہ اس شخص کے لئے دعا کرتا ہوں جو مجھے آکر کہے کہ میرے لئے کوئی دعا کرنے والا نہیں آپ میرے لئے دعا کریں۔ جب وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے حالانکہ وہ میرا واقف بھی نہیں ہوتا تو میں اس پر اعتماد کیوں نہ کروں۔ پس فرمایا وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ جو مجھ پر یقین رکھتا ہے اور میرے منشا کے مطابق دُعا کرتا ہے میں اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ لیکن جسے یقین نہ ہو اور وہ میرے منشاء کے مطابق دعا نہ کرتا ہو تو اس کی دعا قبول نہیں ہوسکتی۔ اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے کہ لَا يَزَالُ يُسْتَجَابُ

لِلْعَبْدِ مَالَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ مَالَمْ يَسْتَعْجِلْ۔ قِيْلَ! يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِسْتِعْجَالُ؟ قَالَ يَقُوْلُ: قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ أَرَ يَسْتَجِيْبُ لِيْ فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذَالِكَ وَيَدْعُ الدُّعَاءَ (مسلم کتاب الذکر و الدعاء باب بیان انه یستجاب للداعی مالم یعجل...) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے جب تک کہ وہ قطع رحم اور گناہ کے متعلق نہ ہوں۔ مگر اس صورت میں نہیں کہ وہ جلدی کرے۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! جلدی سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا وہ یہ کہنے لگتا ہے کہ میں نے بڑی دُعا کی مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری دُعا قبول نہیں ہوئی۔ پھر وہ دُعا سے تھک جاتا ہے اور دُعا چھوڑ بیٹھتا ہے۔ غرض دُعا کی قبولیت کے لئے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور یقین رکھے اور مایوسی اس کے قریب بھی نہ پھٹکے۔

پھر فرماتا ہے لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔ اس کے نتیجہ میں یقیناً وہ کامیاب ہوں گے۔ رشد کے معنے ہوتے ہیں رستہ دکھائی دینا۔ پس لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ کے معنے یہ ہیں کہ انہیں وہ رستہ مل جائے گا جو انہیں کامیابی تک پہنچا دے گا۔ (اقرب) لَعَلَّ کے معنے عام طور پر شاید کے ہوتے ہیں لیکن اس جگہ اس کے معنے شاید کے نہیں۔ یہاں یہ لفظ کلام الملوک کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہمارا شاید بھی یقینی ہوتا ہے۔ چنانچہ بالعموم حکام کہہ دیتے ہیں کہ اگر تم درخواست کرو تو حکومت غور کرے گی۔ لفظ شک کے ہوتے ہیں۔ لیکن دراصل وعدہ ہوتا ہے کہ ہم ضرور ایسا کر دیں گے۔ لغت والے بھی لکھتے ہیں کہ جب لَعَلَّ کا لفظ خدا تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس وقت اس کے معنے یقین کے ہوتے ہیں۔ (مفردات راغب) پس لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ کے یہ معنے ہیں کہ ابھی تک تو مجھے ان تک آنا پڑتا ہے مگر جب وہ یہ مقام حاصل کر لیں گے تو پھر ان کے اندر یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ وہ خود مجھ تک آسکیں گے۔ چنانچہ پہلے اِنِّيْ قَرِيْبٌ کہہ کر بتایا تھا کہ میں ان کے پاس آتا ہوں مگر يَرْشُدُوْنَ کہہ کر بتایا کہ بندہ میں ترقی کرتے کرتے ایک قسم کی الوہیت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے پہلے اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے نابینا آدمی کے پاس اس کا دوست بیٹھا رہے۔ مگر پھر یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جیسے بینا کے سامنے اس کا محبوب بیٹھا ہو۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عبادت کرتے وقت ہر انسان کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ یا کم سے کم وہ یہ سمجھے کہ خدا مجھ کو دیکھ رہا ہے (بخاری کتاب الایمان باب سؤال جبریل النبی عن الایمان۔۔۔)۔ اب خدا تعالیٰ کے دیکھنے کے یہی معنے ہیں کہ وہ اس کے قریب ہو جاتا ہے ورنہ دیکھ تو وہ عرش سے بھی رہا ہے درحقیقت اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندہ کے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ انسان یہ یقین کرنے لگ جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے بلکہ اس سے ترقی کر کے وہ اس مقام کو بھی حاصل کر

لیتا ہے جس میں وہ خود بھی خدا تعالیٰ کو دیکھنے لگ جاتا ہے اور اعلیٰ درجہ کے کمالات روحانیہ تک پہنچ جاتا ہے۔

چونکہ اس آیت سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی روزوں کا ذکر ہے اس لئے اس آیت کے ذریعہ مومنوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یوں تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہی اپنے بندوں کی دُعائیں سُنتا اور ان کی حاجات کو پورا فرماتا ہے لیکن رمضان المبارک کے ایام قبولیت دُعا کے لئے مخصوص ہیں۔ اس لئے تم ان دنوں سے فائدہ اُٹھاؤ اور خدا تعالیٰ کے قریب ہونے کی کوشش کرو۔ ورنہ اگر رمضان کے مہینہ میں بھی تم خالی ہاتھ رہے تو تمہاری بدقسمتی میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

دنیا میں ہر کام اپنے وقت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اگر اس وقت وہ کام کیا جائے تو جیسے اعلیٰ درجہ کے نتائج اس وقت مرتّب ہوتے ہیں وہ دوسرے وقت میں نہیں ہوتے۔ تمام غلّے اور ترکاریاں بونے کا ایک خاص وقت ہوتا ہے اگر اس وقت کو مدنظر نہ رکھا جائے تو کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ وقت جادو یا ٹونے کی طرح نہیں ہوتا کہ اس کے آنے سے کوئی خاص اثر پیدا ہوجاتا ہے اس لئے وہ کام ہوجاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جس وقت کسی کامیابی کے سامان مہیا ہوجاتے ہیں تو وہی اس کے کرنے کا وقت ہوتا ہے اگر گیہوں کا دانہ ایک خاص وقت میں بونے سے اُگتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت اس میں کوئی خاص بات پیدا ہوجاتی ہے بلکہ اس کے اُگنے کے لئے جو سامان ضروری ہوتے ہیں وہ اس وقت مہیا ہوجاتے ہیں اگر وہی سامان کسی دوسرے وقت مہیا ہوسکیں تو اس وقت بھی وہ ضرور اُگ آئے گا۔ تو تمام کاموں کے لئے ضروری سامان مہیا ہونے کا ایک وقت مقرر ہے۔ اسی طرح دُعا کے لئے بھی وقت مقرر ہیں ان وقتوں میں کی ہوئی دُعا بھی بہت بڑے نتائج پیدا کرتی ہے۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **اِتَّقُوْا دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ** (مسند احمد بن حنبل مسند المکثرین من الصحابة مسند انس بن مالک ؓ)۔ مظلوم کی بددعا سے ڈرو کیونکہ جب وہ ہر طرف مصائب ہی مصائب دیکھتا اور خدا تعالیٰ کے سوا کوئی سہارا نہیں پاتا تو اس کی تمام تر توجہ خدا تعالیٰ کی طرف پھر جاتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے آگے گر پڑتا ہے اور اس وقت وہ جو بھی دعا کرتا ہے قبول ہوجاتی ہے کیونکہ دعا کے قبول ہونے کے سامانوں میں سے ایک اعلیٰ درجہ کا سامان یہ بھی ہے کہ انسان کی ساری توجہ ہر طرف سے ہٹ کر خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہوجائے۔ چونکہ مظلوم کی یہی حالت ہوتی ہے اس لئے اس کے لئے بھی یہ ایک موقع پیدا ہوجاتا ہے۔

اسی طرح دُعا کے قبول ہونے کے اوقات بھی ہیں۔ لیکن وہ ظاہری سامانوں کی حد بندیوں کے نیچے نہیں ہوتے بلکہ وہ انسانی قلوب کی خاص حالتوں اور کیفیات سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں وہی انسان محسوس کرسکتا ہے جس پر وہ حالت وارد ہو۔ مگر دُعا کی قبولیت کا ایک اور وقت بھی ہے جس کے معلوم کرنے کے لئے باریک قلبی کیفیات سے

واقف ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ وقت رمضان کا مہینہ ہے۔ یہ آیت خدا تعالیٰ نے روزوں کے ساتھ بیان کی ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ اس کا روزوں سے بہت گہرا تعلق ہے اور اس کے روزوں کے ساتھ بیان کرنے کی وجہ یہی ہے کہ جس طرح مظلوم کی ساری توجہ محدود ہو کر ایک ہی طرف یعنی خدا تعالیٰ کی طرف لگ جاتی ہے اسی طرح ماہِ رمضان میں مسلمانوں کی توجہ خدا تعالیٰ کی طرف ہو جاتی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ جب کوئی پھیلی ہوئی چیز محدود ہو جائے تو اس کا زور بہت بڑھ جاتا ہے جیسے دریا کا پاٹ جہاں تنگ ہوتا ہے وہاں پانی کا بڑا زور ہوتا ہے اسی طرح رمضان کے مہینہ میں وہ اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو دعا کی قبولیت کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس مہینہ میں مسلمانوں میں ایک بہت بڑی جماعت ایسی ہوتی ہے جو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔ پھر سحری کے لئے سب کو اُٹھنا پڑتا ہے اور اس طرح ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عبادت کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اس وقت لاکھوں انسانوں کی دُعائیں جب خدا تعالیٰ کے حضور پہنچتی ہیں تو خدا تعالیٰ ان کو رد نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں قبول فرماتا ہے۔ اس وقت مومنوں کی جماعت ایک کرب کی حالت میں ہوتی ہے پھر کس طرح ممکن ہے کہ ان کی دُعا قبول نہ ہو؟ درد اور کرب کی حالت کی دعا ضرور سنی جاتی ہے جیسے یونسؑ کی قوم کی حالت کو دیکھ کر خدا تعالیٰ نے ان کو بخش دیا اور ان سے عذاب ٹل گیا اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ سب اکٹھے ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور جھک گئے تھے۔ (یونس: ۱۹)

پس رمضان کا مہینہ دُعاؤں کی قبولیت کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتا ہے یہی وہ مہینہ ہے جس میں دُعا کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قَرِيْبٌ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اگر وہ قریب ہونے پر بھی نہ مل سکے تو اور کب مل سکے گا؟ جب بندہ اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیتا ہے اور اپنے عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ اب وہ خدا تعالیٰ کا در چھوڑ کر اور کہیں نہیں جائے گا تو اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں اور اِنِّيْ قَرِيْبٌ کی آواز خود اس کے کانوں میں بھی آنے لگتی ہے جس کے معنے سوائے اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے؟ اور جب کوئی بندہ اس مقام تک پہنچ جائے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے خدا کو پا لیا۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ

تمہیں روزہ رکھنے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ وہ تمہارے لئے ایک (قسم کا)

لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

لباس ہیں اور تم ان کے لئے (ایک قسم کا) لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفسوں

كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ

کی حق تلفی کرتے تھے اس لئے اس نے تم پر فضل سے توجہ کی اور تمہاری (اس حالت کی) اصلاح کردی۔

فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَ كُلُوْا وَ

سو اب تم (بلا تأمل) ان کے پاس جاؤ اور جو کچھ اللہ (تعالیٰ) نے تمہارے لئے مقدر کیا ہے اس کی جستجو کرو۔ اور کھاؤ

اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

اور پیؤ۔ یہاں تک کہ تمہیں صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔

الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا

اس کے بعد (صبح سے) رات تک روزوں کی تکمیل کرو۔ اور جب

تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ

تم مساجد میں معتکف ہو تو ان کے (یعنی عورتوں کے) پاس نہ جاؤ۔ یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں

حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ

اس لئے تم ان کے قریب (بھی) مت جاؤ۔ اللہ (تعالیٰ) اسی طرح لوگوں کے لئے اپنے نشانات بیان کرتا ہے

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

تاکہ وہ (ہلاکتوں سے) بچیں۔

حلّ لُغات۔ رَفَثٌ اَلرَّفَثُ كَلَامٌ مُتَضَمِّنٌ لِمَا يُسْتَقْبَحُ ذِكْرُهٗ مِنْ ذِكْرِ الْجِمَاعِ وَدَوَاعِيْهِ وَجُعِلَ كِنَايَةً عَنِ الْجِمَاعِ۔

یعنی رَفَثَ کا لفظ جماع اور اس کے محرکات کے لئے کنایۃً استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات)

لِبَاسٌ لَّكُمْ لِبَاسٌ کے معنے اصل میں سِتْرٌ کے ہیں یعنی ڈھانپنے والی چیز۔ مگر قرآن کریم نے اس کے اور

معنے بھی بتائے ہیں۔ چنانچہ سورہ اعراف میں لباس کے دو کام بتائے گئے ہیں فرماتا ہے یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا (الاعراف: ۲۷) یعنی اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس نازل کیا ہے جو تمہارے ننگ کو ڈھانکتا اور تمہیں زینت بخشتا ہے۔ لباس کا تیسرا کام ایک اور جگہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جَعَلَ لَکُمۡ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمُ الۡحَرَّ وَ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمۡ بَاۡسَکُمۡ (النحل: ۸۲) اس نے تمہارے لئے گرمی سردی کے ضرر سے بچانے کے لئے سرابیل بنائے ہیں۔ پس لباس کا تیسرا کام گرمی سردی کے ضرر سے بچانا ہے۔

تَخۡتَانُوۡنَ خَانَ یَخُوۡنُ سے باب افتعال ہے۔ اور جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ اور اِخۡتَانَہٗ اِخۡتِیَانًا کے معنے ہیں اُؤۡتُمِنَ فَلَمۡ یَنۡصَحۡ وَخَانَ الۡعَھۡدَ نَقَضَہٗ۔ یعنی اِخۡتَانَ کے معنے ہیں امانت کا حق ادا نہ کیا اور عہد کو توڑا۔ (اقرب)

عَفَا عَنۡکُمۡ عَفَا عَنۡہُ وَلَہٗ ذَنۡبَہٗ وَعَنۡ ذَنۡبِہٖ صَفَحَ عَنۡہُ وَتَرَكَ عُقُوۡبَتَہٗ وَ ھُوَ یَسۡتَحِقُّھَا وَ اَعۡرَضَ عَنۡ مُؤَاخَذَتِہٖ۔ یعنی عَفَا کے معنے ہیں (۱) اس کا قصور معاف کر دیا اور اس سے مواخذہ نہ کیا۔ (۲) اور عَفَا اللّٰہُ عَنۡ فُلَانٍ کے معنے ہیں مَحَا ذُنُوۡبَہٗ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ مٹا دیئے۔ (اقرب) (۳) وَقَدۡ یُسۡتَعۡمَلُ عَفَا اللّٰہُ عَنۡکُمۡ فِیۡمَا لَمۡ یَسۡبَقۡ بِہٖ ذَنۡبٌ وَلَا یُتَصَوَّرُ۔ عَفَا کا لفظ بعض دفعہ ایسے آدمی کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس نے نہ کوئی گناہ کیا ہو اور نہ اس کے متعلق گناہ کا خیال ہو سکتا ہو۔ (اقرب)

بَاشِرُوۡھُنَّ باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ ہے اور بَاشَرَ الۡاَمۡرَ کے معنے ہیں تَوَلَّاہُ بِنَفۡسِہٖ اس نے خود کوئی کام کیا۔ وَبَاشَرَہُ النَّعِیۡمُ اَفَاضَ عَلَیۡہِ حَتّٰی کَاَنَّہٗ مَسَّ بَشَرَتَہٗ اور بَاشَرَہُ النَّعِیۡمُ کے معنے ہیں اُسے اس کثرت سے نعمتیں حاصل ہوئیں کہ اس کے چمڑے کو چھونے لگیں۔ (اقرب) اور اَلۡمُبَاشَرَۃُ کے معنے ہیں اَلۡاِفۡضَاءُ بِالۡبَشَرَتَیۡنِ ہم صحبت ہونا۔ (مفردات)

کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ کَتَبَ لَہٗ میں عام طور پر لام فائدہ کے لئے آتا ہے اور کتابت کے معنے مقدر کر دینے اور فرض کر دینے کے ہیں۔ اس جگہ مقدر کر دینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

مِنۡ کے معنے اس جگہ امتیاز کے ہیں۔

عَاکِفُوۡنَ عَاکِفٌ عَکَفَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور عَاکِفُوۡنَ جمع کا صیغہ ہے۔ اور عَکَفَ کے معنے ہیں اَلۡاِقۡبَالُ عَلَی الشَّیۡءِ وَ مُلَازَمَتُہٗ عَلٰی سَبِیۡلِ التَّعۡظِیۡمِ لَہٗ۔ یعنی کسی چیز کی طرف پوری طرح متوجہ ہونا۔ اور اس کے ساتھ اس کی تعظیم کی خاطر تعلق قائم رکھنا یا اس میں رہنا (مفردات)۔ پس عَاکِفُوۡنَ فِی الۡمَسٰجِدِ

کے معنے میں مسجدوں کولازم پکڑنے والے اوران میں بیٹھے رہنے والے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے روزوں کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی عورتوں سے بے تکلّف ہونا جائز ہے کیونکہ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اورتم ان کے لئے لباس ہو۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں لباس کے تین کام بتائے گئے ہیں۔ اوّل۔ ننگ ڈھانکنا۔ دوم۔ زینت کا موجب ہونا۔ سوم۔ سردی گرمی کے ضرر سے انسانی جسم کو بچانا۔ چنانچہ فرماتا ہے یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا (الاعراف:۲۷) یعنی اے آدم کی اولاد! ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے جوتمہارے ننگ کوڈھانکتا ہے اورتمہارے لئے زینت کا موجب بھی ہے۔اسی طرح سورہ نحل میں فرماتا ہے۔وَجَعَلَ لَکُمۡ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمُ الۡحَرَّ وَ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمۡ بَاۡسَکُمۡ (النحل:۸۲) یعنی اس نے تمہارے لئے کئی قسم کی قمیصیں بنائی ہیں جوتمہیں گرمی سردی سے بچاتی ہیں۔اوربعض قمیصیں یعنی زرہیں ایسی بھی ہیں جوتمہیں آپس کی جنگ کی سختی سے بچاتی ہیں۔پس ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّھُنَّ میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں؟ فرماتا ہے مردوں اورعورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ لباس کا کام دیں یعنی (۱) ایک دوسرے کے عیب چھپائیں (۲) ایک دوسرے کے لئے زینت کا موجب بنیں (۳) پھرجس طرح لباس سردی گرمی کے ضرر سے انسانی جسم کومحفوظ رکھتا ہے اسی طرح مردوعورت سُکھ دُکھ کی گھڑیوں میں ایک دوسرے کے کام آئیں۔اور پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کی دلجمعی اورسکون کا باعث بنیں۔غرض جس طرح لباس جسم کی حفاظت کرتا ہے اوراسے سردی گرمی کے اثرات سے بچاتا ہے اسی طرح انہیں ایک دوسرے کا محافظ ہونا چاہیے۔حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مثال دیکھ لو۔انہوں نے شادی کے معاً بعد کس طرح اپنا سارا مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں پیش کردیا۔تاکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی دقت پیش نہ آئے اورآپ پورے اطمینان کے ساتھ خدمتِ خلق کے کاموں میں حصہ لیتے جائیں۔یہ اہلی زندگی کوخوشگوار رکھنے کا کتنا شاندار نمونہ ہے جوانہوں نے پیش کیا۔

عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اس بات کوخوب جانتا ہے کہ تم اپنے نفسوں کے حقوق کوتلف کیا کرتے تھے اوران کا پوراحق ادانہیں کرتے تھے۔پس اس نے تم پراپنے فضل سے توجہ کی اورتمہاری اس حالت کی اصلاح کردی۔

یہ حق تلفی جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے درحقیقت اس والہانہ عشق کی وجہ سے تھی جوصحابہؓ کے

دلوں میں عبادت اور ذکر الٰہی کے متعلق پایا جاتا تھا۔ انہوں نے جب رمضان کی برکات کا مشاہدہ کیا اور دیکھا کہ خدا تعالیٰ ان دنوں میں آسمان سے اُتر آتا ہے اور بندوں پر اپنے انوار اور برکات کی بارش نازل کرتا ہے تو انہوں نے چاہا کہ وہ رمضان کی راتیں بھی ذکر الٰہی اور عبادت میں بسر کریں اور جنسی تعلقات سے بالا رہیں۔ اسی طرح کھانے پینے کے متعلق بھی بعض ناواجب قیود انہوں نے اپنے اوپر عاید کر رکھی تھیں۔ چنانچہ بخاری میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس آیت کے نزول سے قبل صحابہؓ میں سے جب کوئی شخص افطاری سے قبل سوجاتا تو آنکھ کھلنے پر وہ نہ رات بھر کچھ کھاتا اور نہ اگلے دن کھاتا یہاں تک کہ پھر دوبارہ شام کا وقت آجاتا۔ ایک دفعہ ایک انصاری جو روزہ دار تھے انہوں نے افطاری کے قریب اپنی بیوی سے کچھ کھانے کے لئے مانگا۔ اس نے کہا کہ گھر میں تو کچھ نہیں مگر کہیں سے کچھ مانگ لاتی ہوں۔ اتنے میں انہیں نیند آگئی اور وہ سو گئے۔ بیوی باہر سے کھانا لے کر آئی تو چونکہ وہ سو چکے تھے اس لئے پرانے دستور کے مطابق وہ کچھ کھا نہیں سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری رات بھوکے رہے اور اگلے دن بھی ان کا روزہ ہی رہا۔ بارہ بجے کے قریب وہ شدت ضعف کی وجہ سے بیہوش ہو گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ اسی طرح یہ آیت نازل ہوئی کہ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بخاری کتاب الصوم باب قول اللہ جل ذکرہ احل لکم لیلۃ الصیام) درحقیقت یہ پابندیاں یہود کی بعض رسوم کا نتیجہ تھیں۔ یہود میں یہ رواج تھا کہ وہ ایٹونمنٹ ڈے یعنی یوم کفارہ کا جب روزہ رکھتے تو ایک صبح سے دوسری صبح تک نہ کچھ کھاتے نہ پیتے (جیوش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ Fasting private fasts) اُن کو دیکھ کر مسلمانوں کو بھی خیال پیدا ہوا کہ شاید جب آدمی سو جائے تو اس کے بعد وہ کچھ نہیں کھا سکتا۔ اسی طرح مرد و عورت کے اختلاط کے متعلق ان کا خیال تھا کہ سارا رمضان جائز نہیں۔ بعض خیال کرتے تھے کہ جس وقت کھانا منع ہو وہ بھی منع ہے ان خیالات کی وجہ سے اگر کوئی سوجاتا تو کھانا نہ کھاتا اور اپنی بیوی کے پاس بھی نہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ بے فائدہ تکلیف ہے اس کی کچھ ضرورت نہیں صرف وہی پابندی انسان کے لئے خیر و برکت کا موجب ہوتی ہے جو الٰہی منشاء کے مطابق ہو ورنہ بلاضرورت اپنے آپ کو مختلف قیدوں اور پابندیوں میں جکڑتے چلے جانا درست نہیں ہوتا۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فرمایا کہ اب ہم نے تم پر رحم کر دیا ہے۔ اور تمہارے لئے آسانی بہم پہنچا دی ہے اس لئے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور پہلے سے بھی زیادہ شوق اور مستعدی کے ساتھ نیک کاموں میں حصہ لو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مومن بندے خدا تعالیٰ کی رضاء کے لئے اپنے آپ کو کسی مشقت میں ڈالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے اور وہ کسی نہ کسی شکل میں انسان کے لئے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔ گویا اُن کے اخلاص کا انہیں دم نقد فائدہ دے دیتا ہے۔

پھر فرماتا ہے فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۔ كَتَبَ عَلَيْهِ اور كَتَبَ لَهٗ میں فرق ہے۔ كَتَبَ عَلَيْهِ کے معنے ہوتے ہیں۔اُس پر فرض کیا گیا ہے۔اور كَتَبَ لَهٗ کے معنے ہوتے ہیں اس کے لئے کوئی انعام مقرر کیا گیا ہے۔ یا کوئی حق مقرر کیا گیا ہے۔(یا استعارۃً تقدیر مقررہ کے معنوں میں بھی آجاتا ہے) پس اس آیت کے یہ معنے ہوئے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارا حق مقرر کیا ہے اس کو چاہو یعنی جن باتوں کو اللہ تعالیٰ نے جائز کیا ہے یا جن سے نہیں روکا اُن کو بے شک کرو۔ وہ تمہارا حق ہیں۔اُن کو چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یا یہ کہ جو اولاد اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھی ہے۔اُس کی جستجو کرو یعنی جو طریق اولاد حاصل کرنے کا اُس نے مقرر کر رکھا ہے اس کے مطابق عمل کرو۔

اسی طرح وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ سے یہ بھی مراد ہے کہ اس مقدس مہینہ میں جو کچھ برکات خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے مقرر کر رکھی ہیں ان کے حصول کے لئے پوری کوشش کرو۔ پہلا طریق جو حقوق نفس کو تلف کرنے والا تھا اس کے نتیجہ میں ممکن تھا کہ تمہارے جسم کو کوئی نقصان پہنچ جاتا اور تم زیادہ محنت اور مشقّت نہ کر سکتے۔مگر اب جبکہ ہم نے اس کی تلافی کر دی ہے اور تمہارے جسم کو بے جا کوفت سے بچا لیا ہے تمہارا فرض ہے کہ تم کمر ہمت باندھ کر خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اُن درجاتِ عالیہ کی تلاش کرو جن کو خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھا ہے۔

وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۔فرماتا ہے تم اس وقت تک کھاؤ پیئو جب تک کہ تمہیں صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے غلطی سے سیاہ اور سفید دھاگے اپنے پاس رکھنے شروع کر دیئے اور انہوں نے خیال کیا کہ ہمیں اس وقت تک کھانے پینے کی اجازت ہے جب تک کہ ہمیں سفید اور سیاہ دھاگے میں فرق نظر نہ آنے لگے۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عدیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔اور انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے سیاہ اور سفید دو دھاگے اپنے تکیہ کے نیچے رکھ دیئے ہیں تا کہ جب سیاہ اور سفید دھاگے میں فرق نظر آنے لگے تو مجھے معلوم ہو جائے

کہ اب کھانا پینا چھوڑ دینا چاہیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی یہ بات سن کر فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے تمہارا تکیہ بہت چوڑا ہے کہ اُس کے نیچے خیط ابیض اور خیط اسود دونوں آ گئے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا۔ اس سے مراد تو صرف رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی ہے۔ ظاہری دھاگے مراد نہیں ہیں (مسلم کتاب الصّیام باب بیان أن الدخول فی الصوم یحصل بطلوع الفجر۔۔۔) اسی طرح بعض اور صحابہؓ بھی سفید اور سیاہ دھاگے اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور وہ اس وقت تک کھاتے پیتے رہتے تھے جب تک کہ ان دونوں میں انہیں فرق نظر نہ آ جاتا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مِنَ الْفَجْرِ کے الفاظ نازل فرمائے تب انہیں معلوم ہوا کہ خیط ابیض اور خیط اسود سے سفید اور سیاہ دھاگا مراد نہیں بلکہ اس سے صبح صادق اور صبح کاذب کا فرق مراد ہے۔

پنجاب میں بھی بعض زمیندار رمضان کی راتوں میں سفید اور سیاہ دھاگا اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ اور چونکہ دھاگا اچھی روشنی میں نظر آتا ہے مدھم روشنی میں نظر نہیں آتا اس لئے وہ کافی روشنی ہونے تک کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کی نظر چونکہ کمزور ہوتی ہے اس لئے ممکن ہے وہ دن چڑھنے کے بعد بھی اس آیت کی رو سے کھانے پینے کا جواز ثابت کرلیں کیونکہ انہیں سورج کی روشنی میں ہی اس فرق کا پتہ لگ سکتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خیط ابیض اور خیط اسود کے الفاظ استعارۃً استعمال فرمائے ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ صرف اس وہم کی بنا پر کھانا پینا ترک نہیں کر دینا چاہیے کہ ممکن ہے صبح ہوگئی ہو بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ صبح صادق اور صبح کاذب میں امتیاز ہو جائے اور پَو پھٹ جائے۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ۔ اس جگہ لیل سے گہری تاریکی مراد نہیں بلکہ صرف سورج غروب ہونے کا وقت مراد ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ (مسلم کتاب الصیام باب فضل السحور و تاکید استحبابه۔۔۔) کہ جب تک لوگ سورج غروب ہوتے ہی روزہ افطار کرتے رہیں گے اُس وقت تک وہ خیر پر قائم رہیں گے۔ یعنی احکام اسلامی کی حقیقی روح ان میں زندہ رہے گی۔ ورنہ جب لوگ رسوم یا وہم سے کام لینے لگتے ہیں تو فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں اور اُن کے اوہام انہیں دور از کار باتوں میں الجھا دیتے ہیں اور اُن کی حالت بالکل اس شخص کی سی ہو جاتی ہے۔ جو نماز کی نیت باندھتے ہوئے اپنے وہم میں اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ پہلے تو امام کو انگلی مار مار کر کہتا کہ پیچھے اس امام کے اور پھر رفتہ رفتہ اُس نے امام کو دھکے دینے شروع کر دیئے۔ اِسی طرح جن لوگوں کا وہم بڑھ جاتا ہے وہ پہلے تو سورج کے غروب ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ مگر چونکہ ابھی سُرخی باقی ہوتی ہے اس لئے ان کی تسلی نہیں ہوتی اور وہ زیادہ انتظار کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ جب گہری تاریکی چھا جائے تب افطاری کرتے ہیں۔ یہ طریق شریعت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ کا حکم دیا ہے اور لیل کا وقت سورج ڈوبنے سے لے کر سورج نکلنے تک ہے۔ یہ مراد نہیں کہ جب تک اچھی طرح تاریکی نہ چھا جائے اس وقت تک تم روزہ افطار ہی نہ کرو۔

وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ۔ اس کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ آیا اعتکاف کی وجہ سے مباشرت ممنوع قرار دی گئی ہے یا مسجد کی حرمت کی وجہ سے (تفسیر کبیر لامام رازی زیر آیت ھذا)۔ میرے نزدیک اعتکاف کی وجہ سے مباشرت سے نہیں روکا گیا بلکہ مسجد کے احترام کی وجہ سے روکا گیا ہے۔ جس کی طرف وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ مباشرت کی نفی اعتکاف کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مساجد کی وجہ سے ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مباشرت لَمَس کو بھی کہتے ہیں اور احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایسی حالت میں جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اعتکاف میں بیٹھے ہوتے تھے آپ کا سر بھی پانی سے دھو دیتی تھیں اور بالوں کی کنگھی بھی کر دیا کرتی تھیں (بخاری ابواب الاعتکاف باب لا یدخل البیت الا لحاجة)۔ پس اس جگہ مباشرت کی نہی سے محض مخصوص تعلقات یا اُس کے مبادی مراد ہیں جسم کو چھونا مراد نہیں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں۔ تم اُن کے قریب بھی مت جاؤ تا کہ غلطی سے تمہارا قدم اللہ تعالیٰ کے محارم میں نہ جا پڑے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ ؓ کو اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو! حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے لیکن ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور بھی ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص ان مشتبہ امور سے بچا اُس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچانے کے لئے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ لیکن جو شخص ان مشتبہ امور میں جا پڑا وہ اس چرواہے کی مانند ہے جو رکھ کے آس پاس اپنا ریوڑ چرا رہا ہے۔ اور قریب ہے کہ اُس کا ریوڑ رکھ کے اندر چلا جائے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا اِنَّ حِمَى اللّٰهِ فِيْ اَرْضِهٖ مَحَارِمُهٗ۔ کان کھول کر سنو! کہ ہر بادشاہ کی ایک رکھ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کی رکھ اُس کی حرام کردہ چیزیں ہیں (بخاری کتاب الایمان باب فضل من اِسْتَبْرَأَ لدینہٖ) پس محارم اللہ تعالیٰ کی رکھ ہوتے ہیں اور اگر کوئی انسان اُن کے قریب جائے تو اس بات کا خطرہ ہوتا ہے کہ اُس کا قدم ڈگمگا جائے اور وہ ناجائز امور کا مرتکب ہو کر خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بن جائے۔ پس اصل تقویٰ یہی ہے کہ انسان حدود اللہ کے قریب جانے سے بھی بچے تا کہ شیطان اُس کے قدم کو ڈگمگا نہ دے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ اس میں آیات سے مراد احکام الٰہیہ ہیں اور فرماتا ہے کہ ان احکام کی اصل غرض تمہارے اندر تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ پس تمہیں چاہیے کہ تم ہمیشہ تقوی اللہ کو ملحوظ رکھو اور نہ صرف اللہ کی حدود کو نہ توڑو بلکہ شبہات سے بھی پرے رہنے کی کوشش کرو مبادا تمہارا قدم پھسل جائے اور تم تقویٰ سے دور چلے جاؤ۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى

اور تم اپنے (بھائیوں کے) مال آپس میں (مل کر) جھوٹ (اور فریب) کے ذریعہ سے مت کھاؤ۔ اور نہ ان

الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ

(اموال) کو (اس غرض سے) حکّام کی طرف کھینچ لے جاؤ تا تم لوگوں کے مالوں کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہوئے

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ ع

ناجائز طور پر ہضم کر جاؤ۔

حلِّ لُغات۔ تَاْكُلُوْا اَكَلَ کے معنے کھانے کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب غذا کے سوا اور چیزوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہلاک کرنے یا فنا کر دینے کے ہوتے ہیں۔

تُدْلُوْا اَدْلٰى سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَدْلٰى اِدْلَاءً کے معنے ہیں اَرْسَلَ الدَّلْوَ فِي الْبِئْرِ۔ اس نے کوئیں میں ڈول ڈالا اور اَدْلٰى فُلَانٌ فِي فُلَانٍ کے معنے ہیں۔ قَالَ قَبِيْحًا اس نے کسی کے متعلق بُری بات کہی اور اَدْلٰى بِحُجَّتِهٖ کے معنے ہیں اس نے اپنی دلیل پیش کی اور اَدْلٰى اِلَيْهِ بِمَالٍ کے معنے ہیں۔ اس نے اُسے مال دیا۔ (اقرب) تُدْلُوْا بِهَا اصل میں لَا تُدْلُوْا بِهَا کے معنوں میں ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ (۱) ایک دوسرے کے مال حکّام کے پاس نہ لے جاؤ۔ یعنی جھوٹے مقدمات بنا کر اُن کے مال نہ لو (۲) حاکموں کو بطور رشوت مال نہ دو۔

تفسیر۔ اپنے مال کو تو انسان کھایا ہی کرتا ہے پس لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کے مال باطل کے ساتھ مت کھاؤ۔ انسان دوسرے کا مال کئی طرح کھاتا ہے۔ اوّل۔ جھوٹ بول کر۔ دوم۔ ناجائز ذرائع سے چھین کر۔ سوم۔ سود کے ذریعہ سے۔ چہارم رشوت لے کر یہ سب امور باطل میں داخل ہیں۔

وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ میں بتایا کہ جس طرح آپس میں ایک دوسرے کا مال کھانا ناجائز ہے۔اسی طرح تم حکام کو بھی روپیہ کا لالچ نہ دو تا کہ اس ذریعہ سے تم دوسرے کا مال کھا سکو۔اس آیت میں افسران بالا کو رشوت دینے کی ممانعت کی گئی ہے اور اُسے حرام اور ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اپنے مالوں کو حکّام کے پاس نہ لے جاؤ تا کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم گناہ کے ذریعہ کھا جاؤ۔یعنی ان کے متعلق جھوٹے مقدمات دائر نہ کرو اور یہ نہ سمجھو کہ اگر حاکم انصاف کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے تمہیں کسی کا حق دلا دے گا تو وہ تمہارے لئے جائز ہو جائے گا کیونکہ دنیوی عدالتوں سے بالا ایک آسمانی عدالت بھی ہے اور جب اس نے اپنے قانون میں ایک چیز کو ناجائز قرار دے دیا ہے تو دنیا کی کوئی عدالت خواہ اُسے جائز بھی قرار دے دے وہ بہرحال ناجائز اور حرام ہی رہے گا۔

چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِحَقِّ اَخِيْهِ شَيْئًا فَلَا يَاْخُذْهُ۔ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ ۔(بخاری کتاب الاحکام باب موعظۃ الامام للخصوم) یعنی اگر میں کسی شخص کے لئے اس کے بھائی کے حق میں سے کسی چیز کا غلط فیصلہ کر دوں تو اُسے چاہیے کہ وہ اس کے لینے سے انکار کر دے کیونکہ میں اس کے لئے آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کرتا ہوں۔

اسی طرح بخاری اور مسلم میں اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت آتی ہے کہ اَنَّهٗ سَمِعَ خُصُوْمَةً بِبَابِ حُجْرَتِهٖ فَخَرَجَ اِلَيْهِمْ فَقَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَ اِنَّهٗ يَاْتِيْنِي الْخَصْمُ فَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ يَّكُوْنَ اَبْلَغَ مِنْ بَعْضٍ فَاَحْسِبُ اَنَّهٗ صَادِقٌ فَاَقْضِيَ لَهٗ بِذٰلِكَ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِحَقِّ مُسْلِمٍ فَاِنَّمَا هِيَ قِطْعَةٌ مِّنَ النَّارِ فَلْيَاْخُذْهَا اَوْ لِيَتْرُكْهَا۔(بخاری کتاب الاحکام باب من قضی له بحق اخیه فلا یاخذه۔۔) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنے مکان کے دروازہ پر کسی جھگڑے کی آواز سنی آپ شور سُن کر باہر تشریف لے آئے اور لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو میں بھی ایک انسان ہوں۔میرے پاس مقدمات والے آتے ہیں تو ممکن ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے سے زیادہ چرب زبان ہو۔اور میں اس کی باتوں کی وجہ سے خیال کر لوں کہ وہی سچا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔پس اگر میں کوئی ایسا فیصلہ کر دوں تو جس شخص کے لئے میں کسی مسلمان کے حق میں سے کسی چیز کا فیصلہ کروں اُسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو میں نے اُسے دیا ہے اور اسے اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اس آگ کے ٹکڑا پر قبضہ کر لے اور چاہے تو اُسے چھوڑ دے۔

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡاَهِلَّةِ ؕ قُلۡ هِىَ مَوَاقِيۡتُ لِلنَّاسِ وَ

تجھ سے چاندوں کے بارہ میں سوال کرتے ہیں۔تو کہہ دے کہ یہ لوگوں (کے عام کاموں) اور حج کے لئے وقت

الۡحَجِّ ؕ وَ لَيۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُيُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا وَ

معلوم کرنے کا آلہ ہیں اور اعلیٰ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑے سے داخل ہو بلکہ کامل نیک وہ شخص

لٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اۡتُوا الۡبُيُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِهَا ۖ وَ اتَّقُوا

ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔اور (تم) گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو۔اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو

اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۹۰﴾

تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

حل لغات۔ اَلۡاَهِلَّةُ هَلَالٌ کی جمع ہے۔وَقِيۡلَ يُسَمّٰى هِلَالًا لِلَيۡلَتَيۡنِ اَوۡ اِلٰى ثَلَاثٍ اَوۡ اِلٰى سَبۡعٍ۔اور ہلال دو راتوں کے چاند کو کہتے ہیں۔اسی طرح تین اور سات راتوں کے چاند کو بھی ہلال کہا گیا ہے۔ (اقرب الموارد)

مَوَاقِيۡتُ مِيۡقَاتٌ کی جمع ہے اور اَلۡمِيۡقَاتُ کے معنے ہیں۔ اَلۡوَقۡتُ وقت۔ وَقِيۡلَ اَلۡوَقۡتُ الۡمَضۡرُوۡبُ لِلشَّيۡءِ۔اور کہا گیا ہے کہ میقات سے مراد وہ خاص وقت بھی ہے جو کسی کام کے لئے مقرر کیا جائے۔ وَالۡمَوۡعِدُ الَّذِيۡ جُعِلَ لَهٗ وَقۡتٌ۔اور میقات اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے لئے کوئی وقت مقرر کیا گیا ہو۔وَقَدۡ يُسۡتَعَارُ لِلۡمَوۡضِعِ الَّذِيۡ جُعِلَ وَقۡتًا لِلشَّيۡءِ۔اور وہ خاص جگہ جہاں کوئی خاص کام وقت مقررہ پر کیا جائے اُسے بھی میقات کہتے ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔ صحابہ کرامؓ نے جب دیکھا کہ کس طرح رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ ان کے قریب آجاتا اور ان کی دُعاؤں کو قبول فرماتا ہے تو ان کے دلوں میں شوق پیدا ہوا کہ وہ باقی مہینوں کے بارہ میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کریں تا کہ وہ ان کی برکات سے بھی مستفیض ہو سکیں۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ لوگ تجھ سے چاندوں کے بارہ میں سوال کرتے ہیں تو انہیں کہہ دے کہ هِىَ مَوَاقِيۡتُ لِلنَّاسِ یہ لوگوں کے لئے وقت کا اندازہ

کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ یعنی ہر قمری مہینہ اس لئے مقرر نہیں کیا گیا کہ اس کے ساتھ شریعت کے کسی خاص حکم کا تعلق ہے بلکہ ان مہینوں کا چاند کے ساتھ اس لئے تعلق رکھا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ گذشتہ یا آئندہ کام کا وقت پہچانا جاتا ہے اور پھر لِلنَّاسِ فرما کر بتایا کہ عوام کے فائدہ کے لئے یہی چاند کے مہینے کام دیتے ہیں۔ ورنہ وہ حساب جس کی سورج کی گردش پر بنیاد ہے اس سے صرف علمی طبقہ ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے عام لوگ اس سے فائدہ اُٹھانے کی استعداد نہیں رکھتے۔

پھر فرمایا وَ الْحَجِّ۔ قمری مہینوں کا دوسرا فائدہ حج سے تعلق رکھتا ہے یعنی بوجہ اس کے کہ حج کا فریضہ قمری مہینہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ یہ عبادت سارے سال میں چکر لگاتی رہتی ہے اور مختلف طبائع کے لوگ اور گرم سرد ممالک کے رہنے والے اپنی اپنی طبیعت اور اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اگر حج کسی شمسی مہینہ میں مقرر کر دیا جاتا تو لازماً وہ ہر سال ایک ہی مہینہ میں ہوتا اور کئی لوگوں کے لئے حج کا فریضہ ادا کرنا ناممکن ہو جاتا۔ مگر اب حج کی عبادت سارے سال میں چکر لگاتی رہتی ہے اور ہر شخص اپنے اپنے حالات کے مطابق بیت اللہ کا سفر کر کے حج کی برکات سے مستفیض ہو سکتا ہے۔

هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام کے نزدیک چاند ہی وقت کا اندازہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں سورج کو بھی وقت کا اندازہ کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ یونس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ (یونس: ۶) یعنی وہ خدا ہی ہے جس نے سورج کو اپنی ذات میں ایک روشن وجود بنایا ہے اور چاند کو نور بنایا ہے جو سورج سے اکتسابِ نور کر رہا ہے۔ اسی طرح سورج اور چاند کی ہم نے منازل مقرر کر دی ہیں تا کہ تمہیں سالوں کی گنتی اور حساب معلوم ہوا کرے۔ پھر سورۃ انعام میں فرماتا ہے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَ جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (الانعام: ۹۷) یعنی خدا صبح کو ظاہر کرنے والا ہے اور اس نے رات کو سکون اور آرام کا موجب اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا اور یہ فیصلہ ایک غالب اور علم رکھنے والے خدا کا ہے۔

اسی طرح سورہ رحمٰن میں فرماتا ہے اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (الرحمٰن: ۶) سورج اور چاند دونوں ایک حساب کے ماتحت کام کر رہے ہیں یعنی ان کی حرکات قانون سے آزاد نہیں بلکہ ایک معین اور مقررہ قانون کے مطابق ہیں اور اسی مقررہ قانون کا یہ نتیجہ ہے کہ وَ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (الرحمٰن: ۷) زمین کی روئیدگی اور سبزہ سب اپنے اُگنے، نشوونما پانے اور پھل لانے میں سورج اور چاند کے پیچھے چلتے ہیں اور ان سے متاثر ہوتے ہیں۔

ان آیات قرآنیہ سے واضح ہے کہ تاریخ اور حساب کے ساتھ سورج اور چاند دونوں کا تعلق ہے۔ اور یہ علوم کبھی ظاہر نہیں ہو سکتے تھے اگر سورج اور چاند کا وجود نہ ہوتا۔ اگر سورج اور چاند نہ ہوتے تو دنوں اور سالوں کا اندازہ ہی نہ ہوسکتا اس لئے کہ اندازہ اور فاصلہ معلوم کرنے کے لئے کسی مستقل چیز کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے پٹواری حساب لگاتے ہیں تو کہتے ہیں فلاں زمین فلاں کنوئیں سے اتنے کرم کے فاصلے پر ہے یا فلاں درخت سے اتنے کرم کے فاصلے پر ہے۔ پس چونکہ کسی مستقل چیز کے بغیر فاصلہ کا معلوم کرنا ناممکن ہوتا ہے اس لئے اگر سورج اور چاند نہ ہوتے تو سالوں اور دنوں کا اندازہ بھی نہ ہوسکتا۔

اسلام نے اپنی عبادات میں سورج اور چاند دونوں سے وقت کے اندازے کئے ہیں۔ مثلاً دن بھر کی نمازوں کے اوقات اور روزہ کی ابتداء اور اس کی افطاری وغیرہ کا تعلق شمسی نظام کے ساتھ ہے۔ لیکن جہاں عبادات کسی خاص مہینہ سے تعلق رکھتی ہیں وہاں قمری نظام سے کام لیا گیا ہے جیسے رمضان اور ایام حج کے لئے قمری مہینوں کو اختیار کیا گیا ہے تا کہ دونوں عبادتیں سال کے ہر حصہ میں چکر کھاتی رہیں۔ اور ایک مومن فخر کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ اس نے سال کے ہر حصہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہے۔ مثلاً رمضان کا انحصار چونکہ قمری مہینوں پر ہے۔ اس لئے ۳۶ سال میں ایک دور ختم ہوجاتا ہے اور رمضان کبھی جنوری میں آجاتا ہے اور کبھی فروری میں کبھی مارچ میں اور کبھی اپریل میں اس طرح سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے ہر دن ایسا ہوتا ہے جس میں انسان نے روزہ رکھا ہوتا ہے لیکن اگر شمسی مہینوں پر روزے مقرر ہوتے تو اگر ایک دفعہ جنوری میں روزے آتے تو پھر ہمیشہ جنوری میں ہی روزے رکھنے پڑتے اور اس طرح عبادت کو وسعت حاصل نہ ہوتی۔ پس عبادت کو زیادہ وسیع کرنے کے لئے اور اس غرض کے لئے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر لحظہ کے متعلق کہہ سکے کہ وہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذارا ہے عبادت کا انحصار قمری مہینوں پر رکھا گیا ہے لیکن سال کے اختتام یا اس کے شروع ہونے کے لحاظ سے انسانی دماغ سورج سے زیادہ تسلی پاتا ہے۔ بہرحال قمری اور شمسی دونوں نظام حساب کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے وہ چاند کے مہینوں سے ہی زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ شمسی نظام سے تعلق رکھنے والے حسابات ان کی علمی استعداد سے بالا ہوتے ہیں۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا کہتے ہیں اسلام سے پہلے عربوں کا دستور تھا کہ جب وہ حج کے لئے احرام باندھ لیتے اور اس دوران میں انہیں گھر آنے کی ضرورت پیش آتی تو وہ دروازوں سے آنے کی بجائے گھروں کی پشت سے دیوار پھاند کر آتے تھے (بخاری کتاب التفسیر سورۃ البقرۃ باب قولہ لیس البر بان تاتوا البیوت ۔۔۔)

ہوسکتا ہے کہ یہ آیت اسی کے متعلق ہو کہ تم ایسا نہ کرو مگر میرے نزدیک چونکہ اس آیت سے پہلے گھروں کی پشت سے داخل ہونے کا کوئی ذکر نہیں اس لئے اس آیت کے یہ معنیٰ نہیں کہ تم گھروں میں ان کی پشت سے داخل نہ ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام کو سرانجام دینے کے جو صحیح طریق مقرر کئے گئے ہیں تم ان سے کام لو ورنہ تمہیں کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ چنانچہ دیکھ لو اس سے پہلے یہ سوال بیان کیا گیا ہے کہ رمضان میں تو ہم نے مشقت برداشت کی اور خدا تعالیٰ ہمیں مل گیا۔ اب ہمیں بتایا جائے کہ باقی مہینوں میں ہم نفس کشی کے لئے کیا کریں اور کون کون سے طریق اختیار کریں خدا تعالیٰ نے بتایا کہ تمہاری خواہش تو نیک ہے مگر یہ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا یہ ذریعہ نہیں کہ زیادہ تکلیف اٹھاؤ بلکہ حقیقی ذریعہ یہ ہے کہ جو طریق ہم نے نیکی میں ترقی کرنے کے تمہیں بتائے ہوئے ہیں تم ان پر عمل کرو۔ تمہیں خود بخود اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر تم ایسا نہ کرو تو تمہاری مثال ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی آقا اپنے ملازم کو بلائے اور وہ دیر کر کے آئے تو پوچھے تم دیر کر کے کیوں آئے ہو؟ اس پر وہ کہہ دے کہ دروازے سے نہیں آیا بلکہ دیوار پھاند کر آیا ہوں اور مجھے دیوار پھاندنے میں بہت دیر لگ گئی تھی اس لئے میں جلدی نہیں پہنچ سکا۔ اگر وہ یہ جواب دے تو کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ اس جواب سے اس کا آقا خوش ہو جائے گا اور اُسے انعام دے گا اور کہے گا کہ چونکہ یہ دیوار پھاند کر آیا ہے اور اس نے بڑی مشقت برداشت کی ہے اس لئے اسے ترقی دی جائے؟ اسی طرح خواہ مخواہ مشقت اُٹھا کر اپنی طرف سے نئی نئی راہیں ایجاد کرنا اور ان پر اپنا وقت ضائع کرنا اور اپنے قویٰ کو نقصان پہنچانا کوئی نیکی نہیں۔ نیکی یہ ہے کہ لوگ اپنے آسمانی آقا کی آواز پر لبیک کہیں اور اس راستہ کو اختیار کریں جو شریعت نے ان کے لئے قائم کر دیا ہے غرض اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ طریق جو میں نے تمہیں بتائے ہوئے ہیں اگر ان کے ذریعہ سے تم میرے پاس آؤ گے تو مجھ تک پہنچ سکو گے اور اگر اور ذرائع عمل میں لاؤ گے اور ان میں تمہیں محنت بھی زیادہ کرنی پڑے تو یہ زیادہ محنت کرنا تمہیں خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچائے گا۔ جیسا کہ ہندوؤں میں سے بعض اُلٹے لٹکے رہتے ہیں بعض اپنے ہاتھ کھڑے رکھ کر خشک کر لیتے ہیں۔ مگر انہیں خدا تعالیٰ کی کوئی رضا حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے مقابلہ میں مسلمان بھی عبادتیں کرتے ہیں جو مشقت میں ان سے بہت کم ہوتی ہیں لیکن پھر بھی وہ رضائے الٰہی کو حاصل کر لیتے ہیں۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے بھی فیج اعوج کے دور میں بڑی بڑی مشقتیں اپنے نفس پر وارد کیں اور وہ غلط راستہ پر چلنے لگے۔ بیسیوں قسم کی چلّہ کشیاں تھیں جو انہوں نے اختیار کر لیں اور بیسیوں قسم کے ذکر تھے جو انہوں نے خود ہی ایجاد کر لئے۔ اگر مسلمان اپنے آپ کو ان مشقتوں میں ڈالنے کی بجائے قرآن کریم کے احکام پر عمل کرتے تو وہ

قرب الٰہی کی ان منازل کو دنوں میں طے کر لیتے جنہیں وہ سالوں میں بھی طے نہ کر سکے بلکہ ان ریاضتوں کے نتیجہ میں ان میں سے کئی مسلول اور مدقوق ہو کر مر گئے۔ کئی دیوانے ہو گئے اور کئی مرگی کا شکار ہو گئے۔

وَ اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اس میں بتایا کہ کامیابی ہمیشہ ابواب ہی کے ذریعہ آنے سے ہوا کرتی ہے۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے اور دروازوں میں سے داخل ہونے کی بجائے دیواریں پھاند کر اندر داخل ہونا چاہتے ہو تو تمہیں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً لڑائی کے زمانہ میں اگر تم ہتھیاروں سے کام لینا نہ سیکھو اور جنگی فنون کی تربیت نہ لو بلکہ یونہی سینہ تان کر دشمن کے سامنے چلے جاؤ۔ تو تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر چھوٹی سے چھوٹی تلوار بھی تمہارے پاس ہو یا تمہیں لاٹھی چلانا ہی آتا ہو تو تم قوم کے لئے مفید وجود بن سکتے ہو۔ پس کامیابی کے لئے ان ذرائع اور اسباب کو استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ ورنہ اسے ناکامی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر وَ اتَّقُوا اللّٰہَ کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ذرائع اور اسباب کو نظر انداز کرنا اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے نظام کی ہتک کرنا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر چیز کے حصول کے جو طریق اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہوئے ہیں انہی کے مطابق چلو اپنے پاس سے نئے نئے طریق وضع نہ کرو۔ مثلاً رمضان کے مہینہ میں بیشک روزے رکھنا ایک بڑی نیکی ہے لیکن اگر اسی پر قیاس کرتے ہوئے کوئی شخص کسی اور مہینہ میں بھی تیس تیس روزے رکھنے شروع کر دے اور سمجھے کہ وہ اس طرح اللہ تعالیٰ کو راضی کر لے گا تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی دروازہ سے داخل نہ ہو بلکہ نقب لگا کر داخل ہو اور اندر جا کر کہے کہ دیکھئے میں کیسی مشقّت اٹھا کر آپ تک پہنچا ہوں۔ ایسے شخص کی کوئی تعریف نہیں کر سکتا بلکہ ہر شخص اسے ملامت کرے گا اور اس کے فعل کو قابلِ مذمت قرار دے گا۔

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ اور کسی پر زیادتی نہ کرو۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۱﴾

(اور یاد رکھو) کہ اللہ (تعالیٰ) زیادتی کرنے والوں سے ہرگز محبت نہیں کرتا۔

تفسیر۔ اب اللہ تعالیٰ نے دینی جنگوں کے احکام بیان کرنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ اس پہلی آیت میں

ہی اللہ تعالیٰ نے وہ تمام شرائط بیان کر دی ہیں جن کو مذہبی جنگوں میں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے اے مسلمانو! ان کفار سے جو تم سے جنگ کر رہے ہیں تم بھی محض اللہ تعالیٰ کی خاطر جس میں تمہارے اپنے نفس کا غصہ یا نفس کی ملونی شامل نہ ہو جنگ کرو اور یاد رکھو کہ جنگ میں بھی کوئی ظالمانہ فعل نہیں کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو بہرحال پسند نہیں کرتا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ جس جنگ کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے وہ صرف وہی ہے جو اوّل فی سبیل اللہ ہو۔ یعنی ذاتی لالچوں، ذاتی حرصوں ملک کے فتح کرنے کی نیت یا اپنے رسوخ کو بڑھانے کی نیت سے نہ ہو بلکہ صرف خدا تعالیٰ کے لئے ہو یعنی ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے ہو جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اور اس کے دین کے راستہ میں پیدا کی گئی ہوں۔ اگر وہ دینی جنگ نہیں تو اُسے فی سبیل اللہ نہیں کہا جا سکتا۔ مسیحی مصنف فی سبیل اللہ کے الفاظ سے دھوکہ کھاتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد زبردستی مسلمان بنانے کے ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اس کے معنے تو یہ ہیں کہ صرف وہی جنگ جائز ہے جو خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق اور اس کی رضا چاہنے کے لئے ہو۔ چنانچہ اسی قسم کے الفاظ اسی سورۃ کی آیت نمبر ۲۶۳ میں بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر خرچ کرنے کے بعد نہ کسی رنگ میں احسان جتاتے ہیں اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں ان کے رب کے پاس ان کے اعمال کا بدلہ محفوظ ہے اور نہ تو انہیں کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اس آیت میں جو فی سبیل اللہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں انہی کی تشریح آیت نمبر ۲۶۶ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ یعنی وہ لوگ اپنے اموال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

اسی طرح لسان العرب جو لغت کی مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ كُلُّ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْخَيْرِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَيْ مِنَ الطُّرُقِ اِلَى اللّٰهِ یعنی ہر نیکی جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے جو انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ اور نہایۃ میں لکھا ہے وَسَبِيْلُ اللّٰهِ عَامٌّ يَقَعُ عَلٰى كُلِّ عَمَلٍ خَالِصٍ سُلِكَ بِهٖ طَرِيْقُ التَّقَرُّبِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى بِاَدَاءِ الْفَرَائِضِ وَالنَّوَافِلِ وَاَنْوَاعِ التَّطَوُّعَاتِ یعنی سَبِيْلِ اللّٰه ایک عام اصطلاح ہے جس کا اطلاق ہر ایسے عمل نیک پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہو۔ خواہ وہ فرائض کی ادائیگی کے ذریعہ ہو یا نوافل یا دوسری نیکیوں میں حصہ لینے کے ذریعہ ہو۔

پس قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے یہ معنے نہیں کہ تم دوسروں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے جنگ کرو۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب کوئی قوم دین کے بارہ میں تم سے جنگ کرے اور تمہارا مقدس مذہب تم سے زبردستی چھڑانا چاہے تو اس وقت تمہارا فرض ہے کہ تم محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور دینی مشکلات کو دور کرنے کے لئے دشمن سے جنگ کرو۔ پس اس میں کفار کو زبردستی مسلمان بنانے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ کفار کے اس جبر کو دور کرنے کا ذکر ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے لئے مذہبی آزادی تک باقی نہیں رہی تھی۔

دوسری شرط اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ بیان کی ہے کہ لڑائی صرف انہی لوگوں سے جائز ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہتھیار اُٹھا چکے ہوں۔ جیسا کہ یُقَاتِلُوْنَکُمْ کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔

تیسری شرط جو یُقَاتِلُوْنَکُمْ میں بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ تمہارے لئے صرف انہی سے جنگ کرنا جائز ہے جو تم سے لڑتے ہیں۔ یعنی جو لوگ باقاعدہ سپاہی نہیں اور لڑائی میں عملاً حصہ نہیں لیتے جیسے بچے بوڑھے عورتیں وغیرہ ان کو مارنا یا ان سے لڑائی کرنا جائز نہیں گویا سول آبادی کو لڑائی کے دائرہ سے کلیتہً باہر رکھا گیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم کی جو تشریح فرمائی ہے وہ ان احکام سے ظاہر ہے جو آپ اس وقت دیتے تھے جب آپ کسی کو کمانڈر بنا کر جنگ پر بھجواتے تھے۔ چنانچہ **مسلم جلد ۲ کتاب الجہاد** میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی لشکر یا دستہ فوج کا کسی کو افسر بنا کر بھجواتے تھے تو آپ اُسے اور دوسرے مسلمانوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور پھر فرماتے اُغْزُوْا بِسْمِ اللّٰہِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اور اللہ تعالیٰ کی خاطر جنگ کے لئے جاؤ۔ قَاتِلُوْا مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ اس شخص کے ساتھ جنگ کرو جو اللہ تعالیٰ کا کفر اختیار کرے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ تم کافر سے لڑو بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جس شخص سے تمہاری لڑائی ہے اگر وہ مسلمان ہو جائے تو پھر تم نے اس سے لڑنا نہیں تمہیں لڑائی کی صرف اس وقت تک اجازت ہے جب کفر باللہ کی شرط موجود ہے۔ اگر کسی شخص نے لڑائی تو شروع کی مگر جب تمہارا لشکر پہنچا تو اس نے کہہ دیا کہ میں اسلام اختیار کرتا ہوں تو بس لڑائی ختم ہو جائے گی۔ وَلَا تَغُلُّوْا اور قطعی طور پر خیانت سے کام نہ لو۔ وَلَا تَغْدِرُوْا اور بدعہدی نہ کرو۔ دھوکہ بازی سے کام نہ لو۔ اگر تم اپنے دشمن سے کوئی وعدہ کر لو تو بعد میں اُسے کسی بہانہ سے توڑنے کی کوشش نہ کرو۔ وَلَا تُمَثِّلُوْا اور تم مثلہ نہ کرو یعنی کفار اپنی رسم کے مطابق اگر مسلمان مقتولین کے ناک کان بھی کاٹ دیں تو بھی تم ان کے مُردوں کے ساتھ یہ سلوک نہ کرو۔ وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِیْدًا اور کسی نابالغ بچے کو نہ مارو کیونکہ وہ جنگ میں شامل نہیں ہوا۔ (**مسلم کتاب الجہاد باب تأمیر الامام الامراء علی البعوث......**) سیرتِ حلبیہ میں اس کے

علاوہ بعض اور نصائح بھی درج ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو جنگ پر جاتے وقت یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ لَا تَقْتُلُوْا اِمْرَءَۃً۔ کسی عورت کو نہیں مارنا وَلَا کَبِیْرًا فَانِیًا اور کسی بڑھے شخص کو بھی نہیں مارنا۔ وَلَا مُعْتَزِلًا بِصَوْمَعَۃٍ۔ اور عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی نہیں مارنا۔ کیونکہ گو وہ ایک ایسی قوم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جو تمہاری مخالف ہے مگر وہ خدا کا نام لیتے ہیں پھر فرماتے وَلَا تَقْرَبُوْا نَخْلًا۔ کسی کھجور کے درخت کے قریب بھی نہ جانا یعنی کھجور کو نقصان پہنچانے کا خیال بھی نہ کرنا۔ کیونکہ اس سے ان کے رزق پر اثر پڑتا ہے اور تمہارا حملہ ان کے حملے کو دور رکھنے کی نیت سے ہے ان کو مستقل تباہ کرنے کی غرض سے نہیں۔ وَلَا تَقْطَعُوْا شَجَرًا بلکہ کوئی درخت بھی نہ کاٹنا کیونکہ وہ غریبوں اور مسافروں کو سایہ دینے کے کام آتا ہے اور تم لڑنے کے لئے جارہے ہو اس لئے نہیں جارہے کہ وہ قوم سایہ سے بھی محروم ہو جائے۔ وَلَا تَھْدِمُوْا بِنَاءً۔ اسی طرح عمارتوں کو مت گراؤ۔ قلعہ کا انہدام ایک علیٰحدہ چیز ہے۔ وہ جنگ کے حملے کو روکنے کے لئے ہوتا ہے۔ مگر یہ جائز نہیں کہ کسی ملک کے باشندوں کو بے گھر کر دیا جائے اور ان کے مکانوں کو گرا دیا جائے یا انہیں آگ لگا دی جائے۔ اسی طرح آپ کی دوسری ہدایات میں ہے کہ ملک میں ڈر اور ہراس پیدا نہ کیا جائے۔ دنیوی حکومتیں جب کسی ملک میں داخل ہوتی ہیں تو اندھا دھند مظالم شروع کر دیتی ہیں محض اس لئے کہ حکومت کا رعب قائم ہو جائے۔ مگر اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مفتوحہ ممالک میں جاؤ تو ایسے احکام جاری کرو جن سے لوگوں کو آسانی ہو تکلیف نہ ہو (السیرۃ الحلبیۃ باب سرایاہٗ و بعوثہ)۔ اور فرمایا جب لشکر سڑکوں پر چلے تو اس طرح چلے کہ عام مسافروں کا راستہ نہ رکے۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں ایک دفعہ لشکر اس طرح نکلا کہ لوگوں کے لئے اپنے گھروں سے نکلنا اور راستہ چلنا مشکل ہو گیا اس پر آپ نے منادی کروائی کہ جس نے مکانوں کو بند کیا یا راستہ روکا اس کا جہاد جہاد ہی نہیں رہے گا۔

غرض اسلام کہتا ہے کہ تم کو جنگ میں عورتوں کے مارنے کی اجازت نہیں تم کو بچوں کے مارنے کی اجازت نہیں۔ تم کو بڈھوں کے مارنے کی اجازت نہیں۔ تم کو بدعہدی کرنے کی اجازت نہیں۔ تم کو دھوکا دینے کی اجازت نہیں۔ تم کو مقتولین کے ناک کان کاٹنے کی اجازت نہیں۔ تم کو پادریوں اور پنڈتوں اور گیانیوں کو مارنے کی اجازت نہیں۔ تم کو کوئی باغ اور درخت کاٹنے کی اجازت نہیں۔ تم کو کوئی عمارت گرانے کی یا اُسے آگ لگانے کی اجازت نہیں اور اگر کبھی ان ہدایات کی خلاف ورزی ہوئی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ عرب کے دستور کے مطابق عورتیں بھی لڑائی میں شامل ہوتی تھیں اور چونکہ وہ دوسروں کو قتل کرتی تھیں لازماً وہ خود بھی قتل کی جاتی تھیں مگر ایک موقعہ پر ایک لڑائی کے بعد جب ایک عورت کی لاش آپ نے دیکھی تو آپ کے چہرے پر غم

اور غصہ کے آثار ظاہر ہوئے اور آپ نے فرمایا اسلام اس کو پسند نہیں کرتا یہ فعل اسلامی تعلیم کے خلاف ہوا ہے (مسلم کتاب الجهاد و السير باب تحريم قتل النساء و الصبيان فی الحرب) اُحد کی جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تلوار پیش کی اور فرمایا یہ تلوار میں اس شخص کو دوں گا جو اس کا حق ادا کرنے کا وعدہ کرے۔ بہت سے لوگ اس تلوار کو لینے کے لئے کھڑے ہوئے آپ ابودجانہؓ انصاری کو وہ تلوار دی۔ لڑائی میں ایک جگہ مکہ والوں کے کچھ سپاہی ابودجانہؓ پر حملہ آور ہوئے۔ جب آپ ان سے لڑ رہے تھے تو آپ نے دیکھا کہ ایک سپاہی سب سے زیادہ جوش کے ساتھ لڑائی میں حصہ لے رہا ہے۔ آپ نے تلوار اُٹھائی اور اس کی طرف لپکے لیکن پھر اس کو چھوڑ کر واپس آ گئے۔ آپ کے کسی دوست نے پوچھا۔ آپ نے اُسے کیوں چھوڑ دیا؟ آپ نے جواب میں کہا۔ میں جب اس کے پاس گیا تو اس کے منہ سے ایک ایسا فقرہ نکلا جس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے ان کے ساتھی نے کہا بہر حال وہ سپاہیوں کی طرح فوج میں لڑ رہی تھی۔ پھر آپ نے اُسے چھوڑا کیوں؟ ابوُجانہؓ نے کہا میرے دل نے برداشت نہ کیا کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تلوار کو ایک کمزور عورت پر چلاؤں (السيرة النبوية ابن هشام غزوة احد)۔ غرض آپ عورتوں کے ادب اور احترام کی ہمیشہ تعلیم دیتے تھے جس کی وجہ سے کفار کی عورتیں زیادہ دلیری سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی تھیں مگر پھر بھی مسلمان ان باتوں کی برداشت کرتے چلے جاتے تھے۔ صرف ایک ہی عورت تھی جس نے شروع سے لے کر آخر تک اسلام کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا اور مسلمان شہداء کے ناک اور کان کاٹ لینے میں بہت مشہور تھی یعنی ہندہ۔ فتح مکہ کے وقت آپ نے صرف اس کے قتل کا حکم دیا مگر وہ باقی عورتوں کے ساتھ آئی اور مسلمان ہو گئی اور پھر آپ نے اُسے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ آپ نے فرمایا توبہ نے اس کے سارے گناہوں کو دھو دیا ہے (السيرة الحلبية باب ذكر مغازيهٗ فتح مكة شرفها الله تعالىٰ)۔

چوتھی شرط وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ کے الفاظ میں یہ بیان فرمائی کہ باوجود دشمن کے حملہ میں ابتداء کرنے کے لڑائی کو صرف اس حد تک محدود رکھنا چاہیے جس حد تک دشمن نے محدود رکھا ہے اور اسے وسیع کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ نہ علاقہ کے لحاظ سے اور نہ ذرائع جنگ کے لحاظ سے اور فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حد سے زیادہ گذر جانے والوں سے محبت نہیں کرتا یا یوں کہو کہ جو لوگ حد سے گذر جانے والے ہوں وہ کبھی خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا شخص طبعی طور پر اللہ تعالیٰ سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ حق کا مطالبہ کرنے میں حد سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کو غصہ آ گیا اور اس نے دوسرے کو تھپڑ مار دیا تو اب یہ ایک غلطی تو ہے جس کی اُسے سزا ملنی چاہیے مگر یہ سزا اتنی ہی ہو سکتی ہے کہ ہم اُسے بلائیں اور ڈانٹ دیں کہ تم نے فلاں کو

تھپڑ کیوں مارا لیکن بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جس شخص سے قصور سرزد ہوا ہو جب تک وہ اس کا قیمہ نہ کرلیں ان کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ اور پھر یہیں تک بس نہیں کرتے بلکہ چاہتے ہیں کہ جب وہ اگلے جہان میں پہنچے تو وہاں بھی خدا اس کو دوزخ میں ڈالے اور اُسے ایسا عذاب دے جو کسی اور کو نہ دیا گیا ہو حالانکہ خدا بڑا رحیم و کریم ہے وہ حد سے گذرنے والوں سے محبت نہیں کرتا اور نہ حد سے گذرنے والا خدا تعالیٰ سے محبت کرسکتا ہے۔ اس زمانہ میں بڑی بڑی طاقتیں اس بات کی مدعی ہیں کہ انہوں نے عدل و انصاف کو کمال تک پہنچا دیا ہے مگر ان کی حالت یہ ہے کہ وہ لڑائی میں ہر قسم کے جھوٹ اور ظلم اور دھوکا اور فریب سے کام لیتی ہیں اور جب تک دشمن کو پیس نہ لیں ان کے دل کی آگ ہی نہیں بجھتی کہیں گیسیں استعمال کی جاتی ہیں تو کہیں قیدیوں کو پکڑ کر لڑائی کے وقت اپنے آگے رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح اور کئی ظالمانہ طریق اختیار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ بھی اعتداء میں داخل ہے کہ دشمن کا لباس پہن کر یا اس کا نشان دکھا کر حملہ کر دیا جائے یا صلح کے بہانہ سے حملہ کیا جائے یہ تمام امور ناجائز اور اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں۔

بہرحال اوپر کی دونوں آیات سے مندرجہ ذیل چھ امور کا استنباط ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ مستنبط ہوتی ہے کہ غیر شرعی طریق سے جائز کام بھی ناجائز ہو جاتا ہے کیونکہ فرماتا ہے کہ اپنے گھروں میں جن میں داخل ہونے کا تم کو ہر وقت اور پورا اختیار ہے ان میں بھی اگر تم دیواریں پھاند پھاند کر داخل ہو تو یہ امر خدا تعالیٰ کے نزدیک نیکی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس مثال سے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لئے ایک رستہ بنایا ہے۔ اگر تو انسان اس رستہ سے اس کام کو کرتا ہے تو اس کا کام نیکی قرار دیا جائے گا۔ لیکن اگر کام نیک ہو مگر اس کے کرنے کا طریق غلط ہو تو پھر وہ عمل نیک نہیں رہے گا۔ مثلاً نماز ایک نیکی ہے لیکن اگر کوئی شخص بغیر وضو کے نماز پڑھے یا پہلے نماز پڑھ لے بعد میں وضو کرے یا بے وقت نماز پڑھے تو باوجود اس کے کہ وہ نماز پڑھے گا جو ایک عبادت ہے وہ اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کر سکے گا بلکہ ایک بدی کا مرتکب ہوگا۔ بعینہٖ اسی طرح اظہار غضب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غیرت کو ایک نیکی قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بھی نہایت غیرت مند ہے اور وہ بری باتوں پر اظہار غضب بھی کرتا ہے لیکن غیرت کے جائز موقعہ پر بھی اگر کوئی شخص غیرت کا اظہار غلط طریق پر کرے اور شریعت جس موقعہ پر غضب کی اجازت دیتی ہے غضب کو اسی موقعہ پر ظاہر کرے لیکن اس کا طریق بدل دے تو یہ گناہ ہو جائے گا مثلاً شریعت اظہار غیرت یا اظہار غضب کا یہ طریق بتائے کہ اس جگہ سے مومن اُٹھ جائے مگر مومن اس جگہ سے بجائے اُٹھ جانے کے لڑنے لگے تو شریعت اس مومن کو بھی گنہگار قرار دے گی۔

دوسری بات جو اس آیت سے مستنبط ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نیکی تقویٰ کا نام ہے۔ یعنی نیک کام کو نیک راہ سے

بجالانا۔ پس مومن کا فرض ہے کہ ہر گھر میں اس کے دروازہ سے داخل ہو یعنی ہر نیک کام کے لئے خدا تعالیٰ نے جو طریق تجویز کیا ہے اس طریق سے اس کام کو کرے۔ جو شخص اس طریق سے کام نہ کرے وہ نیک نہیں کہلا سکتا۔

تیسری بات جو مذکورہ بالا آیات سے مستنبط ہوتی ہے یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اوپر کے بتائے ہوئے راستہ میں ہے بلکہ خود انسان کی کامیابی بھی اسی راہ پر چلنے میں ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی یہ حکم ہم نے یونہی نہیں دیئے۔ تمہاری ترقی اور کامیابی بھی اسی طریق سے وابستہ ہے۔ کامیابی کا اس امر کے ساتھ وابستہ ہونا ایک ظاہر امر ہے جو راستے کسی عمارت میں داخل ہونے کے ہوں جب انسان ان راستوں سے داخل ہو تبھی وہ بغیر کسی تکلیف کے اپنے مدعا کو پا سکتا ہے۔ اگر ان راستوں کو چھوڑ کر دیواریں پھاندنی شروع کر دے تو اس کی تکلیف بڑھ جائے گی اور اس کی حماقت کی بھی لوگ شکایت کرنے لگیں گے۔

چوتھی بات اس آیت سے یہ مستنبط ہوتی ہے کہ کسی شخص پر جارحانہ حملہ کرنا خلاف شریعت ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ۔ یہ تو تمہارے لئے جائز ہے کہ اگر کوئی تم پر قاتلانہ حملہ کرے تو تم اپنا بچاؤ کرو۔ لیکن تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم خود کسی پر جا کر حملہ کرو۔

پانچواں استنباط ان آیات سے یہ ہوتا ہے کہ دفاع بھی وہ جائز ہے جو مقررہ حدود کے اندر ہو۔ یعنی دفاع میں بھی انسان پوری طرح آزاد نہیں۔ اس کے لئے بھی قیود اور شرائط ہیں اور ان قیود اور شرائط سے آزاد ہو کر جو دفاع کیا جائے وہ بھی ناجائز اور حرام ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو تھپڑ مارے تو جس شخص کو تھپڑ مارا گیا ہے اس کے لئے یہ درست نہ ہوگا کہ اس تھپڑ کی سزا کے لئے دوسرے شخص کا سر پھوڑ دے۔

چھٹی بات اس آیت سے یہ مستنبط ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان قیود کو توڑے تو باوجود مظلوم ہونے کے خدا تعالیٰ کی نظروں سے وہ گر جائے گا۔ کیونکہ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ اگر تم دفاع میں بھی اعتداء سے کام لو اور خدا تعالیٰ کی مقررہ قیود کو نظر انداز کر دو تو تم اللہ تعالیٰ کی محبت کھو بیٹھو گے اور اس کی نصرت تم سے جاتی رہے گی۔

وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ

اور جہاں بھی ان (ناحق لڑنے والوں) کو پاؤ انہیں قتل کرو۔ اور تم (بھی) انہیں اس جگہ سے نکال دو جہاں سے

اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ

انہوں نے تمہیں نکالا تھا۔ اور (یہ) فتنہ قتل سے (بھی) زیادہ سخت (نقصان دہ) ہے۔ اور تم ان سے مسجد حرام

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ

کے قرب (وجوار) میں (اس وقت تک) جنگ نہ کرو جب تک وہ (خود) تم سے اس میں جنگ (کی ابتداء)

فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ

نہ کریں۔ اور اگر وہ تم سے (وہاں بھی) جنگ کریں تو تم بھی انہیں قتل کرو۔ ان کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۳﴾

آجائیں تو یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْفِتْنَةُ کے معنے ہیں (۱) اَلْعَذَابُ عذاب (۲) اَلْاِبْتِلَاءُ ابتلاء (۳) اِخْتِلَافُ النَّاسِ فِي الْآرَاءِ وَمَا يَقَعُ بَيْنَهُمْ مِنَ الْقِتَالِ وہ لڑائی جو اختلافِ آراء کی وجہ سے لوگوں میں پیدا ہو۔

(اقرب)

تفسیر۔ مخالفین اسلام کے نزدیک اس آیت میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جہاں کوئی کافر ملے اُسے مار ڈالو۔ مگر اس میں ہرگز یہ نہیں کہا گیا کہ جہاں کوئی کافر ملے اسے تہ تیغ کردو بلکہ اس جگہ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ کے حکم کے ماتحت صرف وہ کفار آتے ہیں جن کا پہلے ذکر آچکا ہے اور جنہوں نے مسلمانوں سے عملاً جنگ شروع کر دی تھی ایسے لوگوں کے ساتھ لڑائی جاری رکھنے میں نہ اخلاقاً کوئی اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ شرعاً۔ اور حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جہاں کہیں بھی تمہاری اور ان کی جنگ کے ذریعہ سے مٹھ بھیڑ ہو جائے وہاں تم ان سے جنگ کرو۔ یہ نہیں کہ اِکّا دُکّا ملنے پر حملہ کرتے پھرو بلکہ تمہاری جنگ صرف باقاعدہ فوج کے ساتھ ہونی چاہیے۔ خواہ وہ فوج ہو جس نے مقابلہ میں ابتداء کی ہے یا اُسی فوج کا کوئی دوسرا حصہ ہو جو اس کی مدد کر رہا ہو۔

پھر فرمایا وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ اور تم بھی انہیں اس جگہ سے نکال دو جس جگہ سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ ان الفاظ میں یہ پیشگوئی مخفی تھی کہ ایک زمانہ میں مسلمان ایسی طاقت حاصل کرلیں گے کہ وہی مقام جہاں سے انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس میں مسلمانوں کو فاتحانہ طور پر داخل کرے گا۔ اور یا تو مسلمان کفار کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے اور یا کفار مسلمانوں کی منتیں کرتے

اور ان کے آگے ہاتھ جوڑتے دکھائی دیں گے۔ اسی غلبہ کی طرف سورۃ توبہ میں بھی بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖٓ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ (التوبۃ:۱) کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ مشرکین مکہ کہتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ تو یہ ہے کہ میں مکی نبی ہوں جس کی پیشگوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی مگر یہ تو مکہ چھوڑ کر مدینہ چلا گیا ہے۔ پھر یہ پیشگوئی کس طرح پوری ہوئی؟ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ اب خدا تعالیٰ نے عرب کو فتح کر کے جس کے بغیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں نہیں آسکتے تھے اس اعتراض کو دور کر دیا ہے اور آپ اور آپ کے ساتھی اس الزام سے بری ہو چکے ہیں اس کے بعد فرمایا فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰہِ (التوبۃ:۲) تم ملک عرب میں چار مہینے تک پھر کر دیکھ لو اور جان لو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے یعنی اس سفر کے نتیجہ میں تمہیں اقرار کرنا پڑے گا کہ اسلام عرب کے کونہ کونہ پر غالب آچکا ہے۔ اور تمہارے تمام اعتراضات غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ پس اَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ میں اسی غلبہ کی پیشگوئی ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح انہوں نے تم کو ظالمانہ طور پر ملک سے نکالا ہے اسی طرح تم بھی ان کا تصرف وہاں سے ہٹا دو۔ اس جگہ اَخْرِجُوْھُمْ سے ان کا نکالنا مراد نہیں۔ بلکہ ان کے تصرف کو مٹانا مراد ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ کو وہاں سے نکالا نہیں بلکہ ان کی اولاد کو خود آپ نے مکہ میں رہنے کی اجازت دی۔ چنانچہ ابوجہل جو سب سے بڑا مشرک اور دشمن اسلام تھا فتح مکہ کے موقعہ پر اس کے بیٹے عکرمہ نے بھاگ کر ایبے سینیا جانے کا ارادہ کیا اور وہ مکہ سے چلا بھی گیا مگر اس کی بیوی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کر لی اور وہ مکہ میں آزادانہ طور پر رہنے لگ گیا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام، ذکر فتح مکۃ)۔ پس چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل نے اس کی تشریح کر دی ہے اس لئے اَخْرِجُوْھُمْ میں کفار کے جبری نکالنے کا کوئی حکم نہیں بلکہ وہاں سے ان کا تصرف دور کرنے کا ذکر ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کو نکالنے کا حکم ہے جو شریر ہوں اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں جاری رکھنے والے ہوں اور ایسے لوگوں کو دنیا کی ہر حکومت نکالتی ہے اور اس میں کسی قسم کا حرج نہیں سمجھتی۔

وَالْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ پھر فرماتا ہے یاد رکھو قتل اور لڑائی کی نسبت دین کی وجہ سے کسی کو فتنہ میں ڈالنا زیادہ خطرناک گناہ ہے پس تم ایسا طریق مت اختیار کرو۔ کیونکہ یہ بے دین لوگوں کا کام ہے۔

اس جگہ فتنہ سے مراد وہی دورِ آزمائش ہے جس میں سے مسلمان گذر رہے تھے اور جس کا اس سے پہلے ان الفاظ میں ذکر آچکا ہے کہ کفار بلا وجہ محض دینی اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں کو مارتے اور انہیں اپنے گھروں سے

نکالتے ہیں۔ فرماتا ہے دین کی وجہ سے لوگوں کو دکھ دینا اور انہیں ان کے گھروں سے نکالنا دنیوی لڑائیوں اور عام سیاسی جنگوں کی نسبت کہ جن میں قومی حقوق وغیرہ کا سوال پیدا ہوجاتا ہے بہت زیادہ ہولناک جرم ہے کیونکہ دنیا دین کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اور یہ بھی کہ فتنہ یعنی مومنوں کی تعذیب اس غرض سے کہ وہ اپنے دین کو چھوڑ دیں قتل سے بڑھ کر ہے۔ کیا بلحاظ اس کے کہ دین کے معاملہ میں جان کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور کیا بلحاظ اس کے کہ ایسے ظلم کا نتیجہ نہایت خطرناک فساد ہوتا ہے اور ذہنی آزادی جاتی رہتی ہے اور دلوں میں بغض پیدا ہوجاتا ہے۔ پس فرمایا کہ ان کو قتل کرنا کوئی ظلم نہیں کیونکہ قتال تو قتال سے ہی جائز ہوجاتا ہے اور یہ لوگ تو قتال سے بڑھ کر مذہبی دست اندازی اور مذہب کی خاطر تعذیب سے بھی کام لیتے ہیں جو قتال سے بڑھ کر ہے۔

پھر وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ بیشک قتل ایک بہت بُرا فعل ہے۔ مگر فتنہ پیدا کرنا اس سے بھی زیادہ بُری چیز ہے کیونکہ اس سے لاکھوں بلکہ کروڑوں جانیں ضائع چلی جاتی ہیں۔ قتل کرنے سے تو صرف ایک یا چند جانیں ضائع ہوتی ہیں لیکن ایک فتنہ پرداز شخص بعض دفعہ ایسی بات کر دیتا ہے جس سے قومیں آپس میں لڑ پڑتی ہیں اور جماعتوں میں تفرقہ اور شقاق پیدا ہوجاتا ہے۔ فتنہ باز لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے تو معمولی بات کہی تھی مگر ان کا ایک معمولی بات کہنا دراصل ایک زہر ہوتا ہے جس کا دور دور تک اثر پھیلتا ہے اور پھر اس سے خطرناک لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں جن سے لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ بیشک فتنہ شروع میں چھوٹا نظر آتا ہے مگر اس کا انجام بہت بڑا ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے قتل سے بھی منع کیا ہے مگر فتنہ سے اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ منع کیا ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ عام طور پر قتل سے تو بچنے کی کوشش کرتے ہیں مگر فتنہ سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے حالانکہ جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں کہ فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر بُرا فعل ہے اس وقت تک دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔

وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ۔ اب فرماتا ہے کہ تم مسجد حرام کے پاس ان سے اس وقت تک جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ خود جنگ کی ابتداء نہ کریں کیونکہ اس طرح حج اور عمرہ کے راستہ میں روک پیدا ہوتی ہے۔ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ہاں اگر وہ خود ایسی جنگ کی ابتداء کریں تو پھر تم مجبور ہو اور تمہیں جواب دینے کی اجازت ہے۔ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۔ اور جو لوگ عقل اور انصاف کے احکام کو رد کر دیتے ہیں ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ اس آیت میں یہ ہدایت دی گئی کہ اس امر کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ مذہبی عبادتوں اور مذہبی فرائض

کی ادائیگی میں روکیں پیدا نہ ہوں اگر دشمن کسی ایسی جگہ پر جنگ کی طرح نہ ڈالے جہاں جنگ کرنے سے مذہبی عبادتوں میں رخنہ پیدا ہوتا ہو تو مسلمانوں کو بھی اس جگہ جنگ نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اگر دشمن خود مذہبی عبادت گاہوں کو لڑائی کا ذریعہ بنائے تو پھر مجبوری ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ عبادت گاہوں کے اردگرد بھی لڑائی نہیں ہونی چاہیے۔ کجا یہ کہ عبادت گاہوں پر براہ راست حملہ کیا جائے یا ان کو مسمار کیا جائے۔ یا ان کو توڑا جائے۔ ہاں اگر دشمن خود عبادت گاہوں کو لڑائی کا قلعہ بنالے تو پھر ان کے نقصان کی ذمہ داری اس پر ہے مسلمانوں پر نہیں۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ہاں اگر انہیں ہوش آجائے اور وہ اس بات سے رُک جائیں تو اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا مہربان ہے یعنی اگر دشمن مذہبی مقامات میں لڑائی شروع کرنے کے بعد اس کے خطرناک نتائج کو سمجھ جائے اور مذہبی مقام سے نکل کر دوسری جگہ کو میدان جنگ بنالے تو مسلمانوں کو اس بہانہ سے ان کے مذہبی مقاموں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے کہ اس جگہ پر پہلے ان کے دشمنوں نے لڑائی شروع کی تھی بلکہ فوراً ان مقامات کے ادب اور احترام کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے حملہ کا رُخ بدل دینا چاہیے۔

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ

اور تم ان سے اس وقت تک جنگ کرو کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین اللہ ہی کے لئے ہوجائے

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

پھر اگر وہ باز آجائیں (تو یاد رکھو کہ) ظالموں کے سوا کسی پر گرفت (جائز) نہیں۔

تفسیر۔ فرماتا ہے چونکہ کفار تم سے لڑائی شروع کر چکے ہیں اس لئے تم بھی اس وقت تک لڑائی جاری رکھو جب تک کہ دین میں دخل اندازی کرنے کے طریق کو وہ چھوڑ نہ دیں۔ اور یہ تسلیم نہ کرلیں کہ دین کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس میں جبر کرنا کسی انسان کے لئے جائز نہیں۔ اگر وہ یہ طریق اختیار کرلیں اور دین میں دخل اندازی سے باز آجائیں تو فوراً لڑائی بند کردو کیونکہ سزا صرف ظالموں کو دی جاتی ہے اور اگر وہ اس قسم کے ظلم سے باز آجائیں تو پھر ان سے لڑائی کرنا جائز نہیں ہوسکتا۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے اَلْفِتْنَةُ فرمایا تھا اور کہا تھا کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ مگر اس

جگہ صرف فِتْنَۃٌ فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں فتنہ کفار اور قتال کا مقابلہ کرنا تھا پس معرفہ لانا ضروری تھا اور اس جگہ مقابلہ نہ تھا پس نکرہ لایا گیا تا کہ عظمتِ فتنہ پر دلالت کرے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ تم اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک کہ یہ عظیم الشان فتنہ دور نہ ہو جائے۔

بعض لوگوں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ تم یہاں تک لڑو کہ کفر باقی نہ رہے (قرطبی)۔لیکن یہ معنے غلط ہیں۔ اس جگہ فتنہ سے مراد کفر نہیں بلکہ دین میں دخل اندازی ہے جس کا سورۃ الحج کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۔ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج: ۴۰۔۴۱) یعنی اس لئے کہ مسلمانوں پر ظلم کیا گیا ان مسلمانوں کو جن سے دشمن نے لڑائی شروع کر رکھی ہے آج جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یقیناً ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ہاں ان مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جن کو ان کے گھروں سے بغیر کسی جرم کے نکال دیا گیا۔ان کا صرف اتنا ہی جرم تھا (اگر یہ کوئی جرم ہے) کہ وہ کہتے تھے اللہ ہمارا رب ہے۔اور اگر اللہ تعالیٰ بعض ظالم لوگوں کو دوسرے عادل لوگوں کے ذریعہ سے ظلم سے روکتا نہ رہے تو گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں خدا تعالیٰ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ظالموں کے ہاتھ سے تباہ ہو جائیں۔پس دنیا میں مذہب کی آزادی قائم رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ مظلوموں کو اور ایسی قوموں کو جن کے خلاف دشمن پہلے جنگ کا اعلان کر دیتا ہے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ لڑائی صرف اس وقت تک جاری رکھنی چاہیے جب تک فتنہ باقی رہے۔یعنی لوگ تبدیل مذہب کے لئے ایک دوسرے کو مجبور کرتے رہیں۔اگر یہ حالات بدل جائیں مذہبی دست اندازی ختم ہو جائے اور دین کے معاملہ کو صرف ضمیر کا معاملہ قرار دیا جائے تو خواہ دشمن حملہ میں ابتداء کر چکا ہو سوائے دفاع کے اس کے ساتھ لڑائی نہیں کرنی چاہیے۔ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہؓ کرام نے بھی اس آیت کے یہی معنے سمجھے ہیں۔چنانچہ بخاری میں آتا ہے کہ ایک شخص اس زمانہ میں جبکہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان جنگ جاری تھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آ کر کہنے لگا کہ آپ حضرت علیؓ کے زمانہ کی جنگوں میں کیوں شامل نہیں ہوتے حالانکہ قرآن کریم میں صاف حکم موجود ہے کہ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔انہوں نے جواب دیا کہ فَعَلْنَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ كَانَ الْاِسْلَامُ قَلِيْلًا فَكَانَ الرَّجُلُ يُفْتَنُ فِيْ دِيْنِهٖ اِمَّا قَتَلُوْهُ وَ اِمَّا يُعَذِّبُوْهُ حَتّٰى كَثُرَ الْاِسْلَامُ فَلَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ البقرۃ باب قولہ

و قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ) یعنی ہم نے یہ حکم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پورا کر دیا ہے جبکہ اسلام بہت قلیل تھا اور آدمی کو اس کے دین کی وجہ سے فتنہ میں ڈالا جاتا تھا یعنی یا تو اُسے قتل کیا جاتا تھا یا عذاب دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اسلام پھیل گیا پھر کسی کو فتنہ میں نہیں ڈالا جاتا تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک فتنہ نہ رہنے سے یہ مراد ہے کہ لوگ دینی معاملات میں جبر و اکراہ سے کام نہ لیں اور محض دین قبول کرنے کی وجہ سے نہ کسی کو قتل کریں۔ اور نہ کسی قسم کا اور عذاب دیں۔ اگر یہ معنے نہ ہوتے تو فَاِنِ انْتَهَوْا کیوں آتا؟ کیونکہ یہ تو لوگوں کے بتائے ہوئے معنوں کے خلاف پڑتا ہے اور ہمارے معنوں کے مطابق ہے۔

وَ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ کے الفاظ نے بھی مذکورہ بالا حصہ کی تشریح کر دی اور بتا دیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دین کا اختیار کرنا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہو جائے اور اس کے متعلق کسی اور کا ڈر نہ ہو۔ گویا دین کے اختیار کرنے کے بارہ میں ہر شخص کو کامل آزادی حاصل ہو جائے اور اگر لوگ مسلمان ہونا چاہیں تو وہ بغیر کسی خوف کے ہو سکیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں جبر کی تعلیم نہیں دی گئی۔ اگر جبر کی تعلیم ہوتی اور اس وقت تک جنگ جاری رکھنا ضروری ہوتا جب تک تمام لوگ مسلمان نہ ہو جائیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی مشرکوں سے صلح کے معاہدات نہ کرتے۔ پس یہ کہنا کہ اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ مشرکوں سے اس وقت تک لڑائی جاری رکھو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور کفر اور شرک مٹ نہ جائے بالکل غلط ہے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے بدلہ میں ہے۔ اور سب (ہی) عزت والی چیزوں (کی ہتک) کا بدلہ لیا

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى

جاتا ہے۔ اس لئے جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر (اس کی) زیادتی کا جس قدر کہ اس نے تم پر زیادتی کی ہو

عَلَيْكُمْ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

بدلہ لے لو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ اللہ یقیناً متقیوں کے ساتھ (ہوتا) ہے۔

حل لغات۔ اَلْحَرَامُ کے معنے ہیں اَلْمَمْنُوْعُ مِنْهُ جس چیز سے روکا گیا ہو۔ (مفردات)

اِعْتَدُوْا عَلَیْہِ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ کسی فعل کے بدلہ کے لئے بھی وہی لفظ بولا جاتا ہے جو اس فعل کے لئے بولا جائے۔ چنانچہ صاحب مفردات نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ اَیْ قَابِلُوْہُ بِحَسْبِ اِعْتِدَائِہٖ وَ تَجَاوِزُوْا اِلَیْہِ بِحَسْبِ تَجَاوُزِہٖ۔ یعنی اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کی زیادتی کے مقابلہ میں اس کی زیادتی کے مطابق ہی سلوک کرو۔

اس کا مفصل ذکر اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ (البقرۃ:۱۶) میں گذر چکا ہے۔ اس جگہ بھی جرم کے لئے جو لفظ بولا گیا ہے وہی سزا کے لئے لایا گیا ہے۔ پس اس کے معنے ظلم کے نہیں بلکہ ظلم کی سزا کے ہیں۔

تفسیر ۔ اس میں بتایا کہ اگر کفار حرمت والے مہینوں یعنی ذوالقعدہ۔ ذوالحجہ، محرم اور رجب کا پاس کریں تو تم بھی کرو۔ اور اگر وہ نہ کریں۔ تو تمہارے لئے مجبوری ہے تم بھی مقابلہ میں اس وقت تک جنگ کر سکتے ہو جب تک کہ وہ اس سے باز نہ آجائیں۔

وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ۔ اس میں اصولی طور پر یہ تعلیم دی کہ جن چیزوں میں حرمت پائی جاتی ہے ان میں بھی قصاص کا طریق اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی چیز کی حرمت قصاص کو بالکل باطل کر دے۔ چنانچہ آگے اس کی تشریح کر دی اور صاف طور پر فرما دیا کہ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ یعنی اگر وہ تم پر زیادتی کریں اور تمہارے مقدس مقامات کا پاس نہ کریں تو تمہارے لئے بھی جائز ہے کہ تم ان کی شرارت اور زیادتی کے مطابق انہیں سزا دو۔ اور ان کے کسی مقام کی تقدیس کی پروا نہ کرو کیونکہ انہوں نے خود حرمت کو توڑا ہے۔ مگر ساتھ ہی فرمایا کہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جائز حد سے تجاوز نہ کرو اور اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کا ساتھ دیتا ہے۔ یعنی حرمات کی ہتک کا بدلہ لینے کی تو تمہیں اجازت ہے مگر تقویٰ کا بلند مقام یہ ہے کہ تم اس حکم کو اپنے سامنے رکھو کہ فَمَنْ عَفٰی وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (الشوریٰ:۴۱) یعنی جو شخص دشمن کو معاف کر دے اور اس کی معافی کے نتیجہ میں دوسرے کی اصلاح ہوتی ہو تو وہ یقیناً ایک مستحسن کام کرتا ہے اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ عربی زبان میں بعض دفعہ جزائے جُرم کے لئے بھی وہی لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے جو جرم کے متعلق استعمال ہوا ہو۔ اسی قاعدہ کے مطابق یہاں فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ کہا گیا ہے جس کے لفظی معنے تو یہ ہیں کہ جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی کہ تم پر کی گئی ہے۔ مگر مراد زیادتی کا بدلہ لینا ہے (اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں تفسیر کبیر جلد اوّل زیر آیت یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ)۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی

اور اللہ کے راستے میں (مال و جان) خرچ کرو۔ اور اپنے ہاتھوں ہی (اپنے آپ) کو ہلاکت میں مت ڈالو

التَّھْلُکَۃِ ۚۖۛ وَ اَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۶﴾

اور احسان سے کام لو اللہ (تعالیٰ) احسان کرنے والوں سے یقیناً محبت کرتا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ انہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاں کوئی تکلیف پیش آتی ہے وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والی بات ہے ہم اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں۔ حالانکہ اس کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ جہاں موت کا ڈر ہو وہاں سے مسلمان کو بھاگ جانا چاہیے اور اسے بزدلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب دشمن سے لڑائیاں ہو رہی ہوں تو اس وقت اپنے مالوں کو خوب خرچ کرو۔ اگر تم اپنے اموال کو روک لو گے تو اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان پیدا کرو گے۔ چنانچہ احادیث میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس وقت جب کہ وہ قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے کہا کہ یہ آیت ہم انصار کے بارہ میں نازل ہوئی تھی اور پھر انہوں نے بتایا کہ پہلے تو ہم خدا تعالیٰ کے رستہ میں اپنے اموال خوب خرچ کیا کرتے تھے۔ لیکن جب خدا تعالیٰ نے اپنے دین کو تقویت اور عزّت دی اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا تو قُلْنَا ھَلُمَّ نُقِیْمُ فِیْٓ اَمْوَالِنَا وَنُصْلِحُھَا (ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی قوله لا تلقوا بایدیکم الی التهلكة) ہم نے کہا کہ اگر اب ہم اپنے مالوں کی حفاظت کریں اور اسے جمع کریں تو یہ اچھا ہوگا۔ اس وقت یہ آیت اُتری کہ اللہ تعالیٰ کے رستہ میں اپنے اموال خرچ کرنے سے دریغ نہ کرو۔ کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہو۔ پس اپنے مالوں کو جمع نہ کرو۔ بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے رستہ میں خوب خرچ کرو۔ ورنہ تمہاری جانیں ضائع چلی جائیں گی۔ دشمن تم پر چڑھ آئیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

وَاَحْسِنُوْا اور اپنے فرائض کو عمدگی سے ادا کرو یا اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں مالی وسعت عطا فرمائی ہے تو اپنے نادار اور غریب بھائیوں کے اخراجات بھی برداشت کرو اور نیکی کی نئی سے نئی راہیں تلاش کرتے رہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نیکی

کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غرباء کی امداد کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ تم زکوٰۃ اور عُشر وغیرہ مقررہ ٹیکس بھی دو مگر اس کے علاوہ ہم تم سے بعض طوعی ٹیکس بھی مانگتے ہیں۔ چنانچہ ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ ہمیشہ غرباء کی امداد کے لئے روپیہ دیتے رہو۔ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ اور اپنے نفسوں کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ یعنی اے مالدارو! اگر تم اپنے زائد مال خوشی سے دے دوگے تو وہ تو زائد ہی ہیں تم کو کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن اگر تم ایسا نہیں کروگے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ یہ الفاظ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے زارِ روس کے ساتھ ہونے والے واقعات کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اگر ایسا نہ کروگے تو جو کچھ زارِ روس اور روسی امراء یا فرانس کے امراء کا حال ہوا وہی تمہارا ہوگا۔ آخر عوام ایک دن تنگ آکر لوٹ مار پر اُتر آئیں گے۔ اور شاہ پوری محاورہ کے مطابق دُعائے خیر پڑھ دیں گے۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس محاورہ کی تشریح یہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے علاقے میں کچھ مدت پہلے زمیندار بنیئے سے قرض لیتے جاتے تھے اور بنیا بھی دیتا چلا جاتا تھا کچھ عرصہ تک تو انہیں اس کا احساس نہ ہوتا۔ مگر جب سب علاقہ اس بنیئے کا مقروض ہو جاتا اور زمینداروں کی سب آمد اس کے قبضہ میں چلی جاتی تو یہ دیکھ کر اس علاقے کا کوئی بڑا زمیندار تمام چودھریوں کو اکٹھا کرتا اور کہتا کہ بتاؤ اس بنیئے کا قرض کتنا ہے۔ وہ بتاتے کہ اتنا قرض ہے اس پر وہ دریافت کرتا کہ اچھا پھر اس قرضے کے اترنے کا کوئی ذریعہ ہے یا نہیں۔ وہ جواب دیتے کہ ہمیں تو کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ اس پر وہ کہتا کہ اچھا تو پھر ''دُعائے خیر پڑھ دو''۔ چنانچہ وہ سب دُعائے خیر پڑھ دیتے۔ اور اس کے بعد ہتھیار لے کر بنیئے کے مکان کی طرف چل پڑتے اور اُسے قتل کر دیتے اور اس کے بہی کھاتے سب جلا دیتے۔

اللہ تعالیٰ اس آیت میں ایسی ہی حالت کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ دیکھو ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اگر تمہارے پاس زائد مال ہو تو اُسے خدا تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کر دیا کرو۔ اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی بے شک کماؤ تو خوشی سے مگر اس دولت کو اپنے گھر میں جمع نہ رکھا کرو۔ ورنہ کسی دن لوگ تمہارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

پھر فرماتا ہے وَاَحْسِنُوْا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہم تمہیں یہ حکم دیتے ہیں کہ تم نیکی کرو اور وہ اس طرح کہ تم خود اپنی ضرورتوں کو کم کر کے اور مال بچا کر خدا تعالیٰ کی راہ میں دے دیا کرو۔ مگر یاد رکھو کہ یہ عمل تم لوگوں سے ڈر کر نہ کرو بلکہ خوشی سے کرو۔ اگر تم ڈر کر کروگے تو غریبوں کی مدد تو ہو جائے گی مگر خدا تعالیٰ خوش نہیں ہوگا۔ لیکن اگر خوشی سے یہ

قربانی کروگے تو غریب بھی خوش ہوں گے۔تم بھی ہلاکت سے بچ جاؤ گے اور خدا تعالیٰ بھی تم پر خوش ہوگا۔

پھر فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ پھر ہماری کمائی کا صلہ ہم کو کیا ملا۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا صلہ مال سے زیادہ ملے گا۔اور وہ تمہارے پیدا کرنے والے خدا کی محبت ہے۔ تمہاری دنیا کے ساتھ تمہاری عاقبت بھی درست ہوجائے گی۔

یہ معنے تو سیاقِ کلام کے لحاظ سے ہیں لیکن اس کے ایک معنے صرف اس ٹکڑہ آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ہیں کہ عبادات میں یا کھانے پینے میں یا محنت ومشقت میں یا صفائی وطہارت میں کبھی کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرو۔جس کا نتیجہ تمہاری صحت یا تمہاری جان یا تمہاری عقل یا تمہارے اخلاق کے حق میں بُرا نکلے۔تَہْلُکَۃ کا لفظ جو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا ہے اس کے معنے کسی ایسے فعل کے ہوتے ہیں جس کا انجام ہلاکت ہو اور نتیجہ بُرا نکلے۔ پس اس لفظ کے استعمال کرنے سے قرآن کریم نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ اسلام دین یا عزّت یا تمدن کی حفاظت کے لئے انسان کو اپنی جان خطرہ میں ڈالنے سے نہیں روکتا بلکہ ایسے کاموں سے روکتا ہے جن کا کوئی نیک نتیجہ برآمد ہونے کی امید نہ ہو۔اور جن میں انسان کی جان یا کسی اور مفید شے کے بلا وجہ برباد ہونے کا خطرہ ہو۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا

اور حج اور عمرہ کو اللہ (کی رضا) کے لئے پورا کرو۔پھر اگر تم (کسی سبب سے حج اور عمرہ سے) روکے جاؤ

اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰی

تو جو قربانی میسّر آئے (ذبح کرو) اور جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر (نہ) پہنچ جائے اپنے سر نہ مونڈو۔

یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ بِهٖۤ

اور جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اپنے سر (کی بیماری کی وجہ) سے اسے تکلیف (پہنچ رہی) ہو

اَذًی مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ

(اور وہ سر مونڈوا دے) اس پر (اس وجہ سے) روزوں یا صدقہ یا قربانی کی قسم سے کچھ فدیہ (واجب) ہوگا۔

نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۥ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ

پھر جب تم امن میں آجاؤ۔ تو اس وقت جو شخص عمرہ کا فائدہ (ایسے) حج کے ساتھ (ملا کر) اٹھائے

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ

تو جو قربانی بھی آسانی سے مل سکے (کردے) اور جو (کسی قربانی کی بھی توفیق) نہ پائے (اس پر) تین دن کے

اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ

روزے تو حج (کے دنوں) میں واجب ہوں گے اور سات (روزے) جب (اے مسلمانو!) تم (اپنے گھروں کو)

كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ

واپس لوٹ آؤ۔ یہ پورے دس ہوئے۔ یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس رہنے

الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۷﴾ ع ۲۴ ۸

والے نہ ہوں۔ اور تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سمجھ لو کہ اللہ کی سزا یقیناً سخت (ہوتی) ہے۔

تفسیر ۔ یہاں سے حج اور عمرہ کے احکام کا آغاز ہوتا ہے۔ حج اسلامی ارکان میں سے ایک اہم رُکن ہے۔ اور ہر شخص جو بیت اللہ کا حج کرنا چاہے اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ میقات پر پہنچنے کے بعد احرام باندھ لے۔ میقات ان مقامات کو کہتے ہیں جہاں پہنچنے پر اسلامی ہدایات کے مطابق حاجیوں کو احرام باندھنا پڑتا ہے۔ مدینہ منورہ کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذوالحلیفہ۔ شام کی طرف سے آنے والوں کے لئے جُحفہ۔ عراق کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذات عرق۔ نجد کی طرف سے آنے والوں کے لئے قرن المنازل اور یمن کی طرف سے آنے والوں کے لئے یلملم میقات مقرر ہیں۔ پاکستان سے جانے والوں کے لئے یلملم ہی میقات ہے اور حاجیوں کو جہاز میں ہی احرام باندھنا پڑتا ہے۔ جو لوگ ان میقات کے اندر رہتے ہوں انہیں احرام کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی اپنی جگہوں سے ہی احرام باندھ سکتے ہیں۔ احرام کا طریق یہ ہے کہ انسان حجامت بنوا کر غسل کرے۔ خوشبو لگائے۔ اور اس کے بعد سلے ہوئے کپڑے اتار کر ایک چادر تہہ بند کے طور پر کمر سے باندھ

لے اور دوسری چادر جسم کے اوپر اوڑھ لے۔ سر کو ننگا رکھے اور دو رکعت نفل پڑھے اور اس کے بعد اپنے اوقات کا اکثر حصہ تکبیر و تلبیہ اور تسبیح و تحمید میں بسر کرے اور بار بار لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ کہتا رہے۔ ہر نماز کے بعد خصوصیت کے ساتھ بلند آواز کے ساتھ تلبیہ کہنا چاہیے۔ محرم کے لئے سِلے ہوئے کپڑے یعنی قمیص شلوار پاجامہ یا کوٹ وغیرہ پہننا، سر کو ڈھانپنا، جرابیں پہننا، خوشبو لگانا، خوشبودار رنگوں سے رنگے کپڑے پہننا، سر منڈوانا، ناخن اتارنا، جوئیں نکالنا یا ان کو مارنا، جنگل کے کسی جانور کا شکار کرنا، شکار کے جانور کو ذبح کرنا، کسی کو شکار کے لئے کہنا یا کسی شکاری کی مدد کرنا، شہوانی تعلقات قائم کرنا یا شہوانی گفتگو کرنا، فحش کلامی کرنا یا فحش اشعار پڑھنا، فسق و فجور اور لڑائی جھگڑے میں حصہ لینا، یہ سب امور ناجائز ہوتے ہیں۔ البتہ محرم غسل کرسکتا ہے کپڑے دھوسکتا ہے اور دریائی جانور کا شکار بھی کرسکتا ہے۔ محرم عورت کے لئے بھی ان ہدایات کی پابندی ضروری ہے البتہ اُسے بے سلے کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں۔ اُسے اپنا معمولی لباس یعنی قمیص پاجامہ اور دوپٹہ ہی رکھنا چاہیے البتہ وہ برقعہ نہیں اوڑھ سکتی۔

جب حاجی حدودِ حرم میں داخل ہو (یعنی مکہ معظّمہ اور اس کے اردگرد کے علاقہ میں جو حرم کہلاتا ہے) تو وہ آدابِ حرم کو ملحوظ رکھے۔ اور جب بیت اللہ پر پہلی مرتبہ نظر پڑے تو اللہ تعالیٰ کے حضور فوراً دُعا کے لئے اپنے ہاتھ اُٹھا دے کیونکہ وہ قبولیت دُعا کا خاص وقت ہوتا ہے اس کے بعد جب بیت اللہ کے پاس پہنچے تو حجر اسود سے خانہ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کرے۔ طواف کرتے ہوئے اگر ممکن ہو تو ہر دفعہ حجر اسود کو بوسہ دینا چاہیے اور اگر ممکن نہ ہو تو صرف ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کر دینا بھی کافی ہے۔ طواف سے فارغ ہونے کے بعد دو رکعت نفل پڑھے اور پھر صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ چکر لگائے۔ صفا سے مروہ تک ایک چکر شمار ہوگا اور مروہ سے صفا تک دوسرا پھر مکہ معظّمہ میں ٹھہر کر ایام حج کا انتظار کرے جب ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ ہو تو وہ مکہ سے منیٰ چلا جائے اور وہاں پانچوں نمازیں پڑھے پھر وہاں سے دوسری صبح نماز فجر ادا کرنے کے بعد عرفات کی طرف ایسے وقت میں چلے کہ وہاں بعد زوال داخل ہو اور ظہر و عصر کی نمازیں وہاں جمع کر کے ادا کرے اور سورج کے ڈوبتے تک عرفات میں ہی رہے اور دعاؤں اور عبادت میں اپنا وقت گذارے اس کے بعد مزدلفہ مقام میں آئے۔ جہاں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھے اور وہاں رات بھر عبادت اور دعاؤں میں بسر کرے۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سورج نکلنے سے پہلے مشعر الحرام پر جا کر دُعا کرے۔ اور وہاں سے سورج نکلنے سے پہلے ہی روانہ ہو کر منیٰ پہنچے اور وہاں جا کر جمرۃ العقبہ پر سات کنکریاں مارے اور ہر دفعہ کنکر پھینکنے کے ساتھ ساتھ تکبیر کہے۔ مگر یہ کام سورج نکلنے کے بعد

کرے۔ یہاں سے فارغ ہو کر قربانی کرے۔ سر منڈوائے اور پھر اسی دن شام تک یا اگلے دن مکہ مکرمہ جا کر خانہ کعبہ کا طواف کرے۔ افضل یہ ہے کہ اسی دن شام تک جا کر کعبہ کا طواف کر آئے۔ پھر دوسرے دن منیٰ میں واپس آجائے۔ اور بعد زوال جمرۃ الدنیا۔ جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ العقبہ پر سات سات پتھر مارے۔ اسی طرح تیسرے دن اور پھر چوتھے دن بھی جو ایام تشریق کہلاتے ہیں یعنی گیارھویں بارھویں اور تیرھویں ذوالحج کو تیرھویں تاریخ کو منیٰ سے واپس آجائے اور بیت اللہ کا طواف الوداع کرے۔ جو شخص یہ تمام مناسک بجالائے وہ فریضہ حج ادا کر لیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور سرخرو ہو جاتا ہے۔

عمرہ بھی یہی ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص حرم کے اندر رہنے والا ہو تو وہ حرم سے اور اگر باہر کا ہو تو میقات سے احرام باندھے خانہ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کرے۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے اور پھر حلق یا قصر کر دے۔ اور اگر قربانی کرنا چاہے تو قربانی بھی کر دے۔ لیکن عمرہ میں قربانی لازمی نہیں ہوتی۔ حج اور عمرہ میں یہ فرق ہے کہ عمرہ کے لئے کسی خاص وقت یا مہینہ کی قید نہیں بلکہ وہ سال کے ہر حصہ میں ہو سکتا ہے جبکہ حج صرف شوال۔ ذوالقعدہ اور ذوالحج میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ ترمذی میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کے متعلق پوچھا کہ اَوَاجِبَۃٌ ؟ کیا عمرہ واجب ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لَا، وَ اَنْ تَعْتَمِرُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ عمرہ واجب تو نہیں لیکن اگر تم عمرہ کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ (ترمذی کتاب الحج باب ما جاء فی العمرۃ أواجبۃ ھی او لا)

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ۔ اس میں بتایا کہ اگر حج یا عمرہ کرنے والا کوئی شخص بیماری کی وجہ سے یا جنگ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے راستہ میں ہی روک دیا جائے اور وہ مکہ مکرمہ جا کر حج یا عمرہ نہ کر سکے تو پھر جو قربانی بھی میسّر آئے اُسے دے دینی چاہیے اور اس وقت تک احرام نہیں کھولنا چاہیے جب تک کہ قربانی محلّہ نہ پہنچ جائے۔ یعنی اس جگہ پر جہاں قربانی نے ذبح ہونا ہے۔ ابن القاسم کا قول ہے کہ اگر قربانی ساتھ ہو تب قربانی دے ورنہ نہیں اور جمہور کا قول ہے کہ جس جگہ روکا جائے وہیں قربانی کر دے اور سر منڈوا ڈالے جو سب سے آخری عمل ہے اس کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے (بحر محیط زیر آیت ھذا) امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک بھی مَحِلَّہٗ سے مراد وہی جگہ ہے جہاں حاجی کو روک دیا گیا ہو۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرم ہے۔

میرے نزدیک یہ جھگڑا فضول ہے کیونکہ اگر تو جنگ ہو اور دشمن نے اُسے روکا ہو تو وہ اس کی قربانی کو آگے کیسے جانے دے گا۔ ایسی صورت میں وہ جہاں روکا جائے وہیں قربانی کر کے حلق کر دے لیکن اگر بیماری کے سبب سے

حاجی کو روکا گیا ہو اور وہ قربانی آگے بھجوا سکتا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ قربانی کے حرم پہنچنے تک سر نہ منڈوائے اور کوشش کرے کہ وہ حرم کے اندر ہی ذبح ہو۔ اس کے بعد حلق کر دے۔ ضمنی طور پر اس آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ ایک وقت آنے والا ہے جب مسلمانوں کو بیت اللہ کی زیارت سے جبراً روک دیا جائے گا لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو کفار پر فتح عطا فرمائے گا اور وہ امن سے حج بیت اللہ کر سکیں گے۔ چنانچہ صلح حُدیبیہ میں ایسا ہی ہوا۔ باوجود اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صرف طواف کی نیت سے تشریف لے گئے تھے۔ قریش نے اطلاع ملنے پر چیتوں کی کھالیں پہن لیں اور اپنی بیویوں اور بچوں کو ساتھ لے لیا اور قسمیں کھائیں کہ وہ مر جائیں گے مگر آپؐ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آخر یہ معاہدہ طے پایا کہ اس سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر واپس چلے جائیں اور اگلے سال آکر طواف کر لیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور تمام صحابہؓ واپس چلے گئے مگر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مکہ فتح ہو گیا اور مسلمان آزادی کے ساتھ آنے جانے لگے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۔فرماتا ہے۔ اگر کوئی شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو جس کی وجہ سے اُسے سر منڈوانا پڑے۔ جیسے اس کے سر میں جُوئیں پڑ جائیں یا پھوڑے نکل آئیں تو وہ سر منڈوا سکتا ہے۔ مگر اس صورت میں اسے صیام یا صدقہ یا قربانی کا فدیہ دینا پڑے گا۔ قرآن کریم میں فدیہ کی تینوں اقسام کو غیر معین رکھا ہے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک ارشاد سے اس کی تعیین ہو جاتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ کعب بن عجرہؓ ایک صحابی تھے ان کے سر میں جُوئیں پڑ گئیں۔ اور ان کی اتنی کثرت ہو گئی کہ جوئیں ان کے منہ پر گرتی تھیں وہ کہتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر فرمایا۔ اے کعب! تجھے ان جوؤں کی وجہ سے بہت تکلیف ہے تو سر منڈوا دے اور صُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اَوْ اَطْعِمْ سِتَّةَ مَسَاكِيْنَ اَوْ اُنْسُكْ بِشَاةٍ ۔تو فدیہ کے طور پر تین دن کے روزے رکھ لے چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا ایک بکری کی قربانی دے دے (مؤطا امام مالک کتاب الحج باب فدیۃ من حلق قبل ان ینحر)۔

میرے نزدیک اس آیت میں جو فدیہ کی ترتیب ہے وہ امارت اور غربت کے لحاظ سے ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص غریب ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔ اگر متوسط درجہ کا ہو تو چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے اور اگر مالدار ہو تو قربانی دے دے۔ بہر حال قربانی مقدم ہے اور اس کے بعد صدقہ ہے اور اس کے بعد روزے ہیں اور یہ ترتیب درجہ کی بلندی کے لحاظ سے ہے۔ یعنی ادنیٰ فدیہ یہ ہے کہ تین دن کے روزے رکھے اس سے اعلیٰ فدیہ یہ ہے کہ

چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اور اس سے اعلیٰ فدیہ یہ ہے کہ ایک قربانی دے دے۔ اور یہ حکم محصر کے لئے نہیں بلکہ محصر اور غیر محصر دونوں کے لئے ہے۔ محصر کا حکم مَحِلَّهٗ تک ختم ہو گیا ہے۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ فرماتا ہے جب جنگ ختم ہو جائے یا دوسری روکاوٹیں دور ہو جائیں تو اس کے بعد جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر فائدہ اُٹھائے اور قِران یا تمتع کرے تو جو قربانی بھی آسانی سے میسّر آ سکے کر دے۔

حج اور عمرہ کے الگ الگ ادا کرنے کا ذکر تو پہلے آ چکا ہے۔ اب دونوں اکٹھے ادا کرنے کا ذکر فرماتا ہے۔ میرے نزدیک اس جگہ تمتع سے اصطلاحی تمتع مراد نہیں بلکہ قران اور تمتع دونوں مراد ہیں۔ اور تمتع کے معنے لغوی ہیں فائدہ اٹھائے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ مکہ مکرمہ میں لوگ چار رنگ میں جاتے ہیں۔ اوّل صرف حج کے لئے۔ دوم صرف عمرہ کے لئے۔ سوم تمتع کے لئے۔ چہارم قران کے لئے۔ تمتع اور قران دونوں میں قربانی واجب ہے۔ لیکن حج اور عمرہ میں نہیں۔ اسی طرح عمرہ تو سال کے دوران میں ہر وقت ہو سکتا ہے اور حج سال میں صرف ایک ہی دفعہ مقررہ ایام میں ہو سکتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص صرف عمرہ کے لئے جائے یا صرف حج کے لئے جائے اور عمرہ کی نیت نہ ہو تو یہ امر اس کے حالات پر منحصر ہے کہ وہ قربانی کرے یا نہ کرے۔ لیکن قِران جس میں عمرہ اور حج دونوں کی نیت ہوتی ہے اس میں قربانی واجب ہوتی ہے۔ قِران یہ ہے کہ اشہر الحج میں انسان میقات سے احرام باندھ کر حج اور عمرہ دونوں کی اکٹھی نیت کرے اور مکہ معظّمہ پہنچ کر عمرہ کے احکام بجا لائے اور جب تک حج سے فارغ نہ ہو احرام نہ کھولے۔ بعض کے نزدیک اس پر ایک سعی اور ایک طواف ہے اور بعض کے نزدیک دو طواف اور دو سعی۔ اور جب لوٹنا چاہے تو طواف وداع کرے۔ اس میں عمرہ کے بعد اس وقت تک احرام نہیں کھولا جاتا جب تک کہ حج نہ ہو جائے حج کرنے کے بعد احرام کھولا جاتا ہے۔ لیکن اگر تمتع کی نیت سے جائے تو اشہر الحج میں عمرہ کی نیت کر کے میقات سے احرام باندھے اور مکہ میں داخل ہو پہلے طواف کرے پھر سعی کرے۔ پھر حلق یا قصر کرے اور جب عمرہ ہو چکے تو احرام کھول دے اور ذوالحج کی آٹھویں تاریخ کو حج کے لئے پھر نیا احرام باندھے اور حج کرے۔ اس میں بھی قربانی واجب ہے۔ اس میں عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور حج کے لئے نئے سرے سے احرام باندھا جاتا ہے۔ غرض قِران اور تمتع دونوں میں قربانی واجب ہے۔ لیکن اکیلے عمرہ یا حج میں واجب نہیں بلکہ مستحبّ ہے۔ اور اگر ان میں سے کسی کی نیت کر کے جائے اور کسی وجہ سے روکا جائے تو اس پر قربانی واجب ہو گی اور جب تک قربانی ذبح نہ ہو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ سر نہ منڈوائے۔ ہاں اگر قربانی مکہ مکرمہ میں بھیج سکتا ہو تو بھیج دے اور پھر جب

تک قربانی وہاں پہنچ نہ جائے اس وقت تک سر نہ منڈائے۔

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمتع اور قِران کی خصوصیات جو خالی حج اور خالی عمرہ کے مقابلہ میں ہیں بیان فرمائی ہیں۔اور فَاِذَآ اَمِنْتُمْ کے الفاظ اس لئے بڑھائے ہیں کہ اس حکم کو پہلے حکم کا حصہ نہ سمجھ لیا جائے۔اس حکم کو احصار کے ذکر کے بعد اس لئے بیان کیا کہ اس صورت میں بلا احصار قربانی ہونی چاہیے اور حج اور عمرہ میں احصار سے قربانی ہوتی ہے ورنہ نہیں۔اس لئے اس کو احصار کے ذکر کے بعد بیان کیا۔

اس جگہ تمتع اور قِران کی یہ خصوصیات بیان کی گئی ہیں کہ ان میں قربانی ضروری ہوگی خواہ احصار نہ ہی ہوا ہو۔ اور جسے اس کی توفیق نہ ہو وہ جیسا کہ اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے تین دن کے روزے مکہ میں اور سات دن کے روزے واپس آکر رکھے۔

فرماتا ہے فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ۔(۱) بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تین دن کے روزے ذوالحج کی ساتویں۔آٹھویں اور نویں تاریخ کو رکھے جائیں (۲) حضرت امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر وہ ان ایام میں روزے نہیں رکھے گا تو اس پر قربانی بھی واجب ہوگی (۳) بعض کہتے ہیں کہ یہ روزے چونکہ قربانی کے بدلہ میں ہیں اس لئے حج کے بعد رکھنے چاہئیں (۴) بعض کہتے ہیں کہ یہ روزے واپسی سے پہلے مکہ میں ہی رکھنے چاہئیں (۵) بعض نے احرام عمرہ اور احرام حج کے درمیانی عرصہ میں روزے رکھنے کو کہا ہے۔(بحر محیط زیر آیت ھذا)۔

میرے نزدیک یہ روزے ایام تشریق یعنی گیارھویں بارھویں اور تیرھویں ذوالحجہ کو رکھنے چاہئیں اور فِي الْحَجِّ سے مراد اس جگہ فِيْٓ اَيَّامِ الْحَجِّ ہے۔باقی سات روزے گھر پر بھی رکھے جاسکتے ہیں۔اس جگہ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ کا فقرہ اس لئے زائد کیا گیا ہے کہ وَسَبْعَةٍ کی جگہ اَوْ نہ سمجھ لیا جائے اور غلطی سے یہ معنے نہ کر لئے جائیں کہ وہاں رکھے تو تین رکھے اور گھر رکھے تو سات رکھے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے آخر میں تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ فرما کر بتا دیا کہ صرف تین یا سات روزے رکھنا مراد نہیں بلکہ پورے دس روزے رکھنے مراد ہیں یا یہ الفاظ تاکید کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔اور تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ کے یہ معنے ہیں کہ یہ روزے ثواب یا قربانی کے قائم مقام ہونے کے لحاظ سے کامل فدیہ ہیں۔

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرماتا ہے یہ حکم یعنی تمتّع کا صرف باہر کے لوگوں کے لئے ہے کیونکہ ان کو آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے مکہ والے تو ہر وقت عمرہ کر سکتے ہیں ان کے لئے تمتّع یا قِران نہیں ہے۔

اس آیت کے بارہ میں مفسّرین میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے (۱) بعض کہتے ہیں کہ قربانی نہ ملنے کی

صورت میں روزوں کا حکم صرف آفاقیوں کے لئے ہے مکہ والوں کے لئے نہیں کیونکہ وہ تو اپنے شہر میں ہی قربانی مہیا کر سکتے ہیں۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔(۲) بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت روزوں کے متعلق ہے۔ یعنی روزوں کا حکم اہل مکہ کے لئے نہیں بلکہ صرف باہر والوں کے لئے ہے۔ گویا انہوں نے صیام کو ذٰلِكَ کے ماتحت رکھا ہے مگر میرے نزدیک یہ دونوں درست نہیں کیونکہ اس صورت میں مکہ والوں کو سہولت رہتی ہے (۳) امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اس سے تمتّع اور قِران والے احکام مراد ہیں جن کا ذکر فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ میں آچکا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ تمتّع اور قِران اہل مکہ کے لئے جائز نہیں (بحر محیط زیر آیت ھذا)۔ میرے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کے معنے زیادہ درست ہیں اور عقل بھی انہی کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ مکہ والے تو ہر وقت عمرہ کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں بھی اختلاف ہے کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں (۱) حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے تمام اہل حرم مراد ہیں (۲) عطاء کہتے ہیں کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہر جہت سے مواقیت کے اندر رہتے ہیں (۳) زہری کہتے ہیں کہ ایک یا دو دن کے سفر تک رہنے والے مراد ہیں (۴) بعض کہتے ہیں کہ اس سے صرف اہل مکہ مراد ہیں اور یہی معنے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں۔

آخر میں فرمایا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یعنی حج کی عبادت محض اس غرض کے لئے ہے کہ تمہارے دلوں میں تقویٰ پیدا ہو۔ اور تم ماسوی اللہ سے نظر ہٹا کر صرف اللہ تعالیٰ کو ہی اپنی ڈھال بنالو۔ اگر حج بیت اللہ یا عمرہ سے کسی کو یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا کوئی مخفی کبر اس کے سامنے آگیا ہے اسے چاہیے کہ خلوت کے کسی گوشہ میں اپنے خدا کے سامنے اپنے ماتھے کو زمین پر رکھ دے اور جس قدر خلوص بھی اس کے دل میں باقی رہ گیا ہو اس کی مدد سے گریہ وزاری کرے یا کم سے کم گریہ وزاری کی شکل بنائے اور خدا تعالیٰ کے حضور جھک کر کہے کہ اے میرے خدا! لوگوں نے بیج بوئے اور ان کے پھل تیار ہونے لگے وہ خوش ہیں کہ ان کے اور ان کی نسلوں کے فائدہ کے لئے روحانی باغ تیار ہو رہے ہیں۔ پر اے میرے رب! میں دیکھتا ہوں کہ جو بیج میں نے لگایا تھا اس میں سے تو کوئی روئیدگی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ نہ معلوم میرے کِبر کا کوئی پرندہ اُسے کھا گیا یا میری وحشت کا کوئی درندہ اسے پاؤں کے نیچے مسل گیا یا میری مخفی شامت اعمال ایک پتھر بن کر اس پر بیٹھ گئی۔ اور اس میں سے کوئی روئیدگی نکلنے نہ دی۔ اے خدا! اب میں کیا کروں کہ جب میرے پاس کچھ تھا میں نے بے احتیاطی سے اُسے اس طرح خرچ نہ کیا کہ نفع اٹھاتا۔ مگر آج تو میرا دل خالی ہے۔ میرے گھر میں ایمان کا کوئی دانہ نہیں کہ میں بوؤں اے خدا! میرے اس ضائع شدہ بیج کو پھر مہیّا کر دے اور میری کھوئی ہوئی متاع ایمان مجھے واپس عطا کر۔ اور اگر

میرا ایمان ضائع ہو چکا ہے تو تو اپنے خزانے سے اور اپنے ہاتھ سے اپنے اس دھتکارے ہوئے بندہ کو ایک رحمت کا بیج عطا فرما تا کہ میں اور میری نسلیں تیری رحمتوں سے محروم نہ رہ جائیں اور ہمارا قدم ہمارے سچی اور اعلیٰ قربانی کرنے والے بھائیوں کے مقام سے پیچھے ہٹ کر نہ پڑے بلکہ تیرے مقبول بندوں کے کندھوں کے ساتھ ساتھ ہمارے کندھے ہوں۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ میں اس طرف توجہ دلائی کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ہمیشہ خائف رہو اور اپنے تمام کاموں کی تقویٰ اللہ پر بنیاد رکھو ورنہ تمہارا پہلا ایمان بھی ضائع ہو جائے گا اور تم خدا تعالیٰ کی ناراضگی کے مورد بن جاؤ گے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا

حج (کے مہینے سب کے) جانے بوجھے ہوئے مہینے ہیں۔ پس جو شخص ان میں حج (کا ارادہ) پختہ کرلے (اسے یاد

رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ

رہے کہ) حج (کے ایام) میں نہ تو کوئی شہوت کی بات نہ کوئی نافرمانی اور نہ کسی قسم کا جھگڑا کرنا (جائز) ہوگا۔ اور نیکی

خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫

(کا) جو (کام) بھی تم کرو گے اللہ (ضرور) اس (کی قدر) کو پہچان لے گا۔ اور زادِ راہ (ساتھ) لو اور (یاد رکھو کہ)

وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۸﴾

بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اور اے عقلمندو! میرا تقویٰ اختیار کرو۔

حل لغات۔ رَفَثَ مصدر ہے اور لانفی جنس کے بعد واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ رَفَثَ سے مراد ہر ایسا کلام ہے جس کے اندر کوئی ایسی بات پائی جائے جسے عرف میں برا سمجھا جاتا ہو۔ (۲) ایسی بات جس کے اندر جماع یا اس کے متعلقات کا ذکر ہو۔ (۳) جب اس کے بعد اِلٰی صلہ ہو تو اس وقت کنایہ کے طور پر اس کے معنے جماع کے لئے جاتے ہیں (مفردات) اور طبری نے کہا ہے اَلرَّفَثُ اَللَّغْوُ مِنَ الْكَلَامِ (بحرِ محیط) رفث لغو اور

بے ہودہ گفتگو کو بھی کہتے ہیں۔

فُسُوْقَ فَسَقَ کا مصدر ہے اور فسوق کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو ترک کر دینا۔ (۲) نافرمانی (۳) سچے راستہ سے دوسری طرف جُھک جانا۔ (اقرب)

جِدَالَ باب مفاعلہ سے مصدر ہے اور اس کے معنے جھگڑا کرنے کے ہیں۔ (اقرب)

زَاد جس چیز کو انسان بطور سفر خرچ اپنے ساتھ لے لے۔

اِتَّقُوْنِ امر جمع کا صیغہ ہے جو وَقٰی سے باب افتعال کے مضارع کے صیغہ سے بنا ہے۔ اِتِّقَاءٌ (مصدر) جب اللہ تعالیٰ کے لئے آئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کا مفعول ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنالینا۔

تفسیر ۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ میں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ حج کے بارہ میں قرآن کریم نے کوئی نیا حکم نہیں دیا بلکہ اسی حکم کو قائم رکھا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ اس وجہ سے حج کے مہینے بھی سب لوگوں کو معلوم ہیں یعنی شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ۔ گو امام ابوحنیفہ ؒ اور امام شافعی ؒ کے نزدیک ذوالحج کے صرف دس دن اشہر الحج میں شامل ہیں (بحر محیط زیر آیت ھٰذا)۔ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ جو شخص ان مہینوں میں حج کو اپنے اوپر فرض کر کے چل پڑے۔ اُسے چاہیے کہ وہ اپنی زبان کو پاک رکھے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جو جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عشقیہ اشعار پڑھنا اس میں داخل نہیں۔ کیونکہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایام حج میں جاہلیت کے اشعار پڑھے تھے (درمنثور)۔ یہ روایت اگرچہ قرآن کریم کے اس واضح حکم کی موجودگی میں درست تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے ایسا کیا تھا تو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کس غرض کے ماتحت جاہلیت کے اشعار پڑھے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے دوران گفتگو میں کسی دلیل کے لئے پڑھے ہوں اور سننے والوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہو کہ وہ شوقیہ طور پر اس قسم کے اشعار پڑھ رہے ہیں۔ بہرحال اس قسم کا کلام خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور ان دنوں کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی عبادت میں صرف کرنا چاہیے۔ مگر اس ممانعت کے یہ بھی معنے نہیں کہ رفث۔ فسوق اور جدال دوسرے دنوں میں جائز ہے۔ بلکہ اس ممانعت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت رکھی ہے کہ اگر کچھ عرصہ تک انسان اپنے نفس پر دباؤ ڈال کر ایسے کام چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُسے دوسرے دنوں میں بھی ان کو چھوڑنے کی توفیق مل جاتی ہے کیونکہ مشق ہونے کی وجہ سے اس کے

لئے سہولت پیدا ہو جاتی ہے بعض دفعہ بشری کمزوریوں کی وجہ سے انسان ایک لمبے وقت کے لئے کسی کام کو چھوڑنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ ایسی حالت میں اس کے اندر استعداد پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے کچھ وقت کے لئے اس کام سے روک دیا جائے۔ جب کچھ عرصہ تک رکا رہتا ہے تو اس کی ضبط کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ کلّی طور پر اس کام کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ رمضان کے مہینہ میں اپنی کمزوریوں میں سے کسی ایک کمزوری پر غالب آنے کی کوشش کرے اور مہینہ بھر اس سے بچتا رہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ رمضان کے بعد بھی اس کی مدد کرے گا اور اسے ہمیشہ کے لئے اس بدی پر غالب آنے کی توفیق عطا فرما دے گا۔

یہاں رفث فسوق اور جدال تین گناہوں کے چھوڑنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ رفث مرد عورت کے مخصوص تعلقات کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بدکلامی کرنا، گالیاں دینا، گندی باتیں کرنا، قصے سُنانا، لغو اور بے ہودہ باتیں کرنا جسے پنجابی میں گپیں مارنا کہتے ہیں۔ یہ تمام امور بھی رفث میں ہی شامل ہیں۔ اور فسوق وہ گناہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں جن میں انسان اس کی اطاعت اور فرمانبرداری سے باہر نکل جاتا ہے۔ آخر میں جدال کا ذکر کیا ہے جو تعلقات باہمی کو توڑنے والی چیز ہے ان تین الفاظ کے ذریعہ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے تین اصلاحوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا ہے (۱) اپنی ذاتی اصلاح کرو اور اپنے دل کو ہر قسم کے گندے اور ناپاک میلانات سے پاک رکھو۔ (۲) اللہ تعالیٰ سے اپنا مخلصانہ تعلق رکھو (۳) انسانوں سے تعلقات محبت کو استوار رکھو۔ گویا یہ صرف تین بدیاں ہی نہیں جن سے روکا گیا ہے بلکہ تین قسم کی بدیاں ہیں جن سے باہر کوئی بدی نہیں رہتی۔ کیونکہ بدی یا تو اپنے نفس سے تعلق رکھتی ہے یا خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور یا پھر مخلوق سے تعلق رکھتی ہے۔ اور روحانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی ذاتی اصلاح کے بعد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں بھی سرگرم رہے۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ۔ فرماتا ہے تمہیں ان باتوں کے چھوڑنے میں کئی قسم کی دقتیں پیش آئیں گی۔ مثلاً کسی شخص کو گالی دے دی جائے تو اس کے لئے صبر کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر تم خدا کے لئے ان پابندیوں کو اپنے اوپر عائد کرو گے اور نیکیوں میں حصہ لو گے تو تم جو بھی نیک کام کرو گے اللہ تعالیٰ اسے ضرور ظاہر کر دے گا۔ خدا تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ نیکی کو پوشیدہ نہیں رہنے دیتا۔ گو بعض صورتوں میں نیکیوں پر پردہ بھی پڑا رہتا ہے مگر آخر کار نیکی ظاہر ہو کر رہتی ہے اور دشمن بھی اس کو محسوس کئے بغیر نہیں رہتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کو ہی دیکھ لو! وہ آپ کو گالیاں دیتے تھے مگر ابوسفیان ہرقل کے سامنے آپؐ کا کوئی عیب بیان نہ کرسکا۔ صرف

اتنا ہی کہہ سکا کہ اب ایک عہد ہم میں اور اس میں ہوا ہے معلوم نہیں وہ اسے پورا کرتا ہے یا نہیں (بخاری کتاب الوحی باب کیف کان بدء الوحی)۔ تو فرمایا کہ تم جو نیکی بھی کرو گے خدا تعالیٰ اُسے ضرور ظاہر کر دے گا اور لوگوں پر تمہارے اچھے کردار اور بلند اخلاق کا گہرا اثر پڑے گا۔

وَ تَزَوَّدُوْا فرمایا جب تم سفر کے لئے نکلو تو ہمیشہ اپنے ساتھ زادراہ لے لیا کرو۔ اس جگہ تَزَوَّدُوْا سے دونوں زاد مراد ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ آمدورفت اور کھانے پینے کے اخراجات کا انتظام کر لیا کرو۔ اور یہ بھی کہ نیکی اور تقویٰ کا زاد ساتھ لو۔ چونکہ اس سے پہلے وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے نیکیوں اور حسنات میں ترقی کرنے کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی تھی اس لئے تَزَوَّدُوْا کہہ کر بتایا کہ حج اور عمرہ کا ثواب تو بہت بڑا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ تم زیارت کعبہ کے شوق میں خالی ہاتھ اپنے گھروں سے نکل پڑو اور لوگوں سے بھیک مانگتے ہوئے وہاں پہنچو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم پہلے زادِراہ کا انتظام کرو۔ اور جب آمدورفت اور رہائش اور کھانے پینے وغیرہ کے تمام اخراجات کا انتظام ہو جائے تو اس کے بعد سفر کے لئے نکلو۔ فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اور یاد رکھو کہ بہتر زادراہ ہے جس سے تم سوال اور گناہ سے بچو۔

افسوس ہے اس زمانہ میں مسلمانوں میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ انسان کو اسباب سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ اپنے تمام معاملات خدا تعالیٰ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ مگر یہ قطعاً غلط اور اسلامی تعلیم کے خلاف ہے اس لئے یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ جب تم سفر کے لئے نکلو تو ضروری سامان اور زادِراہ سے کبھی غفلت اختیار نہ کرو۔

لیکن تَزَوَّدُوْا کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم تقویٰ کا زاد لو۔ اور چونکہ تقویٰ کا زاد مخفی تھا اس لئے اسے فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى کے الفاظ میں کھول کر بیان کر دیا اور بتایا کہ تقویٰ سب سے بہتر زاد ہے جو آخرت کے سفر میں تمہارے کام آنے والا ہے انہیں معنوں میں بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنی جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

> ''وقت تھوڑا ہے اور کارِ عمر ناپیدا۔ تیز قدم اٹھاؤ کہ شام نزدیک ہے جو کچھ پیش کرنا ہے وہ بار بار دیکھ لو ایسا نہ ہو کہ کچھ رہ جائے اور زیاں کاری کا موجب ہو یا سب گندی اور کھوٹی متاع ہو۔ جو شاہی دربار میں پیش کرنے کے لائق نہ ہو''۔ (کشتی نوح روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۶)

چونکہ اس سے پہلے حج کا ذکر آچکا ہے اس لئے فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اب حج سے تمہاری ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے تمہیں تقویٰ کا پہلے سے بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیے

جیسے صاف کپڑوں والا چھوٹے چھوٹے داغ اور دھبے سے بھی بچنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ۔ اے عقلمندو! اگر تم اپنے بچاؤ کا سامان کرنا چاہتے ہو تو میری طرف جھکو۔ اور صرف مجھے ہی اپنی حفاظت کا ذریعہ بناؤ۔ باقی تمام ذرائع اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ

تمہارے لئے (یہ) کوئی گناہ (کی بات) نہیں کہ (حج کے ایام میں) اپنے رب سے کوئی (اور) فضل بھی مانگ لو۔

اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠

پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو۔ اور جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے (اس

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۹﴾

کے مطابق) اسے یاد کرو۔ اور اس سے پہلے تم یقیناً گمراہوں میں سے تھے۔

حلّ لُغات۔ كَمَا کے معنے ''جس طرح'' کے بھی ہوتے ہیں۔ اور ''اس لئے'' کے بھی چنانچہ سیبویہ کہتا ہے كَمَا اِنَّهٗ لَا يَعْلَمُ تَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهُ کہ چونکہ وہ نہ جانتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا گناہ معاف کر دیا۔ (بحر محیط زیر آیت ھٰذا)

اِنْ یہ اِنَّ سے مخففہ ہے اور اس کے معنے قریباً ''گو'' کے ہوتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اِنْ نافیہ ہے یہ فرّاء کا قول ہے۔ کسائی کہتا ہے کہ اِنْ کے معنے قَدْ کے بھی ہوتے ہیں اور اس جگہ اس کے معنے قَدْ کے ہی ہیں۔ (بحر محیط)

تفسیر۔ فرماتا ہے تمہارے لئے یہ کوئی گناہ کی بات نہیں کہ حج کے ایام میں تم اپنے ربّ سے کوئی اور فضل بھی مانگ لو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فضل سے مراد اس جگہ تجارت ہے اور میرے نزدیک بھی یہ درست ہے مگر فضل سے صرف تجارت مراد لینا ایک وسیع مضمون کو محدود کر دینا ہے۔ درحقیقت آج اسلام کو جس بہت بڑی مصیبت کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں چاروں طرف کفر غالب ہے اور مسلمان جمود اور بے حسّی کا شکار ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اسلام کی اشاعت کے لئے اس جنون سے کام لیں جس جنون سے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے کام لیا تھا اور اسلام کو تھوڑے عرصہ میں ہی تمام معلومہ دنیا میں غالب کر دیا تھا پس حج کے ذکر کے

ساتھ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ فرما کر میرے نزدیک اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اس عظیم الشان اجتماع سے بعض دوسرے فوائد بھی حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ کا وہ فضل تلاش کرو جس کے نتیجہ میں مسلمان قعرِ مذلّت سے نکل کر بامِ عروج پر پہنچ جائیں اور اسلام کی اشاعت کے لئے مختلف ممالک کے با اثر اور ممتاز افراد کے ساتھ مل کر ایسی سکیمیں سوچو جن کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا فضل نازل ہو جائے اور اسلام دنیا پر غالب آ جائے۔ غرض اس فضل کو تلاش کرنا جس کے نتیجہ میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو اللہ تعالیٰ نے ہمارا فرض قرار دیا ہے اور یہ جو فرمایا ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم خدا تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ یہ کلام کا ایک طریق ہے جس کا مقصد کسی اہم نیکی کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اسی طریق کلام کو اس جگہ استعمال کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے اچھے موقعہ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی تلاش نہ کرنا کیا کوئی گناہ کی بات ہے کہ تم اسے چھوڑ رہے ہو۔ یعنی اس عظیم الشان اجتماع کے موقعہ کو جبکہ دنیا کے چاروں کناروں سے لوگ یہاں جمع ہیں غنیمت جانو اور اسے اپنے ہاتھ سے نہ جانے دو۔

یہ لَا جُنَاحَ بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ لَا جُنَاحَ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا (البقرۃ:۱۵۹) میں لَا جُنَاحَ کا استعمال کیا گیا ہے۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۔ فرمایا جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعر الحرام کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ عرفات مکّہ سے شمال مشرق کی طرف قریباً نو میل کے فاصلہ پر ایک وسیع میدان ہے جہاں ۹؍ذوالحجہ کو تمام حاجی جمع ہوتے ہیں یہاں ٹھہرنا اور عبادت کرنا اتنا اہم ہے کہ اگر کوئی شخص حج کے اور تمام مناسک ادا کرے مگر عرفات کے میدان میں نہ پہنچ سکے تو اس کا حج ہی نہیں ہوتا۔ اور مشعر الحرام مزدلفہ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم عرفات میں عبادت کر چکو اور وہاں سے واپس لوٹو تو مشعر الحرام کے پاس جو مزدلفہ میں ایک پہاڑی ہے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا طریق تھا کہ آپ یہاں بھی دُعا کیا کرتے تھے (مشکوٰۃ المصابیح کتاب المناسک باب الدّفع من عرفۃ والمزدلفۃ) مگر اب عام طور پر لوگ اس جگہ دُعا نہیں کرتے بلکہ اس جگہ کا پتہ لگانے میں بھی دقّت محسوس ہوتی ہے چنانچہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ہم نے اس کا پتہ لگانے کی بڑی کوشش کی مگر نہ لگا۔ اور یونہی دعا کر کے چل پڑے۔ معلوم ہوتا ہے یہ کوئی بڑی پہاڑی نہیں بلکہ ٹیلہ سا ہے۔ چونکہ وہاں ایسے کئی ٹیلے ہیں اور مجمع بھی بہت ہوتا ہے اس لئے اس کا آسانی سے پتہ نہیں لگ سکتا۔

اس آیت میں اَفَضْتُمْ کا لفظ استعمال فرما کر اس امر کا بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تم عرفات سے واپس لوٹو تو تمہارے قلوب اللہ تعالیٰ کی برکات اور اس کے انوار سے اس طرح معمور ہونے چاہئیں جیسا کہ ایک برتن اپنے

کناروں تک پانی سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور پھر اسی حالت میں جبکہ ساقی کوثر کی روحانی شراب سے تمہارے جام لبالب بھرے ہوئے ہوں تم مشعر الحرام کے پاس پہنچو اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔ گویا روحانی انعامات کی وہ بارش جو عرفات میں تم پر نازل ہوئی ہے وہ تمہیں بہاتی ہوئی مشعر الحرام کی طرف لے جائے اور تمہیں اپنے محبوب کے قدموں تک پہنچا دے۔

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ اس کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ اُذْكُرُوْهُ ذِكْرًا كَمَا هَدٰىكُمْ اس کا اس طرح ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا ذکر کرو کیونکہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے۔ ان معنوں کے لحاظ سے اس جگہ كَمَا کا استعمال ایسا ہی ہے جیسا كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ (الحجر:۹۱) میں کیا گیا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ میں اِنْ مخففہ ہے اور اس کے معنے ''گو'' کے ساتھ ملتے ہیں۔ فرّاء نے کہا ہے کہ اس کے معنے نفی کے ہیں۔ اور لام کے معنے اِلَّا کے ہیں۔ یعنی ''تم اس ہدایت سے پہلے نہ تھے مگر گمراہ''۔ کسائی نے کہا ہے کہ اس کے معنے قَدْ کے ہیں اور لام زائد ہے۔ یعنی تم ضرور اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ

اور جہاں سے لوگ (واپس) لوٹتے رہے ہیں وہیں سے تم بھی (واپس) لوٹو اور اللہ (تعالیٰ) سے مغفرت طلب کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾

اللہ یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حل لغات۔ اَفِيْضُوْا اَفَاضَ يُفِيْضُ سے امر کا صیغہ ہے اور اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ کے معنے ہیں دَفَعْتُمْ مِنْهَا بِكَثْرَةٍ تَشْبِيْهًا بِفَيْضِ الْمَآءِ۔ یعنی تم وہاں سے کثرت سے چل پڑو۔ یہ معنے پانی کے کثرت سے بہنے کے ساتھ بطور تشبیہ کے ہیں۔ (مفردات راغب)

تفسیر۔ اس آیت کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ افاضہ تو ہو چکا پھر یہ کونسا نیا افاضہ ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی عرفات سے تو لوٹ آئے پھر اور کہاں سے لوٹنے کا حکم دیا گیا ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ اس جگہ ثُمَّ کے معنے ''اور'' کے ہیں۔ اور اس بات کو اس لئے دہرایا ہے کہ پہلے اس بارہ میں کوئی حکم نہ تھا بلکہ صرف اظہار واقعہ کیا گیا تھا۔ اب حکم دیا کہ جہاں سے دوسرے لوگ واپس لوٹتے رہے ہیں وہیں سے تم بھی لوٹو۔ اور یہ حکم اس

لئے دیا گیا ہے کہ قریش اور ان کے ساتھیوں کا طریق تھا کہ وہ مزدلفہ سے آگے عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ بلکہ مزدلفہ ہی سے واپس چلے آتے تھے۔ اور اس کی وجہ وہ یہ قرار دیتے تھے کہ عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے اس لئے ہم وہاں نہیں جائیں گے بلکہ مزدلفہ میں مشعر الحرام کے پاس ہی ٹھہریں گے جو حرم کے اندر ہے اور کہتے کہ ہم حرم کے باشندے ہیں اس لئے ہم حرم سے باہر نہیں جاسکتے۔ لیکن دوسرے قبائل عرفات میں جا کر حج کرتے تھے۔ اس لئے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جس طرح دوسرے لوگ عرفات میں جاتے اور پھر وہاں سے واپس آتے ہیں اسی طرح تم بھی وہاں جاؤ اور جس طرح وہ عرفات سے واپس آتے ہیں اسی طرح تم بھی واپس آؤ۔ لیکن اگر ثُمَّ کے معنے ''پھر'' یا ''تب'' کے کئے جائیں تو اس صورت میں اس کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ پھر تم مزدلفہ سے لوٹو جہاں سے سب لوگ واپس لوٹتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ قریش اور بنو کنانہ جو حُمس یعنی بڑے پکے دیندار کہلاتے تھے وہ بھی یہیں سے واپس چلے جاتے تھے۔

مزدلفہ سے لوٹنے کے متعلق یہ حکم ہے کہ تمام حاجی نماز پڑھ کر اور دُعا کر کے سورج نکلنے سے پہلے وہاں سے چلیں اور منیٰ میں سورج نکلنے کے بعد پہنچ جائیں۔ جہاں رمی جمار کی جاتی ہے۔ قربانیاں دی جاتی ہیں اور احرام کی حالت ختم ہو جاتی ہے۔

یہ آیت چکڑالویوں پر بھی حجّت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے خود اس جگہ کا نام نہیں بتایا۔ پس تفسیر کے لئے سنت کا تفحص بھی ضروری ہے۔ پھر فرماتا ہے وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ تم ان مناسک کے ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتے رہو کیونکہ حج ایک بہت بڑا ابتلاء بھی ہے۔ مجھ سے کئی لوگوں نے بیان کیا کہ ہم نے حج کیا اور ہمارا دل پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گیا۔ اسی طرح بہت سے لوگوں نے بیان کیا کہ حج کے دنوں میں تو بڑا جوش ہوتا ہے مگر بعد میں دل پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حج میں ظاہر پر اس قدر زور ہے کہ اس کے مقابلہ میں باطن بہت حد تک پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہاں حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگاتے ہیں۔ بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ منیٰ میں تین ٹیلوں پر جو اب برجیوں کی شکل میں ہیں کنکر پھینکتے ہیں۔ اس لئے اگر ساتھ ساتھ استغفار نہ ہو تو دل پر زنگ لگ جاتا ہے اسی طرح وہاں پانچ پانچ گھنٹے بیٹھ کر عبادت کرنی پڑتی ہے۔ ہزاروں کے مجمع میں مَیں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو دُعا کرتا ہو۔ لوگ حج صرف اس قدر سمجھتے ہیں کہ خطیب جب کھڑا ہو تو اس کے رومال کے ساتھ رومال ہلا دیں۔ مگر مجھے خدا تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی اور میں نے وہاں کثرت سے دُعائیں کیں۔ تو چونکہ یہ نماز کی طرح ایک معیّن عبادت نہیں اس لئے لوگ اس کی اہمیت محسوس نہیں کرتے۔ شریعت

نے صرف ظاہر بتا دیا ہے اور باطن کو انسان پر چھوڑ دیا ہے۔ مگر وہاں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اکثر لوگ جانتے ہی نہیں کہ ہم نے یہاں دُعا یا عبادت کرنی ہے۔ پس فرماتا ہے۔ حج کے ایام میں تمہیں استغفار کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ حج میں ظاہر زیادہ نمایاں ہے اور باطن جو جوہر عبادت ہے مخفی ہے۔ اگر انسان باطن کی طرف توجہ نہ کرے اور صرف ظاہر پر عمل کر کے سمجھ لے کہ اس نے شریعت کی اصل غرض کو پورا کر دیا ہے۔ تو اس کا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ

پھر جب تم اپنی عبادتیں پوری کر چکو تو (گذشتہ زمانہ میں) اپنے باپ دادوں کو یاد کرنے کی طرح اللہ کو یاد کرو۔

اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ

یا (اگر ہو سکے تو اس سے بھی) زیادہ (دلبستگی سے) یاد کرو اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو (یہی) کہتے رہتے ہیں کہ اے

اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۱﴾ وَمِنْهُمْ

ہمارے رب! ہمیں اس دنیا میں (آرام) دے اور ان کا آخرت میں کچھ بھی حصّہ نہیں ہوتا۔ اور ان میں سے کچھ

مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ

(ایسے بھی ہوتے) ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں (اس) دنیا (کی زندگی) میں (بھی) کامیابی دے

حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۲﴾

اور آخرت میں (بھی) کامیابی (دے) اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

حلّ لُغات۔ اَوْ کے معنے ''یا'' کے بھی ہوتے ہیں اور یہ لفظ اظہار ترقی کے لئے بھی آتا ہے۔ اسی طرح اَوْ کا لفظ کسی چیز کو حقیر ظاہر کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے (بحر محیط)۔

اَشَدَّ یہ ذکر کی صفت ہے جو بطور حال پہلے بیان کر دی گئی ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے جب تم اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق حج بیت اللہ کا فرض ادا کر چکو تو خدا تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو۔ اہل عرب میں دستور تھا کہ جب وہ حج

سے فارغ ہو جاتے تو تین دن منیٰ میں مجالس منعقد کر کے اپنے باپ دادوں کے کارنامے بیان کرتے اور اپنے اپنے قبیلہ کی بہادری شہرت اور سخاوت کی تعریف میں قصیدے پڑھتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ لوگ تو اپنے باپ دادوں کی تعریف میں قصائد پڑھا کرتے تھے مگر ہم تمہیں یہ ہدایت دیتے ہیں کہ جب تم مناسک حج کو ادا کر چکو تو تم خدا تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو۔ یعنی جس طرح ایک چھوٹا بچہ جو اپنی ماں سے جدا ہوتا ہے روتا اور چلّاتا ہوا کہتا ہے کہ میں نے اپنی اماں کے پاس جانا ہے اسی طرح تم بھی بار بار خدا تعالیٰ کا ذکر کرو تا کہ اس کی محبت تمہارے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے۔ خدا تعالیٰ ایک وراء الوراء ہستی ہے اس کا حسن براہ راست انسان کے سامنے نہیں آتا بلکہ کئی واسطوں کے ذریعہ سے آتا ہے۔ اگر اُس کے حسن کو الفاظ میں بیان کیا جائے اور پھر ہم اس پر غور کریں اور سوچیں تو آہستہ آہستہ معنوی طور پر اس کی شکل ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اگر تم مالک کا نام لو اور اس کی مالکیت کو ذہن میں لاؤ۔ قدوس کا نام لو اور اس کی قدوسیت کو ذہن میں لاؤ۔ ستّار کا نام لو اور اس کی ستاریت کو ذہن میں لاؤ۔ غفور کا نام لو اور اس کی غفوریت کو ذہن میں لاؤ تو یہ لازمی بات ہے کہ آہستہ آہستہ خدا تعالیٰ کی ایک مکمل تصویر تمہارے سامنے آجائے گی۔ اور محبت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ یا تو کسی کا وجود سامنے ہو یا اس کی تصویر سامنے ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ایک شعر میں اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

دیدار گر نہیں ہے تو گفتار ہی سہی
حسن و جمال یار کے آثار ہی سہی

یعنی اگر محبوب خود سامنے نہیں آتا تو اس کی آواز تو سنائی دے اور اس کے حُسن کی کوئی نشانی تو نظر آئے۔ پس ربّ، رحمٰن، رحیم، مالک یوم الدین، ستار، غفار، قدوس، مہیمن، سلام، جبار، قہار اور دوسری صفاتِ الٰہیہ کو جب ہم اپنے ذہن میں بٹھا لیتے ہیں تو خدا تعالیٰ کی ایک تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ہمارے دلوں میں اس کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض صفاتِ الٰہیہ کے بار بار دُہرانے اور تواتر سے دُہرانے کے نتیجہ میں چونکہ خدا تعالیٰ کی ایک تصویر بنتی ہے اور اس تصویر کی وجہ سے ہی ہمارے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح بچوں کے دل میں اپنے ماں باپ کی ملاقات کا اشتیاق ہوتا ہے۔ اسی طرح تمہارا بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہی روحانی تعلق ہونا چاہیے۔ گویا تمہارا چین اور تمہارا آرام صرف خدا تعالیٰ کے ساتھ ہی وابستہ ہونا چاہیے کیونکہ اسی پر تمہاری روحانی زندگی کا مدار ہے۔ اور حج کے بعد ذکر الٰہی کی طرف توجہ دلا کر اس

طرف اشارہ فرمایا ہے کہ تمہارا خدا تعالیٰ سے اب ایک روحانی پیوند قائم ہو چکا ہے۔ پس جس طرح ایک بچہ اپنے ماں باپ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی کے دن بسر کرتا ہے اور ان کے اخلاق وعادات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح تم بھی خدا تعالیٰ کی صفات کا آئینہ بنو اور اسی کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی کے دن بسر کرو۔

پھر فرماتا ہے اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا ہم نے پہلے تو تمہیں یہ ہدایت دی ہے کہ تم خدا تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو۔ مگر ہمارا یہ حکم صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو روحانیت میں ابھی اعلیٰ مقام پر نہیں پہنچے ورنہ جو لوگ اپنے ماں باپ کی محبت میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہاتھ پوشیدہ دیکھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں ماں باپ کے تعلق کو بالکل ہیچ سمجھتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ایسے رنگ میں ذکر کریں کہ ان کے دنیوی تعلقات میں اس کی کوئی مثال دکھائی نہ دے اور ماں باپ کا ذکر اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہو جائے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ فرماتا ہے بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ سے صرف دنیا ہی مانگتے ہیں۔ جیسے عیسائی ہیں۔ وہ یہی دعا کرتے ہیں کہ ’’ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے‘‘ (متی باب ۶ آیت ۱۱) انہیں حرام وحلال سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ انہیں کسی چیز کے مفید یا مضر ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کا مطمح نظر محض دنیا طلبی ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جس میں یہ اشارہ ہے کہ ایسے لوگ صرف دنیا پر جان دیتے ہیں حالانکہ خالی دنیوی عزت جس کے ساتھ اخروی عزت نہ ہو ایک لعنت ہوتی ہے۔ جیسے یہود کو آجکل خالی دنیوی عزت ملی ہوئی ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کو صرف دنیوی عزت ملی ہوئی ہے مگر اُخروی عزت سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملا۔ اسی لئے فرمایا کہ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ یعنی ہم انہیں دنیا تو دے دیتے ہیں مگر اُخروی انعامات میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری طرف خالی اُخروی عزت بھی ایک بے ثبوت چیز ہوتی ہے۔ ثبوت والی چیز وہی ہوتی ہے جس میں دین اور دنیا دونوں اکٹھے ملیں۔ اسی لئے فرمایا کہ ایک اور گروہ ایسا ہے جو یہ دعا کرتا رہتا ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ یعنی الٰہی! ہمیں دنیا میں بھی عزت بخش اور آخرت میں بھی ہمارے مقام کو بلند کر۔ اگر ہمیں دنیا ملے تو ہم اسے اپنی ذات کے لئے استعمال نہ کریں بلکہ تیرے دین کی شوکت ظاہر کرنے کے لئے استعمال کریں اور تیری رضا اور خوشنودی کے لئے اُسے صرف کریں۔ اگر ایسا ہو تو پھر انسان کو دنیا میں بھی عزت ملتی ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور بھی اس کا مرتبہ بڑھتا ہے۔ یہ دُعا جو اسلام نے ہمیں سکھائی

ہے بظاہر بہت چھوٹی سی دعا ہے لیکن ہر قسم کی انسانی ضرورتوں پر حاوی ہے۔انسان کہتا ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً اے ہمارے رب! ہم کو اس دنیا میں حسنہ دے۔بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حسنہ کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے یہ درست نہیں۔حسنات کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا جس کے معنے بہت سی نیکیوں کے ہیں مگر یہ اعتراض عربی زبان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔اصل بات یہ ہے کہ اگر یہاں حسنات کا لفظ ہوتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ ہمیں کچھ اچھی چیزیں ملیں لیکن حسنہ کے یہ معنے ہیں کہ ہمیں جو کچھ ملے خیر ہی ملے۔پس رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کے یہ معنے ہیں کہ اے ہمارے رب! دنیا میں ہم کو جو کچھ دے حسنہ دے۔روٹی دے تو حلال ہو طیب ہو، پچنے والی ہو۔کپڑا دے تو حلال دے طیّب دے، ضرورت کے مطابق دے، ننگ ڈھانکنے والا دے، پسندیدہ دے، بیوی دے تو ایسی دے جو ہمدرد ہو ہم خیال ہو دیندار ہو محبت کرنے والی ہو، نیکی میں تعاون کرنے والی ہو، بچے پیدا کرنے والی ہو، ان بچوں کی نیک تربیت کرنے والی ہو، مکان دے تو مبارک ہو، وہ بیماریوں والا گھر نہ ہو، سل دق اور ٹائیفائیڈ کے جراثیم اس میں نہ ہوں، کوئی چیز ایسی نہ ہو جو صحت پر بُرا اثر کرنے والی ہو، کوئی ہمسایہ ایسا نہ ہو جو دکھ دینے والا ہو، وہ ایسے محلہ میں نہ ہو جہاں کے رہنے والے بُرے ہوں، وہ ایسے شہر میں نہ ہو جسے تو میرے لئے اچھا نہ سمجھتا ہو، ہمیں حاکم دے تو ایسے دے جو رحم دل ہوں، تقویٰ سے کام لینے والے ہوں، انصاف سے کام لینے والے ہوں، ماتحتوں سے محبت کرنے والے ہوں، ہمیں اُستاد دے تو ایسے دے جو علم رکھنے والے اور اچھا پڑھانے والے ہوں، وہ شوق سے پڑھائیں وہ ظالم نہ ہوں، خرابیاں پیدا کرنے والے اور دوسروں کو ورغلانے والے نہ ہوں، دوست دے تو ایسے دے جو خیر خواہ ہوں، محبت کرنے والے ہوں، مصیبت میں کام آنے والے ہوں، خوشی میں شریک ہونے والے ہوں، دکھوں میں ہاتھ بٹانے والے ہوں، غرض رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً اے ہمارے رب! دنیا میں ہم کو وہ چیز دے جو حسنہ ہو۔پس یہاں حسنات کی بجائے حسنہ کا لفظ رکھ کر اس کے مفہوم کو خدا تعالیٰ نے وسیع کر دیا ہے۔اور جب مومن یہ دعا کرتا ہے تو دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہتا ہے کہ خدایا! مجھے ہر وہ چیز دے جو میری ضرورت کے مطابق ہو اور پھر وہ چیز ایسی ہو جو نہایت اچھی ہو مگر اچھی چیز کے لئے اور الفاظ بھی استعمال ہو سکتے تھے۔خدا تعالیٰ نے وہ الفاظ استعمال نہیں کئے بلکہ حسنہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے یہ لفظ ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں پر دلالت کرتا ہے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز اپنے فوائد اور خوبیوں کے لحاظ سے اچھی ہو مگر ظاہری صورت کے لحاظ سے اچھی نہ ہو۔مثلاً کسی شخص کی بیوی بڑی با اخلاق ہو۔مگر فرض کرو وہ نکٹی ہے یا اندھی ہے یا بہری ہے تو وہ حسنہ نہیں کہلائے گی حسنہ وہی بیوی کہلائے گی جس کے اخلاق بھی اچھے ہوں شکل بھی اچھی ہو ظاہر بھی اچھا ہو

اور باطن بھی اچھا ہو۔ تو حسنہ کا لفظ ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں پر دلالت کرتا ہے۔ اور مومن اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہے کہ خدایا مجھے جو چیز بھی دے وہ ایسی ہو جو ظاہری اور باطنی دونوں خوبیاں رکھتی ہو۔

پھر فرمایا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً آخرت میں بھی ہمیں وہ چیز دے جو حسنہ ہو۔ یعنی وہ بھی ظاہر و باطن میں ہمارے لئے اچھی ہو۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ آخرت میں تو ہر چیز اچھی ہوتی ہے۔ وہاں کی چیزوں کے لئے حسنہ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بات غلط ہے۔ آخرت میں بھی بعض چیزیں ایسی ہیں جو باطن میں اچھی ہیں مگر ظاہر میں بُری ہیں۔ مثلاً دوزخ ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ انسان کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ پس ایک لحاظ سے وہ اچھی چیز ہے۔ مگر ایک لحاظ سے وہ بُری بھی ہے۔ پس جب آخرت کے لئے خدا تعالیٰ نے حسنہ کا لفظ رکھا تو اس لئے کہ تم یہ دُعا کرو کہ الٰہی ہماری اصلاح دوزخ سے نہ ہو بلکہ تیرے فضل سے ہو۔ اور آخرت میں ہمیں وہ چیز نہ دیجیو جو صرف باطن میں ہی اچھی ہو۔ جیسے دوزخ باطن میں اچھا ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے مگر ظاہر میں بُرا ہے کیونکہ وہ عذاب ہے۔ آخرت میں حسنہ صرف جنت ہے۔ جس کا ظاہر بھی اچھا ہے اور جس کا باطن بھی اچھا ہے۔

پھر فرمایا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ ہم کو عذاب نار سے بچا۔ اس سے مراد وہی عذاب نار نہیں جو مرنے کے بعد ملے گا۔ یہ عذاب نار دنیا کے ساتھ بھی تعلق رکھتا ہے کیونکہ دنیا اور آخرت دونوں کے ساتھ تعلق رکھنے والی دُعاؤں کے بعد وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ کہا گیا ہے۔ پس وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ کے معنے یہ ہیں کہ ہمیں دنیا کے عذاب نار سے بھی بچا اور آخرت کے عذاب نار سے بھی محفوظ رکھ۔ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں کئی لوگ عذاب نار میں گرفتار ہوتے ہیں۔ انہیں کئی قسم کے دُکھ ہوتے ہیں، تکلیفیں ہوتی ہیں، حسرتیں ہوتی ہیں، قسم قسم کے مصائب ہوتے ہیں مگر جب انسان اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ خدایا! مجھے عذاب نار سے بچا۔ تو خدا تعالیٰ اُسے اس عذاب سے بچا لیتا ہے۔ تب وہ چیزیں جو پہلے اس کے لئے نار تھیں جنت بن جاتی ہیں۔

اسی طرح اس سے مراد آخرت کا عذاب بھی ہے جس سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ دُعا سکھلائی ہے۔ بظاہر یہ ایک مختصر سی دُعا ہے مگر بڑی جامع اور وسیع دعا ہے۔

عَذَابَ النَّارِ کے لحاظ سے دنیا کی لڑائی بھی مراد لی جاسکتی ہے۔ کیونکہ لڑائی بھی آگ کا ہی عذاب ہے۔ پس جو شخص یہ دُعا کرے گا کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ وہ گویا خدا تعالیٰ کے بیان فرمودہ الفاظ میں یہ دعا کرے گا کہ الٰہی! دنیا میں مجھ پر کوئی ساعت ایسی نہ آئے جو بُری ہو۔ لڑائی مجھ سے دُور

رہے اور یہ آگ کا عذاب میرے قریب نہ پہنچے۔

اگر کوئی سپاہی لڑائی میں شامل ہو اور وہ یہ دُعا کرے۔ تو اس کی دُعا کے یہ معنے ہوں گے کہ اس لڑائی کے بداثرات سے مجھے بچا۔ بندوق کی گولی آئے تو وہ مس کر جائے۔ میرے دائیں نکل جائے یا بائیں نکل جائے۔ اوپر نکل جائے یا نیچے نکل جائے۔ بہر حال وہ مجھے نہ لگے۔ اور میں اس سے محفوظ رہوں پس یہ ایک جامع دُعا ہے جو اسلام نے سکھائی ہے اور جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بڑی کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ

یہی (وہ لوگ) ہیں جن کے لئے ان کی (نیک) کمائی کے سبب سے (ثواب کا) ایک بہت بڑا حصّہ (مقدر) ہے

سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٣﴾

اور اللہ (بہت) جلد حساب چکا دیتا ہے۔

تفسیر ۔ کَسَبَ کے معنے محنت کر کے کسی چیز کو حاصل کرنے کے ہوتے ہیں لیکن اس جگہ کَسَبُوْا کا لفظ اوپر والی دُعا کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے کمایا اس سے ان کو حصہ ملے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسب کا لفظ زبان یا دل کے فعل پر بھی بولا جاتا ہے اور مراد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی نعماء طلب کرتے رہتے ہیں وہ اپنے اپنے اخلاص اور ایمان کے مطابق خدا تعالیٰ سے اجر پائیں گے۔

وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بدی کی جزا میں کوئی دیر نہیں لگتی بلکہ ادھر عمل سرزد ہوتا ہے اور ادھر اس کی جزا ظاہر ہو جاتی ہے یعنی انسان کا ہر عمل اس کے جوارح پر فوراً اثر ڈال دیتا ہے۔ یہ مضمون قرآن کریم میں کئی جگہ بیان ہوا ہے اور حدیثوں میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے آپ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص بُرا کام کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نشان پڑ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ نہیں کرتا اور اس کے بداعمال بڑھتے چلے جاتے ہیں تو یہ سیاہ نقطے بڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور جب کوئی شخص نیک کام کرتا ہے تو ایک سفید نقطہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے اور جب اس کے بعد وہ متواتر نیک اعمال بجالاتا ہے تو یہ سفید نقطے بڑھنے شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کا سارا دل منور ہو جاتا ہے۔ (مسند احمد بن حنبل، مسند ہریرہ ؓ)

سَرِیْعُ الْحِسَابِ میں اللہ تعالیٰ کی اسی سنت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر کام کا اثر فوراً انسان کے دل پر پڑ جاتا ہے۔اور یہ بھی ایک قسم کا حساب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لیا جاتا ہے۔تازہ تحقیقات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کوئی انسانی حرکت ایسی نہیں جو فضا میں محفوظ نہ ہو جاتی ہو پس عمل اور اس کی جزا یہ دو توام بھائی ہیں کہ ایک کے ساتھ دوسرا بھی ظہور میں آ جاتا ہے۔

وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ

اور (ان) مقررہ دنوں میں اللہ (تعالیٰ) کو یاد کرو۔ پھر جو شخص جلدی کرے (اور)

يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ

دو دنوں میں (ہی واپس چلا جائے) تو اسے کوئی گناہ نہیں اور جو پیچھے رہ جائے اسے (بھی) کوئی گناہ نہیں (یہ وعدہ)

لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ

اس شخص کے لئے ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور تم اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ (ایک دن) تم سب کو

اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

اکٹھا کر کے اس کے حضور لے جایا جائے گا۔

تفسیر۔اس آیت میں جن مقررہ دنوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا خصوصیت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے وہ ایام تشریق ہیں یعنی ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳ ذوالحجہ یا ایام منیٰ ہیں۔ جو دسویں تاریخ سے شروع ہوتے ہیں اور ۱۳ کو ختم ہو جاتے ہیں۔

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۔فرماتا ہے جو شخص جلدی کرے اور دو دنوں میں ہی واپس چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ دراصل دسویں ذوالحجہ کے بعد رمی الجمار کے لئے تین دن رکھے گئے ہیں۔ مگر اجازت ہے کہ کوئی شخص دو دن کے بعد بھی لوٹ آئے۔اس بارہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مذہب تو یہ ہے کہ ایام تشریق کے تیسرے دن صبح کے وقت جا سکتا ہے۔لیکن بعض نے کہا ہے کہ دوسرے دن رمی الجمار کے بعد بھی جا سکتا ہے۔بعض نے کہا ہے

کہ اگر عصر کا وقت آ جائے تو نہیں جا سکتا۔ اس سے پہلے جا سکتا ہے۔ گویا اس سے تیسرے دن کی رمی معاف ہو گئی۔ پھر بعض نے کہا ہے کہ جس نے تعجیل کی نیت کی اسے چاہیے کہ وہ یوم النحر کو رمی کرے (بحر محیط زیر آیت ھذا)۔

پھر فرماتا ہے وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى۔ اور جو شخص پیچھے رہ جائے یعنی تیسرے دن رمی کر کے جائے۔ اسے بھی کوئی گناہ نہیں اور یہ وعدہ اس شخص کے لئے ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ لِمَنِ اتَّقٰى کا تعلق تعجیل کے ساتھ ہے مگر میرے نزدیک اس کا تعلق نہ تعجیل کے ساتھ ہے نہ تاخیر کے ساتھ بلکہ لَا اِثْمَ عَلَيْهِ کے ساتھ ہے ورنہ جو گناہ گار ہے وہ تو گناہ گار ہی ہے اس کے متعلق لَا اِثْمَ عَلَيْهِ کہنا تو درست ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ نفیِ اِثْم صرف ایسے شخص کے لئے ہے جو متقی ہو۔ یعنی اگر وہ کسی اور طرح گنہگار نہیں تو اس تعجیل یا تاخیر سے گنہگار نہیں ہوتا۔

آخر میں وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ ان مناسک کی اصل غرض یہ ہے کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ تمہارا بیت اللہ کا طواف کرنا۔ حجر اسود کو بوسہ دینا۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا۔ مزدلفہ منیٰ عرفات اور مشعر الحرام میں اللہ تعالیٰ کا بکثرت ذکر کرنا۔ اور رمی الجمار کرنا۔ یہ سب اس غرض کے لئے ہے کہ تمہارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی سچی محبت پیدا ہو اور تم سمجھو کہ ایک دن تم اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حضور اکٹھے ہونے والے ہو۔ پس اگر تم نے اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط رکھا اور اس کی راہ میں ہر قسم کی تکالیف کو برداشت کیا اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور ہاجرہؑ کو برکت دی تھی۔ اُسی طرح وہ تمہیں بھی برکت عطا فرمائے گا اور تمہاری نسلوں کو بھی اپنی دائمی حفاظت اور پناہ میں لے گا۔ پس تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ اور اس دن کو یاد رکھو جب تم سب کو اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا پڑے گا۔

حج کے احکام تو ختم ہو گئے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جگہوں میں جانے اور وہاں چکر لگانے کی کیا حکمتیں ہیں؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ میرے نزدیک اس کی ظاہری حکمتوں میں سے ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ (آل عمران:۹۷) کہ سب سے پہلا گھر جو تمام دنیا کے فائدہ کے لئے بنایا گیا تھا وہ ہے جو مکہ مکرمہ میں ہے اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہیں بنایا بلکہ یہ آدم کے زمانہ سے چلا آتا ہے (خواہ وہ کوئی آدم ہو) پس وُضِعَ لِلنَّاسِ میں پیشگوئی تھی کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے اسے ساری دُنیا کو اکٹھا کرنے کے لئے بنایا ہے اس لئے تمام لوگوں کو اس جگہ جمع کیا جائے گا چنانچہ اسی غرض کے لئے حج کی خاص

تاریخیں مقرر کر دی گئیں۔ تا کہ ان تاریخوں میں وہاں ساری دنیا کے لوگ جمع ہو سکیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں تمام دنیا کو اکٹھا کرنے اور جہان بھر کے اتقیاء اور صلحاء کو جمع کرنے اور عالم اسلامی میں عالمگیر اخوت اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے مائدہ روحانی پر لوگوں کو ایک عظیم الشان دعوت دی ہے تا کہ قومی اور ملکی منافرت درمیان سے اُٹھ جائے اور باہمی تعلقات وسیع ہو جائیں۔ اور ایک دوسرے کی محبت ترقی کرے۔ اور یہ خیال کہ ہم فلاں قوم سے ہیں اور ہمارا غیر فلاں قوم سے ہے مٹ جائے۔ میرے نزدیک منیٰ میں لوگوں کے تین دن اسی لئے فارغ رکھے گئے ہیں کہ وہاں لوگ ذکر الٰہی اور عبادت میں اپنا وقت گذارنے کے علاوہ آپس میں ایک دوسرے سے ملیں اور حالات معلوم کریں۔ قادیان اور ربوہ میں بھی لوگ مختلف اوقات میں آتے رہتے ہیں۔ مگر وہ تعلقات نہیں بڑھتے جو جلسہ سالانہ کے ایام میں بڑھتے ہیں۔ اگر حج سے یہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائے تو میرے نزدیک وہ تفرقے اور شقاق مٹ سکتے ہیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کو کمزور کر رکھا ہے اور ان کے درمیان اختلافِ عقائد کے باوجود زبردست اتحاد پیدا ہو سکتا ہے غرض حج گو ایک مذہبی عبادت ہے مگر اس میں روحانی فوائد کے علاوہ یہ ملی اور سیاسی غرض بھی ہے کہ مسلمانوں کے ذی اثر طبقہ میں سے ایک بڑی جماعت سال میں ایک جگہ جمع ہو کر تمام عالم کے مسلمانوں کی حالت سے واقف ہوتی رہے۔ اور ان میں اخوت اور محبت ترقی کرتی رہے اور انہیں ایک دوسرے کی مشکلات سے آگاہ ہونے اور آپس میں تعاون کرنے اور ایک دوسرے کی خوبیوں کو اخذ کرنے کا موقعہ ملتا رہے۔ گو افسوس ہے کہ اس غرض سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حج سے یہی غرض تھی تو پھر مکہ مکرمہ میں ہی تمام مسلمانوں کا اجتماع کافی تھا عرفات منیٰ اور مزدلفہ میں جانے کی کیا غرض ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ عرفات منیٰ اور مزدلفہ میں جمع کرنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ شہر میں اجتماع کی صورت نہیں ہو سکتی اور نہ لوگوں کا آپس میں صحیح رنگ میں میل جول ہو سکتا ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو کھلے میدانوں میں جمع ہونے کا حکم دے دیا تا کہ وہاں لوگ آسانی سے ایک دوسرے سے مل سکیں چونکہ جگہ بھی کھلی ہوتی ہے اور وقت بھی فارغ ہوتا ہے اس لئے ایک دوسرے کو ملنے کا مدّعا خوب اچھی طرح پورا ہو سکتا ہے لیکن اس کے علاوہ خدا تعالیٰ نے مزدلفہ منیٰ اور عرفات کو اس شرف کے لئے اس لئے چُنا ہے کہ عرفات ساحل سمندر کی طرف ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی راستہ سے حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو چھوڑنے کے لئے شام سے تشریف لائے تھے۔ اور عرفات وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی ان پر تجلی ظاہر ہوئی۔ اور مزدلفہ وہ مقام ہے جہاں آپ سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اس قربانی کے بدلہ میں تجھے بہت بلند

درجات عطا کئے جائیں گے اور منیٰ وہ مقام ہے جہاں حضرت ہاجرہؑ گھبرائی ہوئی پہنچی تھیں مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں خدا کے حکم سے تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں تو انہوں نے کہا کہ اِذًا لَّا یُضَیِّعُنَا (بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی) اگر یہ بات ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا اور وہ واپس چلی گئیں۔ گویا شیطان ہمیشہ کے لئے مار دیا گیا۔ اس لئے یہاں شیطان کو کنکر مارے جاتے ہیں۔

پھر حج بیت اللہ کی ایک غرض شعائر اللہ کا احترام اور ان کی عظمت لوگوں کے دلوں میں قائم کرنا ہے۔ شعائر اللہ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے نشانات میں سے ہیں۔ چونکہ دنیا میں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا ذہن صرف ظاہر سے باطن کی طرف منتقل ہوا کرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے حج بیت اللہ میں ان کے سامنے ایسے نشانات رکھ دیئے جو خدا تعالیٰ کو یاد دلانے والے اور اس کی محبت دلوں میں تازہ کرنے والے ہیں۔ حج دراصل اس عظیم الشان قربانی کی یاد تازہ کرتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو بیت اللہ کے قریب ایک وادی غیر ذی زرع میں انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ کر سرانجام دی تھی بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ وہ اپنے بچے حضرت اسمٰعیلؑ کی گردن پر چھری پھیرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یادگار حج کی صورت میں قائم کر دی۔ حالانکہ اگر یہ درست ہوتا تو چونکہ یہ واقعہ شام میں ہوا تھا اس لئے حج کا اصل مقام شام ہوتا نہ کہ حجاز اور لوگ وہاں جمع ہو کر خدا تعالیٰ کی یاد کرتے اور کہتے ابراہیمؑ نے کس قدر قربانی کی تھی! لیکن خدا تعالیٰ نے حج کے لئے مکہ مکرمہ کو چُنا اور منیٰ اور مزدلفہ اور عرفات میں جانا اور وہاں مناسک حج بجالانا ضروری قرار دیا۔ پس میرے نزدیک حج کا تعلق آپ کا چُھری پھیرنے کے لئے تیار ہو جانے والے واقعہ سے نہیں بلکہ اس واقعہ سے ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایک ایسی وادی میں لا کر پھینک دیا جہاں پانی کا ایک قطرہ تک نہ تھا اور کھانے کے لئے ایک دانہ تک نہ تھا جب انسان حج کے لئے جاتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے یہ نقشہ آ جاتا ہے کہ کس طرح خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرنے والے بچائے جاتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ غیر معمولی عزت دیتا ہے اور حج کرنے والے کے دل میں بھی خدا تعالیٰ کی محبت بڑھتی اور اس کی ذات پر یقین ترقی کرتا ہے پھر وہ اپنے آپ کو اس گھر میں دیکھ کر جو ابتدائے دنیا سے خدا تعالیٰ کی یاد کے لئے بنایا گیا ہے ایک عجیب روحانی تعلق ان لوگوں سے محسوس کرتا ہے جو ہزاروں سال پہلے سے اس روحانی سلک میں پروئے چلے آتے ہیں جس میں یہ شخص پرویا ہوا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کی محبت کا رشتہ جو سب کو باندھے ہوئے ہے خواہ وہ پرانے ہوں یا نئے اسی طرح بیت اللہ کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کا نقشہ

انسانی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اسے احساس ہوتا ہے کہ کس طرح خدا تعالیٰ نے غیر معمولی طور پر چاروں طرف سے لوگوں کو اس گھر کے گرد جمع کر دیا ہے۔ جب انسان بیت اللہ کو دیکھتا ہے اور اس پر اس کی نظر پڑتی ہے تو اس کے دل پر ایک خاص اثر پڑتا ہے اور وہ قبولیت دعا کا ایک عجیب وقت ہوتا ہے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے حج کیا تو میں نے ایک حدیث پڑھی ہوئی تھی کہ جب پہلے پہل خانہ کعبہ نظر آئے تو اس وقت جو دعا کی جائے وہ قبول ہوجاتی ہے۔ فرمانے لگے اس وقت میرے دل میں کئی دعاؤں کی خواہش ہوئی لیکن میرے دل میں فوراً خیال پیدا ہوا کہ اگر میں نے یہ دعائیں مانگیں اور قبول ہو گئیں۔ اور پھر کوئی اور ضرورت پیش آئی تو پھر کیا ہوگا پھر تو نہ حج ہوگا اور نہ یہ خانہ کعبہ نظر آئے گا۔ کہنے لگے تب میں نے سوچ کر یہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کروں کہ یا اللہ! میں جو دعا کیا کروں وہ قبول ہوا کرے۔ تا کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے۔ میں نے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ سے یہ بات سنی ہوئی تھی۔ جب میں نے حج کیا تو مجھے بھی وہ بات یاد آ گئی۔ جونہی خانہ کعبہ نظر آیا ہمارے نانا جان نے ہاتھ اُٹھائے کہنے لگے دُعا کرلو۔ وہ کچھ اور دُعائیں مانگنے لگ گئے مگر میں نے تو یہی دُعا کی کہ یا اللہ! اس خانہ کعبہ کو دیکھنے کا مجھے روز روز کہاں موقعہ ملے گا۔ آج عمر بھر میں قسمت کے ساتھ موقع ملا ہے پس میری تو یہی دُعا ہے کہ تیرا اپنے رسول سے وعدہ ہے کہ اس کو پہلی دفعہ حج کے موقعہ پر دیکھ کر جو شخص دعا کرے گا وہ قبول ہوگی۔ میری دُعا تجھ سے یہی ہے کہ ساری عمر میری دُعائیں قبول ہوتی رہیں۔ چنانچہ اس کے فضل اور احسان سے میں برابر یہ نظارہ دیکھ رہا ہوں کہ میری ہر دعا اس طرح قبول ہوتی ہے کہ شاید کسی اعلیٰ درجہ کے شکاری کا نشانہ بھی اس طرح نہیں لگتا۔

اسی طرح بیت اللہ کے گرد چکر لگاتے وقت جب انسان دیکھتا ہے کہ ہزاروں لوگ اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں اور ہزاروں ہی اس کے گرد نمازیں پڑھ رہے ہیں تو اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں دنیا سے کٹ کر خدا تعالیٰ کی طرف آ گیا ہوں اور میرا بھی اب یہی کام ہے کہ میں اس کے حضور سر بسجود رہوں۔ پھر سعی بین الصفا والمروۃ میں حضرت ہاجرہؑ کا واقعہ انسان کے سامنے آتا ہے اور اس کا دل اس یقین سے بھر جاتا ہے کہ انسان اگر جنگل میں بھی خدا تعالیٰ کے لئے ڈیرہ لگا دے تو خدا تعالیٰ اُسے کبھی ضائع نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے خود اپنے پاس سے سامان مہیا کرتا اور اُسے معجزات اور نشانات سے حصہ دیتا ہے پھر وہاں جتنے مقام شعائر کا درجہ رکھتے ہیں ان کے بھی ایسے نام رکھ دیئے گئے ہیں کہ جن سے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے مثلاً سب سے پہلے لوگ منیٰ میں جاتے ہیں یہ لفظ اُمْنِيَّةٌ سے نکلا ہے جس کے معنے آرزو اور مقصد کے ہیں اور اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ لوگ اس جگہ محض

خدا کو ملنے اور شیطان سے کامل نفرت اور علیحدگی کا اظہار کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ پھر عرفات ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اب ہمیں خدا تعالیٰ کی پہچان اور اس کی معرفت حاصل ہوگئی ہے اور ہم اس سے مل گئے ہیں۔ اس کے بعد مزدلفہ ہے جو قرب کے معنوں پر دلالت کرتا ہے اور جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ وہ مقصد جس کی ہم تلاش کر رہے ہیں وہ ہمارے قریب آ گیا ہے۔ اسی طرح مشعر الحرام جو ایک پہاڑی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مخلصانہ عقیدت اور ابراہیم کے جذبات ہمارے دلوں میں پیدا کرتی ہے کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاص طور پر دعائیں فرمایا کرتے تھے۔ پھر مکہ مکرمہ ایسی جگہ ہے جہاں سوائے چند درختوں اور اذخر گھاس کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ہر جگہ ریت ہی ریت اور کنکر ہی کنکر ہیں اور کچھ چھوٹی چھوٹی گھاٹیاں ہیں۔ غرض وہ ایک نہایت ہی خشک جگہ ہے نہ کوئی سبزہ ہے نہ باغ دنیا کی کشش رکھنے والی چیزوں میں سے وہاں کوئی بھی چیز نہیں۔ پس وہاں جانا صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے قرب اور رضا کے لئے ہی ہوسکتا ہے اور یہی غرض حج بیت اللہ کی ہے پھر احرام باندھنے میں بھی ایک خاص بات کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ انسان کو یوم الحشر کا اندازہ ہوسکے کیونکہ جیسے کفن میں دو چادریں ہوتی ہیں۔ احرام میں بھی دو ہی ہوتی ہیں۔ ایک جسم کے اوپر کے حصہ کے لئے اور دوسری نیچے کے حصہ کے لئے۔ پھر سر بھی ننگا ہوتا ہے اور عرفات وغیرہ میں یہی نظارہ ہوتا ہے۔ جب لاکھوں آدمی اس شکل میں وہاں جمع ہوتے ہیں تو حشر کا نقشہ انسان کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم خدا تعالیٰ کے سامنے ہیں اور کفن میں لپٹے ہوئے ابھی قبروں سے نکل کر اس کے سامنے حاضر ہوئے ہیں پھر حج بیت اللہ میں حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ہاجرہؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات زندگی انسان کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں اور اس کے اندر ایک نیا ایمان اور عرفان پیدا ہوتا ہے۔ یوں تو اور قوموں نے بھی اپنے بزرگوں کے واقعات تصویری زبان میں کھینچنے کی کوشش کی ہے جیسے ہندو دسہرہ میں اپنے پُرانے تاریخی واقعات دہراتے ہیں مگر مسلمانوں کے سامنے خدا تعالیٰ نے ان کے آباؤ اجداد کے تاریخی واقعات کو ایسی طرز پر رکھا ہے کہ اس سے پرانے واقعات کی یاد بھی تازہ ہوجاتی ہے۔ اور آئندہ پیش آنے والے حادثہ یعنی قیامت کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ اسی طرح رمی الجمار کی اصل غرض بھی شیطان سے بیزاری کا اظہار کرنا ہے اور ان جمار کے نام بھی جمرۃ الدنیا، جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ العقبیٰ اس لئے رکھے گئے ہیں کہ انسان اس امر کا اقرار کرے کہ وہ دنیا میں بھی اپنے آپ کو شیطان سے دور رکھے گا اور عالم برزخ اور عالم عقبیٰ میں بھی ایسی حالت میں جائے گا کہ شیطان کا کوئی اثر اُس کی روح پر نہیں ہوگا۔ اسی طرح ذبیحہ سے اس طرف توجہ دلائی جاتی

ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رکھے اور جب بھی اس کی طرف سے آواز آئے وہ فوراً اپنا سر قربانی کے لئے جھکا دے اور اس کی راہ میں اپنی جان تک دینے سے بھی دریغ نہ کرے۔ پھر سات طواف سات سعی اور سات ہی رمی ہیں۔ اس سات کے عدد میں روحانی مدارج کی تکمیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ اس کے بھی سات ہی درجے ہیں جن کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ سورہ مومنون میں ان درجات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اسی طرح حجر اسود کو بوسہ دینا بھی ایک تصویری زبان ہے۔ بوسہ کے ذریعہ انسان اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ میں اس وجود کو جس کو مَیں بوسہ دے رہا ہوں اپنے آپ سے جدا رکھنا پسند نہیں کرتا بلکہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے جسم کا ایک حصہ بن جائے۔ غرض حج ایک عظیم الشان عبادت ہے جو ایک سچے مومن کے لئے ہزاروں برکات اور انوار کا موجب بنتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل مسلمان صرف رسمی رنگ میں یہ فریضہ ادا کرنے کی وجہ سے اس کی برکات سے پوری طرح متمتع نہیں ہوتے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ

اور بعض آدمی ایسے (بھی ہوتے) ہیں جن کی باتیں (اس) دنیا کی زندگی کے متعلق تجھے (بہت) پسندیدہ معلوم ہوتی

يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۵

ہیں اور وہ (بات کرتے وقت) اللہ کو اس (اخلاص) پر جو ان کے دل میں ہے گواہ ٹھہراتے (جاتے) ہیں۔ حالانکہ وہ (حقیقت میں) سب جھگڑالوؤں سے زیادہ جھگڑالو ہوتے ہیں۔

حل لغات۔ اَلَدُّ الْخِصَامِ اَلَدُّ لَدَّ يَلِدُّ سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اَلَدُّ کے معنے ہیں شَدِيْدُ الْخُصُوْمَةِ۔ وہ دشمن جو دشمنی میں بہت بڑھا ہوا ہو۔ خِصَامٌ یہ مصدر ہے جس کے معنے مجادلہ یعنی جھگڑے کے ہیں (اقرب)۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں کہ جب وہ کسی مجلس میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کرتے ہیں تو تم سمجھتے ہو واہ وا یہ کتنے عقلمند اور سمجھدار ہیں!! یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے سارے علوم پر حاوی ہیں اور ان کی عقل کو کوئی پہنچ نہیں سکتا اور پھر وہ اپنی دینداری کے متعلق اتنا یقین لوگوں کو دلاتے ہیں کہ کہتے ہیں خدا کی قسم! ہمارے دل میں جو نیکیاں بھری ہوئی ہیں ان کو کوئی نہیں جانتا ہم سے مشورہ لیا جائے تو ہم یوں کر دیں وُوں

کردیں مگر فرماتا ہے حقیقت کیا ہوتی ہے؟ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ بدترین دشمن جو تمہارے ہو سکتے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ جھگڑالو اور خطرناک ہوتا ہے وہ ہوتا تمہارے ساتھ ہے وہ مسلمان کہلاتا ہے اور جب کسی مجلس میں بیٹھ جاتا ہے تو ساری مجلس پر چھا جاتا ہے اور اپنی دینداری اور تقویٰ پر قسمیں کھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا دل تو قوم کے لئے گھلا جا رہا ہے۔ جب دیکھنے والا اسے دیکھتا ہے اور سننے والا اس کی باتیں سنتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ قطب الاقطاب بیٹھا ہے مگر فرماتا ہے۔ دنیا میں تمہارے یہودی بھی دشمن ہیں۔ عیسائی بھی دشمن ہیں اور قومیں بھی دشمن ہیں مگر یہ ان سے بھی بڑا اور خطرناک دشمن ہوتا ہے۔ بظاہر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کا ایک مجسمہ ہے لیکن معاملہ برعکس ہوتا ہے وہ کوئی دینی نکتے بیان نہیں کرتا بلکہ دنیوی امور کے متعلق ایسی باتیں کرتا ہے جو بظاہر تو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر درحقیقت ان کی تہہ میں منافقت کام کر رہی ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتا چلا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا گواہ ہے میرے دل میں تو اخلاص ہی اخلاص ہے اور میں تو محض اپنے دوستوں کی خیر خواہی اور بھلائی کی وجہ سے ایسا کر رہا ہوں۔ فرماتا ہے تم ایسے شخص کی چکنی چپڑی باتوں سے کبھی دھوکا نہ کھاؤ۔ اور جب بھی تمہیں کوئی ایسا شخص نظر آئے۔ فوراً لاحول پڑھ کر اس سے علیحدہ ہو جاؤ اور سمجھ لو کہ تمہارے سامنے ایک شیطان بیٹھا ہے جو قسمیں کھا کھا کر اور اپنی خیر خواہی کا لوگوں کو یقین دلا دلا کر انہیں دھوکا اور فریب دے رہا ہے۔

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ

اور جب حاکم ہو جاتے ہیں تو فساد (پیدا) کرنے اور کھیتی (باڑی) اور مخلوق کو ہلاک کرنے کی غرض سے (سارے)

وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۶﴾

ملک میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ (تعالیٰ) فساد کو پسند نہیں کرتا۔

حل لغات۔ تَوَلّٰى وَلِيَ سے باب تفعّل ہے اور اَلتَّوَلِّيْ کے معنے ہیں اَلْاِنْصِرَافُ بِالْبَدَنِ اَوِ الْقَوْلِ۔ بدن کے ساتھ پھر جانا یعنی پیٹھ پھیر لینا۔ مرتد ہو جانا یا (۲) اپنی بات سے پھر جانا (۳) حاکم اور والی بن جانا۔ (لسان العرب)

اَلْحَرْثُ کے معنے ہیں مَا يَسْتَنْبُتُ بِالْبَذْرِ وَالنَّوٰى وَالْغَرْسِ۔ یعنی جو چیز بیج گٹھلی یا پودے سے اُگائی

جائے۔(اقرب)

نَسْل کے معنے ہیں (۱) عقب یعنی اولاد بیٹے بیٹیاں (۲) مخلوق (۳) اگلی نسل یعنی صرف بیٹوں تک ہی نہیں بلکہ دس دس بیس بیس پشتوں تک جو اولاد چلتی ہے اُسے بھی نسل ہی کہتے ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔فرمایا ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں بادشاہت مل جاتی ہے یعنی وہ خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ طاقتوں سے کام لے کر حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ رعایا اور ملک کی خدمت کریں بجائے اس کے کہ لوگوں کے دلوں میں سکینت اور اطمینان پیدا کریں وہ ایسی تدابیر اختیار کرنی شروع کر دیتے ہیں جن سے قومیں قوموں سے۔قبیلے قبیلوں سے اور ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے لڑنے جھگڑنے لگ جاتے ہیں اور ملک میں طوائف الملوکی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔اسی طرح وہ ایسے طریق اختیار کرتے ہیں جن سے ملک کی تمدنی اور اخلاقی حالت تباہ ہو جاتی ہے اور آئندہ نسلیں بیکار ہو جاتی ہیں۔حرث کے لغوی معنے تو کھیتی کے ہیں مگر یہاں حرث کا لفظ استعارۃً وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ جتنے ذرائع ملک کی تمدنی حالت کو بہت بنانے والے ہوتے ہیں ان ذرائع کو اختیار کرنے کی بجائے وہ ایسے قوانین بناتے ہیں جن سے تمدن تباہ ہو۔اقتصاد برباد ہو۔مالی حالت میں ترقی نہ ہو۔اس طرح وہ نسلِ انسانی کی ترقی پر تبر رکھ دیتے ہیں۔اور ایسے قوانین بناتے ہیں جن سے آئندہ پیدا ہونے والی نسلیں اپنی طاقتوں کو کھو بیٹھتی ہیں اور ایسی تعلیمات جن کو سیکھ کر وہ ترقی کر سکتی ہیں ان سے محروم رہ جاتی ہیں۔

پھر فرماتا ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں کرتا۔اس لئے ایسے بادشاہ اور حکمران خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مغضوب ہیں اور وہ ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک وہی بادشاہ صحیح معنوں میں بادشاہ کہلا سکتا ہے جو لوگوں کے لئے ہر قسم کا امن مہیّا کرے۔ان کی اقتصادی حالت کو درست کرے اور ان کی جانوں کی حفاظت کرے۔کیا بلحاظ صحت کا خیال رکھنے کے اور کیا بلحاظ اس کے کہ وہ غیر ضروری جنگیں نہ کرے اور اپنے ملک کے افراد کو بلاوجہ مرنے نہ دے۔گویا ہر قسم کے امن اور جان و مال کی حفاظت کی ذمہ واری اسلام کے نزدیک حکومت پر عاید ہوتی ہے۔اور وہ اس امر کی پابند ہے کہ ملک کی ترقی اور رعایا کی بہبودی کا ہمیشہ خیال رکھے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ

اور جب انہیں کہا جائے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو (اپنی) عزت (کی پچ) انہیں گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے پس اس

جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۷﴾

(قسم کے لوگوں) کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ یقیناً بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

حل لغات۔ اِتَّقِ وَقٰی یَقِیْ سے باب افتعال کا امر کا صیغہ ہے اس کے اصل معنے یہ ہیں کہ انسان اس چیز سے جو سامنے سے آرہی ہو بچنے کے لئے ہٹ جائے مگر یہ معنے اس جگہ چسپاں نہیں ہوتے کیونکہ انسان خدا تعالیٰ سے نہیں بچ سکتا۔ خواہ وہ کسی جگہ چلا جائے بہر حال دوسرے معنے ہی لینے پڑیں گے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنالے (لسان العرب)۔

اَخَذَتْهُ اَلْاَخْذُ کے معنے ہیں حَوْزُ الشَّیْءِ وَتَحْصِیْلُهٗ۔۔۔۔۔وَتَارَةً بِالْقَهْرِ۔ کسی چیز کو زبردستی لے لینا یا حاصل کرنا یا پکڑ لینا (اقرب) اور اَخَذَتْهُ بِکَذَا کے معنے ہیں حَمَلَتْهُ عَلٰی کَذَا۔ اُسے کسی کام پر اکسا دیا یا اُس کی ترغیب دی۔ (اقرب)

اَلْعِزَّةُ وَرُبَمَا اسْتُعِيْرَتِ الْعِزَّةُ لِلْحَمِيَّةِ وَ الْاَنَفَةِ الْمَذْمُوْمَةِ۔ وَمِنْهُ فِی الْقُرْاٰنِ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (اقرب) یعنی بعض اوقات عزۃ کا لفظ بطور استعارہ جھوٹی غیرت اور پچ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ کے معنے یہ ہوئے کہ جھوٹی قومی غیرت نے اُسے گناہ کی خاطر گھیر لیا یا اُسے گناہ پر آمادہ کر دیا۔

جَهَنَّمُ دَارُ الْعِقَابِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔ یعنی جہنم موت کے بعد سزا کی جگہ کا نام ہے (اقرب) جہنم کے لئے قرآن کریم میں اور بھی کئی لفظ آتے ہیں۔ جیسے جَحِيْمٌ، سَعِيْرٌ، سَقَرٌ، لظٰی وغیرہ۔

مِهَادٌ وہ جگہ جہاں انسان تھک کر آرام کرے جیسے بستر وغیرہ۔

تفسیر۔ فرماتا ہے جب اُسے کہا جائے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ تم تو دو کوڑی کے بھی آدمی نہیں تھے تمہیں تو جو کچھ ملا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے احسان کی وجہ سے ملا ہے۔ تو اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ اُسے اپنی جھوٹی عزت کی پچ گناہوں پر اور زیادہ دلیر کرتی ہے۔ اس کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ اس کے پہلے گناہوں اور

شامت اعمال کی وجہ سے ہتک عزت کا جنون اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے اور اسے ہدایت سے اور زیادہ دور پھینک دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اپنی عزت کی پچ اُسے گناہوں کے لئے پکڑ لیتی ہے یعنی اس سے اور زیادہ گناہوں کا ارتکاب شروع کرا دیتی ہے۔ فرماتا ہے یہاں ممکن ہے تم لوگوں کو فریب دے لو لیکن آخر جہنم تمہارا ٹھکانہ ہے۔ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ جہنم بے شک اگلے جہان میں ہے لیکن ایک جہنم ایسے انسانوں کے لئے اس جہان میں بھی پیدا کر دیا جاتا ہے جب شریف انسان مقابلہ میں کھڑے ہو جائیں تو انہیں ایسا جواب مل جاتا ہے کہ یہی دنیا ان کے لئے جہنم بن جاتی ہے افسوس ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ صرف اس لئے اپنی اصلاح نہیں کر سکتے کہ جب انہیں ان کی غلطی بتائی جائے اور کہا جائے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ تو اپنی ہتک عزت کے خیال سے وہ دیوانہ ہو کر بجائے نصیحت سے فائدہ اٹھانے کے ناصح کا مقابلہ کرنے لگ جاتے ہیں مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جس کسی میں کوئی غلطی یا نقص دیکھے بازار میں کھڑے ہو کر اُسے تنبیہہ کرنا شروع کر دے۔ سمجھانا ہمیشہ علیحدگی میں چاہیے۔ اور سمجھانے والے کو اپنی حیثیت اور قابلیت بھی دیکھنی چاہیے کہ وہ جس شخص کو سمجھانا چاہتا ہے اسے سمجھانے کی اہلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ تا کہ اس کا اُلٹا نتیجہ نہ نکلے غرض جہاں غلطی کرنے والوں کو برداشت کی طاقت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور سمجھانے والے کی بات کو ٹھنڈے دل سے سُننا چاہیے۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ سمجھانے والا احتیاط سے کام لے۔ یہ نہ ہو کہ وہ جس کو چاہے لوگوں میں ذلیل کرنا شروع کر دے۔ اس مثال کو حج کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ حج کی بڑی غرض قومی تفرقوں کو مٹا کر اتفاق و اتحاد اور محبت و یگانگت کے تعلقات کو بڑھانا ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دنیا میں لڑتے جھگڑتے اور فساد پیدا کرتے رہتے ہیں۔ انہیں متوجہ کیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ ساری دنیا کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہے تو انہیں بھی چاہیے کہ وہ اتفاق و اتحاد قائم رکھیں اور اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے کینے اور بغض چھوڑ دیں۔ درحقیقت صحیح معنوں میں حج کرنے والا صرف وہی شخص کہلا سکتا ہے جو اس قسم کے فتنہ و فساد سے مجتنب رہے۔ لیکن جو شخص فساد کرتا اور بنی نوع انسان کو دکھ پہنچاتا ہے وہ اپنے عمل سے اس وحدت اور مرکزیت کو نقصان پہنچاتا ہے جس کو قائم کرنے کے لئے اسلام نے حج بیت اللہ کا حکم دیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط

اور بعض آدمی ایسے (بھی) ہوتے ہیں جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کو (ہی) بیچ ڈالتے ہیں۔

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۸﴾

اور اللہ (اپنے ایسے مخلص) بندوں پر بڑی شفقت کرنے والا ہے۔

حل لغات۔ **يَشْرِيْ** شَرٰی سے مضارع کا صیغہ ہے اور شَرٰی کے معنے خریدنے اور بیچنے دونوں کے ہوتے ہیں۔ (اقرب)

رَءُوْفٌ رَءُوْفٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ رَءُوْفٌ رَأْفَةٌ سے ہے اور رأفت کے معنے تکلیف کو دیکھ کر اس کے دور کرنے کی طرف توجہ کرنے کے ہیں۔ رأفت اور رحمت دونوں ہم معنے لفظ ہیں مگر رحمت وسیع ہے اور رأفت قدرے محدود ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر اُسے چھڑانا۔ پس رؤوف کے معنے ہوئے تکلیف میں دیکھ کر چھڑانے والا۔ رحمت دُکھ و سکھ دونوں کے لئے ہوتی ہے۔ مگر رأفت ہمیشہ دکھ پر ہی ہوتی ہے گویا رحمت عام ہے اور رأفت خاص۔

تفسیر۔ اس مثال میں بتایا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ اُسے بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جان کو بھی قربان کرنے پر تیار رہتے ہوں وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لئے کب کوئی قدم اُٹھا سکتے ہیں؟ یہ مثال دے کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تمہیں بھی آخر الذکر گروہ کا سا طریق اختیار کرنا چاہیے اور نہ صرف فتنہ و فساد سے مجتنب رہنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دینا چاہیے۔

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑی شفقت کرنے والا ہے۔ اس کی شفقت کا تقاضا ہے کہ تم بھی فتنہ و فساد سے بچو۔ اور اپنی زندگیوں کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں صرف کرو تا کہ تم بھی رءوف بالعباد خدا کے مظہر بن جاؤ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم سب کے سب فرمانبرداری (کے دائرہ) میں آجاؤ۔ اور

تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۹﴾

شیطان کے قدم بقدم نہ چلو۔ وہ یقیناً تمہارا کھلا (کھلا) دشمن ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلسِّلْمُ کے معنے ہیں اَلصُّلحُ۔ اَلسَّلَامُ وَالْاِسْلَامُ (اقرب) یعنی (۱) صلح (۲) امن کو قائم کرنا (۳) اسلام۔

كَآفَّةً كَفٌّ کے معنے ہیں جمع کرنا۔ روکنا۔ پس كَآفَّةٌ کے معنے جمع کرنے والے یا روکنے والے کے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اے مومنو! تم سارے کے سارے پورے طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ اور اس کی اطاعت کا جُوا اپنی گردنوں پر کامل طور پر رکھ لو۔ یا اے مسلمانو! تم اطاعت اور فرمانبرداری کی ساری راہیں اختیار کرو اور کوئی بھی حکم ترک نہ کرو۔ اس آیت میں كَآفَّةً اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا بھی حال ہو سکتا ہے اور اَلسِّلْمِ کا بھی۔ پہلی صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ یعنی تمہارا کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو اطاعت اور فرمانبرداری کے مقام پر کھڑا نہ ہو۔ یا جس میں بغاوت اور نشوز کے آثار پائے جاتے ہوں۔ دوسری صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ تم پورے کا پورا اسلام قبول کرو۔ یعنی اس کا کوئی حکم ایسا نہ ہو جس پر تمہارا عمل نہ ہو۔ یہ قربانی ہے جو اللہ تعالیٰ ہر مومن سے چاہتا ہے کہ انسان اپنی تمام آرزوؤں تمام خواہشوں اور تمام امنگوں کو خدا تعالیٰ کے لئے قربان کر دے اور ایسا نہ کرے کہ جو اپنی مرضی ہو وہ تو کر لے اور جو نہ ہو وہ نہ کرے۔ یعنی اگر شریعت اس کو حق دلاتی ہو تو کہے میں شریعت پر چلتا ہوں اور اسی کے ماتحت فیصلہ ہونا چاہیے لیکن اگر شریعت اس سے کچھ دلوائے اور ملکی قانون نہ دلوائے تو کہے کہ ملکی قانون کی رو سے فیصلہ ہونا چاہیے۔ یہ طریق حقیقی ایمان کے بالکل منافی ہے۔ چونکہ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ مسلمانوں میں بعض ایسے کمزور لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو قومی ترقی اور رفاہیت کے دور میں فتنہ وفساد پر اُتر آتے ہیں۔ اور وہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری پہلی حالت کیا تھی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں کیا کچھ عطا کر دیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نصیحت فرماتا ہے کہ بے شک تم مومن کہلاتے ہو مگر تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ صرف مونہہ سے اپنے آپ کو مومن کہنا تمہیں نجات کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ تم اگر

نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ اوّل ہر قسم کی منافقت اور بے ایمانی کو اپنے اندر سے دور کرنے کی کوشش کرو۔ اور قوم کے ہر فرد کو ایمان اور اطاعت کی مضبوط چٹان پر قائم کردو۔ دوم صرف چند احکام پر عمل کر کے خوش نہ ہو جاؤ۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے تمام احکام پر عمل بجالاؤ۔ اور صفاتِ الٰہیہ کا کامل مظہر بننے کی کوشش کرو۔

پھر فرماتا ہے وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔ تم شیطان کے پیچھے نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس آیت میں خطوات کا لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہ شیطان ہمیشہ قدم بقدم انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ کبھی یکدم کسی انسان کو بڑے گناہ کی تحریک نہیں کرتا بلکہ اسے بدی کی طرف صرف ایک قدم اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے اور جب وہ ایک قدم اُٹھا لیتا ہے تو پھر دوسرا قدم اُٹھانے کی تحریک کرتا ہے اس طرح آہستہ آہستہ اور قدم بقدم اسے بڑے گناہوں میں ملوث کر دیتا ہے پس فرماتا ہے ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ تمہارا صرف چند احکام پر عمل کر کے خوش ہو جانا اور باقی احکام کو نظر انداز کر کے سمجھ لینا کہ تم پکے مسلمان ہو ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ اگر تم اسی طرح احکام الٰہیہ کو نظر انداز کرتے رہے تو رفتہ رفتہ جن احکام پر تمہارا اب عمل ہے ان احکام پر بھی تمہارا عمل جاتا رہے گا۔ پس اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہو۔ اور شیطانی وساوس سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرو۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ

اور اگر تم باوجود اس کے کہ تمہارے پاس کھلے (کھلے) نشان آئے ڈگمگا گئے تو جان لو کہ

اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۱۰﴾

اللہ یقیناً غالب (اور) حکمت والا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے اگر تم اپنی اصلاح نہیں کرو گے اور طاقت اور قوت حاصل کرنے کے بعد بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کی بجائے ان پر ظلم کرنا شروع کردو گے۔ اور انہیں مالی اور جانی نقصانات پہنچاؤ گے تو تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تمہارے سر پر ایک غالب خدا موجود ہے جو تمہیں سزا دینے کی بھی طاقت رکھتا ہے اور تم سے تمہارا اقتدار بھی چھین سکتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ سے ڈرو جو ایکدم میں تمہیں بادشاہ سے گدا اور امیر سے فقیر بنا سکتا ہے اور تمہاری عزّت کو ذلّت سے بدل سکتا ہے مگر ساتھ ہی حکیم کہہ کر بتایا کہ اس کا کوئی فعل ظالمانہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہر

کام کے پیچھے بڑی بڑی حکمتیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ پس اس کی سزا بھی ظالمانہ نہیں ہوتی بلکہ انسانی اصلاح کے لئے ہوتی ہے۔ اگر لوگ اپنی درندگی چھوڑ دیں اور خدا تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کر لیں۔ اور بنی نوع انسان کی خدمت اپنا شعار بنالیں اور سچائی اور راستی اور دیانت اور امانت کو اختیار کر لیں اور ہر قسم کا کھوٹ اپنے دلوں میں سے نکال دیں اور پاک باطن اور نیک دل اور با اخلاق اور خدا ترس بن جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم کرتا اور ان کی تضرعات کو سنتا اور ان کی ناکامیوں اور ذلتوں کو کامیابیوں اور عزتوں میں بدل دیتا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ

وہ (لوگ) اس کے سوا کس (بات) کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ (تعالیٰ) ان کے پاس بادلوں کے سایوں میں آئے

وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۱﴾ ع ۲۵ / ۱۴ / ۹

اور فرشتے بھی (آئیں) اور بات کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اور تمام امور اللہ ہی کی طرف پھیرے جاتے ہیں۔

تفسیر ۔ اس میں بتایا کہ یہ کفار جو مسلمانوں کی مخالفت کر رہے ہیں اور منافق جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں اور اسلام کی تباہی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر تو اس بات کے منتظر ہیں کہ کب وہ دن آئے کہ اسلام دنیا سے مٹ جائے اور خدائے واحد کی حکومت پر شیطانی طاقتیں غلبہ حاصل کر لیں لیکن درحقیقت اپنے عمل سے وہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے پاس بادلوں کے سایوں میں آئے۔ یعنی اپنی مخفی تدبیر سے ان کی ہلاکت اور بربادی کے سامان پیدا کر دے۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ آسمان سے اس کے فرشتے نازل ہوں جو انہیں کچل کر رکھ دیں۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ کوئی ایسا نشان ظاہر ہو جس کے نتیجہ میں یہ روز روز کے جھگڑے مٹ جائیں اور خدا تعالیٰ کا آخری فیصلہ ایک چمکتے ہوئے نشان کی صورت میں سب کو نظر آ جائے۔ اور آخر ایک دن ایسا ہی ہوگا۔ خدا ان کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوگا اور ان کی ہلاکت کی ساعت ان کے سروں پر منڈلانے لگے گی۔ چنانچہ جنگِ بدر میں خدا تعالیٰ نے بادلوں میں سے ہی اپنا چہرہ ظاہر کیا۔ یعنی ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ بارش ہوئی جس سے کفار کو شدید نقصان اور مومنوں کو جنگی لحاظ سے عظیم الشان فائدہ پہنچا اور پھر مومنوں کی مدد اور کفار پر رُعب طاری کرنے کے لئے ملائکہ بھی دلوں پر نازل ہوئے۔ بلکہ جنگِ بدر میں کئی کفار نے ملائکہ کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا (الانفال: ۱۰۔ السیرۃ النبویۃ لابن ھشام، واقعہ بدر)۔ اور قُضِيَ الْاَمْرُ کے ماتحت

عرب کے سردار چُن چُن کر مارے گئے۔ یہاں تک کہ وہ بھی جسے وہ سید الوادی کہتے تھے دو انصاری لڑکوں کے ہاتھ سے مارا گیا (بخاری کتاب المغازی باب قتل ابی جھل)۔ اور مکہ میں ایسا کہرام مچا کہ کوئی گھر نہ تھا جس میں ماتم نہ پڑا ہو۔ اور گو یہود پر اس کا براہ راست کوئی اثر نہیں پڑا مگر اس جنگ کے نتیجہ میں ہی ان کی شرارتیں ظاہر ہوئیں۔ اور آخر وہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ غرض ان کا منہ مانگا نشان انہیں مل گیا اور ان کی شوکت کی جڑھ کاٹ کر رکھ دی گئی اور پھر یہی سلوک بعد میں پیدا ہونے والے دشمنوں سے بھی ہوتا رہا اور خدا تعالیٰ انہیں اپنی قہری تجلّی کے جلوے بار بار دکھاتا رہا یہاں تک کہ اسلام دنیا پر غالب آ گیا۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ

(ذرا) بنی اسرائیل سے پوچھو (تو) کہ ہم نے انہیں کتنے کھلے کھلے نشان دیئے تھے اور جو شخص اللہ کی (کسی)

مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ

نعمت کو بعد اس کے کہ وہ اسے حاصل ہو جائے (اور وہ اس حقیقت کو سمجھ چکا ہو) بدل ڈالے تو (وہ یاد رکھے کہ) اللہ

شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۲﴾

(بھی) سخت سزا دینے والا ہے۔

تفسیر۔ میں ترتیب مضمون کو بیان کرتے ہوئے اوپر بتا چکا ہوں کہ اس جگہ یہود مخاطب ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس پیشگوئی پر بحث ہو رہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے متعلق تھی۔ اور آپ کو اس پیشگوئی کا مصداق ثابت کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اسی تسلسل میں اللہ تعالیٰ نے وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں فتح مکہ کی پیشگوئی کی۔ یہ پیشگوئی اس وقت کی گئی تھی جبکہ مکہ پر کفار کا غلبہ اور حکومت تھی اور مسلمان مدینہ میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے الہام کے ذریعے بتایا کہ ایک وقت آئے گا جب تم مکہ فتح کر لو گے اور تمہارے لئے حج بیت اللہ کے راستے بالکل کھل جائیں گے۔ پھر اسی ضمن میں صلح حدیبیہ کی بھی پیشگوئی کی کیونکہ بتایا کہ اگر تمہیں عمرہ سے روکا جائے تو تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ گویا پہلے سے پیشگوئی کر دی کہ تمہیں ایک زمانہ میں عمرہ کرنے سے بھی روکا جائے گا۔

اسی طرح مَنْ لَّمْ یَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں یہ اشارہ مخفی تھا کہ مکہ ایک دن تمہارے لئے گھر کے طور پر بننے والا ہے۔غرض ان آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ مکہ کے دروازے تمہارے لئے کھلنے والے ہیں۔اور تم اس میں امن سے داخل ہوگے۔ چنانچہ فتح مکہ سے پہلے ہی فرما دیا کہ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ جب تم امن میں آجاؤ تو ایسا کرو۔

اب ان پیشگوئیوں کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم ان سے پوچھو کہ ہم نے انہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت کے کس قدر کھلے نشانات دکھائے ہیں اور یہ جو ہم نے فتح مکہ کی پیشگوئی کی ہے یہ بھی ایک زبردست نشان ہے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔پس وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی ناقدری کرتے ہوئے اسے مٹانے کے درپے ہیں۔انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں سخت سزا دے گا۔ چنانچہ فتح مکہ کے ساتھ ہی یہود کی بھی انتہائی ذلت ہوئی اور وہ بھی تباہ ہوتے چلے گئے۔

اس آیت کا ایک یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے یہود کو پہلے بھی بہت سی نعمتیں عطا فرمائی تھیں جن کی انہوں نے ناشکری کی مثلاً سب سے بڑی نعمت تو ان پر یہی نازل ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے متواتر انبیاء ان میں مبعوث فرمائے لیکن یہود نے ہمیشہ ان کی تکذیب کی اور ان کی مخالفت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ یہاں تک کہ بعض انبیاء کو انہوں نے جان سے بھی مار ڈالا۔ یہ خدا تعالیٰ کی نعمت کی ایک عظیم الشان ناشکری تھی جو ان سے ظاہر ہوئی۔اسی طرح عیسائیوں نے جو یہود کی ایک شاخ ہیں اس قدر ناشکری کی کہ شریعت کو لعنت قرار دے دیا۔ غرض یہود کی ان متواتر سرکشیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتِ نبوت ان سے واپس لے لی کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتا الٰہی سنّت کے مطابق وہ نعمتیں اس سے چھین لی جاتی ہیں اور اسے رنج و غم اور حسرت و یاس کے لمبے عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے انہیں دنیوی زندگی خوبصورت کر کے دکھائی گئی ہے۔اور وہ ان لوگوں سے جو ایمان

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

لائے ہیں ٹھٹھا کرتے ہیں۔اور (اس کے بالمقابل) جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے وہ (ان) کفار پر قیامت

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۳﴾

کے دن غالب ہوں گے۔اور اللہ جسے پسند کرتا ہے اسے بے حساب دیتا ہے۔

تفسیر ۔فرمایا یہ لوگ ابھی اس پیشگوئی کی حقیقت کونہیں سمجھ سکتے۔کیونکہ دنیا اپنی تمام دلفریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی ہے اور طاقت اور دولت کے نشہ نے ان کی نگاہوں کو ایسا خیرہ کر رکھا ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں ہم مسلمانوں سے کہاں شکست کھا سکتے ہیں بلکہ وہ ان پیشگوئیوں پر مسلمانوں سے تمسخر کرتے اور ان کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اور انہیں طعنے دیتے ہیں کہ ہمیں تو نقد مل رہا ہے۔تمہارا انعام کہاں ہے؟ مگر ایک دن ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کس طرح مسلمان کو غلبہ عطا کرتے اور کفار کو نیچا دکھاتے ہیں۔چنانچہ فرمایا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ جب قیامت کا دن آئے گا تو متقی لوگ ان کفار پر غالب ہوں گے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کا نظارہ اس قیامت کے دن بھی ہوگا جو مرنے کے بعد آنے والا ہے جب کہ کفار دوزخ میں جائیں گے اور مومن جنت میں اور وہ ہمیشہ کے لئے فوق ہو جائیں گے کیونکہ آخرت میں مقابلہ تو ہے نہیں کہ دوزخی جنتیوں پر کسی وقت فوقیت لے جاسکیں۔مگر اس قیامت کے دن سے لوگ نصیحت حاصل نہیں کر سکتے اور نہ اسے حجت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور اس آیت میں اس غلبہ کو بطور دلیل صداقت پیش کیا گیا ہے۔پس اس آیت میں یومِ قیامت سے مراد وہی دن ہے جس دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح حاصل ہوئی اور کفار کو شکست جس دن دنیا نے یہ عجیب نظارہ دیکھا کہ وہ جو اکیلا اور بے یارومددگار تھا اور قوم کے ظلموں کا نشانہ بنا ہوا تھا وہ تو حاکم ہو گیا اور جو ملک کے بادشاہ اور حکمران تھے محکوم اور ذلیل ہو گئے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا کے الفاظ میں مومنوں کو بھی اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کفار پر حقیقی غلبہ حاصل کرنے کے لئے سب سے بڑی چیز جس کی تمہیں ضرورت ہے وہ تقویٰ ہے بیشک ایمان بھی ایک قیمتی دولت ہے لیکن اگر اس ایمان کے مطابق عمل نہیں تو وہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ میں بغیر حساب کے الفاظ کفار کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے ہیں۔ اور جب کوئی چیز بے حساب ملے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بدلہ سے بہت زیادہ ہے۔حساب کر کے تو جتنا کسی کا حق بنتا ہے اتنا ہی دیا جاتا ہے مگر بغیر حساب کے اسی صورت میں دیا جاتا ہے جب حق سے زیادہ دیا جائے۔پس ان الفاظ میں یہ اشارہ مخفی ہے کہ مومنوں کو ان کے بدلہ سے بہت بڑھ چڑھ کر انعام ملے گا۔دوسرے اس میں کفار کو بتایا

کہ تم کو جو کچھ ملا ہے اس کے متعلق تو تم سے پوچھا جائے گا کہ کس کس طرح خرچ کیا ہے؟ لیکن ان کو اس طرح ملے گا کہ ان سے حساب بھی نہیں لیا جائے گا۔ گویا تم کو تو ملازموں کی طرح ملا ہے اور تم اس میں خیانت کر کے سزا کے مورد بنتے ہو۔ لیکن ان کو ہدیہ کے طور پر ملے گا۔ اور اس میں تصرف کا ان کو اختیار کامل ہوگا۔ دراصل سلوک دو قسم کا ہوتا ہے ایک دوستانہ اور دوسرا ملازمانہ۔ چونکہ دوستی میں غیریت باقی نہیں رہتی اس لئے فرمایا کہ ہم مومنوں کو بغیر حساب دیں گے اور ان سے ایسا سلوک کریں گے جو ایک دوست دوست سے کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ میری امت میں سے ستّر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے (بخاری کتاب الرقاق باب یدخل الجنۃ سبعون الفا بغیر حساب) لیکن جس کے ساتھ غیریت کا معاملہ ہو اس سے سختی کے ساتھ حساب لیا جاتا ہے اور حساب ہی کے مطابق اسے معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں کفار کے متعلق یہ الفاظ کہیں استعمال نہیں ہوئے کہ انہیں بغیر حساب دیا جائے گا۔ بلکہ ان کے متعلق جہاں بھی آیا ہے یہی آیا ہے کہ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک دفعہ فرمایا مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ یعنی وہ شخص جس کا سختی سے حساب لیا گیا وہ تباہ ہوا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات سنی تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ کیا قرآن میں یہ نہیں آتا کہ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا (الانشقاق:۹) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومنوں کا بھی حساب ہوگا۔ آپ نے فرمایا حساب سے مراد یہ ہے کہ پوری طرح حساب لیا جائے ورنہ مومن کا حساب تو محض سرسری ہوگا (بخاری کتاب الرقاق باب من نوقش الحساب عذب) پس مومنوں کو جو کچھ ملے گا بغیر حساب کے ہی ملے گا۔

اسی طرح بغیر حساب کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ختم ہونے والا انعام ملے گا۔ اور چونکہ یہ آیت اس دنیا کے غلبہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اس لئے وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی قربانیوں سے بہت زیادہ اجر عطا فرمائے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی غلامی میں اس دنیا میں جو کچھ ملا وہ بے حساب ہی ملا۔ بے شک ان کی قربانیوں کی چمک بھی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جو انہیں دینی اور دنیوی رنگ میں غیر معمولی اجر عطا فرمایا وہ ان کی قربانیوں سے بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو مادی رنگ میں انہیں تختِ شاہی پر بٹھا دیا اور دوسری طرف روحانی رنگ میں انہیں ایسی برکات سے نوازا کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (التوبۃ:۱۰۰) کا دائمی سرٹیفکیٹ انہیں حاصل ہوگیا۔

وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ میں کفار کے اس شبہ کا بھی ازالہ کیا گیا ہے کہ یہ مٹھی بھر مسلمان ہم پر کس طرح غالب آسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ جب کسی قوم پر اپنے انعامات نازل کرنا چاہے تو اسے بے حساب انعام دیا کرتا ہے۔ بے شک تم حساب کی رو سے یہی سمجھتے ہو کہ ایک شخص دو پر غالب نہیں آسکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ کا سلوک مسلمانوں سے اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ ان کا ایک شخص تمہارے دو پر ہی نہیں بلکہ ان کا ایک آدمی تمہارے دس آدمیوں پر بھی غالب آجائے گا۔ اور فتح و کامیابی کا پرچم لہراتے ہوئے واپس لوٹے گا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ

سب لوگ ایک ہی (خیال کے) تھے۔ پھر اللہ (تعالیٰ) نے انبیاء

مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ

کو مبشر اور منذر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ

تا کہ وہ (یعنی اللہ) لوگوں کے درمیان ان باتوں کے متعلق جن میں انہوں نے اختلاف پیدا کر لیا تھا فیصلہ کرے۔

فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

اور (ہوا یہ کہ) صرف انہیں لوگوں نے جنہیں وہ (کتاب) دی گئی تھی اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلے (کھلے) نشان

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

آچکے تھے آپس کی سرکشی (اور فساد) کی وجہ سے اس (یعنی کتاب) کے بارہ میں اختلاف کیا۔ پس اللہ (تعالیٰ)

مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ

مومنوں کو اپنے حکم سے اس صداقت تک لے گیا جس کے بارہ میں دوسروں نے اختلاف سے کام لیا تھا۔ اور

مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۲۱۴﴾

اللہ جسے پسند کرتا ہے سیدھی راہ پر چلا دیتا ہے۔

تفسیر ۔اس آیت کے متعلق بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور لوگ حیران ہوتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ آیا یہ کہ لوگ ایک اُمت تھے یعنی سب نیک تھے پھر نبی آئے اور اختلاف ہو گیا۔ یا یہ کہ لوگ بد تھے اور پھر نبی آئے۔ میرے نزدیک اس کے یہی معنے ہیں کہ لوگ بد تھے اور نبی آئے۔ اس کی دلیل قرآن کریم سے تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ نبی لوگوں کی خرابی پر ہی بھیجتا ہے خود اس آیت سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ لوگ بد تھے۔ کیونکہ فرمایا مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ ۔ نبی بشارتیں اور انذار لے کر آئے اور انذار کا ساتھ ہونا بتاتا ہے کہ خدا سے دور لوگ موجود تھے۔ دوسرا ثبوت اسی آیت سے یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ۔ وہ نبی اس لئے آئے کہ جس بات میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اس میں فیصلہ کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائل کے متعلق اختلاف موجود تھا پس یہ بھی دلیل ہے کہ اُمَّةً وَّاحِدَةً سے یہ مراد نہیں کہ لوگ نیک تھے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُمَّةً وَّاحِدَةً کیوں کہا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ اَلۡكُفۡرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ کفر بھی ایک ہی ملّت ہے۔ یعنی اصل الاصول کفر کا یہی ہے کہ خدا سے لوگوں کو دور کیا جائے جس طرح اسلام بھی ملّتِ واحدہ ہے۔ یعنی سب اسلامی اُمتیں ایک ہیں۔ کیونکہ ان کے اصول ایک ہیں۔ گو تفصیلِ شرائع میں اختلاف ہو۔ پس ملتِ واحدہ کہنے سے مراد ان کا اتفاق یا باہمی محبت بتانا مدِّ نظر نہیں بلکہ یہ مدِّ نظر ہے کہ سب کافر ہی کافر تھے نیک لوگ ان میں نہ تھے کیونکہ کفر کے مقابلہ میں دوسری جماعت درحقیقت مومنوں کی ہی ہوتی ہے۔ کافر آپس میں خواہ کتنے ہی مختلف الخیال ہوں پھر بھی اصل غرض جو خدا کا قرب پانا ہے اس کے متعلق سب کا ایک ہی رویہ ہوتا ہے اور سب اپنے اپنے دائرہ میں ایک ہی کام کر رہے ہوتے ہیں یعنی خدا سے لوگوں کو دور کر دینا۔

یا یہ کہ كَانَ کے معنے ’’تھے‘‘ کے نہیں بلکہ ’’ہیں‘‘ کے ہیں۔ اور اس کا یہ مطلب ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے اُمَّةً وَّاحِدَةً بنایا ہے۔ یعنی دوسرے حیوانات بھی اُمت ہیں مگر امتِ واحدہ نہیں ہیں۔ انسان مدنی الطبع ہے اور اس کو آپس میں مل کر رہنا پڑتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ اختلاف اور شقاق پیدا ہونا ہے۔ بڑی نعمت کے ساتھ بڑے خطرات بھی ہوتے ہیں کیونکہ ایک دوسرے کی بدیاں بھی انسان اخذ کرتا ہے۔ جب تمدن کے یہ نقائص بڑھ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نبی بھیجتا ہے جو اختلاف کو دور کر دیں اور ملنے جلنے کی وجہ سے جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور ضد کی وجہ

سے لوگ اپنا اپنا دین بنا بیٹھے ہیں اس کی وہ اصلاح کریں۔ اگر کہا جائے کہ یہ معنے ہوتے تو چاہیے تھا کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَتَشَاجَرُوْ وَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ فَا نے اس امر پر دلالت کر دی ہے کہ پچھلی بات پہلی بات کے نتیجہ میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اُمَّةً وَّاحِدَةً ہونے کا نتیجہ نبیوں کی بعثت نہیں ہے۔ اس لئے یہاں لازماً مقدر تسلیم کرنا پڑے گا اور فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ اس مقدر کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اَلْکُتُب نہیں کہا بلکہ اَلْكِتٰب کہا ہے جس میں جنس کتاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہر نبی کو کوئی نہ کوئی کتاب ضرور دی جاتی ہے خواہ نئی ہو یا پرانی۔ یہ نہیں کہ ہر ایک کو الگ الگ کتاب ملے۔ بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہر نبی کو الگ الگ کتاب دی جاتی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اور تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ قرآن کریم کی کوئی آیت بھی اس مضمون کی تائید نہیں کرتی اگر اَنْزَلَ کے لفظ سے یہ استدلال کیا جائے کہ ہر نبی پر کتاب اُتری ہے تو یہ لفظ تو قرآن میں غیر انبیاء کے لئے بھی استعمال ہوا۔ پھر وہاں بھی یہی مراد لینی پڑے گی کہ انہیں بھی کتاب ملی تھی حالانکہ اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ جیسے قرآن کریم میں آتا ہے وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (آل عمران: ۷۳) یعنی اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مومنوں پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس پر دن کے ابتدائی حصہ میں تو ایمان لے آؤ اور اس کے پچھلے حصہ میں اس سے انکار کر دو۔ شاید اس ذریعہ سے وہ بھی مرتد ہو کر اپنے دین کو چھوڑ دیں۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ جو کچھ نازل ہوا وہ مومنوں پر نازل نہیں ہوا تھا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ پس اَنْزَلَ کا لفظ یہ ثابت نہیں کرتا کہ ہر نبی پر مستقل طور پر کوئی کتاب نازل ہوئی ہے اور نہ اَلْکِتَاب کا لفظ ان کے دعویٰ کو ثابت کرتا ہے۔ اگر ہر نبی صاحب کتاب جدیدہ ہوتا تو اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ کی بجائے اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكُتُبَ کہنا چاہیے تھا مگر خدا تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا کیونکہ نبی تو لاکھوں آئے مگر لاکھوں کتابیں نازل نہیں ہوئیں۔

درحقیقت اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر نبی جب بھی مبعوث ہوا ہے تو کسی نہ کسی کتاب کے ساتھ مبعوث ہوا ہے۔ یعنی وہ اس لئے بھیجا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کی کتاب کو دنیا میں قائم کرے۔ یہاں اس امر کا کوئی ذکر نہیں کہ ہر نبی کو کوئی نئی کتاب دی گئی تھی بلکہ صرف کتاب دیئے جانے کا ذکر ہے اور کتاب پرانی بھی ہو سکتی ہے اور نئی بھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد متواتر انبیاء آتے رہے۔ مگر ان کا کام صرف یہ تھا کہ وہ تورات کی ترویج کریں اور اس کے احکام پر لوگوں سے عمل کروائیں۔ پس یہ عقیدہ کہ ہر

نبی ضرور کوئی نئی کتاب لاتا ہے نہ صرف قرآن کریم کے خلاف ہے بلکہ انبیاء کی ایک لمبی تاریخ بھی اس عقیدہ کو واضح طور پر رد کرتی ہے۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ میں يَحْكُمَ کی ضمیر غائب کا مرجع اللہ تعالیٰ بھی ہوسکتا ہے۔ اور رسول اور کتاب بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے اختلافات کا فیصلہ کرے یا رسول فیصلہ کرے یا کتاب فیصلہ کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے آنے سے پہلے بھی لوگوں میں اختلاف موجود ہوتا ہے جسے خدا یا اس کا رسول یا اس کی کتاب آ کر دُور کرتے ہیں۔ یہ ایک غلط خیال ہے جو لوگوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے کہ انبیاء کے آنے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ اختلاف پیدا نہیں کرتے بلکہ اختلاف جو واقعہ ہو چکا ہوتا ہے اسے مٹا کر وحدت پیدا کرتے ہیں۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ سے پھر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف درحقیقت بعد میں ہی ہوا۔ پہلے اُن میں کوئی اختلاف نہ تھا مگر یہ درست نہیں۔ کیونکہ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ کے بعد اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ رکھ کر بتا دیا ہے کہ یہ اختلاف وہ ہے جو کتاب کے بارہ میں ہے کیونکہ اُوْتُوْهُ نے بتا دیا ہے کہ یہ کتاب کا ذکر ہے۔ پس اس آیت میں پہلے اختلاف کا ذکر نہیں بلکہ ایک اور اختلاف کا ذکر ہے۔ جو نبیوں کی آمد سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلا اختلاف تو وہ تھا کہ جس کے باوجود اُن کو اُمَّةً وَّاحِدَةً کہا تھا لیکن اب صداقت کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور دلائل کے آنے کے بعد پیدا ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس اختلاف کا تو پہلے ذکر ہی نہیں۔ پھر اس آیت کا یہاں کیا جوڑ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ جو پہلی آیت لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ تھا کہ اگر نبیوں کے بعثت کی غرض اختلاف کو مٹانا تھا تو پھر اُن کی بعثت کا کیا فائدہ ہوا انہوں نے تو آ کر اور اختلاف پیدا کر دیا؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ یہ اختلاف اور پہلا اختلاف مختلف ہیں۔ پہلا اختلاف ایسا تھا کہ جیسے مختلف بیمار ہوں اور دوا نہ ہو۔ اور دوسرا ایسا ہے کہ بیمار کو دوا دی جائے اور وہ نہ پیئے۔ پس پہلا اختلاف مجبوری کا تھا اور اس کی تلافی ضروری تھی اور یہ اختلاف حق کے مقابلہ میں پیدا ہوا ہے۔ بہر حال اب حق تو آ گیا ہے جس کو اگر لوگ چاہیں تو مان لیں پس پہلا اختلاف خرابی ہی خرابی پیدا کرتا تھا اور یہ اختلاف ایسا ہے کہ اس میں ہدایت کی اُمید ہے کیونکہ حق موجود ہے۔ اب اگر اختلاف ہے تو صرف ضد کی وجہ سے ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف صرف اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ کو ہے۔ یعنی اس تعلیم سے جو ہم نے بھیجی ہے صرف اُن لوگوں کو اختلاف ہے جن کی طرف وہ کتاب آئی ہے یا تعلیم یا نبی آیا ہے۔ جو دوسرے لوگ ہیں اُن کو اِس سے

کوئی اختلاف نہیں اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اختلاف اُس نبی یا اُس کتاب یا اس تعلیم کے نتیجہ میں نہیں ہے۔ کیونکہ اگر فی الواقعہ وہ تعلیم جو ہم نے بھیجی ہے یا نبی جو بھیجا ہے اختلاف کا موجب ہوتے تو جو لوگ بے تعلق ہیں مثلاً غیر اقوام جو اُن کی مخاطب نہیں یا بعد میں آنے والے لوگ وہ کیوں ان کی تعلیم کی تعریف کرتے۔ واقعہ میں اگر دیکھا جائے تو نبیوں کی مخالفت کا زمانہ جب گذر جاتا ہے۔ تو لوگ اُن کی تعلیم کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ جیسے اب مسیحؑ کی تعلیم کی لوگ تعریف کرتے ہیں۔ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور زرتشتؑ کی تمام اقوام تعریف کرتی ہیں۔ حالانکہ اُس کتاب کی لوگ مخالفت کرتے ہیں جس میں وہ مخاطب ہوں۔ پس معلوم ہوا کہ اصل وجہ تعلیم یا نبی نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بات ہوتی ہے کہ ہم اس کی اطاعت کس طرح کریں۔ یا ان احکام کو مان کر ہمارے آرام میں خلل آئے گا۔ جب دوسرے لوگ مخاطب ہوں تو خوب تعریف کرتے ہیں کہ واہ وا! کیا اچھی تعلیم ہے۔

تیسری بات بَغْيًا بَيْنَهُمْ میں یہ بیان فرمائی کہ یہ اختلاف بھی درحقیقت اس کتاب کی وجہ سے نہیں پیدا ہوا بلکہ درحقیقت پہلے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ نبی آنے سے پہلے جو سرکشی اور عداوت آپس میں لوگوں کی پیدا ہو چکی تھی وہی اس تعلیم کی مخالفت پر لوگوں کو آمادہ کر رہی ہے۔ یا یہ سوال ہے کہ اس نبی کو ہم کیونکر مان لیں؟ یا یہ کہ فلاں نے اِسے مان لیا ہے اب ہم کس طرح مان لیں؟ یا یہ فلاں عقیدہ کی جو ہمارے دشمنوں کا ہے تائید کرتا ہے۔ اس کو مان لیں تو اُن کے سامنے ہماری نظریں نیچی ہو جائیں۔ جیسے حنفی کہتے ہیں کہ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے وہابیوں کی فلاں فلاں باتوں کی تائید کی ہے اس لئے ہم انہیں نہیں مانتے۔ اِسی طرح وہابی کہتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے حنفیوں کی بعض باتوں کی تائید کی ہے اس لئے ہم آپ کو قبول نہیں کر سکتے۔ پس نبی کو نہ ماننے کی وجہ وہ عداوت ہوتی ہے جو اس نبی کے آنے سے پہلے اُن میں موجود ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی کے آنے کے بعد ایک جماعت ایسی پیدا ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو ماننے والی اور اس کے احکام پر عمل کرنے والی ہوتی ہے اس لئے گو اس کے آنے سے بھی اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن روحانی نگاہ رکھنے والا جانتا ہے کہ نبی کے آنے سے اختلاف کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے دور رہنے والے لوگ گھٹ جاتے ہیں اور ایک بڑی جماعت ایسی پیدا ہو جاتی ہے جو خدائے واحد کی پرستار ہوتی ہے۔ غرض اختلاف اس کتاب کے سبب سے نہیں بلکہ پہلے اختلاف کے باعث لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں جو ان لوگوں کے اندر پہلے سے موجود تھا یا یہ کہ وہ بَغِيْ جو بَيْنَهُمْ ہے۔ یعنی ساری کی ساری اُنہی کے قبضہ میں ہے۔ ہمارے رسولوں اور اُس کے اتباع میں اس کا کوئی حصہ نہیں وہ اس اختلاف کا باعث ہے۔ اس سے الزام اور بھی سخت ہو جاتا ہے کہ یہ بغی کرتے

ہیں باوجود اس کے کہ دوسری طرف سے اُن کی خیر خواہی اور ترقی کے سامان ہو رہے ہیں۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ۔ اس میں چوتھا جواب دیا ہے کہ اختلاف کا الزام نبیوں پر نہیں آسکتا اور وہ یہ کہ اُن کے آنے سے پہلے تو دیکھو کہ کوئی بھی حق کا ماننے والا نہ تھا۔ مگر اب ایک پارٹی تو حق کو مانتی ہے۔ پس اختلاف درحقیقت مٹ گیا پیدا نہ ہوا۔ کیونکہ پہلے مثلاً ایک لاکھ آدمی خدا تعالیٰ کے متعلق اٹکل پچو باتیں بنا رہے تھے۔ اب ایک ہزار نے مان لیا اور ننانوے ہزار نے نہ مانا تو اختلاف کم ہوا یا زیادہ۔ ایک ہزار آدمی اس خیالی اختلاف سے نکل کر یقین اور وثوق کے مقام پر آکھڑے ہوئے جہاں سے اللہ تعالیٰ کے جلال کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ پس اس آیت کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس چیز کی طرف ہدایت دی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا یعنی جس کا ذکر وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ میں ہوا تھا۔ اِخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ میں فِيْهِ کی جو ضمیر ہے الْحَقّ اُس کی صفت ہے۔ یعنی اُس چیز کی طرف جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور جس کی صفت یہ ہے کہ وہ حق ہے یا حق میں سے ہے۔ یا مِنْ بیان کے لئے ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہدایت کی اُس چیز کی طرف جس کی نسبت لوگوں نے اختلاف کیا تھا حالانکہ وہ حق تھی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ پہلے ہی مومن تھے تو ھَدَی اللّٰہُ کے کیا معنے ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی پچھلی بات کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ نام لے لیا کرتے ہیں جیسے کہتے ہیں یہ بادشاہ جب پیدا ہوا تو یوں ہوا۔ حالانکہ وہ پیدائش کے وقت بادشاہ نہیں ہوتا۔ یا کہتے ہیں یہ عالم جب سکول میں پڑھنے گیا۔ پس اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اُن کا موجودہ نام ہے جس کو پرانے واقعہ کو دہراتے وقت قائم رکھا۔ تا کہ اُن کا احترام قائم رہے اور اُن کی طرف کفر کسی وقت بھی منسوب نہ ہو۔ یا یہ کہ استعدادِ مخفی جو اُن کے اندر تھی اس کو مدّنظر رکھتے ہوئے انہیں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہا گیا ہے۔ یعنی وہ جو مومن بننے والے تھے اور اس کے لئے سامان بہم پہنچا رہے تھے۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ جب لوگوں نے کتاب الٰہی کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے اُن سب وعدوں کو جو اس نبی کے ذریعہ سے اپنی قوم کے متعلق تھے مٹھی بھر مومنوں کے حق میں پورا کر دیا اور مومنوں کو وہ کامیابیاں دے دیں جو سب قوم کے لئے مقدر تھیں۔ اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں بھی اشارہ ہے کہ ہر شخص کے دو گھر ہیں ایک جنت میں اور ایک دوزخ میں جب کوئی ظلم کرے تو اللہ تعالیٰ ظالم کا جنت کا گھر مومن کو اور اس کا دوزخ کا گھر کافر کو دے دیتا ہے۔ کفار نے چونکہ بلاوجہ کتابِ الٰہی کی مخالفت کی اور اس کے سبب سے مومنوں کو سخت دُکھ برداشت کرنے پڑے خدا تعالیٰ نے

حکم دے دیا کہ وہ انعامات جو ساری قوم کے لئے مقدر تھے وہ مٹھی بھر مسلمانوں کو دے دیئے جائیں اور باقی قوم کو بوجہ ظالم ہونے کے ان سے محروم کر دیا جائے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ باوجود اس کے کہ تم پر ابھی ان لوگوں کی (سی تکلیف کی) حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے

الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ

گذرے ہیں تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ انہیں تنگی بھی پہنچی اور تکلیف بھی۔ اور انہیں خوب خوف دلایا گیا تا کہ

زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ

(اس وقت کا) رسول اور اس کے ساتھ (کے) ایمان لانے والے کہہ اٹھیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟

اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۵﴾

یاد رکھو اللہ کی مدد یقیناً قریب ہے۔

حلّ لُغات۔ مَسَّتْهُمْ مَسَّ الشَّيْءَ کے معنے ہیں لَمَسَهٗ وَاَفْضٰى اِلَيْهِ بِيَدِهٖ مِنْ غَيْرِ حَائِلٍ کسی چیز کو بغیر کسی درمیانی روک کے اس نے چُھوا۔ (اقرب)

بَاْسَآء کے معنے ہیں اَلشِّدَّةُ سختی وَاِسْمٌ لِلْحَرْبِ وَالْمُشَقَّةِ وَالضَّرْبِ۔ اور بَاْسَاء کے لفظ کا اطلاق جنگ اور مشقت اور جسمانی تکالیف پر بھی ہوتا ہے۔ (اقرب)

ضَرَّآءُ کے معنے ہیں اَلزَّمَانَةُ وَالشِّدَّةُ قحط۔ اَلنَّقْصُ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ۔ مالی اور جانی نقصان۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں ان ابتلاؤں کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں پر آنے والے تھے۔ چونکہ اس سے پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ جب دنیا پر ضلالت چھا جاتی ہے تو اس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی آتا ہے جس کی لوگ مخالفت کرتے ہیں۔ اس لئے اب فرماتا ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ بغیر ابتلاؤں کے تم ترقی کر جاؤ گے۔ تمہاری ترقی ابتلاؤں کے آنے پر ہی موقوف ہے جیسا کہ پہلوں کی ترقی کا باعث بھی ابتلاء ہی ہوئے۔ چنانچہ اس کا نقشہ کھینچتے

ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ انہیں مالی مشکلات بھی پیش آئیں اور جانی بھی اور وہ سر سے پاؤں تک ہلا دیئے گئے اور ان پر اس قدر ابتلاء آئے کہ آخر اس وقت کے رسول اور مومنوں کو دُعا کی تحریک پیدا ہوگئی اور وہ پکار اُٹھے کہ اے خدا! تیری مدد کہاں ہے؟ اس آیت کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور اس کے پاک بندے بھی کسی وقت اللہ تعالیٰ کی مدد سے ایسے مایوس ہو جاتے ہیں کہ انہیں مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ کہنا پڑتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مایوسی کا تصور بادی النظر میں پیدا ہوتا ہے اس سے انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے کلیۃً پاک ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّهٗ لَا يَاْيْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف: ۸۸) کہ صرف کافر ہی خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب مَتٰى کا لفظ بولیں تو اس سے مراد مایوسی نہیں ہوتی بلکہ تعیین کے لئے ایک درخواست ہوتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں بات کے لئے ایک وقت مقرر فرما دیا جائے۔ ایسا ہی اس جگہ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ کے یہ معنے نہیں کہ وہ مایوسی کا شکار ہو کر ایسا کہتے ہیں بلکہ درحقیقت ان الفاظ میں وہ یہ درخواست کرتے ہیں کہ الٰہی اس بات کی تعیین فرما دی جائے کہ وہ مدد کب آئے گی؟ گویا مزید اطمینان کے لئے وہ آنے والی نصرت کے وقت کی تعیین کروانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد جلد نازل ہو۔ یہ دُعا کا ایک موثر طریق ہے اور اس میں یہ اشارہ مخفی ہے کہ ان پر اس قدر ابتلاء آئے کہ وہ ہلا دیئے گئے اور ان میں دُعا کی تحریک پیدا ہوگئی۔ اور ابتلاؤں کی بڑی غرض بھی یہی ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو جب مومنوں کو دعا کی تحریک ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ آسمان سے اپنی نصرتِ نازل فرما دیتا ہے۔ اور ان کے مصائب کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

مگر اس کے علاوہ حتّٰى کے معنے ''کَیْ'' کے بھی ہوتے ہیں اور یہ معنے کُتبِ نحو اور قرآن کریم سے ثابت ہیں۔ مغنی اللبیب میں لکھا ہے۔ وَمُرَادِفَةُ كَيِ التَّعْلِيْلِيَّةِ حَتّٰى یعنی حتّٰى کے معنے اس ''کَیْ'' کے مترادف بھی ہوتے ہیں جو کسی بات کی وجہ بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی اس حتّٰى سے پہلے جو بات ہوتی ہے وہ بعد میں آنے والی بات کے لئے بطور سبب کے ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی حتّٰى ان معنوں میں آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ منافقون میں آتا ہے هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (المنافقون: ۸) یعنی جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پاس جمع ہیں ان پر خرچ نہ کرو۔ تاکہ وہ بھاگ جائیں۔ نحوی اس کی یہ مثال بھی دیتے ہیں کہ اَسْلِمْ حَتّٰى تَدْخُلَ الْجَنَّةَ یعنی فرمانبرداری کرتا کہ تو جنت میں داخل ہو جائے۔ ان معنوں کے لحاظ سے

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ زلزلہ جو کفار کے ہاتھوں سے ہم نے پیدا کیا اس کی غرض ہی یہ تھی کہ ہمارے بندے ہم سے مانگیں اور ہم ان کو دیں۔ پس مانگنے کی طرف توجہ پھیرنے اور اپنی قوتِ فضل کو ظاہر کرنے کے لئے اس وقت تک ہم چُپ رہے جب تک کہ ان کے دل میں دعا کی زور سے تحریک پیدا نہ ہوئی۔ اور یہ تحریک ہم نے خود کروائی تا کہ ایک طرف ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھے اور دوسری طرف جب اللہ تعالیٰ کی نصرت معجزانہ طور پر آئے تو ان کے ایمان بڑھیں اور کفار میں سے جو غور کرنے والے ہوں انہیں ہدایت حاصل ہو۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ جب یہ غرض پوری ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرما دیتا ہے کہ لو اب ہماری مدد آ گئی۔

ابتلاؤں کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ انسان کی ہمت دیکھ کر ابتلاء ڈالتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایسے ابتلاء انسان پر ڈالے جن کے برداشت کرنے کی اس میں طاقت ہی نہ ہو۔ ہاں انسان ایسے ابتلاؤں میں ضرور ڈالا جاتا ہے جن کے متعلق وہ غلطی سے خیال کر لیتا ہے کہ میں ان کو برداشت نہیں کر سکوں گا لیکن اس کا یہ خیال درست نہیں ہوتا وہ ان کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ:۲۸۷) یعنی خدا تعالیٰ کسی پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جس کے اُٹھانے کی اس میں طاقت نہ ہو۔ بوجھ ہمیشہ وہی ڈالا جاتا ہے جس کے اُٹھانے کی انسان میں طاقت ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ کسی قوم کو تباہ کرنے کا منشا ہو۔ ورنہ جو ابتلاء کسی جماعت کی ترقی کے لئے ہوتے ہیں وہ طاقت برداشت سے باہر نہیں ہوتے۔ ہاں مومن بعض دفعہ خیال کر لیتا ہے کہ وہ اس کی طاقت سے بالا ہیں۔ مگر یہ اس کی غلطی ہوتی ہے جب مومن ایک ابتلاء کو برداشت کر لیتا ہے تو اُسے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کا ایمان کتنا مضبوط ہے پھر اور رنگ میں اس پر ابتلاء آتا ہے اور وہ اُسے بھی برداشت کر لیتا ہے اور اس کے دل میں کسی قسم کا شکوہ پیدا ہونے کی بجائے شکر و امتنان کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے اتنی طاقت دی کہ میں نے اسے برداشت کر لیا تب اس کا ایمان اور بھی پختہ ہو جاتا ہے اور وہ اس سے بڑے بڑے ابتلاء برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ غرض جوں جوں انسان دلیر ہوتا جاتا ہے آگے بڑھتا جاتا ہے اس طرح ایک تو اسے اپنے ایمان کی پختگی کا پتہ لگ جاتا ہے۔ دوسرے قربانیوں کے میدان میں اُسے دوسروں سے آگے بڑھنے کا موقعہ مل جاتا ہے اور وہ ترقی کر جاتا ہے۔

غرض ابتلاء کے دو فائدے ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ انسان کو اپنی حالت کا پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں اس کی جان کس قدر تکلیف اُٹھا سکتی ہے۔ دوسرے اس میں آگے قدم بڑھانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے۔ ان ابتلاؤں کا آنا ایسا ضروری ہے کہ نبیوں کی کوئی جماعت ایسی نہیں ہوئی جس پر ابتلاء نہ آئے ہوں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے کہ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ جنت جس کی وسعت کا اندازہ بھی تم نہیں لگا سکتے تمہیں یونہی مل جائے گی یا وہ دنیوی کامیابیاں جن کا تمہیں وعدہ دیا جارہا ہے بغیر قربانیوں کے تمہیں مل جائیں گی اور تم پر وہ حالت نہیں گذرے گی جو پہلوں پر گذرتی رہی۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ وہ حالت ضرور آئے گی۔ اس لئے یہ مت خیال کرو کہ تم آسانی سے کامیاب ہو جاؤ گے۔ جب تک تم ان حالتوں میں سے نہیں گذرو گے جن میں سے پہلے لوگ گذرے اس وقت تک تمہیں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ انہیں بڑی بڑی تکالیف پہنچی تھیں جسمانی بھی اور مالی بھی۔ انہیں اپنی جائیدادیں چھوڑنی پڑیں۔ رشتہ داروں کو ترک کرنا پڑا۔ فاقے کرنے پڑے۔ ماریں کھائیں۔ قتل ہوئے۔ غرض وہ کئی رنگ میں ہلائے گئے جس طرح زلزلہ سے عمارت کبھی دائیں طرف جھکنے لگتی ہے اور کبھی بائیں طرف اسی طرح دیکھنے والے ان کے متعلق یہی سمجھتے تھے کہ یہ اب گرے کہ گرے حتّٰی کہ ان کی تکالیف بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئیں کہ دشمن نے یہ خیال کرلیا کہ اب یہ گر ہی گئے ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کے رسول اور مومنوں نے دعائیں کرنی شروع کیں کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ۔ اے خدا! ابتلاء اب اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ کی مدد آئے اور ہمیں کامیابی عطا کرے۔

مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ کے لفظی معنے چونکہ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی۔ اس لئے جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ان کو خدا تعالیٰ کی مدد کے متعلق نعوذ باللہ شبہ پیدا ہوگیا تھا۔ کہ شاید وہ آئے یا نہ آئے اس لئے انہوں نے کہا کہ خدایا! تیری مدد کب آئے گی؟ مگر یہ صحیح نہیں اوّل تو مَسَّتْھُمْ میں مَسّ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک یہ کہ عملاً ان کو مشکلات پہنچیں اور دوسرے یہ کہ وہ مشکلات دل پر اثر کرنے والی نہیں تھیں صرف سطحی تھیں ان کے دل مضبوط تھے پس جب مشکلات کے باوجود وہ بہادر دل تھے تو ان کے متعلق کسی مایوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ دوسرے سوال کبھی التجاء کا رنگ بھی رکھتا ہے انسان کسی سے پوچھتا ہے کہ یہ بات آپ کب کریں گے؟ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ نہیں کریں گے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ کردیں۔ اسی طرح مجسٹریٹ سے جب پوچھا جاتا ہے کہ میری باری کب آئے گی تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ کبھی نہیں آئے گی۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ آجائے۔

بدر کے موقعہ پر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی کہ اے خدا! اگر یہ مختصر سا گروہ بھی ہلاک ہوگیا تو دنیا میں تیری عبادت کون کرے گا (مسند احمد بن حنبل، مسند عمر بن الخطاب)۔ تو اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر یقین نہیں تھا بلکہ اس رنگ میں دُعا کرکے آپؐ نے خدا تعالیٰ کی

غیرت کو برانگیختہ کیا۔ اسی طرح حضرت مسیح ناصری علیہ السلام نے جب صلیب پر لٹکتے وقت کہا کہ ایلی ایلی لماسبقتنی (متی باب ۲۷ آیت ۴۶) یعنی اے خدا! چاہیے تو یہ تھا کہ اس مصیبت کے وقت تو میری مدد کے لئے آتا لیکن تُو تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے تو آپ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خدا تعالیٰ مصیبت کے وقت انہیں واقعہ میں چھوڑ گیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرا دل گھبرا رہا ہے آپ جلدی میری مدد کے لئے آجائیں پس اس رنگ میں جب دُعا کی جاتی ہے تو قبولیت دُعا پر عدمِ یقین کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ خدا تعالیٰ کو غیرت دلانے کے لئے ہوتی ہے اسی طرح جب مومن کہتے ہیں مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ اے خدا! تیری مدد اور نصرت کب آئے گی تو خدا تعالیٰ کہتا ہے سُنو۔ میری مدد آپہنچی۔ چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فتح مکہ کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ والوں کو خیال تک بھی نہیں تھا کہ آپ ان پر حملہ آور ہوں گے۔ ابوسفیان خود آپ سے مدینہ میں مل کر آرہا تھا۔ جب لوگوں نے آپ کا لشکر دیکھا تو بعض نے کہا کہ یہ لشکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہوگا۔ اس پر ابوسفیان نے کہا۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے میں ابھی مدینہ سے آرہا ہوں۔ وہاں کوئی لشکر تیار نہیں تھا۔ مگر اگلے ہی چار پانچ منٹ میں مسلمان اُس کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے ابوسفیان کو گرفتار کر لیا اور دوسرے دن مکہ فتح ہو گیا۔ غرض خدا تعالیٰ کی نصرت اچانک آتی ہے اور مومنوں کو کامیاب کر دیتی ہے۔ عیسائیوں نے تین سو سال تک بڑے بڑے مصائب برداشت کئے لیکن ایک دن انہوں نے سُنا کہ روم کا بادشاہ عیسائی ہو گیا ہے اور آئندہ سے ملک کا مذہب عیسائیت ہوگا اور اس اعلان کے ساتھ ہی ان کے تمام مصائب ختم ہو گئے۔

غرض مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ۔ میں یہ بتایا ہے کہ مومن دُعائیں کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ الٰہی ابتلاء بڑھ گئے ہیں اب تیری مدد آجائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ۔ سُنو! خدا کی مدد قریب ہی ہے یعنی جب ابتلاء تمہاری ترقیات کے لئے آئیں تو پھر تمہیں تباہ ہونے کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تمہارے نفسوں میں خرابی ہے اور تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ تمہیں سزا دینا چاہتا ہے تو پھر یقیناً تمہارے لئے مدد نہیں آئے گی۔ لیکن اگر تمہارے نفسوں میں کوئی خرابی نہیں تمہارا ایمان مضبوط ہے تم تقویٰ کی راہ پر قدم مار رہے ہو۔ وساوس پر تمہیں قابو حاصل ہے تو ابتلاء تمہارے لئے خوف و خطر کا باعث نہیں ہو سکتے۔ درحقیقت ایک سچے مومن پر جب ابتلاء آتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس ابتلاء کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی مدد بھی آرہی ہے۔ مولانا رومؒ نے اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ؎

ہر بلا کیں قوم راحق دادہ است
زیر آں گنجِ کرم بنہادہ است

(مثنوی معنوی للرومی ذکر کرامات شیبان الراعی صفحہ ۱۱۳)

یعنی جب کسی قوم پر کوئی آزمائش کا وقت آتا ہے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے نیچے انعامات کا ایک بہت بڑا خزانہ مخفی ہوتا ہے۔

پس ابتلاء کسی خطرہ کا موجب نہیں ہوتے بلکہ ابتلاء کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اور ترقی عطا کرے گا۔ ڈر اور خوف صرف اپنے نفس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس ہمیشہ اپنے نفس پر غور کرتے رہنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ آیا اس میں کوئی ایسی بات تو پیدا نہیں ہوگئی جو تباہی کا باعث بن جائے۔ اگر اس میں وساوس پیدا نہیں ہوتے اگر ایمان مضبوط ہے اور دل شکر اور امتنان کے جذبات سے پُر ہے تو انسان کو خوش ہونا چاہیے کیونکہ ایسی حالت میں ابتلاء بہت بڑے انعامات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ابتلاء آنے پر دل میں وساوس پیدا ہوں اور ایمان میں کمزوری محسوس ہو تو سمجھ لو کہ یہ ابتلاء ترقی کا باعث نہیں بلکہ ہلاکت کا باعث ہیں۔ غرض اصل اور حقیقی ایمان وہی ہوتا ہے جو ابتلاؤں میں سے گذرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی کے نتیجہ میں ابدی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۗ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ

وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ تو کہہ دے (کہ) جو اچھا مال بھی تم دو

فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ

وہ (تمہارے) ماں باپ قریبی رشتہ داروں یتیموں مسکینوں اور مسافر کا

السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۶﴾

(پہلا) حق ہے۔ اور جو نیک کام بھی تم کرو اللہ اسے یقیناً اچھی طرح جانتا ہے۔

تفسیر۔ چونکہ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ پہلے لوگوں پر بھی مالی اور جانی مشکلات آئی

تھیں اور وہی ان کی قومی ترقی کا باعث ہوئیں جیسا کہ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس لئے جب صحابہؓ نے یہ بات سنی تو ان کے دل بھی ان قربانیوں کے لئے بے تاب ہو گئے اور انہوں نے بے اختیار ہو کر روحانی ترقیات کے حصول کے لئے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! اگر قومی ترقی کے لئے مالی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمیں بھی بتایا جائے کہ ہم کیا خرچ کریں تا کہ ہمارا قدم بھی عشق کے میدان میں کسی دوسرے سے پیچھے نہ رہے۔

دوسرا سوال جانی قربانیوں کے متعلق ہوسکتا تھا۔ سو اس کا جواب كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ میں دیا گیا ہے جس سے قرآن کریم کی نہایت اعلیٰ درجہ کی ترتیب پر روشنی پڑتی ہے۔

اس آیت کے متعلق لوگ عام طور پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ سوال کچھ ہے اور جواب کچھ ہے۔ پوچھا تو یہ گیا ہے کہ کیا خرچ کریں؟ اور جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جو کچھ بھی اپنے اموال میں سے خرچ کرو۔ وہ فلاں فلاں کو دو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض قلّتِ تدبر کی وجہ سے ہے سوال کا جواب آیت میں موجود ہے جب اس نے فرمادیا کہ جو کچھ بھی تم اچھے مال سے خرچ کرو تو اس میں سائل کا جواب مکمل آ گیا۔ اوّل یہ کہ کوئی حد بندی نہیں۔ جتنے کی توفیق ہو اتنا خرچ کرو۔ دوم یہ ہے کہ اس امر کا لحاظ رکھو کہ جو خرچ کرو وہ طیب مال ہو۔ جو لوگ حرام کماتے ہیں اور اس میں سے خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے گناہ کا کفارہ کر دیا وہ غلطی پر ہیں۔ خدا تعالیٰ ایسے ہی مال کو قبول کرتا ہے جو اچھا ہو۔ سوم یہ کہ صرف حلال نہیں دینا بلکہ طیّب دینا ہے یعنی جس مال کو قبول کرنا اس شخص پر گراں نہ گذرے جس کو مال دیا جائے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ خیر کے معنے مال کے ہیں۔ اچھے مال کے معنے کہاں سے نکالے گئے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خیر کے اصل معنے بہترین شے کے ہیں۔ اور مال کو اسی صورت میں خیر کہتے ہیں جب کہ وہ طیّب ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ مفرداتِ راغب میں ہے وَقَالَ بَعۡضُ الۡعُلَمَاءِ لَا يُقَالُ لِلۡمَالِ خَيۡرٌ حَتّٰى يَكُوۡنَ كَثِيۡرًا وَمِنۡ مَكَانٍ طَيِّبٍ۔ یعنی مال کو خَیۡر اسی صورت میں کہیں گے جبکہ وہ زیادہ ہو اور پاک ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ اور خود طیّب ہو پس خیر کہنے سے یقیناً قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ طیب اموال میں سے خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔ اگر کہا جائے کہ اگر کوئی شخص حرام کماتا ہو لیکن صدقہ طیب مال سے دے تو کیا یہ اس حکم کے مطابق ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تھوڑی سی گندگی بھی بہت سی پاکیزہ شے کو گندہ کر دیتی ہے۔ پس اگر کوئی شخص رشوت لیتا یا چوری کرتا یا ظلم سے دوسرے کا مال لیتا ہے تو خواہ اس قسم کا مال تھوڑا ہو اس کا سب مال گندہ ہو جائے گا اور وہ اس حکم کو پورا کرنے والا نہ ہوگا۔ غرض سوال کا مکمل جواب اسی آیت میں

آ گیا۔ ہاں اس سے زائد مضمون بھی بتا دیا گیا کہ اگر خرچ کروتو کہاں کہاں خرچ کرو۔ گویا اس طرف اشارہ کیا کہ خرچ کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ صحیح جگہ خرچ کرنا مشکل ہے۔ پس جو خرچ کرو احتیاط سے کرو اور مستحقین کو دو۔ یہ قرآنی کمال ہے کہ وہ مختصر الفاظ میں وسیع مضمون بیان کر دیتا ہے۔ دیکھو یہاں کتنے مختصر لفظوں میں سوال کا جواب بھی دے دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ مال حلال دو (طیّب میں حلال کا مفہوم بھی شامل ہے) اور یہ بھی کہ حلال مال طیب بھی ہو۔ یہ نہیں کہ ٹوٹی ہوئی جوتی جو کسی کام کی نہیں دے دی بیشک وہ اس کا مال ہے۔ بے شک اس کا دینا اسے حلال ہے مگر وہ طیّب نہیں۔ کیونکہ جسے دی گئی ہے اس کے کام کی نہیں۔ یا مثلاً ایک بھوکا کھانا مانگنے آیا ہے گھر میں کھانا تیار ہے مگر اُسے آٹا دے دیا۔ یہ مال بھی ہے حلال بھی ہے۔ مگر بھوکے کی ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔ طیب یہ ہے کہ خود کم کھائے اسے پکا ہوا کھانا دے جسے وہ فوراً کھا سکے۔ یہ سب کچھ بتا کر یہ بھی بتا دیا کہ فلاں فلاں جگہ مال خرچ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ سبحان اللہ کیا معجزانہ اعجاز ہے!! قرآن مجید میں ایسی مثالیں اور بھی ہیں کہ سوال کا جواب دے کر زائد مضمون بتا دیا ہے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس قسم کا کلام فرماتے تھے۔ آپؐ سے کسی نے پوچھا کہ سمندر کے پانی کے بارہ میں کیا حکم ہے۔ آپؐ نے فرمایا هُوَ الطَّهُوْرُ مَاءُهٗ وَ الْحِلُّ مَيْتَتُهٗ۔ (ترمذی ابواب الطھارۃ باب ما جاء فی ماء البحر انہ طھور) اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے یعنی سمندری جانور کے لئے ذبح کرنے کی شرط نہیں۔ جیسے مچھلی، اب دیکھو! یہاں سوال کا جواب بھی دیا ہے اور زائد مضمون بھی بتا دیا ہے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کیا خرچ کرنے کے الفاظ سے صدقہ کے اقسام کا دریافت کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے؟ یعنی ہمارا خرچ کرنا کس کس موقعہ اور کن کن لوگوں کے لئے ہو۔ اور اس جگہ غالباً یہی مراد ہے۔ کیونکہ کمیت کے متعلق سوال آگے آتا ہے۔ مَاذَا سے سوال کبھی اُس چیز کے متعلق کیا جاتا ہے اور کبھی اس کی صفات کے متعلق۔ نحوی لکھتے ہیں کہ صفات کے متعلق صرف ذوی العقول کے بارہ میں سوال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حد بندی بلا وجہ معلوم ہوتی ہے میرے نزدیک اس جگہ پوچھنے والا یہ نہیں پوچھتا کہ صدقہ کس چیز کا ہو۔ بلکہ یہ پوچھتا ہے کہ صدقہ کی صفات کیا ہوں؟ سو اللہ تعالیٰ نے جواب دے دیا کہ معین نہیں ہر اچھی چیز خرچ کرو۔ یعنی طیّب مال سے ہو اور جتنی توفیق ہو اس قدر دیا جائے اور ساتھ ایک بات زائد بتا دی کہ تم اپنے ایمان یا اپنی حالت کے ماتحت جو کچھ خرچ کرو۔ یہاں یہاں خرچ کرو۔

پھر فرمایا مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کے لئے تم کسی ایک نیکی پر حصر نہ کرو۔ بلکہ ہر قسم کی نیکیاں بجالاؤ۔ اور ہر خیر اور برکت کا دروازہ اپنے اوپر کھولنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ تمہارے سامنے ایک

لامتناہی زندگی ہے جس میں تمہاری روح نے قربِ الٰہی کی باریک در باریک راہوں پر چلنا ہے۔ پس کسی ایک یا چند نیکیوں پر اکتفا نہ کرو بلکہ خیر میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ اور اس امر پر یقین رکھو کہ ایک علیم ہستی تمہاری ہر حرکت اور سکون کو دیکھ رہی ہے۔ وہ تمہیں دنیا و آخرت میں اس کا بہترین اجر دے گی۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَنْ

جنگ کرنا تم پر فرض کیا جاتا ہے (اور) اس حالت میں (فرض کیا جاتا ہے) کہ وہ تمہیں ناپسند ہے۔ اور بالکل ممکن

تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَ

ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو۔ اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی شے کو پسند کرتے

هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٧﴾ ع

ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے دوسری چیز کی نسبت بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر ۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ صحابہؓ لڑائی کو اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ وہ نعوذ باللہ بُزدل تھے۔ بلکہ ان کی ناپسندیدگی کی وجہ صرف یہ تھی کہ مومن صلح پسند ہوتا ہے اور اس کی پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ لڑائی نہ ہو اور صلح سے فیصلہ ہو جائے اور اگر وہ اپنے دشمن سے لڑتا ہے تو مجبوراً لڑتا ہے۔ صحابہؓ بھی دل سے صلح جُو تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اگر کُشت و خون کے بغیر یہ فتنہ دب سکے تو دب جائے مگر انہیں مجبوراً لڑائی لڑنی پڑی۔ پس یہ صحابہؓ کی تعریف ہے نہ کہ ان کی مذمت۔ یہ ان کی بُزدلی نہیں بلکہ یہ قابل تعریف امر ہے کہ باوجود دشمنوں کے شرارتوں کے وہ یہی چاہتے تھے کہ اگر صلح سے فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ تم تو نہیں چاہتے تھے کہ لڑو حالانکہ دشمن تم پر ظلم پر ظلم کر رہا تھا۔ اور تمہیں مار رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہ دشمن بغیر لڑائی کے باز آنے والے نہیں۔ اس لئے اب ان کی اصلاح کا یہی ذریعہ ہے کہ ان سے لڑا جائے اور انہیں ان کے کئے کا مزا چکھایا جائے۔

عیسائیوں نے اس آیت سے دھوکا کھاتے ہوئے اعتراض کیا ہے کہ مسلمان چونکہ لڑائی سے ڈرتے تھے اس لئے معلوم ہوا کہ وہ بزدل اور ڈرپوک تھے۔ (تفسیر القرآن از وہیری زیر آیت ھذا) مگر صحابہؓ کو بزدلی کا طعنہ دینے والے عیسائی یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے اپنے حواری کیسے بہادر اور دلیر تھے اور انہوں نے مسیح کی گرفتاری کے وقت کیسی

جرأت کا مظاہرہ کیا؟ انجیل گواہ ہے کہ کوئی ایک حواری بھی ایسا نہیں نکلا جس نے دلیری سے مسیح کا ساتھ دیا ہو بلکہ ایک حواری نے تو آپ پر تین دفعہ لعنت کی اور باقی سب اُس انتہائی نازک گھڑی میں آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایسے باایمان اور دلیر حواریوں کو مقدس قرار دینے والے عیسائی اگر صحابہؓ پر اعتراض کریں تو ان کی عقل پر تعجب آتا ہے پھر عیسائیوں کی یہ ایک عجیب عادت ہے کہ صحابہؓ کے لڑائی پر جانے کا ذکر ہو تو بھی اعتراض کرتے ہیں اور نہ جانے کا ذکر ہو تب بھی اعتراض کرتے ہیں۔ جہاں غنیمت کا ذکر آتا ہے وہاں کہنے لگ جاتے ہیں کہ مسلمان بڑے لالچی تھے مال کی لالچ کے لئے لڑتے تھے اور اس موقعہ پر لکھتے ہیں کہ وہ بڑے بزدل تھے۔ لڑائی سے ڈرتے تھے حالانکہ اگر ان کی لڑائی لوٹ مار کے شوق کے لئے تھی تو پھر کراہت کیسی اور اگر کراہت تھی تو پھر شوق کیسا؟ اصل بات یہ ہے کہ غلط معنے کر کے انسان اضداد میں پھنس جاتا ہے۔ بات وہی ہے جو میں نے بتائی ہے کہ مومن صلح پسند ہوتا ہے اسے اگر مجبور کیا جائے تو وہ لڑتا ہے ورنہ وہ یہی پسند کرتا ہے کہ لوگوں کی جانیں ضائع نہ ہوں۔

پھر فرماتا ہے۔ عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ درحقیقت انسانی علم اور سمجھ نہایت ہی محدود ہے اور ان دونوں کے محدود ہونے کی وجہ سے انسان بعض دفعہ ایک بات کو اپنے لئے مفید سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کے لئے مضر ہوتی ہے اور بعض دفعہ وہ ایک بات کو اپنے لئے مضر خیال کرتا ہے حالانکہ وہ اس کے لئے مفید ہوتی ہے اور دونوں کے پیچھے یا تو جذبہ محبت کا ناجائز استعمال کام کر رہا ہوتا ہے یا جذبہ نفرت کا ناجائز استعمال کام کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی بعض دفعہ تو شدید محبت کی وجہ سے وہ کسی چیز کے مضرات کو نہیں دیکھ سکتا اور بعض دفعہ شدید نفرت کی وجہ سے وہ دوسری چیز کے حسن کو دیکھنے سے قاصر رہتا ہے اور وہ یقینی طور پر کسی امر کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آیا وہ میرے لئے مفید ہے یا مضر۔ اس حالت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض دفعہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو لیکن حقیقتاً وہ تمہارے لئے مفید ہوتی ہے اور بعض دفعہ تم ایک چیز کو مفید خیال کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے مضر ہوتی ہے تم کبھی کسی چیز سے فوائد حاصل کرنے کے لئے سامان مہیا کرتے ہو لیکن پھر بھی نتیجہ خراب نکلتا ہے۔ جس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ بعض ایسے سامان جن سے اچھا نتیجہ نکل سکتا تھا تمہاری نظر سے مخفی رہے پس جبکہ انسان کی ایسی حالت ہے کہ اس کی امید کے مطابق ہر وقت اچھے نتیجے نہیں نکلتے بلکہ بعض اوقات بُرے نتائج نکل آتے ہیں تو وہ کیا کرے؟ سو اس کا علاج یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور گرے اور عاجزی سے یہ دعا کرے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اے خدا! مجھ کو ہر امر میں خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی صحیح اور سیدھا راستہ دکھا تا میں غلطیوں سے محفوظ رہوں۔ اور اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو نہ دیکھے بلکہ محبت اور نفرت کے جذبات سے بالا ہو کر

صرف اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی نگاہ رکھے اور اس سے دعائیں کرتا رہے کہ وہ اسے سیدھا راستہ دکھائے اور اپنی نیت اور ارادہ کو اللہ تعالیٰ کے منشاء کے تابع کر دے۔ تب اس کے لئے کامیابی ہی کامیابی ہوگی اور خیر اور برکت کے دروازے اس کے لئے کھولے جائیں گے۔

آخر میں وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کہہ کر بتایا کہ تم تو نہیں جانتے لیکن خدا تعالیٰ تمام حالات کو جانتا ہے۔ یعنی تم کفار سے لڑائی کرنا رحم کے خلاف سمجھتے ہو۔ حالانکہ بعض دفعہ شریر کو سزا دینا اس کی اصلاح کے لئے ضروری ہوتا ہے اور اس کو چھوڑ دینا خود اس کے لئے اور دوسرے لوگوں کے لئے مضر ہوتا ہے۔ پس چونکہ یہ لوگ اب بغیر جنگ کے باز آنے والے نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کا مقابلہ کیا جائے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ

یہ (لوگ) تجھ سے حرمت والے مہینہ کے بارہ میں یعنی اس میں جنگ کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ تو کہہ

فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ

دے (کہ) اس میں جنگ کرنا بڑی (خرابی کی) بات ہے۔ اور اللہ کے راستہ سے روکنا اور اس کا (یعنی اللہ کا) اور

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ

عزت والی مسجد کا انکار کرنا اور اس کے باشندوں کو اس میں سے نکال دینا اور اللہ کے نزدیک (اس سے بھی)

الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ

بڑی بات ہے۔ اور فتنہ (وفساد) قتل سے بھی بڑا (گناہ) ہے۔ اور یہ لوگ اگر ان کی طاقت میں ہو تو تم سے لڑتے ہی

حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ

چلے جائیں تا کہ تمہیں تمہارے دین سے پھرا دیں۔ اور تم میں سے جو (بھی)

يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ

اپنے دین سے پھر جائے۔ (اور) پھر کفر کی ہی حالت میں مر (بھی) جائے تو (وہ یاد رکھے کہ) ایسے لوگوں کے

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ

اعمال اس دنیا میں (بھی) اور آخرت میں (بھی) اکارت جائیں گے۔ اور ایسے لوگ دوزخ

اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۸﴾

(کی آگ میں پڑنے) والے ہیں۔ وہ اس میں (دیر تک) رہیں گے۔

تفسیر۔ فرمایا یہ عزّت والے مہینوں یعنی محرم، رجب، ذیقعدہ اور ذوالحج کے متعلق تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ آیا ان میں لڑائی کرنا جائز ہے؟ یہ سوال کس طرح پیدا ہوا؟ اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو اس کے بعد بھی مکہ والوں کے جوشِ غضب میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ انہوں نے مدینہ والوں کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ چونکہ تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے اس لئے اب تمہارے لئے ایک ہی راہ ہے کہ یا تو تم ان سب کو قتل کر دو یا مدینہ سے باہر نکال دو ورنہ ہم خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم مدینہ پر حملہ کر دیں گے اور تم سب کو قتل کر کے تمہاری عورتوں پر قبضہ کر لیں گے اور پھر انہوں نے صرف دھمکیوں پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان ایام میں یہ کیفیت تھی کہ بسا اوقات آپؐ ساری ساری رات جاگ کر بسر کرتے تھے۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم رات کو ہتھیار باندھ کر سویا کرتے تھے تا کہ رات کی تاریکی میں دشمن کہیں اچانک حملہ نہ کر دے۔ ان حالات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو مدینہ کے قرب وجوار میں بسنے والے قبائل سے معاہدات کرنے شروع کر دیئے اور دوسری طرف ان خبروں کی وجہ سے کہ قریش حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں آپؐ نے ۲ سنہ ہجری میں حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو بارہ آدمیوں کے ساتھ نخلہ بھجوایا اور انہیں ایک خط دے کر ارشاد فرمایا کہ اسے دو دن کے بعد کھولا جائے۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے دو دن کے بعد خط کھولا تو اس میں لکھا تھا کہ تم نخلہ میں قیام کرو۔ اور قریش کے حالات کا پتہ لگا کر ہمیں اطلاع دو۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس دوران میں قریش کا ایک چھوٹا سا قافلہ جو شام سے تجارت کا مال لے کر واپس آ رہا تھا وہاں سے گذرا۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے ذاتی اجتہاد سے کام لے کر ان پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں کفار میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا اور دو گرفتار ہوئے۔ اور مالِ غنیمت پر بھی مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ جب انہوں نے مدینہ میں واپس آ کر

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپؐ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ میں نے تمہیں لڑائی کی اجازت نہیں دی تھی اور مالِ غنیمت کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا (تاریخ الخمیس زیر عنوان بعث عبداللہ بن جحش الی بنی نخلہ)۔ ابنِ جریرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ان کے ساتھیوں سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ ابھی رجب شروع نہیں ہوا۔ حالانکہ رجب کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ خیال کرتے رہے کہ ابھی ۳۰ جمادی الثانی ہے۔ رجب کا آغاز نہیں ہوا۔ بہرحال عمرو بن الحضرمی کا ایک مسلمان کے ہاتھوں مارا جانا تھا کہ مشرکین نے شور مچانا شروع کر دیا کہ اب مسلمانوں کو ان مقدس مہینوں کی حرمت کا بھی پاس نہیں رہا جن میں ہر قسم کی جنگ بند رہتی تھی (تفسیر ابن جریر زیر آیت ھذا)۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ بے شک ان مہینوں میں لڑائی کرنا سخت ناپسندیدہ امر ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے لوگوں کو روکا جائے۔ اور خدا تعالیٰ کی توحید کا انکار کیا جائے اور مسجد حرام کی حرمت کو باطل کیا جائے اور اس کے باشندوں کو بغیر کسی جرم کے محض اس لئے کہ وہ خدائے واحد پر ایمان لائے تھے اپنے گھروں سے نکال دیا جائے۔ تمہیں ایک بات کا تو خیال آ گیا مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ تم خود کتنے بڑے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہو اور خدا اور اس کے رسول کا انکار کر کے اور مسجد حرام کی حرمت کو باطل کر کے اور اس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال کر کتنے ناپسندیدہ افعال کے مرتکب ہوئے ہو جب تم خود ان قبیح حرکات کے مرتکب ہو چکے ہو تو تم مسلمانوں پر کس مونہہ سے اعتراض کرتے ہو۔ ان سے تو صرف نادانستہ طور پر ایک غلطی ہوئی ہے مگر تم تو جانتے بوجھتے ہوئے یہ سب کچھ کر رہے ہو۔

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ علامہ ابوالبقاء کے نزدیک بغیر اعادہ جار کے جر جائز نہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ یہ متعلق ہے فعل محذوف کا اور پورا جملہ یہ ہے وَصَدٌّ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (املاء ما منّ به الرحمٰن)۔ کشاف نے بھی صَدٌّ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے ہی معنے کئے ہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف بِهٖ پر ہے اور ضمیر مجرور پر عطف بلا اعادہ جار کے برخلاف قول بصریوں کے جائز ہے۔ (روح المعانی زیر آیت ھذا) اہل عرب میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے کہتے ہیں۔ مَا فِیْهَا غَیْرُهٗ وَفَرَسِهٖ۔ یعنی اس گھر میں اس کے اور اسکے گھوڑے کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس مثال میں فَرَسِهٖ کا عطف ضمیر مجرور پر کیا گیا ہے۔

پھر فرمایا وَالْفِتْنَةُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ فتنہ قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ اس جگہ فتنہ سے وہی فتنہ مراد ہے جس کا لَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ میں ذکر آتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو مرتد کرنے اور انہیں

اسلام سے منحرف کرنے کی سازشوں کا نام فتنہ رکھا گیا ہے اور اسے قتل سے بھی بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ کفار تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے تا کہ اگر ان کو طاقت ہو تو تم کو اپنے دین سے مرتد کر دیں۔ یعنی گو تمہارا مرتد کر دینا ان کی طاقت سے باہر ہے مگر کفار کی غرض تم سے لڑنے کی یہی ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں مرتد کر دیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کفار اپنے بدارادوں میں تو خدا تعالیٰ کے فضل سے ناکام رہے اور مسلمانوں پر فتح نہ پا سکے مگر اِکّا دکا آدمی جو ان کے قبضہ میں آ گیا انہوں نے اپنی طرف سے اس کو مرتد کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

چنانچہ بلالؓ، ابوجندلؓ اور یاسرؓ کی مثالیں اس امر پر کافی سے زیادہ روشنی ڈالتی ہیں۔ انہی جبراً مرتد کرنے کی کوششوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ قتل اور لڑائی کی نسبت دین کی وجہ سے کسی کو دکھ میں ڈالنا بہت زیادہ خطرناک گناہ ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے منحرف ہو جائیں اور کفر کی حالت میں ہی مر جائیں ایسے لوگوں کے اعمال اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اکارت چلے جائیں گے۔

حَبِطَتْ کے متعلق بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب کسی شخص نے کوئی عمل کر لیا۔ تو وہ ضائع کس طرح ہو گیا؟ (تفسیر کبیر لامام الرازی زیر آیت ھذا) اس اعتراض کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کا ذہن حَبِطَتْ کے اصل معنوں کی طرف نہیں جاتا۔ حَبِطَتْ کے اصل معنوں کا پتہ قرآن کریم کے ایک دوسرے مقام سے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ فاطر میں فرماتا ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (الفاطر: ۱۱) یعنی جو شخص عزّت چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کرے۔ کیونکہ تمام عزتیں خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کی طرف پاکیزہ روحیں صعود کرتی ہیں اور عمل صالح یعنی ایمان کے مطابق عمل ان کو بلند کرتا ہے اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کے ضائع نہ ہونے کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ اعمال خدا تعالیٰ کے حضور قبولیت کا جامہ پہن لیتے ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ کا مقرب بنا دیتے ہیں۔ پس حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کے یہ معنے ہیں کہ چونکہ ان کے اعمال خدا تعالیٰ کے لئے نہیں تھے اس لئے وہ انہیں قبول نہیں کرے گا اور ان کی روحوں کا صعود آسمان کی طرف نہیں ہوگا۔

اسی طرح حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ کے یہ بھی معنے ہیں کہ خواہ ایمان لانے کے بعد کسی شخص کو اسلام کی بڑی بھاری خدمت کی توفیق ملی ہو پھر بھی اگر اس کا انجام کفر پر ہوا ہے تو اس کی پہلی دینی خدمات بھی رائیگاں چلی جائیں گی کیونکہ اس نے اپنے عمل سے ان خدمات کو باطل قرار دے دیا اور آخرت میں بھی اس کے وہ

اعمال اس کے کسی کام نہیں آئیں گے کیونکہ اس کا خاتمہ اچھا نہ ہوا۔

وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ اور یہی لوگ دوزخ کی آگ میں پڑنے والے ہوں گے۔ کیونکہ دنیا میں بھی انہوں نے اپنے ارتداد سے فتنے اور فساد کی آگ کو بھڑکایا تھا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے ہجرت کی ہے اور اللہ (تعالیٰ) کے راستہ میں جہاد کیا ہے

اللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۱۹﴾

ایسے لوگ یقیناً اللہ (تعالیٰ) کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اللہ (تعالیٰ) بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر۔ چونکہ گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا تھا جو ارتداد کی حالت میں ہی اس دنیا سے اُٹھ جائیں اور بتایا تھا کہ ایسے لوگوں کی اسلام کو مٹانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گی۔ اس لئے اب اللہ تعالیٰ ان کے مقابلہ میں ان لوگوں کا ذکر فرماتا ہے جن کو ارتداد کے بعد توبہ کی توفیق مل جائے اور وہ پھر اسلام میں داخل ہو جائیں چونکہ ارتداد کا داغ ایک نہایت ہی بدنما داغ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کے لئے صرف ایمان لانا کافی قرار نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ ایسے لوگوں کی توبہ اس وقت قبول ہوگی جب ایمان لانے کے بعد وہ ہجرت اختیار کریں یعنی بزدلی اور اخفائے ایمان جیسی گندی عادتوں کو کلّی طور پر ترک کر دیں یا اس علاقہ سے نکل جائیں جہاں دینی معاملات میں جبر سے کام لیا جاتا ہو اور پھر دین کی راہ میں ایک ننگی تلوار بن کر کھڑے ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مالی اور جانی جہاد کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کو غفور اور رحیم پائیں گے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک دفعہ حضرت عمرؓ حج کے لئے مکہ تشریف لے گئے۔ تو حج کے بعد آپ کی ملاقات کے لئے لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ انہی ملاقاتیوں میں مکہ کے روساء اور سردارانِ قریش کے بعض لڑکے بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بڑی عزّت سے بٹھایا اور ان سے مختلف باتیں پوچھتے رہے اتنے میں ایک غلام صحابی آیا۔ وہی غلام جو ابتدائے اسلام میں ان روساء عرب اور سرداران قریش کے باپ دادوں کی جوتیاں کھایا کرتے تھے جنہیں وہ گلیوں میں گھسیٹتے اور اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مار مار کر زخمی کر دیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان نوجوانوں سے کہا۔ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

صحابی ہیں وہ پیچھے ہٹ گئے اور صحابی قریب ہو کر حضرت عمرؓ سے باتیں کرنے لگ گئے۔ اتنے میں ایک اور صحابی آ گیا۔ حضرت عمرؓ نے پھر ان نوجوانوں سے کہا۔ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور ان کے لئے جگہ چھوڑ دو۔ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وہ جوتیوں تک جا پہنچے۔ یہ دیکھ کر وہ مجلس سے اُٹھ کر باہر آ گئے اور ایسی حالت میں آئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ کیا کبھی یہ خیال بھی آ سکتا تھا کہ ہم کسی زمانہ میں اس قدر ذلیل ہو جائیں گے کہ وہ لوگ جو ہماری جوتیاں اُٹھانا اپنے لئے فخر کا موجب سمجھا کرتے تھے مجلس میں ایک ایک کر کے ہم سے آگے بٹھائے جائیں گے اور ہمیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے ہم جوتیوں تک جا پہنچیں گے۔ گویا وہ جو ذلیل تھے معزز ہو گئے اور ہم جو معزز تھے ذلیل ہو گئے۔ یہ تمام نوجوان اگرچہ ایماندار تھے مگر غصہ اور جوش میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے لیکن ان میں سے ایک نوجوان جس کا ایمان زیادہ مضبوط تھا وہ کہنے لگا۔ بھائی! تم نے بات تو ٹھیک کہی مگر اس کا ذمہ دار کون ہے اور کس نے ہمارے باپ دادا سے کہا تھا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیں؟ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کی تھی اس لئے آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہم مجلس میں پیچھے ہٹا دیئے گئے مگر وہ جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی تھی۔ جنہوں نے اپنی جانیں اور اپنے اموال آپ کی راہ میں قربان کر دیئے تھے ان میں سے گو بہت سے مارے گئے مگر اب بھی جو باقی ہیں ان کا حق ہے کہ ان کی عزت کی جائے۔ اور ان کو ہم سے زیادہ ادب کے مقام پر بٹھایا جائے۔ انہوں نے کہا یہ بات تو درست ہے مگر کیا اب اس ذلت کو مٹانے کا کوئی ذریعہ نہیں؟ یا کیا کوئی ایسی قربانی نہیں جو اس گناہ کا کفارہ ہو سکے؟ اس پر اسی نے کہا چلو! حضرت عمرؓ کے پاس ہی چلیں اور انہی سے اس کا علاج دریافت کریں۔ چنانچہ وہ پھر آپ کے مکان پر گئے اور دستک دی مجلس اس وقت تک برخواست ہو چکی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اندر بلا لیا اور کہا کس طرح آنا ہوا انہوں نے کہا آج جو سلوک ہمارے ساتھ ہوا ہے وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں معذور تھا کیونکہ اس وقت جو لوگ میرے پاس آئے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابی تھے اور میرے لئے ضروری تھا کہ میں ان کی عزت و تکریم کرتا۔ انہوں نے کہا ہم اس بات کو خوب سمجھتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے اپنے لئے بہت بڑی ذلّت مول لے لی۔ مگر کیا کوئی ایسا طریق نہیں جس سے یہ ذلّت کا داغ ہماری پیشانیوں سے مٹ سکے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کا کام اہل عرب کے انساب کو یاد رکھنا تھا اور وہ جانتے تھے کہ ان نوجوانوں کے باپ دادا کو کتنی بڑی عزت اور وجاہت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ اسلام کی دشمنی کے زمانہ میں بھی اگر وہ کسی مسلمان کو

پناہ دے دیتے تھے تو کسی شخص کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس مسلمان کو دکھ پہنچا سکے اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے یہ واقعات آئے اور اس کا تصور کر کے ان پر رقّت طاری ہوگئی اور بات کرنا آپ کے لئے مشکل ہو گیا اور غلبہ رقّت میں آپ نے صرف اپنا ہاتھ اُٹھایا اور شمال کی طرف جہاں شام میں ان دنوں عیسائیوں سے لڑائی ہو رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس کا علاج صرف وہاں ہے یعنی اب اس ذلت کا علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس جہاد میں شامل ہو کر اپنی جانیں دے دو۔ پھر خود بخود لوگ ان باتوں کو بھول جائیں گے۔ چنانچہ اسی وقت وہ لوگ وہاں سے اُٹھے اور اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ سات نوجوان تھے جو اس ذلت کو دور کرنے کے لئے جہاد میں شامل ہوئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ پھر ان نوجوانوں میں سے ایک بھی زندہ مکہ کی طرف واپس نہیں آیا۔ سب اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ جس طرح ان نوجوانوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کر کے رضاء الٰہی حاصل کی تھی۔ اسی طرح ارتداد کے بعد اسی صورت میں توبہ قبول ہوسکتی ہے۔ جب زبان سے ایمان کا اظہار کیا جائے اور عمل سے ہجرت اختیار کی جائے۔ خواہ حقیقی رنگ میں یا معنوی رنگ میں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کی راہ میں کفار سے جہاد کیا جائے یہی وہ ذرائع ہیں جن سے وہ رحمت الٰہی کے مورد بن سکتے ہیں۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ

وہ تجھ سے شراب اور جُوئے کی بابت پوچھتے ہیں۔ تو کہہ دے (کہ) ان (کاموں) میں بڑا گناہ (اور نقصان)

وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ٚ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ

ہے اور لوگوں کے لئے ان میں (کئی ایک) منفعتیں (بھی) ہیں۔ اور ان کا گناہ (اور نقصان) ان کے نفع سے بہت

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

بڑا ہے۔ اور وہ (لوگ) تجھ سے (یہ بھی) پوچھتے ہیں کہ وہ (یعنی سائل) کیا خرچ کریں؟ تو کہہ دے کہ جتنا تکلیف

لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ۝۲۲۰

میں نہ ڈالے۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لئے بیان کرتا ہے تا کہ تم سوچ سے کام لو۔

حل لغات۔ اَلْخَمْرُ اَلْخَمْرُ اِسْمُ کُلِّ مُسْکِرٍ خَامِرِ الْعَقْلِ (اقرب) خمر ہر ایک نشہ دینے والی چیز کو

کہتے ہیں۔ جو عقل کو ڈھانپ دیتی ہے۔

اَلْمَیْسِرُ یَسَرَ سے مَفْعِلٌ کا صیغہ ہے اور اَلْمَیْسِرُ کے معنے ہیں اَللَّعْبُ بِالْقِدَاحِ (۱) تیروں سے جُوا کھیلنا۔ (اَوْھُوَ النَّرْدُ اَوْ کُلُّ قِمَارٍ) اَوْ ھُوَ الْجُزُوْرُ الَّتِیْ کَانُوْا یَتَقَامَرُوْنَ عَلَیْھَا (اقرب) (۲) نَرد یعنی شطرنج اور چوپٹ کو بھی میسر کہتے ہیں (۳) ہر قسم کا جُوا بھی میسر کہلاتا ہے۔ (۴) مَیسر ان اونٹوں کو بھی کہتے ہیں جن پر لاٹری ڈالتے تھے۔

اَلْاِثْمُ اَلْاَفْعَالُ الْمُبْطِئَۃُ عَنِ الْخَیْرِ (اقرب)۔ وہ کام جو نیکیوں سے روک دیں ان کو اِثْمٌ کہتے ہیں (۲) اِثْمٌ کا لفظ کبھی سزا اور تکلیف اور دکھ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اپنے نتیجہ کے اعتبار سے تکلیف وغیرہ کے معنے دیتا ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ کبھی سبب کو مسبّب کی جگہ استعمال کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اسے دوسری جگہ ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ الَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا یَزْنُوْنَ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا (الفرقان: ۶۹) اس جگہ یَلْقَ اَثَامًا کے یہ معنے ہیں کہ جو شخص یہ کام کرے گا وہ سزا پائے گا۔

اَلْعَفْوَ خِیَارُ الشَّیْءِ وَ اَطْیَبُہٗ بہتر سے بہتر اور پاک سے پاک چیز (۲) مَا یَفْضُلُ عَنِ النَّفَقَۃِ وَلَا عَسَرَ عَلٰی صَاحِبِہٖ فِیْ اِعْطَائِہٖ۔ جو کسی کے خرچ سے بچ رہے اور دینے والے کو اس کے دینے میں تنگی محسوس نہ ہو۔ (۳) عَفْوُ الْمَالِ۔ وہ مال جو بغیر سوال کے دیا جائے۔ کہتے ہیں اَعْطَیْتُہٗ عَفْوًا یا اَعْطَیْتُہٗ عَفْوَ الْمَالِ۔ میں نے اُسے بغیر مانگے دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے کہ لوگ تجھ سے شراب اور جُوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ جائز ہیں یا ناجائز؟ تُو ان سے کہہ دے کہ شراب اور جوئے میں کچھ خرابیاں ہیں اور کچھ فوائد لیکن خرابیاں فوائد کی نسبت زیادہ ہیں۔ یہ کیا ہی لطیف جواب اللہ تعالیٰ نے دیا ہے! ان کے سوال پر انہیں فوری طور پر منع نہیں کیا کہ تم شراب نہ پیو اور جُوا نہ کھیلو۔ بلکہ فرمایا کہ ان میں فوائد تھوڑے ہیں اور نقصانات زیادہ۔ اب تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اس جواب میں اصولی طور پر خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ قاعدہ بیان فرما دیا ہے کہ اگر کسی کام میں فائدہ زیادہ ہو اور نقصان کم تو اسے اختیار کر لیا کرو۔ اور اگر نقصان زیادہ ہو اور فائدہ کم تو اسے کبھی اختیار نہ کرو۔ بالخصوص ایسا کام تو کبھی اختیار نہ کرو جس میں اِثْمٌ کَبِیْرٌ ہو۔ اِثْمٌ کے معنے گناہ کے بھی ہیں اور اِثْمٌ کے معنے نیکیوں سے محرومی کے بھی ہیں۔ گویا انسان کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس کے نتیجہ میں اسے گناہ ہو۔ یا جس کے نتیجہ میں وہ نیکیوں سے محروم

ہو جائے۔ خواہ اس میں بظاہر کچھ فوائد بھی دکھائی دیتے ہوں۔

پھر مَنَافِعُ لِلنَّاسِ فرما کر اسلام نے ہمیں یہ بھی تعلیم دی ہے کہ خواہ تمہاری نگاہ میں کوئی چیز کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اس کی خوبیوں سے کلی طور پر انکار نہ کرو۔ جب شراب اور جُوئے جیسی چیزیں بھی فوائد سے خالی نہیں تو دوسری ضرررساں چیزوں کو تم فوائد سے خالی کیوں سمجھتے ہو۔ بے شک تمہارا فرض ہے کہ تم ان کے ضرر سے بچو۔ اور آئندہ نسلوں کو بچاؤ لیکن تمہاری بینائی ایسی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کسی چیز کا صرف تاریک پہلو ہی دیکھے بلکہ ہر چیز کا تاریک اور روشن دونوں پہلو سامنے رہنے چاہئیں اور حسن کا اقرار کرنے میں تمہیں کبھی بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمان اس بارہ میں خود آ آکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا کرتے تھے حالانکہ عرب کے رہنے والے شراب پینے کے اس قدر عادی تھے کہ وہ اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک عرب شاعر کہتا ہے

؎ اَلَا هُبِّيْ بِصَحْنِكِ فَاصْبَحِيْنَا
فَلَا تُبْقِيْ خُمُوْرَ الْاَنْدَرِيْنَا

(سبع معلّقة، معلقة عمرو بن كلثوم)

یعنی اے میری محبوبہ! تو بیدار ہو۔ اور اپنے بڑے پیالے میں ہم کو صبوحی پلا۔ اور اس قدر پلا کہ علاقہ شام کے اندر شہر کے شراب فروشوں کی شراب میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے۔ سب کی سب ہمیں پلا دے۔ اسی طرح جنگوں کے موقعہ پر وہ خصوصیت سے شراب کا زیادہ استعمال کیا کرتے تھے تاکہ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر لڑیں اور عاقبت اندیشی کا خیال ان میں نہ رہے۔ مگر ایسے ماحول میں رہنے کے باوجود انہوں نے خود پوچھا کہ یا رسول اللہ! شراب اور جُوئے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ ابھی شراب اور جُوئے کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کے بعد وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ چیزیں قربِ الٰہی میں روک ہیں اور ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کوئی واضح حکم نازل ہونا چاہیے۔ پس یہ سوال خود اپنی ذات میں صحابہ کرامؓ کی پاکیزگی ان کی بلندی اخلاق اور ان کے اعلیٰ کردار کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ شراب اور جُوا یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کے روکنے کے لئے دنیا میں بڑی بڑی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ مگر اسلام کے سوا اور کوئی مذہب ان کو روک نہیں سکا۔ صرف اسلام ہی ہے جسے اس میدان میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ شراب

کے متعلق اسلامی تعلیم کی حقیقت آشکارا کرنے کے لئے ہم پہلے دیگر مذاہب کی تعلیم کو جو وہ شراب کے متعلق دیتے ہیں بیان کرتے ہیں اور سب سے پہلے اسی مذہب کا ذکر کرتے ہیں جو سب سے قدیم مذہب ہونے کا مدعی ہے یعنی ویدک مذہب، ہندو مذہب کی شراب کے متعلق جو تعلیم ہے اس کے لئے ہمیں زیادہ چھان بین کی ضرورت نہیں اس مذہب کی بنا ویدوں پر ہے اور وید خود اس مسئلہ پر کافی سے زیادہ روشنی ڈالتے ہیں۔ ویدوں پر خصوصاً رگوید پر جو چاروں ویدوں میں سے اہم ہے ایک اجمالی نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ شراب نہ صرف جائز ہے بلکہ اس کا استعمال بعض موقعوں پر ضروری اور موجب ثواب بتایا گیا ہے۔ اور ہند کے رشی اسے ایک مقدس اور پاک چیز قرار دیتے ہیں۔ وید کے منتر یکے بعد دیگرے ہماری آنکھوں کے سامنے اس سنجیدہ کوشش کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں جو ہندوستان کا برگزیدہ پجاری اپنے پرماتما کی توجہ کو کھینچنے کے لئے شراب کو پیش کر کے کرتا ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان کے پجاری کی پوجا میں شراب کا دوسری چیزوں کی نسبت بہت زیادہ دخل تھا۔ وہ سوم کا رس نہ صرف خود پیتا ہے بلکہ اس کے ساتھ بہت سی پوجا کی چیزوں کو بھی نہلاتا ہے اور اِندر اور دوسرے دیوتاؤں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ان کے سامنے بھی اسے پیش کرتا ہے۔ اسی طرح اتھر وید میں اشونی کمار دیوتاؤں کی پوجا کے وقت جو منتر پڑھنے کے لئے بتائے گئے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایام کا ہندو پجاری اس چیز کو ایسا متبرک سمجھتا تھا کہ صرف خود ہی شراب کو استعمال نہ کرتا تھا بلکہ اپنے دیوتا سے بھی اس کے استعمال کی درخواست کرتا تھا۔ چنانچہ کانڈ نمبر ۱۹ ادھیائے نمبر ا منتر نمبر ۱۷ میں لکھا ہے۔

’’اے اشونی کمارو! پہاڑوں میں، جنگلوں میں، جنگلی جڑی بوٹیوں میں جو مدھو (شراب) ہے اس وقت (یعنی یگیہ کی تقریب پر) جو کشید کی جاتی ہے اس کا رس میرے اور آپ کے لئے ہو۔‘‘

اس منتر میں تو صرف دیوتا سے شراب کے استعمال کی درخواست ہی کی گئی ہے۔ مگر بلّور کے بنائے ہوئے نیتر کی پوجا کے وقت اس سے بھی زیادہ یہ کام کیا جاتا ہے کہ اسے شراب سے غسل دیا جاتا ہے۔ گویا عملاً اسے شراب پلائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اتھر وید کا یہ منتر پڑھا جاتا ہے کہ

’’اے بلّور کے بنائے ہوئے نیتر! آپ ہمارے مہمان ہو کر ہمارے گھر میں رہیئے گا اور ہم آپ کو گھی شراب شہد اور میٹھے میٹھے اسی طرح کے کھانے دیتے ہیں۔ آپ ہماری ہمیشہ بھلائی سوچتے رہا کریں۔ جیسے باپ اپنی اولاد کے لئے بہتری سوچتا رہتا ہے۔‘‘

(اتھر وید کانڈ نمبر ۱۰ ادھیائے نمبر ۶ منتر ۲۶، ۲۷)

یہ دو منتر تو اس امر پر روشنی ڈالتے ہیں کہ قدیم ہند کا پجاری پوجا کے وقت اپنے دیوتا سے شراب پینے کی درخواست کرتا ہے اور خود شراب پیتا اور بلّور کے نیتر کو شراب میں غوطہ دیتا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ وضاحت اسی وید کے کانڈ نمبر ۱۰ ادھیائے نمبر ۱۰ اور منتر نمبر ۱۰ میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوتا خود بھی اپنی کامیابی کی خوشی میں شراب کا استعمال کرتے ہیں چنانچہ لکھا ہے۔

''اپنے دشمنوں کو قابو کر کے فتح حاصل کرنے کے لئے اِندر نے شراب کے پیالے پیئے۔''

اس زمانہ میں آریہ مت کے بعض ممبروں نے سوم کے رس اور اسی قسم کے اور الفاظ کی تشریح کرتے وقت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وید میں شراب کا کوئی ذکر نہیں بلکہ گلو وغیرہ کے رس کا ذکر ہے مگر جب ہم تمام کی تمام ہندو قوم کا طریق عمل دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ ہندو قوم کا میل جول کسی ایسی قوم سے جو شراب کی سخت عادی ہو کبھی لمبے عرصے تک اور پورے طور پر نہیں رہا جس سے خیال ہو سکے کہ دوسروں سے یہ عادات انہوں نے اخذ کر لی ہیں تو ہم کو ان تاویلات کے ماننے میں بہت کچھ تأمّل ہوتا ہے۔ مگر جب ہم اتھر و وید کے کانڈ نمبر ۱۸ انو واک نمبر ا سوکت نمبر ا منتر ۴۸ کو دیکھتے ہیں تو ان تاویلات کا قبول کرنا ہمارے لئے بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں ہم یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ۔

''یہ سوم بہت ہی لذیذ اور خوش ذائقہ ہے اور کچھ میٹھا بھی اور کچھ تیز و تُرش بھی ہے ایسے سوم کو پینے والے اِندر دیوتا کے مقابلہ پر جنگ میں کوئی دشمن نہیں ٹھہر سکتا۔''

ان حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو مذہب پورے طور پر شراب کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اور بعض عبادات میں اس کا استعمال ضروری قرار دیتا ہے۔ ہندوؤں کا تمدن بھی اس نتیجہ کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی تاریخ بھی اس کی صحت پر شاہد ہے۔

ایرانی مذہب کی تعلیم دوسرا قدیم مذہب ایرانیوں کا مذہب ہے۔ ایرانی قوم ایک مسلسل اور لمبی تاریخ رکھتی ہے بلکہ تازہ تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تعجب نہیں اس کا تمدن ویدک تمدن سے بھی پرانا ہو۔ اس قوم کے مذہب قدیم وجدید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شراب جائز تھی۔ زردشتی مذہب کی واقفیت رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ زردشت کسی جدید مذہب کا بانی نہ تھا بلکہ اس نے قدیم ایرانی مذہب کو جو مرور زمانہ سے بہت کچھ بگڑ گیا تھا دوبارہ زندہ کیا تھا۔ پس ایرانی مذہب کا فتویٰ شراب کے متعلق معلوم کرنے کے لئے ہمیں زردشت کی بعثت سے پہلے اور بعد دونوں زمانوں پر نظر ڈالنی چاہیے۔ گو تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی لوگ شراب بکثرت استعمال کرتے

تھے مگر مذہبی طور پر وہ اس کو کیسا سمجھتے تھے؟ اس کا پتہ ہمیں زردشتی کتب سے ہی ملتا ہے۔ چنانچہ پہلوی کتب میں زردشت کی پیدائش کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے والد یوروشاسپ کو فرشتہ نے ایک شراب کا گلاس دیا جس کے پینے کے قریب زمانہ میں ہی اس کی بیوی دوغدو نامی حاملہ ہوئی اور ایک ایسا لڑکا جنی جس نے مشرقی تاریخ میں ایک نیا انقلاب پیدا کرنا تھا۔

ایک مقدس انسان کی پیدائش کے لئے فرشتہ کا شراب کا گلاس ان کے والد کو پلانا ایک ایسا واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کے زمانہ سے پہلے بھی شراب کا استعمال مذہباً نہ صرف جائز بلکہ مستحسن تھا۔

زردشت نے ایرانی مذہب میں جو اصلاح کی اس کی رو سے بھی شراب کا استعمال ایک مستحسن امر قرار دیا گیا۔ چنانچہ افرنجن کی دعائیں جو زردشتی مذہب کے پادریوں کے پڑھے جانے کے لئے مخصوص ہیں ان کے پڑھے جانے کے وقت جو رسوم ادا کی جاتی ہیں ان میں بھی شراب کا دخل ہے۔

دستور ان دعاؤں کے پڑھنے کے وقت ایک قالین پر جسے زمین پر بچھایا ہوا ہوتا ہے بیٹھ جاتا ہے اور اس کے سامنے دھات کی تھالی یا کسی پودہ کے پتہ پر اس موسم کے اعلیٰ سے اعلیٰ میوہ جات اور پھول رکھے جاتے ہیں اور ساتھ ہی برتنوں میں تازہ دودھ اور شراب اور تازہ پانی اور شربت پڑا ہوتا ہے۔ غرض ایرانی مذاہب کے مطابق بھی شراب کا استعمال ایک مستحسن اور پسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے۔ اور بعض مذہبی رسوم کی ادائیگی کے وقت شراب کا استعمال یا اس کا پاس رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

شراب اور بائیبل تیسرا قدیم مذہب اسرائیلی مذہب ہے۔ یہ مذہب بھی ہندو مذہب اور زردشتی مذہب کی طرح اپنا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے شروع کرتا ہے گو اس مذہب کی بنیاد حضرت موسیٰ ؑ نے رکھی ہے۔ مگر یہ ایک مسلسل سلسلہ تاریخ کے ذریعہ ابوالبشر آدم علیہ السلام سے اپنا تعلق جا ملاتا ہے۔ اس مذہب کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شراب کا استعمال ابتدائے آفرینش سے برابر چلا آیا ہے اور نہ صرف یہ کہ اسے کبھی بُرا نہیں سمجھا گیا بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ بائیبل کی کتاب پیدائش باب ۹ آیت ۲۰ تا ۲۳ میں لکھا ہے۔

’’اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا۔ اور اس کی مے پی کر نشہ میں آیا۔ اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو ننگا دیکھا۔ اور اپنے دو بھائیوں کو جو باہر تھے خبر دی۔ تب سم اور یافث نے ایک کپڑا لیا اور اپنے دونوں کاندھوں پر دھرا اور پچھلے پاؤں جا کر اپنے باپ کی برہنگی کو چھپایا۔‘‘

یہ توحضرت نوحؑ کا حال ہے۔ جو پہلے نبی ہیں جن کی تاریخ ایک حد تک محفوظ ہے۔ اور جن کے بعد تاریخ ایک حد تک تفصیلی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ آپ کے بعد دوسرا مہتم بالشان زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے ان کی نسبت ہم بائیبل کے باب ۱۴ آیت ۱۸ میں پڑھتے ہیں کہ ملک صدق سالم کے بادشاہ نے ان کی دعوت میں روٹی اور مے پیش کی تھی۔ اسی طرح حضرت لوطؑ کی نسبت پیدائش باب ۹ آیت ۳۲ و ۳۵ میں لکھا ہے کہ لوطؑ کی لڑکیوں نے اپنے باپ کو مے پلائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نہ صرف شراب منع نہ سمجھی جاتی تھی بلکہ ضروریات زندگی میں سے خیال کی جاتی تھی۔ کیونکہ یہ واقعہ عذاب کے بعد کا ہے۔ جس وقت کہ حضرت لوطؑ اپنی دونوں لڑکیوں سمیت جنگل میں ایک غار میں رہتے تھے۔ اس وقت ان کے پاس شراب کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ بائیبل کے بیان کے مطابق اس وقت کے طرز معاشرت کے ماتحت انہوں نے ان چند ضروری اشیاء میں جو وہ برباد ہونے والی بستی سے لے کر نکلے تھے شراب کا شامل کرنا بھی ضروری خیال کیا تھا۔ بنو اسرائیل میں نبوت کے منتقل ہونے میں بھی شراب کا بہت کچھ دخل ہے۔ کیونکہ جیسا کہ بائیبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ابتداءً بڑے لڑکے ہی وارث ہوا کرتے تھے اور انہی کی نسل سے شجرہ چلایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس طریق کے مطابق حضرت اسحاقؑ نے بھی اپنے بڑے لڑکے عیسو کو برکت دینی چاہی مگر جیسا کہ پیدائش باب ۲۷ سے معلوم ہوتا ہے حضرت یعقوبؑ کی والدہ نے ان کو کھانا پکا کر دیا۔ اور انہوں نے لذیذ کھانا کھلا کر اور عمدہ شراب پلا کر (آیت ۲۵) اور اپنے آپ کو عیسو ظاہر کر کے ان سے اپنے حق میں دُعا کروالی۔ اور اس طرح نبوت عیسُو کے خاندان سے نکل کر یعقوب یعنی اسرائیل کے خاندان میں آ گئی۔ پس بنی اسرائیلی اپنی روحانی ترقیات میں ایک حد تک مے کے بھی ممنون ہیں۔

پھر نہ صرف یہ کہ بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت اسحاقؑ نے خود ہی مے پی۔ بلکہ حضرت یعقوبؑ کے حق میں بھی جن کو وہ اپنا بڑا لڑکا عیسو خیال کر رہے تھے یہ دعا کی کہ خدا تجھے اناج اور مے کی زیادتی بخشے (آیت ۲۸) جس کے ذریعے انہوں نے بنی اسرائیل کے لئے ہمیشہ شراب کا استعمال ضروری قرار دے دیا کیونکہ اگر وہ شراب کا استعمال ترک کر دیں تو یہ دعا باطل جاتی ہے۔ حضرت اسحاقؑ کی اس دعا کو حضرت یعقوبؑ نے بھی اپنی وفات کے وقت کی دعا سے اور تقویت دے دی کیونکہ انہوں نے اپنے بیٹے یہودا اور اس کی اولاد کے حق میں خبر دی ہے۔ کہ ان کی آنکھیں شراب کے نشہ سے سُرخ رہیں گی۔ (پیدائش باب ۴۹ آیت ۱۲) اس زمانہ کے بعد بنی اسرائیل کی تاریخ میں سب سے بڑا اور اہم زمانہ حضرت موسیٰؑ کا ہے۔ حضرت موسیٰؑ یہودی مذہب کے بانی ہیں۔ اور اپنے سے پہلے سب شریعتوں کے ناسخ ہیں۔ مگر جہاں انہوں نے ایسے بہت سے قانون اور رواج جو ان سے پہلے

بنی اسرائیل میں رائج تھے موقوف کئے ہیں۔شراب کے متعلق پہلے حکم کو تبدیل نہیں کیا بلکہ انہوں نے بھی شراب کو خداوند کا چڑھاوا قرار دے کر اس کو مقدس کہا ہے۔کیونکہ جیسا کہ گنتی باب ۱۸ آیت ۱۲ سے معلوم ہوتا ہے اچھی سے اچھی شراب کا حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد کے لئے جن کو کہانت کا عہدہ سپرد کیا گیا تھا وعدہ کیا گیا ہے اور بنی اسرائیل کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ عمدہ شرابیں خدا تعالیٰ کے نام پر معبد پر چڑھائیں جنہیں کاہن استعمال کریں۔

یہ وعدے جو اوپر بیان ہوئے ہیں صرف حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد کے لئے ہیں۔مگر دوسرے بنی اسرائیل کو بھی خالی نہیں چھوڑا۔بلکہ ان کے لئے بھی حضرت موسیٰؑ سے خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ خدا تعالیٰ کے حکموں پر عمل کریں گے اور شریعت کی پابندی کریں گے تو ان کے رحم کے پھل اور ان کی زمین کے پھل اور ان کے غلّہ اور ان کی مے اور ان کے تیل اور ان کی گائیوں کی بڑھتی اور ان کی بھیڑوں کے گلوں میں اس زمین پر جس کی بابت اس نے ان کے باپ دادوں سے قسم کر کے کہا کہ تجھ کو دوں گا برکت بخشے گا۔(استثنا باب ۷ آیت ۱۳) اس حوالہ کے علاوہ تورات میں اور بھی کئی جگہ بنی اسرائیل کے لئے شراب کی کثرت کا وعدہ کیا گیا ہے اور حضرت مسیح کی آمد تک جس قدر انبیاء اور سلاطین گذرے ہیں عموماً سب کے ذکروں میں شراب کا بیان ہے گویا ان کی تمام تاریخ سے شراب کا استعمال نہایت کثرت سے ثابت ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد مذہبی دنیا میں عظیم الشان تبدیلی کر دینے والی ہستی جس کے بعد نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی تغیر عظیم پیدا کرنے والا انسان مبعوث نہیں ہوا حضرت مسیح ہیں۔اس وقت ان کے ماننے والوں کو دنیا میں ایک خاص مرتبہ اور عزت حاصل ہے۔اور ان کی تعلیم کو وہ نہایت کامل اور مکمل ظاہر کرتے ہیں۔انہوں نے بھی شراب کے متعلق جو کچھ فتویٰ دیا ہے وہ اس کی تقدیس کا ہی ہے۔انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح شراب کو بُرا نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ خود اس کو استعمال کرتے تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ معجزانہ طور پر شراب بنا کر لوگوں کو پلاتے تھے۔حضرت مسیح کا خود شراب استعمال کرنا تو متی باب ۲۶ آیت ۲۹ سے ثابت ہے جہاں لکھا ہے کہ مسیح نے حواریوں سے کہا کہ

’’میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں۔‘‘

اور ان کا معجزانہ طور پر شراب بنانا اور دوسروں کو پلانا یوحنا باب ۲ آیت ۳ تا ۱۰ سے ثابت ہوتا ہے۔ان آیات کا مضمون یہ ہے۔

’’اور جب مے گھٹ گئی۔ یسوع کی ماں نے اس سے کہا کہ ان کے پاس مے نہ رہی۔ یسوع نے اس سے کہا۔ کہ اے عورت! مجھے تجھ سے کیا کام میرا وقت ہنوز نہیں آیا۔ اس کی ماں نے خادموں کو کہا۔ جو کچھ وہ تمہیں کہے سو کرو۔ اور وہاں پتھر کے چھ مٹکے طہارت کے لئے یہودیوں کے دستور کے مطابق دھرے تھے اور ہر ایک میں دو یا تین من کی سمائی تھی۔ یسوع نے انہیں کہا۔ مٹکوں میں پانی بھرو۔ سو انہوں نے ان کو لبالب بھرا پھر اس نے انہیں کہا کہ اب نکالو۔ اور مجلس کے سردار پاس لے جاؤ۔ اور وے لے گئے جب میر مجلس نے وہ پانی جو مے بن گیا تھا چکھا اور نہیں جانا کہ یہ کہاں سے تھا مگر چاکر کہ جنہوں نے وہ پانی نکالا تھا جانتے تھے تو میر مجلس نے دولہا کو بلایا اور اسے کہا کہ ہر شخص پہلے اچھی مے خرچ کرتا ہے اور ناقص اس وقت کہ جب پی کے چھک گئے۔ پر تو نے تو اچھی مے اب تک رکھ چھوڑی ہے۔‘‘

مذکورہ بالا حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدائے عالم سے لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک تمام کے تمام مذاہب شراب کے جواز کا فتویٰ دیتے چلے آئے ہیں بلکہ اس کا استعمال بعض مذہبی رسوم میں بھی واجب رکھا جاتا رہا ہے اور اسے متبرک اور مفید شے قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ان مذاہب کی موجودگی اور ان کے رسوخ کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ نے ان تمام مذاہب کی تعلیم کے خلاف اللہ تعالیٰ کا یہ حکم اپنے پیرووٴں کو سنایا کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ یعنی لوگ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ شراب اور جُوئے کے متعلق کیا حکم ہے؟ تُو کہہ دے کہ ان میں نقصان بھی بہت ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں اور ان کا ضرر ان کے نفع سے زیادہ ہے۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں شراب کو منع کیا گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ۔ (المائدۃ: ۹۱ تا ۹۳) یعنی اے مومنو! شراب اور جُوا اور چڑھاوے کی جگہیں اور لاٹری شیطانی کاموں میں سے ہیں۔ سو ان سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ شیطان سوائے اس کے اور کچھ نہیں چاہتا کہ تمہارے درمیان شراب اور جُوئے کے ذریعے عداوت اور بغض پیدا کر دے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اور نماز سے تم کو روک دے۔

پس کیا تم باز رہو گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ہمیشہ چوکس رہو۔ اور اگر تم باوجود سمجھانے کے پھر جاؤ تو خوب یاد رکھو کہ ہمارے رسول کا فرض صرف یہی ہے کہ تم لوگوں تک حق کو پہنچا دے۔

ان آیات میں شراب کو قطعی طور پر منع کر دیا گیا ہے اور ایک مسلمان کے لئے اس چیز کا استعمال ہرگز جائز نہیں۔ میں بتا چکا ہوں کہ جس وقت یہ حکم اسلام نے دیا ہے اس وقت تک تمام مذاہب شراب کو نہ صرف یہ کہ برا نہیں قرار دیتے تھے بلکہ اس کے استعمال کو بالعموم اچھا سمجھتے تھے اور بعض مذاہب کی رسوم میں اس کا استعمال واجب تھا۔ ایسے موقعہ پر اسلام کا شراب کو منع فرمانا کوئی معمولی بات نہ تھی دنیا اس حکم کی خوبی کو سمجھنے کے لئے ابھی تیار نہ تھی بلکہ اس زمانہ کی طب بھی شراب کو ایک نہایت ہی مقوی اور اعلیٰ درجہ کی شے قرار دیتی تھی اور اس کا پینا صحتِ جسمانی کے لئے نہایت مفید قرار دیا جاتا تھا مگر باوجود ان سب باتوں کے اسلام نے شراب کو منع فرمایا۔ اور قطعی طور پر اس کا استعمال ناجائز قرار دے دیا اور یونہی بلا وجہ نہیں بلکہ دلائل کے ساتھ اور دلائل دیتے وقت بھی تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ اس کے استعمال کو منع کرتے وقت یہ بھی اقرار کیا کہ اس میں فوائد بھی ہیں۔ ممکن ہے بعض فلسفیوں نے اس کے استعمال کو بعض حالات میں ناپسند کیا ہو لیکن جس رنگ میں اسلام نے اس مسئلہ کو حل کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔ مثلاً جینی مت جو درحقیقت مذہب نہیں ہے بلکہ ایک فلسفہ ہے اس میں بھی شراب کی ممانعت کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ مگر کس بنا پر؟ کسی عقلی بنا پر نہیں۔ کسی علمی بنا پر نہیں۔ کسی مدلل پیرایہ میں نہیں بلکہ اس لئے کہ شراب کے تیار کرنے میں بہت سے کیڑوں کی جان جاتی ہے۔ اور چونکہ جان کا ہلاک کرنا جینی اصول کے ماتحت ناجائز ہے اس لئے شراب کا استعمال باکمال پیروؤں کو نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ممانعت درحقیقت نہ تو کلّی ممانعت ہے اور نہ شراب پر بذاتہٖ نظر ڈال کر اور اس بات کو مدنظر رکھ کر کہ شراب کا اثر اس کے استعمال کرنے والوں پر کیا پڑے گا اس کا حکم دیا گیا ہے بلکہ صرف اس لئے کہ شراب کا استعمال جینی فلسفہ کے اس مرکزی اصل کے خلاف تھا کہ جیو ہتیا کسی طرح نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا استعمال ناپسند کیا گیا ہے۔ غرض اسلام تمام مذاہب میں سے بلکہ تمام تعلیموں میں سے شراب کے منع کرنے اور بادلائل طور پر منع کرنے میں منفرد ہے۔ اور ایسے وقت میں اس نے شراب سے اپنے پیروؤں کو منع کیا ہے جبکہ لوگ ابھی اس مناعی کے حکم کو پورے طور پر سمجھنے کے بھی قابل نہیں تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ قرآن کریم نے صاف بتا دیا تھا کہ شراب کے نقصانات اس کے منافع سے زیادہ ہیں۔ مسلمان اطباء اپنی کتب میں برابر شراب کی تعریفیں اور خوبیاں بیان کرتے رہے اور اس کثرت سے بیان کرتے رہے کہ ان کی کتب کو پڑھ کر حیرت آتی ہے۔ چنانچہ میں اس جگہ صرف موجز کی کسی قدر عبارت مختصراً بیان کر دیتا ہوں جو ایک عام

درسی کتاب ہے۔اس کتاب کا مسلمان مصنف شراب کے وصف کو یوں بیان کرتا ہے۔

''اور چاہیے کہ مجلس شراب کے اردگرد منظر لذیذ ہو۔ پھول ہوں۔ پیارے دوست ہوں عمدہ خوشبوئیں ہوں۔ دل خوش کن راگ ہو اور ہر غم پہنچانے والی اور دل کو تنگ کرنے والی چیز کو دور کر دینا چاہیے۔مثلاً بغل کی بُو، بوسیدہ لباس، غم و غصہ اور شراب نہا کر اور عمدہ کپڑے پہن کر اور سر اور داڑھی کے بال کھلے چھوڑ کر اور ناخن کٹوا کر پینی چاہیے۔ اور یہ بھی چاہیے کہ جس مقام پر شراب پی جائے وہ ہوادار اور کھلا ہو۔ اور جاری پانی کے کنارے پر ہو۔ اور اس وقت لطیفہ گو دوست ساتھ ہوں کیونکہ شراب نفسانی قوتوں کو تحریک کرتی ہے اور تمام شہوات کو اُبھارتی ہے پس جب کوئی قوت اپنے مطلب کو نہیں پاتی تو تکلیف محسوس کرتی ہے اور منقبض ہو جاتی ہے پس نفس شراب کی طرف پورے شوق سے راغب نہیں ہوتا۔ اور نہ پورے طور پر اسے ہضم کرتا ہے۔ پس شراب کا نفع کم ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات شراب کا پینا بیکار جاتا ہے اور شراب پینے سے نفع کی نسبت نقصان زیادہ ہو جاتا ہے۔''

شراب کی نسبت یہ رائے ساتویں صدی ہجری کے ایک مصری مسلمان مصنف کی ہے اور اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ باوجود سات سو سال کی علمی ترقی کے مسلمان بھی شراب کی مضرت کو علمی طور پر سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ اور اس وقت تک کی تحقیقات سے مجبور ہو کر لکھتے رہے ہیں کہ شراب کا نفع اس کی مضرتوں سے زیادہ ہے حالانکہ قرآن شریف صاف فرما چکا تھا کہ اس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ ہے۔غرض قرآن کریم نے آج سے تیرہ سو سال پہلے جو تعلیم شراب کے متعلق تمام مذاہب کے برخلاف دی تھی اور جس طرح دی تھی وہاں انسانی عقل نہیں پہنچ سکتی تھی حتّٰی کہ باوجود قرآن کریم کے بیان کے خود مسلمان اطباء علمی طور پر شراب کی مضرت کو ثابت نہیں کر سکے اور ان کو مجبوراً اس امر کا اقرار کرنا پڑا کہ شراب ایک نہایت ہی نفع رساں شے ہے۔

زمانہ پر زمانہ گذرتا گیا اور صدی کے بعد صدی آتی گئی مگر شراب کے متعلق وہی تحقیق رہی جو ہزاروں سال سے چلی آتی تھی کہ شراب ایک عمدہ شے ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس تحقیق کی اور بھی تصدیق ہوتی گئی اور اگر کسی علم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے کلام کی تکذیب کر سکے تو کہا جا سکتا ہے کہ علم طب نہایت دلیری سے قرآن کریم کے اس ارشاد کی تکذیب صدیوں تک کرتا رہا۔ یونانی طب کے دور ختم ہونے اور طب جدید کے دور کے شروع ہونے پر اور ہزاروں تحقیقاتوں کو تو ردی کر کے پھینک دیا گیا۔لیکن شراب کی خوبیوں کے اظہار پر پہلے سے بھی زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اگر طب قدیم تندرست آدمی کی صحت کے قیام اور کمزور کی طاقت بڑھانے کے لئے

شراب کے استعمال کو مفید قرار دیتی تھی تو طب جدید نے بعض خطرناک قسم کے مریضوں کا علاج ہی برانڈی تجویز کیا اور اس کے فوائد پر اس قدر زور دیا جانے لگا کہ کوئی ہسپتال مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا جس میں برانڈی کی چند بوتلیں نہ رکھی گئی ہوں اور شراب کو آبِ حیات قرار دیا جانے لگا۔ اور بعض لوگ علی الاعلان کہنے لگے کہ جب تک شراب کو اسلام جائز نہ قرار دے دنیا کا اسلام کی طرف جھکنا ناممکن امر ہے۔ مگر باوجود ان تمام تحقیقاتوں اور طبی شہادتوں کے قرآن کریم کا یہ فیصلہ روشن حروف میں چمک رہا تھا کہ شراب کی مضرتیں اس کے فوائد سے زیادہ ہیں اور باوجود زمانہ کی ناموافق رائے کے کوئی شخص اس فیصلہ کو بدل نہیں سکتا تھا کیونکہ قرآن کریم خدا کا کلام اور آخری شریعت ہے جس کے بعد کوئی اور شریعت نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شراب کی مضرتیں صرف جسم انسانی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا اثر اخلاق پر بھی پڑتا ہے اور بہت پڑتا ہے جیسا کہ خود قرآن کریم نے سورۂ مائدہ میں اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ بھی فرمایا ہے کہ شیطان تمہارے درمیان شراب اور جُوئے کے ذریعے عداوت اور بُغض پیدا کرنا چاہتا ہے مگر کتنے لوگ ہیں جو کھانے پینے کی چیزوں کے ان اثرات کی طرف جو اخلاق پر ہوتے ہیں توجہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اور اس زمانہ میں تو ایک بہت بڑی مشکل یہ بھی پیدا ہوگئی تھی کہ تمدن اور تہذیب کی خرابی اور زوال اور انحطاط کے باعث وہ قوم جو شراب سے مجتنب ہے اپنے اخلاق میں بہت ہی گر گئی تھی۔ پس مقابلہ کیا جاتا تو کس طرح اور چند مثالوں سے کبھی کوئی مسئلہ پوری طرح صاف نہیں ہوسکتا۔ جو امر قوموں سے تعلق رکھتا ہو اس کے حل کرنے کے لئے قوموں کی ہی مثالیں درکار ہوتی ہیں اور ان کا بہم پہنچانا ناممکن ہو رہا تھا۔ پس علمی طور پر علم طب کے ذریعے ہی اس پر روشنی پڑتی تھی اور اس مسئلہ کا پورے طور پر فیصلہ ہوسکتا تھا۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا ایک ایک لفظ جس قدر معانی پر دلالت کرتا ہے ان تمام معانی کی صداقت خدا تعالیٰ خود ظاہر کرتا ہے اور زور آور نشانوں سے ثابت کرتا ہے ہاں بعض معانی کی صداقت ہمیشہ سے ثابت چلی آتی ہے تاکہ ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے وہ حجت ہو اور بعض معانی کی صداقت وہ آہستہ آہستہ مختلف زمانوں میں ثابت کرتا ہے۔ تا معلوم ہو کہ قرآن کریم خدا کا کلام ہے اور کسی انسان کا اس کی تالیف میں دخل نہیں کیونکہ اس میں وہ باتیں ہیں جو اس زمانہ کے علوم سے تعلق نہیں رکھتیں۔ شراب کے حکم کے متعلق بھی یہ دونوں پہلو اختیار کئے گئے تھے۔ اس کی اخلاقی مضرتیں تو ہر زمانہ میں ثابت کی جاسکتی تھیں۔ گو لوگ اس کی طرف پوری توجہ کریں یا نہ کریں اور گو بعض زمانوں میں بہ نسبت دوسرے زمانوں کے ان کا ثابت کرنا زیادہ مشکل ہو۔ لیکن شراب پینے کی چیز ہے اور پینے کی چیزوں کا پہلا اثر جسم انسانی پر پڑتا ہے اور ان اشیاء کے متعلق طبعاً لوگوں کی توجہ بھی

ایسے ہی اثرات کے معلوم کرنے کی طرف پھرتی ہے۔ پس اس حکم کی اہمیت اور خوبی اسی وقت پورے طور پر منکشف ہوسکتی تھی جبکہ اس کے جسمانی اثرات کی مضرتیں بھی روز روشن کی طرح ثابت ہوں اور پھر اس کے نفع سے زیادہ ثابت ہوں۔ اس اظہارِ حقیقت کا بھی آخر وقت آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو بعض ایسی ایجادوں کی توفیق دی جن کے ذریعہ سے انسان نہایت باریک اعصاب اور ریشوں پر مختلف ادویات اور اغذیہ اور تغیرات موسم اور احساسات کا جو اثر ہوسکتا ہے اسے معلوم کرنے کے قابل ہوگیا۔ ان ایجادوں نے جہاں اور عظیم الشان تغیرات پیدا کئے وہاں شراب کے متعلق بھی قدیم علمی تحقیقات کی غلطی کو ثابت کر دیا اور اکثر علماء طب کو اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ اس کے ضرر اس کے نفعوں سے زیادہ ہیں اس قدیم اور مستحکم خیال کے بدل دینے کا فخر علم النفس کے ایک ماہر کرپلن کو حاصل ہے جس نے اپنے بعض ہم خیالوں کی مدد سے کوشش کر کے اس امر کو ثابت کر دیا کہ شراب کی چھوٹی سے چھوٹی مقدار کے ایک ہی دفعہ کے استعمال سے بھی انسانی دماغ کے باریک ریشوں اور اعلیٰ درجہ کے علمی مرکزوں کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح ہاجؔ نے بھی الکوحل کے اس اثر کے متعلق تجربات کئے جو پٹھوں پر پڑتا ہے۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ شراب کے استعمال سے برداشت اور ذکاوت اور صبر کی قوتوں کو نہایت سخت نقصان پہنچتا ہے۔ مسٹر الیگزینڈر برائس ایم۔ڈی۔ڈی۔پی۔ایچ جو ماہر علم الاغذیہ ہیں شراب کے متعلق اپنی تحقیقات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

”اس میں کچھ شبہ اب باقی نہیں رہا کہ شراب درحقیقت ایک نہات سخت زہر ہے جو باریک ریشوں کو تباہ کر دیتا ہے پہلے تو یہ اپنا خواب آور اثر ظاہر کرتا ہے اور آہستہ آہستہ تحلیل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ خصوصاً اعصاب کو سخت نقصان پہنچاتا ہے۔ درحقیقت اس کا حق نہیں کہ اسے مقوی ادویہ میں شامل کیا جائے کیونکہ یہ صرف ایک ایسی دوائی ہے جو ایک عارضی تحریک کر دیتی ہے مگر اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک ضعف رہتا ہے۔ قریباً تمام سمجھدار ڈاکٹروں کی رائے اب یہی ہوگئی ہے کہ صحت میں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر بیماری کے علاج میں اس کا فائدہ بالکل مشتبہ نہ سمجھا جائے تو بھی یہ بات تو متحقق ہے کہ یہ اس قابل ہے کہ اس کی جگہ عموماً دوسری ایسی دوائیں استعمال کی جائیں جو اس سے کم ضرر رساں ہیں۔“

ان انکشافات کا اثر لازمی طور پر علم طب پر پڑنا تھا اور پڑا۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء سے برابر علم طب کے ماہروں کی توجہ اس طرف پھرنی شروع ہوگئی کہ شراب کے استعمال کو کم کیا جائے۔ چنانچہ ایڈنبرگ کے ایک ہسپتال میں جہاں

۱۸۹۱ء میں فی مریض اوسطاً نو روپیہ کی شراب خرچ ہوئی تھی ۱۹۰۰ء میں کل ۱۲ آنے کی خرچ ہوئی۔ اس تجربہ کی کامیابی نے ان کی توجہ کو اور بھی کھینچا اور ۱۹۰۹ء میں سر تھامس فریزر نے جو بہت بڑے ڈاکٹروں میں سے ہیں اپنے زیر علاج مریضوں کو ایک ماشہ شراب بھی استعمال نہیں کرائی۔ اب بہت سے ہسپتال اس قسم کے تجارب کر رہے ہیں اور سوائے چند شدید بیماریوں مثلاً نمونیا خنّاق اور محرقہ کے بہت کم استعمال کی جاتی ہے۔ اور تندرستوں کے لئے بھی اس کا استعمال اب مضر سمجھا جاتا ہے۔ غرض قرآن کریم کے فیصلہ کے تیرہ سو سال بعد دنیا پر اب آ کر روشن ہوا ہے کہ شراب کے ضرر اس کے فوائد سے بہت زیادہ ہیں۔ اور علمی طور پر یہ بات تحقیق کو پہنچ گئی ہے اور اب وہ لوگ جو اچھی بات کے قبول کرنے کے لئے کسی رسم یا عادت یا خیال یا اصول کی پرواہ نہیں کرتے اپنی غلطی کی اصلاح کی فکر کر رہے ہیں۔ وہ لوگ اپنی کوشش میں کامیاب ہونگے یا عادات رسم اور پرانے مذہبی خیالات غالب آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ مگر یہ بات ظاہر ہے کہ یہ جدوجہد اور جدید علمی تحقیق اس امر کو روز روشن کی طرح ثابت کر رہی ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم باقی تمام مذاہب کی تعلیموں پر ایک زبردست فوقیت رکھتی ہے۔ حتّٰی کہ اس کے بعض احکام کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے جو وہ تمام دیگر مذاہب کے برخلاف دیتا ہے دنیا کو تیرہ سو سال کی تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس لمبی تحقیق کے بعد ہزاروں دھکے کھا کر وہ اسی نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ جو حکم اسلام نے دیا تھا وہی درست اور صحیح تھا۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شراب کے معاملہ میں نہ صرف بلحاظ تعلیم کے اسلام کو دیگر ادیان پر تفوق حاصل ہے بلکہ بلحاظ تاثیر کے بھی دیگر ادیان پر اور تمام اخلاقی تحریکوں پر اسے تفوق حاصل ہے۔ جن لوگوں نے شرابیوں کی حالت کا کبھی غور سے مطالعہ کیا ہے اور ایسے لوگوں سے ان کو واسطہ پڑا ہے جنہیں شراب کی عادت ہو چکی ہو۔ وہ اس امر کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ شراب کی عادت جن لوگوں کو پڑ جاتی ہے ان کے لئے اس کا چھوڑنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ دوسرے نشوں کے برخلاف شراب میں ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ جن لوگوں کو اس کی سخت عادت پڑ جاتی ہے ان کو اس سے ایک قسم کا مجنونانہ لگاؤ ہو جاتا ہے جو ورثہ کے طور پر ان کی اولاد میں بھی منتقل ہو جاتا ہے اور ایسے لوگ جب تک شراب میں مخمور نہ رہیں ان کو چین نہیں آتا اور اس کے حاصل کرنے کے لئے سخت سے سخت جرم سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ پس شراب کی عادت کا چھڑا دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ میں بتا چکا ہوں کہ صرف اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے نہایت عمدگی سے اور دلائل کے ساتھ شراب کی ممانعت اپنے پیروؤں کو کی ہے۔ اور باقی سب ادیان نہ صرف یہ کہ شراب کے استعمال سے اپنے پیروؤں کو روکتے نہیں بلکہ ان میں سے بعض مذاہب نے اس کا استعمال مذہبی رسوم کے اندر داخل کر رکھا ہے لیکن میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ باوجود اس اجازت

کے بلکہ بعض صورتوں میں حکم کے ان مذاہب کے بڑے بڑے آدمیوں نے شراب کی مضرتوں کو دیکھ کر یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ اگر شراب کا استعمال اسی طرح جاری رہا تو ان کی قومیں کیا بلحاظ صحت و تندرستی کے اور کیا بلحاظ اخلاق و آداب کے بہت گر جائیں گی۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے عالم سے ہی ایسے لوگ ہوتے چلے آئے ہیں جو یہ تحریک کرتے رہے ہیں کہ شراب کا استعمال کم کیا جائے اور اعتدال کو ہر حالت میں مدنظر رکھا جائے۔ تمام مشرقی ممالک کی تاریخ (اور یہی ممالک پرانے زمانہ میں تہذیب و تمدن کے جھنڈے کو بلند کرنے والے تھے) اس بات پر شاہد ہے کہ قدیم زمانہ سے ہندوستان، ایران، چین۔ فلسطین۔ مصر۔ یونان اور کارتھج کے علماء مذہبی فلاسفر اور مقنّن بدمستی سے دور کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی کوششوں کا کیا نتیجہ نکلا یہی کہ اگر بعض آدمیوں نے کچھ مدت کے لئے شراب کا استعمال کم کر دیا تو کچھ عرصہ کے بعد پھر تمام کا تمام ملک اس ’’آب حیات‘‘ سے اپنی روح کو تازہ کرنے کے لئے دوڑ پڑا۔ امریکہ کو ہی دیکھ لو۔ امریکہ میں شراب نوشی کے انسداد کے لئے حکومت نے کتنی کوششیں کیں۔ لیکن چونکہ ایمان ان لوگوں کے دلوں میں نہیں تھا بلکہ ممانعتِ شراب کے پیچھے صرف ایک قانون کام کر رہا تھا اس لئے یہ تحریک ناکام رہی۔ ہزارہا موتیں صرف اس وجہ سے واقعہ ہوئیں کہ لوگ شراب پینے کے شوق میں سپرٹ پی لیتے اور سپرٹ میں چونکہ زہریلی چیزوں کی آمیزش ہوتی ہے اس لئے کئی اندھے ہو جاتے اور کئی مر جاتے۔ پھر امریکہ میں نصف سے زیادہ ایسے لوگ تھے جو باہر سے ناجائز طور پر شرابیں منگواتے اور پیتے۔ گورنمنٹ کا قانون تھا کہ ڈاکٹر کے سرٹیفکیٹ کے بغیر کسی شخص کو شراب نہیں مل سکتی اس قانون کی وجہ سے ہزاروں ڈاکٹروں کی آمدنیاں پہلے سے کئی گنا بڑھ گئیں وہ فیس لے کر سرٹیفکیٹ دے دیتے کہ فلاں شخص کا معدہ کمزور ہے یا اور کوئی ایسی بیماری ہے اسے پینے کے لئے شراب ملنی چاہیے۔ غرض ہزاروں ڈاکٹروں کا گذارہ محض اسی قسم کے سرٹیفکیٹوں پر ہو گیا اور باوجود شراب نوشی کے خلاف قانون بن جانے کے لوگ کئی قسم کے حیلوں سے کوشش کرتے کہ کسی طرح قانون شکنی کریں۔ غرض کسی ملک میں کسی مدبّر، کسی مقنّن، کسی واعظ اور کسی فلاسفر کی کوشش کا یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ لوگوں نے واقعہ میں شراب کم کر دی ہو۔ اور وہ اس عہد پر قائم رہے ہوں۔ اگر ایک جماعت نے اس کا استعمال کم کر دیا تو دوسری نے اس کی کسر پوری کر دی۔ شراب بہر حال اپنے مرکز پر قائم رہی اور اسے کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

اب آؤ اور اس کے مقابلہ میں اس تاثیر کو دیکھو جو انسدادِ شراب نوشی کے متعلق اسلام کو حاصل ہے اسلام اس وقت دنیا میں آیا جبکہ علم و سائنس کا رواج دنیا میں بہت کم تھا۔ یونانی علوم اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچ کر مسیحی پادریوں کی

سعی سے گوشہ گمنامی میں جا بیٹھے تھے اور سوائے معدودے چند آدمیوں کے دوسرے لوگ ان سے ناواقف تھے۔ خصوصاً ایشیائے کوچک پر جس کا ان علوم کی ترقی میں خاص حصہ تھا سخت اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہندوستانی فلسفہ بھی تنزل پر تھا۔ ایران بھی اخلاقی اور علمی طور پر انحطاط کی طرف قدم زن تھا۔ اور عربوں کی حالت تو سخت ناگفتہ بہ تھی۔ حجازی عربوں میں پڑھنا لکھنا ہی بہت بڑا علم تھا۔ اور اس فن کے واقف بھی چند آدمیوں سے زیادہ نہ تھے۔ علم الاخلاق ان کے ہاں وہی تھا جو ان کے شاعروں نے اپنے شعروں میں نظم کیا اور علم طب ان کے ہاں وہی تھا جو ان کی بڑی بوڑھیاں بطور صدری نسخوں کے یکے بعد دیگرے ایک دوسری کو سناتی چلی آئی تھیں۔ اور وہ علم الاخلاق جس کی طرف ان کے شاعروں نے راہنمائی کی ہے یہی ہے کہ شراب انسان کے اخلاق کو اعلیٰ کرتی ہے اور اسے دلیر اور سخی بناتی ہے اور یہی دو خصائل ہیں جن کی عرب پرواہ کرتا تھا۔ اس کے نزدیک تمام علم الاخلاق انہیں دو صفات میں مرکوز تھا اور ان کا علمِ طب بھی ان کو یہی ہدایت کرتا تھا کہ ہر مرض کا علاج شراب کا جام ہے پس عرب اپنے علوم کے لحاظ سے شراب سے متنفر نہیں بلکہ اس کا دلدادہ تھا۔ ہر عرب شراب کا عادی تھا اور عادی بھی ایسا کہ اس کے روزمرہ کے شغلوں میں سے سب سے بڑا شغل ہی شراب نوشی تھا۔ عرب کے شعروں کو پڑھو شراب کے ذکر سے ان کی کوئی نظم خالی نظر نہیں آتی۔ عرب کا مشہور شاعر طرفہؔ جو اپنی زبان کی خوبی اور مضامین کی بلندی کی وجہ سے عرب کا دوسرے نمبر کا شاعر سمجھا جاتا ہے لکھتا ہے۔ ؎

وَ اِنْ تَبْغِنِیْ فِیْ حَلْقَةِ الْقَوْمِ تُلْفِنِیْ
وَاِنْ تَقْتَنِصْنِیْ فِی الْحَوَانِیْتِ تَصْطَدِیْ
كَرِیْمٌ یُرَوِّیْ نَفْسَهٗ فِیْ حَیَاتِهٖ
سَتَعْلَمُ اِنْ مِتْنَا غَدًا اَیُّنَا الصَّدِیْ

(کتاب الشعر و الشعراء لابن قتیبة)

یعنی اگر تو میری تلاش قوم کی مجلس شوریٰ میں کرے تو تُو مجھے وہاں پائے گا۔ یعنی میں باوجود نوعمر ہونے کے قوم کا معتمد ہوں (یہ صرف بیس سال کی عمر میں مارا گیا تھا) اور اگر تو مجھے شراب کی دوکانوں پر تلاش کرے تو وہاں بھی مجھے پائے گا۔ یعنی دو ہی مقام ہیں جہاں میں مل سکتا ہوں اپنی دانائی کی وجہ سے قوم کی مجلس شوریٰ میں مجھے جانا پڑتا ہے اور اپنی شراب نوشی کی وجہ سے شراب خانوں پر میرا پھیرا رہتا ہے۔ پھر کہتا ہے میں وہ شریف النفس ہوں کہ اپنے نفس کو میں نے اس زندگی میں سیراب کر دیا ہے۔ اور اگر اے دوستو! ہم مر جائیں تو تم کو بعد مردن معلوم ہو جائے گا کہ کون پیاسا

ہے۔ یعنی میں اس قدر شراب پینے والا ہوں کہ مرنے کے بعد بھی نشہ میں ہی اٹھوں گا۔ طرفہؔ کی یہ باتیں باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ وہ اس پر عمل پیرا بھی تھا۔ چنانچہ عرب کے بادشاہ عمرو بن ہند نے جب اس کے بعض اشعار پر جو اس نے بادشاہ کی ہجو میں کہے تھے ناراض ہو کر عین اس کے عنفوانِ شباب میں اس کے قتل کا حکم اپنے والئی بحران کو لکھا اور اس نے طرفہؔ سے دریافت کیا کہ وہ اپنے لئے بہترین طریقہ موت کا چُنے۔ تو اس نے یہ پسند کیا کہ اس کے پاس بہت سی شراب رکھ دی جائے اور اسی کو پیتے وقت اس کی رگوں کا خون نکال کر اسے قتل کر دیا جائے۔

اسی طرح عرب کا ایک شاعر ابو محجن ثقفی اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

اِذَا مِتُّ فَادْفِنِّیْ اِلٰی اَصْلِ کَرْمَۃٍ
تُرَوِّیْ عِظَامِیْ بَعْدَ مَوْتِیْ عُرُوْقُھَا
وَلَا تُدْفِنِّیْ فِی الْفَلَاۃِ فَاِنَّنِیْ
اَخَافُ اِذَا مَامِتُّ اَنْ لَّا اَذُوْقُھَا

یعنی جب میں مر جاؤں تو مجھے انگور کے درختوں کے پاس دفن کیجیئو تا کہ اس کی جڑیں میری ہڈیوں کو سیراب کرتی رہیں اور مجھے جنگل میں دفن نہ کیجیئو۔ تا ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد میں شراب سے محروم رہ جاؤں۔

(کتاب الشعر و الشعراء لابن قتیبۃ)

شعراء کے کلام کے علاوہ لغتِ عرب بھی عرب کے شراب پر شیدائی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ عربی زبان میں شراب کے نام اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اور کسی زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ تمدن عرب بھی اس بات کا شاہد ہے کہ عرب شراب نوشی میں نہ صرف کامل تھا بلکہ باقی تمام دنیا سے بڑھا ہوا تھا۔ کیونکہ عرب میں شراب کشید کرنے کا طریق بہت قدیم زمانہ میں دریافت کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹنیکا میں لکھا ہے۔

’’معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کے لوگوں کو شراب کے کشید کرنے کا طریق معلوم تھا اور تاریکی کے زمانوں میں عرب لوگ شراب کے کشید کرنے کا کام کیا کرتے تھے۔‘‘

(انسائیکلو پیڈیا برٹنیکا زیر لفظ wine)

اس تاریخی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب قدیم زمانہ میں شراب بنانے اور اس کے استعمال کرنے میں سب سے آگے تھے۔ بلکہ وہ دنیا کے لئے کشید کردہ شراب کی جو خمیر سے تیار کردہ شراب سے زیادہ سخت اور زیادہ عادی بنا

دینے والی ہے اکیلی منڈی بنا ہوا تھا۔ یہ ملک تھا جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مبعوث ہوئے اور یہ قوم تھی جس سے شراب چھڑانے کا انہوں نے ارادہ کیا۔ اس ارادہ کے پورا کرنے کے لئے انہوں نے کیا تدابیر اختیار کیں۔اوران کا کیا نتیجہ نکلا؟ یہ ایک حیرت انگیز تاریخی واقعہ ہے جس پر تمام عقلیں دنگ ہیں اور کل دانا انگشت بدنداں۔ اس شراب کے نشہ میں مخمور رہنے والی قوم اور شراب کو اپنا ایک ہی دل لگی کا ذریعہ سمجھنے والی جماعت میں ایک دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلتے ہیں۔ اور مختصر اور صاف لفظوں میں خدا تعالیٰ کا یہ حکم سنا دیتے ہیں کہ شراب کے نقصانات چونکہ اس کے نفع سے زیادہ ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے اس کو حرام کر دیا ہے پس ہر ایک مسلمان کو چاہیے کہ اس سے پرہیز کرے اور اس کا بنانا۔ بیچنا۔ پینا اور پلانا ترک کر دے۔ اور اس حکم کو سن کر وہ شراب کے شیدائی اپنا سر نیچا کر لیتے ہیں۔ اور ایک شخص کے منہ سے بھی اس کے خلاف آواز نہیں نکلتی۔ ہر ایک ان میں سے شرح صدر سے اس حکم کو قبول کر لیتا ہے اور اس وقت کے بعد شراب کا گلاس کسی ایک فرد کے منہ کے قریب بھی نہیں جاتا۔ وہ لوگ مہلت نہیں مانگتے قلّت وکثرت کا سوال نہیں اٹھاتے کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جس چیز کی زیادتی حرام ہے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔ ان میں لیکچروں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ شراب کی بُرائیاں ذہن نشین کرنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اسلام نے ان کے ذہنوں کو ایسی جلا دے دی تھی کہ حق بات کی طرف توجہ دلانا ان کے لئے کافی ہوتا تھا۔ اور تعصب اور خود بینی سے ان کو اس قدر دور کر دیا تھا کہ اپنی غلطیاں خود بخود ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں۔ پس کسی لیکچرار کے لیکچر یا میجک لنٹرن کی تصاویر کی ان کو ضرورت نہ تھی۔ ان کے لئے صرف ایک اشارہ کافی تھا۔ ایک لفظ بس تھا۔ اور سب معاملہ آپ ہی آپ ان کے لئے واضح ہو گیا۔ ان کا اپنا نفس ان کے لئے لیکچرار تھا اور گوشہ ہائے دماغ میجک لنٹرن کے پردے جن پر وہ عقل کی آنکھوں کے ساتھ خوب اچھی طرح ان بدمستیوں کے نظاروں کو دیکھ سکتے تھے جو شراب نوشی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں وہ جھوٹی تصویروں کے محتاج نہ تھے سچا نقشہ ان کی رہنمائی کے لئے کافی تھا۔ اسلام کے اس دوحرفہ حکم کا جو اثر شراب نوشی پر ہوا اس کی بہترین مثال ذیل کا واقعہ ہے جو مسلم۔ مسند احمد بن حنبل اور ابن جریر کی روایات سے ماخوذ ہے۔

حضرت انسؓ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام میں سے تھے اور مدینہ کے رہنے والے تھے۔ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن ابوطلحہ کے مکان پر مجلس شراب لگی ہوئی تھی اور بہت سے دوست جمع تھے۔ میں شراب پلا رہا تھا۔ دور پر دور چل رہا تھا اور نشہ کی وجہ سے ان کے سر جھکنے لگے تھے کہ اتنے میں گلی میں کسی نے آواز دی

کہ شراب حرام کی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اُٹھ کر دریافت کرو کہ یہ بات درست بھی ہے یا نہیں؟ مگر بعض دوسروں نے کہا کہ نہیں پہلے شراب بہا دو پھر دیکھا جائے گا۔ اور مجھے حکم دیا کہ میں شراب کا برتن توڑ کر شراب بہادوں چنانچہ میں نے ایک سونٹا مار کر وہ گھڑا جس میں شراب تھی توڑ دیا اور اس کے بعد وہ لوگ کبھی شراب کے نزدیک نہیں گئے۔

(صحیح مسلم کتاب الاشربۃ باب تحریم الخمر، مسند احمد بن حنبل روایت حضرت انسؓ تفسیر طبری زیر آیت ھٰذا)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اثر لوگوں کے دلوں پر کیا تھا۔ مجلس شراب میں جبکہ لوگ نشہ میں ہیں۔ ایک شخص کے خبر دینے پر بلا تحقیق شراب کا بہا دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کی اہمیت کو وہ اقوام زیادہ سمجھ سکتی ہیں جو شراب کی عادی ہیں۔ کیونکہ جب دور سے دیکھنے والے ان کی اس حالت کو عجیب حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو خود ان کے دل ضرور اس حالت کی خصوصیت کو اچھی طرح محسوس کرتے ہوں گے۔ اس واقعہ کو دوسرے مذاہب اور دوسرے تمدنوں اور قوانین کے اثرات کے ساتھ ملا کر دیکھو کہ کیا دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نہیں؟ آج جبکہ سائینس اور علومِ طبعیہ شراب کی مضرت کو ثابت کر رہے ہیں اور شراب کے ترک کرنے میں ملکی بہبودی اور مالی فراخی کی بھی امید ہے پھر بھی لوگ شراب چھوڑنے کے لئے تیار نہیں لیکن عرب کا مخمور مسلم ایک راستہ پر چلنے والے کی اکیلی آواز سن کر کہ شراب حرام کی گئی ہے شراب کے مٹکوں کو توڑ کر مدینہ کی گلیوں میں شراب ہی کا دریا بہا دیتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

دوسری چیز جس سے اس آیت میں روکا گیا ہے وہ جُوا ہے۔ جوا بھی اہل عرب کی گھٹی میں رچا ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جب کوئی بڑی دعوت کرنی ہوتی تو اس کے اخراجات کے لئے یہ انتظام کرتے کہ تمام امراء مل کر جُوا کھیلتے اور جو ہار جاتا اس پر اس خرچ کی ذمہ واری ڈال دی جاتی۔ اسی طرح جنگوں کے موقعہ پر وہ قرعہ اندازی سے کام لیتے اور جس امیر آدمی کا نام نکلتا اس کا فرض قرار دیا جاتا کہ وہ لڑنے والوں کے کھانے پینے کا انتظام کرے اور ان کو شراب مہیا کر کے دے۔ گویا یہ جنگی اخراجات پورا کرنے کا ایک ذریعہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی مسلمانوں کو منع فرما دیا کیونکہ جس طرح شراب جسم اور اخلاق اور روحانیت کو تباہ کرنے والی چیز ہے اسی طرح جُوا بھی اخلاق اور تمدن کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔ جُوئے کا عادی انسان اگر جیتتا ہے تو اور ہزاروں گھروں کی بربادی کا موجب ہو کر پھر جُوئے باز میں زمین اور روپیہ لٹانے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی جوئے باز ایسا ہوگا جو روپیہ کو سنبھال کر رکھتا ہو۔ بالعموم جُوئے باز بے پرواہی سے اپنے مال کو لٹاتے ہیں اور ایک طرف تو اور لوگوں کو برباد کرتے ہیں

اور دوسری طرف اپنے مال سے فائدہ نہیں اٹھاتے کیونکہ روپیہ کمانے میں انہیں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ پھر جُوا عقل اور فکر کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ اور جُوئے باز عادتاً ایسی چیزوں کے تباہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جنہیں کوئی دوسرا عقلمند تباہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ جب شراب سے جو سپاہیوں میں تہور پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا اور جوئے سے جو لوٹ مار کا طریق تھا اور جس سے وہ لوگ جنگی اخراجات پورا کیا کرتے تھے۔ روک دیا گیا تو بجائے اس کے کہ ان کے دلوں میں کوئی انقباض پیدا ہوتا انہوں نے قربانیوں کی راہ میں ایک اور قدم آگے بڑھایا۔ اور جائز ذرائع سے کمائے ہوئے اموال کے متعلق بھی یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ انہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں کس نسبت سے خرچ کرنا چاہیے چونکہ پہلے بھی ایک ایسا ہی سوال گزر چکا ہے اس لئے یاد رکھنا چاہیے کہ وہاں اقسام صدقہ کے متعلق سوال تھا اور یہاں کمیت کے متعلق سوال ہے یعنی جب جُوا بھی منع کر دیا گیا تو ان کے دلوں میں سوال پیدا ہوا کہ اب لازماً ہمیں زیادہ قربانی کی ضرورت ہوگی۔ سو ہم کیا خرچ کریں۔ کیا سب کچھ یا کسی اور نسبت سے؟ گویا جس حد تک ہمیں اپنے اموال خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے چاہئیں اس پر روشنی ڈالی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں صرف ایک لفظ عفو استعمال فرمایا ہے جس کے ایک معنے اس مال کے ہیں جو ضروری اخراجات سے بچ جائے اور جس کے دینے سے انسان کو کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ ہو۔ دوسرے معنے عَفْوٌ کے خِیَارُ الشَّیْءِ وَاَطْیَبُہٗ کے ہیں۔ یعنی سب سے اچھی اور پاکیزہ شے اور تیسرے معنے عَفْوٌ کے بغیر مانگے دینے کے ہیں۔ مفسرین نے اس آیت کے کئی معنے لکھے ہیں ایک تو یہ کہ اس جگہ جہاد میں اموال خرچ کرنے کا حکم ہے۔ صدقات مراد نہیں گویا ان کے نزدیک زیر تفسیر آیت کے یہ معنے ہیں کہ جب جہاد درپیش ہو تو اپنی ضروریات سے زائد مال تمام کا تمام جہاد کے لئے دے دو۔ دوسرے معنے اس کے یہ کئے جاتے ہیں کہ یہاں جہاد کا نہیں بلکہ صدقات کا ذکر ہے۔ اور پھر عَفْوٌ کے لحاظ سے اس کے کئی معنے کرتے ہیں (۱) بعض کہتے ہیں کہ عَفْوٌ کے معنے ضرورت سے زائد مال کے ہیں۔ چنانچہ ابتدائے اسلام میں سال بھر کے نفقہ سے جو کچھ بچ رہتا اس کے فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا مسلمانوں کو حکم تھا مگر آیت زکوٰۃ کے نازل ہونے پر یہ حکم موقوف ہو گیا۔ گویا ان کے نزدیک یہ آیت اب منسوخ ہو چکی ہے (۲) دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ زکوٰۃ کے متعلق حکم ہے اور مجملاً بیان ہوا ہے اس کی تفصیل دوسری جگہوں سے معلوم ہوتی ہے (۳) ایک اور جماعت عفو کے معنے اس مال کے کرتی ہے جس کا خرچ کرنا بوجھ معلوم نہ ہو۔ (۴) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنے درمیانی خرچ کے ہیں یعنی نہ بالکل کم خرچ کرو اور نہ حد سے زیادہ (۵) پھر بعض نے کہا ہے کہ عَفْوٌ کے

معنے بہتر اور پاک مال کے ہیں۔ اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اچھے اور پاک مال میں سے خرچ کرو۔ یہ نہیں کہ پُرانی اشیاء یا دوسروں کے اموال اٹھا کر دے دو۔ (۶) بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ و خیرات خوب دل کھول کر کرو۔

جس جماعت نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ جو ضرورت سے زائد بچے اسے خرچ کرو۔ اس نے بھی اسے یا تو جہاد پر چسپاں کیا ہے یا منسوخ قرار دیا ہے۔ اور وہ اس بات پر مجبور بھی تھے کیونکہ وہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عمل اور اُمتِ اسلامیہ کے طریق کو اس کے خلاف دیکھتے تھے۔ احادیث بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ اپنے اخراجات نکال کر باقی سارا مال تقسیم کر دینا اسلامی حکم نہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یَجِیْءُ اَحَدُکُمْ بِمَالِہٖ کُلِّہٖ یَتَصَدَّقُ بِہٖ وَیَجْلِسُ یَتَکَفَّفُ النَّاسَ اِنَّمَا الصَّدَقَةُ عَنْ ظَهْرِ غِنًی (البحر المحیط سورۃ البقرۃ زیر آیت ھٰذا) یعنی تم میں سے بعض لوگ اپنا سارا مال صدقہ کے لئے لے آتے ہیں اور پھر لوگوں کے آگے سوال کے لئے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ صدقہ صرف زائد مال سے ہوتا ہے۔ اسی طرح فرماتے ہیں اِنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِیَاءَ خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ (البحر المحیط زیر آیت ھذا) یعنی اگر تو اپنے ورثاء کو دولت مند چھوڑ جائے تو یہ زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ تو ان کو غریب چھوڑ جائے۔ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ثلث مال کے تقسیم کر دینے کی اجازت چاہی مگر آپ نے انہیں منع فرمایا۔ پھر انہوں نے آدھا مال تقسیم کرنا چاہا تو اس سے بھی منع فرمایا پھر انہوں نے تیسرے حصہ کے تقسیم کر دینے کی اجازت چاہی تو اس حصہ کی آپؐ نے اجازت دے دی مگر ساتھ ہی فرمایا اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ (ترمذی کتاب الوصایا باب ما جاء فی الوصیة فی الثلث) یعنی تیسرے حصہ کی وصیت کر دو گو ثلث بھی کثیر ہے۔ غرض یہ خیال کہ اسلام کا یہ حکم ہے کہ جو مال ضرورت سے زائد بچے اُسے تقسیم کر دینا چاہیے بالکل خلاف اسلام اور خلاف عملِ صحابہؓ ہے جن میں سے بعض کی وفات پر لاکھوں روپیہ ان کے ورثاء میں تقسیم کیا گیا (أسد الغابة، عبد الرحمٰن بن عوفؓ)۔ پھر اگر اسلام کا یہی حکم تھا تو زکوٰۃ کا حکم دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی؟ جب سب مال جو ضرورت سے زائد ہو تقسیم کر دینے کا حکم ہے تو زکوٰۃ مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر ضرورت سے بچے ہوئے کی اصطلاح خود مبہم ہے۔ بعض لوگ جو کچھ ان کو مل جائے گو لاکھوں روپیہ ہی کیوں نہ ہو خرچ کر دیتے ہیں اور ضرورت سے زائد ان کے خیال میں کوئی مال ہوتا ہی نہیں۔ پھر بعض لوگ اپنا سب مال تجارت وغیرہ میں لگائے رکھتے ہیں۔ ان کے پاس بھی ضرورت سے زیادہ نہیں بچ

سکتا۔عقلاً بھی یہ خیال بالکل باطل ہے کیونکہ جب تک ایک جماعت ایسے لوگوں کی نہ ہو جو مال دار ہوں عام ملکی ترقی نہیں ہوسکتی اور غرباء کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض روحانی لوگ اپنے اموال کو حتی الوسع غرباء کی خدمت میں خرچ کرتے ہیں اور اسے اسلام نے منع نہیں کیا بلکہ پسند کیا ہے مگر یہ بات غلط ہے کہ اسلام نے اس امر کا حکم دیا ہے کہ دنیا میں مالی مساوات قائم کی جائے۔اور ضرورت سے زیادہ مال لوگ لازماً خرچ کر دیا کریں۔اگر یہ اصل تسلیم کیا جائے تو یہ اصل بھی مقرر کرنا پڑے گا کہ ضرورت سے مراد عام حالتِ ملکی کے مطابق اخراجات ہوں گے ورنہ اگر اس بات کی اجازت دے دی جائے کہ ہر شخص اپنی ضرورت کا خود فیصلہ کرے تو پھر بھی مساوات نہیں رہے گی۔کوئی شخص اعلیٰ سے اعلیٰ کھانوں اور عمدہ سے عمدہ کپڑوں اور وسیع اور کھلے اور آراستہ و پیراستہ مکانوں اور خوشنما چمنوں اور میوہ دار باغوں کے لئے روپیہ رکھ کر باقی اگر بچے گا تو غرباء میں بانٹ دے گا۔اور غریب بیچارے معمولی لباس پہننے اور جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور ہوں گے۔اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے احکام کے مطابق ہر مسلمان حکومت کا یہ فرض ہے کہ اس کے ملک کے باشندے فاقہ سے نہ رہیں اور ان کے قابلِ ستر مقامات کے لئے کپڑا مہیّا کیا کرے۔گویا انسانی زندگی کی پوری طرح حفاظت کرے۔اس کے لئے وہ امراء سے شریعت کے حکم کے مطابق مال لے کر غرباء پر خرچ کرتی ہے اس سے زیادہ جو کچھ خرچ کیا جائے وہ امراء کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ہاں! اگر زکوٰۃ دینے کے بعد بھی کوئی شخص فاقہ سے مرتا ہوا کسی کو نظر آئے تو اس کا فرض ہے کہ اس کی جان بچانے کی پوری کوشش کرے۔اس دعویٰ کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کیا ہے۔آپؐ نے اسے اسلام کے اصولی احکام بتائے۔اور ان میں زکوٰۃ کا مسئلہ بھی بیان فرمایا۔یہ سب کچھ سن کر اس شخص نے کہا کہ میں اس سے نہ زیادہ کروں گا نہ کم۔اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے اس قول کو پورا کر دیا تو یہ کامیاب ہو گیا (بخاری کتاب الایمان باب الزکٰوۃ من الاسلام)۔اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غرباء کی مدد کے لئے زکوٰۃ سے زیادہ دینا کسی پر فرض نہیں۔ہاں اگر کوئی زیادہ دے تو یہ اس کی نیکی ہے۔

دراصل اس آیت میں تین قسم کے لوگوں کے لئے تین مختلف احکام دیئے گئے ہیں۔اور یہ تینوں احکام عفو کے لفظ کے اندر شامل ہیں۔پہلا حکم جو ادنیٰ درجہ کا ایمان رکھنے والوں کے لئے ہے وہ تو یہ ہے کہ تم اس قدر خرچ کرو کہ بعد میں تمہارے ایمان میں کوئی تزلزل واقع نہ ہو اور تمہارے دین اور ایمان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ہم نے دیکھا ہے بعض لوگ جوش میں آکر بہت سا روپیہ دینی ضروریات کے لئے صرف کر دیتے ہیں لیکن بعد میں جب انہیں مالی مشکلات محسوس ہوتی ہیں تو اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت دی ہے

کہ جس نے کل اپنے ایمان سے ہاتھ دھونا ہے اسے چاہیے کہ وہ آج ہی اپنا ہاتھ اتنا نہ پھیلائے کہ بعد میں یہ انفاق اس کے لئے ٹھوکر کا موجب بن جائے۔

دوسرا حکم ان سے اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو یہ دیا کہ تمہارا جو اچھے سے اچھا مال ہے اسے تم خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور (۳) جو لوگ اس سے بھی اوپر درجہ کے ہیں انہیں یہ حکم دیا کہ وہ بغیر کسی کے سوال کے خود ہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال دے دیا کریں۔ گویا ان سے کسی کو مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آنی چاہیے بلکہ انہیں خود بخود مذہبی اور قومی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور ہمیشہ اس کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے رہنا چاہیے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ كَذٰلِكَ میں ک واحد کی علامت آیا ہے حالانکہ لَكُمْ بتاتا ہے کہ مخاطب بہت سے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی جگہ قرآن کریم میں واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور مراد جمع ہوتی ہے۔ ابوحیان کہتے ہیں وَهِيَ لُغَةُ الْعَرَبِ يُخَاطِبُوْنَ الْجَمْعَ بِخِطَابِ الْوَاحِدِ (بحر محیط زیر آیت ھذا) یعنی یہ اہل عرب کا محاورہ ہے کہ وہ بعض دفعہ جمع کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں قَدْ كَثُرَ الدِّرْهَمُ وَالدِّيْنَارُ۔ اسی طرح کہتے ہیں فَقُلْنَا اَسْلِمُوْا اِنَّا اَخُوْكُمْ ہم نے کہا تم مسلمان ہو جاؤ ہم تمہارے بھائی ہیں۔ یعنی اِخْوَانُكُمْ کہنے کی بجائے اَخُوْكُمْ کہہ دیا گیا۔ اسی طرح کہتے ہیں كُلُوْا فِيْ نِصْفِ بَطْنِكُمْ تَعِيْشُوْا تم نصف بھوک رکھ کر کھاؤ۔ تم زندہ رہو گے۔

(الصاحبی لاحمدبن فارس باب الواحدیرادبہ الجمع)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ شرعی احکام کا چونکہ ایک اثر دنیوی زندگی پر پڑتا ہے اور ایک اخروی زندگی پر۔ اس لئے ہم اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ تم ان پر غور کر سکو۔ اور تم جو بھی قدم اٹھاؤ علیٰ وجہ البصیرت اٹھاؤ۔ اندھا دھند کسی بات کو نہ مانو۔

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کا اشارہ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کی طرف بھی ہو سکتا ہے کہ بے شک شراب اور جُوئے میں بعض قسم کے فوائد بھی ہیں مگر ان میں ضرر زیادہ ہیں۔ دنیوی نقطہ نگاہ سے بھی اور دینی نقطہ نگاہ سے بھی۔ اسی طرح دوسرے احکام بھی تمہارے فائدہ کے لئے دیئے گئے ہیں۔ پس تمہارا کام ہے کہ تم غور و فکر سے کام لے کر وہ راہ اختیار کرو جو دینی اور دنیوی دونوں رنگ میں تمہیں کامیابی کی منزل کی طرف لے جانے والی ہو۔

فِي الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡيَتٰمٰى ؕ قُلۡ

اس جہان کے بارے میں (بھی) اور آخرت کے بارے میں بھی۔ اور یہ (لوگ) تجھ سے یتامیٰ کے بارے میں (بھی)

اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَيۡرٌ ؕ وَ اِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ

پوچھتے ہیں۔ تو کہہ دے (کہ) ان کی اصلاح بہت اچھا کام ہے۔ اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو تو (اس میں کوئی

يَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعۡنَتَكُمۡ ؕ

حرج نہیں کیونکہ) وہ تمہارے بھائی ہی ہیں اور اللہ فساد کرنے والے کو اصلاح کرنے والے کے مقابلہ میں خوب

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۱﴾

جانتا ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔ اللہ یقیناً غالب (اور) حکمت والا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَعۡنَتَ کے معنے ہیں وہ کام سپرد کرنا جس کی طاقت اور برداشت نہ ہو۔ کہتے ہیں اَعۡنَتَ الرَّاکِبُ الدَّآبَّۃَ اَیۡ حَمَلَھَا مَالَا تَحۡتَمِلُہٗ (اقرب) سوار نے سواری وغیرہ کو ایسے کام پر لگایا جس کی اسے طاقت نہ تھی۔

تفسیر۔ فرماتا ہے لوگ تجھ سے یتامیٰ کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ تو ان سے کہہ دے کہ ان کی اصلاح اور ترقی کو مدنظر رکھنا بڑا اچھا کام ہے اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ آخر وہ تمہارے بھائی ہیں اور بھائیوں کے ساتھ مل کر رہنا بڑی اچھی بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والے کو اصلاح کرنے والے کے مقابلہ میں خوب جانتا ہے۔

یتامیٰ کے متعلق آج دنیا میں بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ یا تو ان پر حد سے زیادہ سختی کی جاتی ہے اور یا پھر حد سے زیادہ پیار کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ بگڑ جاتے ہیں حالانکہ نہ ان پر زیادہ سختی کرنی چاہیے اور نہ اتنا پیار کرنا چاہیے کہ خواہ وہ کچھ کریں یہ کہہ دیا جائے کہ اسے کچھ نہیں کہنا اس کا باپ مرا ہوا ہے۔ عام طور پر لوگ ان کو لاوارث پا کر یا تو حد سے زیادہ سختی کرتے ہیں یا پھر حد سے زیادہ نرمی۔ لوگ جھوٹے رحم سے کام لے کر انہیں کچھ نہیں کہتے اور اس طرح وہ بچے جو یتیم رہ جاتے ہیں بگڑ جاتے اور ان کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ تم ہر بات میں ان کی

اصلاح کو مدنظر رکھو اور درمیانی راہ اختیار کرو۔ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ یتامیٰ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو ان کی طرف توجہ نہیں کرتے انہیں یہ تو سوچنا چاہیے کہ کیا یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ خود مرجائیں اور اپنے بچوں کو یتیم چھوڑ جائیں؟ (النساء:۱۰) اس رنگ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یتامیٰ کی پرورش اور ان کی نگہداشت ایک اہم ترین فرض ہے لوگ اگر مرنے سے ڈرتے ہیں تو محض اس وجہ سے کہ وہ دیکھتے ہیں فلاں شخص مرگیا اور اس کے بچے در بدر بھیک مانگتے پھر رہے ہیں یا ان بچوں کو کسی نے ملازم رکھ لیا ہے تو وہ بات بات پر ان کو بوٹ سے ٹھوکریں مارتا اور ان کے مونہہ پر تھپڑ رسید کرتا ہے وہ روتے ہیں چیختے ہیں چلاتے ہیں مگر ان کی آہ وزاری اس کے دل پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ یہ حالات دیکھ کر وہ بھی موت سے گھبراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر میں مرگیا تو میرے بچوں کے ساتھ بھی لوگ ایسا ہی سلوک کریں گے۔ لیکن اگر قومی کیریکٹر ایسا اعلیٰ درجہ کا بن جائے کہ جب کوئی شخص مرے تو اس کے بچوں کے متعلق ساری قوم میں ایک زبردست جذبہ اخوت پیدا ہو جائے اور ہر شخص کہے کہ ان بچوں کو میرے سپرد کیا جائے میں اپنے بچوں کی طرح ان کی پرورش کروں گا تو موت کا ڈر ہر شخص کے دل سے نکل جائے اور وہ سمجھنے لگ جائے کہ اگر میں مرگیا تب بھی میری قوم کے افراد ایسے اچھے ہیں کہ وہ میرے بچوں کی میری طرح ہی خبر گیری کریں گے اور انہیں تھپڑوں اور بوٹ کی ٹھوکروں کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔ پس یتامیٰ کی خبر گیری اور بیواؤں سے حسنِ سلوک یہ دو ایسی چیزیں ہیں جو قوم میں جرأت اور بہادری پیدا کر دیتی ہیں۔ اگر یہ چیز قوم میں موجود نہ ہو بلکہ اس کے برعکس اس کے افراد کا نمونہ یہ ہو کہ وہ یتامیٰ تو رکھتے ہوں مگر ملازم بنا کر بلکہ ملازموں سے بھی بدتر حالت میں اور وہ ذرا ذرا سی بات پر ان کو تھپڑ مارنے کے لئے تیار ہو جاتے ہوں تو کون شخص ہے جس کا مرنے کو دل چاہے گا؟ ہر شخص ڈرے گا ہر شخص موت سے گھبرائے گا اور سمجھے گا کہ میری موت میرے بچوں کی موت ہے۔ میری موت میری بیوی کی موت ہے۔ میں مروں تو کس طرح اور جان دوں تو کیوں؟ پس ضروری ہے کہ ساری قوم کا یہ کیریکٹر بن جائے کہ جب کوئی شخص فوت ہو تو یہ سوال نہ ہو کہ کون اس کے بچوں کی پرورش کرے گا بلکہ لوگ خود دوڑتے ہوئے جائیں اور ان بچوں کو اپنے سینہ سے لگاتے ہوئے اپنے گھروں میں لے آئیں اور اپنے بچوں کی طرح بلکہ اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر ان سے محبت اور پیار اور نرمی اور شفقت کا سلوک کریں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا واقعہ ہے ایک بچہ یتیم رہ گیا تو بعض صحابہؓ میں آپس میں لڑائی شروع ہوگئی ایک کہتا میں اس کی پرورش کروں گا۔ دوسرا کہتا ہے میں اس کی پرورش کروں گا۔ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ معاملہ پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ بچہ سامنے کرو اور وہ جس کو پسند کرے اس کے سپرد کر دو۔ مگر آج یہ

حالت ہے کہ اگر کوئی شخص مرنے لگتا ہے تو اسے اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں میں سب سے بڑا فکر اور اضطراب یہی ہوتا ہے کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔ کون ان کی پرورش کرے گا۔ کون ان کی نگہداشت کرے گا کون ان کی طرف محبت اور پیار کی نگاہ سے دیکھے گا؟؟ اور جب وہ شخص مر جاتا ہے اور اس کے بچوں کی پرورش کا سوال سامنے آتا ہے تو ایک شخص کہتا ہے میرا دل تو چاہتا ہے کہ بچہ لے لوں مگر کیا کروں مجھ پر بوجھ بڑا ہے۔ دوسرا کہتا ہے منشاء تو میرا بھی یہی تھا مگر مشکلات بہت ہیں۔ تیسرا کہتا ہے میں بھی یہ ثواب حاصل کرنا چاہتا تھا مگر بہت مجبوری ہے۔ اس طرح ایک ایک کر کے ہر شخص اس بوجھ سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن صحابہؓ میں یہ بات نہیں تھی وہ بھاگتے نہیں تھے بلکہ خوشی سے اس ثواب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب کسی قوم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ یتامیٰ و مساکین کی خبر گیری کرنے لگ جائے ان کا احترام افرادِ قوم کے دلوں میں پیدا ہو جائے۔ ان کی پرورش میں انہیں سکون اور راحت حاصل ہو اور وہ یتیموں کو ایسا ہی سمجھیں جیسے ان کے اپنے بچے ہیں تو اس وقت ایمان کے بغیر بھی وہ قوم بہادر بن جاتی ہے اور جب اس کے ساتھ کسی کو حیات بعد الموت پر ایمان بھی ہو اور زندہ خدا پر توکل ہو تو پھر تو یہ دو چیزیں مل کر اس کے دل کو ایسا مضبوط بنا دیتی ہیں کہ موت کا ڈر اس کے قریب بھی نہیں آتا۔ یوروپین قوموں میں اگر ہمیں دلیری نظر آتی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نوجوانوں کے اندر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ اگر ہم مر گئے تو ہماری قوم یتامیٰ و بیوگان کی خبر گیری کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مرنے والا موت کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا وہ جاتا ہے اور اپنی جان کو قربان کر دیتا ہے۔ ایمان اور چیز ہے وہ زیادہ تر انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے نبی پر تازہ بتازہ ایمان لانا نصیب ہو مگر قومی کیریکٹر کی اس رنگ میں مضبوطی ایمان کے بغیر بھی افرادِ قوم کو بہادر اور نڈر بنا دیا کرتی ہے۔

وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۔ فرمایا اگر تم انہیں اپنے ساتھ ملا لو یعنی کھانے پینے تجارت اور دوسرے کام کاج میں ان کو اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں۔ تم ایسا کر سکتے ہو۔ مگر بھائی کہہ کر ذمہ داریاں بھی بتا دیں کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ ہونا چاہیے جو ایک بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کرتا ہے۔ بڑا بھائی جس کے سپرد چھوٹے بھائیوں کی نگرانی ہوتی ہے وہ اسی طرح کرتا ہے کہ ان کے مال کی حفاظت کرتا ہے۔ انہیں کھلاتا پلاتا ہے اور بڑے ہونے پر ان کا مال ان کو دے دیتا ہے اسی طرح یتامیٰ کو بھائی کہہ کر توجہ دلائی کہ چھوٹے بھائیوں سے لینے کی امید نہ رکھو بلکہ انہیں اپنے پاس سے بھی کچھ دینا چاہیے۔ اور ان کے ساتھ وہی معاملہ ہونا چاہیے جو بھائیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ اگر تم مصلح بن کر فساد کی بنیاد ڈالو گے اور یتامیٰ

کے ساتھ ناروا سلوک کر کے انہیں دکھ پہنچاؤ گے یا ناواجب پیار کر کے انہیں خراب کرو گے تو دونوں صورتوں میں خدا تعالیٰ کے سامنے تم جواب دہ ہو گے۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایسا حکم دے دیتا جس کے نتیجہ میں تمہیں تکلیف ہوتی یعنی وہ کہہ دیتا کہ یتامیٰ کا مال بھی الگ رکھو اور ان کا خرچ بھی برداشت کرو۔ لیکن اس نے رحم سے کام لیا اور تمہاری سہولت کو اس نے مدنظر رکھا اس سہولت کا یہ نتیجہ نہیں نکلنا چاہیے کہ تم یتامیٰ کی تربیت کا خیال نہ رکھو یا ان کے اموال کو غصب کرنے کی کوشش کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ اس میں عزیز اور حکیم کی صفات کا ذکر کر کے پھر دو امور کی طرف توجہ دلائی ایک طرف تو اس امر کی طرف کہ یتیم میں طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے حقوق دوسروں سے لے سکے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ عَزِيْز نہیں تو خدا تعالیٰ تو عزیز اور غالب ہے جس طرح تم یتیم پر غالب ہو تمہارے اوپر بھی کوئی غالب ہستی ہے۔ اگر تم اس کے حقوق کو تلف کرو گے یا ناجائز سختی اور دباؤ سے کام لو گے یا اس کا مال کھاؤ گے تو خدا تعالیٰ تمہیں پکڑے گا پھر فرمایا تھا کہ یتیم سے نرمی کرو اور اس کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا لو۔ اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے تمہیں بھی حکمت سے کام لینا چاہیے اور جس بات میں فائدہ ہو وہی اختیار کرنی چاہیے۔

ترتیب و ربط اوپر کی آیات کے ساتھ ان آیات کا ربط یہ ہے کہ جنگ کے احکام کے سلسلہ میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس کے نتیجہ میں بہت لوگ شہید ہو جائیں گے اور ان کے بچے یتیم رہ جائیں گے ایسی صورت میں ان سے کیا سلوک کیا جائے؟ اللہ تعالیٰ نے زیر تفسیر آیات میں اس سوال کا جواب دے دیا اور اس طرح تمام مضمون ایک لڑی میں پرو دیا۔ درحقیقت قرآنی مضامین کی ترتیب عام کتب کی ترتیب کے مطابق نہیں بلکہ طبعی ترتیب ہے وہ اپنے مضامین میں جو ترتیب رکھتا ہے وہ اس ترتیب سے علیحدہ ہے جو انسان اپنی کتابوں میں رکھتے ہیں۔ قرآن کریم اس چیز کو جو سب سے پہلے بیان ہونی ضروری ہو بیان کرتا ہے اور پھر اس کے متعلق انسانی قلب میں پیدا ہونے والے تمام وساوس اور شبہات کا ازالہ کرتا ہے۔ مثلاً جنگ ہے اس کے متعلق جو سوال پیدا ہوں گے ان کو بیان کرے گا پھر ان سے جو سوال پیدا ہوگا اس کا ذکر کرے گا اور اس میں جن امور کی طرف انسانی ذہن منتقل ہوگا وہ بیان کرتا چلا جائے گا اور چونکہ ایسے سوالات طبعی ہوتے ہیں اس لئے ان کے جوابات کا قلوب پر خاص اثر پڑتا ہے اسی طبعی ترتیب سے اس جگہ بھی کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ جنگ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کا ذکر کر دیا جو جنگ سے براہ راست تعلق رکھنے والی چیزیں تھیں اور جب جُوئے سے اخراجات جنگ پورے

کرنے کے طریق سے روک دیا تو طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ پھر یہ اخراجات کس طرح پورے ہوں گے اس کے لئے بتایا کہ ضروریات زندگی پوری کرنے کے بعد جو رقم بچ رہے۔ وہ خرچ کرنی چاہیے پھر ایک ہی لفظ عفو استعمال کر کے اس میں مختلف مدارج کا ذکر کر کے بتایا کہ ادنیٰ درجہ کونسا ہے اور اعلیٰ درجہ کونسا؟ اس کے بعد یتامیٰ کے حقوق کو لے لیا۔ کیونکہ جنگ کے بعد لازماً اس سوال نے اہمیت اختیار کر لینی تھی۔ غرض قرآن کریم کا یہ کمال ہے کہ اس نے اپنے مضامین میں ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی ترتیب رکھی ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے ادھر ایک سوال فطرت انسانی میں پیدا ہوتا ہے اور ادھر قرآن کریم میں اس کا جواب موجود ہوتا ہے۔

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ

اور تم مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں نکاح نہ کرو۔ اور ایک مومن لونڈی

خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا

ایک مشرک عورت سے خواہ وہ تمہیں (کتنی ہی) پسند ہو یقیناً بہتر ہے۔ اور مشرکوں سے جب

الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ

تک وہ ایمان نہ لے آئیں (مسلمان عورتیں) مت بیاہو۔ اور ایک مومن غلام ایک

مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ

مشرک (آزاد) سے (بھی) خواہ وہ تمہیں (کتنا ہی) پسند ہو یقیناً بہتر ہے۔ یہ لوگ (تو) آگ کی طرف بلاتے

اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ

ہیں۔ اور اللہ (تعالیٰ) اپنے حکم کے ذریعہ سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ اور لوگوں کے لئے اپنی

اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ؑ ۲۲۲ ع ۲۷ ۱۱

(معرفت کی) علامات کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

حل لغات۔ لَا تَنْكِحُوا نَكَحَ يَنْكِحُ سے جمع مخاطب نہی کا صیغہ ہے اور نَكَحَ الْمَرْأَةَ کے معنے ہیں

تَزَوَّجَهَا اس نے عورت سے شادی کر لی۔(اقرب)

تفسیر۔فرماتا ہے۔مشرک عورتوں سے اُس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجائیں۔ یعنی اگر جنگ میں مشرک عورتیں آئیں توتم اُن سے نکاح نہ کرو۔ہاں !اگر وہ ایمان لے آئیں تو پھر بے شک اُن سے نکاح کر سکتے ہو۔یہ حکم بھی جنگ کے احکام کے سلسلہ میں ہی دیا گیا ہے کیونکہ ایام جنگ میں مسلمان اپنے گھروں سے بہت دور ہوتے ہیں۔اور ہوسکتا ہے کہ اُن میں سے کسی کو مشرکہ عورت سے شادی کرنے کا خیال آجائے۔

وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ میں مومن لونڈی کو حُرّہ مشرکہ سے اچھا ٹھہرایا ہے۔کیونکہ مومنہ کا تو صرف جسم ہی غلامی میں ہوتا ہے مگر حُرّہ مشرکہ کی رُوح شیطان کی غلامی میں ہوتی ہے۔اور جسم کی غلامی رُوح کی غلامی کے مُقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔اِسی طرح حکم دیا کہ مومن عورتیں مشرکوں کے نکاح میں نہ دو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔

پھر فرماتا ہے کہ ہم نے یہ حکم اس لئے دیا ہے کہ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں۔یعنی جب مشرکہ عورت مسلمان کے گھر میں آئے گی یا مُسلمان عورت مشرک سے بیاہی جائے گی تو چونکہ میاں بیوی کے تعلقات کا ایک دوسرے پر گہرا اثر ہوتا ہے اس لئے اُن کے یہ تعلقات انہیں دین سے منحرف کرنے والے ثابت ہوں گے۔پس مشرک عورتوں یا مردوں سے تعلقات پیدا نہ کرو ورنہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تمہیں خدائے واحد سے منحرف کرنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح تمہیں جہنّم کی طرف لے جائیں گے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہیں جنّت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔جنّت وہ جگہ ہے جہاں دلوں میں سے ہر قسم کا کینہ نکل جائے گا۔مگر مشرک مرد اور مومن عورت یا مشرک عورت اور مومن مرد کبھی ایک نکتہ پر متحد نہیں ہو سکتے کیونکہ توحید اور شرک دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔اور جب ان میں مذہبی عقائد اور تمدّن اور تہذیب کے لحاظ سے اتحاد ہی نہیں ہوگا۔تو اُن کی اہلی زندگی خوشگوار کس طرح ہوسکتی ہے؟

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ شرعی اصطلاح میں مشرک سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جن کی کوئی شریعت نہ ہو۔ اہلِ کتاب اس حکم میں شامل نہیں ہیں۔

بِاِذْنِهٖ کا لفظ جو اس جگہ بڑھایا گیا ہے ہمیشہ ایسی صورت میں استعمال ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے اپنی طرف سے سامان پیدا کرے۔خواہ وہ سامان تقدیر عام کے ماتحت ہوں یا تقدیر خاص کے ماتحت۔مگر اس کے

یہ معنے نہیں کہ قانون قدرت کو توڑ کر خدا تعالیٰ کوئی کام کرتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے خاص حکم سے اس کام کو سرانجام دینے کے سامان مہیّا فرماتا ہے۔قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

آخر میں یُبَیِّنُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ ہم نے قانونِ نکاح تمہارے سامنے بیان کر دیا ہے۔اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم اِس قانون کو مدّنظر رکھو اور جنگ میں بھی جبکہ دشمن کی عداوت انسان کو نابینا کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے ماتحت چلنے کی کوشش کرو۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا

اور یہ لوگ تجھ سے حیض کے (ایام میں عورت کے پاس جانے کے) بارہ میں (بھی) سوال کرتے ہیں۔تو کہہ دے کہ

النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ ۙ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى یَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا

وہ ایک ضرر رساں (امر) ہے اس لئے تم عورتوں سے حیض (کے دنوں) میں علیحدہ رہو۔اور جب تک وہ پاک

تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

(وصاف) نہ ہولیں ان کے پاس نہ جاؤ۔پھر جب وہ نہا کر پاک ہو جائیں۔تو جدھر سے اللہ (تعالیٰ) نے تمہیں حکم

یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ۝۲۲۳

دیا ہے۔ان کے پاس آؤ۔اللہ ان سے جو اس کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں یقیناً محبت کرتا اور (ظاہری و باطنی) صفائی رکھنے والوں سے بھی یقیناً محبت کرتا ہے۔

حل لغات۔اَلْمَحِیْضُ اَلْحَیْضُ وَوَقْتُ الْحَیْضِ وَمَوْضِعُهٗ۔اَلْمَحِیْضُ کے معنے (۱) حیض (۲) ایام حیض اور (۳) حیض کی جگہ کے ہیں۔(مفردات)

اَذًی اَلْاَذٰی مَا یَصِلُ اِلَی الْحَیَوَانِ مِنَ الضَّرَرِ۔اَذٰی کے معنے ہر ایسے ضرر کے ہیں جو کسی ذی روح کو پہنچے۔وَ قَوْلُهٗ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ هُوَ اَذًی فَسُمِّیَ ذٰلِكَ اَذًی بِاِعْتِبَارِ الشَّرْعِ وَبِاِعْتِبَارِ الطِّبِّ عَلٰی حَسْبِ مَا یَذْكُرُهٗ اَصْحَابُ هٰذِهِ الصِّنَاعَةِ۔اور قرآن کریم کی آیت میں اسے اَذًی ایک تو شرعی

نقطہ نگاہ سے کہا گیا ہے۔ دوسرے طبّی لحاظ سے بھی اسے نقصان رساں قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ تمام اطبّاء اسے بیان کرتے چلے آئے ہیں۔(مفردات)

اِعْتِزَالٌ کے معنے ہیں ایک طرف ہوجانا۔

تَطَهَّرْنَ تَطَهَّرَتِ الْمَرْاَةُ کے معنے ہوتے ہیں اِغْتَسَلَتْ عورت نے غسل کیا۔(اقرب)

تفسیر۔ جب مرد و عورت کا نکاح کے ذریعہ تعلق قائم ہوجائے تو اس کے بعد جوں جوں ازدواجی ذمہ واریاں سامنے آتی ہیں انسانی قلب میں مختلف قسم کے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا حل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس جگہ اسی قسم کے ایک سوال کا ذکر کرتے ہوئے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ فرماتا ہے لوگ ایام حیض کے بارہ میں تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ آیا ان ایّام میں مخصوص تعلقات قائم کئے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ فرماتا ہے تو انہیں کہہ دے کہ حیض تو ایک نجاست ہے۔ پس تمہیں چاہیے کہ ان ایام میں جنسی تعلقات سے پرہیز رکھو اور اس وقت تک اس پر قائم رہو جب تک کہ وہ نہا دھو کر پاک صاف نہ ہوجائیں۔

اس جگہ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ کے یہ معنے نہیں کہ اِن اَیام میں عورتوں کو چھونا یا ہاتھ لگانا یا اُن کے پاس بیٹھنا بھی منع ہے۔ بلکہ اس سے صرف مخصوص تعلقات کی نفی کی گئی ہے ورنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایام حیض میں بھی اُن سے پیار کر لیتے اور انہیں اپنے پاس بٹھا لیا کرتے تھے(ترمذی کتاب الطهارۃ باب ما جاء فی مباشرۃ الحائض)۔ فقہاء میں اس امر کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے کہ خون حیض بند ہونے کے بعد مخصوص تعلقات قائم کئے جاسکتے ہیں یا نہانے کے بعد اور اس بارہ میں کچھ تو ایک طرف چلے گئے ہیں اور کچھ دوسری طرف۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ حیض بند ہوجانے کے بعد عورت کے پاس جانا تو جائز ہوجاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ نہانے دھونے کے بعد یہ تعلق قائم کیا جائے۔

تطہر کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب عورت ایّام حیض سے فارغ ہو تو مشک پانی میں حل کر کے اور اس سے روئی بھگو کر اندرونی اعضاء کی صفائی کر لیا کرے۔(بخاری کتاب الحیض باب غسل المحیض) اور طبّی طور پر ثابت ہے کہ ایسا کیا جائے تو عورت کی صحت اور آئندہ اولاد پر اس کا نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ میں حَيْثُ ظرفِ مکان ہے اور مراد یہ ہے کہ تم عورتوں کے پاس اس جگہ سے آؤ جس جگہ کے آنے کا اس نے حکم دیا ہوا ہے اور اس سے بھی معلوم ہوگیا کہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم دیا

ہوا ہے۔اور وہ یہی ہے جو فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (البقرۃ:۱۸۸) میں بیان کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اولاد حاصل کرنے کا جو طبعی طریق مقرر کر رکھا ہے اس کے مطابق عمل کرو اور اللہ تعالیٰ نے جو اولاد تمہارے لئے مقدر کر رکھی ہے اس کی جستجو کرو۔ گویا عورتوں سے تم ایسا ہی تعلق رکھو جس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہو۔کوئی غیر فطری طریق اختیار نہ کرو۔

يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ میں اللہ تعالیٰ نے ایک تو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر تم سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے فوراً بعد تمہارے دل میں اس گناہ پر ندامت پیدا ہونی چاہیے اور تمہیں اس سے توبہ کرنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے۔دوسرے توّاب اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو بار بار خدا تعالیٰ کی درگاہ میں جاتا اور اس سے دُعائیں کرتا رہے۔اِس لحاظ سے يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ کے یہ معنے ہیں کہ وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے تمام کام دعاؤں سے وابستہ ہیں اور قدم قدم پر وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور اس سے مدد طلب کرتے ہیں وہ بالآخر اللہ تعالےٰ کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔گویا گناہوں پر ندامت اور توبہ کا اظہار اور ہر مشکل گھڑی میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع یہ دو ذرائع ایسے ہیں جن سے خدا تعالیٰ کی محبت کا دروازہ انسان کے لئے کھل جاتا ہے۔اسی طرح يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ میں بھی دو امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ایک تو اس امر کی طرف کہ اللہ تعالیٰ صفائی رکھنے والوں سے محبت کرتا ہے۔درحقیقت نظافت پسندی انسانی تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے جسم کو صاف رکھنا۔منہ کو صاف رکھنا۔کپڑوں کو صاف رکھنا۔اور ایسی اشیاء کا استعمال کرنا جو ناک کی قوت کو صدمہ پہنچانے والی نہ ہوں بلکہ اس کے لئے موجب راحت ہوں۔اس تقاضا کو لوگوں نے غلطی سے نیکی اور تقویٰ کی اعلیٰ راہوں پر چلنے والوں کے طریق کے خلاف سمجھ لیا تھا اور ایک ایسی راہ اختیار کر لی تھی جس کے نتیجہ میں یا تو خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ طیّب اشیاء بیکار ہو کر رہ جائیں یا خدا تعالیٰ کے بندے ان طیّب اشیاء کو استعمال کر کے گنہگار قرار پائیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس بناوٹی نیکی اور جھوٹے تقویٰ کی چادر کو بھی چاک کر دیا اور حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔چنانچہ آپ اکثر غسل فرماتے۔پھر کئی امور کے ساتھ غسل آپ نے واجب قرار دے دیا (ابو داؤد کتاب الطہارۃ باب فی الغسل للجمعۃ) چونکہ انسان اپنے گھر کے اشغال کی وجہ سے صفائی میں سُستی کر بیٹھتا ہے اس لئے آپؐ نے خدا تعالیٰ کے حکم سے میاں بیوی کے تعلقات کے ساتھ غسل کو واجب قرار دے دیا (ترمذی کتاب الطہارۃ باب ما جاء اذا التقی الختانان وجب الغسل)۔اِسی طرح پانچوں نمازوں سے پہلے آپ ان اعضاء کو دھوتے جو عام طور پر گردوغبار کا محل بنتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس امر پر

عمل پیرا ہونے کا حکم دیتے (ترمذی کتاب الطہارۃ باب الوضوء لکل صلوٰۃ)۔ کپڑوں کی صفائی کو آپ پسند فرماتے۔ جمعہ کے دن دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر آنے کا حکم دیتے اور خوشبو کو خود بھی پسند فرماتے اور اجتماع کے مواقع کے لئے بھی خوشبو لگانا پسند فرماتے۔ جہاں اجتماع ہونا ہو چونکہ وہاں مختلف قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور متعدی بیماریوں کے پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے آپ وہاں خوشبودار مصالحہ جات جلانے اور ان جگہوں کو صاف رکھنے کا حکم دیتے (مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ باب التنظیف و التکبیر)۔ بدبودار اشیاء سے پرہیز فرماتے اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے کہ بدبودار اشیاء کھا کر اجتماع کی جگہوں میں آئیں (ترمذی ابواب الاطعمۃ باب ما جاء فی کراھیۃ اکل الثوم و البصل)۔ غرض جسم کی صفائی۔ لباس کی پاکیزگی۔ اور ناک کے احساس کا آپ پورا خیال رکھتے۔ اور دوسروں کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم دیتے۔ ہاں یہ ضرور فرماتے کہ جسم کی صفائی میں اس قدر منہمک نہ ہو جاؤ کہ رُوح کی صفائی کا خیال ہی نہ رہے۔ اور لباس کی پاکیزگی کا اس قدر خیال نہ رکھو کہ ملک و ملّت کی خدمت سے محروم ہو جاؤ اور غریب لوگوں کی صحبت سے احتراز کرنے لگو۔ اور کھانے میں اس قدر احتیاط نہ کرو کہ ضروری غذائیں ترک ہو جائیں۔ ہاں یہ خیال رکھو کہ اہلِ مجلس کو تکلیف نہ ہو تا کہ اچھے شہری بنو۔ اور لوگ تمہاری صحبت کو ناگوار نہ سمجھیں بلکہ اسے پسند کریں اور اس کی جستجو کریں۔ غرض لوگوں نے تو کہا کہ صفائی اور خوشبو سے بچو کہ وہ جسم کو پاک مگر دل کو ناپاک کرتی ہے لیکن اسلام نے کہا یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ خدا تعالیٰ ظاہری اور باطنی صفائی رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے گویا اسلام نے اپنے اس اعلان سے عیسائیوں اور ہندوؤں کے ان تمام فرقوں کا رد کر دیا جن میں بزرگانِ دین کے لئے پاک وصاف رہنا اور خوشبو کا استعمال بالکل حرام سمجھا جاتا تھا اور جن میں گندے اور بدبودار لباس کا استعمال اور ناخن نہ کٹوانا اور جسم کی میل نہ اتارنا بزرگی کی ایک بہت بڑی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اسلام نے اس نظریہ کو باطل قرار دیتے ہوئے بتایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف بار بار رجوع کرنے والے بھی ہوں اور اُن کا جسم اور لباس بھی صاف ستھرا ہو اور وہ ہر قسم کی غلاظت سے دور رہنے والے ہوں۔ ان معنوں کے لحاظ سے یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ خدا تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ جب عورتیں غسل کر لیں تب اُن کے ساتھ صحبت کی جائے اس سے پہلے ان کے پاس جانا یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ کے خلاف ہے۔

مُتَطَهِّرٌ کے دوسرے معنے تکلّف کے ساتھ پاکیزگی اختیار کرنے والے کے ہیں۔ اس لحاظ سے یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے ہم جنس بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کی جو صفات قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں تم اُن کی نقل کرنے کی کوشش کرو۔ تم حَیّ

نہیں بن سکتے لیکن تم بیمار کا علاج کر کے حیّ کی نقل تو کر سکتے ہو۔ تم مُمِیْت نہیں بن سکتے لیکن تم بدی کا خاتمہ کر کے ممیت کی نقل تو کر سکتے ہو تم خالق نہیں بن سکتے لیکن تم اچھی اولاد پیدا کر کے خالق کی نقل تو کر سکتے ہو۔ پس فرمایا اگر تم میری محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو تم میری نقل کرنا شروع کر دو اور میری صفات کو اپنے اندر پیدا کرو اس کے نتیجہ میں تم سے محبت کرنے لگ جاؤں گا۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ

تمہاری بیویاں تمہارے لئے (ایک قسم کی) کھیتی ہیں۔ اس لئے تم جس طرح چاہو اپنی کھیتی کے پاس آؤ۔

قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ

اور اپنے لئے (کچھ) آگے بھیجو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ تم اس کے روبرو ہونے والے ہو۔

بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۴﴾

اور تو مومنوں کو (اس دن کے بارے میں) خوشخبری دے۔

حلّ لُغات۔ اَنّٰی کے معنے اَیْنَ، مِنْ اَیْنَ اور کَیْفَ کے ہیں۔ یعنی ''جہاں''۔ ''جہاں سے''۔ ''جب'' اور ''جس طرح'' (اقرب)

تفسیر۔ اِس آیت میں عورت کو کھیتی قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ (۱) تم اپنی کھیتی کو پھل دار بنانے کی کوشش کرو۔ اِسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی اشارہ فرماتی ہے کہ تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ فَاِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ (ابو داؤد کتاب النکاح باب النھی عن تزویج من لم یلد من النساء و نسائی کتاب النکاح باب کراھیۃ التزویج العقیم) یعنی تم ایسی عورتوں کے ساتھ شادی کیا کرو جو زیادہ اولاد پیدا کرنے والی اور اپنے خاوندوں کے ساتھ محبت کرنے والی ہوں۔ کیونکہ میں دوسرے نبیوں کی اُمتوں کے مقابل پر اپنی امّت کی کثرت پر قیامت کے دن فخر کروں گا۔

(۲) عورتوں سے ایسا سلوک کرو کہ نہ اُن کی طاقت ضائع ہو۔ اور نہ تمہاری۔ اگر کھیتی میں بیج زیادہ ڈال دیا جائے تو بیج خراب ہو جاتا ہے۔ اور اگر کھیتی سے پے در پے کام لیا جائے تو کھیتی خراب ہو جاتی ہے۔ پس ہر کام ایک حد

کے اندر کرو۔ جس طرح عقلمند انسان سوچ سمجھ کر کھیتی سے کام لیتا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی نکل آیا کہ بعض حالات میں برتھ کنٹرول بھی جائز ہے۔ چنانچہ کھیتی میں سے اگر ایک فصل کاٹ کر معاً دوسری بو دی جائے تو دوسری فصل اچھی نہیں ہوتی۔ اور تیسری اس سے بھی زیادہ خراب ہوتی ہے۔ اسلام نے اولاد پیدا کرنے سے روکا نہیں بلکہ خود فرمایا ہے کہ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ تم اپنی عورتوں کے پاس اِس لئے جاؤ کہ آگے نسل چلے اور تمہاری یادگار قائم رہے لیکن ساتھ ہی بتادیا کہ کھیتی کے متعلق خدا تعالیٰ کے جس قانون کی تم پابندی کرتے ہو اسی کو اولاد پیدا کرنے میں بھی مدّنظر رکھو۔ اگر عورت کی صحت مخدوش ہو یا بچہ کی پرورش اچھی طرح نہ ہوتی ہو تو اس وقت اولاد پیدا کرنے کے فعل کو روک دو۔

(۳) یہ بھی بتایا کہ عورت سے ایسا تعلق رکھو جس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہو۔ اس سے خلافِ وضع فطرت فعل کی ممانعت نکل آئی۔ چونکہ قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اس لئے وہ بات کو اُسی حد تک ننگا کرتا ہے جس حد تک اخلاق کو کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو۔ لوگ اَنّٰى شِئْتُمْ سے غلط استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ کہہ کر تو خدا تعالیٰ نے ڈرایا ہے کہ یہ تمہاری کھیتی ہے اب جس طرح چاہو سلوک کرو۔ لیکن یہ نصیحت یاد رکھو کہ اپنے لئے بھلائی کا سامان ہی پیدا کرنا۔ ورنہ اس کا خمیازہ بھگتو گے۔ لوگ جب اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے ہیں تو لڑکے والوں سے عموماً کہا کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی بیٹی تمہیں دے دی ہے۔ اب جیسا چاہو اِس سے سلوک کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ تم بے شک اِسے جوتیاں مارا کرو۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تمہاری چیز ہے اسے سنبھال کر رکھنا۔ پس اَنّٰى شِئْتُمْ کا مطلب یہ ہے کہ عورت تمہاری چیز ہے اگر خراب سلوک کرو گے تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے بھی برا ہو گا اور اگر اچھا سلوک کرو گے تو اچھا ہو گا۔ مگر لوگوں نے بیوقوفی سے اَنّٰى شِئْتُمْ کا یہ مطلب لے لیا کہ ''اَنھے واہ'' یعنی اندھا دھند کرو۔ آریوں نے خصوصیت سے اس آیت پر اعتراض کیا ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کے تعلقات کے بارہ میں اپنے متبعین کو غیر فطری طریق اختیار کرنے کی اجازت دی ہے (ستیارتھ پرکاش مترجم باب ۱۴ اعتراض ۳۸ زیر آیت ھٰذا) حالانکہ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اَنّٰى شِئْتُمْ کے یہ معنے نہیں کہ اب خلاف وضع فطری فعل بھی تمہارے لئے جائز ہو گیا ہے۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب تمہاری بیویاں تمہارے لئے کھیتی کی حیثیت رکھتی ہیں تو اب تمہارا اختیار ہے کہ تم جس طرح چاہو اُن سے سلوک کرو۔ یعنی چاہو تو اپنی کھیتی کو تباہ کر لو اور چاہو تو اس سے ایسے فوائد حاصل کرو جن سے دنیا میں بھی تم نیک نامی حاصل کرو اور آخرت میں بھی اپنی روح کو خوش کر سکو۔

دنیا میں کوئی احمق زمیندار ہی ہو گا جو ناقص بیج استعمال کرے یا بیج ڈالنے کے بعد کھیتی کی نگرانی نہ کرے۔ اور اچھی فصل حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے مگر عورتوں کے معاملہ میں بالعموم اس اصول کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور

نہ تو جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے بیج کی صحیح طور پر حفاظت کی جاتی ہے نہ عورت کی صحت اور اُس کی ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ بچوں کی صحیح رنگ میں تربیت کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مردوں کی صحت کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور عورت کی صحت بھی برباد ہو جاتی ہے اور بچے بھی قوم کا مفید وجود ثابت نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بنی نوع انسان کو اِسی اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ جس طرح تم اپنی کھیتی کی حفاظت کرتے ہو اور اعلیٰ درجہ کی فصل پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہو اسی طرح تمہارا فرض ہے کہ تم عورت کی بھی حفاظت کرو اور آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص طور پر توجہ دو تا کہ تمہاری کھیتی سے ایسا روحانی غلہ پیدا ہو جو دنیا کے کام آئے اور انہیں ایک نئی زندگی بخشے۔

وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ میں بتایا کہ تم وہ کام کرو جس کا آئندہ نتیجہ تمہارے لئے اچھا نکلے۔ یعنی طبّی لحاظ سے بھی اور نسلی لحاظ سے بھی۔ یہ حصّہ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کے مشابہ ہے اور مراد یہ ہے کہ آج کے بچے کل کے باپ بننے والے ہیں۔ اس لئے تم ایسی اولاد پیدا کرو جو تمہارے نام کو روشن کرنے والی ہو اور آخرت میں بھی تمہاری عزت اور نیک نامی کا موجب ہو۔

اسی طرح اس کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا بھی ایک کھیتی ہے جس سے آخرت میں کام آنے والا غلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے تمہیں چاہیے کہ اِس کھیتی کی طرف بھی اپنی نگاہ رکھو اور ایسے اعمال بجالاؤ کہ جس طرح ایک دانہ سے سات بالیں اور ہر بال میں سو سو دانہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح تمہارا ایک ایک عمل خدا تعالیٰ کے ہزاروں ہزار انعامات کو تمہاری طرف کھینچ لانے والا ہو۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا

اور تم نیک سلوک کرنے تقویٰ کرنے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے (کے معاملات) میں اللہ کو اپنی قسموں کا

وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

نشانہ نہ بناؤ۔ اور اللہ خوب سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

حل لغات۔ عُرْضَةً مَا يُجْعَلُ مَعْرَضًا لِلشَّيْءِ۔ عرضہ ایسی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کا نشانہ بنا لیا جائے۔ اسی طرح عُرضہ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جسے ضرورت کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا جائے۔ کہتے

ہیں اَلْبَعِیْرُ عُرْضَۃٌ لِلسَّفَرِ سفر پیش آئے تو اونٹ عُرضہ بن جاتا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ اُس کے ذریعہ سفر کی تکلیف کو دُور کیا جاتا ہے (مفردات) اِسی طرح عُرْضَۃٌ حِیْلَۃٌ فِی الْمُصَارَعَۃِ کُشتی کے داؤ پیچ کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

اَیْمَانٌ جمع ہے اس کا مفرد یَمِیْنٌ ہے اور یَمِیْنٌ کے معنے ہیں۔ (۱) دائیں جہت یا دایاں حصّہ جسم (۲) قسم (۳) برکت (۴) قوت (اقرب) اور محاورہ میں اس شے کو بھی کہتے ہیں جس کے بارہ میں قسم کھائی جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمٰن بن سمرۃؓ سے فرمایا اِذَا حَلَفْتَ عَلٰی یَمِیْنٍ فَرَأَیْتَ غَیْرَھَا خَیْرًا مِّنْھَا فَأْتِ الَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ وَ کَفِّرْ عَنْ یَمِیْنِکَ یعنی جب تو کسی چیز کے بارہ میں قسم کھائے (اس کے لئے آپؐ نے لفظ یَمِیْن استعمال فرمایا) اور اس کے بعد اُس سے اچھا کام تجھے سُوجھ جائے تو تُو وہ کام جو بہتر ہے اختیار کر اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے۔ (الکشاف)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ یعنی جس طرح ایک شخص نشانہ پر بار بار تیر مارتا ہے اسی طرح تم بار بار خدا تعالیٰ کی قسمیں نہ کھایا کرو۔ کہ ہم یوں کر دیں گے اور دوں کر دیں گے۔

اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ یہ ایک نیا اور الگ فقرہ ہے۔ جو مبتداء ہے خبر محذوف کا۔ اور خبر محذوف اَمْثَلُ وَ اَوْلٰی ہے۔ یعنی بِرُّکُمْ وَ تَقْوَاکُمْ وَ اِصْلَاحُکُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَمْثَلُ وَ اَوْلٰی اس کے معنے یہ ہیں کہ تمہارا نیکی اور تقویٰ اختیار کرنا اور اصلاح بین الناس کرنا زیادہ اچھا ہے۔ صرف قسمیں کھاتے رہنا کہ ہم ایسا کر دیں گے کوئی درست طریق نہیں۔ تمہیں چاہیے کہ قسمیں کھانے کی بجائے کام کر کے دکھاؤ۔ پہلے قسمیں کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ زجّاج جو مشہور نحوی اور ادیب گذرے ہیں انہوں نے یہی معنے کئے ہیں۔ (بحر محیط زیر آیت ھٰذا)۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو روک نہ بناؤ اُن چیزوں کے لئے جن پر تم قسم کھاتے ہو۔ یعنی بِرّ کرنا تقویٰ کرنا اور اصلاح بین الناس کرنا۔ اِس صورت میں یہ تینوں اَیْمَان کا عطفِ بیان ہیں اور اَیْمَان کے معنے قسموں کے نہیں بلکہ اُن چیزوں کے ہیں جن پر قسم کھائی جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے نیک کام کی قسم نہ کھا لیا کرو۔ تا کہ یہ کہہ سکو کہ کیا کروں چونکہ میں قسم کھا چکا ہوں۔ اس لئے نہیں کر سکتا۔ مثلاً کسی ضرورت مند نے روپیہ مانگا تو کہہ دیا کہ میں نے تو قسم کھالی ہے کہ آئندہ میں کسی کو قرض نہیں دوں گا۔ علّامہ ابو حیّان کہتے ہیں کہ اس فقرہ کو اَیْمَان کا عطفِ بیان بنانے کی بجائے بدل بنانا اچھا ہے۔ کیونکہ عطفِ بیان اکثر اَعْلَام (یعنی کسی چیز کا معیّن نام) ہوتے ہیں (بحر محیط زیر آیت ھٰذا)۔ بہرحال دونوں صورتوں میں اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر کوئی نیکی اور تقویٰ اور اصلاح بین الناس کے کام کے لئے تمہیں کہے تو تم یہ نہ کہو کہ میں نے تو قسم کھائی ہوئی ہے میں

یہ کام نہیں کر سکتا۔

تیسرے معنے یہ ہیں کہ اس ڈر سے کہ تمہیں نیکی کرنی پڑے گی خدا تعالیٰ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ اس صورت میں اَنْ تَبَرُّوْا مفعول لِاَجْلِہٖ ہے اور اس سے پہلے کَرَاھَۃً مقدّر ہے۔ اور مُراد یہ ہے کہ اگر اچھی باتیں نہ کرنے کی قسمیں کھاؤ گے تو ان خوبیوں سے محروم ہو جاؤ گے اس لئے نیکی، تقویٰ اور اصلاح بین الناس کی خاطر اس لغو طریق سے بچتے رہو۔ درحقیقت یہ سب معنے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ صرف عربی عبارت کی مشکل کو مختلف طریق سے حل کیا گیا ہے۔ جس بات پر سب مفسّرین متفق ہیں وہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نہ کرو کہ خدا تعالےٰ کو اپنی قسموں کا نشانہ بنالو۔ یعنی اُٹھے اور قسم کھالی۔ یہ ادب کے خلاف ہے اور جو شخص اس عادت میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات نیک کاموں کے بارہ میں بھی قسمیں کھالیتا ہے کہ میں ایسا نہیں کروں گا اور اس طرح یا تو بے ادبی کا اور یا نیکی سے محرومی کا شکار ہو جاتا ہے یا یہ کہ بعض اچھے کاموں کے متعلق قسمیں کھا کر خدا تعالیٰ کو ان کے لئے روک نہ بنالو۔ اِن معنوں کی صورت میں داؤ پیچ والے معنے خوب چسپاں ہوتے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ صدقہ و خیرات سے بچنے کے لئے چالیں چلتے ہیں اور داؤ کھیلتے ہیں اور بعض خدا تعالےٰ کی قسم کو جان بچانے کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ گویا دوسرے سے بچنے اور اُسے پچھاڑنے میں جو داؤ استعمال کئے جاتے ہیں اُن میں سے ایک خدا تعالیٰ کی قسم بھی ہوتی ہے۔ پس فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام کو ایسے ذلیل حیلوں کے طور پر استعمال نہ کیا کرو۔ میرے نزدیک سب سے اچھی تشریح علاّمہ ابوحیان کی ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے احسان اور نیکی وغیرہ کے آگے روک بنا کر کھڑا نہ کر دیا کرو۔

وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ میں بتایا کہ اگر تمہیں نیکی اور تقویٰ اور اصلاح بین الناس کے کام میں مشکلات پیش آئیں تو خدا تعالیٰ سے ان کا دفعیہ چاہو اور ہمیشہ دُعاؤں سے کام لیتے رہو کیونکہ یہ کام دُعاؤں کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتے۔ اور پھر یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے۔ اگر تم اُس کی طرف جھکو گے تو وہ اپنے علم میں سے تمہیں علم عطا فرمائے گا اور نیکی اور تقویٰ کے بارہ میں تمہارا قدم صرف پہلی سیڑھی پر نہیں رہے گا بلکہ علمِ لدنّی سے بھی تمہیں حصّہ دیا جائے گا۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ

اللہ (تعالیٰ) تمہاری قسموں میں (سے) لغو (قسموں) پر تم سے مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ ہاں جو (گناہ)

يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

تمہارے دلوں نے (بالارادہ) کمایا اس پر تم سے مؤاخذہ کرے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا (اور) بردبار ہے۔

حل لغات۔ حَلِيْمٌ حِلْمٌ سے ہے اور اس کے معنے صبر کرنے والے کے بھی ہوتے ہیں اور اِسی طرح اِس کے معنے بُردبار کے بھی ہیں۔ یعنی جس میں طیش نہ ہو۔ یونہی جوش میں آ کر اندھا دھند کام نہ کرتا ہو۔ حِلْمٌ جہالت اور بیوقوفی کے مخالف معنے بھی دیتا ہے۔ اور علم اور سمجھ کے بھی نیز اس کے معنے عقل کے بھی ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لغو قسموں پر تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ اس جگہ لغو قسموں سے تین قسم کی قسمیں مراد ہیں۔ اوّل عادت کے طور پر قسمیں کھانا۔ یعنی ہر وقت وَاللّٰهِ۔ بِاللّٰهِ۔ ثُمَّ تَاللّٰهِ کہتے رہنا۔ دوم ایسی قسم جس کا کھانے والا یقین رکھتا ہو کہ وہ درست ہے لیکن اس کا یقین غلط ہو۔ مثلاً کسی شخص کے متعلق قسم کھانا کہ وہ وہاں ہے حالانکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے آنے کے بعد وہاں سے چلا گیا ہو۔ سوم ایسی قسم جو شدید غصہ کے وقت کھائی جائے۔ جب ہوش وحواس ٹھکانے نہ ہوں یا حرام شے کے استعمال یا فرض وواجب عمل کے ترک کے متعلق کسی وقتی جوش کے ماتحت قسمیں کھالینا۔ یہ سب قسمیں لغو ہیں اور ان کے توڑنے پر کوئی کفارہ نہیں۔ چونکہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قسموں سے روکا تھا اس لئے اب بتایا کہ مؤاخذہ صرف ایسی قسموں پر ہوگا جن کو لغو قرار نہ دیا جاسکے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ چونکہ مؤاخذہ نہیں ہوگا اِس لئے اب کسی احتیاط کی بھی ضرورت نہیں بیشک رات دن لغو قسمیں کھاتے رہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے متعلق یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (المؤمنون: ۴) مومن لغو باتوں سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ پس لغو قسمیں کھانے والا یقیناً مخطی یا گنہگار ہے اور اُسے اپنے گناہ پر توبہ اور ندامت کا اظہار کرنا چاہیے۔ ہاں اُن کے توڑنے پر کسی کفارہ کی ضرورت نہیں۔ اِسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے لَا يُؤَاخِذُكُمْ کے الفاظ بیان فرمائے ہیں۔ یعنی اگر وقتی جوش کے ماتحت ایسی قسم کھالی جائے تو گناہ نہ ہوگا ہاں اگر جان بوجھ کر کوئی شخص ایسی قسم کھائے تو اُسے یقیناً گناہ ہوگا۔

بعض لوگوں نے لَا يُؤَاخِذُ کے معنے لَا بَأْسَ بِهٖ یا لَا حَرَجَ فِيْ ذٰلِكَ کے کئے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

مگر یہ صحیح نہیں۔ یہاں پر ایک تو مؤاخذہ کی نفی کی ہے اور دوسرے لغو قسموں سے پرہیز کی تاکید کی ہے۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ میں گذشتہ تینوں قسموں کی نفی کر دی گئی ہے کیونکہ قسم عادتاً ہو یا غصّہ اور بے احتیاطی سے ہو ان میں سے کوئی قسم بھی عمداً نہیں ہوتی بلکہ بعض وقت تو انسان کو پتہ بھی نہیں لگتا اور وہ قسم کھا جاتا ہے۔ پس کسب قلب سے مراد یہی ہے کہ عمداً قسم کھائی جائے۔ ایک واقعہ کے متعلق وہ سمجھتا ہو کہ یوں ہے مگر پھر اس کے خلاف قسم کھا جائے۔ ایسی قسم کا کفارہ اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ میں اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ (المائدۃ:۹۰) یعنی قسم توڑنے کا کفارہ دس مساکین کو متوسط درجہ کا کھانا کھلانا ہے۔ ایسا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ یا اُن کے لئے لباس مہیا کرنا ہے۔ یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ لیکن جسے اس بات کی توفیق نہ ہو اُس پر تین دن کے روزے واجب ہیں۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم کھانے کے بعد انہیں توڑ دو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا قرآن کریم کی قسم کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ملکی رواج کو مدّنظر رکھ کر قرآن کریم کی قسم کھائی جائے تو میرے نزدیک جائز ہے۔ کیونکہ مدّمقابل پر قرآن کریم کی قسم کھانے سے غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔

يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کے دل میں بداخلاقی کے خیالات آتے ہیں۔ مثلاً اپنے بھائی کی نسبت بدظنّی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ یا تکبّر یا حسد یا نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن وہ اس خیال کو دبا لیتا ہے تو اس کا یہ خیال یا جذبہ بداخلاقی نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ ایسا شخص درحقیقت بداخلاقی کا مقابلہ کرتا ہے اور تعریف کا مستحق ہے، اسی طرح جس شخص کے دل میں ایک آنی خیال نیکی کا آئے یا آنی طور پر حسن سلوک کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو لیکن وہ اس کو بڑھنے نہ دے تو ایسا شخص بھی صاحب اخلاق نہیں سمجھا جائے گا گو اُس کے اِس وقتی جذبہ کو بھی قابلِ تعریف قرار دیا جائے گا کیونکہ اخلاق وہ ہیں جو انسان کے ارادہ کا نتیجہ ہوں لیکن مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اچھے یا بُرے خیالات ارادہ کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ بیرونی اثرات کے نتیجہ میں بلا ارادہ پیدا ہو جاتے اور اُسی وقت زائل ہو جاتے ہیں۔ اس نکتہ کو قرآن کریم نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ۔ اللہ تعالیٰ تم کو صرف ان خیالات پر پکڑے گا جو ارادہ اور فکر کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں نہ ان پر جو اچانک پیدا ہو جاتے ہیں اور تم ان کو فوراً اپنے دل سے نکال دیتے ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریح یوں

فرماتے ہیں کہ اچانک بدخیال پیدا ہونے پر جو شخص اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا ایسا شخص نیکی کا کام کرتا ہے۔ اور اجر کا مستحق ہے آپ فرماتے ہیں وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً (بخاری کتاب الرقاق باب من همّ بحسنة و بسيّئة) اگر کسی شخص کے دل میں بُرا خیال پیدا ہو اور وہ اس کو دبالے اور اس کے مطابق عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں ایک پوری نیکی لکھے گا۔ یعنی بدخیال کے دبانے کی وجہ سے اس کو نیک بدلہ ملے گا۔

وَاللهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ میں غفور کے لفظ سے بتا دیا کہ اگر تم ایسی قسموں سے اجتناب کرو گے اور توبہ کرو گے تو ہم تمہیں بخش دیں گے۔ اور حلیم کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ ہم نے لغو قسموں پر اس لئے گرفت نہیں کی کہ اگر ہم ان قسموں پر گرفت کرنا شروع کر دیں تو تمہارا بچنا مشکل ہو جائے۔

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ج

جو لوگ اپنی بیویوں کے متعلق قسم کھا (کر ان سے علیحدگی اختیار کر) لیتے ہیں۔ ان کے لئے (صرف) چار مہینے تک

فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَ اِنْ عَزَمُوا

انتظار کرنا (جائز) ہے۔ پھر اگر (اس عرصہ میں صلح کے خیال کی طرف) لوٹ آئیں تو اللہ یقیناً بہت بخشنے والا (اور)

الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

بار بار رحم کرنے والا ہے۔ اور اگر وہ طلاق کا فیصلہ کر لیں۔ تو اللہ بہت سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ اِيْلَاءٌ اٰلٰی يُؤْلِيْ اِيْلَاءً قسم کھانا۔ یہ اَلَّا سے نکلا ہے جس کے معنے کسی کام میں کمی یا تاخیر کرنے کے ہیں۔ اور اِيْلَاءٌ قرآن کریم کے محاورہ میں اُس قسم کو کہتے ہیں جو اس بات پر کھائی جائے کہ مرد اپنی بیوی سے کوئی تعلق نہ رکھے گا (مفردات) چونکہ اس قسم میں عورت کے حق کا اتلاف ہے اس لئے اسے اِيْلَاء کہا گیا۔

فَآءُوْا فَاءَ يَفِيْءُ فَيْئًا لوٹ آیا۔ فَاءَ الْاَمْرَ اَیْ رَجَعَ اِلَيْهِ (اقرب) اس بات کی طرف لوٹ آیا۔ فَاءَ کا لفظ نیک امور کی طرف لوٹنے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات) اصل میں اس کے معنے تعاون اور امداد باہمی کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور سایہ کو بھی فَیْءٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ

سورج کے ساتھ ادھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے ان دونوں معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فَآءَ بالعموم اچھے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔

تفسیر ۔ایلاء کے معنے قسم کے ہیں لیکن اصطلاحی طور پر کسی شخص کا قسم کھا کر اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لینا ایلاء کہلاتا ہے۔عرب میں یہ رواج تھا کہ بعض لوگ اپنی بیویوں کو طلاق تو نہ دیتے لیکن قسم کھا لیتے تھے کہ ہم ان سے تعلق نہیں رکھیں گے اور اس قسم کے ذریعہ وہ اپنے خیال میں بیوی کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داریوں سے آزاد ہو جاتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں قسم کو پورا کرنے کی ذمہ داری خدا تعالیٰ کی طرف سے عائد ہوتی ہے اور بندوں کی ذمہ داری سے مقدم ہے۔ پس جب کہ خدا تعالیٰ کی قسم روک بن گئی تو ان کے خیال کے مطابق عورت کے حقوق کا ادا نہ کرنا کوئی گناہ نہ رہا۔ یہ گندہ خیال اب بھی دنیا میں موجود ہے۔ بلکہ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم بیویوں سے تعلق نہیں رکھیں گے۔لیکن انہیں طلاق بھی نہیں دیتے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کر بیٹھے تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اسے چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے اس عرصہ میں وہ صلح کر لے تو بہتر ورنہ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے پھر قاضی طلاق کا فیصلہ کر دے گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت کو معلّقہ چھوڑنے کے خلاف فیصلہ فرمایا ہے۔مرد زیادہ سے زیادہ مدت نکاح میں چار ماہ تک کے لئے عورت سے علیحدہ رہنے کا عہد کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص چار ماہ سے زائد عرصہ کے لئے زائد عرصہ کے لئے قسم کھائے تو عورت کا حق ہے کہ خلع کرا لے۔ ایسی صورت میں طلاق واقعہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا حکم آگے مذکور ہے۔لیکن عورت کو خلع کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے ایلاء کرے مثلاً دس دن کے لئے ایلاء کیا اور پھر رجوع کیا۔ پھر دس دن کے لئے نیا ایلاء کیا اور پھر رجوع کر لیا تب بھی اس کے لئے مجموعی طور پر چار ماہ کی ہی مدت مقرر ہے۔ اگر وہ چار ماہ کے بعد ایلاء کرے گا۔تو وہ ایلاء ناجائز ہوگا اور عورت علیحدگی کی حقدار ہوگی ۔بعض لوگ عورت کو دکھ دینے کے لئے تھوڑی تھوڑی مدت مقرر کرتے رہتے ہیں تا کہ نہ چار ماہ ختم ہوں اور نہ عورت علیحدہ ہو مگر ان کا یہ خیال غلط ہے اس قسم کی ایلاء کی مدت بھی صرف چار ماہ ہی ہے۔ جب ایام قطع تعلق کا مجموعہ چار ماہ ہو جائے گا۔تو لازماً عورت علیحدگی کی حق دار ہوگی ۔فقہاء کا اس آیت کے احکام کی تفصیلات میں اختلاف ہے۔بعض کہتے ہیں کہ اگر مدت گزر جائے اور مرد عورت سے نہ مباشرت کرے اور نہ زبان سے رجوع کرے تو قاضی دونوں میں علیحدگی کروا دے گا۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔لیکن امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ چار ماہ کے ختم ہونے سے پہلے رجوع ضروری ہے۔اگر چار ماہ کے اندر رجوع نہ کرے تو اس مدت کے گزرنے کے بعد عورت کو خود بخود طلاق ہو جائے گی۔

افضل قول یہی ہے۔لیکن محتاط امام مالکؒ کا فتویٰ ہے امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک چار ماہ گذرنے پر اگر کوئی شخص رجوع نہ کرے تو اسے قاضی مجبور کرے گا کہ رجوع کرے یا طلاق دے۔ یہ بھی قریباً امام مالکؒ کے قول سے ملتا ہے اگر مرد دونوں باتوں سے کوئی بھی نہ کرے گا۔تو قاضی اس کی طرف سے طلاق دلا دے گا (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة، شرعی حدود متعلقه احکام ایلاء)۔امام نخعیؒ کا قول ہے کہ یہ رجوع پوشیدہ جائز نہیں نہ اشارہ سے بلکہ قول سے ہونا چاہیے۔اور گواہوں کی موجودگی اس کے لئے ضروری ہے(کشّاف زیر آیت ھذا)۔ غرض قرآن کریم عورت کو کَالْمُعَلَّقَة چھوڑنے سے منع کرتا ہے۔اور جو چھوڑے اسے مجبور کرتا ہے کہ یا صلح کرے یا اسے طلاق دے دے۔

غَفُوْرٌ کے لفظ سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ بغیر کسی جائز عذر کے اس قسم کی قسم کھانا اور عورت کو دق کرنا گناہ کی بات ہے۔تمہیں ایسے فعل سے توبہ کرنی چاہیے اور عورت کو دق نہیں کرنا چاہیے۔

وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ میں بتایا کہ اگر مرد طلاق دینے کا پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ بھی سننے والا اور جاننے والا ہے۔سَمِیْعٌ کے لفظ سے ڈرایا کہ اگر وہ اپنی بیوی سے ناانصافی کرے گا تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اس کے بدنتائج سے بچ نہیں سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اُس کی بیوی کی فریاد کو سننے والا ہے۔اور عَلِیْمٌ میں بتایا کہ جو خیالات تمہارے دلوں کے اندر ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بھی خوب جانتا ہے اور انہی کے مطابق تم سے معاملہ کرے گا اس لئے تم اپنے معاملات میں ہوشیار رہو۔تم دنیا کو تو دھوکا دے سکتے ہو مگر خدا تعالیٰ کو نہیں۔

چونکہ اس جگہ عورت سے حسن سلوک کو حکم دیا ہے۔اس لئے اگر کوئی شخص قسم کھالیتا ہے کہ میں اپنی بیوی سے حسن سلوک نہیں کروں گا تو یہ قسم بھی اس پہلی قسم ہی کی طرح ہوگی جس کا ذکر لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا میں کیا گیا ہے۔

وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا

اور جن عورتوں کو طلاق مل جائے وہ تین (بار) حیض (آنے) تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔اور اگر انہیں اللہ (پر) اور

يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ

روز آخرت پر ایمان ہے تو (انہیں معلوم رہے کہ) جو کچھ اللہ (تعالیٰ) نے ان کے رحموں میں پیدا کر رکھا ہے ان

كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ

کے لئے اس کا چھپانا جائز نہیں۔ اور اگر ان کے خاوند باہمی اصلاح کا ارادہ کرلیں تو وہ اس (مدت) کے اندر (اندر)

بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ

ان کو (اپنی زوجیت میں) واپس لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔ اور جس طرح ان (یعنی عورتوں پر) کچھ

الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ

ذمہ داریاں ہیں (ویسے ہی) مطابق دستور انہیں بھی (کچھ حقوق) حاصل ہیں۔ ہاں مردوں کو ان پر ایک طرح کی

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۹﴾ ع

فوقیت حاصل ہے اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

تفسیر ۔ اب اللہ تعالیٰ طلاق کے مسائل بیان فرماتا ہے اور اس بارہ میں سب سے پہلی ہدایت یہ دیتا ہے کہ جن عورتوں کو اُن کے خاوند طلاق دے دیں۔ انہیں اپنے آپ کو تین قروء تک روکے رکھنا چاہیے۔

قُرُوْء سے کیا مُراد ہے؟ اس بارہ میں اُمتِ محمدیہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ خلفاء اربعہ یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ اِس سے حیض مُراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور امام ابوحنیفہؒ کی بھی یہی رائے ہے (ابن کثیر، مجمع البیان از طبری زیر آیت ھٰذا)۔ لیکن حضرت عائشہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اس سے طُہر مراد ہے۔ حضرت محی الدین ابنِ عربیؒ لکھتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ اہل عرب تو قُرء سے حیض بھی مُراد لیتے ہیں اور طُہر بھی۔ اللہ تعالیٰ کا اس سے کیا منشاء ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دونوں کو صحیح قرار دیا ہاں ترجیح آپ نے طُہر کو دی۔ (فتوحاتِ مکیہ جلد ۴۔ باب ۵۶۰ صفحہ ۶۰۹، ۶۱۰)

عدّت کی حکمت بالکل واضح ہے۔ اس عرصہ میں خاوند کو سوچنے اور غور کرنے کا کافی وقت مل جاتا ہے۔ اور اگر اس کے دل میں اپنی بیوی کی کچھ بھی محبت ہو تو وہ رجوع کرسکتا ہے۔

وَ لَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْۤ اَرْحَامِهِنَّ میں عورت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ حاملہ ہوتو مرد کو بتا دے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اگر عورت حاملہ ہوتو اس کی وجہ سے پھر آپس میں محبت قائم ہو جاتی ہے اور میاں بیوی میں صلح کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ میں ذٰلِكَ کا اشارہ مدت تربّص کی طرف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اگر عدت کے دوران خاوند اپنی عورت سے دوبارہ تعلقات قائم کرنا چاہے تو اس میں کسی کو روک نہیں بننا چاہیے۔ اس ہدایت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر عورت کے رشتہ دار کہہ دیا کرتے ہیں کہ چونکہ خاوند نے اپنی بیوی سے اچھا سلوک نہیں کیا اور اسے ایک دفعہ طلاق دے دی ہے اس لئے اب ہم اس سے تعلق قائم رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عورت کے رشتہ داروں کو میاں بیوی کے تعلقات میں روک نہیں بننا چاہیے۔ اگر خاوند اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے رجوع کرنا چاہتا ہے تو وہ کسی اور کی نسبت اس عورت کا زیادہ حق دار ہے اور وہ عدّت میں اپنی عورت کو واپس لوٹا سکتا ہے۔

پھر وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ میں عام قانون بتایا کہ مردوں اور عورتوں کے حقوق بحیثیت انسان ہونے کے برابر ہیں جس طرح عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مردوں کے حقوق کا خیال رکھیں اسی طرح مردوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق ادا کریں اور اس بارہ میں کسی قسم کا ناواجب پہلو اختیار نہ کریں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عورتوں کے کوئی حقوق تسلیم ہی نہیں کئے جاتے تھے بلکہ انہیں مالوں اور جائیدادوں کی طرح ایک منتقل ہونے والا ورثہ خیال کیا جاتا تھا۔ اور اُن کی پیدائش کو صرف مرد کی خوشی کا موجب قرار دیا جاتا تھا حتّٰی کہ مسیحی جو اپنے آپ کو حقوقِ نسواں کے بڑے حامی کہتے ہیں اُن کے پاک نوشتوں میں بھی عورت کی نسبت لکھا تھا۔

''البتہ مرد کو اپنا سر ڈھانکنا نہ چاہیے کیونکہ وہ خدا کی صورت اور اُس کا جلال ہے مگر عورت مرد کا جلال ہے۔'' (کرنتھیوں باب ۱۱ آیت ۷)

اسی طرح لکھا تھا۔

''اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے'' (تمطاؤس باب ۲ آیت ۱۲)

صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں عورتوں کی انسانیت کو نمایاں کر کے دکھایا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی وہ پہلے انسان ہیں جنہوں نے عورتوں کے بلحاظ انسانیت برابر کے حقوق قائم کئے۔ اور

وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کی تفسیر لوگوں کے اچھی طرح ذہن نشین کی۔ آپ کے کلام میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق اور ان کی قابلیتوں کے متعلق جس قدر ارشادات پائے جاتے ہیں ان کا دسواں حصّہ بھی کسی اور مذہبی پیشوا کی تعلیم میں نہیں ملتا۔ آج ساری دنیا میں یہ شور مچ رہا ہے کہ عورتوں کو ان کے حقوق دینے چاہئیں اور بعض مغرب زدہ نوجوان تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ عورتوں کو حقوق عیسائیت نے ہی دیئے ہیں حالانکہ عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام نے جو وسیع تعلیم دی ہے عیسائیت کی تعلیم اس کے پاسنگ بھی نہیں۔

عربوں میں رواج تھا کہ ورثہ میں اپنی ماؤں کو بھی تقسیم کر لیتے تھے۔ مگر اسلام نے خود عورت کو وارث قرار دیا۔ بیوی کو خاوند کا۔ بہن کو باپ کا اور بعض صورتوں میں بہن کو بھائی کا بھی۔

غرض فرمایا وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ یعنی انسانی حقوق کا جہاں تک سوال ہے عورتوں کو بھی ویسا ہی حق حاصل ہے جیسے مردوں کو۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مردوں اور عورتوں کو یکساں احکام دیئے ہیں اسی طرح انعامات میں بھی انہیں یکساں شریک قرار دیا ہے۔ اور جن نعماء کے مرد مستحق ہوں گے اسلامی تعلیم کے ماتحت قیامت کے دن وہی انعامات عورتوں کو بھی ملیں گے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے نہ اس دنیا میں ان کی کوئی حق تلفی کی ہے اور نہ اگلے جہان میں انہیں کسی انعام سے محروم رکھا ہے۔ ہاں آپ نے اس بات کا بھی اعلان فرمایا کہ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی حقوق کے لحاظ سے تو مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں لیکن انتظامی لحاظ سے مردوں کو عورتوں پر ایک حقِ فوقیت حاصل ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ایک مجسٹریٹ انسان ہونے کے لحاظ سے تو عام انسانوں جیسے حقوق رکھتا ہے اور جس طرح ایک ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کو بھی ظلم اور تعدّی کی اجازت نہیں اُسی طرح مجسٹریٹ کو بھی نہیں۔ مگر پھر بھی وہ بحیثیت مجسٹریٹ اپنے ماتحتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور اُسے قانون کے مطابق دوسروں کو سزا دینے کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اِسی طرح تمدنی اور مذہبی معاملات میں مرد و عورت دونوں کے حقوق برابر ہیں۔ لیکن مردوں کو اللہ تعالیٰ نے قوّام ہونے کی وجہ سے فضیلت عطا فرمائی ہے لیکن دوسری طرف اس نے عورتوں کو استمالتِ قلب کی ایسی طاقت دے دی ہے جس کی وجہ سے وہ بسا اوقات مردوں پر غالب آجاتی ہیں۔ بنگالہ کی جادوگر عورتیں تو جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے مردوں پر جادو سا کر دیتی ہیں۔ پس جہاں مرد کو عورت پر ایک رنگ میں فوقیت دی گئی ہے۔ وہاں عورت کو استمالتِ قلب کی طاقت عطا فرما کر مرد پر غلبہ دے دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے بسا اوقات عورتیں مردوں پر اس طرح حکومت کرتی ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب کاروبار انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ دراصل ہر شخص کی الگ الگ رنگ کی حکومت ہوتی ہے۔ جہاں تک احکام شرعی اور نظام کے قیام کا

سوال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت دے دی ہے مثلاً شریعت کا یہ حکم ہے کہ کوئی لڑکی اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی (بخاری کتاب النکاح باب من قال لا نکاح الا بولیؒ)۔ یہ حکم ایسا ہے جو اپنے اندر بہت بڑے فوائد رکھتا ہے۔ یورپ میں ہزاروں مثالیں ایسی پائی جاتی ہیں کہ بعض لوگ دھوکے باز اور فریبی تھے مگر اس وجہ سے کہ وہ خوش وضع نوجوان تھے انہوں نے بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں سے شادیاں کر لیں اور بعد میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ لیکن ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ رشتہ کی تجویز کے وقت باپ غور کرتا ہے والدہ غور کرتی ہے۔ بھائی سوچتے ہیں۔ رشتہ دار تحقیق کرتے ہیں اور اس طرح جو بات طے ہوتی ہے وہ بالعموم ان نقائص سے پاک ہوتی ہے جو یورپ میں نظر آتے ہیں۔ یورپ میں تو یہ نقص اس قدر زیادہ ہے کہ جرمنی کے سابق شہنشاہ کی بہن نے اسی ناواقفی کی وجہ سے ایک باورچی سے شادی کر لی اس کی وضع قطع اچھی تھی اور اس نے مشہور یہ کر دیا تھا کہ وہ روس کا شہزادہ ہے جب شادی ہوگئی تو بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو کہیں باورچی کا کام کیا کرتا تھا۔ یہ واقعات ہیں جو یورپ میں کثرت سے ہوتے رہتے ہیں ان واقعات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے مردوں کے قوام ہونے کے متعلق جو کچھ فیصلہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ شریعت کا اس سے یہ منشا نہیں کہ عورتوں پر ظلم ہو یا ان کی کوئی حق تلفی ہو بلکہ شریعت کا اس امتیاز سے یہ منشا ہے کہ جن باتوں میں عورتوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے ان میں عورتوں کو نقصان سے محفوظ رکھا جائے۔ اسی وجہ سے جن باتوں میں عورتوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ان میں ان کا حق خدا تعالیٰ نے خود ہی انہیں دے دیا ہے۔ پس قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنے اندر بہت بڑی حکمتیں اور مصالح رکھتا ہے۔

اگر دنیا ان کے خلاف عمل کر رہی ہے تو وہ کئی قسم کے نقصانات بھی برداشت کر رہی ہے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام کے خلاف عمل پیرا ہونا کبھی نیک نتائج کا حامل نہیں ہو سکتا۔

آخر میں وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ یاد رکھو! عورتوں پر جو فوقیت ہم نے تمہیں دی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔ اور ان کے حقوق کو پامال کرنا شروع کر دو۔ دیکھو! تم پر بھی ایک حاکم ہے جو عزیز ہے۔ یعنی اصل حکومت خدا تعالیٰ کی ہے اس لئے چاہیے کہ مرد اس حکومت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ اور حکیم کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ ضبط و نظم کے معاملات میں جو اختیار ہم نے مردوں کو دیا ہے۔ یہ سراسر حکمت پر مبنی ہے ورنہ گھروں کا امن برباد ہو جاتا۔ چونکہ میاں بیوی نے مل کر رہنا ہوتا ہے اور نظام اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ ایک کو فوقیت نہ دی جائے اس لئے یہ فوقیت مرد کو دی گئی ہے اور اس کی ایک اور وجہ اللہ تعالیٰ

نے دوسری جگہ یہ بیان فرمائی ہے کہ چونکہ مرد اپنا روپیہ عورتوں پر خرچ کرتے ہیں اس لئے انتظامی امور میں انہیں عورتوں پر فوقیت حاصل ہے۔(النساء:۳۵)۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ

ایسی طلاق (جس میں رجوع ہو سکے) دو دفعہ (ہوسکتی) ہے۔ پھر (یا تو) مناسب طور پر روک لینا ہوگا یا حسن سلوک

بِاِحۡسَانٍ‌ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ

کے ساتھ رخصت کر دینا ہوگا۔اور تمہارے لئے اس (مال) کا جو تم انہیں پہلے دے چکے ہو کوئی حصہ بھی (واپس) لینا

شَيۡـــًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ‌ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ

جائز نہیں سوائے اس (صورت) کے کہ ان (دونوں) کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی (مقررہ کردہ) حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں

اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا

گے۔سو اگر تمہیں (ملت اسلامیہ یا اسلام پر ایمان رکھنے والی حکومت کو یہ) اندیشہ ہو کہ وہ (دونوں) اللہ کی

افۡتَدَتۡ بِهٖ‌ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ

(مقرر کردہ) حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔تو وہ (یعنی عورت) جو کچھ بطور فدیہ دے اس کے بارہ میں ان

يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾

(دونوں میں سے کسی) کو کوئی گناہ نہ ہوگا۔یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اس لئے تم ان سے باہر نہ نکلو۔اور جو اللہ کی (مقرر کردہ) حدوں سے باہر نکل جائیں تو (سمجھ لو کہ) وہی لوگ (اصل) ظالم ہیں۔

تفسیر۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ سے مراد یہ ہے کہ ایسی طلاق جس میں خاوند کو رجوع کا حق حاصل ہے صرف دو دفعہ ہی ہوسکتی ہے۔ یہ نہیں کہ عورت کو تنگ کرنے کے لئے اسے بار بار طلاق دیتا رہے۔اور جب عدت ختم ہونے کا وقت قریب آئے تو رجوع کر لے۔احکام دینیہ کے ساتھ یہ ایک ناپاک تمسخر ہے جس کی اسلام ہرگز اجازت

نہیں دیتا۔

احادیث میں صراحتاً ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ لَا اُطَلِّقُكِ اَبَدًا وَلَا اٰوِيْكِ اَبَدًا یعنی نہ تو میں تجھے کبھی طلاق دوں گا اور نہ اپنے گھر میں بساؤں گا۔عورت نے پوچھا۔وَ كَيْفَ ذٰلِكَ یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ اس پر اس نے کہا اُطَلِّقُ حَتّٰى اِذَا اَتٰى اَجَلُكِ رَاجَعْتُكِ میں تجھے طلاق دوں گا اور جب تیری عدت ختم ہونے کے قریب پہنچے گی تو رجوع کرلوں گا۔اگلی دفعہ پھر ایسا کروں گا اور پھر رجوع کرلوں گا۔اس طرح نہ تجھے بساؤں گا اور نہ علیحدہ ہونے دوں گا۔وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اُس نے اس واقعہ کا آپ سے ذکر کیا۔اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ یعنی وہ طلاق جس میں مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے صرف دو دفعہ ہے اس سے زیادہ نہیں (ترمذی کتاب الطلاق و اللعان باب نزول قولہ الطلاق مرّتٰن) اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دو طلاقوں تک تو مرد کو رجوع کا حق حاصل رہتا ہے لیکن تیسری طلاق کے بعد اُسے رجوع کا کوئی حق نہیں رہتا۔اور یہ دو طلاقیں بھی بیک وقت نہیں دی جاسکتیں بلکہ یکے بعد دیگرے دی جاتی ہیں جس کی طرف مَرَّتٰنِ کا لفظ اشارہ کرتا ہے جس کے معنے مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ کے ہیں۔یعنی ایک ہی دفعہ طلاقیں نہ دی جائیں بلکہ باری باری دی جائیں اور ہر طلاق کی مدت جیسا کہ اوپر کی آیت میں گذر چکا ہے تین قروء ہے خواہ وہ ہر مہینے میں ایک طلاق دے یا شروع میں ایک دفعہ دے۔ اس سے طلاق کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔فقہاء نے ہر مہینے طلاق دینے کی طرف اس لئے توجہ دلائی ہے کہ اس طرح بار بار انسان کو رجوع کرنے کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع از کاشانی زیر عنوان کتاب الطلاق)۔میرے نزدیک خواہ انسان ایک دفعہ طلاق دے یا ہر مہینے طلاق دے وہ ایک ہی طلاق سمجھی جائے گی۔اور عدت گذرنے کے بعد پھر خاوند نکاح کرسکے گا۔اِس قسم کی طلاقیں صرف دو جائز ہیں یعنی طلاق دینا اور عدت کے بعد دوبارہ نکاح کرلینا۔اگر دو ہوجائیں تو اس کے بعد پھر اگر وہ تیسری مرتبہ طلاق دے دے تو ایسے شخص کے لئے اس عورت سے دوبارہ نکاح جائز نہیں جب تک کہ وہ باقاعدہ اور شرعی نکاح دوسرے شخص سے نہ کرچکی ہو جو حقیقی نکاح ہے حلالہ نہیں۔کیونکہ حلالہ کا وجود اسلام میں نہیں ملتا۔غرض اَلطَّلَاقُ سے مُراد وہ طلاق ہے جس کی عدت گذر چکی ہے وہ طلاق نہیں جس پر عدت نہ گذری ہو۔اس میں رجوع ہوسکتا ہے جس پر عدت گذر چکی ہو اس میں دو دفعہ نکاح ہوسکتا ہے۔تیسری دفعہ نہیں۔

بیشک بعض حدیثیں اور بعض فقہاء کے اقوال اس کے خلاف نظر آتے ہیں۔لیکن قرآن کریم کے الفاظ

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ بالکل واضح ہیں اور اس سے پہلی آیت وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا۔ واضح کرتی ہے کہ زمانہ طلاق تین قروء تک جاتا ہے اس عرصہ میں انسان بغیر نکاح کے رجوع کر سکتا ہے اور اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے چند آیات بعد کی آیت وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ: ۲۳۳) بتاتی ہے۔ کہ طلاق کی مدت گذر جانے کے بعد خاوند دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ درمیانی آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اس پہلی قسم کی طلاق کی طرف اشارہ کرتی ہے اور پہلی قسم کی طلاق یہی ہے کہ تین قروء تک رجوع جائز ہے اور تین قروء کے بعد نکاح جائز ہے۔

غرض آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ بتاتی ہے کہ ایسی طلاق دو دفعہ ہو سکتی ہے جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ طلاق کے بعد عدت گذر جانے کی صورت میں خاوند کو دو دفعہ دوبارہ نکاح کا حق حاصل ہے۔ ایسے دو واقعات کے بعد اگر پھر انسان طلاق دے دے تو اس کو نکاح کا حق حاصل نہیں رہتا بلکہ اسے عرصہ مدت میں رجوع کا بھی حق حاصل نہیں۔ پھر یہ حق اس کو تبھی حاصل ہوگا جبکہ وہ عورت کسی دوسرے شخص سے باقاعدہ نکاح کرے اور وہ مرد اس کو کسی وجہ سے طلاق دے دے۔

فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ میں بتایا کہ ان دو طلاقوں کے بعد یا تو عورت کو معروف طریق کے مطابق اپنے گھروں میں بسا لو اور یا پھر حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دو۔

تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ایک تشریح احادیث میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ ابنِ ابی حاتم نے ابی رزین سے روایت کی ہے کہ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَرَءَیْتَ قَوْلَ اللّٰہِ الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اَیْنَ الثَّالِثَۃُ قَالَ التَّسْرِیْحُ بِاِحْسَانٍ۔ یعنی رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا۔ اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! دو طلاقیں تو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ تیسری کہاں سے آئی؟ آپ نے فرمایا۔ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ جو آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کو آپ نے تیسری طلاق قرار دیا ہے (تفسیر القرآن العظیم لابن ابی حاتم سورۃ البقرۃ زیر آیت ھٰذا)۔ اس جگہ احسان کا لفظ رکھ کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ عورت کو رخصت کرتے وقت اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا چاہیے۔ مثلاً اس کے حق سے زائد مال اسے دے دیا جائے اور اسے عزت کے ساتھ روانہ کیا جائے۔ بعض صحابہؓ کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے اپنی بیویوں کو طلاق دی تو انہیں دس دس ہزار روپیہ تک دے دیا۔ پھر فرمایا

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا ۔تمہارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اگر کوئی مال یا جائیداد تم انہیں دے چکے ہو تو طلاق کے بعد ان سے واپس لے لو۔ یہ آیت بالصراحت بتاتی ہے کہ طلاق کے بعد عورت سے زیورات اور پارچات وغیرہ واپس نہیں لئے جاسکتے۔ نہ مال واپس لیا جاسکتا ہے۔ نہ کوئی جائداد جو اسے دی جاچکی ہو واپس لی جاسکتی ہے بلکہ مرد اگر مہر ادا نہ کرچکا ہو تو طلاق کی صورت میں وہ مہر بھی اسے ادا کرنا پڑے گا۔ لیکن اسکے بعد ایک استثنیٰ رکھا ہے اور کہا ہے کہ اگر وہ صورت پیدا ہو تو پھر جائز ہے۔ چنانچہ فرمایا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۔سوائے اس کے کہ ان دونوں کو خوف ہو کہ وہ خدا تعالیٰ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے یعنی مرد عورت کے حقوق ادا نہ کرسکے گا۔ اور عورت مرد کے حقوق ادا نہ کرسکے گی۔ اس صورت میں اس کا حکم اور ہے۔ جو فَاِنْ خِفْتُمْ سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۔ یعنی اس صورت میں اگر تمہاری رائے بھی یہی ہو کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے یعنی قضا نے بھی دیکھ لیا کہ فی الواقعہ دونوں کا قصور ہے صرف مرد ہی کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ عورت بھی قصوروار ہے تو اس صورت میں اگر عورت سے کچھ دلوا کر ان میں جدائی کروادی جائے جسے اصطلاحاً خلع کہتے ہیں تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس آیت میں تَاْخُذُوْا کی ضمیر اور طرف گئی ہے اور خِفْتُمْ کی ضمیر اور طرف حالانکہ جملہ ایک ہی ہے۔ یعنی تَاْخُذُوْا سے مراد خاوند ہیں۔ اور خِفْتُمْ سے مراد محکمہ قضاء سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں (رازی)۔ اسے اصطلاح میں انتشار ضمائر کہتے ہیں۔ اور نحوی اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ غرض فَاِنْ خِفْتُمْ میں بتایا کہ اگر حکام اس بات کا فیصلہ کریں کہ ۔۔۔۔۔۔۔عورت راضی نہیں اور اس کی نارضامندی کی وجہ سے مرد بھی عدل نہ رکھ سکے گا تو عورت اگر کچھ دینا چاہے تو مرد کو اجازت ہے کہ لے کر اسے طلاق دے دے۔ چنانچہ اس کے متعلق احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ابن ماجہ اور نسائی میں آتا ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی (یعنی عبداللہ بن ابیّ بن سلول کی بیٹی) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے اپنے خاوند سے اس قدر نفرت ہے کہ اگر وہ مجھ سے حسن سلوک بھی کرے۔ تب بھی میں اس کی طرف توجہ نہیں کرسکتی اور سوائے اس نفرت کے مجھے اس سے اور کوئی شکایت نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خاوند کو بلایا۔ اور اس سے دریافت فرمایا کہ تم نے اسے کچھ دیا ہوا ہے اس نے عرض کیا کہ ایک باغ ہے جو میں نے اسے دیا ہوا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو فرمایا اَتَرُدِّيْنَ عَلَيْهِ حَدِيْقَتَهٗ کہ کیا تو اس کا باغ اسے واپس کرسکتی ہے؟ قَالَتْ

نَعَمْ اس نے کہا ہاں! یا رسول اللہ! میں باغ واپس کردوں گی۔ فَأَمَرَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَنْ يَّأْخُذَ الْحَدِيْقَةَ وَلَا يَزِيْدَ عَلَيْهَا (ابن ماجه باب الطلاق باب المختلعة تأخذ ما اعطاها ۔۔۔ نسائی کتاب الطلاق باب ما جاء فی الخلع) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ اس سے اپنا باغ واپس لے لے اور اس سے زیادہ کچھ نہ لے۔ دوسری روایت میں ذکر آتا ہے کہ اس عورت نے کہا یا رسول اللہ! میں تو زیادہ دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ اَمَّا الزِّيَادَةُ فَلَا۔ کہ زیادہ ہرگز نہیں۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ یہ حبیبہؓ بنت سہیل کا واقعہ ہے۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ باغ اس سے واپس کروا دیا اور عورت کو طلاق دلوادی اور مرد کو اس سے زیادہ لینے کی اجازت نہ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف خاوند کا مال اسے واپس دلوایا جا سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

اس جگہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا دو وجوہ کی بنا پر کہا گیا ہے۔ اوّل اس لئے کہ اس سے پہلے لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا فرما کر عورت سے مال لینا گناہ قرار دیا تھا۔ پس چونکہ یہ شبہ پڑتا تھا کہ کہیں اس صورت میں بھی مال لینا گناہ نہ ہو۔ اس لئے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فرما کر اس شک کو دور کر دیا اور بتلا دیا کہ اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں۔ دوسرے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اس لئے فرمایا کہ عورت کا کچھ دے کر مرد سے آزاد ہونا اس کے جدائی کے شوق پر دلالت کرتا ہے اور یہ گناہ ہے۔ جیسا کہ ابن جریر نے ثوبان سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا الطَّلَاقَ مِنْ غَيْرِ بَأْسٍ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهَا رَائِحَةَ الْجَنَّةِ (تفسیر طبری زیر آیت ھٰذا) یعنی جو عورت بغیر کسی معقول وجہ کے اپنے خاوند سے طلاق مانگے۔ اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ سو فرمایا کہ اگر کوئی حقیقی مجبوری پیش آجائے تو اس صورت میں اس کی درخواست تفریق موجب گناہ نہیں ہوگی اسی طرح مرد کا عورت سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑنا اس کے لالچ پر دلالت کرتا ہے اور یہ بھی گناہ ہے۔ پس چونکہ دونوں طرف گناہ کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے بتایا کہ قاضی کی تحقیق کے بعد اس طریق پر جدائی مناسب سمجھی جائے اور ایک تیسرا شخص فیصلہ کردے کہ یہی طریق مناسب ہے تو پھر دونوں کو کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا۔ فرماتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور تمہارا فرض ہے کہ تم ان حدود سے اپنا قدم باہر مت رکھو۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس حکم کی یہاں تک خلاف ورزی کی کہ انہوں نے کہہ دیا کہ اگر ایک مجلس میں اکٹھی تین طلاقیں بھی دے دی جائیں۔ تب بھی طلاق بتّہ واقع ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ سوال خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا اور آپ سے پوچھا گیا کہ کیا یہ ایک ہی طلاق سمجھی

جائے گی؟ تو آپؐ نے فرمایا۔ یہ ایک ہی طلاق ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ طَلَّقَ رَکَانَۃُ ثَلَاثًا فِیْ مَجْلِسٍ وَاحِدٍ فَحَزَنَ عَلَیْہِ حُزْنًا شَدِیْدًا فَسَأَلَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کَیْفَ طَلَّقْتَہَا قَالَ طَلَّقْتُہَا ثَلَاثًا فِیْ مَجْلِسٍ وَاحِدٍ قَالَ اِنَّمَا تِلْکَ طَلْقَۃٌ وَاحِدَۃٌ فَارْ تَجِعْھَا۔ (تفسیر مظھری سورۃ البقرۃ زیر آیت ھٰذا) یعنی ایک شخص رکانہ نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دیں اس کے بعد رکانہ کو اپنے اس فعل پر شدید صدمہ محسوس ہوا جب یہ معاملہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تو نے اپنی بیوی کو کس طرح طلاق دی تھی؟ اس نے کہا۔ میں نے اسے ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ ایک ہی طلاق ہے۔ اس لئے تم رجوع کرلو۔ اسی طرح نسائی میں محمود بن لبید سے روایت ہے کہ اُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ اِمْرَأَتَہٗ ثَلَاثَ تَطْلِیْقَاتٍ جَمِیْعًا فَقَامَ غَضْبَانًا ثُمَّ قَالَ اَ یُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَاَنَا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ (نسائی کتاب الطلاق باب الثلاث المجموعۃ و فیہ من التغلیظ) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خبر دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی دفعہ تین طلاقیں دے دی ہیں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا۔ ابھی تو میں تم میں موجود ہوں۔ کیا میری موجودگی میں وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کَانَ الطَّلَاقُ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ اَبِیْ بَکْرٍ وَ سَنَتَیْنِ مِنْ خِلَافَۃِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَۃً فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِیْ اَمْرٍ کَانَتْ لَھُمْ فِیْہِ اَنَاۃٌ فَلَوْ اَمْضَیْنَاہُ عَلَیْھِمْ فَاَمْضَاہُ عَلَیْھِمْ (مسلم کتاب الطلاق باب طلاق الثلاث) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک ایک وقت میں تین طلاقیں ایک ہی طلاق تسلیم کی جاتی تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر کہ لوگ طلاقوں کو ایک معمولی بات سمجھنے لگ گئے ہیں اور انہوں نے ایک ایسے معاملہ میں جس میں انہیں بہت غور اور سوچ بچار سے کام لینے کا حکم تھا جلد بازی شروع کر دی ہے وقتی طور پر یہ فیصلہ فرما دیا کہ آئندہ اگر کسی نے اکھٹی تین طلاقیں دیں تو اس کی تین طلاقیں ہی متصور ہوں گی۔

امام ابن قیم نے اعلام الموقعین جلد ۲ صفحہ ۲۴ تا ۲۶ میں اس مسئلہ کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بھی اسلامی تعلیم سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ رواج ہے کہ معمولی معمولی جھگڑوں پر لوگ اپنی بیویوں سے کہہ دیتے ہیں کہ تمہیں تین طلاق۔ تمہیں تین ہزار طلاق۔ تمہیں تین کڑور طلاق۔ تمہیں تین ارب طلاق۔

حالانکہ اسلام نے اس بیوقوفی کی اجازت نہیں دی۔اور پھر آج کل کے وہ لوگ جو شریعت کے پورے واقف نہیں کہہ دیتے ہیں کہ تین دفعہ یکدم طلاق دینے کے بعد عورت سے دوبارہ نکاح نہیں ہوسکتا۔حالانکہ یہ طلاق شرعی لحاظ سے ایک ہی طلاق ہے اور عدت گزرنے کے بعد عورت سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب اس قسم کے واقعات کثرت سے ہونے لگے تو آپ نے فرمایا کہ اب اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک وقت ایک سے زیادہ طلاقیں دے گا تو میں سزا کے طور پر اس کی بیوی کو اس پر ناجائز قرار دے دوں گا۔ جب آپ پر یہ سوال ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تو ایسا حکم نہیں دیا۔ پھر آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ منشاء تھا کہ اس قسم کی طلاقیں رک جائیں۔مگر چونکہ تم لوگ اس قسم کی طلاق دینے سے رکتے نہیں اس لئے میں سزا کے طور پر اس قسم کی طلاق کو جائز قرار دے دوں گا۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور آپ کا ایسا کرنا ایک وقتی مصلحت کے ماتحت تھا اور صرف سزا کے طور پر تھا مستقل حکم کے طور پر نہیں تھا۔ بہرحال طلاق ایک ایسی چیز ہے جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَبْغَضُ الْحَلَال قرار دیا ہے۔یعنی جائز اور حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ مکروہ اور ناپسندیدہ چیز۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں انسان کے لئے جو چیزیں ضروری اور لازمی ہیں اور جن کے ذریعہ انسان آرام اور سکینت حاصل کرسکتا ہے وہ میاں بیوی کے تعلقات ہیں۔میاں بیوی کے تعلقات سے جو سکون اور آرام انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ اسے اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان وجودوں کو ایک دوسرے کے لئے مودت اور رحمت کا موجب قرار دیا ہے۔اسی طرح بائیبل میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے آدم کے لئے حوّا پیدا کی تاکہ وہ آدم کے لئے آرام اور سکون کا موجب ہو۔یعنی حوّا کے بغیر آدم کے لئے تسکین اور آرام کی صورت اور کوئی نہ تھی۔لیکن یہی دو وجود جو ایک دوسرے کے لئے تسکین اور آرام اور راحت کا موجب ہیں کبھی کبھی انہیں لڑائی اور جھگڑے کا موجب بنا لیا جاتا ہے اور راحت اور سکون کی بجائے انسان کے لئے اس کا مدّمقابل یعنی خاوند کے لئے بیوی اور بیوی کے لئے خاوند دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف دینے کا موجب بن جاتا ہے۔ ہزاروں خاوند ایسے ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے بدترین عذاب ہوتے ہیں۔اور ہزاروں بیویاں ایسی ہیں جو اپنے خاوندوں کے لئے بدترین عذاب ہوتی ہیں۔ایسے مواقع کے لئے اسلام کا حکم ہے کہ مرد عورت کو طلاق دے دے یا عورت مرد سے خلع کرا لے۔لیکن طلاق اور خلع سے پہلے اسلام نے کچھ احکام بیان کئے ہیں جن کو مدّنظر رکھنا مرد اور عورت اور قاضیوں کا فرض قرار دیا گیا ہے تاکہ طلاق یا خلع عام نہ ہو جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِنَّ اَبْغَضَ الْحَلَالِ عِنْدَاللّٰہِ الطَّلَاقُ

(تفسير لماتريدی (تأويلات أهل السنة) سورة الطلاق الآيات ۲ تا ۸)یعنی حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز خدا تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے۔ جب طلاق حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے تو ایک مومن جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہے وہ اس چیز کے کس طرح قریب جاسکتا ہے جس کے متعلق وہ سمجھتا ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، ہر کام جو جائز ہے ضروری نہیں کہ اسے کیا بھی جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بنارس۔ کلکتہ۔ مدراس یا بمبئی وغیرہ جانا حلال ہے لیکن کتنے ہیں جو ان جگہوں میں گئے ہیں۔ اگر حلال کے یہی معنے ہیں کہ اسے ضرور کیا جائے تو پھر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ جن لوگوں کے پاس ان شہروں میں جانے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ وہ اپنی جائیدادیں بیچ ڈالتے اور اس حلال کام کو ضرور سرانجام دیتے لیکن لوگوں کا اس پر عمل نہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کو جو بات حلال ہے ضروری نہیں کہ اس پر عمل بھی کیا جائے بلکہ مناسب موقعہ اور محل کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اگر ایک حلال کام کے کرنے سے ناپسندیدگی کے سامان پیدا ہوتے ہوں تو اس کام سے بہرحال اجتناب کیا جائے گا۔ مثلاً پیاز کھانا حلال ہے لیکن مسجد میں پیاز کھا کر جانا منع ہے (بخاری کتاب الأطعمة باب ما جاء في كراهية أكل الثوم والبصل) کیونکہ وہاں لوگوں کو اس کی بو سے تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کے لئے یہ حلال ہے کہ وہ سبز رنگ کا کپڑا پہنے یا اُودے رنگ کا کپڑا پہنے یا زرد رنگ کا کپڑا پہنے۔ لیکن اگر کسی کا دوست کہے کہ یہ زرد رنگ کا کپڑا خرید لو۔ تو وہ کہتا ہے مجھے زرد رنگ اچھا نہیں لگتا کیونکہ اس کے نزدیک حلال وہ چیز ہے جو اس کی پسند کے مطابق ہو اور اس کی طبیعت کو اچھی لگتی ہو۔ کھانے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ حلال اور طیّب چیزیں کھاؤ۔ لیکن بعض لوگ بینگن نہیں کھاتے بعض لوگ کدو کو پسند نہیں کرتے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ آپ بینگن کیوں نہیں کھاتے تو وہ کہتے ہیں ہمیں پسند نہیں یا دوسرے شخص سے پوچھا جائے کہ آپ کدو کیوں نہیں کھاتے تو وہ کہتا ہے کہ میری بیوی اس کو نا پسند کرتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ مکان تیار کرتے ہیں وہ اپنے مذاق اور طبیعت کے مطابق مکان بناتے ہیں۔ کوئی ایک منزلہ مکان بناتا ہے۔ کوئی دو منزلہ اور کوئی سہ منزلہ۔ کوئی مکان میں باغیچہ لگانا پسند کرتا ہے اور کوئی بغیر باغیچہ کے رہنے دیتا ہے۔ اب یہ ساری چیزیں حلال ہوتی ہیں لیکن وہ سب پر عمل نہیں کرتا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ ہر حلال بات پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ لیکن جب بیوی کو طلاق دینے کا معاملہ پیش آجائے تو یہ کہتے ہوئے کہ بیوی کو طلاق دینا جائز ہے فوراً بے سوچے سمجھے اسے طلاق دے دی جاتی ہے۔ حالانکہ بعض حلال چیزیں انسان اپنے نفس کی خاطر بعض اپنے دوستوں کی خاطر اور بعض سوسائٹی کی خاطر ہمیشہ چھوڑتا رہتا ہے درحقیقت ایسے موقعہ پر ایک مومن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس حلال کو خدا تعالیٰ کی خاطر چھوڑ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ چونکہ یہ کام میرے

خدا کو پسند نہیں اس لئے میں یہ کام نہیں کرتا تا میرا خدا مجھ پر ناراض نہ ہو۔ پس رُشد و ہدایت یہ نہیں کہ طلاق کو عام کیا جائے بلکہ رشد و ہدایت یہ ہے کہ طلاق سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ حلال کے معنے یہ ہیں کہ چاہو تو کر سکتے ہو۔ یہ قانون کے لحاظ سے منع نہیں لیکن تمہیں دوسروں کے خیالات۔ دوسروں کے جذبات۔ دوسروں کی ہمدردی اور دوسروں کے پیار کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جس حلال پر عمل کرنے سے دوسروں کے خیالات۔ دوسروں کے جذبات۔ دوسروں کی ہمدردی اور دوسروں کے پیار کا خون ہوتا ہو۔ وہ حلال نہیں بلکہ ایسا حلال ایک جہت سے حلال ہے اور دوسری جہت سے حرام ہے۔ جب لوگ اپنے دوستوں کی ناراضگی اور قوم کی ناراضگی کا خیال رکھتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کی ناراضگی ہی ایسی چیز ہے جس سے انسان کو بے پرواہ ہو جانا چاہیے؟ کیا خدا تعالیٰ کا وجود ہی ایسا کمزور ہے کہ جس کی ناراضگی انسان کے لئے قابل اعتناء نہیں؟ جب دنیوی اور سفلی عشق رکھنے والے لوگ اپنے محبوب کی چھوٹی سے چھوٹی خفگی سے بھی ڈرتے ہیں اور اس کو ناراض ہونے کا موقعہ نہیں دیتے۔ تو ایک مومن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث پڑھ کر یا سن کر کہ اِنَّ اَبْغَضَ الْحَلَالِ عِنْدَاللّٰہِ الطَّلَاقُ کس طرح آسانی سے یہ جرأت کر سکتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی کرے۔ جب شریعت کہتی ہے کہ تم اس اَبْغَضُ الْحَلَال کو اختیار کرنے سے پرہیز کرو تو ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ ایسے امور میں کمی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اور اس بات کو میاں بیوی کے تعلقات کی کشیدگی کے وقت بھول نہ جائے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ طلاق اور خلع درحقیقت ایک ہی معنے رکھتے ہیں۔ اگر مرد عورت کو چھوڑتا ہے تو وہ طلاق ہو جائے گی اور اگر عورت میاں سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اسے آزاد کر دے تو وہ خلع کہلائے گا اور خلع بھی اَبْغَضُ الْحَلَال کے ماتحت ہی آئے گا۔ جہاں تک نسوانی حقوق کا سوال ہے خلع کا مسئلہ مسلمان بالکل بھول چکے تھے جس کی وجہ سے عورتوں کے لئے از حد مشکلات کا سامنا تھا۔ احمدیت نے ان کے اس حق کو قائم کیا اور عورتوں کو ان تکالیف سے نجات دی جو ان حقوق کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کو پہنچتی تھیں لیکن ساتھ ہی اس حدیث کے مضمون کو بھی لوگوں کے سامنے بوضاحت بیان کیا کہ ان دونوں رستوں کو اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اَبْغَضُ الْحَلَال ہے۔ قرآن کریم کا حکم ہے کہ جب میاں بیوی میں کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے تو اس کو دُور کرنے کے لئے حکم مقرر کئے جائیں۔ جو کوشش کریں کہ ان کی رنجش دور ہو جائے اور وہ پہلے کی طرح پیار اور محبت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ لیکن اگر ایسے ہی حالات پیدا ہو جائیں کہ صلح کی کوئی صورت نہ ہو سکے تو پھر خلع کی صورت میں قاضی کے سپرد یہ معاملہ کیا جائے اور وہ اس کا فیصلہ کرے۔ بہرحال یہ امر اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ ذرا ذرا سی بات پر خلع اور

طلاق تک نوبت پہنچا دینا نہایت افسوس ناک امر ہے اور یہ اتنا بھیانک اور ناپسندیدہ طریق ہے کہ ہر شریف آدمی کو اس سے نفرت ہونی چاہیے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا

پھر اگر (اوپر کی بیان کردہ دو طلاقوں کے گزر جانے کے بعد بھی خاوند اسے تیسری) طلاق دے دے تو وہ عورت اس

غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ

کے لئے جائز نہ ہوگی جب تک کہ وہ اس کے سوا (کسی) دوسرے خاوند کے پاس نہ جائے۔ لیکن اگر وہ (بھی) اسے

ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا

طلاق دے دے تو ان دونوں کو بشرطیکہ انہیں یقین ہو کہ وہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدّوں کو قائم رکھ سکیں گے آپس میں

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۱﴾

دوبارہ رجوع کر لینے پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدّیں ہیں جنہیں وہ علم والے لوگوں کے لئے کھول کر بیان کرتا ہے۔

تفسیر ۔ پہلے فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ میں دو صورتیں بیان کی تھیں۔ اب طلاق والی صورت کو علیٰحدہ بیان کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو اس صورت میں وہ عورت اس مرد کے لئے جائز نہیں ہوگی ہاں اگر وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرے اور پھر دوسرا بھی اسے طلاق دے دے یا فوت ہو جائے اور پھر وہ پہلا شخص اور یہ عورت یقین رکھتے ہوں کہ وہ حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں گے تو پھر ان دونوں کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ طَلَّقَ رَجُلٌ اِمْرَأَتَهٗ ثَلَاثًا۔ فَتَزَوَّجَهَا رَجُلٌ ثُمَّ طَلَّقَهَا قَبْلَ اَنْ يَّدْخُلَ بِهَا فَاَرَادَ زَوْجُهَا الْاَوَّلُ اَنْ يَّتَزَوَّجَهَا فَسُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ لَا حَتّٰى يَذُوْقَ الْاٰخِرُ مِنْ عُسَيْلَتِهَا مَا ذَاقَ الْاَوَّلُ (مسلم کتاب النکاح باب لا تحل المطلقة ثلاثا۔۔۔) یعنی ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اور پھر اس کی بیوی نے ایک اور

شخص سے نکاح کر لیا مگر اس نے بھی شادی سے قبل اسے طلاق دے دی۔ اس پر اس کے پہلے خاوند نے چاہا کہ وہ دوبارہ اس عورت سے نکاح کر لے اور اس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ جب تک دوسرا خاوند اس سے صحبت نہ کرے اور پھر کسی وجہ سے اسے طلاق نہ دے دے وہ پہلے کے لئے جائز نہیں ہو سکتی۔ غرض دوسرے خاوند کا ہم صحبت ہونا شرط ہے اس کے بغیر وہ پہلے خاوند کے عقد میں نہیں آ سکتی۔ مسلمانوں نے اپنے تنزل کے دور میں جہاں اور بہت سی خلافِ اسلام رسوم اپنے اندر داخل کر لیں تھیں وہاں انہوں نے حلالہ جیسی گندی رسم بھی اپنے اندر جاری کر لی۔ یعنی انہوں نے طلاق بتّہ کے بعد عورت کو اپنے پہلے خاوند کے نکاح میں لانے کا یہ نرالا ڈھنگ نکالا کہ مطلّقہ عورت سے کسی غیر شخص کا صرف ایک رات کے لئے نکاح کر دیا جاتا اور وہ اس سے ہم صحبت ہوتا اور صبح اٹھ کر وہ اس عورت کو طلاق دے دیتا تاکہ وہ اپنے پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح کر سکے۔ گویا اس نکاح کا ڈھونگ صرف اس لئے رچایا جاتا کہ پہلے خاوند سے اس کا نکاح کیا جا سکے۔ مگر اسلام اس طریق کو ناجائز قرار دیتا ہے اور حلالہ کرنے اور کروانے والوں پر لعنت ڈالتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ (سنن ترمذی کتاب النکاح باب فی المحلل والمحلل له) یعنی اللہ تعالیٰ حلالہ کرنے والے پر بھی اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا ہو اس پر بھی لعنت ڈالتا ہے پس حلالہ کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں اسلامی قانون یہی ہے کہ تین طلاق کے بعد عورت کسی اور مرد سے باقاعدہ شادی کرے اور اپنی زندگی اس کے گھر میں گزارے پھر اگر کسی وجہ سے وہ بھی طلاق دے دے یا وفات پا جائے تو عورت اپنے پہلے خاوند سے نئے مہر اور ولی کی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مقررہ مدت (کی آخری حد) کو پہنچ جائیں تو یا تو انہیں مناسب طور پر روک لو

بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ

یا انہیں مناسب طور پر رخصت کر دو۔ اور انہیں تکلیف دینے کے لئے (اس نیت سے) کہ (بعد میں پھر) ان پر

ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ

زیادتی کرو مت روکو۔ اور جو شخص ایسا کرے تو (سمجھو کہ) اس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا ہے۔ اور تم اللہ (تعالیٰ) کے

وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ٞ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

احکام کو محل تمسخر نہ بناؤ۔ اور تم پر جو اللہ کا انعام ہوا ہے (اس کو) یاد رکھو۔ اور (اسے بھی یاد رکھو) جو اس نے اتارا ہے

وَ مَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ

یعنی کتاب اور حکمت (کو) کہ وہ اس کے ذریعہ سے تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ

اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۲۳۲ ع

اختیار کرو اور جان لو کہ اللہ ہر ایک بات کو خوب جانتا ہے۔

حلّ لُغات۔ هُزُوًا مصدر ہے اور اس کے معنے ہنسی کرنے کے ہیں۔ اس آیت میں یا تو مصدر بمعنے مفعول ہے یعنی جس سے ہنسی کی جائے۔ یا مصدر مبالغہ کے لئے ہے کیونکہ بعض اوقات مصدر مبالغہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یا حذف مضاف ہے۔ یعنی ہنسی کا مقام (اعراب القرآن الکریم للدرویش)۔

تفسیر۔ اس آیت میں طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ سے مراد طلاق رجعی ہے اور بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ کے دو معنے ہیں۔ اوّل میعاد کے ختم ہونے کے قریب پہنچ جانا (۲) مدت کا ختم ہو جانا (لسان العرب)۔ اس جگہ پہلے معنے مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جب دوسری طلاق کے بعد عدت ختم ہونے لگے تو تمہیں رجوع کا اختیار ہے۔ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ میں دوبارہ اس مسئلہ پر زور دیا کہ عورتوں سے دو ہی قسم کے سلوک کرنے کا حکم ہے۔ یا تو انہیں مناسب رنگ میں اپنے پاس رکھ لو۔ یا مناسب رنگ میں رخصت کر دو۔ یہ نہ ہو کہ تم اس نیت کے ساتھ رجوع کرو کہ بعد میں پھر اسے دکھ دینے کا ایک موقعہ تمہارے ہاتھ آ جائے گا۔ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ اور جو شخص عورت کو دکھ دینے کے لئے ایسا کرے گا وہ بظاہر تو اپنی بیوی کو دکھ دے رہا ہو گا لیکن درحقیقت اپنی جان پر ظلم کر رہا ہو گا۔ اس لحاظ سے بھی کہ اس سے تمدن میں ابتری پیدا ہو گی اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ عورت پر ظلم کر کے اپنی شقاوت قلبی کا ثبوت لوگوں کے لئے مہیّا کرے گا۔

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ۔ فرمایا دوسری قوموں کو تو یہ تعلیم نصیب ہی نہیں ہوئی۔ تمہیں یہ پاک تعلیم دی گئی ہے جس کی بات بات حکمت پر مبنی ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اس پر عمل کرو اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاؤ کہ اس نے دوسری قوموں کی طرح تمہیں ٹھوکریں کھانے سے بچا لیا ہے۔ اگر تم نے اس

بابرکت تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا اور تم بھی اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے تو تم سے زیادہ بدقسمت اور کون ہو گا؟ تمہیں چاہیے کہ تم ان احکام اور ہدایات پر عمل کرو اور وہ طریق اختیار نہ کرو جو تقویٰ کے خلاف ہو۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پورا کر لیں۔ تو تم انہیں جب کہ وہ نیک طریق پر باہم رضامند ہو جائیں

اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

اپنے خاوندوں کے ساتھ نکاح کر لینے سے مت روکو۔ یہ (وہ بات) ہے کہ جس کی تم میں سے ہر اس شخص کو جو اللہ پر

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

اور روز آخرت پر ایمان لاتا ہے نصیحت کی جاتی ہے۔ (اور سمجھ لو کہ) یہ بات تمہارے حق میں سب سے زیادہ برکت

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۳﴾

والی اور سب سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حل لغات۔ تَعْضُلُوْهُنَّ عَضَلَ عَلَيْهِ عَضْلًا کے معنے ہیں۔ ضَيَّقَ عَلَيْهِ وَحَبَسَهٗ وَمَنَعَهٗ۔ (اقرب) یعنی کسی پر ناواجب تنگی ڈالنا۔ اس کو روکے رکھنا اور اسے دوسرے کاموں سے منع کر دینا۔ ان معنوں کے لحاظ سے لَا تَعْضُلُوْهُنَّ کا ترجمہ یہ ہو گا۔ کہ ان کو تنگ مت کرو۔ پابند نہ کرو۔ یا روکو نہیں۔

اَزْکٰی کے معنے اَنْفَعُ کے بھی ہیں اور (۲) زیادہ پاکیزہ کے بھی ہیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں بَلَغْنَ کے وہ معنے نہیں جو پہلے بیان ہوئے ہیں بلکہ اس جگہ میعاد کے ختم ہونے کے معنے ہیں۔ اور اَجَل سے حریت والی مدت مراد ہے کہ جب وہ عدت پوری کر لیں اور آزادی کے زمانہ میں آ جائیں فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ میں ازواج کے متعلق اختلاف ہوا ہے۔ (۱) بعض کہتے ہیں کہ اس سے پہلا خاوند مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس سے صلح کر لے۔ اس مفہوم کو مدّنظر رکھتے ہوئے طَلَّقْتُمْ سے مراد طلاق رجعی ہو گی تین طلاقیں مراد نہ ہوں گی۔ (۲) بعض کہتے ہیں کہ خاوند سے مراد آئندہ ہونے والا خاوند ہے، اس صورت میں

طَلَّقْتُمُ سے مراد طلاق بائن ہوگی۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ پہلے بائن طلاق کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے اب یہاں خاوند سے مراد نیا خاوند ہے پہلا خاوند نہیں۔ مگر میرے نزدیک دونوں معنے ہو سکتے ہیں کیونکہ دنیا میں دونوں قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کسی جھگڑے کے بعد ان کے خاندان کی مستورات دوبارہ اپنے پہلے خاوندوں کے گھروں میں بسنا چاہیں تو وہ روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اب اس مرد سے تعلق قائم رکھنا ہماری غیرت کے خلاف ہے یا کہتے ہیں کہ آگے ہی بہت بدنامی ہو چکی ہے۔ اب کب تک طلاقیں ہوتی چلی جائیں گی؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں نصیحت فرمائی ہے کہ ایسے مرد اور ایسی عورتیں جب آپس میں دوبارہ نکاح پر راضی ہو جائیں تو عورتوں کے رشتہ دار انہیں بدنامی وغیرہ کے خیال سے یا خاوند کے پچھلے اعمال پر ناراضگی کے سبب سے اپنے سابق خاوندوں سے نکاح کرنے سے روکیں نہیں۔

اس کے مقابل میں بعض لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دے کر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اور اگر وہ کسی اور جگہ نکاح کرنا چاہیں تو اس میں سو سو روڑے اٹکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور عورت کی برائیاں دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ بھی متنفر ہو جائیں اور عورت کے نکاح میں روک واقع ہو جائے۔ رؤساء بالعموم ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ وہ طلاق بھی دے دیتے ہیں اور عورتوں کو اور جگہ نکاح بھی نہیں کرنے دیتے۔ پس فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ سے یہ بھی مراد ہے کہ دوسرے نکاح کے متعلق عورتوں کے راستہ میں روکیں مت ڈالو۔ اور یہ بھی کہ اگر طلاق رجعی کی عدت ختم ہو جانے کے بعد عورت اپنے پہلے خاوند سے نکاح کے ذریعے پھر تعلق قائم کرنا چاہے۔ تو اس کے رشتہ داروں کو روک نہیں بننا چاہیے۔ مگر لَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ سے یہ مراد نہیں کہ وہ عورت خود بخود جس سے چاہے بغیر ولی کی وساطت کے نکاح کر لے۔ ولی کا ہونا بہر حال ضروری ہے، اور اگر ولی نہ مانیں تو حکومت کی معرفت نکاح کر لے۔

اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت کے ولی کسی حد تک بھی عورت کو روک سکتے ہیں۔ یا کسی مرحلہ پر بھی انہیں یہ حق حاصل نہیں؟ اس کے متعلق امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ایک دو موقعوں تک تو اولیاء روک ڈال سکتے ہیں لیکن اگر وہ انکار ہی کرتے چلے جائیں اور کسی سے بھی اس کی شادی نہ ہونے دیں تو یہ ان کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ گویا ایک دو خواہشمندوں سے روکنا تو احتیاط میں شامل سمجھا جائے گا لیکن ان کو اتنا وسیع اختیار نہیں ہوگا کہ جہاں اور جب بھی وہ عورت نکاح کرنا چاہے اسے روک دیں۔ (۲) بعض کہتے ہیں کہ اگر بڑا ولی اجازت نہ دے تو دوسرے ولی کے ذریعے وہ اپنا نکاح کرا سکتی ہے۔ (۳) بعض کہتے ہیں کہ بلا جائز ولیوں یا سلطان کے نکاح جائز نہیں اور یہی درست ہے (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعة کتاب النکاح خلاصة مباحث الولی)۔ ہاں اگر ولی کسی

صورت میں بھی رضا مند نہ ہوں تو وہ حاکم وقت اور قاضی کے ذریعہ کسی دوسری جگہ جہاں وہ اجازت دے نکاح کرا سکتی ہے یا قاضی کی معرفت اولیاء پر دباؤ ڈال سکتی ہے کہ وہ روکیں نہ ڈالیں۔

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ میں بتایا کہ یہ قانون تمہارے لئے دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے بڑا مفید اور بابرکت ہے۔ یعنی تمدنی نقطہ نگاہ سے بھی اس قانون کی متابعت تمہارے لئے مفید ہے اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ قانون تمہارے اندر پاکیزگی کی روح پیدا کرنے والا ہے۔

وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔ (یہ ہدایت) ان

اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ

کے لئے (ہے) جو دودھ پلانے (کے کام) کو (اس کی مقررہ مدت تک) پورا کرنا چاہیں۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے

كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا

ذمہ حسب دستور ان (دودھ پلانے والیوں) کا کھانا اور ان کی پوشاک ہے۔ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ

تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَ عَلَى

ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی۔ کسی والدہ کو اپنے بچے کے ذریعہ سے دکھ نہ دیا جائے۔ اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ

الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ

سے (دکھ دیا جائے) اور وارث پر (بھی) ایسا ہی (کرنا لازم) ہے۔ اور اگر وہ دونوں آپس کی رضامندی اور

مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ

باہمی مشورہ کے ساتھ دودھ چھڑانا چاہیں تو (اس میں) ان پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو (کسی دوسری

تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ

عورت سے) دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں جب تم وہ (معاوضہ) جو تم نے دینا کیا ہے

اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا

مناسب طور پر ادا کر دو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اللہ اسے یقیناً دیکھتا ہے۔

حل لغات۔ تَسْتَرْضِعُوْٓا اِسْتَرْضَعَ کے معنے ہیں طلب مُرْضِعَةً اُس نے کسی دودھ پلانے والی عورت کو طلب کیا۔ اور اِسْتَرْضَعَ وَالِدُہٗ کے معنے ہیں والد نے اپنے بچہ کو کسی اور سے دودھ پلوالیا۔ اور اِسْتَرْضَعَتِ الْمَرْأَةُ الطِّفْلَ کے معنے ہیں اِتَّخَذَتْ مُرْضِعَةً لَھَا۔ اس نے دودھ پلانے کے لئے دایہ کو رکھ لیا۔ (تاج العروس)

تفسیر۔ چونکہ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ سے یہ دھوکا لگ سکتا تھا کہ دوسال تک رضاعت ضروری ہے اس لئے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ فرما کر بتا دیا کہ اس سے کم مدّت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں دوسال سے زیادہ کی نفی بھی کر دی گئی ہے کیونکہ كَامِلَيْنِ کا لفظ بتاتا ہے کہ دوسال سے زیادہ دودھ پلانا جائز نہیں۔

وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ میں کھانے اور کپڑے سے مراد تمام اخراجات ہیں نہ کہ صرف روٹی اور لباس۔ اور معروف سے مراد باپ کی مقدرت ہے کہ امیر اپنی طاقت کے مطابق دے اور غریب اپنی طاقت کے مطابق۔ اس جگہ عام دودھ پلانے والی عورتوں کا ذکر نہیں بلکہ ماؤں کا ذکر ہے۔ اور یہ ذکر طلاق کے ضمن میں کیا گیا ہے کہ اگر دودھ پلانے والی عورت کو طلاق دی جائے تو بچہ کی خاطر عورت کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچے کو دودھ مقررہ مدت تک پلائے اور اس کے بدلہ میں خاوند پر فرض ہے کہ عام مزدور عورت کی طرح نہیں بلکہ اپنی توفیق کے مطابق اسے خرچ دے کیونکہ یہ امر عورت کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والا ہوگا کہ ایک طرف تو اسے مجبور کیا جائے کہ وہ طلاق کے بعد بھی بچہ کو دودھ پلاتی رہے۔ اور دوسری طرف اسے ایسی حالت میں رکھا جائے جو پہلی حالت سے ادنیٰ ہو اور اس کے لئے ذلت کا موجب ہو مگر اس کے ساتھ ہی لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا کہہ کر اس

طرف اشارہ فرمادیا کہ مرد سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی طاقت سے زیادہ خرچ کرے یہ بھی نامناسب ہے اور عورت سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ایک نوکر کی طرح طلاق کے بعد ایک عرصہ گھر میں گزار دے یہ بھی نامناسب ہے۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَۃٌۢ بِوَلَدِھَا کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ماں اپنے بچہ کی وجہ سے باپ کو ضرر نہ دے اور یہ بھی کہ ماں اپنے بچے کی وجہ سے ضرر نہ دی جائے اس آیت میں مرد اور عورت دونوں کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ بچہ کو ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ بہت سے نادان اس حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو بچے ہلاک ہو جاتے ہیں یا ان کی تربیت خراب ہوتی ہے۔ اس قسم کا فعل درحقیقت قتلِ اولاد کے مشابہ ہے۔ اور قرآن کریم نے اس سے روک کر آئندہ اولادوں پر احسان عظیم کیا ہے۔

وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کا عطف وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ پر ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب حق قائم کیا ہے جو تمدن کی صورت ہی بدل دیتا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ اگر باپ مر جائے تو باپ کے جو ورثاء ہوں۔ ان پر بچہ کو دودھ پلانے والی عورت کا خرچ ہوگا۔ گویا ورثہ کے ساتھ بوجھ بٹانے کا کام بھی ان کے سپرد کر دیا۔ خواہ انہیں ترکہ ملا ہو یا نہ ملا ہو، تھوڑا ہو یا بہت۔ چنانچہ فرمایا وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ وارث پر بھی ویسا ہی حق ہے جیسا کہ باپ پر یعنی باپ کا وارث خواہ لڑکا ہو خواہ کوئی قریبی رشتہ دار اس پر یہ خرچ واجب ہوگا۔ یعنی اس کی پرورش کرنا احسان کے طور پر نہیں ہوگا بلکہ ایک حق کے طور پر ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر واجب کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی مطلب ہے کہ اس بچہ کے حصہ میں سے خرچ دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمدن کی ایک نئی بنیاد رکھی ہے کہ کمزور بچوں کی تربیت بطور حق ورثاء پر ڈال دی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب دودھ پلایا جا چکے تو پھر وہ بچوں کو لاوارث چھوڑ دیں بلکہ اس حق کو بلوغت تک ممتد کرنا پڑے گا اور ان کا فرض ہوگا کہ وہ بچہ کے کھانے اور لباس کے اخراجات کے علاوہ اس کے تعلیمی اخراجات بھی بالغ ہونے تک پورے کریں اور اس کی اعلیٰ درجہ کی تربیت مدنظر رکھیں تا کہ وہ قوم کا ایک مفید وجود بن سکے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ خرچ نسبتی طور پر تمام ورثاء پر پڑے گا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صرف سب سے بڑھ کر حق وراثت رکھنے والا شخص اس کا ذمہ دار ہوگا۔ خواہ اسے ترکہ میں سے کچھ ملا ہو یا نہ ملا ہو۔

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کے متعلق دودھ پلانے یا چھڑانے کا فیصلہ قرآن کریم نے نہ مرد کے اختیار میں رکھا ہے نہ عورت کے اختیار میں بلکہ دونوں کو مشترکہ اختیار دیا ہے۔ شاید تمام شرائع کی تاریخ میں یہ منفرد مثال ہے کہ اس طرح اہلی معاملات میں میاں بیوی کو ایک مقام

پر کھڑا کر کے برابر کے اختیار دیئے گئے ہیں۔ ہاں یہ شرط ضرور ہے کہ دودھ پلانے کی جو مدت قرآن کریم نے مقرر کی ہے اس سے زیادہ دیر تک دودھ پلانے پر نہ خاوند مجبور کر سکتا ہے نہ عورت زور دے سکتی ہے۔ جب طلاق کے بعد بھی عورت کے جذبات کا اس قدر خیال رکھنے پر خاوند کو مجبور کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ جو عورت نکاح میں ہو ان امور میں اس کے جذبات کا خیال رکھنا اسلام کے نزدیک کس قدر ضروری ہوگا۔

وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ میں بتایا کہ بچوں کو دوسروں سے دودھ پلوانا حقوق پدری کے خلاف نہیں نہ حقوق مادری کے خلاف کہ اس کو گناہ سمجھو گناہ تب ہوگا اگر بلا اجرت دینے کے ظلماً کسی سے یہ کام لو۔ کیونکہ اس صورت میں تم نے دو گناہ کئے ایک تو دوسرے کا مال لینے کا اور ایک بچہ کے حقوق ادا نہ کرنے کا۔ انہی معنوں سے لَا جُنَاحَ کے معنے حل ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کے حقوق بطور حق کے ہیں اور ان میں کمی کرنا موجب گناہ ہوتا ہے۔

اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو بظاہر ایک بے معنی فقرہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لفظی معنے یہ بنتے ہیں کہ جب تم دے دو جو تم دے چکے ہو۔ حالانکہ جو معاوضہ ایک دفعہ دے دیا گیا ہو اس کے دوبارہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس مشکل کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرضعہ کی مزدوری پہلے دینی ضروری ہے مگر میرے نزدیک اس سے مزدوری پہلے دینا ثابت نہیں کیونکہ سَلَّمَ کے معنے صرف سپرد کرنے کے ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے معنے راضی ہونے کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ عربی زبان میں سَلَّمَ بِهٖ کے معنے ہوتے ہیں رَضِيَ وہ اس سے راضی ہوگیا۔ (اقرب) قرآن کریم میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء:٦٦) یعنی تیرے ربّ کی قسم جب تک وہ ہر اس بات میں جس کے متعلق ان میں جھگڑا ہو جائے وہ تجھے حَکم نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ تو کرے اس سے وہ اپنے نفوس میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کریں اور پورے طور پر راضی نہ ہو جائیں اس وقت تک وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے، ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اِذَا سَلَّمْتُمْ کے یہ معنے ہوں گے کہ جب تم دودھ پلانے والیوں کو مناسب حق دینے پر رضامند ہو جاؤ اور تمہاری نیت یہ ہو کہ تم اتنی رقم بہرحال دے دو گے تو پھر کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانے میں کوئی حرج نہیں۔ گویا ایتان بالمعروف پر باہم رضامند ہو جانے کے بعد اگر کسی اور سے دودھ پلوالو تو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ ان معنوں کے لحاظ سے اُجرت کا پہلے دینا ضروری نہیں۔ مگر اجرت کا پہلے مقرر ہو جانا بہرحال ضروری ہے۔ لیکن اگر سَلَّمْتُمْ کے

معنے سپرد کرنے کے بھی لئے جائیں تب بھی اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ پہلے اجرت سپرد کرو تب دودھ پلوانا جائز ہوگا بلکہ یہاں ایک قاعدہ بیان ہوا ہے، اور وہ یہ کہ اگر اجرت سپرد نہ کروگے تو گناہ ہوگا گویا اِذَا سَلَّمْتُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ کے ساتھ ہے نہ کہ تَسْتَرْضِعُوْا کے ساتھ۔ مگر سَلَّمْتُمْ کے معنے حل کرنے کے بعد بھی یہ سوال قائم رہتا ہے کہ اس جگہ اٰتَیْتُمْ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنے ہیں ''تم نے دے دیا ہے'' یا ''تم دے چکے ہو''۔ اس لحاظ سے اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ جب تم اس حق پر رضامند ہو جاؤ جو تم دے چکے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک بے معنے فقرہ بن جاتا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ عربی زبان میں کبھی ماضی کا صیغہ قطعی فیصلہ پر دلالت کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَ اَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ۔ (المائدۃ:۷)

جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اپنے مونہوں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لیا کرو حالانکہ وُضو نماز کے لئے کھڑے ہونے سے پہلے کیا جاتا ہے نہ کہ کھڑے ہوتے وقت۔ پس یہاں یہی مراد ہے کہ جب تم نماز کا پختہ ارادہ کر لو تو پہلے وُضو کر لیا کرو۔ اور یہی اٰتَیْتُمْ کے معنے ہیں کہ جو کچھ تم اسے دینے کا پختہ فیصلہ کر چکے ہو۔ اگر اس کے یہ معنے نہ کئے جائیں تو آیت کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ پہلا روپیہ جو تم اسے دے چکے ہو وہ اسے پھر دے دو۔ یعنی اگر پہلے سو روپیہ دے چکے تھے تو پھر اور سو روپیہ دے دو حالانکہ اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ درحقیقت اس کے یہی معنے ہیں کہ اگر تم اپنے بچوں کو کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ تم نے اسے جو کچھ دینے کا پختہ فیصلہ کیا ہے اس پر پورے طور پر قائم ہو جاؤ اور اس میں کسی قسم کی حیل وحجت سے کام نہ لو۔

اس آیت میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ حق الخدمت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے ادا کرنے کا انسان ایسا عہد کرے کہ گویا ادا کر ہی دیا ہے اور بالمعروف کہہ کر اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حق الخدمت ادا کرنے میں معروف کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یعنی معاوضہ ملک کی اقتصادی حالت کے مطابق ادا کیا جائے۔ اس قدر کم نہ ہو کہ اس وقت کی اقتصادی حالت کے مطابق اس سے دودھ پلانے والی عورت کا گزارہ ہی نہ ہو سکے۔ اسی طرح بالمعروف میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر تمہاری مالی حالت عام لوگوں سے اچھی ہو تو نہ صرف پہلی حد بندی کو مدّنظر رکھو بلکہ اس سے زائد یہ امر بھی مدنظر رکھو کہ ایسا حق الخدمت ادا کرو۔ جو تمہاری اپنی مالی حالت کے مطابق ہو۔ گویا کم سے کم حق الخدمت تو وہ ہو جو اس زمانہ کے حالات کے مطابق گزارہ کے لئے کافی ہو۔ لیکن اگر ہو سکے تو اس سے زیادہ دو اور صرف زمانہ کے حالات کے مطابق ہی نہ دو بلکہ اپنی مالی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا معاوضہ دو جو تمہارے حالات کے مطابق ہو۔

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ

اور تم میں سے جن (لوگوں) کی روح قبض کر لی جاتی ہے۔ اور وہ (اپنے پیچھے) بیویاں چھوڑ جاتے ہیں (چاہیے کہ)

بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ

وہ (یعنی بیویاں) اپنے آپ کو چار مہینے (اور) دس (دن) تک روک رکھیں۔ پھر جب وہ

اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ

اپنا مقررہ وقت پورا کر لیں وہ اپنے متعلق مناسب طور پر جو کچھ (بھی) کریں اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔

بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۵﴾

اور جو تم کرتے ہو اللہ (تعالیٰ) اس سے واقف ہے۔

حلّ لُغات۔ یَتَرَبَّصْنَ میں مبتدا محذوف ہے۔ یعنی حُکْمُ اَزْوَاجِھِمْ اَنْ یَّتَرَبَّصْنَ اَوْ اَزْوَاجُھُمْ یَتَرَبَّصْنَ یعنی حُکْمُ اَزْوَاجِھِمْ مبتدا ہے جو محذوف ہے اور اَنْ یَّتَرَبَّصْنَ اُس کی خبر ہے۔ (املاء ما منّ بہ من الرحمٰن)

تفسیر۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر چار ماہ دس دن کی عدّت گذرنے کے بعد عورتیں اپنے مستقبل کے متعلق کوئی قدم اٹھائیں۔ تو مردوں پر تو کوئی گناہ نہ ہوگا لیکن عورتوں پر گناہ ہوگا کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ (البقرۃ:۲۴۱) یعنی عورتوں کو اپنے گھروں سے ایک سال تک کوئی شخص نکالنے کا مجاز نہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ بات درست نہیں کہ ایسی صورت میں عورتوں پر گناہ ہے کیونکہ اسی آیت میں اس کے بعد بِالْمَعْرُوْفِ کا لفظ آیا ہے جس سے صاف ثابت ہے کہ اگر وہ نکاح ثانی کر لیں تو یہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایک پسندیدہ اور قابل ستائش فعل ہے۔ اگر گناہ ہوتا تو بِالْمَعْرُوْفِ کے الفاظ استعمال نہ کئے جاتے کیونکہ معروف کے معنے رائج الوقت قانون یا فطرتی جذبہ یا عقلِ عامہ کے مطابق کسی کام کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور جو کام قانون کے مطابق ہو یا فطرتی جذبہ کے مطابق ہو یا انسانی عقل اس کا تقاضا کرتی ہو اس کام کو کوئی دانا شخص بُرا قرار نہیں دے سکتا۔ درحقیقت یہ آیت ان لوگوں کے لئے زجر ہے جو بیوہ

عورتوں کو نکاح ثانی سے روکتے ہیں فرماتا ہے۔ اگر وہ نکاح کرلیں تو کیا تم پر کوئی گناہ ہے۔ یعنی ہرگز کوئی گناہ نہیں۔ پھر تم انہیں نکاح سے کیوں روکتے ہو؟ وہ اپنے نفوس کے متعلق جو کچھ فیصلہ کریں اس کا وہ حق رکھتی ہیں۔ ہاں! اس میں یہ اشارہ ضرور پایا جاتا ہے کہ اگر وہ کوئی غیر معروف کام کریں اور حکام و اولیاء انہیں نہ روکیں تو یہ گناہ ہوگا۔

بیوہ کے لئے چار ماہ دس دن کی مدت مقرر کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس عرصہ میں جنین میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور اسے حمل کا یقینی طور پر علم ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ضروری ہوتا ہے کہ وہ نکاح کے لئے وضع حمل تک انتظار کرے۔

وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ

عورتوں سے نکاح کی درخواست کے متعلق جو بات تم اشارۃً (ان سے) کہو

النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

یا اپنے دلوں میں رکھو اس پر تمہیں کوئی گناہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے

سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا

کہ تمہیں ضرور ان کا خیال آئے گا۔ لیکن تم ان سے خفیہ طور پر (کوئی) معاہدہ نہ کرلو۔ ہاں یہ (اجازت ہے)

قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ۬ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ

کہ تم ان سے کوئی مناسب بات کہہ دو۔ اور جب تک (عدّت کا) حکم اپنی میعاد کو (نہ) پہنچ جائے

الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ

(اس وقت تک) تم نکاح کرنے کا پختہ ارادہ نہ کرلو۔ اور جان لو کہ تمہارے دلوں میں جو (کچھ بھی) ہے اللہ (تعالیٰ)

فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ؑ ﴿۲۳۶﴾

اسے جانتا ہے۔ پس تم اس (بات) سے ڈرو۔ اور جان لو کہ اللہ (تعالیٰ) بہت بخشنے والا (اور) بردبار ہے۔

حلّ لُغات۔ عَرَّضْتُمْ عَرَّضْتُ لَهٗ وَعَرَّضْتُ بِهٖ تَعْرِيْضًا کے معنے ہیں اِذَا قُلْتَ قَوْلًا وَاَنْتَ

تَعْنِيَةٍ فَالتَّعْرِيْضُ ضِدُّ التَّصْرِيْحِ مِنَ الْقَوْلِ (اقرب) یعنی تعریض ایسے کلام کو کہتے ہیں جو تصریح کے مخالف ہو۔ اور صرف اشارۃً ایسی بات کہی جائے جس کا اصل مفہوم کہنے والا ہی سمجھتا ہو۔

صاحب مفردات لکھتے ہیں۔ اَلتَّعْرِيْضُ كَلَامٌ لَهٗ وَجْهَانِ مِنْ صِدْقٍ وَ كِذْبٍ اَوْ ظَاهِرٍ وَ بَاطِنٍ یعنی تعریض ایسے کلام کو کہتے ہیں جس کے صدق اور کذب یا ظاہر اور باطن کے لحاظ سے دو مفہوم سمجھے جاسکیں۔

تَعْزِمُوْا عَزَمَ الْاَمْرَ وَعَلَيْهِ کے معنے ہیں عَقَدَ الضَّمِيْرَ عَلَيْهِ۔ کسی بات کا پختہ ارادہ کرلیا (اقرب)۔

تفسیر۔ فرماتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم ان عورتوں سے نکاح کے سلسلہ میں کوئی بات اشارۃً کہہ دو۔ مثلاً کسی بیوہ سے کہہ دیا کہ مشورہ سے کام کرنا بہتر ہوگا۔ آپ کو اگر کوئی ضرورت محسوس ہو تو میں ہمدردانہ مشورہ کے لئے حاضر ہوں۔ اب لفظ مشورہ عام ہے خواہ وہ اپنے لئے ہو یا کسی اور کے لئے۔ اس طرح بات بھی مخفی رہتی ہے اور اشارۃً اس کا اظہار بھی ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ارادۂ نکاح کو اپنے دل میں مخفی رکھنا بھی جائز ہے۔ تاوقتیکہ چار ماہ اور دس دن کی میعاد نہ گزر جائے۔

لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا میں عورتوں سے خفیہ معاہدہ نکاح کی کلّی ممانعت کرتے ہوئے قولِ معروف کی اجازت دی گئی ہے مگر قول معروف سے شادی کی درخواست مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے ہمدردی اور غمخواری کا اظہار کرو تاکہ اس پر یہ اثر ہو کہ یہ شخص میرا خیر خواہ ہے۔ اور میں اس سے ضرورت پر مفید مشورہ لے سکتی ہوں ورنہ یہ مطلب نہیں کہ اسے صاف طور پر نکاح کے لئے کہہ دیا جائے ایسا کہنا ہرگز جائز نہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ تم دونوں مل کر اس امر کا فیصلہ نہ کرلو کہ عدّت کے بعد ہم آپس میں نکاح کر لیں گے۔ اس سے پہلے اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ میں تو مردوں کو سمجھایا کہ وہ شادی کے متعلق عورتوں کے سامنے پورا اظہار نہ کریں۔ ہاں! اگر وہ دل میں نیت رکھیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر اس جگہ عورتوں کو بھی منع کر دیا ہے کہ اگر وہ مردوں کی بات کو سمجھ جائیں تو فوراً ہاں نہ کر دیں بلکہ وہ بھی خاموش رہیں اور اپنے ارادۂ نکاح کا ان کے سامنے اظہار نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر اس لئے کیا ہے کہ عام طور پر لوگ ایسے امور میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور نفسانی جوشوں سے دب جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عدت کے اندر تمہارا نکاح کے متعلق آپس میں کوئی فیصلہ کرلینا قطعی طور پر ناجائز ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔ پس تم اس سے ڈرو۔ اور سمجھ لو کہ کسی اور کو پتہ ہو یا نہ ہو خدا تعالیٰ کو تو پتہ ہے اس لئے تم چوکس

رہواور احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہ کرو۔

یا یہ کہ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ میں دوسرا حکم ہے اور وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ میں لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا کے حکم کے سلسلہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم ان سے کوئی مخفی معاہدہ نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل کی باتوں تک کو جانتا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ان احکام کی خلاف ورزی ہو جائے تو تم اللہ تعالیٰ کو غَفُوْرٌ اور حَلِيْمٌ پاؤ گے۔ بلکہ اس میں لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ کی حکمت بتائی ہے۔ کہ چونکہ خدا تعالیٰ پردہ پوش ہے اور وہ انسان کی کمزوری سے واقف ہے۔ اس لئے اس نے صرف چار ماہ دس دن کی عدّت مقرر کی ہے۔ زیادہ سخت احکام اس نے نہیں دیئے۔ اور حلیم کہہ کر بتایا کہ اللہ تعالیٰ دانا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس غرض کے لئے کس قدر انتظار کرنا ضروری ہے۔ اگر اس قسم کے احکام نہ دیئے جاتے تو تمدّن میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتیں اور سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ پس اس خیال سے کہ نکاح تقویٰ کا ایک ذریعہ ہے۔ جلدی نہ کرو۔ خدا تعالیٰ اس امر کو بہتر سمجھتا ہے کہ تمہارے لئے کس قدر دیر مناسب ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو اس وقت بھی طلاق دے دو جبکہ تم نے ان کو چھوا تک نہ ہو۔ یا مہر نہ

تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ

مقرر کیا ہو۔ اور (چاہیے کہ اس صورت میں) تم انہیں مناسب طور پر کچھ سامان دو۔ (یہ امر) دولت مند پر اس کی طاقت

وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۷﴾

کے مطابق (لازم ہے) اور نادار پر اس کی طاقت کے مطابق (ہم نے ایسا کرنا) نیکوکاروں پر واجب کر دیا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْمُوْسِعُ اَوْسَعَ سے اسم فاعل ہے۔ اور اَوْسَعَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں صَارَ ذَا سَعَةٍ وَغِنًى وہ آدمی وسعت والا ہو گیا۔ یا غنی ہو گیا۔ اور اَوْسَعَ اللّٰهُ عَلٰی فُلَانٍ کے معنے ہیں اَغْنَاهُ خدا تعالیٰ نے اسے غنی کر دیا۔ (اقرب)

اَلْمُقْتِرِ اَقْتَرَ سے اسم فاعل ہے۔ اور اَقْتَرَ عَلٰی عَیَالِہٖ کے معنے ہیں قَلَّ مَالُہٗ وَافْتَقَرَ اُس کا مال کم ہو گیا اور وہ محتاج ہو گیا۔ اور اَقْتَرَ اللّٰہُ رِزْقَہٗ کے معنے ہیں ضَیَّقَہٗ وَ قَلَّلَہٗ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا مال کم کر دیا اور اسے تنگ دست کر دیا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ اب طلاق کے متعلق اللہ تعالیٰ بعض اور احکام بیان فرماتا ہے۔ طلاق کی پہلی صورت تو یہ تھی کہ میاں بیوی میں کوئی شدید اختلاف پیدا ہوا اور طلاق واقع ہو گئی۔ مگر بعض ایسی بھی عورتیں ہوتی ہیں کہ میاں بیوی ابھی اکٹھے بھی ہونے نہیں پاتے کہ طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ مثلاً نکاح کے معًا بعد ایسے گواہ مل گئے جنہوں نے ایسی گواہیاں دیں جن سے نکاح کی حرمت ثابت ہو گئی یا کم سے کم نکاح کی کراہت پیدا ہو گئی۔ مثلاً ادھوری گواہی ایسی مل گئی کہ یہ عورت خاوند کی رضاعی بہن ہے۔ پس گو وہ ادھوری گواہی ہو مگر خاوند کے دل میں کراہت تو پیدا ہو جائے گی اور اس قسم کی گواہیاں بعض دفعہ نکاحوں کے بعد مل جاتی ہیں۔ پس ایک صورت تو یہ ہے جس میں چھونے سے بھی پہلے طلاق دینے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح کے بعد دونوں خاندانوں کے بعض اکابر جن کو پہلے اس تعلق کا علم نہ ہوا ہو فیصلہ دے دیں کہ ہمارے آپس کے تعلقات ایسے ہیں کہ تم دونوں آپس میں نبھا نہیں کر سکو گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ عورت کو طلاق دے دو اور وہ چھونے سے پہلے اُسے طلاق دے دے۔

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً سے پتہ لگتا ہے کہ ایسا نکاح جس میں کوئی مہر مقرر نہ کیا گیا ہو وہ بھی جائز ہوتا ہے لیکن جیسا کہ اسلامی فقہاء نے تصریح کی ہے خواہ مہر کی تعیین نہ کی گئی ہو یہ ضرور سمجھا جائے گا کہ مہر مقرر ہے اور اس کی تعیین مہر بالمثل سے کی جائے گی۔ یعنی اسی حیثیت کے خاندان کے دوسرے افراد کو دیکھا جائے گا کہ اُن کا کیا مہر ہے؟ اور وہی مہر اس عورت کا قرار دیا جائے گا۔ (الهداية شرح البداية كتاب النكاح باب المهر)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ یہ ہدایت دیتا ہے کہ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۔ اگر تم عورتوں کو اُن کے چھونے سے پہلے طلاق دے دو یا ایسی صورت میں طلاق دو کہ تم نے اُن کا مہر مقرر نہ کیا ہو تو دونوں صورتوں میں تمہارا فرض ہوگا کہ تم اُن سے حسنِ سلوک کرو اور انہیں مناسب رنگ میں کچھ سامان دے دو۔ مالی وسعت رکھنے والا اپنی طاقت کے مطابق اس کام میں حصہ لے اور تنگدست اپنے حالات کو مدنظر رکھ کر حصہ لے اور یہ صرف طوعی نیکی نہیں بلکہ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ نیکی اور تقویٰ سے کام لینے والوں پر ہم نے یہ واجب کر دیا ہے کہ وہ عورتوں کو حسن سلوک کے ساتھ رخصت کریں۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایک انصاری نے ایک عورت سے شادی کی مگر اس کا مہر مقرر نہ کیا۔ ثُمَّ طَلَّقَهَا قَبْلَ اَنْ يَمَسَّهَا۔ پھر مجامعت سے قبل اُسے طلاق دے دی۔ جب یہ معاملہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم نے احسان کے طور پر اسے کوئی چیز بھی دی ہے اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ مَتِّعْهَا بِقَلَنْسُوَتِكَ اگر تمہارے پاس اور کوئی چیز نہیں تو اپنی ٹوپی ہی اُتار کر اس کے حوالے کر دو۔ (تفسیر بحر محیط زیر آیت ھذا) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا کس قدر حکم ہے۔ کہ اگر اور کوئی چیز نہ ہو تو مرد کو چاہیے کہ وہ اپنی ٹوپی یا پگڑی ہی اُتار کر اُسے دے دے اور خالی ہاتھ نہ جانے دے۔

لیکن اگر اس بارے میں کوئی جھگڑا پیدا ہو تو چونکہ قرآن کریم نے اصولی طور پر فیصلہ فرما دیا ہے کہ جھگڑے کی صورت میں اولی الامر کی طرف رجوع کیا کرو۔ اس لئے اختلاف کی صورت میں قاضی کے پاس فیصلہ لے جانا چاہیے وہ حالات دیکھ کر فیصلہ دے گا کہ خاوند نے اپنی حیثیت کے مطابق عورت کو اُس کا حق ادا کیا ہے یا نہیں؟

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ

اور اگر تم انہیں قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو لیکن مہر مقرر کر دیا ہو طلاق دے دو تو (اس صورت میں)

لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ

جو مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا آدھا (ان کے سپرد کرنا) ہوگا۔ سوائے اس (صورت) کے کہ وہ (یعنی عورتیں) معاف

يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ

کر دیں یا وہ (شخص) معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح (کا) باندھنا ہو۔ اور تمہارا معاف کر دینا تقویٰ کے

لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا

زیادہ قریب ہے۔ اور تم آپس میں (معاملہ کرتے وقت) احسان کو نہ چھوڑا کرو۔ (اور یاد رکھو) کہ جو کچھ تم کرتے ہو

تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۸﴾

اللہ (اسے) یقیناً دیکھتا ہے۔

تفسیر ۔ پہلے یہ بتایا تھا کہ اگر مہر مقرر نہ ہو اور طلاق کی ضرورت پیش آجائے تو کیا کرنا چاہیے؟ اب یہ بتاتا ہے کہ اگر مہر تو مقرر ہو چکا ہو مگر میاں بیوی کا تعلق قائم نہ ہوا ہو اور طلاق کی نوبت آجائے۔ تو کیا کرنا چاہیے؟ فرماتا ہے ایسی صورت میں طلاق دیتے وقت تمہیں نصف مہر ادا کرنا پڑے گا۔

مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ مَسّ سے کیا مُراد ہے؟ (۱) بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد میاں بیوی کا آمنے سامنے ہو جانا یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھنا مراد ہے مخصوص تعلقات مراد نہیں۔ (تفسیر مظہری زیر آیت ھذا) (۲) لیکن بعض کہتے ہیں کہ مَسّ سے مراد مخصوص تعلقات ہیں۔ کیونکہ چُھونا محاورہ کے طور پر صحبت کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے (املاء ما منّ بہ من الرحمٰن)۔ میرے نزدیک اس کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک واقعہ سے ہو جاتی ہے۔

جب عرب فتح ہوا اور اسلام پھیلنے لگا تو کندہ قبیلہ کی ایک عورت جس کا اسماء یا امیمہ نام تھا اور وہ جونیہ یا بنت الجون بھی کہلاتی تھی اُس کا بھائی لقمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی قوم کی طرف سے بطور وفد حاضر ہوا اور اس موقع پر اُس نے یہ بھی خواہش کی کہ اپنی ہمشیرہ کی شادی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دے اور بالمشافہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست بھی کر دی کہ میری ہمشیرہ جو پہلے ایک رشتہ دار سے بیاہی ہوئی تھی اب بیوہ ہے نہایت خوبصورت اور لائق ہے آپ اس سے شادی کر لیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ قبائل عرب کا اتحاد منظور تھا آپ نے اس کی یہ دعوت منظور کر لی اور فرمایا کہ ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی پر نکاح پڑھ دیا جائے۔ اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! ہم معزز لوگ ہیں مہر تھوڑا ہے آپ نے فرمایا۔ اس سے زیادہ میں نے اپنی کسی بیوی یا لڑکی کا مہر نہیں باندھا۔ جب اُس نے رضامندی کا اظہار کر دیا تو نکاح پڑھا گیا اور اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ کسی آدمی کو بھیج کر اپنی بیوی منگوا لیجیئے۔ آپ نے ابا اسیدؓ کو اس کام پر مقرر کیا۔ وہ تشریف لے گئے۔ جونیہ نے اُن کو اپنے گھر بلایا تو آپ نے کہا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں پر حجاب نازل ہو چکا ہے۔ اِس پر اُس نے دوسری ہدایات دریافت کیں۔ جو آپ نے بتا دیں۔ اور اونٹ پر بٹھا کر مدینہ لے آئے۔ اور ایک مکان میں جس کے گرد کھجوروں کے درخت بھی تھے لا کر اتارا۔ اُس کے ساتھ اُس کی دایہ بھی

اُس کے رشتہ داروں نے روانہ کی تھی۔ جس طرح ہمارے ملک میں ایک بے تکلّف نوکر ساتھ جاتی ہے تا کہ اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ چونکہ یہ عورت حسین مشہور تھی اور یوں بھی عورتوں کو دلہن دیکھنے کا شوق ہوتا ہے مدینہ کی عورتیں اس کو دیکھنے گئیں اور اس عورت کے بیان کے مطابق کسی عورت نے اُس کو سکھا دیا کہ رُعب پہلے دن ہی ڈالا جاتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تیرے پاس آئیں تو کہہ دیجیئو کہ میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں، اِس پر وہ تیرے زیادہ گرویدہ ہو جائیں گے۔ اگر یہ بات اس عورت کی بنائی ہوئی نہیں تو کچھ تعجب نہیں کہ کسی منافق نے اپنی بیوی یا اور کسی رشتہ دار کے ذریعہ یہ شرارت کی ہو۔ غرض جب اس کی آمد کی اطلاع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ اس گھر کی طرف تشریف لے گئے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ احادیث میں لکھا ہے۔ کہ فَلَمَّا دَخَلَ عَلَيْهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَبِي نَفْسَكِ لِيْ قَالَتْ وَ هَلْ تَهَبُ الْمَلِكَةُ نَفْسَهَا لِلسُّوْقَةِ؟ قَالَ فَاَهْوٰى بِيَدِهٖ يَضَعُ يَدَهٗ عَلَيْهَا لِتَسْكُنَ فَقَالَتْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ فَقَالَ قَدْ عُذْتِ بِمَعَاذٍ ۔ ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا فَقَالَ يَا اَبَا اُسَيْدٍ اُكْسُهَا رَازِقِيَّيْنِ وَاَلْحِقْهَا بِاَهْلِهَا (بخاری کتاب الطلاق باب من طلق و هل يواجه الرجل امرأته بالطّلاق) جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے پاس تشریف لائے تو آپ نے اُسے فرمایا کہ تو اپنا نفس مجھے ہبہ کر دے اُس نے جواب دیا کہ کیا ملکہ بھی اپنے آپ کو عام آدمیوں کے سپرد کیا کرتی ہے؟ ابواُسید کہتے ہیں کہ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس خیال سے کہ اجنبیت کی وجہ سے گھبرا رہی ہے اُسے تسلی دینے کے لئے اس پر اپنا ہاتھ رکھا۔ آپ نے اپنا ہاتھ ابھی رکھا ہی تھا کہ اُس نے یہ نہایت ہی گندہ اور نامعقول فقرہ کہہ دیا کہ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں۔ چونکہ نبی خدا تعالیٰ کا نام سُن کر ادب کی رُوح سے بھر جاتا ہے اور اُس کی عظمت کا متوالا ہوتا ہے۔ اُس کے اِس فقرہ پر آپ نے فوراً فرمایا کہ تو نے ایک بڑی ہستی کا واسطہ دیا ہے اور اس کی پناہ مانگی ہے جو بڑا پناہ دینے والا ہے اس لئے میں تیری درخواست کو قبول کرتا ہوں۔ چنانچہ آپ اُسی وقت باہر تشریف لے آئے اور فرمایا۔ اے ابا اسیدؓ! اِسے دو چادریں دے دو اور اسے اِس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دو۔ چنانچہ اس کے بعد اُسے مہر کے حصہ کے علاوہ بطور احسان دو رازقی چادریں دینے کا آپ نے حکم دیا تا کہ قرآن کریم کا حکم وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ پورا ہو۔ جو ایسی عورتوں کے متعلق ہے جن کو بلا صحبت طلاق دے دی جائے اور آپ نے اُسے رخصت کر دیا اور ابو اسیدؓ ہی اُس کو اُس کے گھر پہنچا آئے۔ اُس کے قبیلہ کے لوگوں پر یہ بات نہایت شاق گذری اور انہوں نے اُس کو ملامت کی مگر وہ یہی جواب دیتی رہی کہ یہ میری بدبختی ہے اور بعض دفعہ اُس نے یہ بھی کہا کہ مجھے ورغلایا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیرے پاس آئیں تو تم پرے ہٹ

جانا۔ اور نفرت کا اظہار کرنا اس طرح اُن پر تمہارا رعب قائم ہو جائے گا۔ معلوم نہیں یہ وجہ ہوئی یا کوئی اور بہر حال اُس نے نفرت کا اظہار کیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے علیحدہ ہو گئے اور اُسے رخصت کر دیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مَس سے مراد صرف چھونا نہیں بلکہ مخصوص تعلقات کا قائم ہو جانا ہے۔ ورنہ لغوی معنوں کے لحاظ سے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا اور آپ اُسے چھو چکے تھے۔

اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ کے متعلق بھی اختلاف ہوا ہے کہ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے کون مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں اس سے خاوند مراد ہے (کشاف) کیونکہ نکاح ہو جانے کے بعد اُس کی گرہ خاوند کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس صورت میں خاوند کا عفو کرنا یہ ہوگا کہ وہ نصف مہر کی بجائے سارا مہر دے دے لیکن بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد عورت کے ولی ہیں (کشاف) اور ان کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو نصف مہر بھی نہ لیں۔ اُن کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ اِس طرح ہوتی ہے کہ کسی عورت کا نکاح اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے ولی اجازت نہ دیں۔ بعض لوگوں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ اِس سے خاوند مراد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس نے تو مہر دینا ہے اور دینے کو معاف کرنا نہیں کہتے (رازی)۔ لیکن ان کا یہ اعتراض عربی زبان سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ عفو کے معنے زیادہ دینے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں عَفَا فُلَانُ الشَّعْرَ (لسان) اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ فلاں شخص نے بال بڑھا لئے ہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اِعْفُوا اللُّحٰی (مسلم کتاب الطہارۃ باب خصال الفطرۃ) اور اس کے معنے ہیں۔ ڈاڑھیاں بڑھاؤ۔ پھر عرب کے رسم و رواج سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مہر پہلے دے دیا کرتے تھے۔ پس خاوند کا عفو کرنا یہ ہوگا کہ وہ باقی نصف واپس نہ لے۔ اس لحاظ سے اس کے معنے یہ ہوئے کہ طلاق دیتے وقت یا تو کچھ بڑھا کر دو یا یہ کہ آدھا جو تم دے چکے ہو وہ بھی واپس نہ لو۔ اور پہلے لوگ یہ دونوں معنے مراد لیتے آئے ہیں۔ چنانچہ قاضی شریح کہتے ہیں اَنَا اَعْفُوْا عَنْ مُهُوْرِ بَنِيْ مُرَّةَ وَاِنْ كَرِهْنَ کہ میں اپنی قوم بنی مرّہ کی عورتوں کا مہر معاف کر دوں گا۔ اگرچہ وہ ناپسند ہی کرتی رہیں۔ (بحر محیط زیر آیت ھذا) دراصل یہاں عورت کی کراہت یا عدمِ کراہت کا کوئی سوال نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر عورت اس قابل نہ ہو کہ معاف کر سکے، مثلاً ایسی بالغ نہ ہو جس کو مال پر تصرّف حاصل ہوتا ہے تو ایسی صورت میں اگر ولی عفو کا اعلان کر دے تو یہ عورت کا ہی اعلان سمجھا جائے گا۔ اس کے متعلق عورت سے الگ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اسی طرح جبیر بن مطعم ایک صحابی ہیں۔ اُن کا ایک عورت سے نکاح ہوا جب انہوں نے اسے طلاق دی تو جو

کچھ مہر تھا اُسے دے دیا اور پھر اس سے بھی زیادہ دیا۔اور کہا اَنَا اَحَقُّ بِالْعَفْوِ کہ میں عفو کرنے کا زیادہ حقدار ہوں۔گویا زیادہ دینے کو انہوں نے عفو قرار دیا۔(کشاف زیر آیت ھذا)۔

وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی میں مرد عورت ولی سب مراد ہیں۔اور یہ قاعدہ بتایا گیا ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنا حق چھوڑنا بہ نسبت اپنا حق طلب کرنے کے زیادہ افضل ہوتا ہے اور تقویٰ کا یہی تقاضا ہوتا ہے۔مگر افسوس ہے کہ لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے اور ہمیشہ اپنے حقوق کا مطالبہ پیش کرتے اور اس پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔دوسرے پر احسان کرنے کی طرف اپنا قدم نہیں بڑھاتے حالانکہ اللہ تعالیٰ واضح طور پر فرماتا ہے کہ تمہارا معاف کر دینا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔یعنی عورت یہ خیال کرے کہ میں اپنے خاوند کے ہاں آباد تو ہوئی نہیں۔اگر اسے مہر معاف کردوں تو کیا حرج ہے؟ اسی طرح مرد یہ خیال کرے کہ گو یہ عورت میرے ہاں آباد نہیں ہوئی لیکن میری طرف منسوب تو ہوئی ہے اس لئے میں ہی کچھ زیادہ دے دوں۔اِسی طرح ولی کو چاہیے کہ وہ ایسے رنگ میں فیصلہ کرائے کہ کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔

وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ میں نسیان کے معنے بھولنے کے نہیں بلکہ چھوڑنے کے ہیں۔جیسے اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبة:٦٧) انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کو ترک کر دیا۔اور فضل سے مراد ایسا فعل ہے جس سے انسان دوسرے پر فضیلت حاصل کر لے۔پس لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ میں اللہ تعالیٰ نے یہ نصیحت فرمائی ہے کہ آپس میں معاملہ کرتے وقت تم میں سے ہر فرد کو ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ نیکی اور احسان اور مروّت میں ایک دوسرے پر فضیلت لے جائے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے وہ تمہاری نیکی ضائع نہیں کرے گا بلکہ تمہیں اس کا اچھے سے اچھا بدلہ دے گا۔پس چاہیے کہ تم ان احکام کو ملحوظ رکھو اور ان پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرو۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۹﴾

تم (تمام) نمازوں کا اور (خصوصاً) درمیانی نماز کا پورا خیال رکھو۔اور اللہ کے لئے فرمانبردار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔

حلّ لُغات۔ اَلْقُنُوْتُ کے معنے ہیں اَلطَّاعَةُ اطاعت۔ اَلْقِيَامُ فِي الصَّلٰوةِ نماز کے لئے کھڑا

ہونا۔ اَلدُّعَاءُ دُعا۔ اَلْخُشُوْعُ وَخَفْضُ الْجَنَاحِ وَسَکُوْنُ الْاَطْرَافِ وَ تَرْکُ الْاِلْتِفَاتِ مِنْ رَهَبِ اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کامل عجز وانکسار اور ادب اور سکون اور ما سوی اللہ کو بھلا کر کام کرنا۔ (اقرب)

تفسیر۔ شادی بیاہ کے ذکر کے سلسلہ میں اب اللہ تعالیٰ نمازوں کا ذکر فرماتا ہے کیونکہ بالعموم شادی کی وجہ سے لوگ نمازوں میں بہت کچھ سُست ہوجاتے ہیں وہ اوّل تو رات کو زیادہ دیر بیدار رہتے ہیں جس کی وجہ سے تہجد اور فجر کی باجماعت نماز میں ان سے غفلت ہوجاتی ہے۔ اور پھر دن کو بھی گھریلو مصروفیات انہیں نمازوں کی طرف توجہ کرنے نہیں دیتیں۔ پس چونکہ شادی کے سِلسلہ میں عبادت میں بہت کچھ نقص واقع ہوجاتا ہے کیونکہ انسان کے مشاغل بڑھ جاتے ہیں کیا بلحاظ آپس کے تعلقات کے اور کیا بلحاظ بچوں کی دیکھ بھال کے اور کیا بلحاظ سامانِ خورد ونوش وغیرہ مہیّا کرنے کے اِسی طرح طہارت کے نقائص بھی پیدا ہوجاتے ہیں اس لئے فرمایا کہ تمہاری گھریلو مصروفیات بے شک بڑھ جائیں گی۔ تمہیں روزی کمانے کے لئے پہلے سے زیادہ تگ ودَو کرنی پڑے گی اور تمہاری توجہ میں یکسوئی نہیں رہے گی۔ مگر دیکھنا تم نمازوں میں سُستی نہ کرنا خصوصاً نماز وسطیٰ کا ہمیشہ خیال رکھنا۔

یہ نماز وسطیٰ کونسی ہے؟ اس کے متعلق لوگوں میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ (۱) بعض نے اسے تہجد کی نماز قرار دیا ہے اور میرا خیال بھی نماز تہجد کی طرف ہی جاتا ہے۔ جو شام اور صبح کے درمیان آتی ہے۔ (۲) بعض کہتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے وہ نماز مراد ہے۔ جو کام کے درمیان آجائے (کشاف و بحر محیط زیر آیت ھذا)۔

اِس کے علاوہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عصر کی نماز کو بھی صلوٰۃ وسطیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ترمذی اور بخاری میں سمرۃؓ سے روایت آتی ہے کہ جنگِ احزاب میں جب کفار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عصر کی نماز سے روکا تو آپ نے فرمایا۔ خدا ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھرے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ سے روک دیا ہے۔ (ترمذی کتاب التفسیر باب ومن سورۃ البقرۃ و بخاری کتاب التفسیر باب حفظوا علی الصلوات زیر آیت ھذا) مگر میرے نزدیک اِن حدیثوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے وہی نماز مراد ہے جو کام کے درمیان آجائے کیونکہ جنگِ احزاب میں بھی عصر کی نماز دوران جنگ میں آگئی تھی۔ اور ممکن ہے اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صلوٰۃ وسطیٰ قرار دیا ہو۔

وسطیٰ کے معنے افضل واعلیٰ کے بھی ہوتے ہیں (کشاف زیر آیت ھذا)۔ اس لئے جس نماز کو انسان زیادہ مشاغل ترک کرکے پڑھے وہی نماز اس کے لئے صلوٰۃ وسطیٰ ہوگی اور اُس کے لئے زیادہ برکات اور انوار کی حامل ہوگی۔ اس مفہوم کو مدّنظر رکھتے ہوئے اوپر کے معنوں کی تائید ہوتی ہے۔

میرے نزدیک حٰفِظُوْا میں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ حٰفِظُوْا باب مفاعلہ سے ہے جس میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ پس اس میں خدا تعالیٰ نے مرد و عورت دونوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ اب نکاح کے بعد تم آپس میں میاں بیوی بن گئے ہو۔ تم دونوں مل کر نمازوں کے متعلق ایک دوسرے کی نگرانی کرو۔ خصوصاً نماز وسطیٰ یعنی تہجد کے متعلق۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ اگر تہجد کے نماز کے لئے خاوند کی آنکھ کھلے تو بیوی کو جگا دے اور اگر وہ نہ اٹھے تو پانی کا ایک ہلکا سا چھینٹا اس کے منہ پر مارے۔ اور اگر بیوی کی آنکھ کھلے تو وہ میاں کو جگا دے اور اگر وہ نہ اُٹھے تو وہ بھی پانی کا ایک ہلکا سا چھینٹا اس کے منہ پر مارے (مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ باب التحریض علی قیام اللیل)۔ جب تہجد کی نماز کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر تاکید فرمائی ہے تو اور نمازوں کی نگہداشت کا حکم خود بخود واضح ہو گیا۔ پس گو محافظت کے معنے عام طور پر نگرانی کے ہوتے ہیں مگر دراصل اس میں وہ خاصہ ملحوظ ہے جو باب مفاعلہ کا ہے اور جس کی رو سے اس کا یہ مطلب ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی نگرانی کریں۔ اور عبادت میں ایک دوسرے کے لئے ترقی کا موجب بنیں۔

قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ کے معنے یہ ہیں کہ نماز میں تمہارا خیال کسی اور طرف نہ ہو بلکہ پورے خلوص اور اطاعت اور تبتل تام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے صحابہؓ بعض دفعہ نماز میں آپس میں بات چیت بھی کر لیا کرتے تھے مگر پھر اس حکم کے نتیجہ میں انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

(ترمذی کتاب التفسیر باب و من سورۃ البقرۃ)

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا

اور اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل یا سوار ہونے کی حالت میں (ہی نماز پڑھ لو) پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو اللہ

اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۴۰﴾

کو یاد کرو کیونکہ اس نے تمہیں (وہ کچھ) سکھایا ہے جو تم (پہلے) نہ جانتے تھے۔

تفسیر۔ اس آیت میں نماز کی اہمیت پر زیادہ زور دینے کے لئے فرمایا میاں بیوی کے تعلقات کیا چیز ہیں؟ اگر تمہارے پیچھے تمہیں پکڑنے کیلئے کوئی دشمن آ رہا ہو اور تم بھاگ رہے ہو تو خواہ تم سوار ہو یا پیادہ تو بھی تم نماز کو نہ چھوڑو بلکہ اسی حالت میں ہی پڑھ لو۔ گویا نماز میں غفلت اور سستی کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ حتیّٰ کہ سخت

خطرہ کی حالت میں بھی جو صلوٰۃ الخوف کے خطرہ سے بھی بڑھ کر ہو جو عین جنگ میں ہوتی ہے تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم نماز چھوڑ دو بلکہ جس حالت میں بھی ہو نماز ادا کرو۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ان سے صلوٰۃ خوف کے متعلق سوال کیا گیا۔ تو انہوں نے اس کا طریق بتایا اور پھر فرمایا کہ اگر اس سے بھی زیادہ خوف کی حالت ہو تو پھر پیدل یا سوار جس حالت میں بھی ہو تم نماز پڑھ لو۔ اور حضرت نافع جو اس کے راوی ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ بات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی سُنی ہے۔ (بخاری کتاب التفسیر باب قولہ وَاِنْ خِفْتُمْ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس آیت میں صلوٰۃ خوف والی حالت سے بھی زیادہ خطرہ والی حالت مراد لی ہے، صلوٰۃ خوف میں تو باقاعدہ ایک امام کی اقتداء میں نماز ادا کی جاتی ہے (النساء: ۱۰۳) مگر یہ حالت ایسی ہے جس میں اتنی مہلت بھی نہ مل سکے اور دوڑتے اور بھاگتے ہوئے نماز پڑھنی پڑے۔ مثلاً اسلامی فوج کا ایک سپاہی دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لئے گیا تھا۔ اس کا دشمن کو علم ہو گیا۔ وہ گھوڑے کو دوڑاتا ہوا واپس آ رہا ہے اور پچاس ساٹھ سپاہی اس کے تعاقب میں ہیں۔ کہ راستہ میں نماز کا وقت آ گیا۔ اب اگر وہ ٹھہر جاتا ہے یا گھوڑے سے اُتر کر نماز پڑھنے لگ جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پکڑا جائے گا اور اسلامی لشکر ان معلومات سے محروم رہ جائے گا جن کو مہیّا کرنے کے لئے اُسے بھجوایا گیا تھا۔ پس چونکہ اس کا جان بچا کر اسلامی لشکر میں پہنچنا ضروری ہے۔ اس لئے اسے اجازت ہوگی کہ وہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتا چلا جائے۔ جس طرح بیمار آدمی لیٹے لیٹے نماز پڑھ لیتا ہے یا بعض دفعہ اشاروں میں ہی نماز پڑھ لیتا ہے اسی طرح اسے بھی اجازت ہوگی کہ جس طرح چاہے نماز پڑھ لے۔ مثلاً گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے نماز کے کلمات دہراتا جائے۔ رکوع کا وقت آئے تو ذرا سا سر جھکا لے اور ایک دو دفعہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ کہہ دے۔ ذرا اور سر جھکا دے تو اسے سجدہ سمجھ لے۔ اس طرح جلدی جلدی نماز پڑھ کر فارغ ہو جائے۔ ایسی حالت میں باوجود اس کے کہ اس کی ایک ٹانگ گھوڑے کے ایک طرف ہوگی اور دوسری ٹانگ دوسری طرف پھر بھی اس کی نماز ہو جائے گی۔ اور اگر اس کا منہ قبلہ کی طرف نہیں ہوگا تب بھی نماز ہو جائے گی۔ ہاں! اگر موقعہ مل سکے تو نماز شروع کرتے ہوئے قبلہ کی طرف مُنہ کر لیا جائے۔ پھر خواہ کسی طرف مُنہ ہو جائے۔ غرض خوف کے وقت نماز کو اپنی مقررہ شکل سے بدل کر پڑھنا جائز ہے۔ چاہے انسان گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے پڑھ لے۔ چاہے اشارے سے پڑھ لے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دشمن کے سامنے بندوق تانے کھڑا ہو۔ اور نماز کا وقت آ جائے۔ ایسی صورت میں اُس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بندوق بھی سنبھالے رکھے دشمن پر فائر بھی کرتا جائے اور نماز کی عبارتیں بھی دہراتا جائے۔ بلکہ یہ نماز خوف کی

حالت میں شہروں میں رہتے ہوئے بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ مثلاً فرض کرو ایک ملک کی دوسرے ملک سے لڑائی ہو جاتی ہے اُس وقت سرحدی شہروں یا دیہات میں رہنے والے جو لوگ ہوں گے اُن کے لئے جائز ہو گا کہ اگر زور کا حملہ ہو تو وہ کھڑے کھڑے نماز کی عبارتیں دہراتے جائیں اور ساتھ ہی دشمن پر گولیاں برساتے جائیں۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ ہاں جب خوف کی حالت جاتی رہے اور تم امن میں آ جاؤ تو پھر تمہیں اسی طرح نماز پڑھنی چاہیے جس طرح قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ میں حکم دیا گیا ہے یعنی خاموشی اور بغیر ضروری حرکت کے۔ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ کے معنے ہیں جس طرح اس نے تم کو سکھایا ہے یا اس لئے یاد کرو کہ اس نے تمہیں وہ کچھ سکھایا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔ اِن الفاظ میں قرآن کریم نے دنیا کے سامنے یہ دعوٰی پیش کیا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے لوگوں کو وہ روحانی علوم سکھائے گئے ہیں جو اس سے پہلے اور کسی مذہب کی الہامی کتاب نے بیان نہیں کئے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے

لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ

حق میں ایک سال تک فائدہ پہنچانے یعنی ان کو (گھروں سے) نہ نکالنے کی وصیت کر جائیں۔

خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ

لیکن اگر وہ (خود بخود) چلی جائیں تو وہ اپنے متعلق جو پسندیدہ بات کریں اس کا تمہیں کوئی گناہ نہیں۔

مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۱﴾

اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

تفسیر۔ وَصِيَّةٌ مصدر ہے اور اس سے پہلے يُوْصُوْنَ محذوف سمجھا جائے گا۔ یعنی وہ وصیت کر جائیں۔ مَتَاعًا دوسرا مصدر ہے اس سے پہلے بھی اَنْ مَتِّعُوْهُنَّ محذوف ہے۔ اور معنے یہ ہیں کہ اپنی بیویوں کے حق میں

وصیت کر جائیں کہ بعد میں وہ لوگ جن کے ہاتھ میں وصیت کا اجراء ہے انہیں ایک سال تک فائدہ پہنچائیں۔ اس کے بعد غَيْرَ اِخْرَاجٍ کے الفاظ ہیں۔ جو بدل ہیں مَتَاعًا کا پس معنٰی یہ ہوئے کہ فائدہ پہنچانے سے ہماری مراد یہ ہے کہ ان کو گھروں سے نہ نکالیں (املاء مامنّ بہ الرحمٰن)۔ بلکہ باوجود اس کے کہ مکان کسی اور وارث کے حصّہ میں آیا ہو بیویوں کو ایک سال تک اس میں رہنے کا حق حاصل ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ عورت خود بھی مکان سے نہیں جاسکتی۔ عورت عدت کے بعد اپنی مرضی سے اور اپنے فائدہ کے لئے جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ سال بھر کی شرط صرف عورت کے آرام اور فائدہ کے لئے لگائی گئی ہے اور اس سے وارثوں کو پابند کیا گیا ہے۔ عورت پر پابندی صرف ایام عدت تک گھر میں رہنے کی ہے بعد میں اس حکم سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا اس کے اختیار میں ہے۔

یہ امر کہ اس ایک سال میں عدّت شامل ہے یا نہیں۔ اس بارہ میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک جس بات میں عورت کا فائدہ ہو اسے تسلیم کرنا چاہیے اور وہ صورت یہی ہے کہ عدت کے بغیر ایک سال تک عورت کو گھر میں رہنے دیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس حکم کی پابندی نہ تو مرنے والے کے رشتہ دار کرتے ہیں اور نہ عورتیں۔ اگر تو عورت کے بچے ہوں تو پھر تو رشتہ دار کچھ عرصہ تک صبر کرتے ہیں لیکن اگر بچے نہ ہوں تو چند ماہ کے بعد ہی مرنے والے کے رشتہ دار مکان اور جائیداد کی تقسیم کے پیچھے پڑ جاتے ہیں حالانکہ اس مکان میں ایک سال تک عورت کو رہنے دینا ضروری ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت احکام میراث کے ذریعہ منسوخ ہوگئی ہے (رازی زیر آیت ھذا) مگر یہ بالکل غلط ہے بیوہ کا اپنے خاوند کی جائیداد میں جو حصّہ رکھا گیا ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں یہ ایک الگ حکم ہے جس میں جائیداد کے حصہ کے علاوہ عورت کے لئے سال بھر کے نان ونفقہ اور رہائش کا انتظام ضروری قرار دیا گیا ہے۔

فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ میں بتایا کہ ہمارا یہ منشاء نہیں کہ تم ایک سال تک ان کو پکڑ کر رکھو بلکہ مطلب یہ ہے کہ تمہاری طرف سے ایک سال کے عرصہ تک انہیں کھلی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے گھر میں رہیں ہاں اگر وہ سال کے اندر ہی مکان چھوڑ دیں تو تم انہیں جانے دو۔ عدّت میں تو خود ان کا نکلنا بھی ممنوع ہے لیکن اس کے بعد ان کا خود نکلنا گناہ نہیں۔ پس اس آیت کو آیت عدت سے منسوخ سمجھنا بھی غلطی ہے۔ یہ ان سے نیک سلوک کرنے کا ایک زائد حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ فوراً ان کا نیا گھر بنانا یا نکاح کرنا مشکل ہوتا ہے چار ماہ دس دن تک تو وہ خود نہیں نکل سکتیں۔ اس کے بعد ایک سال مزید تک ان کو نکالا نہیں جاسکتا ہاں وہ خود چاہیں تو نکل سکتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کو معروف کہا ہے۔

معروف کا لفظ قرآن کریم میں بہت دفعہ آیا ہے۔ یہ عُرف سے نکلا ہے اور اس کے معنے ہیں پہچانا ہوا۔ مفردات امام راغب میں لکھا ہے۔ اَلْمَعْرُوْفُ اِسْمٌ لِکُلِّ فِعْلٍ یُعْرَفُ بِالْعَقْلِ وَالشَّرْعِ حُسْنُہٗ یعنی معروف ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کی خوبی عقل وشرع سے پہچانی جائے۔ پس جب کوئی فعل شرع کے لحاظ سے معروف ہو تو وہ مطابق قانون فعل کہلائے گا۔ اور جب عقل عامہ سے اس کی خوبی پہچانی جائے تو اسے مطابق دستور کہیں گے کیونکہ جس امر کی خوبی ہر انسان پہچانتا ہے اس کا رواج بنی نوع انسان میں پایا جاتا ہے اور جب کسی امر کی خوبی کسی خاص فرد کی عقل سے پہچانی جائے گی تو اسے مناسب حال یا مطابق حال کہیں گے کیونکہ افراد کے ساتھ انہی نیکیوں کا تعلق ہوتا ہے جو خاص ان کے حالات سے متعلق ہوں۔

پس معروف کے معنے قانون یا قومی رواج کے مطابق کے ہوتے ہیں لیکن اس جگہ اس کے معنے پسندیدہ اور بہتر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ عدّت کے بعد عورتیں نکاح کر لیں خواہ اپنے والدین یا دوسرے رشتہ داروں کے ہاں چلی جائیں یا کوئی ملازمت اختیار کر لیں تم پر کوئی اعتراض نہیں۔ تمہیں اس حکم کی رو سے یہ نہیں چاہیے کہ انہیں روکو۔

وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۴۲﴾

اور جن عورتوں کو طلاق دی جائے انہیں بھی (اپنے) حالات کے مطابق کچھ سامان دینا ضروری ہے۔ یہ بات (ہم نے) متقیوں

کَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ ع

پر واجب کر دی ہے۔ اسی طرح اللہ (تعالیٰ) اپنے احکام تمہارے (فائدہ کے) لئے کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم سمجھو۔

تفسیر۔ طلاق کے مضمون کو ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مطلّقات سے حسن سلوک کے حکم کو پھر دہرایا ہے۔ چونکہ عام طور پر مطلّقات سے ناراضگی ہوتی ہے اس لئے فرمایا۔ تمہیں ان سے اچھا سلوک کرنا چاہیے اور پچھلی آیتوں پر اس کا عطف کر کے یہ بھی بتا دیا کہ مطلّقہ عورتوں کو بھی اگر عرصہ عدت سے زیادہ گھر میں رہنے کی ضرورت ہو تو رہنے دیا جائے اور ان کو بھی ان کے مناسب حال فائدہ پہنچانا چاہیے۔ یہ متقیوں پر حق قرار دیا گیا ہے۔ پس مطلقہ عورت سے بھی بے مروتی نہیں کرنی چاہیے اور اس کو عدّت کے فوراً بعد گھر سے نہیں نکال دینا چاہیے۔ بلکہ بطریق احسان اسے موقعہ دینا چاہیے تا کہ وہ اطمینان سے نقل مکانی کا انتظام کر سکے۔

مسلمانوں پر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مطلّقہ عورتوں سے مہر کے علاوہ حسن سلوک کرنے کا بھی ارشاد فرماتا ہے اور مسلمان عورتوں کے مہر تک بھی کھا جاتے ہیں۔ اگر اس حکم پر عمل کیا جائے تو کس قدر فساد اور جھگڑے دور ہو جائیں۔ اور طلاق جو صرف مجبوری میں حلال ہے اس تلخی کے پیدا کرنے کا موجب نہ ہو جس کا موجب وہ اب ہو رہی ہے۔ بلکہ دونوں فریق محسوس کریں کہ مجبوری سے علیٰحدگی اختیار کی گئی ہے ورنہ آپس میں کوئی تلخی یا بدمزگی نہیں ہے۔

پھر فرمایا کَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمہارے فائدہ کے لئے اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم خطاؤں اور کمزوریوں سے بچو۔ اٰیَۃٌ کے عام معنے علامت کے ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں کہیں خدا تعالیٰ نے اپنی طرف توجہ دلانے والی باتوں کو۔ کہیں ایمان کی طرف راہنمائی کرنے والی باتوں کو۔ کہیں عذاب سے بچانے والی باتوں کو اور کہیں تمدّن کا صحیح راستہ بتانے والی باتوں کو آیات کہا ہے (اقرب)۔ اس جگہ آیات سے وہ احکام مراد ہیں جو صحیح تمدن کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ شریعت کے بیان کرنے میں یہ امر ہر جگہ مدّنظر رکھا گیا ہے۔ کہ تمام ضروری امور کے متعلق تعلیم آ جائے اور ایسے رنگ میں بیان کر دی جائے کہ بنی نوع انسان بدیوں اور کمزوریوں سے بچ جائیں جس پر تَعْقِلُوْنَ کا لفظ دلالت کرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ

کیا تجھے ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو موت سے بچنے کے لئے جبکہ وہ ہزاروں (کی تعداد میں) تھے

الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ اس پر اللہ نے انہیں کہا کہ تم مرجاؤ۔ اس کے بعد اس نے انہیں زندہ کر دیا۔

لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۴﴾

اللہ لوگوں پر یقیناً (بڑا) فضل کرنے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے کیا تجھے ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو موت سے بچنے کے لئے اپنے گھروں سے ایسی حالت میں نکلے تھے جبکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ اگر تم موت سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم مرجاؤ۔ چنانچہ اُس موت کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں زندہ کر دیا۔

یہ لوگ کون تھے جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر کی وجہ سے نکلے اور جن کو خدا تعالے نے کہا کہ مرجاؤ؟ اور پھر یہ کون لوگ تھے جنہیں موت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حیاتِ نو عطا فرمائی؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بنی اسرائیل تھے جو موت کے ڈر کی وجہ سے ملک مصر سے نکلے تھے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس آیت میں جتنی باتیں بیان کی ہیں وہ سب کی سب بنی اسرائیل کے واقعات میں دکھائی دیتی ہیں۔ موت کے ڈر کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے کہ وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ (البقرۃ:۵۰) یعنی اس وقت کو یاد کرو جبکہ ہم نے تم کو فرعون کی قوم سے اس حالت میں نجات دی کہ وہ تمہیں بدترین عذاب دے رہی تھی۔ وہ تمہارے لڑکوں کو قتل کر دیتی تھی اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتی تھی۔ اور گھروں سے نکلنے کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے کہ۔ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (الشعراء:۵۳) یعنی ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات نکال کر لے جا۔ اور میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔

وَ هُمْ اُلُوْفٌ والی علامت بھی بنی اسرائیل پر ہی چسپاں ہوتی ہے۔ کیونکہ جب وہ مصر سے نکلے تو اس وقت وہ صرف چند ہزار ہی تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پیدائش باب ۴۶ آیت ۲۷ میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں آئے تو صرف ۷۰ تھے لیکن تورات ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ۲۱۵ سال کے بعد موسیٰؑ کے زمانہ میں ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ عورتوں اور بچوں کو نکال کر وہ چھ لاکھ کے قریب پہنچ گئے۔ چنانچہ خروج باب ۱۲ آیت ۳۷ میں لکھا ہے۔

”اور بنی اسرائیل نے رعمسیس سے سکات تک پیدل سفر کیا۔ اور بال بچوں کو چھوڑ کر وہ کوئی چھ لاکھ مرد تھے۔“

اسی طرح گنتی باب ۱ آیت ۴۶ میں ان کی تعداد چھ لاکھ تین ہزار پانچ سو پچاس بتائی گئی ہے۔ اگر مردوں کی تعداد کو ملحوظ رکھ کر عورتوں اور بچوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل تعداد ۲۵ لاکھ کے قریب پہنچ جاتی ہے مگر ۲۱۵ سال کے عرصہ میں ستر آدمیوں کا ۲۵ لاکھ تک پہنچ جانا بالکل عقل کے خلاف بات ہے اور پھر واقعہ کے بھی خلاف ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب مصر سے کنعان کی طرف ہجرت کی تو وہ چالیس سال تک جنگلوں میں رہے تو کیا پچیس لاکھ آدمیوں کی روٹی کا انتظام چالیس سال تک ان جنگلوں میں ہو سکتا تھا؟ بے شک بائیبل میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کے لئے آسمان سے بٹیرا اتارے اور زمین میں ترنجبین پیدا کر دی (خروج باب ۱۶ آیت ۱۳ تا ۱۵)۔ لیکن بائیبل کے بیان کے مطابق یہ خوراک سارے عرصہ کے لئے مہیا نہیں ہوئی تھی۔ پھر دوسرے عرصہ میں اتنے آدمیوں کے

لئے خوراک کہاں سے لاتے تھے؟ پھر بائیبل سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک چشمہ سے پانی بھی پی لیتے تھے۔اب کیا کوئی عقل تسلیم کرسکتی ہے کہ ایک ایک چشمہ سے پچیس لاکھ آدمی سیراب ہوسکتا ہے؟

دراصل اس بیان میں سخت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے حقیقت وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ بنی اسرائیل جو فرعون کے ظلم سے ڈر کر بھاگے تھے ان کی تعداد صرف چند ہزار تھی۔ ورنہ پچیس لاکھ یہودی فلسطین کے چھوٹے چھوٹے قبائل سے ڈر کس طرح سکتے تھے؟ فلسطین کی آبادی تو اپنی شان وشوکت کے زمانہ میں بھی ۲۵-۳۰ لاکھ سے زیادہ نہیں بڑھی۔ بلکہ اس زمانہ میں بھی تقسیم سے پہلے اس کی آبادی اٹھارہ لاکھ کے قریب تھی۔ پرانے زمانہ میں جبکہ خوراک ادھر ادھر پہنچانے کے سامان مفقود تھے غیر زرعی علاقوں میں بڑی آبادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پس موسیٰ ؑ کے وقت میں یقیناً سارے فلسطین کی آبادی چند ہزار افراد پر مشتمل ہوگی۔ چنانچہ بنی اسرائیل اور ان کے دشمنوں کی لڑائیوں میں ہمیشہ سینکڑوں اور ہزاروں افراد کا ہی پتہ لگتا ہے۔ اگر موسیٰ ؑ کے ساتھ ۲۵ لاکھ آدمی فلسطین میں آئے تھے تو سفر کا زمانہ تو الگ رہا حکومت کے زمانہ میں بھی ان کی خوراک کا انتظام نہ ہوسکتا تھا اور لڑائی کا تو ذکر ہی کیا ہے یہ لوگ تو اپنے کندھوں کے دھکوں سے ہی ان چند ہزار افراد سے فلسطین کو خالی کرا سکتے تھے جو ان سے پہلے وہاں بس رہے تھے۔ پس وَهُمْ اُلُوْفٌ میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بنی اسرائیل ہی ہیں۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں تفسیر کبیر سورۃ مریم تا انبیاء جلد ۷ تا ۸)

چوتھی بات اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ تم مرجاؤ۔ اس امر کا ذکر بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (المآئدۃ:۲۷) یعنی جب موسیٰ ؑ کی نافرمانی کرتے ہوئے بنی اسرائیل نے لڑائی کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہیں اب اس ملک سے چالیس سال کے لئے محروم کر دیا گیا ہے۔ وہ زمین میں سرگردان پھرتے رہیں گے پس تو باغی لوگوں پر افسوس نہ کر۔

پانچویں بات یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں موت کے بعد پھر زندہ کر دیا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (البقرۃ:۵۶،۵۷) یعنی اس وقت کو بھی یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ؑ! ہم تیری بات ہرگز نہیں مانیں گے جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو آمنے سامنے نہ دیکھ لیں۔ اس پر تمہیں ایک مہلک عذاب نے پکڑ لیا اور تم اپنی آنکھ سے اپنے فعل کا انجام دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے

تمہاری ہلاکت کے بعد تمہیں اس لئے اٹھایا کہ تم شکر گذار بنو۔

میرے نزدیک اس آیت میں نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً سے مراد اُن کا فَاذْھَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ (المآئدۃ: ۲۵) والا جملہ ہے۔ اس کے بعد انہیں چالیس سال کی سزا ملی۔ جو صاعقہ تھی۔ غرض اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ ھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ سے مراد بنی اسرائیل ہی ہیں جو فرعون کے متواتر مظالم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے اور ہلاکت کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔ ان کے لڑکے مارے جاتے تھے اور قومی زندگی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو ملک مصر سے بچا کر لایا۔ اور اس نے فلسطین کا ان سے وعدہ کیا اور حکم دیا کہ دشمن سے لڑو اور فتح حاصل کر لو۔ مگر وہ اپنی نادانی سے کہہ اُٹھے کہ یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَھَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْھَا فَاذْھَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ (المآئدۃ: ۲۵) یعنی اے موسیٰؑ! جب تک وہ لوگ اس میں موجود ہیں ہم اُس سرزمین میں کبھی داخل نہیں ہوں گے۔ اس لئے تو اور تیرا ربّ دونوں جاؤ اور ان سے جنگ کرو ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر موت نازل کی۔ یعنی وہ چالیس سال تک اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد رہے۔ اس کے بعد ان کی اگلی نسل جب جوان ہوئی اور اس نے اللہ تعالیٰ کے منشا کے ماتحت قربانیوں سے کام لیا تو خدا تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا۔ یعنی کنعان کے دروازے ان کے لئے کھل گئے اور حکومت پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ اسی کی طرف ثُمَّ اَحْیَاھُمْ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اسی کی طرف ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ میں اشارہ تھا۔

فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے گھروں سے موت کے خوف سے نکلے اور انہوں نے چاہا کہ وہ زندگی حاصل کریں تو ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں جو تدبیر بتائی وہ یہ تھی کہ تم اپنے لئے موت اختیار کرو۔ ایک ایسی قوم جو موت سے بچنے کے لئے گھروں سے نکلی تھی۔ اسے قدرتی طور پر یہ علاج بہت عجیب نظر آیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنا وطن خواہ وہ اختیار کردہ ہی ہو۔ املاک خواہ تھوڑے ہی ہوں۔ اپنی عزت یا رتبہ خواہ قلیل ہی ہو۔ اپنے جلیس اور ہم صحبت دوست اور وہ ملک جس کی وہ زبان سمجھتے تھے صرف اس لئے کہ انہیں زندگی ملے اور وہ موت سے بچ سکیں کُلّی طور پر چھوڑ دیا۔ وہ خدا تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت ایک ایسے ملک کی طرف چلے گئے جہاں کی زبان وہ نہیں جانتے تھے جہاں ان کی کوئی جائیداد نہیں تھی۔ جہاں کے لوگ ان کی دیانت سے اور یہ لوگ ان کی دیانت سے واقف نہ تھے۔ جہاں کے لوگوں کی نگاہ میں ان کے چھوٹے بڑے میں کوئی تمیز نہ تھی۔ یہ قربانی کوئی معمولی قربانی نہ تھی۔ یہ قربانی صرف اس لئے کی گئی تھی کہ انہیں جان

بہت پیاری تھی ورنہ وہ اس ملک کو چھوڑتے ہی کیوں؟ مگر جب وہ وہاں پہنچے تو خدا تعالیٰ سے انہوں نے سوال کیا کہ وہ زندگی کہاں ہے جس کا ہمیں وعدہ دیا گیا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم موت قبول کرو۔ پھر زندہ ہو جاؤ گے۔ وہ لوگ حیران ہوئے کہ یہ ہمیں کیا کہا جا رہا ہے کیونکہ جو پیالہ فرعون انہیں پلا رہا تھا وہی اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا فرعون نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ مر جائیں مگر انہوں نے کہا ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اور ہم خدا تعالیٰ سے فریاد کریں گے لیکن جب انہوں نے خدا تعالیٰ سے فریاد کی تو وہاں سے بھی ان کو یہی جواب ملا کہ مر جاؤ۔ انہیں دونوں جگہوں سے موت ہی کا پیالہ ملا۔ وہ حیران تھے کہ فرعون کو دوست سمجھیں یا خدا تعالیٰ کو دشمن۔ فرعون انہیں زندہ کرنا چاہتا تھا یا خدا تعالیٰ انہیں مارنا چاہتا ہے کیونکہ دونوں پیالوں پر موت لکھی ہوئی تھی۔ وہ گھبرائے۔ ان میں سے کمزوروں نے کہا کہ ہم تو موت سے بچنے کے لئے آئے تھے اگر یہی پیالہ ہمیں پینا ہوتا تو وہیں کیوں نہ پی لیتے اتنی تکالیف برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم اس پیالہ کو پینے کے لیے تیار نہیں ہم سے دھوکا کیا گیا ہے اگر موت ہی ہمیں ملنی تھی تو کیوں ہم سے زندگی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اتنی امیدیں دلانے کے بعد ہمیں قوم میں کیوں شرمندہ کرایا؟ وہ ہنسیں گے کہ بیوقوف موت سے بھاگے تھے وہاں بھی موت ہی نصیب ہوئی۔ وہ اس مشکل کو حل نہ کر سکے سوائے اس کے کہ ان میں سے کمزوروں نے کہا کہ ہم یہ پیالہ پینے کے لئے تیار نہیں۔ عزت کی زندگی جس کا ہم سے وعدہ تھا وہ ہمیں دو۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تھی۔ فرعون انہیں تباہ کرنا چاہتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تمہارے سب لڑکے مارے جائیں گے اور لازماً لڑکیاں غیروں سے بیاہی جائیں گی اور تمہاری نسل مٹ جائے گی اور غیروں کی نسل جاری ہو جائے گی۔ تم اس موت سے بچو اور ذلّت کی زندگی برداشت نہ کرو۔ خدا تعالیٰ نے بتایا ہے کہ حیات کا پیالہ تمہارے لئے کنعان کی سرزمین میں تیار ہے چنانچہ انہوں نے گھر بار چھوڑا۔ مال جو اٹھایا نہ گیا وہیں چھوڑا عزت سے ہاتھ دھوئے۔ ایک باقاعدہ حکومت کا آرام کھویا۔ وہ نکلے اور چل پڑے۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَهُمْ اُلُوْفٌ وہ چند ہزار تھے۔ جو اپنے گھروں سے نکلے۔ ان میں بہت سی عورتیں اور بچے بھی ہوں گے۔ عام طور پر صرف پانچواں حصہ بالغ مرد ہوتے ہیں پھر ان میں کچھ بوڑھے بھی ہوں گے۔ متمدن اقوام میں چھ فیصدی مرد جنگ کے قابل ہوتے ہیں۔ اور غیر متمدن قوموں میں سولہ فیصدی۔ اگر وہ پچاس ہزار بھی ہوں تو ان میں سے زیادہ سے زیادہ آٹھ ہزار لڑائی کے قابل مرد ہوں گے۔ اور وہ بھی ناتجربہ کار۔ پتھیرے بھلا کیا جانے کہ جنگ کیا ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا لاؤ۔ وہ ملک جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس پر ایک زبردست قوم کے لوگ جن کے چہرے خون سے بھرے ہوئے تھے۔ جنہیں اگر دائیں طرف عرب کے جنگجوؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا

تو بائیں طرف یونانیوں سے ۔تہذیب کے گہوارہ میں پلی ہوئی تین قوموں یونانیوں ، ایرانیوں اور مصریوں سے انہیں واسطہ پڑتا ۔ وہ تینوں کے طریق کار سے واقف تھے وہ خود بھی مہذب اور بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے تھے۔اور بنی اسرائیل سے قریباً دس گنا تھے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ جنگجواور خونخوار قوم دکھا کر کہا کہ اس قوم کو ماردو پھر حکومت تمہارے ہاتھ آجائے گی۔ بنی اسرائیل پر حیرت کا اظہار کرنا آسان ہے لیکن ذرا سوچو! تمہارا ایک دوست تمہاری دعوت کرے۔ وقت مقررہ پر وہ تمہیں بلا کر لے جائے اور جب وہ بازار میں پہنچے تو ایک بڑے ہوٹل میں چلا جائے۔ جہاں ہر ایک چیز پانچ چھ گنا قیمت پر ملتی ہو اور کہے کہ یہ ہوٹل ہے اس میں آپ آٹھ دس روپے خرچ کر کے کھانا کھا سکتے ہیں۔اور دوسری طرف ایک ایسا مکان بھی ہے جہاں سے کھانوں کی خوشبو آرہی ہے۔ آپ اس کے اندر گھس جائیں مالک مکان کا سر لٹھ سے پھوڑ دیں اور کھانا لے لیں اس جواب کو سن کر تمہاری کیا حالت ہوگی؟ تم اس کو ذلیل کرنے والا تمسخر خیال کرو گے اور اس دوست سے ناراض ہوجاؤ گے۔شاید تم میں سے جو شیلے ایسے دوست پر حملہ ہی کر بیٹھیں یہی حالت یہاں ہوئی۔سینکڑوں میل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس وعدہ پر کہ وہاں انہیں بادشاہت ملے گی لائے۔مگر وہاں پہنچ کر انہیں کہہ دیا کہ کنعان پر قابض قوم کو ماردو۔اور ان سے حکومت چھین لو۔ اس جہالت کو دیکھ کر جو بنی اسرائیل میں اس وقت پھیلی ہوئی تھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس جواب پر سر پیٹ لیا ہوگا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھتے ہوں گے کہ تم نے وعدے کیا کئے تھے اور اب کہہ کیا رہے ہو؟ وہ کہتے ہوں گے کہ وہیں ہمیں کیوں نہ کہہ دیا کہ فرعون کا سر اڑا دو۔اور اس سے حکومت چھین لو۔ وہاں پر تو ہم یہ کر بھی سکتے تھے کیونکہ ہمارے آدمی فرعون کے گھروں میں کام کرتے تھے وزراء ہمارے واقف تھے اور کئی سہولتیں ہمیں میسر تھیں۔لیکن یہاں پر زبان اور ہے اس لئے ہم جاسوسی بھی تو نہیں کر سکتے ۔وہ ذرائع ہمیں یہاں میسر نہیں ان لوگوں کو مارنا بھلا کونسا آسان کام تھا کہ تم ہمیں وہاں سے نکال لائے اور یہاں آکر کہہ دیا کہ ان کو مارو۔اور ملک پر قبضہ کرلو۔ یہ خدا تعالیٰ کا وعدہ تھا لیکن خدا تعالیٰ انہیں نظر نہ آتا تھا۔ ورنہ وہ اس سے ہی جھگڑا کرتے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں نظر آتے تھے اس لیے انہی کو وہ مخاطب کرتے تھے اور بظاہر حالات انہوں نے شرافت سے ہی کام لیا۔ ورنہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حملہ آور ہوتے۔کہ تم نے ہمارے ساتھ **نعوذ باللہ** دھوکا کیا ہے۔ بائیبل میں آتا ہے کہ وہ روئے پیٹے اور بچوں کی طرح روٹھ گئے۔(استثنا باب ۱ آیت ۲۶، ۲۷)

قرآن کریم فرماتا ہے۔انہوں نے کہا۔اے موسیٰ علیہ السلام! اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ۔ (المآئدۃ:۲۵) ہمارے مدِّ مقابل ایک تجربہ کار اور جنگجو قوم ہے۔ان کے پاس اسلحہ بھی ہم سے زیادہ ہے وہ اپنے

وطن میں ہیں اور راستوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا تعاقب کیسے کریں وہ محفوظ قلعوں میں ہیں اور ہم جنگلوں میں۔ تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں بادشاہت دو گے اس لئے ہم تو ہاتھ نہیں اٹھائیں گے اور یہیں بیٹھے رہیں گے۔ تم اور تمہارا خدا جاؤ اور ملک فتح کر کے ہمیں دے دو۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے جو وعدہ کیا تھا اسے انہوں نے لفظاً پورا نہیں کیا۔ لیکن جب ہم اس واقعہ کو ایک اور نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اس کی شکل ہی بدل جاتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ کی فتح پر انصار سے مخاطب ہو کر فرمایا اے انصار! کیا تم نے یہ کہا ہے کہ خون تو ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے اور مالِ غنیمت مہاجرین میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا۔ حضور! ہم میں سے ایک نوجوان نے نادانی سے ایسا کہہ دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم نے بے در پایا۔ ہم نے اسے اپنے گھر میں جگہ دی۔ اُس کے بھائی اُس کے خون کے پیاسے تھے۔ ہم اس کے آگے پیچھے لڑے۔ دنیا میں اس کی بات کوئی نہ سنتا تھا ہم نے لوگوں تک اس کا پیغام پہنچایا۔ پھر جب فتح ہوئی تو اس نے مال اپنی قوم میں تقسیم کر دیا اور ہمیں کچھ نہ دیا۔ لیکن اگر تم چاہو تو یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں قربِ الٰہی حاصل کرایا۔ تقویٰ جیسی نعمت دی۔ خدا تعالیٰ کی محبت دی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اسے فتح دی۔ اور خدائی فوجوں نے مکہ فتح کیا۔ مکہ اُس کا پیدائشی مقام تھا اور مہاجرین کا وطن۔ انہیں توقع تھی کہ مکہ فتح کر کے وہ اپنے گھروں پر قبضہ کر لیں گے مگر مکہ مکرمہ والے تو چند اونٹ لے گئے اور ہم اپنے ساتھ رسول اللہ کو لے آئے (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الطائف فی شوالٍ سنۃ ثمان)۔ یہی دونوں رُخ یہاں ہیں۔ اگر حکومت کے رنگ میں کوئی تغیر خدا تعالیٰ کو منظور نہیں تھا اور وہ ایسی ہی حکومت پسند کرتا جیسی فرعون کی تھی تو فرعون سے حکومت چھین کر بنی اسرائیل کو کیوں دینا چاہتا۔ خدا تعالیٰ تو ایسی قوم کو بادشاہت دینا چاہتا تھا جو اخلاق کی خوشنما حکومت قائم کرتی۔ خدا تعالیٰ بنی اسرائیل کو ایسی زندگی نہیں دینا چاہتا تھا جو ختم ہو جاتی۔ ایسی زندگی تو چمار بھی دیتا ہے جبکہ وہ بچہ پیدا کرتا ہے بلکہ خدا تعالیٰ انہیں ایسی زندگی دینا چاہتا تھا جو کوئی اور نہیں دے سکتا تھا۔ خدا تعالیٰ انہیں اخلاق فاضلہ کی ہمیشہ کی زندگی دینا چاہتا تھا جو فرعون انہیں نہیں دے سکتا تھا۔ اور ایسی زندگی بغیر تربیت اور قربانی کی عادت کے انہیں نہیں مل سکتی تھی۔ خدا تعالیٰ انہیں اپنے تازہ نشانوں کے ساتھ زندہ کرنا چاہتا تھا تا ان میں سے ہر ایک دس دس کے مقابل میں کھڑا ہو۔ پھر خدا تعالیٰ ان کو فتح دیتا تو ایک زندہ نشان دیکھتے جس سے ان کی اصلاح ہوتی اور اس طرح ان کو حقیقی زندگی ملتی گویا پیالے دونوں موت کے تھے۔ لیکن فرعون کے پیالہ میں شربت بھی موت کا تھا اور خدا تعالیٰ کے پیالہ میں زندگی کا۔

یہ فرق تھا جسے وہ سمجھ نہ سکے۔ اگر وہ فرعون کا پیالہ پی لیتے تو ہمیشہ کے لئے انہیں موت ملتی۔ لیکن وہ خدا تعالیٰ کا پیالہ پی لیتے تو وقتی موت ہوتی جس کے بعد ہمیشہ کے لئے انہیں زندگی مل جاتی۔ مگر انہوں نے اس فرق کو نہ سمجھا اور خدا تعالیٰ کا پیش کردہ موت کا پیالہ پینے سے بھی اسی طرح انکار کر دیا جس طرح فرعون کا پیالہ پینے سے انکار کیا تھا۔ تب خدا تعالیٰ نے انہیں فرمایا مُوْتُوْا تم اپنے ہاتھ سے موت لینے سے انکار کرتے ہو۔ اب ہم خود تمہیں موت دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے فرعون کی دی ہوئی موت اور اپنی دی ہوئی موت میں فرق رکھا۔ وہ لوگ گھر سے تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتبار کر کے ہی نکلے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ عرصہ کی موت کے بعد انہیں پھر زندگی دے دی اور اس طرح اس وعدہ کو پورا کر دیا۔

یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے قومی جدوجہد کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ دعائے ابراہیمی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چار کام بتائے گئے تھے۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ (البقرۃ:۱۳۰) اوّل آیات الٰہی سنانے کا کام۔ دوم تعلیم کتاب کا کام۔ سوم تعلیم حکمت کا کام۔ چہارم تزکیہ نفوس کا کام۔ یہ آیت يُعَلِّمُهُمُ الْحِكْمَةَ کے ماتحت ہے۔ یہاں قوموں کی ترقی کے ذرائع بیان کئے گئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس جگہ مثال دے کر بتایا ہے کہ قومیں کس طرح ترقی کیا کرتی ہیں۔ جب بھی کسی قوم کو موت کا ڈر ہو تو اس کا یہی علاج ہے کہ یا تو وہ اپنے ہاتھ سے موت قبول کرے یا خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے موت قبول کرے۔ اپنے ہاتھ سے موت قبول کرنے میں کئی آسانیاں ہوتی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ جب تم اپنے ہاتھ سے ابتلاء لو تو تم اسے کم کر سکتے ہو۔ جیسے سردی میں وضو کے لئے پانی کی ٹھنڈک کو تم دور کر سکتے ہو۔ اسی طرح جنگ میں تم بخوشی موت قبول کرتے ہو لیکن تم اس سے بچاؤ کے لئے تلوار ہاتھ میں پکڑ لیتے ہو اور بدن پر زرہ پہن لیتے ہو تا کہ جہاں تک ہو سکے موت کے اثر کو کم کر دو۔ اگر تم زخمی ہو تو علاج کرا سکتے ہو لیکن خدا تعالیٰ کی دی ہوئی موت سے تم کوئی بچاؤ نہیں کر سکتے خدا تعالیٰ کا قانون کام کرتا چلا جاتا ہے۔ اور وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس طرح تکلیف کم ہوگی یا زیادہ مثلاً ہیضہ یا طاعون کی وبائیں بلا لحاظ مارتی چلی جاتی ہیں لیکن تم خود ایک چیز کی تکلیف کو کم کر سکتے ہو۔ مثلاً کانٹا چبھ جائے تو تم اسے اپنے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش کرتے ہو۔ کیونکہ دوسرے سے تمہیں یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ اس تکلیف کو کم کرنے کی ویسی ہی کوشش کرے گا جیسی تم کر سکتے ہو۔ پس جب قوم کی موت آتی ہے۔ تو اس کا علاج زندہ رہنا نہیں بلکہ موت قبول کرنا ہوتا ہے۔

دنیا میں تین قسم کی قومیں ہوتی ہیں ایک تو وہ جو موت کو خود قبول کر لیتی ہیں۔ اور بعد میں انہیں ہمیشہ کے لئے

زندگی مل جاتی ہے۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی تھے۔ صحابہؓ کے سامنے موت پیش ہوئی اور انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ جس کے نتیجہ میں انہیں ہمیشہ کی زندگی مل گئی۔ جنگ بدر کے موقعہ پر تمام صحابہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے تھے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مصالح کی بناء پر انہیں جنگ کی خبر نہیں دی تھی گو آپ کو اس کا علم تھا۔ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر جا کر لڑنے کا ارادہ فرمایا۔ تو آپؐ نے انصار اور مہاجرین کو جمع کیا۔ اور فرمایا۔ اے لوگو! مجھے مشورہ دو کہ اب کیا کرنا چاہیے اس پر مہاجرین کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا یا رسول صلی اللہ! مشورہ کا کیا سوال ہے؟ ہم لڑنے کے لئے حاضر ہیں مگر جب کوئی مہاجر بیٹھ جاتا آپ پھر فرماتے کہ اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔ جب آپؐ نے بار بار یہ الفاظ دہرائے۔ تو انصار سمجھ گئے کہ آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے۔ چنانچہ ایک انصاری کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپؐ کی مراد شاید ہم انصار سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں۔ اُس نے کہا۔ یارسول اللہ! شاید آپ کا اشارہ اُس معاہدہ کی طرف ہے جو ہجرت کے وقت ہم نے آپ سے کیا تھا کہ مدینہ کے اندر رہ کر تو ہم دشمن کا مقابلہ کریں گے مگر مدینہ سے باہر آپ کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم ٹھیک سمجھے میرا اشارہ اسی طرف ہے۔ اس نے کہا یارسول اللہ! بیشک ہمارا یہ معاہدہ تھا کہ ہم مدینہ سے باہر نہیں لڑیں گے۔ لیکن یارسول اللہ! وہ ابتدائی زمانہ تھا۔ اب خدا کا نور ہم نے خود اترتے دیکھ لیا ہے۔ اب یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ میدانِ جنگ میں جائیں اور ہم نہ جائیں۔ ہم ان انصار کی طرف سے بھی جو علم نہ ہونے کی وجہ سے مدینہ میں رہ گئے ہیں حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ بھی یہاں موجود ہوتے تو ضرور آپ کے ساتھ جنگ میں شامل ہوتے پھر اُس نے کہا۔ یارسول اللہ! اب معاہدات کا کیا سوال ہے؟ آپ ہمیں حکم دیں کہ سمندر میں گھوڑے ڈال دو تو ہم سمندر میں گھوڑے ڈالنے کے لئے بھی تیار ہیں اور اگر لڑائی ہوئی تو یارسول اللہ ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے اور آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور کوئی شخص آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گزرے۔ یہ فقرہ صحابہؓ کو اس قدر پسند تھا کہ ایک صحابی جو چودہ یا اٹھارہ جنگوں میں شریک ہوئے کہا کرتے تھے کہ باوجود اس کے کہ مجھے اتنی جنگوں میں شمولیت کا فخر حاصل ہے میرے نزدیک اُس صحابی کا یہ فقرہ میری ساری لڑائیوں سے بہتر تھا۔ کاش یہ میرے منہ سے نکلتا۔ (بخاری کتاب المغازی باب قصّة غزوة بدر)

غرض ایک تو یہ قوم تھی جنہوں نے بخوشی موت کو قبول کیا اور اس کے مطابق اس سے سلوک ہوا۔ دوسری قوم حضرت موسیٰؑ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے زندگی کا وعدہ کیا اور اس نے وعدہ کے ایفاء کا لفظاً مطالبہ کیا انہوں نے کہا

تم ہم کو زندگی دینے کے وعدہ پر لائے تھے۔ تم نے ہمیں بادشاہت دینے کا وعدہ کیا تھا تم وہ ملک لے کر ہمیں دے دو۔ ہم لڑ کر ملک لینے کے لئے تیار نہیں۔ اس پر خدا تعالیٰ نے انہیں موت دے دی اور چالیس سال تک اس ملک سے محروم کر دیا مگر چونکہ زندگی کا وعدہ بھی تھا اس لئے پھر زندگی بھی دے دی۔ لیکن اس وقت جب کہ وہ نسل جس نے خود موت لینے سے انکار کر دیا تھا بیابانوں میں ہلاک ہو چکی تھی۔ خدا تعالیٰ نے اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ کہنے والوں کے بچوں کو جنہوں نے یہ فقرہ نہیں کہا تھا۔ اٹھایا اور زندگی کا وعدہ ان کے زمانہ میں پورا کر دیا۔ چنانچہ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

تیسری قسم کی قوم وہ ہوتی ہے جس سے کوئی وعدہ نہیں ہوتا۔ یہ قوم جب موت کے مونہہ میں آتی ہے تو اس سے سلوک اس کی اپنی ہمّت کے مطابق ہوتا ہے کبھی اپنی کوشش سے ایسی قوم بچ جاتی ہے اور کبھی ہلاک ہو جاتی ہے۔ غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ ایک عجیب نکتہ بتایا ہے کہ غلام قوم اور مغلوب لوگ کبھی زندگی نہیں پا سکتے جب تک کہ پہلے اپنے لئے موت کو اختیار نہ کر لیں۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ میں بھی یہ بتایا کہ خدا تعالیٰ جو مجاہدات بتاتا ہے وہ قومی ترقی کے لئے ضروری ہوتے ہیں مگر لوگ ان پر شور مچا دیتے ہیں کہ ہم مر گئے۔ بوجھوں میں دب گئے حالانکہ فائدہ ان کا اپنا ہوتا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۵﴾

اور تم اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ اور جان لو کہ اللہ بہت سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اے امّتِ محمدیہ تم اُس قوم کی حالت کو دیکھو جسے موسیٰ علیہ السلام مصر سے اس لئے نکال کر لائے تھے کہ اسے ایک ملک کی حکومت حاصل ہو۔ لیکن جب انہیں اپنے دشمنوں سے جو اُن کے ملک پر قابض تھے لڑنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر خدا تعالیٰ نے انہیں اس ملک کی حکومت سے چالیس سال تک کے لئے محروم کر دیا اور وہ جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر مر گئے۔ غرض باوجود اس کے کہ موت ان کو اپنے گھروں میں بھی آنی تھی انہوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں موت کا پیالہ پینے سے انکار کر دیا اور تباہ ہو گئے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں اس قوم کے حالات سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے کبھی انکار نہیں کرنا چاہیے۔ جو قوم موت سے ڈرتی ہے وہ دنیا میں کبھی زندہ نہیں رہ سکتی کیونکہ موت سے ڈرنا ہی اُسے موت

کا شکار بنا دیتا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ میں بتایا کہ بے شک تم کمزور اور بے سروسامان ہو۔ اور تمہارا دشمن بڑا تجربہ کار اور سارے سامان سے مسلح ہے مگر اللہ تعالیٰ سمیع ہے وہ تمہاری دعاؤں کو سنے گا۔ اور وہ علیم ہے یعنی ان مشکلات کو بھی جانتا ہے جو تمہیں پیش آئیں گی۔ اس لئے تم اس پر بھروسہ رکھو وہ تمہاری دعاؤں کو سنے گا اور تمہیں دشمن کے مقابلہ میں کامیابی وکامرانی عطا فرمائے گا۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ

کیا کوئی ہے جو اللہ کو (اپنے مال کا) ایک اچھا ٹکڑا کاٹ کر دے تا کہ وہ اسے اس کے لئے بہت بہت بڑھائے۔ اور

اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ؕ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۶﴾

اللہ (کی یہ بھی سنت ہے کہ وہ بندہ کا مال) لیتا ہے اور بڑھاتا ہے۔ اور آخر تمہیں اسی کی طرف لوٹایا جائے گا۔

حلّ لُغات۔ یُقْرِضُ اَقْرَضَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اس کے معنے قرض دینے کے بھی ہیں اور کاٹ کر الگ کر دینے کے بھی چنانچہ اَقْرَضَہٗ کے یہ بھی معنے ہیں کہ قَطَعَ لَہٗ قِطْعَۃً اُس کے لئے ایک ٹکڑہ کاٹ کر الگ کر دیا۔ اور یہ بھی کہ اَعْطَاہُ قَرْضًا اُسے قرض دیا۔ (اقرب)

لسان العرب میں لکھا ہے۔ اَلْقَرْضُ اَلْقَطْعُ وَھُوَ مَا اَسْلَفَہٗ مِنْ اِحْسَانٍ اَوْمِنْ اَسَاءَۃٍ یعنی ہر وہ عمل جسے انسان اپنے آگے بھیجے خواہ وہ نیک ہو یا بد اُسے قرض کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اس سے مراد مال ہی ہو۔ چنانچہ اُمیّہ کا شعر ہے ؎

کُلُّ امْرِیٍٔ سَوْفَ یُجْزٰی قَرْضَہٗ
حَسَنًا اَوْسَیِّئًا مَدِیْنًا مِثْلَ مَادَانَ

یعنی ہر شخص کو اس کے قرض کا بدلہ ملے گا خواہ وہ اچھا ہو یا برا اور وہ اپنے کئے کی جزاء پائے گا۔

اَلْقَرْضُ کُلُّ اَمْرٍ یُتَجَازٰی بِہٖ مِنَ النَّاسِ۔ ہر ایسا فعل جس کا انسان کو بدلہ دیا جائے قرض کہلاتا ہے قَرَضْتُہٗ کے معنے ہیں جَازَیْتُہٗ میں نے اُسے بدلہ دیا۔ تَقُوْلُ الْعَرَبُ لَکَ عِنْدِیْ قَرْضٌ حَسَنٌ وَ قَرْضٌ سَیِّیٌٔ۔ عرب کہتے ہیں کہ تیرا میرے ساتھ اچھا معاملہ ہے، میں نے اس کا بدلہ دینا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں

کہ تیرا معاملہ میرے ساتھ بُرا ہے میں نے اس کا بدلہ دینا ہے۔ وَاَصْلُ الْقَرْضِ مَا یُعْطِیْهِ الرَّجُلُ اَوْ یَفْعَلُهٗ لِیُجَازٰی عَلَیْهِ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَقْرِضُ مِنْ عِوَضٍ وَلٰكِنَّهٗ یَبْلُوْ عِبَادَهٗ۔ اصل قرض یہ ہے کہ انسان کسی کو کوئی چیز دے یا ایسا کام کرے جس کا اُسے بدلہ دیا جائے۔ کہتے ہیں خدا تعالیٰ عوض کے بدلہ میں نہیں لیتا بلکہ وہ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ لبید کہتا ہے ؎

وَاِذَا جُوْزِیْتَ قَرْضًا فَاَجْزِهٖ
اِنَّمَا یُجْزَی الْفَتٰی لَیْسَ الْجَمَلُ

کہ جب تجھے قرض دیا جائے تو تُو اس کا بدلہ دے۔ کیونکہ بہادر آدمی ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اونٹ نہیں دیا کرتے۔ یعنی تُو ایسا نہ بن کہ لوگ تجھ سے معاملہ کریں تو تُو اُن سے اچھا معاملہ نہ کرے۔

اِسی طرح کہتے ہیں اَلْقَرْضُ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی مَنْ یُّقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا اِسْمٌ لَیْسَ بِمَصْدَرٍ وَلَوْ كَانَ مَصْدَرًا لَكَانَ اِقْرَاضًا وَلٰكِنَّ الْقَرْضَ كُلُّ مَا یُلْتَمَسُ عَلَیْهِ الْجَزَآءُ کہ قرض کا لفظ اِس آیت میں اسم ہے نہ کہ مصدر۔ اگر مصدر ہوتا تو اِقْرَاض ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہاں قَرْض ہے۔ جس کے معنے ہیں ہر وہ چیز جس پر انسان بدلہ چاہے۔

اخفش کہتا ہے یُقْرِضُ اللّٰهَ یَفْعَلُ فِعْلًا حَسَنًا فِیْ اِتِّبَاعِ اَمْرِهٖ یُقَالُ لِكُلِّ مَنْ فَعَلَ اِلَیْهِ خَیْرًا اَلَقَدْ اَحْسَنْتَ قَرْضِیْ کہ یہ محاورہ ہے کہ جس آدمی سے اچھا سلوک کیا جائے۔ وہ کہتا ہے تو نے مجھے اچھا قرض دیا ہے یعنی اچھا معاملہ کیا ہے یا یوں کہتے ہیں کہ لَقَدْ اَقْرَضْتَنِیْ قَرْضًا حَسَنًا اَیْ اَدَّیْتَ اِلَیَّ خَیْرًا تو نے مجھے قرضہ حسنہ دیا ہے۔ یعنی میرے ساتھ بڑی نیکی کی ہے۔ ان معنوں کی رُو سے زیر تفسیر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ (۱) کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرے ایسی صورت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اُس کی جزاء کی اُمید رکھے۔ (۲) کون ہے جو اپنے مال کا ایک حصہ کاٹ کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے۔ گویا دونوں معنوں کی رو سے غرض یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ کی اتباع کرے اور اپنے مال کا ایک حصہ کاٹ کر اس کی راہ میں خرچ کرے۔

اَضْعَافٌ ضِعْفٌ کی جمع ہے۔ اور ضِعْفٌ کے معنے عربی زبان میں کئی ہیں۔ (۱) محض بڑھا دینا۔ (۲) جتنی چیز ہو اتنی ہی اور بڑھا دینا یعنی دوگنا کر دینا۔ (۳) کہتے ہیں کہ یہ کم از کم افزائش ہے بڑی حد مقرر نہیں کی جا سکتی خواہ اُسے کروڑ گنا بڑھا دیا جائے (اقرب)۔ کروڑ گنا بھی اضعاف میں داخل ہے۔ یہ جملہ ہے تو سوالیہ مگر تحریص کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کی اصل عبارت یوں ہوگی اَیُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا فَیُضَاعِفَهٗ لَهٗ یا هَلْ مِنْ

مُّقْرِضٍ فَيُضَاعِفَهٗ۔

تفسیر ۔جیسا کہ حل لغات میں بتایا جاچکا ہے اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ تم میں سے کون ہے جو اپنے مال کا ایک عمدہ حصہ کاٹ کر اللہ تعالیٰ کو دے دے تا کہ وہ اُسے خود دینے والے کے فائدہ کے لئے بڑھائے اور اُسے ترقی دیتا چلا جائے اس آیت میں نہایت لطیف پیرایہ میں مومنوں کو خدا تعالیٰ کے لئے اپنے اموال خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اوّل تو ہم تم سے سارا مال نہیں مانگتے بلکہ مال کا صرف ایک حصہ مانگتے ہیں اور پھر مانگتے بھی اس لئے ہیں کہ تم ایک روپیہ دو تو تمہیں اس کا دس گنا اجر دیا جائے۔ خدا تعالیٰ کی محبت اور اُس کی رضا حاصل کرنے کا اس سے زیادہ سہل اور آسان طریق اور کیا ہوسکتا ہے؟

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انسان جب خدا تعالیٰ کے لئے اپنا مال خرچ کرے تو اسے تین باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ اوّل۔ اُس کے دل میں صدقہ وخیرات کرتے وقت کوئی انقباض پیدا نہ ہو۔ بلکہ وہ پوری بشاشت اور خوش دلی کے ساتھ اُس میں حصہ لے۔ دوم۔ جسے کوئی چیز دی جائے اُس پر احسان نہ جتایا جائے اور نہ اس کے نتیجہ میں اس پر کوئی ناواجب بوجھ ڈالا جائے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس نیکی کی توفیق دے کر درحقیقت مجھ پر احسان کیا ہے۔ سوم۔ جو چیز دی جائے وہ اپنے مال کا بہترین حصہ ہو۔ یہ تینوں امور مندرجہ ذیل آیتوں سے مستنبط ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ منافقوں کے متعلق فرماتا ہے وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (التوبۃ: ۵۴) وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں کراہت اور ناپسندیدگی کے ساتھ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى (البقرۃ: ۲۶۳) مومن وہ ہیں جو اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے بعد نہ تو کسی رنگ میں دوسروں پر احسان جتلاتے ہیں اور نہ انہیں کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں۔ پھر فرماتا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (آل عمران: ۹۳) تم کامل نیکی کا مقام ہرگز نہیں پاسکتے جب تک کہ تم اپنی پسندیدہ اشیاء میں سے خرچ نہ کرو۔

پس مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم میں سے کوئی ہے جو اپنے مال کا اچھے سے اچھا ٹکڑا الگ کر کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے جس کے دیتے وقت نہ تو اس کے دل میں انقباض پیدا ہوا اور نہ اس کے بعد وہ دوسروں پر احسان جتلائے یا ان کے لئے کسی قسم کی تکلیف کا موجب بنے۔ اور یقیناً یاد رکھو کہ جو لوگ ایسا کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں اس نیکی کا بہتر سے بہتر اجر عنایت فرمائے گا اور ان کا ایک ایک عمل ان کے لئے ہزاروں

گنا برکات کا موجب ہوگا۔

مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا بظاہر تو ایک سوال ہے مگر اس کی غرض لوگوں کو تحریص و ترغیب دلانا ہے اور مطلب یہ ہے کہ کیا کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرے اور خدا تعالیٰ اس کے مال کو بڑھائے اور اسے اپنے قرب میں جگہ دے؟

اِس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندوں کو قرض حسنہ دیا کرو۔ یعنی اس کے بندوں سے حسن سلوک کرو اور جو غریب ہیں ان کی مدد کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو کسی نے نہیں دینا بندوں ہی کو دینا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بندوں کو دینے کا نام بھی خدا تعالیٰ کو دینا رکھا جاتا ہے۔ جیسے حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ بعض لوگوں سے کہے گا کہ اے ابن آدم! میں بیمار ہوا لیکن تو نے میری عیادت نہ کی۔ میں بھوکا رہا اور میں نے کھانا بھی مانگا مگر تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ میں پیاسا رہا اور تجھ سے پانی بھی مانگا مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ اس کے بعد حدیث میں آتا ہے کہ بندہ خدا تعالیٰ سے پوچھے گا کہ اے اللہ! تو کب بیمار ہوا؟ کہ میں نے تیری عیادت نہ کی۔ تو نے کب مجھ سے پانی مانگا؟ کہ میں نے تجھے پانی نہ پلایا۔ تو نے کب مجھ سے کھانا مانگا؟ کہ میں نے تجھے نہ کھلایا۔ اس پر خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا مگر تو نے اس کی بیمار پرسی نہ کی۔ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے اسے کھانا نہ کھلایا۔ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے اسے پانی نہ پلایا۔

(مسلم کتاب البرّ و الصّلۃ و الآداب باب فی فضل عیادۃ المریض)

پس خدا تعالیٰ کو قرض دینے کا ایک یہ بھی مفہوم ہے کہ اس کے بندوں سے نیک سلوک کیا جائے اور ان کی مالی پریشانیوں کو دور کرنے میں حصہ لیا جائے۔ عیسائیوں نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے حالانکہ اس حدیث کے الفاظ بعینہٖ انجیل میں بھی آئے ہیں۔ وہاں لکھا ہے۔

> ’’تب بادشاہ انہیں جو اس کے داہنے ہیں کہے گا۔ اے میرے باپ کے مبارک لوگو! اس بادشاہت کو جو دنیا کی بنیاد ڈالنے سے تمہارے لئے تیار کی گئی میراث میں لو کیونکہ میں بھوکا تھا۔ تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں اتارا۔ میں ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ بیمار تھا تم نے میری عیادت کی۔ قید میں تھا تم میرے پاس آئے۔ اس وقت راست باز اسے جواب میں کہیں گے۔ اے خداوند کب ہم نے تجھے بھوکا دیکھا اور کھانا کھلایا۔ پیاسا دیکھا اور پانی پلایا۔ کب ہم نے تجھے پردیسی دیکھا اور اپنے گھر میں اتارا یا ننگا دیکھا اور

کپڑا پہنایا۔ ہم کب تجھے بیمار یا قید میں دیکھ کر تجھ پاس آئے۔تب بادشاہ ان سے جواب میں کہے گا۔ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے ایک کے ساتھ کیا تو میرے ساتھ کیا۔تب وہ بائیں طرف والوں سے بھی یہی کہے گا۔ اے ملعونو! میرے سامنے سے اس ہمیشہ کی آگ میں جاؤ۔ جو شیطان اور اس کے فرشتوں کے لئے تیار کی گئی۔کیونکہ میں بھوکا تھا پر تم نے کھانے کو نہ دیا۔ پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہ پلایا۔ پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں نہ اتارا۔ ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا نہ پہنایا۔ بیمار اور قید میں تھا تم نے میری خبر نہ لی۔ تب وے بھی اسے جواب میں کہیں گے۔اے خداوند کب ہم نے تجھے بھوکا یا پیاسا یا پردیسی یا ننگا یا بیمار یا قیدی دیکھا اور تیری خدمت نہ کی۔تب وہ انہیں جواب میں کہے گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے ایک کے ساتھ نہ کیا تو میرے ساتھ بھی نہ کیا۔" (متی باب ۲۵ آیت ۳۴ تا ۴۰)

انجیل کے اس حوالہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ بندوں کو دینا خدا تعالیٰ کو دینا کہلاتا ہے۔ پس مَنۡ ذَاالَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ سے مَنۡ ذَاالَّذِیۡ یُقۡرِضُ عِبَادَ اللّٰہِ مراد ہے۔گویا یہاں ایک مضاف محذوف ہے جو عِبَادَ اللّٰہِ ہے اور چونکہ اس سے پہلے وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔اس لئے اس کے معنے یہ ہیں کہ لڑائیوں کے ایام میں بعض کو مالی نقصان پہنچیں گے۔تم کو چاہیے کہ انہیں قرض دے کر ان کے حالات درست کرو۔ یہ قرض گویا تم خدا تعالیٰ کو دو گے۔اور یاد رکھو کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے لئے ایک دانہ بھی خرچ کرتا ہے۔خدا تعالیٰ اسے بڑھاتا ہے اور اتنا بڑھاتا ہے کہ کسی کو اس کی امید بھی نہیں ہوتی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھو۔انہوں نے اپنا ایک بیٹا خدا تعالیٰ کے لئے قربان کیا اور خدا تعالیٰ نے ان کو اس کے بدلہ میں اتنی اولاد دینے کا وعدہ دیا جس کا آسمان کے ستاروں کی طرح شمار ہی نہیں ہوسکتا (پیدائش باب ۱۳ آیت ۱۵ تا ۱۷)۔اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کے لئے ایک بے آب وگیاہ جنگل میں رہنا منظور کیا۔جس کے بدلہ میں ان کو یہ مرتبہ ملا کہ اوّلین و آخرین کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کی نسل میں سے پیدا ہوئے۔پس فرماتا ہے کہ تم یہ مت گمان کرو کہ تمہاری قربانیاں ضائع چلی جائیں گی۔ خدا تعالیٰ نے اس کے بدلہ میں تمہارے لئے جو انعام مقرر کیا ہے وہ تمہارے وہم وگمان سے بھی بالا ہے۔

فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضۡعَافًا کَثِیۡرَۃً پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اَضۡعَافًا کس طرح آسکتا ہے۔ یہاں تو

ضِعَافًا آنا چاہیے تھا (تفسیر مظہری زیر آیت ھذا)۔ اس کا بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ چونکہ تعدّدِ انواع کی طرف اشارہ کرنا مدّنظر تھا۔ اس لئے اَضْعَافًا رکھا گیا ہے، ضِعَافًا سے تو صرف یہی مراد ہوسکتا تھا کہ وہ اُسے کئی گُنے بڑھائے گا۔ مگر اَضْعَافًا میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بڑھائے گا بھی اور یہ زیادتی کئی قسم کی ہوگی۔ پس تعدادِ انواع کے اظہار کے لئے ضِعَافًا کی بجائے اَضْعَافًا جمع لائی گئی ہے۔

وَ اللّٰہُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ میں ایک تو اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح تمہارے دوسرے بھائیوں پر مصیبت آئی ہے اسی طرح تم پر بھی آسکتی ہے۔ کیونکہ تنگی اور کشائش کے دور بدلتے رہتے ہیں اس لئے ان کی مدد کرنا تمہارا اوّلین فرض ہے۔

دوسرے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں پہلے جملہ کی مزید تشریح کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرض لینے کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ پہلے اپنے بندوں کا مال لیتا ہے اور پھر اُس کو بڑھاتا اور ترقی دیتا ہے۔ پس جب تک بندہ قربانی نہ کرے اس وقت تک خدا تعالیٰ کا وہ خاص فضل بھی نازل نہیں ہوتا جس کی طرف یَبْصُۜطُ کا لفظ اشارہ کر رہا ہے۔ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ تنگی بھی لاتا ہے اور کشائش بھی پیدا کرتا ہے اور جب دونوں اس کے اختیار میں ہیں تو پھر جو بھی اس کے احکام پر چلے گا اُس کے لئے وہ بسط پیدا کرے گا اور جو اس کی نافرمانی کرے گا اس کے لئے وہ قبض یعنی عذاب کی صورت پیدا کر دے گا۔

اسی طرح اس کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں انسان کی دو ہی حالتیں ہوتی ہیں یا تو قبض کی حالت ہوتی ہے یا بسط کی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دفعہ ایک صحابیؓ حاضر ہوئے۔ اور انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! میں تو منافق ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم تو مومن ہو تم اپنے آپ کو منافق کیوں سمجھتے ہو؟ اس صحابیؓ نے کہا یا رسول اللہ! میں جب تک آپ کی مجلس میں بیٹھا رہتا ہوں یوں معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ اور جنت میرے سامنے ہیں۔ اور خشیت الٰہی کا زور ہوتا ہے لیکن جب میں اپنے گھر جاتا ہوں تو وہ حالت قائم نہیں رہتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہی تو خالص ایمان ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ اگر انسان ایک ہی حالت پر رہے تو وہ مر نہ جائے۔ غرض قبض و بسط دونوں حالتیں انسان پر آتی رہتی ہیں اگر انسان کی ہر وقت ایک قسم کی حالت رہے تو اگر جسمانی طور پر نہیں تو دماغی طور پر وہ یقیناً مرجائے گا اور پاگل ہوجائے گا۔ مجنونوں اور عقل مندوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ مجنون پر ایک ہی حالت ہمیشہ طاری رہتی ہے۔ اور عقلمندوں پر اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ مجنون ایک ہی قسم کے خیالات میں مبتلا رہتا ہے لیکن عقل مند شخص کے خیالات ایک قسم کے نہیں رہتے۔ غرض قبض و بسط

کی حالتیں انسان کے ساتھ لازم کردی گئی ہیں کبھی اس کے اندر بسط کی لہر پیدا ہوتی ہے اور وہ دین کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ حساب کرنے بیٹھ جاتا ہے کہ میں کتنی قربانی کر سکتا ہوں۔ یہ حساب کرنے والی حالت قبض کی حالت ہوتی ہے اور جب کوئی شخص سب کچھ دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس میں خوشی محسوس کرتا ہے تو وہ بسط کی حالت ہوتی ہے۔ پس فرمایا کہ تم دونوں حالتوں میں خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرو۔ کیونکہ تنگی بھی عارضی چیز ہے اور فراخی بھی عارضی۔ اور چونکہ سوال ہو سکتا تھا کہ اگر خدا تعالیٰ کے پاس ہمارا مال بڑھتا رہتا ہے تو اس کا ہمیں کیا فائدہ؟ اس لئے فرمایا کہ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ اصل گھر تو تمہارا وہی ہے۔ پس جو کچھ تم ہمارے پاس بھیجتے ہو ہم اسے بڑھاتے رہتے ہیں۔ جب تم آؤ گے تو خدا تعالیٰ نے تمہارا مال بہت بڑھا رکھا ہوگا۔ اور وہ تمہیں مل جائے گا۔ جیسے کوئی ملازم باہر جاتا ہے تو روپیہ اپنے گھر بھیجتا رہتا ہے اور اس کی بیوی اسے جمع کرتی رہتی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ صرف جمع ہی نہیں کرتا بلکہ اسے بڑھاتا بھی رہتا ہے۔ پس اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ میں بتایا کہ آخر ایک دن تم نے خدا کی طرف لوٹنا ہے۔ جہاں ایک دائمی زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ پس عارضی چیزوں کی وجہ سے اپنی دائمی زندگی کو نقصان مت پہنچاؤ اور جس قدر بھی نیکی میں حصہ لے سکتے ہو لو۔

قرآن کریم کا کمال دیکھو کہ اس میں انفس اور اموال کی ترتیب کیسے عجیب طور پر رکھی گئی ہے۔ چونکہ جنگ میں سب سے پہلے سپاہی کا وجود ضروری ہوتا ہے جو قوم اور ملّت کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کا حکم دے کر مومنوں سے ان کی جان کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد دوسرا سوال خزانہ کی مضبوطی کا ہوتا ہے کیونکہ جب کوئی قوم میدانِ جہاد میں نکلتی ہے تو ملک کے خزانہ پر جنگی اخراجات کا غیر معمولی بار پڑ جاتا ہے اور اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ جنگ زیادہ دیر تک نہیں لڑی جا سکتی۔ اسی حکمت کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے دوسرے نمبر پر مالی قربانیوں کی تحریک فرما دی اور اس طرح قومی اور مذہبی استحکام کے لئے جان اور مال کی قربانیوں کو ایک بنیادی حیثیت دے کر ان کی طبعی ترتیب بھی قائم کر دی کہ پہلا درجہ جانی قربانیوں کا ہے اور دوسرا درجہ مالی قربانیوں کا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ

کیا تجھے بنی اسرائیل کے ان سرکردہ لوگوں کا حال نہیں معلوم ہوا۔ جو موسیٰ کے بعد گزرے ہیں۔

اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ

جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے کوئی (شخص) بادشاہ (بنا کر) کھڑا کیجیئے تا کہ ہم (اس کے ماتحت ہو کر)

اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا

اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ اس نے کہا (کہیں) ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر تم پر جنگ فرض کی جائے تو تم جنگ نہ کرو۔

تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ

انہوں نے کہا (ایسا نہیں ہوگا) اور ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں گے حالانکہ

اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ

ہمیں اپنے گھروں سے نکالا گیا ہے اور اپنے بچوں سے (جدا کیا گیا ہے) مگر جب ان پر جنگ فرض کی گئی

الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۷﴾

تو ان میں سے ایک قلیل (سی) جماعت کے سوا (باقی) سب پھر گئے۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

حل لغات۔ مَلَأٌ اس کے اصل معنے بھر دینے کے ہیں۔ کہتے ہیں۔ مَلَأَ الْإِنَاءَ بِالْمَاءِ اُس نے برتن کو پانی سے بھر دیا۔ مُلِئَ رُعْبًا اُس کا دل خوف سے بھر گیا۔ اَلْمَلَأُ کے معنے ہیں۔ سرداران قوم۔ بڑے آدمی۔ کیونکہ جب مجلس میں بڑا آدمی آجاتا ہے تو کہتے ہیں۔ اب مجلس بھر گئی ہے۔ اب کسی کی ضرورت نہیں رہی۔ غرباء خواہ پچاس بیٹھے ہوئے ہوں جب تک بڑا آدمی نہ آجائے تب تک یہی کہتے ہیں کہ ابھی رونق نہیں ہوئی۔ اور اس وقت تک کام بھی شروع نہیں کرتے جب تک کہ وہ آنہ جائے۔ اس لئے مَلَأٌ بڑے لوگوں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے وجود سے لوگوں کی مجلس کو بھر دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کے خوف یا محبت کی وجہ سے بھی لوگوں کے دل بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ (اقرب)

هَلْ عَسَيْتُمْ عَسٰی بعض جگہ تو امکان کے لئے آتا ہے اور بعض جگہ توقع کے لئے جب یہ لفظ خدا تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو امکان کی طرف اشارہ ہوتا ہے یعنی اس امر کو بعید مت سمجھو۔ (مفردات)

مَا لَنَا یہ عربی زبان کا محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کیا ہو گیا ہے۔

تفسیر ۔گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان کر کے مسلمانوں کو نصیحت کی تھی کہ تم خدا کے لئے موت قبول کرنے سے کبھی انکار نہ کرنا اب ایک اور واقعہ بیان فرماتا ہے جو بنی اسرائیل کے سرداروں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کہ انہوں نے دشمن سے لڑائی کرنے کے لئے ایک بادشاہ بنائے جانے کی اپنے نبی کے سامنے درخواست پیش کی اور کہا کہ دشمن کی طرف سے ہم پر متواتر ظلم کیا جارہا ہے ہمیں اپنے مکانوں اور جائیدادوں سے بے دخل کیا گیا ہے اور ہمیں اپنے بچوں سے بھی جُدا کر دیا گیا ہے۔ اب ہم پر ایک بادشاہ مقرر کیا جائے تا کہ ہم خدا تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کریں۔

یہاں مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی کے الفاظ سے فوراً بعد مراد نہیں کیونکہ فوراً بعد حضرت یوشعؑ ہوئے تھے جو نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی (یشوع باب ۱ آیت ۱تا۴)۔اور یہ واقعہ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا کئی سو سال بعد ہوا۔

هَلْ عَسَيْتُمْ میں اس نبی نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اس بات کا امکان ہے کہ اگر تم پر جنگ فرض کی گئی تو تم انکار کر دو۔ چنانچہ اس نے کہا کہ تم پہلے اپنے دلوں کو ٹٹول لو ایسا نہ ہو کہ لڑائی فرض کی جائے اور تم انکار کر کے گناہ گار بنو۔

وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں اپنے گھروں سے بھی نکالا گیا اور اپنے بیٹوں سے بھی جدا کیا گیا۔ یعنی ہماری زمینوں اور مکانات پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور ہمارے بیٹے بھی قتل کئے گئے یا مکانات کے ساتھ بیٹے بھی انہوں نے چھین لئے۔ اور جب ہم نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اس قدر تکالیف برداشت کی ہیں تو اب ہم لڑائی کرنے سے کیوں انکار کریں گے؟ اِن الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بعد کے زمانہ کی بات ہے۔ ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تو بنی اسرائیل کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اے موسیٰ! تُو اور تیرا ربّ دونوں جاؤ اور دشمنوں سے لڑتے پھرو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ لیکن اس موقعہ پر انہوں نے یہ جواب نہیں دیا۔ بلکہ کہا کہ ہم جہاد میں کیوں حصہ نہیں لیں گے جب کہ ہمیں اپنے گھروں سے بھی نکالا گیا اور اپنے بچوں سے بھی علیحدہ کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب لڑائی کا وقت آیا تو جیسا کہ اگلی آیات سے واضح ہے ان میں سے بہت سے لوگ متزلزل ہو گئے۔ مگر بہر حال انہوں نے شروع میں لڑنے

سے انکار نہیں کیا۔ بلکہ خود خواہش کی کہ ہم پر کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے تا کہ دشمن کے مظالم کا انسداد ہو۔ یہ بات بتاتی ہے کہ ان آیات میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے بہت بعد کا ہے۔ ورنہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں تو انہوں نے لڑنے سے کلّی طور پر انکار کر دیا تھا مگر یہاں انہوں نے انکار نہیں کیا بلکہ اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ہم پر کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے تا کہ ہم خدا تعالیٰ کے راستہ میں اپنے دشمنوں سے لڑائی کریں۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ

اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت (یعنی جدعون) کو بادشاہ بنا کر (اس کام کے لئے)

مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ

کھڑا کیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ اسے ہم پر حکومت کس طرح مل سکتی ہے جبکہ ہم اس کی نسبت حکومت کے زیادہ حق دار ہیں۔

بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ

اور اسے مالی فراخی بھی (کوئی ایسی زیادہ) عطا نہیں ہوئی۔ اس نے کہا کہ

اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ

اللہ نے اسے تم پر یقیناً فضیلت دی ہے اور اسے علمی اور جسمانی لحاظ سے (تم سے زیادہ) فراخی عطا کی ہے۔

الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۸﴾

اور اللہ جسے پسند کرتا ہے اسے اپنا ملک عطا کرتا ہے۔ اور اللہ کشائش دینے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

تفسیر۔ بنی اسرائیل نے جب درخواست کی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کیا جائے جس کی کمان میں ہم دشمنوں سے جنگ کریں تو ان کا خیال تھا کہ انہی میں سے کسی کو بادشاہ مقرر کر دیا جائے گا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ان کا امتحان لینا چاہتا تھا اس لئے ان کی منشاء کے خلاف ایک شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا۔ اِس پر اُن کی مخفی ایمانی کمزوری ظاہر ہوگئی اور انہوں نے اعتراض کرنے شروع کر دیئے کہ اسے کیوں بادشاہ بنا دیا گیا ہے؟ اور پھر انہوں نے اپنے اس اعتراض کو تقویت دینے کے لئے کہا۔ (۱) ہمارے مقابلہ میں اسے کوئی ظاہری وجاہت حاصل

نہیں۔ ہم اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ادنیٰ خاندان میں سے ہے اس لئے بادشاہت ہمارا حق تھا نہ کہ اس کا۔ (۲) یہ مالی لحاظ سے غربت میں مبتلا ہے حالانکہ بادشاہت کے لئے دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس ہم اسے بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ ۔ اُن کے نبی نے پہلی بات کا تو یہ جواب دیا کہ اس کے انتخاب میں خدائی ہاتھ ہے اور بڑائی اِسی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ ایک شخص کو دوسروں کے مقابلہ میں چن لیتا ہے اور پھر اُسے مخالفت کے باوجود کامیاب کر دیتا ہے۔ اِسی طرح طالوت کو خدا تعالیٰ نے تم میں سے چن لیا ہے اور اس طرح اسے بزرگی اور برتری حاصل ہوگئی ہے۔

دوسرا سوال اُن کا یہ تھا کہ وہ مال دار نہیں اس کے جواب میں بتایا کہ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ خدا تعالیٰ نے اسے علمی لحاظ سے بہت فراخی عطا فرمائی ہے۔ علم کے لفظ سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ دنیا میں مال علم کے ذریعہ ہی کمایا جاتا ہے اور علم اسے تم سے بہت زیادہ حاصل ہے ورنہ بیوقوف آدمی تو اپنے باپ دادا کی کمائی کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے اسے جو علم بخشا ہے اس کے ذریعہ وہ بہت کچھ مال کما لے گا۔ اسی طرح اس کی علمی برتری کا ذکر کر کے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ صرف دولت کی وجہ سے کوئی حکومت کا اہل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے لئے تنظیمی صلاحیتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور حکومتی اوصاف کا بھی پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ تمام باتیں اسے تم سے زیادہ حاصل ہیں۔ اسے حکومت کرنے کا ڈھب بھی آتا ہے اور سیاسیات سے بھی خوب واقف ہے۔ اس لئے صرف مالی کمزوری دیکھ کر اعتراض نہ کرو۔ اس کے اندر جو مخفی جوہر ہیں وہ اپنے وقت پر ظاہر ہوں گے۔

پھر جسم کے لحاظ سے بتایا کہ تم لڑائی کرنا چاہتے تھے۔ اس کا جسم بھی خوب مضبوط ہے اور اس کی جسمانی طاقتیں اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اس میں ہمت اور استقلال اور ثبات اور شجاعت کا مادہ پایا جاتا ہے۔ پس اس سے زیادہ اور کون موزون ہوسکتا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ وہ موٹا تازہ ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ مضبوط اور دلیر ہے اور اس میں قوت برداشت اور قربانی کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ کہا کرتے ہیں۔ اَلْمَرْءُ بِاَصْغَرَيْهِ بِقَلْبِهٖ وَلِسَانِهٖ (اقرب)۔ یعنی انسان کی تمام طاقت اُس کی دو چھوٹی سی چیزوں پر موقوف ہے ایک دل پر اور ایک اُس کی زبان پر۔ اور یہی سچے خلفاء کی علامت ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ نہ تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے تو جانے دیں۔ اس وقت ان سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لئے کمزوری کا باعث ہوگا (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکوٰۃ)۔ مگر جب اپنی خلافت کا زمانہ آیا تو کتنے بڑے بڑے کام کئے۔ دراصل ہمت واستقلال

اور استقامت ایک بہت بڑا نشان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے سچے خلفاء کو عطا کیا جاتا ہے۔

وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ میں بتایا کہ اگر تمہارے سوال صحیح بھی مان لئے جائیں تو بھی تمہارا کوئی حق نہیں کہ اعتراض کرو کیونکہ فیصلہ ہمیشہ مالک ہی کیا کرتا ہے اور جب ملک خدا کا ہے تو وہ جسے چاہے دے اس میں کسی کو چون و چرا کی کیا مجال ہے؟ جب ہم مالک کی اجازت سے ملک اس کے سپرد کرتے ہیں تو پھر تم کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ دنیا میں یہ تسلیم شدہ اصل ہے کہ اگر کسی چیز کی ملکیت کے بارہ میں اختلاف ہو جائے تو اس بارہ میں اصل مالک کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پس جب خدا نے اُسے اِس غرض کے لئے منتخب فرمالیا ہے اور اصل حکومت خدا تعالیٰ ہی کی ہے تو تمہارا کیا حق ہے کہ تم اعتراضات کرو؟ اِن الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے پھر کوئی سوال کرنا تھا کہ اچھا اگر اسے علم دیا گیا ہے تو وہ کونسا علم ہے یا کونسی استقامت ہے جو اس نے دکھائی۔ اس لئے پہلے ہی اس کا جواب دے دیا کہ وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ۔ یعنی آراء میں تو ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے مگر جو مالک ہو اس کی رائے مقدم سمجھی جاتی ہے۔ پھر خدا تعالیٰ تمہاری رائے کے پیچھے کیوں چلے؟ خصوصاً جبکہ وہ واسع اور علیم ہے۔ اس میں بتایا کہ اگر تم مال کے متعلق کہو کہ اس کے پاس نہیں تو ہم واسع ہیں ہم اسے وسعت دے دیں گے۔ اگر کہو کہ یہ حکومت کرنے کا اہل نہیں تو ہم خوب جانتے ہیں کہ بادشاہت کا اہل کون ہے؟ پس اگر تم نے لڑنا ہی ہے تو جاؤ خدا سے لڑو۔ خدا کا ملک تھا اُس نے جسے چاہا دے دیا۔

اِس آیت سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے انبیاء چونکہ کامل شریعت لے کر نہیں آئے تھے اس لئے جب اصلاح خلق کے لئے الہام کی ضرورت ہوتی تھی تو کسی نبی کو کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ اور اُسے نبوت کا مقام براہ راست حاصل ہوتا تھا۔ اور جب نظام میں خلل واقع ہوتا تو کسی کو بادشاہ بنا دیا جاتا۔ گویا چونکہ لوگوں کو ابھی اس قدر ذہنی ارتقاء حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی اصلاح کے لئے جدوجہد کر سکتے اس لئے نہ صرف انبیاء کو اللہ تعالیٰ براہ راست مقام نبوت عطا فرماتا بلکہ ملوک بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی مقرر کئے جاتے تھے۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے وہ انتخابی نہیں ہوتے تھے بلکہ یا تو ورثہ کے طور پر وہ حکومت حاصل کرتے تھے۔ یا نبی انہیں خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت بادشاہ مقرر کر دیتے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ایک کامل تعلیم لے کر آئے تھے اور آپ کی قوم زیادہ اعلیٰ درجہ کی تھی اس لئے آپ کے بعد مستقل انبیاء کی ضرورت نہ رہی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت کی ادنیٰ صورت کو بھی اُڑا دیا گیا۔ اور اس کی ایک کامل صورت پیدا کر دی گئی۔ اور انتخاب کو پہلی شرط قرار دیا گیا۔ اس طرح قومی حقوق کو محفوظ کیا گیا جو پہلے بادشاہوں کی صورت میں محفوظ نہ تھا۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ

اوران کے نبی نے ان سے کہا۔ کہ اس کی حکومت کی دلیل یہ (بھی) ہے کہ تمہیں

التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ

(ایک) تابوت ملے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین (ہوگی) اوراس چیز کا بقیہ ہوگا جو موسیٰ کے متعلقین

مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

اور ہارون کے متعلقین نے (اپنے پیچھے) چھوڑا۔ فرشتے اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اگر تم مومن ہو تو اس

لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۟ؑ ﴿۲۴۹﴾

ع ۳۲ ۱۶

(بات) میں تمہارے لئے یقیناً ایک (بڑا) نشان ہے۔

حل لغات۔ بَقِيَّةٌ یہ لفظ ایسی چیز پر بولا جاتا ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو۔ چنانچہ جب کہیں فُلَانٌ بَقِيَّةُ قَوْمِهٖ تو اس کے معنے ہوتے ہیں هُوَ مِنْ خِيَارِهِمْ۔ وہ قوم کے شرفاء اور اچھے لوگوں میں سے ہے۔ (اقرب)

قرآن کریم میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا (مریم: ۷۷) یعنی اچھے اور نیک اعمال خدا تعالیٰ کے حضور ثواب حاصل کرنے کے لحاظ سے بھی اور انجام کے لحاظ سے بھی سب سے بہتر شے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ عقل پر بھی بولا گیا ہے جیسے آتا ہے۔ فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ (ھود: ۱۱۷) یعنی کیوں ان قوموں میں سے جو تم سے پہلے زمانہ میں تھیں ایسے عقل مند لوگ نہ نکلے جو لوگوں کو ملک میں بگاڑ پیدا کرنے سے روکتے۔ چونکہ عقل بھی خیر ہی کے معنے رکھتی ہے اور انسان کے لئے مفید ہوتی ہے اور وہ اس کے ذریعہ سے باقی رہتا ہے۔ اس لئے اُسے بھی بقیہ کہتے ہیں۔

تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ۔ ترکہ سے مراد عام طور پر ورثہ ہوتا ہے لیکن ترکہ سے مراد دوسروں کی اعلیٰ صفات کا حامل ہونا بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ يَرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ (مریم: ۷) یعنی اے خدا! مجھے اپنے پاس سے وارث دے جو میرا بھی وارث ہو اور سارے بنی اسرائیل کا بھی۔ سارے

بنی اسرائیل کا وارث تو وہ ظاہری طور پر نہیں ہوسکتا تھا۔ پس مراد یہی ہے کہ اٰلِ یعقوب کی جو نیکیاں ہیں وہ اس میں بھی پیدا ہوں اور وہ ان کا وارث ہو۔ اس لحاظ سے اس آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ جو نیک دستور پہلے لوگ چھوڑ گئے ہیں اُن کا وارث ہو۔

تَحْمِلُهُ حَمَلَهٗ عَلٰی كَذَا کے معنے ہیں اَغْرَاهُ اُسے کسی کام پر اکسایا۔ اِسی طرح اس کے معنے اٹھانے کے بھی ہیں۔ (لسان)

تفسیر ۔ گذشتہ آیات میں اس زمانہ کے نبی نے طالوت پر اعتراض کرنے والوں کو یہ جواب دیا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۔ یعنی مخفی طاقتوں کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور جب اس نے طالوت کو چنا ہے تو یقیناً وہ تم سے افضل ہے۔ دوسرے دولت کے زور سے بادشاہت نہیں ہوتی بلکہ علم اور قربانی کی طاقت سے ہوتی ہے۔ سوان دونوں باتوں میں وہ تم سے بڑھا ہوا ہے۔ وہ تم سے زیادہ علوم جانتا ہے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے جسم کو انتہائی ابتلاؤں میں ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ اب اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ان کے نبی نے انہیں کہا کہ اس انتخاب کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تمہیں ایک ایسا تابوت ملے گا جس میں تمہارے ربّ کی طرف سے سکینت ہوگی اور اس چیز کا بقیہ ہوگا جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ کی آل نے اپنے پیچھے چھوڑا۔ اور فرشتے اُسے اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔

مفسّرین نے تابوت سے مراد بنی اسرائیل کا وہ خاص صندوق لیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر تورات کا اصل نسخہ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کے تبرّکات محفوظ تھے۔ اور بنی اسرائیل سفر وحضر میں اُسے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ اُسے بڑا متبرک سمجھتے تھے (الجواھر فی تفسیر القرآن زیر آیت ھٰذا)۔

بائیبل میں بھی اس تابوت کا ان الفاظ میں ذکر آتا ہے۔

’’وے شطیم کی لکڑی کا ایک صندوق بناویں جس کی لمبائی اڑھائی ہاتھ اور چوڑائی ڈیڑھ ہاتھ اور اونچائی ڈیڑھ ہاتھ ہووے۔‘‘ (خروج باب ۲۵ آیت ۱۰)

مگر تعجب ہے قرآن کریم تو کہتا ہے کہ اس تابوت کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے مگر بائیبل بتاتی ہے کہ ایک دفعہ دشمن نے ایسا حملہ کیا کہ وہ یہ تابوت بھی اٹھا کر لے گئے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

’’اور جب لوگ لشکر گاہ میں پھر آئے تھے تب اسرائیل کے بزرگوں نے کہا کہ خداوند نے ہم کو فلستیوں کے سامنے کیوں شکست دی۔ آ ؤ ہم خدا کے عہد کا صندوق سیلا سے اپنے پاس لے

آئیں تا کہ وہ ہمارے درمیان ہو کے ہم کو ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں سے رہائی دیوے۔ سوانہوں نے سیلا میں لوگ بھیجے تا کہ وہ ربُّ الافواج کے عہد کے صندوق کو جو کروبیوں کے درمیان دھرا رہتا ہے وہاں سے لے آویں اور عیلی کے دونوں بیٹے حُفنیؔ اور فینحاسؔ خدا کے عہد کے صندوق پاس وہاں حاضر تھے۔ اور جب خداوند کے عہد کا صندوق لشکر گاہ میں آ پہنچا۔ تو اسرائیلی خوب للکارے۔ ایسا کہ زمین لرز گئی اور فلستیوں نے جو للکارنے کی آواز سنی تو بولے کہ ان عبرانیوں کی لشکر گاہ میں کیسی للکارنے کی آواز ہے۔ پھر انہوں نے معلوم کر لیا کہ خداوند کا صندوق لشکر گاہ میں آ پہنچا۔ سو فلستی ڈر گئے کہ انہوں نے کہا۔ خدا لشکر گاہ میں آیا ہے۔ اور بولے ہم پر واویلا ہے اس لئے کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہ ہوا۔ ہم پر واویلا ہے۔ ایسے خدائے قادر کے ہاتھ سے ہمیں کون بچائے گا۔ یہ وہ خدا ہے جس نے مصریوں کو میدان میں ہر ایک قسم کی بلا سے مارا۔ اے فلستیو! تم مضبوط ہو اور مردانگی کرو۔ تا کہ تم عبرانیوں کے بندے نہ بنو جیسے کہ وے تمہارے بندے بنے بلکہ مرد کی طرح بہادری کرو اور لڑو۔ سو فلستی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے اپنے خیمے کو بھاگا۔ اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی کہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے مارے پڑے۔ اور خدا کا صندوق لُوٹا گیا۔''

(ا۔سموئیل باب ۴ آیت ۳ تا ۱۱)

سو اگر تو یہاں تابوت سے مراد وہی تابوت ہو تو وہ ان کے لئے کسی خوشی کا موجب نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ ہی اس سے ان کو کوئی تسلّی ہو سکتی تھی کیونکہ اس کی موجودگی میں وہ شکست کھا چکے تھے حالانکہ اس سے پہلے ان کو تابوت پر اس قدر یقین تھا کہ جب ان کے سب سے بڑے کاہن کو معلوم ہوا کہ تابوت دشمنوں کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے تو وہ گر پڑا اور وہیں مر گیا۔ لیکن قرآن کریم نے جس تابوت کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق کہا ہے کہ وہ ان کے لئے تسکین کا موجب ہوگا۔ پس یہ تابوت وہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس تابوت سے یقیناً کچھ اور مراد ہے اس غرض کے لئے جب ہم لغت کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تابوت کے عام معنے تو صندوق کے اور کشتی کے ہوتے ہیں (تاج العروس) لیکن استعارۃً اُسے دل کے معنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ عربی زبان میں انسانی قلب کو بَیْتُ الْحِكْمَةِ اور وِعَاءُ الْحِكْمَةِ اور صَنْدُوْقُ الْحِكْمَةِ کہنے کے علاوہ تَابُوْتُ الْحِكْمَةِ بھی کہتے ہیں (مفردات راغب) اسی طرح لسان العرب کا یہ حوالہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ مَا اَوْدَعْتُ شَيْئًا تَابُوْتِيْ فَفَقَدْتُهٗ مَیں نے اپنے تابوت یعنی دل میں کوئی ایسی بات نہیں رکھی کہ بعد میں اسے گم کر دیا ہو۔ یعنی مَیں مستقل مزاج

ہوں۔ جو بات دل میں بیٹھ گئی سو بیٹھ گئی۔ نیز تاج العروس میں لکھا ہے۔ اَلتَّا بُوْتُ اَلْاَ ضْلَاعُ وَ مَا تَحْوِیْہِ کَالْقَلْبِ وَالْکَبِدِ وَغَیْرِ ھِمَا تَشْبِیْھًا بِالصَّنْدُوْقِ الَّذِیْ یُحْرَزُ فِیْہِ الْمَتَاعُ۔یعنی تابوت کے معنے پسلیوں والے حصہ جسم کے ہیں جس میں دل اور جگر وغیرہ اعضاء ہیں۔اور اس حصہ جسم کو تابوت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی صندوق کی طرح ہوتا ہے جس میں سامان محفوظ رکھا جاتا ہے۔اور کسی علمی یا ایمانی یا راز کی بات کو تابوت میں رکھنے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ گویا وہ سینہ میں لکھی گئی ہے۔اور ایسی محفوظ ہوگئی ہے جیسے کوئی چیز صندوق میں رکھ دی جائے۔ وَفِیْ اَحْکَامِ الْاَسَاسِ اَلتَّابُوْتُ: اَلْقَلْبُ اور کتاب احکام الاساس میں بھی تابوت کے معنے دل کے لکھے ہیں اسی طرح مفردات میں لکھا ہے۔ قِیْلَ عِبَارَۃٌ عَنِ الْقَلْبِ وَالسَّکِیْنَۃِ وَعَمَّا فِیْہِ مِنَ الْعِلْمِ۔یعنی کبھی لفظ تابوت کو استعارۃً دل کے معنیٰ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے الفاظ قرآنیہ صاف دلالت کر رہے ہیں کہ اس جگہ تابوت سے مراد دل ہے۔کیونکہ فرماتا ہے اس تابوت میں تمہارے رب کی طرف سے سکینت ہے۔اب یہ ظاہر ہے کہ سکینت دل میں ہوتی ہے نہ کہ صندوقوں میں۔اسی طرح اس تابوت کے متعلق فرماتا ہے تَحْمِلُہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ۔فرشتے اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔اگر تابوت سے ظاہری صندوق مراد لیا جائے تو یہ قرآنی تعلیم کے خلاف ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَھُمُ الْھُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ قُلْ لَّوْ کَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْھِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۹۵۔۹۶) یعنی مخالفین کو ہدایت الٰہی پر ایمان لانے سے صرف یہ بات روکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بشر رسول کیوں بھیجا ہے؟ تو کہہ کہ اگر زمین میں فرشتے امن سے چلتے پھرتے تو ہم فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجا کرتے۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ ملائکہ اس طرح لوگوں میں چلتے پھرتے نہیں ہیں جس طرح انسان چلتے پھرتے ہیں۔پس چونکہ ظاہری تابوت کی صورت میں ماننا پڑتا ہے کہ فرشتے اُسے اُٹھا کر ساتھ ساتھ لئے پھرتے تھے اور یہ قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔اس لئے تابوت سے مراد اس جگہ دل ہی ہیں۔جنہیں فرشتے اٹھاتے تھے اور ہمت بڑھاتے تھے کیونکہ حَمَلَہٗ عَلٰی کَذَا کے معنے اَغْرَاہُ کے ہیں یعنی اکسانا اور جوش دلانا (اقرب) پس معنے یہ ہوئے کہ اَتباع طالوت کو فرشتے قربانیوں پر آمادہ کریں گے اور ان کی نصرت ہر شخص کے ساتھ ہوگی۔چنانچہ مورخین کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ طالوت کا لشکر بہت ہی کم تھا اور ایسے قلیل التعداد لشکر کا کثیر افواج پر غالب آنا سوائے خاص نصرت الٰہی اور ملائکہ کی تائید کے ناممکن تھا۔(التفسیر الطبری زیر آیت ھذا)

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ سے فیوض حاصل کرنے کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ

اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ خلفاء سے مخلصانہ تعلق قائم رکھا جائے اور ان کی اطاعت کی جائے۔ چنانچہ اس جگہ طالوت کے انتخاب میں خدائی ہاتھ کا ثبوت یہی پیش کیا گیا ہے کہ تمہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نئے دل ملیں گے جن میں سکینت کا نزول ہوگا اور خدا تعالیٰ کے ملائکہ ان دلوں کو اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ گویا طالوت کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے نتیجہ میں تم میں ایک تغیر عظیم واقع ہو جائے گا تمہاری ہمتیں بلند ہو جائیں گی۔ تمہارے ایمان اور یقین میں اضافہ ہو جائے گا۔ ملائکہ تمہاری تائید کے لئے کھڑے ہو جائیں گے اور تمہارے دلوں میں استقامت اور قربانی کی روح پھونکتے رہیں گے۔ پس سچے خلفاء سے تعلق رکھنا ملائکہ سے تعلق پیدا کر دیتا اور انسان کو انوارِ الٰہیہ کا مہبط بنا دیتا ہے۔

اب بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ کا حل کرنا باقی رہ گیا۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ بَقِيَّةٌ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے اعلیٰ شے کے ہوتے ہیں۔ پس بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ سے مراد وہ اخلاق فاضلہ ہیں جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے متبعین اور آپ کے مقربین سے ظاہر ہوتے تھے۔ اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے دل ان خوبیوں کے وارث ہوں گے جو آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ نے چھوڑیں ہیں۔ یہ ویسا ہی فقرہ ہے جیسے حضرت زکریاؑ نے دُعا کرتے ہوئے کہا تھا کہ الٰہی مجھے ایک ایسا لڑکا عطا فرما يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ (مریم: ۷) جو میرا اور آلِ یعقوب کا وارث ہو۔ اور مطلب یہ تھا کہ ان کے اخلاق حسنہ اور خوبیوں کا وارث ہو نہ یہ کہ اُن کی جائیداد کا وارث ہو کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو وفات پائے قریباً ایک سو پشت گزر چکی تھی۔ غرض بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ سے یہ مراد ہے کہ طالوت کے ساتھیوں میں وہی اخلاق فاضلہ اللہ تعالیٰ پیدا کر دے گا جو آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ میں تھے۔

آل موسیٰ و آل ھارون سے یہ مراد نہیں کہ ان دونوں کی الگ الگ اُمتیں تھیں۔ یہ بات تو بالبداہت باطل ہے ایک قوم میں اور ایک وقت میں اور ایک شریعت پر عمل کرنے والی دو اُمتیں کس طرح ہو سکتی ہیں؟ اس کا مطلب اہل یعنی اقارب سے ہے اور مراد یہ ہے کہ ان دونوں نبیوں کی اولادوں میں جو خوبیاں تھیں وہ ان میں بھی آ جائیں گی۔ اگر کہو کہ اہل میں خوبی ہونا ضروری نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بَقِيَّةٌ کے لفظ نے بتا دیا ہے کہ اس جگہ خوبیاں مراد ہیں۔ دوسرے بائیبل کی کتاب خروج باب ۴۰ آیت ۱۲ تا ۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ ہارون کو مقدس لباس پہنایا جائے اور نہ صرف اس کی عزت افزائی کی جائے بلکہ اس کی تمام اولاد کی عزت کرنا بھی بنی اسرائیل پر فرض قرار دیا جائے۔ اور عبادت گاہوں کا انتظام ان کے سپرد کیا

جائے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

’’جیسے ان کے باپ کو مسح کرے۔ ویسے ہی ان کو بھی مسح کرنا۔ تا کہ وہ میرے لئے کاہن کی خدمت کو انجام دیں۔ اور ان کا مسح ہونا ان کے لئے نسل درنسل ابدی کہانت کا نشان ہوگا۔‘‘

پس بے شک ہر اہل میں خوبیوں کا موجود ہونا ضروری نہیں مگر موسیٰؑ اور ہارونؑ کے متعلقین اور ان کے خاص متبعین میں اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کے اخلاق یقینی طور پر ودیعت کر دیئے تھے۔ اور طالوت کے خدائی انتخاب کا یہ ثبوت بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو روحانیت آل موسیٰؑ اور آل ہارونؑ میں رکھی تھی اور جن بلند اخلاق اور کردار کا انہوں نے مظاہرہ کیا تھا وہی تقویٰ اور وہی روحانیت اور وہی بلند اخلاقی طالوت کے ساتھیوں میں بھی پیدا کر دی جائے گی اور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ جس شخص کی انہوں نے متابعت اختیار کی ہے وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ

پھر جب طالوت اپنی فوجوں کو لے کر نکلا تو اس نے کہا کہ اللہ (تعالیٰ) ایک ندی کے ذریعہ سے یقیناً تمہارا امتحان

بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ

لینے والا ہے۔ پس جس نے اس (نہر) میں سے (پیٹ بھر کر پانی) پی لیا وہ مجھ سے (وابستہ) نہیں (رہے گا)

يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ

اور جس نے اس سے نہ چکھا وہ یقیناً مجھ سے (وابستہ) ہوگا۔ سوائے اس کے جس نے اس میں سے (فقط) اپنے

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ

ہاتھوں سے ایک چلّو لے (کر پی) لیا (کہ اس پر کوئی الزام نہ ہوگا) پھر (ہوا یہ کہ) ان میں سے چند ایک کے سوا (باقی

اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ

سب نے) اس میں سے (پانی) پی لیا۔ پھر جب وہ خود اور (نیز) وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اس ندی

جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ

سے پار اتر گئے (تو) انہوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ کی بالکل طاقت نہیں (مگر)

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

جولوگ یقین رکھتے تھے کہ وہ (ایک دن) اللہ سے ملنے والے ہیں انہوں نے کہا کہ بہت سی چھوٹی جماعتیں اللہ کے

وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آ چکی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ (ہوتا) ہے (پس ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں)۔

حلّ لُغات۔ **اِغْتَرَفَ** اِغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ غرفہ کا لفظ چونکہ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ يَدٌ بمعنی ہاتھ رکھ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے معنے محدود ہو گئے ہیں۔ پس اِغْتَرَفَ غُرْفَةً کے معنے اس جگہ صرف چلو بھر لینے کے ہی ہیں۔ (اقرب)

كَمْ یہ لفظ اس جگہ کثرت کے اظہار کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی کتنے ہی ایسے گروہ ہیں جو قلیل ہونے کے باوجود دوسروں پر غالب آئے لیکن بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ضروری نہیں کہ اس سے کثرت مراد ہو بلکہ کسی قدر تعداد کا پایا جانا بھی کافی ہے خواہ ایسے گروہوں کی تعداد تھوڑی ہی ہو۔ (رازی زیر آیت ھذا)

فِئَةٌ جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ فَاءَ سے نکلا ہے جس کے معنے جھکنے کے ہیں۔ چونکہ جماعت بھی ایک دوسرے کی مدد پر بھروسہ کرتی ہے۔ اور اس کے افراد بھی ایک دوسرے کی طرف جھکتے ہیں۔ اگر ایک کو دکھ ہو تو وہ دوسرے پر اعتماد کرتا ہے اس لئے اسے فِئَةٌ کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ جب طالوت اپنے لشکر کو لے کر جالوت کے مقابلہ میں نکلے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا ایک نہر کے ذریعے پھر امتحان لیا۔ تا کہ جو کمزور ایمان والے ہیں وہ الگ ہو جائیں اور صرف وہی لوگ دشمن کے مقابلہ میں صف آراء ہوں جو کامل الایمان ہوں اور جن کی تائید میں ملائکہ کام کر رہے ہوں۔ نہر کا ترجمہ ندی کیا گیا ہے۔ لیکن ھاء کی زبر سے جب یہ لفظ ہو تو اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ ندی بھی اور فراخی اور وسعت بھی (مفردات) اس آیت میں

یہ دونوں معنے لگ سکتے ہیں۔اگر فراخی اور وسعت کے معنے لئے جائیں تو آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کے ذریعہ سے فوجیوں کو اس امر کی اطلاع دی کہ تمہارا امتحان مال و دولت کی فراخی سے لیا جائے گا۔اگر تم مال و دولت کے پیچھے پڑ گئے تو خدا تعالیٰ کا کام نہ ہو سکے گا۔اور اگر تم مال و دولت سے متاثر نہ ہوئے تو تم کو کامیابی ہوگی۔اس صورت میں فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ وغیرہ الفاظ مجازی معنوں میں سمجھے جائیں گے لیکن چونکہ ظاہری رنگ میں بھی طالوت کے ساتھیوں کا ایک نہر کے ذریعہ سے امتحان لیا گیا تھا۔اس لئے ظاہری معنے لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

چونکہ جنگ میں جلدی اور تیز حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔اور پیٹ کا پانی سے بھر لینا تیز حرکت سے انسان کو محروم کر دیتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ہلکے پیٹ رہو۔اور پانی کم پیؤ۔تا کہ جنگ میں عمدگی سے کام کر سکو مگر اکثر لوگوں نے اس حکمت کو نہ سمجھا اور خوب پیٹ بھر کر پانی پیا۔اور بہت تھوڑی سی تعداد نے جو بائیبل کے بیان کے مطابق صرف تین سو تھی (قاضیوں باب ۷ آیت ۶) جنگی ضرورتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یونہی چند گھونٹ پانی پیا تا کہ لڑائی کے وقت وہ اچھی طرح کام کر سکیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانیوں کا بدلہ دینے کے لئے اور ان کے اخلاص کی قدر کرنے کے لئے فیصلہ کیا کہ صرف انہیں کے ہاتھ پر فتح ہو اور حکم دیا کہ انہی تین سو کو جنگ میں شامل کیا جائے باقی کو نہیں۔چنانچہ انہی تین سو کو طالوت نے جنگ میں شامل کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہی کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائی۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ میں بتایا گیا ہے کہ کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل کے ماتحت بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آجایا کرتی ہیں۔اس غلبہ کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں قربانی اور ایثار کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے اُسے مفید کاموں میں صرف کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔اُن میں دیانت بھی ہوتی ہے۔صداقت بھی ہوتی ہے۔محنت کی عادت بھی ہوتی ہے پھر ان کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ان کے ارادے پختہ ہوتے ہیں اور ان کے مقابل میں جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں وہ ان اوصاف سے خالی ہوتے ہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قلیل غالب آجاتے ہیں اور کثیر مغلوب ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ایک آدمی جس میں ایثار کا مادہ ہوتا ہے۔درجنوں پر بھاری ہوتا ہے۔پاگل کو ہی دیکھ لو۔لوگ اس کا مقابلہ کرنے سے گھبراتے ہیں۔حالانکہ وہ اکیلا ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ ڈرتے ہیں کہ انہیں چوٹ نہ آجائے۔ان کو زخم نہ لگ جائے۔اور وہ اپنی طاقت کو صرف ایک حد تک استعمال کرتے ہیں۔لیکن پاگل کے لئے چوٹ اور زخم بلکہ موت کا بھی کوئی سوال نہیں ہوتا۔اس لئے وہ اپنی طاقت اس حد تک استعمال کرتا ہے

جس حد تک ایک سمجھ دار انسان استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اور وہ اکیلا ہونے کے باوجود دوسروں پر غالب آجاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی جماعت کے افراد میں قربانی اور ایثار کا مادہ ہو اور وہ دین کے لئے اپنے اندر مجنونانہ رنگ رکھتے ہوں اور وہ اپنی محنت اور قربانی کو اس حد تک پہنچا دیں کہ جس حد تک پہنچانے سے دوسرے لوگ گھبراتے ہوں تو پھر ان کے ایک ایک آدمی کے مقابلہ میں دس دس پندرہ پندرہ بلکہ بیس بیس آدمی بھی ہیچ ہو جاتے ہیں۔ جنگ بدر میں ایسا ہی ہوا غزوہ خندق میں بھی ایسا ہی ہوا اور مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت اپنے سے کئی گنا بڑی جماعت پر غالب آگئی۔

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ

اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں (کے مقابلہ) کے لئے نکلے تو انہوں نے کہا اے ہمارے ربّ! ہم پر قوتِ برداشت

عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ

نازل کر اور (میدان جنگ میں) ہمارے قدم جمائے رکھ۔ اور (ان) کافروں کے خلاف ہماری مدد کر۔

الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ

پھر (وہ جنگ میں کود پڑے اور) انہوں نے اللہ کے ارادہ کے مطابق انہیں شکست (دے) دی۔ اور داؤد نے

وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ

جالوت کو قتل کیا۔ اور اللہ نے اسے حکومت اور حکمت بخشی۔ اور جو کچھ اسے (یعنی اللہ کو) منظور تھا اس کا علم اسے

لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ

(یعنی داؤد کو) عطا کیا۔ اور اگر اللہ انسانوں کو (شرارت سے) نہ ہٹائے رکھتا۔ یعنی بعض (انسانوں) کو بعض کے ذریعہ سے

الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

(نہ روکتا) تو زمین تہ و بالا ہو جاتی۔ لیکن اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے (اس لئے اس فساد کو روک دیتا ہے)۔

حلّ لُغات۔ بَرَزَ کے معنے ہیں خَرَجَ۔ باہر نکلا۔ (اقرب)

اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا فَرَغَ کے معنے ہیں۔ بہا دیا۔ انڈیل دیا۔ پس اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا کے معنے یہ ہوں گے کہ ہمیں صبر میں سے وافر حصہ دے یعنی ایسا ہو کہ ہم کامل طور پر صبر کرنے والے ہوں۔ اور ہماری کسی حرکت سے جزع فزع ظاہر نہ ہو۔ اُنْصُرْنَا: نَصَرَ الْمَظْلُوْمَ کے معنے ہوتے ہیں اَعَانَہٗ اُس نے مظلوم کی مدد کی۔ اور نَصَرَ فُلَانٌ عَلٰی عَدُوِّہٖ کے معنے ہیں نَجَّاہُ مِنْہُ وَخَلَّصَہٗ وَاَعَانَہٗ وَقَوَّاہُ عَلَیْہِ۔ اسے دشمن سے نجات دی۔ اُس کے پنجے سے چھڑایا اُس کی مدد کی اور اس پر غلبہ بخشا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ فرماتا ہے جب مقابلہ ہوا تو طالوت اور اس کے ساتھیوں نے جالوت اور اس کے لشکر کو اللہ تعالیٰ کے اذن کے ماتحت شکست دے دی۔

مفردات میں لکھا ہے کہ اذن کے معنے اجازت اور علم کے ہوتے ہیں۔ نیز لکھا ہے کہ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ میں اِذن سے مراد اس کی مشیت اور حکم ہے۔ اسی طرح لکھا ہے کہ اذن میں مشیت کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے جو علم کے لئے ضروری نہیں۔ ہاں اِذن میں رضا کا ہونا ضروری نہیں صرف مشیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس جگہ اِذن سے مراد مشیت ہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے منشاء اور اس کے ارادہ کے مطابق طالوت نے جالوت کو شکست دے دی۔

یہ کیا واقعہ ہے جس کا گزشتہ رکوع سے ذکر چلا آ رہا ہے؟ اس بارہ میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے یہاں تک کہ عیسائیوں نے بھی اعتراض کیا ہے کہ قرآن نے دو مختلف زمانوں کے واقعات کو اکٹھا بیان کر دیا ہے۔ پرانے مفسّرین کا خیال تھا کہ اس کا مصداق ساؤل ہے جو ایک بادشاہ تھا (جامع البیان زیر آیت ھٰذا) جسے سموایل نبی کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا۔ اور جالوت اس کے دشمنوں میں سے تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بائیبل میں ساؤل کے قدوقامت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ۔

> ’’بنی اسرائیل کے درمیان اُس سے خوبصورت کوئی شخص نہ تھا۔ وہ ایسا قدآور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔‘‘ (۱۔سموائیل باب ۹ آیت ۲)

اور یہ بھی ذکر آتا ہے کہ وہ ایک ادنیٰ قبیلہ کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ (۱۔سموایل باب ۹ آیت ۲۱)۔ مگر بائیبل سے ہی ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ ساؤل سے ناراض ہوا اور اس نے بنی اسرائیل کی بادشاہت اس سے چھین لی۔

(۱۔سموائیل باب ۱۵۔آیت ۲۶)

اسی طرح بائیبل سے یہ بھی ثابت ہے کہ ساؤل نے فلستیوں کے مقابلہ میں شکست فاش کھائی اور انہوں نے

اس کے تین بیٹوں کو مار ڈالا۔ اور وہ خود بھی خودکشی کر کے مر گیا۔ (ا۔سموائیل باب ۳۱ آیت ۱ تا ۵)

حالانکہ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ فرشتے اس کی مدد کرتے تھے۔ گویا اسے فتح پر فتح حاصل ہوتی تھی۔ پس اگر ساؤل کو ہی اس کا مصداق قرار دیا جائے تو قرآنی علامات اس پر چسپاں نہیں ہوتیں۔ میں نے جب اس واقعہ پر غور کیا تو مجھے وہ معنے پسند آئے جس پر دشمنوں نے اپنی نادانی سے اعتراض کیا ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کریم نے دو علیٰحدہ علیٰحدہ زمانوں کے واقعات کو ملا کر بیان کر دیا ہے۔ اور مفسرین نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ داؤد اور جالوت اور طالوت کا ایک ہی زمانہ ثابت کریں۔ ساؤل پر وہ اس واقعہ کو اس لئے بھی چسپاں کرتے ہیں کہ وہ لمبے قد کا تھا اور دشمن کے ایک بڑے پہلوان کا نام جاتی جولیت (یعنی جالوت) تھا۔ (ا۔سموایل باب ۱۷ آیت ۴) مگر میرے نزدیک کسی شخص کی تعیین کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات پر یکجائی نظر ڈالی جائے۔

قرآن کریم میں اس واقعہ کے متعلق پہلی بات یہ بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآءِنَا ہم اپنے گھروں اور اپنے بیٹوں سے علیٰحدہ کئے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم جس کا یہاں ذکر ہے اپنے گھروں سے نکالی گئی تھی۔ دوم۔ ان پر ایک ایسا شخص بادشاہ بنایا گیا تھا جو کسی اعلیٰ خاندان یا شاہی نسل میں سے نہیں تھا۔ سوم۔ وہ ایسا شخص تھا جس کی اللہ تعالیٰ مدد کرتا تھا اور جس کے ساتھی بھی منصور من اللہ تھے اور ان کے پاس ایک تابوت تھا۔ چہارم۔ ایک نہر کے ذریعہ ان کی آزمائش ہوئی تھی۔ پنجم۔ ان کی اور ان کے دشمنوں کی تعداد میں بڑا بھاری فرق تھا۔ ان کی تعداد دشمن کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑی تھی اور پھر اس آزمائش کی وجہ سے اس کی جماعت اور بھی کم ہوگئی۔ ششم۔ باوجود اس کے کہ اس کی فوج دشمن کی فوج سے کم تھی وہ دشمن پر غالب آیا۔

ان میں سے بعض باتیں بیشک ساؤل پر بھی چسپاں ہوتی ہیں۔ مثلاً ساؤل کے مقرر کرنے میں ایک نبی کا دخل تھا۔ ساؤل کو اپنے دشمنوں پر فتوحات بھی حاصل ہوئیں۔ ساؤل کے ایک دشمن کا نام جالوت بھی تھا۔ مگر میرے نزدیک اس میں جو باتیں وزنی ہیں اور جن کی وجہ سے ساؤل کی بجائے کسی اور شخص کی تلاش ہمارے لئے ضروری ہے وہ یہ ہیں۔

اوّل۔ اس میں مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی کے الفاظ آتے ہیں۔ میرا ذہن ان الفاظ سے اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس میں کسی ایسے زمانہ کا ذکر ہے۔ جہاں سے بنی اسرائیل کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ ورنہ داؤد کے ذکر سے بنی اسرائیل تو وہ آپ ہی ثابت ہو جاتے ہیں۔ پھر مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ پس درحقیقت یہ الفاظ ان کی قومی تاریخ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔

دوم۔ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اسے ہمیشہ فتح ہی حاصل ہوتی تھی۔ مگر ساؤل کو تو شکستیں بھی ہوئیں اور پھر اس کا انجام نہایت حسرت ناک ہوا (۱۔سموئیل باب ۳۱ آیت ۱ تا ۱۳)۔ حالانکہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق ضروری ہے کہ اس کا مصداق ہمیشہ فتح پاتا رہا ہو۔

سوم۔ اس جگہ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ آیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کی ایک نہر کے ذریعہ آزمائش کی گئی تھی مگر ساؤل کے زمانہ میں کسی نہر کے ذریعہ لوگوں کا امتحان لئے جانے کا بائیبل میں کوئی ذکر نہیں آتا۔ پس ہمیں اس شخص کی تلاش کے ساتھ نہر کے واقعہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

یہ عجیب بات ہے کہ بائیبل ایک نہر کا ذکر ضرور کرتی ہے اور یہ بھی کہتی ہے کہ اس کے ذریعہ ایک قوم کی آزمائش کی گئی۔ ان کو صاف طور پر کہا گیا تھا کہ تم اس سے پانی نہ پیئو۔ مگر اکثر لوگوں نے پانی پی لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانی پینے والے پیچھے رہ گئے اور نہ پینے والے حملہ کر کے دشمن پر غالب آگئے (قاضیوں باب ۷ آیت ۴ تا ۵)۔ گویا قرآنی بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے مگر ساؤل کے زمانہ میں بائیبل ایسا کوئی واقعہ بیان نہیں کرتی۔

عیسائیوں نے اس واقعہ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ جدعون کا واقعہ ہے اور جدعون اور داؤد میں دوسو سال کا فاصلہ ہے۔ مگر قرآن نے ان دونوں واقعات کو ملا کر بیان کر دیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک قرآن کریم کا یہ کہنا کہ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ داؤد نے جالوت کو قتل کیا غلط ہے۔ کیونکہ داؤد اور جالوت میں دوسو سال کا فرق تھا اور اس لحاظ سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ داؤد جالوت کو قتل کر سکتے۔ میرے نزدیک جدعون کا واقعہ جو بائیبل نے بیان کیا ہے اور قرآن کریم کے بیان کردہ واقعہ میں صرف اس قدر فرق ہے کہ بائیبل نے یہ نہیں بتایا کہ اسے کسی نبی نے مقرر کیا تھا۔ بلکہ اس میں صرف اتنا لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے پاس ایک نبی بھیجا جس نے انہیں کہا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ۔

"تم ان اموریوں کے دیوتاؤں سے جن کے ملک میں بستے ہو مت ڈرنا پر تم نے میری بات نہ مانی۔"

(قضاۃ باب ۶ آیت ۱۰)

اور پھر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جدعون کو خدا تعالیٰ کا فرشتہ دکھائی دیا اور اس نے کہا کہ اُٹھ اور مدیانیوں کے ہاتھ سے بنی اسرائیل کو چھڑا۔ (قضاۃ باب ۶ آیت ۱۴)

باقی تمام واقعات جو قرآن کریم نے بیان کئے ہیں وہ بائیبل میں موجود ہیں۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا زمانہ ۱۴۵۱ قبل مسیح ہے۔ اور جدعون کا واقعہ

موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ۱۲۶۶ قبل مسیح میں ہوا۔ گویا ان دونوں میں دوسوسال کا فاصلہ ہے۔ اور انسائیکلو پیڈیا ببلیکا میں لکھا ہے کہ اس وقت جب بنی اسرائیل مصر سے آئے کنعان میں وہ ایک قوم نہیں بنے بلکہ الگ الگ قبیلوں نے جُدا جُدا زمینوں میں اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ اس وقت ان میں کوئی بادشاہت نہیں تھی بلکہ دوسوسال تک ان میں کوئی بادشاہت قائم نہیں ہوئی۔ نہ ان میں فوجیں تھیں اور نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا۔ پھر بائیبل میں ۱۲۵۶ قبل مسیح کے متعلق لکھا ہے۔

''بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی تب خداوند نے انہیں سات برس تک مدیانیوں کے قبضہ میں کر دیا۔ اور مدیانیوں کا ہاتھ بنی اسرائیل پر قوی ہوا اور مدیانیوں کے سبب بنی اسرائیل نے اپنے لئے پہاڑوں میں کھوہ اور غار میں مضبوط مکان بنائے۔'' (قاضیوں باب ۶ آیت ۱، ۲)

یہ واقعہ بعینہٖ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا سے ملتا جلتا ہے۔ آگے لکھا ہے۔

''جب بنی اسرائیل کچھ بوتے تھے تو مدیانی اور عمالیقی اور اہل مشرق ان پر چڑھ آتے تھے اور ان کے مقابل ڈیرے لگا کر غزہ تک کھیتوں کی پیداوار کو برباد کر ڈالتے۔ اور بنی اسرائیل کے لئے نہ تو کچھ معاش نہ بھیڑ بکری نہ گائے بیل نہ گدھا چھوڑتے۔'' (قاضیوں باب ۶ آیت ۴)

اس کے بعد لکھا ہے۔

''بنو اسرائیل مدیانیوں کے سبب نہایت مسکین ہوئے۔ اور بنی اسرائیل خداوند کے آگے چلائے۔'' (قاضیوں باب ۶ آیت ۶)

''اور جب بنی اسرائیل مدیانیوں کے سبب سے خداوند سے فریاد کرنے لگے تو خداوند نے بنی اسرائیل پاس ایک نبی بھیجا جس نے انہیں کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میں تم کو مصر سے چھڑا لایا۔ اور میں تمہیں غلاموں کے گھر سے نکال لایا اور میں نے مصریوں کے ہاتھ سے اور ان سب کے ہاتھ سے جو تمہیں ستاتے تھے۔ چھڑایا اور تمہارے سامنے سے انہیں دفع کیا اور ان کا ملک تم کو دیا اور میں نے تم کو کہا کہ خداوند تمہارا خدا میں ہوں سو تم ان اموریوں کے معبودوں سے کہ جن کے ملک میں بستے ہو مت ڈرو۔ پر تم میری آواز کے شنوانہ ہوئے۔'' (قاضیوں باب ۶ آیت ۷ تا ۱۰)

اس حوالہ میں ایک نبی کا ذکر تو ہوا ہے مگر یہ ذکر نہیں کہ اس نبی نے کوئی بادشاہ مقرر کیا ہو۔ صرف اتنا ذکر ہے کہ

''پھر خداوند کا فرشتہ آیا۔۔۔۔۔ اور اس وقت جدعون مے کے کولھو کے پاس گہوں جھاڑ رہا تھا۔

کہ مدیانیوں کے ہاتھ سے انہیں بچاوے۔سو خداوند کا فرشتہ اسے دکھائی دیا اور اس سے کہا کہ خداوند تیرے ساتھ ہے۔ اے بہادر پہلوان! جدعون نے اسے کہا۔ اے مالک میرے! اگر خداوند ہمارے ساتھ ہے تو ہم پر یہ سب حادثے کیوں پڑے اور کہاں ہیں اس کی وے سب قدرتیں جو ہمارے باپ دادوں نے ہم سے بیان کیں۔اور کہا کیا خداوند ہم کو مصر سے نہیں نکال لایا۔لیکن اب خداوند نے ہم کو چھوڑ دیا۔تب خداوند نے اس پر نگاہ کی اور کہا کہ اپنی اس قوت کے ساتھ جا کہ تو بنی اسرائیل کو مدیانیوں کے ہاتھ سے رہائی دے گا۔کیا میں تجھے نہیں بھیجتا اور اس نے اسے کہا۔اے میرے مالک! میں کس طرح بنی اسرائیل کو بچاؤں۔دیکھ کہ میرا گھرانا منسّی میں حقیر ہے اور میں اپنے باپ دادوں کے گھرانے میں سب سے چھوٹا ہوں تب خداوند نے اسے فرمایا کہ میں تیرے ساتھ ہوں گا۔اور تو مدیانیوں کو ایک ہی آدمی کی طرح مارلے گا۔'' (قضاۃ باب ۶ آیت ۱۱ تا ۱۶)

قرآن کریم میں بھی جُنُوْد کا لفظ آتا ہے اور بائیبل بھی بتاتی ہے کہ وہاں مدیانی۔عمالیقی اور مشرقی تین قومیں موجود تھیں۔پھر لکھا ہے۔

''تب خداوند نے جدعون کو فرمایا کہ لوگ ہنوز زیادہ ہیں۔سو تو انہیں پانی پاس نیچے لا کہ وہاں میں تیری خاطر انہیں آزماؤں گا۔'' (قضاۃ باب ۷ آیت ۴)

''سو وہ ان لوگوں کو پانی پاس نیچے لایا۔اور خداوند نے جدعون کو فرمایا کہ جو شخص پانی چپڑ چپڑ کر کے کتّے کی مانند پیوے تو ہر ایک ایسے کو علیحدہ رکھ۔اور ویسے ہر ایک کو بھی جو اپنے گھٹنوں پر جھک کے پیوے۔سو جنہوں نے اپنا ہاتھ اپنے منہ کے پاس لا کے چپڑ چپڑ کر کے پیا۔وہ گنتی میں تین سو مرد تھے۔۔۔۔تب خداوند نے جدعون کو کہا کہ میں ان تین سو آدمیوں سے جنہوں نے چپڑ چپڑ کر کے پیا تجھے رہائی بخشوں گا۔اور مدیانیوں کو تیرے ہاتھ میں کر دوں گا۔اور باقی سب لوگوں میں ہر ایک کو اس کے مکان پر پھر جانے دو۔تب ان لوگوں نے اپنا توشہ اور اپنے نرسنگے ہاتھوں میں اٹھائے اور باقی سب بنی اسرائیل میں سے ہر ایک کو اس کے خیمے میں بھیجا اور ان تین سو کو اپنے پاس رکھا۔اور مدیانیوں کا لشکر اس کے نیچے وادی میں تھا۔'' (قضاۃ باب ۷ آیت ۵ تا ۸)

آخر میں مدیانیوں سے نجات پانے کا ذکر ہے۔اور وہ اس طرح کہ جدعون کے ساتھ تین سو آدمی رہ گئے جن کو ساتھ لے کر وہ لڑا اور فتح حاصل کی۔یہ سارا واقعہ قرآن کریم سے حرف بحرف ملتا ہے۔اور اس کی بخاری کی ایک

روایت سے بھی تائید ہوتی ہے۔ براء بن عازبؓ بیان کرتے ہیں کہ کُنَّا اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَتَحَدَّثُ اَنَّ عِدَّةَ اَصْحَابِ بَدْرٍ عَلٰی عِدَّةِ اَصْحَابِ طَالُوْتَ الَّذِیْنَ جَاوَزُوْا مَعَهُ النَّهَرَ وَلَمْ یُجَاوِزْ مَعَهُ اِلَّا مُؤْمِنٌ بِضْعَةَ عَشَرَ وَثَلَاثُ مِائَةٍ۔ یعنی ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے تھے۔ کہ بدر والوں کی تعداد طالوت کے ساتھیوں کی تعداد کے مطابق تھی جو اس کے ساتھ نہر سے گزرے تھے اور ان کے ساتھ تین سو دس سے کچھ اوپر مومن تھے۔ (بخاری کتاب المغازی باب عدۃ اصحاب بدر)

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تو اس کا نام طالوت آیا ہے اور بائیبل کے حوالہ میں جدعون نام آیا ہے۔ ان میں مطابقت کس طرح ہے؟ سو پہلے میں جدعون کو لیتا ہوں۔

یہ عجیب بات ہے کہ جدعون کے لفظ کے بھی وہی معنے ہیں جو عربی زبان میں طالوت کے ہیں۔ جدعون کے معنے عبرانی زبان میں کاٹ کر نیچے گرا دینے کے ہیں یا تراشنے یا کلہاڑے سے کاٹ دینے کے ہیں۔ پس جدعون ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مخالف کو کاٹ ڈالتا اور زمین پر گرا دیتا ہے۔ بائیبل میں جدعون کو زبردست سورما اور بہادر پہلوان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ (دیکھو قضاۃ باب ۶ آیت ۱۱)

اور طالوت جو جدعون کا صفاتی نام ہے اس کے بھی یہی معنے ہیں کیونکہ طَالَ کے معنے دوسروں سے بلند اور بڑائی والا ہو جانے کے ہیں۔ پس طالوت کے معنے ہیں جو دوسرے سے درجہ اور بڑائی میں اونچا ہو گیا تھا اور دوسروں کو اس نے نیچا کر دیا تھا۔ گویا اس نام میں بتایا گیا ہے کہ پہلے تو وہ ادنیٰ اور معمولی درجہ کا آدمی تھا مگر پھر بڑا ہو گیا اور خدا تعالیٰ نے اس کو اونچا کر دیا۔ اور اس قسم کے صفاتی نام قرآن کریم میں بعض اور جگہ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرماتا ہے۔ وَ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا (الجن: ۲۰) یعنی جب اللہ تعالیٰ کا بندہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف بلانے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو مکہ کے لوگ اس پر جھپٹ کر آ گرتے ہیں۔ اس جگہ عبد اللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صفاتی نام بیان کیا گیا ہے حالانکہ آپؐ کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا پس جس طرح عبد اللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صفاتی نام ہے۔ اسی طرح طالوت بھی جدعون کا صفاتی نام ہے اور دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

اب صرف جالوت کا لفظ تحقیق طلب رہ گیا۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ جالوت بھی ایک صفاتی نام ہے جو کسی ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک گروہ کا نام ہے جس کا کام ملک میں فساد کرنا اور ڈاکے ڈالنا تھا۔ جالوت کو انگریزی زبان میں گولیتھ کہتے ہیں۔ اور گولیتھ کے معنے انگریزی میں Destroyers, Spirits, Sunning, Ravaging

کے ہیں۔ یعنی تباہی اور بربادی ڈھانے اور لوٹ مار مچانے والی روحیں۔ جو اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی ہوں۔ اور جائل جو اصل میں جالوت ہے اس قوم کو کہتے ہیں جو ہر طرف قتل وغارت اور تباہی و بربادی کا بازار گرم کرنے والی ہو۔ بائیبل سے بھی ثابت ہے کہ جدعون کا دشمن ایک آوارہ گرد گروہ تھا جو ملک میں فساد پھیلاتا پھرتا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ وہ لوگ جب حملہ کرتے تھے تو سب کچھ برباد کر دیتے تھے۔ پس یہاں جالوت سے کوئی ایک شخص مراد نہیں بلکہ ایک گروہ مراد ہے۔ جس نے بنی اسرائیل پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ بائیبل بتاتی ہے کہ جدعون نے ان کو شکست دی اور اس کے بعد ستر سال تک اس کی حکومت رہی۔ یعنی چالیس سال تک وہ خود حکومت کرتا رہا اور تیس سال تک اس کا بیٹا۔ اور اس کے نتیجہ میں متحدہ قومیت کی روح یہود میں ترقی کر گئی (قضاۃ باب ۸ آیت ۲۸)۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ یہاں جدعون کے واقعہ کے تسلسل میں ایک نیا واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ جدعون کے واقعہ سے بہت کچھ ملتا ہے جدعون کے وقت فلسطینیوں نے اسرائیل کو فلسطین سے نکالنے کی بے شک کوشش کی تھی۔ اور جدعون نے ان کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی (قضاۃ باب ۸ آیت ۱ تا ۱۲)۔ لیکن وہ ابتدائی کوشش تھی جو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں آکر ختم ہوئی۔ اور انہوں نے دشمن کو کلّی طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ پس اس واقعہ کو مشابہت مضمون کی وجہ سے اس کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ پہلا جدعون کا واقعہ ہے۔ اور یہ داؤدؑ کا واقعہ ہے اور دونوں میں دو سو سال کا فاصلہ ہے۔

اب صرف ایک سوال حل طلب رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بائیبل کی رو سے تو داؤد نے جالوت کو قتل کیا تھا۔ (۱۔سموایل باب ۱۷ آیت ۵۰، ۵۱) لیکن قرآن کریم نے جدعون کے واقعہ میں بھی جالوت کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ تو انہوں نے کہا۔ اے ہمارے ربّ! ہم پر قوتِ برداشت نازل کر اور ہمارے قدموں کو ثبات بخش اور کفار کے خلاف ہماری تائید اور نصرت فرما۔

اِس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ جالوت ایک صفاتی نام ہے۔ اور اس سے مراد ایسا گروہ ہے جو ملک میں فساد کرتا پھرے اور چونکہ جدعون کا دشمن بھی ایک آوارہ گرد گروہ تھا جو ملک میں فساد پھیلاتا پھرتا تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام نے ملک میں امن قائم کرنے کے لئے جس دشمن کا مقابلہ کیا وہ بھی آوارہ گرد اور فسادی تھا۔ اِس لئے دونوں کے دشمنوں کو صفاتی لحاظ سے جالوت کہا گیا ہے۔ اور ان دونوں کا اکٹھا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ

جدعون کے ہاتھ سے تو دشمن کو صرف شکست ہوئی تھی مگر داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں ان کی کلّی تباہی ہوئی اور آپ نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔ گویا دشمن کے مقابلہ کی ابتدا جدعون سے ہوئی اور اس کا انتہاء داؤدؑ پر ہوا۔ اسی لئے قرآن کریم میں قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ کے الفاظ آئے ہیں۔ کہ داؤد نے جالوت کا خاتمہ کر دیا۔ اور طالوت اور اس کے ساتھیوں کے متعلق صرف هَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی انہوں نے اپنے دشمنوں کو شکست دی۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ جدعون نے ۱۲۵۶ سنہ قبل مسیح میں مخالفوں کو شکست دی اور ۱۱۶۱ قبل مسیح تک اس کی اور اس کے بیٹے کی حکومت رہی۔ اس کے بعد ۱۰۵۰ قبل مسیح میں بنی اسرائیل کا کنعان پر داؤد کے ذریعے قبضہ ہوا۔ غرض جدعون اور داؤد کے اکٹھا ذکر کرنے اور ان دونوں کے واقعات کو ملا کر بیان کرنے کی یہی وجہ ہے کہ جدعون وہ پہلا شخص ہے جس نے بنی اسرائیل کے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اور یہود میں متحدہ قومیت کی روح پھونکی۔ اور داؤد علیہ السلام آخری شخص ہیں جن کے ہاتھوں دشمن کی کلّی تباہی ہوئی غرض جدعون پہلا نقطہ ہے اور داؤد آخری نقطہ۔

وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ میں بتایا کہ اگر ہم شریروں کا بعض دوسرے انسانوں کے ذریعے قلع قمع نہ کرتے تو دنیا میں فساد برپا ہو جاتا۔

یہ اس لئے فرمایا کہ جدعون اور داؤد دونوں کی جنگیں مذہبی تھیں۔ کیونکہ ان کے دشمن ان کی عبادت گاہیں گرا کر ان کی جگہ اپنی عبادتگاہیں بنا دیتے تھے۔ جیسا کہ جدعون کے متعلق قاضیوں باب ۶ اور داؤد کی نسبت ۲۔ سموایل سے ثابت ہے۔

چونکہ اسلام کو بھی مذہبی جنگوں کا سامنا کرنا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے جدعون اور داؤد کے واقعات پیش کر کے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ اب تم بھی کھڑے ہو جاؤ اور شریروں کا مقابلہ کرو اور دنیا میں نیکی اور تقویٰ پھیلاؤ کیونکہ بحر وبرّ میں فساد برپا ہو چکا ہے۔ اور اس امر کو یاد رکھو کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے جدعون اور داؤد کو مدد دی تھی اسی طرح اب اس کی معجزانہ نصرت تمہارے لئے ظاہر ہوگی۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا تباہ ہو جائے اور امن کبھی قائم نہ ہو۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۳﴾

یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم تجھے پڑھ کر سناتے ہیں اس حالت میں کہ تو حق پر (قائم) ہے اور تو یقیناً رسولوں میں سے ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے طالوت اور داؤد کے واقعات ہم نے قصہ کے رنگ میں بیان نہیں کئے بلکہ یہ

پیشگوئیاں ہیں جن کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ بھی یہی واقعات پیش آنے والے ہیں اور ان کو بھی وہی نصرت اور تائید حاصل ہوگی جو پہلے انبیاعلیہم السلام کو حاصل تھی اور اس طرح دنیا پر ظاہر ہو جائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے فرستادہ اور اس کے برگزیدہ رسول ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ

یہ (مذکورہ بالا) رسول وہ ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی تھی۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں

كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ

جن سے اللہ نے کلام کیا اور ان میں بعض کے (فقط) درجات بلند کئے۔ اور عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے

مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ

کھلے کھلے دلائل دیئے تھے۔ اور روح القدس کے ذریعہ سے اسے طاقت بخشی تھی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو

اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

جو لوگ ان کے بعد (آئے) تھے وہ کھلے (کھلے) نشانوں کے آنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے (جھگڑتے)۔

جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ

لیکن (تعجب ہے کہ) انہوں نے (باوجود اس کے) اختلاف کیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض تو ایمان لے آئے

مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ

اور بعض نے انکار کر دیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے (جھگڑتے) لیکن اللہ

يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۴﴾ ع

جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ یہ رسول جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ایسے ہیں کہ ان میں سے بعض کو ہم نے بعض پر

فضیلت دی تھی۔ یعنی ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کے حضور زیادہ بلند مقام رکھتے تھے اور بعض نسبتاً کم۔ یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ پچھلے انبیاء کے ذکر پر طبعی طور پر یہ سوال ہوسکتا تھا کہ پہلے انبیاء تو ایک ایک قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور ان کا مقابلہ بھی صرف اپنی اپنی قوم کے افراد سے تھا۔ کوئی عالمگیر مخالفت ان کی نہیں ہوئی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ دعویٰ ہے کہ میں ساری دنیا کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پھر آپ ساری دنیا کے مقابلہ میں کس طرح فتح پا سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پہلے رسولوں میں بھی تو آپس میں درجہ اور مقام کے لحاظ سے فرق تھا۔ یہ تو نہیں کہ سب ایک ہی درجہ رکھتے تھے۔ آخر کمال کے بھی ہزاروں درجے ہیں اور خود انبیاء میں بھی مدارج فضیلت میں فرق ہوتا ہے۔ پس ان میں سے ہونے کے یہ معنے نہیں کہ ان جیسا ہی درجہ بھی ہو۔ اور کوئی فضیلت نہ ہو۔ مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ نبی ہونے کے علاوہ بادشاہ بھی تھے۔ اور اس طرح ان کو بعض انبیاء کے مقابلہ میں ایک ظاہری فضیلت حاصل تھی اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فضیلت عطا کی گئی مگر داؤد کی فضیلت تو صرف چند نبیوں پر تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت سب انبیاء پر ہے بلکہ آپ نے تو یہاں تک فرمایا کہ اگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بھی میرے زمانہ میں زندہ ہوتے تو وہ میری اطاعت کرتے (ابن کثیر تفسیر سورۃ ال عمران زیر آیت ۸۲، ۸۳)۔

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ سے بعض لوگوں نے بالمشافہ گفتگو کرنا مراد لیا ہے۔ یعنی ایسے طریق پر کلام کرتا کہ درمیان میں جبرائیلی واسطہ نہ ہو مگر میرے نزدیک مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ سے تشریعی نبی مراد ہیں اور رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ سے غیر تشریعی انبیاء مراد ہیں اس لئے کہ کلام تو ہر ایک رسول سے ہوتا ہے۔ بغیر کلام کے وہ نبی کیونکر ہوسکتا ہے اور درجہ بھی ہر ایک کا بلند ہوتا ہے۔ لیکن جب مقابلہ ہو تو اس کے یہی معنے ہوں گے کہ بعض کو شریعت دی اور بعض کو صرف نبوت کا درجہ دیا گیا۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ان کو شریعت نہیں دی گئی محض نبوت عطا کی گئی ہے۔ اس کا ثبوت قرآن کریم سے بھی ملتا ہے اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرماتا ہے وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (النساء:۱۶۵) اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے خوب اچھی طرح کلام کیا۔

یہ کہ كَلَّمَ اللّٰهُ کے معنے شریعت کے ہیں اس کا ثبوت ایک حدیث سے بھی ملتا ہے۔ امام احمدؒ نے ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پہلے نبی آدم تھے۔ وہ کہتے ہیں میں نے کہا کہ وَنَبِيٌّ كَانَ۔ کیا وہ نبی تھے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں! نَبِيٌّ مُكَلَّمٌ (مسند احمد بن حنبل مسند الانصار حدیث ابی ذر غفاری) وہ مکلَّم نبی تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض نبی مکلَّم نہیں ہوتے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے کلام تو سب انبیاء سے کیا ہے

اس لئے اس جگہ کلام سے مراد کلام شریعت ہے۔ اور رَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ کے معنے یہ ہیں کہ بعض کو شریعت نہیں دی۔ ہاں نبوت کے درجہ رفیع پر ان کو سرفراز فرمایا۔ جیسے دوسری جگہ فرماتا ہے وَ لَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَ قَفَّيۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ بِالرُّسُلِ ۔(البقرة:۸۸) یعنی ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اس کے بعد ہم نے اس کی تعلیم کی اشاعت کے لئے پے در پے انبیاء بھیجے۔ یہ تمام انبیاء غیر تشریعی تھے جو موسوی شریعت کے تابع تھے۔

پھر فرماتا ہے وَ اٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلے کھلے نشانات دیئے اور روح القدس کے ساتھ اس کی تائید کی۔ اس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنے والا ہے کہ اس سورۃ میں چونکہ یہود مخاطب ہیں۔ اس لئے حضرت مسیحؑ کے ذکر کے ساتھ ہی ان کی بعض صفات بھی بتا دی جاتی ہیں تا کہ دشمن پر حجت ہو۔ اس سے ان کی کسی خاص فضیلت کا اظہار مقصود نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مسیحیوں نے سمجھا ہے۔

اَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ فرما کر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے بلکہ انہوں نے تورات کے بعض مضامین کو نمایاں طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور روح القدس سے اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید فرمائی تھی۔ کیونکہ گو موسوی دور میں شرلعیت کی تکمیل ہوگئی تھی لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کی نگاہ مغز سے ہٹ کر صرف چھلکے کی طرف آ گئی۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تا کہ ایک طرف تو تورات کے احکام پر عمل کرائیں جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے۔

''یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں''۔ (متی باب ۵ آیت ۱۷)

اور دوسری طرف وہ لوگ جو بالکل اس کے چھلکے کو پکڑ کر بیٹھ گئے تھے ضروری تھا کہ ان کی اصلاح کی جاتی۔ اور اس نکتہ کو کھول کر بیان کیا جاتا کہ ظاہری شریعت اس دنیا کی زندگی کو درست کرنے کے لئے اور باطنی شریعت کے قیام میں مدد دینے کے لئے ہے۔ ورنہ اصل چیز صرف باطنی صفائی اور پاکیزگی اور تقدس ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ کام لیا۔ انہوں نے ایک طرف تو موسوی احکام کو دوبارہ اصل شکل میں قائم کیا اور دوسری طرف جو لوگ قشر کی اتباع کرنے والے تھے انہیں بتایا کہ اس ظاہر کا ایک باطن ہے۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے تو ظاہر لعنت بن جاتا ہے۔ نمازیں بڑی اچھی چیز ہیں لیکن اگر تم صرف ظاہری نماز ہی پڑھو گے اور باطنی نہیں پڑھو گے تو وہ نماز تمہارے لئے لعنت بن جائے گی۔ (متی باب ۶ آیت ۴ تا ۱۸) روزہ بڑی اچھی چیز ہے لیکن اگر تم ظاہری روزہ کے ساتھ باطنی روزہ نہ رکھو گے تو یہ ظاہری روزہ لعنت بن جائے گا یہ وہی بات ہے جو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے

ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (الماعون:۵) یعنی بعض نمازیں پڑھنے والے ایسے ہیں کہ نماز ان کے لئے ویل اور لعنت بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ پوری بات کھول کر بتا دی تھی اس وجہ سے انہیں دھوکہ نہ لگا۔ یہ کھول کر بتانا بھی حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیشگوئی کے مطابق تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ''جب وہ روح حق آئے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی بلکہ جو کچھ سنے گی سو کہے گی''۔ (یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۳) بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بات کو واضح کرنے کی وجہ سے باوجود اس کے کہ آپ نے بھی وہی بات کہی تھی جو حضرت مسیح علیہ السلام نے کہی تھی مسلمانوں کو دھوکا نہ لگا۔ اور انہوں نے شریعت کو لعنت نہ قرار دیا بلکہ صرف اس عمل پر شریعت کو لعنت قرار دیا جس کے ساتھ دل کا تقدس اور اخلاص اور تقویٰ شامل نہ ہو۔ مگر مسیحیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام سے دھوکا کھایا اور جب ان کی روحانیت کمزور ہوئی تو انہوں نے اپنی کمزوری کے اثر کے ماتحت غلط تاویلوں کا راستہ اختیار کر لیا اور شریعت کو لعنت قرار دینے لگے اور یہ خیال نہ کیا کہ اگر وہ لعنت ہے تو حضرت عیسٰی علیہ السلام اور ان کے حواری روزے کیوں رکھتے تھے عبادتیں کیوں کرتے تھے؟ ان امور سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ ظاہری عبادت کو لعنت نہیں سمجھتے تھے بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ظاہر کے ساتھ باطن کی اصلاح نہ کی جائے تو وہ ظاہر لعنت بن جاتا ہے۔

غرض اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے یہ معنے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر پاکیزگیٔ قلب کے خاص راز ظاہر کئے گئے تھے اور قدوسیت اور باطنی تعلیم پر زور دینے کے لئے ان کو خاص طور پر حکم دیا گیا تھا اور ظاہری احکام کی باطنی حکمتیں انہیں سمجھائی گئی تھیں۔ گویا ان کے دور میں تصوف نے زمانہ بلوغت میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا میں بتایا کہ اتنے نبیوں کے واقعات دیکھنے کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ یہ لوگ سنبھل جاتے اور آئندہ ان کے بارہ میں کوئی مخالفانہ رویہ اختیار نہ کرتے۔ لیکن اس رسول کے آنے پر انہوں نے پھر اختلاف کیا اور بعض تو ایمان لے آئے اور بعض نے انکار کر دیا۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۔ اور اگر اللہ چاہتا یعنی لوگوں کو جبراً ہدایت دینا چاہتا تو کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ مگر چونکہ انسان کی پیدائش کی غرض ہی یہی تھی کہ اسے آزادانہ طور پر نیکی اور بدی میں حصہ لینے کا موقعہ دیا جائے اور اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ فرما چکا تھا کہ ہم انسان کو خیر کی بھی مقدرت دیں گے اور شر کی بھی اور پھر جو رستہ وہ اختیار کرے گا اس کے مطابق ہم اسے نیک یا بد جزا دیں گے۔ اس لئے وہ اس فیصلہ کے مطابق کام کرتا

چلا جاتا ہے اور لوگوں کے اعتراضوں کی پرواہ نہیں کرتا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ

اے ایمان دارو! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے اس دن کے آنے سے پہلے کہ جس میں نہ کسی قسم کی

يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَ

(خریدو) فروخت نہ دوستی اور نہ شفاعت (کارگر) ہوگی (خدا کی راہ میں جو کچھ ہو سکے) خرچ کرلو۔ اور

الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۵﴾

(اس حکم کا) انکار کرنے والے (اپنے آپ پر) ظلم کرنے والے ہیں۔

حلّ لُغات۔ خُلَّةٌ اَلْخُلَّةُ کے معنے ہیں اَلصَّدَاقَةُ دوستی اور محبت اور تَخَلَّلَتِ الْقَلْبَ کے معنے ہیں۔ دَخَلَتْ خِلَالَهٗ وہ دوستی اور محبت جو دل کے اندر گھس کر اس کے سوراخوں میں داخل ہو جائے۔ (مجمع البحار) اَلْخَلِيْلُ مَنْ خُلَّتُهٗ مَقْصُوْرَةٌ عَلٰى حُبِّ اللهِ تَعَالٰى فَلَيْسَ فِيْهَا لِغَيْرِهٖ مُتَّسَعٌ وَلَا شِرْكَةٌ مِنْ مَحَابِّ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (مجمع البحار) خلیل اُسے کہتے ہیں جس کی محبت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ہو اور اس کے دل میں اس محبت کے سوا اور کسی کی محبت نہ ہو۔ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول درج ہے کہ اِنِّيْٓ اَبْرَءُ مِنْ كُلِّ ذِيْ خُلَّةٍ مِنْ خُلَّتِهٖ لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ۔ (مسند احمد بن حنبل مسند المکثرین من الصحابة مسند عبد اللہ بن مسعود ؓ) یعنی میں ہر شخص کی دوستی سے براءت کا اظہار کرتا ہوں اور صرف خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اگر دنیا میں مَیں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا۔

شَفَاعَةٌ شَفَعَ سے نکلا ہے اور شَفَعَ کے معنے جفت کے ہیں۔ يُقَالُ شَفَعَ الْعَدَدَ وَشَفَعَ الصَّلٰوةَ صَيَّرَهَا شَفْعًا۔ یعنی شَفَعَ الْعَدَدَ کے معنے ہیں عدد کو جفت بنایا اور شَفَعَ الصَّلٰوةَ کے معنے ہیں نماز کو جوڑا بنا دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ اسلام نے صرف زکوٰۃ اور مالِ غنیمت کے اموال سے ہی غرباء اور مساکین کی امداد کے لئے ایک فنڈ مقرر کرنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو عام طور پر بھی غریبوں اور ناداروں کے

لئے صدقہ وخیرات کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ تمہارے ساتھ ترقیات کے جو وعدے کئے گئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ہمیں اب مزید قربانیوں کی ضرورت نہیں قربانیاں تمہیں قدم قدم پر کرنی پڑیں گی اور قدم قدم پر تمہیں اپنے اموال خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے پڑیں گے۔

لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ میں جس بیع کی طرف اشارہ ہے اس کا ذکر دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبۃ:۱۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ایک بیع کی ہے اور وہ یہ کہ ان کے مالوں اور جانوں کو جنت دے کر خرید لیا ہے۔ پس فرمایا خدا تعالیٰ تم سے یہ بیع کرتا ہے۔ مگر یہ بیع اسی دنیا میں ہوگی اس دن نہیں ہوگی۔

وَ لَا خُلَّةٌ میں بتایا کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سوا سب خلیل جاتے رہیں گے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تو دوسری جگہ آتا ہے اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (الزخرف:۶۸) یعنی متقیوں کے سوا تمام خلیل ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ پھر جب متقیوں کی دوستی رہے گی تو لَا خُلَّةٌ کا کیا مطلب ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ متقی چونکہ خدا تعالیٰ کو ہی اپنا خلیل سمجھتے ہیں اس لئے ان کی دوستی خدا تعالیٰ کی دوستی میں شامل ہوگی اس کا کوئی علیحدہ وجود نہیں ہوگا جو وَ لَا خُلَّةٌ کے منافی ہو۔ اصل مضمون جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ آج اگر خدا تعالیٰ کو خلیل بنانا ہے تو بنالو ورنہ اس دن وہ خلیل نہیں بنے گا۔ اور آج جن کو تم اپنا خلیل بنا رہے ہو ان کی خلت اور دوستی اس دن تمہارے کسی کام نہیں آئے گی بلکہ تم ان کے دشمن بن جاؤ گے۔ صرف متقی ہی ایسے ہوں گے جو اپنے خلیل کے دشمن نہیں ہوں گے کیونکہ مومن کا خلیل خدا تعالیٰ ہوتا ہے۔ پس وَ لَا خُلَّةٌ سے مراد وہ خلّت ہے جو خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی دوسرے سے کی جائے۔

وَ لَا شَفَاعَةٌ میں بتایا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تم یہیں تعلق پیدا کرلو اور اس کو اپنا ساتھی بنالو۔ ورنہ وہاں تمہیں کوئی ساتھی نہیں ملے گا۔ دوسری جگہ فرماتا ہے وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (الانعام:۵۲) یعنی تو اس کلام کے ذریعہ سے ان لوگوں کو جو اس بات سے ڈرتے ہیں کہ انہیں ان کے ربّ کی طرف اکٹھا کر کے لے جایا جائے گا جب کہ اس کے سوا نہ ان کا کوئی مددگار ۔۔۔۔ ہوگا اور نہ کوئی سفارشی اس لئے ڈرا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ وَ ذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا (الانعام:۷۱) یعنی تو اس کلام الٰہی کے ذریعہ سے نصیحت کر۔ تا ایسا نہ ہو

کہ کسی جان کو اس کے کمائے ہوئے کے سبب سے اس طرح ہلاکت میں ڈال دیا جائے کہ خدا تعالیٰ کے سوا اس کا نہ کوئی مددگار رہو اور نہ شفیع۔ اور اگر وہ ہر ایک قسم کا بدلہ بھی دیں۔ تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا تعالیٰ کو ولی اور شفیع بنانے والوں کو تو اس دن شفاعت کا حق پہنچے گا لیکن دوسروں کو نہیں اور نہ ان کے حق میں شفاعت قبول ہوگی۔ خدا تعالیٰ کو شفیع اس لئے قرار دیا کہ اس کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں ہوسکتی پس اصل شفیع وہی ہے فرماتا ہے یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا (طٰہٰ:۱۱۰) یعنی اس دن شفاعت سوائے اس کے جس کے حق میں شفاعت کرنے کی اجازت رحمٰن خدا دے گا اور جس کے حق میں بات کہنے کو وہ پسند کرے گا اور کسی کو نفع نہیں دے گی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں شفاعت بالاذن ہوگی۔ خدا تعالیٰ کو شفیع بنانے والوں کو تو شفاعت کا حق پہنچے گا لیکن اور کسی کو خدا تعالیٰ کے اِذن کے بغیر شفاعت کا حق نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (الانبیاء:۲۹) یعنی خدا تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے جو انہیں آئندہ پیش آنے والا ہے اور جو وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور وہ سوائے اس کے جس کے لئے خدا نے یہ بات پسند کی ہو کسی کے لئے شفاعت نہیں کرتے اور وہ اس کے خوف سے لرزتے رہتے ہیں۔ پھر اس آیت سے اگلی آیت میں فرماتا ہے مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ:۲۵۶) یعنی کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کی سفارش کرے۔

بیشک حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء سابقین کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض امتی بھی شفاعت کریں گے (ابن ماجہ کتاب الزھد باب ذکر الشفاعۃ)۔ لیکن ان حدیثوں کے بارے میں میری تشریح یہ ہے کہ امت محمدیہ میں سے ایسے افراد کی شفاعت صرف ظلّی ہوگی اصل شفیع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے۔ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کریں گے اور آپ اللہ تعالیٰ سے۔ بانی سلسلہ احمدیہ نے بھی اسی عقیدہ کی توضیح فرمائی ہے آپ اپنی کتاب ''کشتی نوح'' میں فرماتے ہیں۔

''نوع انسان کے لئے روئے زمین پر اب کوئی رسول اور شفیع نہیں مگر محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم۔ سو تم کوشش کرو کہ سچی محبت اس جاہ وجلال کے نبی کے ساتھ رکھو اور اس کے غیر کو اس پر کسی نوع کی بڑائی مت دو تا آسمان پر تم نجات یافتہ لکھے جاؤ۔'' (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۱۵، ۱۶)

بہرحال جب تک کوئی انسان اللہ اور اس کے رسول سے واصل نہ ہوجائے اور ان کو اپنا جوڑا نہ بنالے اس وقت تک اسے کسی قسم کی شفاعت میسر نہیں آئے گی۔

وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ میں بتایا کہ یہ ظلم نہیں بلکہ ظلم کفار نے خود اپنی جانوں پر کیا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ

اللہ وہ (ذات) ہے جس کے سوا پرستش کا (اور) کوئی مستحق نہیں۔ کامل حیات والا (اپنی ذات میں) قائم (اور سب کو)

لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ

قائم رکھنے والا۔ نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند (کا وہ محتاج ہے)۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے

ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ

(سب) اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں سفارش کرے۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے

اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ

اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے وہ (سب ہی کچھ) جانتا ہے۔ اور وہ اس کی مرضی کے سوا اس کے علم کے

عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

کسی حصہ کو (بھی) پا نہیں سکتے۔ اس کا علم آسمانوں پر (بھی) اور زمین پر (بھی) حاوی ہے۔

وَ لَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۶﴾

اور ان کی حفاظت اسے تھکاتی نہیں۔ اور وہ بلند شان (رکھنے) والا (اور) عظمت والا ہے۔

حلِّ لُغات۔ اَلْحَيُّ کامل حیات والا۔ اللہ تعالیٰ کے لئے جب اَلْحَيُّ آتا ہے تو الف لام کمال کے معنے دیتا ہے اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حیاتِ کاملہ رکھتا ہے یعنی ایسی حیات جو اپنے قیام میں کسی اور کی محتاج نہیں۔ اسے کسی اور نے زندگی نہیں بخشی بلکہ اس کی ذات ازلی اور ابدی طور پر زندہ ہے۔

اَلْقَيُّوْمُ قَامَ سے نکلا ہے جس کے معنے کھڑے ہونے کے ہیں۔ اسی سے قَيِّمٌ نکلا ہے جس کے معنے نگران اور متولّی کے ہیں اور قَيِّمٌ مُسْتَقِيْمٌ کو بھی کہتے ہیں۔ اَمْرٌ قَيِّمٌ ایسا امر جس میں کوئی کجی نہ ہو بلکہ درست اور ٹھیک ہو۔

اَلْقَیُّوْمُ اور اَلْقَیَّامُ کے معنے ہیں جو اپنی ذات میں قائم ہے اور اس کی کوئی ابتداء نہیں (اقرب) اَلْقَیُّوْمُ صرف اسی کو نہیں کہتے جو اپنی ذات میں قائم ہو بلکہ اس کے معنوں میں دوسرے کو قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا بھی شامل ہے۔ مفردات میں لکھا ہے۔ اَلْقَائِمُ اَلْحَافِظُ بِکُلِّ شَیْءٍ وَ الْمُعْطِیْ لَہٗ مَا بِہٖ قِوَامُہٗ یعنی جو اپنی ذات میں قائم ہو اور ہر چیز کا نگران ہو اور اسے وہ طاقت عطا کرے جس سے وہ قائم رہ سکے۔ غرض اشیاء میں وہ طاقتیں پیدا کرنا جن سے ان کے اجزاء جڑے رہتے ہیں اور اپنے مفوضہ کاموں کو بجالاتے ہیں قَیُّوْم سے متعلق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اَلْقَیُّوْمُ ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ خود قائم ہے بلکہ اس لئے بھی کہ دوسری سب اشیاء اس کی پیدا کردہ طاقتوں سے قائم رہتی ہیں۔ اَلْقَیُّوْمُ کی صفت اجرام فلکی میں کشش ثقل کے وجود اور خوردبینی ذرات کے ایک دوسرے سے اتصال اور ایک دوسرے سے ادغام اور ایک دوسرے کے گرد گھومنے وغیرہ افعال پر لطیف رنگ میں اشارہ کرتی ہے۔

سِنَۃٌ اَلسِّنَۃُ مِنَ الْوَسْنِ۔ سِنَۃٌ کا لفظ وَسْنٌ سے نکلا ہے اور وَسَنَ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں اَخَذَہٗ ثِقْلُ النَّوْمِ۔ اسے گہری نیند نے آ پکڑا جس کی علامت اونگھ ہوتی ہے۔ پس سِنَۃٌ سے مراد وہ اونگھ ہے جو نیند کے غلبہ کی وجہ سے آنے لگے۔ (اقرب)

اَلنَّوْمُ معمولی نیند جو انسان کو بے اختیار نہ کردے۔ (مفردات)

اَلْکُرْسِیُّ کِرْسی سے نکلا ہے جس کے معنے متفرق اجزاء کے اکٹھا ہونے کے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کَرَسْتُ بِنَاءً۔ میں نے عمارت بنائی، یعنی اینٹوں پر اینٹیں رکھیں۔ اور کُرْسِیٌّ علم کو بھی کہتے ہیں اور حکومت کو بھی (مفردات)۔ اس لفظ کی اصل سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں اس کے معنے جمع کرنے اور اکٹھا کرنے کے ہیں۔ اور چونکہ علم بھی پراگندہ معلومات کو جمع کر لیتا ہے اور حکومت ملک کے پراگندہ اجزاء کو جمع کر لیتی ہے اس لئے اسے بھی کرسی کہتے ہیں۔

تفسیر۔ ان آیات میں پہلی بات جس کی طرف انسان کو متوجہ کیا گیا ہے اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ہے یعنی اے انسان! خدا کو دیکھ کہ صرف وہی تیرا معبود ہے اس کے سوا اور کوئی تیرا معبود نہیں ہے۔

دنیا میں ہر ایک چیز کی قدر اس کی کم یابی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً پانی ایک بہت ضروری چیز ہے مگر لوگ اسے سنبھال کر نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس وقت اس کی ضرورت پڑے گی اسی وقت مل جائے گا۔ ہوا صحت کے لئے کیسی ضروری چیز ہے مگر کوئی انسان اس کو سنبھالتا نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب اس کی ضرورت ہوگی

وہ خود ہی ناک اور منہ کے راستے اندر چلی جائے گی۔لیکن یہی پانی جس کی عام طور پر قدر نہیں کی جاتی اور کوئی قیمتی چیز معلوم نہیں ہوتی ایک ایسے جنگل میں جہاں پانی کا نام ونشان نہ ہو نہایت قیمتی ہو جاتا ہے اور اگر اس وقت کسی کے پاس ایک گلاس پانی ہو تو وہ بہت بڑی قیمت پر بھی کسی کو نہیں دیتا۔تو ہر چیز کی قیمت اس کی ضرورت کے مطابق گھٹتی بڑھتی ہے۔دیکھو غلّہ جس وقت زیادہ ہوتا ہے اس وقت سستا ہوتا ہے اور جب کم ہوتا ہے تو مہنگا ہو جاتا ہے۔اسی طرح اگر دنیا میں کئی خدا ہوتے تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ ایک نہ ملا تو اور مل جائے گا۔مگر فرمایا۔صرف ایک ہی اللہ ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس کو چھوڑ کر کسی اور کی تلاش کرلوں گا تو ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ ایک ہی ہے دو نہیں۔تین نہیں۔چار نہیں یا ہزاروں لاکھوں نہیں۔جب ایک ہی اللہ ہے تو اس کو چھوڑ کر اور کہاں جاؤ گے؟ پھر ہر وقت تمہیں اس کی ضرورت ہے اور ہر لحظہ تم اس کے محتاج ہو۔دنیا میں لوگ بعض دفعہ بادشاہوں کو ناراض کر لیتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کیا ہوا اگر یہ بادشاہ ناراض ہو گیا ہے تو اس کے ملک کو چھوڑ کر دوسرے کے ملک میں چلے جائیں گے۔چین کا بادشاہ اگر ظالم ہے تو وہ ایران میں پناہ لے سکتا ہے۔ایران کا بادشاہ اگر ظالم ہے تو انگلستان میں پناہ لے سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے بھاگ کر وہ کہاں جائے گا۔کیونکہ کوئی زمین ایسی نہیں جو خدا کی نہ ہو اور کوئی حکومت ایسی نہیں جو خدا کے قبضہ میں نہ ہو۔پھر کوئی دوسرا خدا نہیں کہ انسان اس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ہندوؤں کا خیال ہے کہ کئی خدا ہیں اور ان کے خداؤں میں جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں۔چنانچہ مشہور ہے کہ شِوْ نے ایک آدمی پر ناراض ہو کر اسے مار ڈالا لیکن وہ برہما خدا کا پیارا تھا اس نے کہا ہم پیدا کرنے والے ہیں ہم اس کو زندہ کرلیں گے چنانچہ برہما نے اسے زندہ کر دیا مگر شِو نے اسے پھر مار دیا اور برہما نے پھر اسے زندہ کر دیا۔غرض شِو اُسے مارتے جاتے اور برہما زندہ کرتے جاتے۔یہی ان کا جھگڑا لگا رہا۔یہ ہندوؤں کے خیالات ہیں۔مگر ہمارے ہاں تو ایسے خدا نہیں ہیں کہ ایک مارے اور دوسرا زندہ کرے۔ایک ناراض ہو تو دوسرا راضی ہو جائے۔دیکھو ایک ملازم اپنے آقا کو جواب دے سکتا ہے کہ میں تمہاری ملازمت نہیں کرتا کیونکہ اسے دوسری جگہ ملازمت مل جاتی ہے۔مگر ہم خدا تعالیٰ کو یہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ ایک ہی آقا ہے اور اس کے سوا اور کوئی آقا نہیں۔پھر ہمارا خدا ایک زندہ خدا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا وہ آدم کے زمانہ میں بھی زندہ تھا اور نوحؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔وہ ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔وہ موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔وہ عیسیٰؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی زندہ تھا اور وہ آج بھی زندہ ہے اور اگر دنیا اور ہزار سال تک قائم رہے گی تو ہزار سال تک اور اگر ایک کروڑ سال تک قائم رہے گی تو کروڑ سال تک اور اگر ایک ارب سال تک قائم رہے گی تو ایک ارب سال تک وہ اپنی زندگی کے نشانات

دکھا تا چلا جائے گا۔ کیونکہ وہ حَيٌّ و قَيُّوْمٌ خدا ہے اور وہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کا مصداق ہے۔ اس پر اونگھ اور نیند ہی نہیں آتی تو اس کے زندہ نشانات کا سلسلہ کس طرح ختم ہوسکتا ہے؟ جب ایسے خدا سے انسان اپنا تعلق پیدا کر لیتا ہے تو اس کی ضرورتوں کا وہ آپ کفیل ہو جاتا ہے اور ہمیشہ اس کی تائید کے لئے اپنے غیر معمولی نشانات ظاہر کرتا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے پاس اکثر لوگ اپنی امانتیں رکھواتے تھے اور آپ اس میں سے ضرورت پر خرچ کرتے رہتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے اس طرح رزق دیتا رہتا ہے بعض دفعہ ہم نے دیکھا کہ امانت رکھوانے والا آپ کے پاس آتا اور کہتا کہ مجھے روپیہ کی ضرورت ہے۔ میری امانت مجھے واپس دے دی جائے۔ آپ کی طبیعت بڑی سادہ تھی اور معمولی سے معمولی کاغذ کو بھی آپ ضائع کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ جب کسی نے مطالبہ کرنا تو آپ نے ردی سا کاغذ اٹھانا اور اس پر اپنے گھر والوں کو لکھ دینا کہ امانت میں سے دوسو روپیہ بھجوا دیا جائے۔ اندر سے بعض دفعہ جواب آتا کہ روپیہ تو خرچ ہو چکا ہے یا اتنے روپے ہیں اور اتنے رپوؤں کی کمی ہے۔ آپ نے اسے فرمانا کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ ابھی روپیہ آجاتا ہے۔ اتنے میں ہم نے دیکھنا کہ کوئی شخص دھوتی باندھے ہوئے جونا گڑھ یا بمبئی کا رہنے والا چلا آرہا ہے اور اس نے آکر اتنا ہی روپیہ آپ کو پیش کر دینا۔

ایک دن تو لطیفہ ہوا کسی نے اپنا روپیہ مانگا۔ اس دن آپ کے پاس کوئی روپیہ نہیں تھا مگر اسی وقت ایک شخص علاج کے لئے آ گیا۔ اور اس نے ایک پڑیہ میں کچھ رقم لپیٹ کر آپ کے سامنے رکھ دی۔ حافظ روشن علی صاحبؓ کو علم تھا کہ روپیہ مانگنے والا کتنا روپیہ مانگتا ہے۔ آپ نے حافظ صاحبؓ سے فرمایا دیکھو! اس میں کتنی رقم ہے؟ انہوں نے گنا تو کہنے لگے بس اتنی ہی رقم ہے جتنی رقم کی حضور کو ضرورت تھی۔ آپ نے فرمایا یہ اس کو دے دو۔ اسی طرح آپ ایک پرانے بزرگ کا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ ایک قرض خواہ ان کے پاس آ گیا۔ اور اس نے کہا کہ آپ نے میری اتنی رقم دینی ہے اور اس پر اتنا عرصہ گذر چکا ہے اب آپ میرا روپیہ ادا کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس تو ہے نہیں جب آئے گا دے دوں گا۔ وہ کہنے لگا۔ تم بڑے بزرگ بنے پھرتے ہو اور قرض لے کر ادا نہیں کرتے یہ کہاں کی شرافت ہے۔ اتنے میں وہاں ایک حلوہ بیچنے والا لڑکا آ گیا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ آٹھ آنے کا حلوہ دے دو۔ لڑکے نے حلوہ دے دیا اور انہوں نے وہ حلوہ اس قارض کو کھلا دیا۔ لڑکا کہنے لگا کہ میرے پیسے میرے حوالے کیجئیے۔ وہ کہنے لگے تم آٹھ آنے مانگتے ہو اور میرے پاس تو دو آنے بھی نہیں۔ وہ لڑکا شور مچانے لگ گیا۔ یہ

دیکھ کر وہ قرض خواہ کہنے لگا کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ میری رقم تو ماری ہی تھی اس غریب کی اٹھنّی بھی ہضم کر لی۔ غرض وہ دونوں شور مچاتے رہے اور وہ بزرگ اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے اپنی جیب میں سے ایک پڑیہ نکال کر انہیں پیش کی۔ اور کہا کہ فلاں امیر نے آپ کو نذرانہ بھیجا ہے۔ انہوں نے اسے کھولا تو اس میں روپے تو اتنے ہی تھے جتنے قرض خواہ مانگتا تھا مگر اس میں اٹھنّی نہیں تھی۔ کہنے لگے۔ یہ میری پڑیہ نہیں اسے واپس لے جاؤ۔ یہ سنتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اس نے جھٹ اپنی جیب سے ایک دوسری پڑیہ نکالی اور کہنے لگا مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ آپ کی پڑیہ یہ ہے۔ انہوں نے اسے کھولا۔ تو اس میں اتنے ہی روپے تھے جو قارض مانگ رہا تھا اور ایک اٹھنی بھی تھی۔ انہوں نے دونوں کو بلایا۔ اور وہ روپے انہیں دے دیئے۔ غرض زندہ خدا اپنے بندوں کی تائید میں ہمیشہ اپنے نشانات دکھاتا رہتا ہے۔

پھر وہ اَلْقَیُّوْمُ ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اب تو میرا یہ آقا ہے لیکن پہلے میں فلاں کے پاس ملازم رہ چکا ہوں۔ اس لئے اس کا بھی مجھ پر احسان ہے اور میرے لئے اس کی قدر کرنا بھی ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہارا آج خدا نہیں بنا بلکہ ہمیشہ سے خدا ہوں۔ تم پر کسی کا پچھلا احسان نہیں ہے۔ میں وہ خدا ہوں جو ہمیشہ قائم رہنے والا اور تمہیں قائم رکھنے والا ہوں۔ اس لئے تم پر میرا ہی احسان ہے کسی اور کا احسان نہیں۔

پھر فرماتا ہے لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ممکن ہے کوئی کہے کہ مان لیا خدا ایک ہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ ہے۔ اور وہی ہمارا پہلے آقا تھا اور وہی اب بھی ہے۔ مگر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ خدا کو نیند آئے اور وہ سو جائے۔ اور اس وقت اس کی جگہ اس کے درباری کام کریں۔ اس لئے انہیں بھی خوش رکھنا چاہیے اور ان کی بھی خوشامد کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تمہارا وہ اللہ ہے کہ اس کو کبھی اونگھ اور نیند نہیں آتی تم اس کو دنیوی بادشاہوں اور حاکموں کی طرح نہ سمجھو۔ جہاں تمہیں درباریوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ تمہارا خدا ایسا نہیں کہ کبھی اسے اونگھ آئے یا وہ سو جائے۔ وہ ہر وقت جاگتا ہے اور ہر ایک بات کا خود نگران ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے کیا ہی لطیف بات بیان فرمائی ہے فرماتا ہے۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ کہ اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ ترتیب کلام کا یہ قاعدہ ہے کہ پہلے چھوٹی باتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر بڑی بات کا۔ اگر اس کے خلاف کیا جائے تو کلام غلط ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص سخت بیمار نہیں تھا بلکہ وہ تو کچھ بھی بیمار نہ تھا۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص کچھ بیمار نہیں تھا بلکہ وہ تو زیادہ بیمار بھی نہ تھا تو فقرہ غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے بڑا اور پھر چھوٹا درجہ بیان کیا جاتا ہے۔ مگر یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ حالانکہ جب اونگھ کی نفی کر دی

گئی تھی تو نیند کی خود ہی نفی ہو جاتی ہے۔ پھر نیند کی نفی کی کیا ضرورت تھی؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ اس میں ایک حکمت ہے۔ اور وہ یہ کہ سِنَةٌ اس کو کہتے ہیں کہ جب سخت نیند کی وجہ سے انسان کی آنکھیں بند ہو جائیں۔ چنانچہ جب انسان کو بہت زیادہ نیند آئی ہوئی ہو اس وقت اونگھ آتی ہے۔ اور جب تک نیند کا غلبہ نہ ہو اونگھ نہیں آتی۔ تو فرمایا کہ خدا تعالیٰ کو کبھی اونگھ نہیں آتی کہ کام کرنے کی وجہ سے وہ تھک گیا ہو۔ اور اس پر نیند کا ایسا غلبہ ہو کہ اس کی آنکھیں بند ہو گئی ہوں اور نہ اسے معمولی نیند آتی ہے۔ غرض ترتیب بیان کے لحاظ سے سِنَةٌ کا ہی پہلے ذکر آنا ضروری تھا۔ اور نوم کا بعد میں۔

پھر فرمایا۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ تمہارا آقا ایسا ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کچھ اسی کا ہے۔ ایسی صورت میں تم اس کے مقابلہ میں کسی اور کو اپنا آقا کس طرح بنا سکتے ہو؟ پھر بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی کی عبادت تو نہیں کرتے ہاں دوسروں کو نیازیں دیتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے مقرب ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے حضور ہماری شفاعت کریں گے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ ہمارے حکم کے بغیر تو کوئی شفاعت ہی نہیں کر سکتا۔ پس تمہاری یہ امید بھی غلط ہے اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر اور کون ہے؟ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک دفعہ جب نواب محمد علی خان صاحبؓ کے لڑکے عبدالرحیم خان کے لئے جبکہ وہ شدید بیمار تھا دُعا کی تو الہام ہوا کہ ’’تقدیر مبرم ہے اور ہلاکت مقدر‘‘ آپ کو خیال آیا کہ نواب صاحب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر قادیان آرہے ہیں۔ ان کا لڑکا فوت ہو گیا تو انہیں ابتلاء نہ آجائے۔ اس لئے آپ نے خدا تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ الٰہی میں اس لڑکے کی صحت کے لئے شفاعت کرتا ہوں۔ اس پر آپ کو بڑے زور سے الہام ہوا مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یعنی تم کون ہو جو میری اجازت کے بغیر شفاعت کرتے ہو؟ اب دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کتنے بڑے انسان تھے! تیرہ سو سال سے دنیا آپ کی منتظر تھی۔ مگر وہ بھی سفارش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم کون ہو کہ بلا اجازت سفارش کرو؟ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے یہ الہام ہوا۔ تو میں گر پڑا اور بدن پر رعشہ طاری ہو گیا اور قریب تھا کہ میری جان نکل جاتی۔ لیکن جب یہ حالت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْمَجَازُ۔ اچھا۔ اب ہم شفاعت کی اجازت دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے شفاعت کی۔ اور عبدالرحیم خان اچھے ہو گئے۔ (الہام مؤرخہ ۲۵؍اکتوبر ۱۹۰۳ء) غرض جب مسیح موعود علیہ السلام جیسے انسان کو۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ تم کون ہو جو بلا اذن سفارش کرو تو اور لوگوں کی کیا حیثیت ہے کہ کسی کی سفارش کر سکیں؟

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اِذن ہوگا تب آپ سفارش کریں گے (ترمذی کتاب صفة القیامة باب ما جاء فی الشفاعة) پھر کیسا نادان ہے وہ شخص جو سمجھتا ہے کہ فلاں میری سفارش کردے گا!

پھر ایک اور بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ مانا شفاعت بلا اجازت نہیں ہوسکتی۔لیکن بادشاہ کے جس طرح درباری ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ بادشاہ تک رسائی حاصل کرکے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بھی درباری ہونے چاہئیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ان احمقوں کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ دنیا کے بادشاہ کیوں درباری رکھتے ہیں۔وہ تو اس لئے رکھتے ہیں کہ انہیں ان سے حالات معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ بادشاہ نہیں جانتا کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو تمہاری اگلی پچھلی ساری باتیں جانتا ہے۔پھر اس کو درباری رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ کے دو معنے ہیں۔ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے جو آگے ہونا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو لوگ پیچھے کر چکے ہیں۔دوسرے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کاموں کو بھی جانتا ہے جو وہ کر رہے ہیں اور ان کاموں کو بھی جانتا ہے جو انہیں کرنے چاہیے تھے۔لیکن انہوں نے ترک کردیئے۔پھر اسے کیا ضرورت ہے کہ درباری رکھے؟

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔ پھر اس کے علوم کا کوئی شخص احاطہ نہیں کرسکتا کسی کو اس کی حقیقت اپنی کوشش سے معلوم نہیں ہوسکتی۔ہاں! جس کو وہ آپ ہی بتادے اور جس قدر بتادے وہ اتنا ہی جانتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔اس آیت میں خدا تعالیٰ نے صاف طور پر بتادیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علم کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نہ کوئی اور شخص۔بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام نبیوں کے سردار اور اللہ تعالیٰ کے بڑے محبوب ہیں بلکہ آپ کی اتباع کرنے والا بھی خدا تعالیٰ کا محبوب ہوجاتا ہے مگر باوجود اس کے آپ خدا تعالیٰ کی مخلوق اور اسی کے محتاج تھے۔پس آپ کے اندر وہی صفات رہیں گی جو بندوں میں ہوتی ہیں اور وہ صفات کبھی نہیں آسکتیں جو خدا نے صرف اپنے لئے مخصوص کی ہوئی ہیں۔

لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ میں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہیں اتنی غیر محدود ہیں کہ انہیں کلّی طور پر طے کرنے کا کوئی انسان خیال بھی نہیں کرسکتا۔جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں بڑھتا ہے اور وہ اپنے مقام کے مطابق اس کے انوار و برکات کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس پر اپنی دوسری تجلّی ظاہر کرتا ہے اور جب وہ دوسری تجلّی کو بھی برداشت کرلیتا ہے اور اللہ تعالیٰ دیکھتا

ہے کہ اب یہ تیسری تجلّی کے قابل ہو گیا ہے۔ تو اس پر اپنی تیسری تجلّی ظاہر کرتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے قرب میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کیفیت کو ایک نہایت ہی لطیف مثال کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جو شخص دوزخ میں سب سے پیچھے رہ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے کہے گا کہ مانگو مجھ سے کیا مانگتے ہو وہ کہے گا بس یہی مانگتا ہوں کہ مجھے دوزخ سے نکال دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اچھا۔ اور وہ اسے دوزخ سے نکال لے گا۔ جس سے اسے بہت خوشی ہو گی لیکن کچھ روز کے بعد اسے دور ایک سرسبز و شاداب درخت نظر آئے گا اور اس کے دل میں لالچ پیدا ہو گا کہ اگر میں وہاں پہنچ کر اس کے نیچے بیٹھ سکوں تو کیا اچھا ہو۔ کچھ مدت تک تو وہ اس خیال کے اظہار سے رکے گا۔ مگر آخر خدا تعالیٰ سے کہے گا کہ ہے تو بڑی بات لیکن اگر آپ مجھ پر رحم کر کے اس درخت کے نیچے بیٹھنے دیں تو بہت مہربانی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی بات کو مان لے گا اور اس درخت کے نیچے اسے پہنچا دے گا۔ آخر جب وہ اس درخت کے نیچے کچھ عرصہ تک راحت حاصل کر لے گا تو پھر اللہ تعالیٰ امتحان کے لئے اس سے بہتر درخت اس سے کچھ فاصلے پر ظاہر کرے گا۔ اور پھر وہ لالچ کرے گا کہ وہ اس کے نیچے بیٹھے کچھ مدت تک تو وہ اپنے نفس کی اس خواہش کو برداشت کرے گا اور کہے گا کہ میں اب اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کس طرح کروں؟ لیکن آخر وہ درخواست کر ہی دے گا اور کہے گا کہ آئندہ اور کچھ نہ مانگوں گا۔ تب خدا تعالیٰ اسے وہاں لے جائے گا۔ اور پھر وہ دور سے جنت کا دروازہ دیکھے گا اور آخر اس سے باہر رہنا برداشت نہیں کرے گا۔ اور خدا تعالیٰ سے کہے گا کہ مجھے اس جنت کے دروازہ کے آگے تو بٹھا دے میں اندر جانے کی درخواست نہیں کرتا۔ صرف باہر بیٹھا دے وہیں سے لطف حاصل کر لوں گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کیا تو اس کے بعد تو کچھ نہیں مانگے گا۔ بندہ کہے گا نہیں اس پر اللہ تعالیٰ اُسے جنت کے دروازے پر بٹھا دے گا لیکن وہاں اسے کس طرح چین حاصل ہو سکتا ہے آخر وہ بے تاب ہو کر کہے گا کہ یا اللہ مجھے دروازہ کے اندر کی طرف بٹھا دے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھے جنت کی نعماء دے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ دروازہ کے اندر بٹھا دے اس پر اللہ تعالیٰ ہنسے گا اور کہے گا کہ میرے بندہ کی حرص کہیں ختم نہیں ہوتی۔ جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ اور جہاں چاہو رہو۔ (مشکوٰۃ کتاب احوال القیامۃ و بدء الخلق باب الحوض و الشفاعۃ)

غرضیکہ پہلے اللہ تعالیٰ ایک ہلکی سی تجلّی دکھاتا ہے اور اسے دیکھ کر جب ملائکہ صفت انسان بے تاب ہو جاتا ہے اور دعائیں کرتا ہے کہ خدایا! تو مجھے کامل تجلی دکھا تو پھر اللہ تعالیٰ اسے دوسرے مقام کی پہلے ہلکی سی تجلی دکھاتا ہے اور پھر پوری تجلی اور یہ سلسلہ اسی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی ہستی غیر محدود ہے اور کوئی شخص اس کا احاطہ

نہیں کر سکتا۔

پھر فرماتا ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۔اللہ تعالیٰ کا علم آسمان اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔یعنی اسے ہر چیز کا انتہائی علم ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے علم سے باہر ہو۔انسانی علم بالکل محدود ہوتا ہے۔بعض اوقات وہ ایک چیز کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ اچھی ہے لیکن اس کا نتیجہ خراب ہوتا ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو میر عباس علی لدھیانوی کے متعلق ایک وقت علم دیا گیا کہ وہ نیک ہے تو آپ اس کی تعریف فرمانے لگے مگر چونکہ اس وقت آپ کو اس کے انجام کا علم نہیں تھا اس لئے آپ کو پتہ نہ لگا کہ ایک دن وہ مرتد ہو جائے گا۔لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا علم دے دیا۔غرض انسانی علم بہت ہی محدود ہے صرف خدا تعالیٰ ہی کامل علم رکھتا ہے جو سب پر حاوی ہے اور کوئی شخص اس کے علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

پھر وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ میں سائنس کے اس عظیم الشان نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ کائنات عالم کی لمبائی کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔اس زمانہ میں جس حد تک علم ہیئت میں ترقی ہو چکی ہے۔اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔آج دنیا کی لمبائی کا اندازہ میلوں میں نہیں لگایا جاتا۔مثلاً یہ نہیں کہا جاتا کہ ایک زمین سے دوسری زمین تک اتنے میل کا فاصلہ ہے بلکہ اس لمبائی کا اندازہ روشنی کی رفتار سے لگایا جاتا ہے۔روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ اسی ہزار میل چلتی ہے اور دنیا کی وسعت کا اندازہ اس نور کی روشنی سے لگاتے ہیں۔گویا یہ بھی اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (النور: ۳۶) کی صداقت کا ثبوت ہے کیونکہ اس آیت میں بتایا گیا تھا کہ زمین و آسمان کی وسعت کا اندازہ تم کسی چیز سے نہیں لگا سکتے صرف نور اور اس کی رفتار سے ہی لگا سکتے ہو۔غرض جب ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ اسّی ہزار میل چلتی ہے۔تو ایک منٹ میں ایک کروڑ آٹھ لاکھ میل چلے گی۔پھر اسے ایک گھنٹہ کے ساتھ ضرب دو تو یہ ۶۴ کروڑ ۸۰ لاکھ میل بنتے ہیں۔ان میلوں کو ایک دن کی روشنی کا حساب لگانے کے لئے ۲۴ سے ضرب دیں تو یہ ۱۵ ارب ۵۵ کروڑ ۲۰ لاکھ میل رفتار بن جاتی ہے۔اب پھر ایک سال کی رفتار کا حساب لگانے کے لئے ۳۶۰ دنوں سے ضرب دیں تو ۵۵ کھرب ۶۷ ارب ۲۷ کروڑ میل بنتے ہیں۔یہ حساب صرف روشنی کے ایک سال کی لمبائی کا ہوتا ہے۔لیکن دنیا کی لمبائی علم ہیئت والے روشنی کے تین ہزار سال قرار دیتے تھے۔پس ان اعداد کو تین ہزار سال سے ضرب دینی ہوگی۔اب اس کا حاصل ضرب جو نکلے وہ حسابی لحاظ سے درحقیقت نا قابلِ اندازہ ہی ہو جاتا ہے۔کیونکہ اربوں کے اوپر کا حساب درحقیقت حساب ہی نہیں سمجھا جاتا مگر یہ حساب یہیں ختم نہیں ہو گیا۔جوں جوں نئے آلات دریافت ہو رہے ہیں یہ اندازے بھی غلط ثابت ہو رہے ہیں۔پہلی جنگ عظیم کے بعد

یہ قرار دیا گیا کہ دنیا کی لمبائی روشنی کے چھ ہزار سال کے برابر ہے۔ مگر اس کے بعد تحقیق ہوئی کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ ہم دنیا کی لمبائی کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کیونکہ جس طرح بچہ کا قد بڑھتا ہے اسی طرح دنیا بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور اب اس کی لمبائی روشنی کے بارہ ہزار سالوں کے برابر سمجھی جاتی ہے۔

اس کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ وَ الْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ (الزمر:۶۸) یعنی سب کی سب زمین اس کی مملوکہ ہے۔ اور آسمان اور زمین دونوں قیامت کے دن اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ اور جو چیز خدا کی مٹھی میں ہو اس کا اندازہ انسان کہاں لگا سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جب انسان کا علم اندازے کے قریب قریب پہنچنے لگتا ہے تو خدا تعالیٰ کائنات کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ غرض اس نئے علم سے وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کی صداقت کا سائینس نے اقرار کر لیا ہے۔ اور دنیا اس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہے کہ زمین و آسمان کی وسعت کا اندازہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔

وَ لَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا۔ پھر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا علم حاصل کرنے کے لئے تو اپنے درباری مقرر نہیں کئے لیکن کام کرنے کے لئے کچھ مددگار تو ضرور مقرر کئے ہوں گے تاکہ وہ اس کا ہاتھ بٹائیں۔ فرمایا اللہ کو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ سب کام خود کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طاقت ایسی وسیع ہے کہ کوئی چیز اس کے قبضہ سے باہر نہیں۔ اور نہ کسی چیز کا انتظام اس کو تھکا سکتا ہے۔

اب ایک ہی اعتراض رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مانا خدا کو علم کے لئے اور مدد کے لئے کسی کی ضرورت نہیں مگر شان و شوکت بھی تو کوئی چیز ہے اس کے اظہار کے لئے ہی اس نے درباری مقرر کئے ہوں گے۔ اس اعتراض کو وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ کہہ کر ردّ فرما دیا۔ یعنی وہ بہت بڑا ہے اور کوئی چیز نہیں جو اس کے ساتھ مل کر اس کے رتبہ کو بڑھا سکے۔ جو چیز خدا کے ساتھ ملے گی اس کا اپنا ہی رتبہ بڑھے گا نہ کہ خدا کا۔ پس یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے شان و شوکت کے لئے درباری مقرر کئے ہوں گے ٹھیک نہیں۔ وہ بہت بلند اور بڑی شان رکھنے والا ہے۔

عَلِیٌّ میں اس کی رفعت اور بلندی کی طرف اور عَظِیْمٌ میں اس کی طاقتوں کی وسعت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ وہ خدا ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اگر ایسے خدا کے ہوتے ہوئے کوئی کسی اور طرف جائے تو کتنے بڑے افسوس کی بات ہے اگر کسی شخص کو نہایت عمدہ کھانا ملے اور وہ اسے چھوڑ کر نجاست کی طرف دوڑے۔ اگر کسی شخص کو عمدہ کپڑا ملے اور وہ اسے چھوڑ کر میلی کچیلی لنگوٹی باندھ لے تو بتاؤ کیا وہ دانا اور عقلمند کہلانے کے قابل ہوگا؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ دانا وہی ہے جو بہتر چیز کو پسند کرے۔ پس اللہ تعالیٰ سے بہتر اور کوئی نہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ

دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر (جائز) نہیں۔(کیونکہ) ہدایت اور گمراہی کا (باہمی) فرق خوب ظاہر ہو چکا ہے۔

يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ

پس (سمجھ لو کہ) جو شخص (اپنی مرضی سے) نیکی سے روکنے والے (کی بات ماننے) سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان

بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۷﴾

رکھے تو اس نے (ایک) نہایت مضبوط قابل اعتماد چیز کو جو (کبھی) ٹوٹنے کی نہیں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور اللہ بہت سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ **رُشْدٌ** رشد کے معنے ہیں صداقت پر استقلال سے قائم رہنا نیز یہ غَیٌّ کے اضداد میں سے ہے۔(اقرب)

اَلْغَیُّ کے معنے ہیں اَلضَّلٰلَةُ۔ گمراہی۔ اَلْھَلَاکُ۔ تباہی۔ اَلْخَیْبَةُ: ناکامی۔(اقرب)

اَلطَّاغُوْتُ طَغٰی سے نکلا ہے جس کے معنے ہر ایسی چیز کے ہیں جو حد سے نکل جائے۔ اور سرکش ہو جائے طاغوت کے ان معنوں میں شیطان بھی شامل ہے کیونکہ وہ انسان کو سرکشی کی طرف لے جاتا ہے اور اس میں وہ انسان بھی شامل ہیں جو لوگوں کو خدا تعالیٰ سے دور کرتے ہیں۔(اقرب)

اِسْتِمْسَاکٌ کے معنے پکڑنے کے ہیں۔(اقرب)

اَلْعُرْوَةُ اَلْعُرْوَةُ مِنَ الدَّلْوِ وَ الْکُوْزِ الْمِقْبَضُ اَیْ اُذُنُھُمَا۔ یعنی عُروہ ڈول یا لوٹے کے دستہ کو کہتے ہیں جس سے اسے پکڑا جاتا ہے۔ اسی طرح عروہ کے معنے مَا یُوْثَقُ بِہٖ کے بھی ہیں۔ یعنی ایسی چیز جس پر اعتبار کیا جائے۔ گویا ہر ایسی چیز جس پر سہارا لیا جائے یا جس پر اعتماد کیا جاسکے وہ عُروہ کہلاتی ہے۔ اسی طرح عُروہ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو کبھی ضائع نہ ہونے والی ہو چنانچہ عُروَۃ اس گھاس کو کہتے ہیں جو ہمیشہ ہرا رہے اور عروہ کے معنے اَلنَّفِیْسُ مِنَ الْمَالِ کے بھی ہیں۔ یعنی اچھا اور بہترین مال۔(اقرب)

تفسیر۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ جبر سے دین پھیلانے کی تعلیم دیتا ہے

حالانکہ اسلام اگر ایک طرف جہاد کے لئے مسلمانوں کو تیار کرتا ہے جیسا کہ اس سورۃ میں وہ فرما چکا ہے کہ وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (البقرة:۱۹۱) یعنی تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف وہ یہ بھی فرماتا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ یعنی جنگ کا جو حکم تمہیں دیا گیا ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ لوگوں کو مسلمان بنانے کے لئے جبر کرنا جائز ہو گیا ہے بلکہ جنگ کا یہ حکم محض دشمن کے شر سے بچنے اور اس کے مفاسد کو دور کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اگر اسلام میں جبر جائز ہوتا تو یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ قرآن کریم ایک طرف تو مسلمانوں کو لڑائی کا حکم دیتا اور دوسری طرف اسی سورۃ میں یہ فرما دیتا کہ دین کے لئے جبر نہ کرو۔ کیا اس کا واضح الفاظ میں یہ مطلب نہیں کہ اسلام دین کے معاملہ میں دوسروں پر جبر کرنا کسی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دیتا؟ پس یہ آیت دین کے معاملہ میں ہر قسم کے جبر کو نہ صرف ناجائز قرار دیتی ہے بلکہ جس مقام پر یہ آیت واقع ہے اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام جبر کے بالکل خلاف ہے۔ پس عیسائی مستشرقین کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ غیر مذاہب والوں کو اسلام میں داخل کرنے کا حکم دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی وہ سب سے پہلا مذہب ہے جس نے دنیا کے سامنے یہ تعلیم پیش کی کہ مذہب کے معاملہ میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے اور دین کے بارہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ یہ جملہ مستانفہ ہے یعنی اس سے پہلے ایک جملہ مقدر ہے جس کا یہ جواب دیا گیا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ دین کے لئے جبر جائز نہیں۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب دین ایک اعلیٰ درجہ کی چیز ہے تو کیوں اس کے لئے لوگوں پر جبر نہ کیا جائے۔ اور انہیں بزور اس نعمت سے متمتع نہ کیا جائے؟ اللہ تعالیٰ اس سوال کے جواب میں فرماتا ہے جب گمراہی اور ہدایت ظاہر ہو گئی ہے تو اب جبر کی ضرورت نہیں۔ صرف ہدایت کا پیش کر دینا تمہارا کام ہے۔ کیونکہ جو حق بات تھی وہ گمراہی اور ضلالت کے بالمقابل پورے طور پر ظاہر ہو گئی ہے۔ غرض اس آیت میں خدا تعالیٰ نے وجہ بیان فرمائی ہے کہ کیوں اسلام کو جبر کی ضرورت نہیں۔ فرماتا ہے۔ جبر اس وقت ہوتا ہے۔ جب کوئی بات دلیل سے ثابت نہ ہو سکے۔ یا جس کو سمجھایا جائے۔ وہ سمجھنے کے قابل نہ ہو۔ مثلاً ایک بچہ کی عقل چونکہ کمزور ہوتی ہے۔ اس لئے بسا اوقات اس کی مرضی کے خلاف اور جبر کرنے والے کی مرضی کے موافق کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس بچہ میں جب عقل آجاتی ہے تو پھر وہ اپنے آپ ہی سمجھ جاتا ہے اور اپنے نفع اور نقصان کو سوچ سکتا ہے۔ اس حالت میں اس پر کوئی جبر نہیں کرتا۔ اسلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس میں ہر قسم کے دلائل کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اسے منوانے کے لئے کسی پر جبر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ

اسلام تو اس بات پر لعنت بھیجتا ہے کہ کسی مذہب کو بغیر سوچے سمجھے ڈر یا لالچ کی وجہ سے قبول کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ یَعۡلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ یَشۡهَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَکٰذِبُوۡنَ (المنافقون: ۲) یعنی منافق جب تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ تُو اللہ کا رسول ہے۔ مگر اللہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔ اگر اسلام کے پھیلانے کے لئے تلوار چلانا جائز ہوتا۔ تو کیا وہ لوگ جو اسلام لے آئے تھے مگر دل میں منافق تھے ان کا ذکر قرآن کریم ان الفاظ میں کرتا جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں تو یہ لوگ گویا قرآنی تعلیم کا نتیجہ ہوتے۔ کون اُمید کر سکتا ہے کہ تلوار کے ساتھ وہ مخلص لوگوں کی جماعت پیدا کرے گا۔ پس یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ سے غیر مذاہب والوں کو اسلام میں داخل کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ۔ (البقرۃ: ۱۹۱) یعنی دین کی لڑائی ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر یہ خیال رکھنا کہ زیادتی نہ کر بیٹھو۔ پس جبکہ اسلام صرف ان لوگوں سے دینی جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے جو دین کے نام سے مسلمانوں سے جنگ کریں اور مسلمانوں کو جبراً اسلام سے پھیرنا چاہیں۔ اور ان کے متعلق بھی یہ حکم دیتا ہے کہ زیادتی نہ کرو بلکہ اگر وہ باز آجائیں تو تم بھی اس قسم کی لڑائی کو چھوڑ دو تو پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا حکم ہے کہ غیر مذاہب والوں سے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے جنگ کرو؟ اللہ تعالیٰ تو مختلف مذہبوں کے مٹانے کے لئے نہیں بلکہ مختلف مذاہب کی حفاظت کے لئے جنگ کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصۡرِهِمۡ لَقَدِیۡرُ ۔ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ بِغَیۡرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذۡکَرُ فِیۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ کَثِیۡرًا ؕ وَ لَیَنۡصُرَنَّ اللّٰهُ مَنۡ یَّنۡصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ۔ (الحج: ۴۰۔۴۱) یعنی ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جاتی ہے جنگ کی اس وجہ سے اجازت دی جاتی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بلا قصور نکالے گئے ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ کہتے تھے کہ اللہ ہمارا ربّ ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے ذریعہ سے بعض کا ہاتھ نہ روکتا تو مسیحیوں کے معبد اور راہبوں کے خلوت خانے اور یہود کی عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اس کے دین کی تائید کرے گا اور اللہ تعالیٰ بہت طاقتور اور غالب ہے۔ یہ آیات کس قدر کھلے الفاظ میں

بتاتی ہیں کہ مذہبی جنگیں تبھی جائز ہیں جبکہ کوئی قوم رَبُّنَا اللّٰہ کہنے سے روکے۔ یعنی دین میں دخل دے اور چاہے کہ دوسری اقوام کے معابد گرائے جائیں اور ان سے ان کا مذہب چھڑوایا جائے یا ان کو قتل کیا جائے۔ ایسی صورت میں اسلام اس قوم سے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ کیونکہ اسلام دنیا میں بطور شاہد اور محافظ کے آیا ہے نہ کہ بطور جابر اور ظالم کے۔

فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ کفر کے معنے صرف انکار کرنے کے ہوتے ہیں خواہ وہ کسی چیز کا انکار ہو۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور بُرے معنوں میں بھی۔ اس جگہ یہ لفظ اچھے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ شیطانوں اور شیطانی لوگوں کی باتیں ماننے سے قطعی طور پر انکار کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر سچے دل سے ایمان لے آتے ہیں وہ ایک مضبوط چٹان پر قائم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں قرآن کریم میں یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ (النساء:۱۵۱) بھی آتا ہے کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں۔ پس جہاں تک اس لفظ کے ظاہر کا تعلق ہے۔ یہ نہ بُرا ہے نہ اچھا ہے۔ اصل معنے تو اس کے ڈھانپ دینے کے ہوتے ہیں۔ بدی کا ڈھانپنا بھی کفر کہلائے گا اور نیکی کا ڈھانپنا بھی کفر کہلائے گا۔ بدی کا چھپانا بھی کفر کہلائے گا اور نیکی کا چھپانا بھی کفر کہلائے گا۔ لیکن چونکہ کثرت سے قرآن کریم میں یہ لفظ نیکی کے انکار کے متعلق استعمال ہوا ہے اس لئے جب کسی قرینہ کے بغیر یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے بُرے ہی کئے جاتے ہیں۔ جس طرح مومن کے معنے بھی ایسے ہی ہیں لیکن وہ زیادہ تر نیکی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے جب مومن کا لفظ بغیر کسی قرینہ کے استعمال ہو تو اس کے معنے ہمیشہ نیک کے ہی کئے جائیں گے حالانکہ قرآن کریم میں مومن کا لفظ بھی برے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ۔ (النساء:۵۲) وہ بے فائدہ باتوں اور حد سے بڑھنے والوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس جگہ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ میں طاغوت کا کفر کرنے سے اس کی ذات کا انکار مراد نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ اس کی بات نہ مانے۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کا لفظ رکھا ہے جس کے معنے خدا تعالیٰ کی بات ماننے کے ہیں اور فرمایا ہے کہ جو شخص طاغوت کا انکار کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے وہ ایسے مضبوط کڑے کو پکڑ لیتا ہے جو کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ اگر انکار کے معنے کسی شے کی ذات کے انکار کے لئے جائیں تو اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہلاکت سے وہی شخص بچتا ہے جو شیطان کے وجود کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرے حالانکہ یہ معنے سراسر غلط ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم صاف طور پر خدا تعالیٰ کے وجود کا بھی اقرار کرتا ہے اور شیطان کے وجود کا بھی اقرار کرتا ہے۔ پس اقرار اور ایمان سے اس آیت

میں یہی مراد ہے کہ وہ شیطان کی باتوں کو ردّ کرتا اور خدا تعالیٰ کی باتوں کو مانتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى۔ عروہ کے معنے دستہ کے بھی ہوتے ہیں جس سے کسی چیز کو پکڑا جاتا ہے اور عُروہ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس پر اعتبار کیا جائے اور عُروہ کے معنے ایسی چیز کے بھی ہیں جس کی طرف انسان ضرورت کے وقت رجوع کرے۔ اور عُروہ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو ہمیشہ قائم رہے اور کبھی ضائع نہ ہو۔ اور عُروہ بہترین مال کو بھی کہتے ہیں (۱) اگر عُروہ کے معنے دستہ کے لئے جائیں تو اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ دین کو خدا تعالیٰ نے ایک ایسی لطیف چیز قرار دیا ہے جو کسی برتن میں پڑی ہوئی ہو اور محفوظ ہو اور انسان نے اس برتن کا دستہ پکڑ کر اسے اپنے قبضہ میں کر لیا ہو (۲) پھر عُروہ کہہ کر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ دین ایک ایسی چیز ہے جس کا انسان سہارا لے لیتا ہے تا کہ اسے گرنے کا ڈر نہ رہے۔ جیسے سیڑھیوں پر چڑھنے کے لئے انسان کو رسّہ کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ اسے پکڑ لیتا ہے۔ اسی طرح دین بھی اس رسّہ کی طرح ایک سہارا ہے۔ اسے مضبوط پکڑ لینے سے گرنے کا ڈر نہیں رہتا۔

(۳) عروہ کہہ کر یہ بھی بتایا کہ اگر انسان اسے مضبوطی سے پکڑ لے تو وہ ہر مصیبت کے وقت اس کے کام آتا ہے۔

(۴) عُروہ میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ صرف دین ہی انسان کے کام آنے والی چیز ہے۔ اس جہان میں بھی اور اگلے جہان میں بھی۔ باقی تمام تعلقات عارضی ہوتے ہیں اور مصیبت کے آنے پر ایک ایک کر کے کٹ جاتے ہیں۔ بیشک انسان اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی اپنا بہترین رفیق قرار دیتا ہے۔ لیکن بسا اوقات ان سے کمزوری یا بے وفائی ظاہر ہو جاتی ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقی تعلقات وہی ہیں جن کی بنیادیں دین اور مذہب پر استوار کی جائیں اور انہی میں برکت ہوتی ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى

اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر

النُّوْرِ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ

روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جو کافر ہیں ان کے دوست نیکی سے روکنے والے (لوگ) ہیں۔ اور انہیں روشنی سے

مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ لوگ آگ (میں پڑنے) والے ہیں۔

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۸﴾

وہ اس میں پڑے رہیں گے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔اللہ مومنوں کا دوست اور مددگار ہے۔اور وہ ایمان لانے والوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔عربی زبان کے محاورہ میں کامیابی کی طرف لے جانے کو ظلمت سے نور کی طرف لے جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔خواہ وہ کامیابی جسمانی ہو یا روحانی۔

پس اس سے مراد مومنوں کی جماعت کو ہر قسم کی روحانی اور جسمانی کامیابیوں کی طرف لے جانا اور انہیں ہر قسم کی ناکامیوں اور تکالیف سے نجات دلانا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۔یہاں طاغوت سے مراد وہ لوگ ہیں جو شیطان کے قائم مقام ہوتے ہیں۔وہ لوگوں کو اس تھوڑی بہت ہدایت سے بھی جس پر وہ قائم ہوتے ہیں دور پھینک دیتے ہیں۔یہ مت خیال کرو کہ کفار میں نور کہاں سے آیا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعویٰ نہیں کیا تھا۔اس وقت ابوجہل ایسا بُرا نہیں تھا جیسا کہ اس وقت تھا جب کہ وہ مارا گیا۔بات یہ ہے کہ صداقت کے انکار سے انسان کے قلب پر زنگ لگ جاتا ہے اور ہوتے ہوتے وہ تھوڑا بہت نور جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہ بھی جاتا رہتا ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ السلام کی بعثت سے پہلے بعض صداقتیں ایسی تھیں جن کو لوگ مانتے تھے مگر اب ان کا بھی انکار کر رہے ہیں۔مثلاً مسلمان خطیب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے پہلے اپنے منبروں پر کھڑے ہو ہو کر یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؏

موسیٰ کجا عیسیٰ کجا اس بات کا ہے سب کو غم

مگر اب ان کی کتابوں سے یہ شعر غائب ہو گیا ہے۔اسی طرح ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کا اعتقاد رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے جیسا کہ مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب تحذیر الناس میں صاف لکھا ہے کہ بغیر شریعت کے نبی ہو سکتا ہے مگر اب سب لوگ اس کا انکار کر رہے ہیں۔پس نبی کے آنے سے پہلے بعض لوگوں کے عقائد اچھے ہوتے ہیں مگر جب وہ نبی کا انکار کر دیتے ہیں اور انہیں ان کے پہلے عقیدہ کی رُو سے پکڑا جاتا ہے تو وہ اپنا پہلو بچانے کے لئے اس کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔لیکن جو شخص صداقت کو قبول کرتا ہے وہ روز بروز اپنے ایمان میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ میں خدا تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہو جاتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ بحیثیت قوم ترقی کی طرف لے جاتا ہے مگر چونکہ دنیا میں انسان کو قدم قدم پر مشکلات پیش آتی رہتی ہیں جن کو دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی کامیابی کا وعدہ کیا ہے تو پھر انہیں مشکلات کیوں پیش آتی ہیں۔ اس لئے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وعدے قومی طور پر کئے گئے ہیں نہ کہ انفرادی طور پر۔ پس انفرادی تکالیف اور مشکلات کو اس وعدہ کے خلاف نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص مارا جاتا ہے لیکن اس کے مرنے سے قوم کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ مرتا نہیں بلکہ زندہ ہوتا ہے۔ ورنہ ظاہری تکالیف کو دیکھا جائے تو حضرت امام حسین علیہ السلام بھی شہید کر دیئے گئے تھے مگر وہ ناکام نہیں ہوئے بلکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور جس اصول کی خاطر انہوں نے قربانی پیش کی تھی وہ اصول آج بھی قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ اسی طرح بعض انبیاء بھی شہید ہوئے۔ مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے صاف لکھا ہے کہ وہ مارے گئے تھے (حمامۃ البشریٰ۔ روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۱۵)۔ پس جب نبی بھی مارا جا سکتا ہے تو اور کون ہے جو اس قسم کی تکالیف سے محفوظ رہے۔ پس کسی فرد کا مارا جانا قوم کی ناکامی کی دلیل نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بیشک مارے گئے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید کو کوئی بھی اچھا نہیں کہتا اور امام حسینؓ کی سب عزت کرتے ہیں اور ان کا نام بڑے ادب اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور ان کی بڑی تعظیم کی جاتی ہے۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ اوپر بتایا تھا کہ اسلام کے لئے جبر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں ممتاز ہو چکی ہے۔ اور جنگ کا حکم تمہیں اس لئے دیا گیا ہے کہ دشمن تم پر حملہ کر رہا ہے۔ اب اس آیت میں بتایا کہ تمہارا انجام اچھا ہوگا اور تمہارے مخالفوں کا برُا۔ خدا تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے گا اور تمہارے دشمنوں کو ایسی تباہیوں سے دوچار کرے گا جن سے وہ ہمیشہ غیظ و غضب کی آگ میں جلتے رہیں گے اور اپنے چاروں طرف دوزخ ہی دوزخ پائیں گے جس سے نکلنے کا انہیں کوئی راستہ نظر نہیں آئے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ

کیا تجھے اس شخص کی خبر نہیں پہنچی جو اس (غرور کی) وجہ سے کہ اللہ نے اسے حکومت دی رکھی تھی ابراہیمؑ سے اس کے

الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ

رب کے متعلق بحث کرنے لگ گیا۔ (یہ اس وقت ہوا) جس وقت ابراہیم نے (اسے) کہا کہ میرا ربّ وہ ہے جو

اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ

زندہ کرتا اور مارتا ہے۔(اس پر) اس نے کہا (کہ) میں (بھی) زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا (کہ اگر یہ

مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِہَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُہِتَ الَّذِیۡ

بات ہے) تو اللہ (تعالیٰ تو) سورج کو مشرق (کی طرف) سے لاتا ہے۔ (اب) تو اسے مغرب (کی طرف) سے لے آ۔

کَفَرَ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۵۹﴾ۚ

اس پر وہ (کافر) مبہوت ہو (کر رہ) گیا۔ اور (یہ ہونا ہی تھا کیونکہ) اللہ ظالم لوگوں کو (کامیابی کی) راہ نہیں دکھاتا۔

حل لغات۔ حَآجَّ حَآجَّہٗ کے معنے ہیں خَاصَمَہٗ (اقرب) اس سے جھگڑا کرنے لگ گیا۔ حَآجَّ کا لفظ قرآن کریم میں جتنی جگہ استعمال ہوا ہے بُرے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے سوائے ایک جگہ کے کہ وہاں اس کے ایک اور معنے لئے جا سکتے ہیں۔ لغت والے بھی یہی لکھتے ہیں کہ یہ لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ پس اس کے معنے ہیں کج بحثی۔ مجادلہ۔ مکابرہ۔

مُلۡکٌ کے معنے بادشاہت کے بھی ہیں اور ملک کے بھی ہیں۔ (اقرب)

اِحۡیَاءٌ کے معنے ہیں زندہ کرنا۔ خوشی پہنچانا۔ نمو کی طاقت دینا۔ آباد کرنا۔ (اقرب)

اِمَاتَۃٌ کے معنے ہیں مُردہ کرنا۔ رنج پہنچانا۔ نمو کی طاقت نکال ڈالنا۔ (اقرب)

بُہِتَ کے معنے ہیں چہرہ کا رنگ اُڑ گیا۔ گھبرا گیا۔ مُنہ بند ہو گیا اور کوئی جواب نہ بن سکا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت کے متعلق مفسّرین کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک کافر بادشاہ میں جس کا نام نمرود بیان کیا جاتا ہے ہستی باری تعالیٰ پر بحث ہوئی تھی۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اسے کہا کہ میرا ربّ وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ تو اس نے کہا کہ ایسا تو میں بھی کر لیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے چند قیدی منگوائے جن میں سے بعض کو اُس نے چھوڑ دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ نے سمجھا کہ میری پہلی دلیل تو کارگر نہیں ہوئی اب میں کوئی اور دلیل پیش کروں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ میرا ربّ وہ ہے جو سورج کو مشرق سے لاتا ہے اگر تُو بھی ربّ ہے تو اسے مغرب سے لے آ۔ اس پر وہ خاموش ہو گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام غالب آ گئے (درمنثور زیر آیت ھذا)۔ مگر میرے نزدیک ان کی یہ قیاس آرائی درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح تو دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔

پہلے سوال پر حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش ہو گئے اور دوسرے سوال پر وہ خاموش ہو گیا۔ پس میرے نزدیک یہ توجیہہ صحیح نہیں کیونکہ اگر یہی مراد ہوتی اور وہ ایسا ہی جھوٹا اور کذّاب تھا اور اپنے آپ کو خدا بنا رہا تھا تو وہ یہ جواب بھی دے سکتا تھا کہ سورج کو مشرق سے تو مَیں ہی لا رہا ہوں۔ تم اپنے خدا کو کہو کہ وہ اسے مغرب سے لے آئے مگر اس نے یہ نہیں کہا۔ بلکہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ وہ خاموش ہو گیا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں تھا۔ بلکہ بات دراصل کچھ اور تھی۔ ورنہ بحث میں تو کوئی چپ ہوا ہی نہیں کرتا۔ لوگ بیہودہ باتوں پر بھی بحث کرتے چلے جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ اس امر پر بھی بحث کرتے ہیں کہ انسان کا وجود ہے یا نہیں۔ اور لوگ پھر بھی خاموش نہیں ہوتے۔ لیکن وہ خاموش ہو گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات تھی جس کے متعلق اس نے سمجھا کہ اگر میں نے اس کا جواب دیا تو میں مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ اس لئے سوائے خاموشی کے اس کے لئے اور کوئی چارہ نہ رہا۔

جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اس بحث کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ جب

''حضرت ابراہیمؑ اس بادشاہ کے سامنے جس کا نام نمرود تھا پیش ہوئے تو اس نے کہا کیا تُو نہیں جانتا کہ میں خدا ہوں اور دنیا کا حاکم ہوں اور میں ہی مارتا اور زندہ کرتا ہوں چونکہ ان کا سب سے بڑا خدا سورج دیوتا سمجھا جاتا تھا اور اسے آقا بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسے کہا کہ اگر تُو خدا اور دنیا کا حاکم ہے تو کیوں سورج کو مغرب سے نکال کر مشرق کی طرف نہیں چڑھاتا۔ اگر تو خدا اور دنیا کا حاکم ہے تو مجھے بتا کہ میرے دل میں اس وقت کیا ہے اور یہ کہ میرا آئندہ کیا حال ہوگا۔ اس پر نمرود کی زبان بند ہو گئی اور وہ حیران رہ گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بات کو جاری رکھا۔ اور کہا کہ تُو کونس کا بیٹا ہے اور اسی طرح کا ایک فانی وجود۔ تو اپنے باپ کو موت سے نہیں بچا سکا اور نہ خود اس سے بچ سکتا ہے۔'' (جیوش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ Abraham)

اسی طرح طالمود میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس بحث کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن طالمود اور قرآن کریم کے بیان میں فرق ہے۔ قرآن کریم میں زندہ کرنے اور مارنے کا ذکر پہلے ہے اور سورج کی تبدیلی کا ذکر پیچھے۔ لیکن طالمود میں سورج کی تبدیلی کا ذکر پہلے ہے اور احیاء و اماتت کا بعد میں۔ دوسرے طالمود میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے آپ کو کہا کہ تُو بتوں کی پوجا کیوں نہیں کرتا؟ انہوں نے کہا۔ جن کو آگ جلا دیتی ہے ان کی کیا پوجا کروں۔ اس نے کہا۔ پھر آگ کی کیوں نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا۔ جسے

پانی بجھا دیتا ہے۔ اس کی کیا پوجا کروں؟ اس نے کہا۔ پھر پانی کی کیوں نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا۔ پانی کو تو بادل لاتا ہے۔ اس نے کہا۔ پھر بادلوں کی کیوں نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا۔ ان کو ہوا اُڑا لے جاتی ہے۔ اس نے کہا۔ پھر ہوا ہی کی کر۔ انہوں نے کہا۔ انسان اس سے بھی بچاؤ کر لیتا ہے اور بچ جاتا ہے اور وہ اس پر غالب نہیں آتی۔ اس نے کہا۔ پھر مجھے پُوجو۔ کیونکہ میں انسانوں کا خدا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں۔

یہ بحث جس کا طالمود میں ذکر کیا گیا ہے خود اپنی ذات میں اس امر کا ثبوت ہے کہ سورج کا ذکر پہلے نہیں ہوا بلکہ پہلے احیاء اور اماتت کا ہی ذکر ہوا ہے ورنہ سورج کے ذکر کے بعد تو بحث آگے چل ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ سورج ان میں سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا اور اس کو ہر قسم کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور ترقی اور تنزل کا اصل باعث قرار دیا جاتا تھا۔ چنانچہ نیلسنز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ میرے ڈاک ان کا بڑا خدا تھا جسے سورج کی شعاع یا دن کی روشنی سمجھا جاتا تھا۔ اور اسے بنی نوع انسان کی ترقی اور تنزل کا اصل باعث قرار دیا جاتا تھا۔ (دیکھو نیلسنز انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ ببلونیا)

پھر عقلاً بھی قرآن کریم کا کلام ہی درست ثابت ہوتا ہے۔ اوّل اس لئے کہ بحث میں نیچے سے اوپر ترقی ہوتی ہے۔ پس موت اور حیات کا ذکر لازماً سورج سے پہلے ہونا چاہیئے نہ کہ بعد میں۔ دوسرے درمیان میں نمرود کے چپ ہو جانے کا ذکر بتاتا ہے کہ یہ واقعہ سب سے آخر میں ہوا۔ تیسرے نمرود کے سامنے پیش تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بتوں کے توڑنے کے جرم میں ہوئے تھے۔ اس کا یہ سوال کہ میں خدا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں بحث کے دوران میں پیدا ہوا ہے۔ ورنہ بے جوڑ کلام ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم یہی بتاتا ہے کہ بحث فِيْ رَبِّهٖ تھی۔ یعنی خدائے واحد کے بارہ میں بحث میں بادشاہ نے کہیں کہہ دیا کہ دیکھ میں تجھے تباہ کر دوں گا کیونکہ میں حاکم ہوں۔ آپ نے فرمایا تباہی یا آبادی تو خدا کے اختیار میں ہے۔ اس پر اس نے اس احیاء اور اماتت کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اور کہا کہ نہیں میرے اختیار میں ہے۔ آپ نے جھٹ اس کو پہلی بحث کے مطابق پکڑا کہ پھر سورج عبث ہوا۔ اور وہ چُپ ہو گیا۔

اس واقعہ کے ناموں وغیرہ میں گو فرق ہے لیکن یہودی تاریخ میں اس واقعہ کو جس طرز پر بیان کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہی واقعہ ہے جس کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے اور جس پر اَلَمْ تَرَ کے الفاظ بھی دلالت کرتے ہیں کیونکہ اَلَمْ تَرَ کے ساتھ کسی بے نشان واقعہ کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا مگر یہودی بیان حسب معمول آگے پیچھے ہو گیا ہے۔

طالمود میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نمرود سے یہ بحث کنعان میں آنے سے پہلے ہوئی تھی۔

میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے جو یہ کہا کہ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ میرا ربّ وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔تو اس سے ان کی مراد ظاہری موت اور حیات نہیں تھی۔ بلکہ کامیابی اور ناکامی اور عزّت اور ذلّت اور آبادی اور بربادی مراد تھی۔ چونکہ آپ سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہو چکا تھا کہ وہ آپ کو کنعان کا ملک دے گا اور آپ کی اولاد کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوگی۔اس لئے آپ نے فرمایا کہ میرا ربّ وہ ہے جو احیاء اور اماتت کی صفت اپنے اندر رکھتا ہے۔وہ جس کو چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔جس کو چاہتا ہے کامیاب کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ناکام کر دیتا ہے۔اور جس کو چاہتا ہے غلبہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے شکست دے دیتا ہے۔اِس پر اُس نے کہا اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ۔یہ بات تو میرے اختیار میں بھی ہے کہ میں جسے چاہوں ترقی دے دوں اور جسے چاہوں ذلیل کر دوں۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے سورج ان کا سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔اور بادشاہ بھی اُس کی پرستش کرتا تھا اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُسے جواب میں کہا کہ خدا تعالیٰ نے تو یہ سلسلہ جاری کیا ہوا ہے کہ وہ سورج کو مشرق سے چڑھاتا ہے اور اس طرح دنیا کو نفع پہنچاتا ہے۔لیکن اگر دنیا کو نفع پہنچانا تیرے اختیار میں ہے تو یہ جو سورج چڑھا ہوا ہے اِس کو مغرب سے مشرق کی طرف لوٹا دے۔وہ دن کا وقت تھا اور سورج چڑھا ہوا تھا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اسے واپس لوٹا دے یعنی اسے پیچھے کو لے جا یا یہ کہا کہ اسے مغرب سے چڑھا لا۔گویا انہوں نے اسے کہا کہ اس پر اپنی حکومت قائم کر کے دکھا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مدّعا یہ تھا کہ اگر دنیا کا نفع ونقصان تمہارے ہاتھ میں ہے تو پھر سورج کیا کرتا ہے اور اگر سورج نفع ونقصان پہنچاتا ہے تو نفع ونقصان پہنچانے اور مالک ہونے کا تمہارا دعویٰ باطل ہے۔اس پر جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے۔وہ مبہوت ہو کر لاجواب ہو گیا کیونکہ اگر وہ جواب دیتا تو یا تو وہ یہ کہتا کہ میں نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ سورج ہی پہنچاتا ہے اور ترقی اور تنزل اسی کے اختیار میں ہے میرے اختیار میں نہیں۔اور اگر وہ ایسا کہتا تو اس سے اس کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا کہ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ۔اور اگر وہ یہ کہتا کہ میں ہی یہ تمام کام کرتا ہوں سورج نہیں کرتا اور نفع نقصان بھی میرے ہی اختیار میں ہے سورج کے اختیار میں نہیں تو اس پر اس کی قوم دشمن ہو جاتی کیونکہ وہ سورج کی پرستش کرتی تھی بلکہ وہ خود بھی سورج کا پرستار تھا۔اس وجہ سے وہ کوئی جواب نہ دے سکا اور خاموش ہو گیا۔

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ کا ثبوت دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم اپنے بندوں کی مشکلات میں کس طرح ان کی مدد کرتے اور انہیں ظلمات سے نور کی طرف اور ناکامیوں سے

کامیابیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔

اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّ ھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا ج

اور (کیا تو نے) اس شخص کی مثل (کوئی آدمی دیکھا ہے) جو ایک ایسے شہر کے پاس سے گزرا جس کی یہ حالت تھی کہ وہ

قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا ج فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ

اپنی چھتوں کے بل گرا ہوا تھا۔ (اس کو دیکھ کر) اس نے کہا کہ اللہ (تعالیٰ) اس کی ویرانی کے بعد اسے کب آباد

مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ ط قَالَ کَمْ لَبِثْتَ ط قَالَ لَبِثْتُ

کرے گا؟ اس پر اللہ (تعالیٰ) نے اسے سو سال تک (خواب میں) مارے رکھا۔ پھر اسے اٹھایا (اور) فرمایا (اے

یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ط قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَۃَ عَامٍ

میرے بندے) تو کتنے عرصہ تک (اس حالت میں) رہا ہے۔ اس نے کہا میں (اس حالت میں) ایک دن یا دن کا

فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَ شَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّہْ ج وَ انْظُرْ اِلٰی

کچھ حصہ رہا ہوں۔ تب (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا (یہ بھی ٹھیک ہے) اور تو (اس حالت میں) سو سال تک بھی رہا ہے۔

حِمَارِکَ وَ لِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ

اب تو اپنے کھانے اور پینے (کے سامان) کی طرف دیکھ کہ وہ سڑا نہیں۔ اور اپنے گدھے کی طرف (بھی) دیکھ (اور

کَیْفَ نُنْشِزُھَا ثُمَّ نَکْسُوْھَا لَحْمًا ط فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ لا

ان دونوں کا سلامت رہنا دیکھ کر سمجھ لے کہ تیرا خیال بھی اپنی جگہ درست ہے اور ہمارا خیال بھی) اور ایسا ہم نے اس

قَالَ اَعۡلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۶۰﴾

لئے کیا تا تجھے لوگوں کے لئے ایک نشان بنائیں۔ اور ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم انہیں کس طرح اپنی اپنی جگہ رکھ کر جوڑتے ہیں۔ پھر ہم ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر (حقیقت) پورے طور پر ظاہر ہوگئی تو اس نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ (تعالیٰ) ہر ایک چیز پر قادر ہے۔

حلّ لُغات۔ اَوۡ كَالَّذِیۡ کاف مثال کے لئے بھی آتا ہے اور تاکید کے لئے بھی۔ اسی طرح تشبیہ اور تمثیل کے لئے بھی آتا ہے۔ یہاں پہلے معنوں کے لئے ہے۔ (اقرب)

خَاوِیَةٌ خَوٰی یَخۡوِیۡ خِوَاءً سے نکلا ہے۔ کہتے ہیں خَوَی الۡبَیۡتُ: سَقَطَ وَ تَهَدَّمَ۔ گھر گر گیا۔ فَرَغَ وَخَلَا۔ گھر خالی ہوگیا اور ویران ہوگیا۔ (المنجد)

بَلۡ حرف ہے جو اضراب کے معنے دیتا ہے۔ یعنی بات کو پھیر کر دوسری طرف لے جانا۔ یہ اضراب دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو انکار کی غرض سے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ۔ (الانبیاء: ۲۷) یعنی مشرک کہتے ہیں کہ رحمٰن خدا نے اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے جن کو یہ لوگ خدا کا بیٹا کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے معزز بندے ہیں۔ اضراب کی دوسری قسم میں ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف مضمون کو پھیرنا مقصود ہوتا ہے۔ بَلۡ سے پہلے جملہ کی تردید مدّ نظر نہیں ہوتی۔ اس آیت میں بھی بَلۡ سے پہلے کی بات بھی درست ہے اور بعد کی بھی صرف ایک نئے مضمون کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ (المنجد)

نُنۡشِزُهَا نَشَزَ کے معنے ہیں اِرۡتَفَعَ اُٹھا۔ اور اَنۡشَزَهٗ کے معنے ہیں رَفَعَهٗ اسے اٹھایا یا کھڑا کیا۔ پس نُنۡشِزُهَا کے معنے ہیں ہم ان کو کھڑا کرتے ہیں۔ یا ہم انہیں اُٹھاتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ مفسّرین کہتے ہیں کہ یہ عزیر نبی کا واقعہ ہے۔ وہ ایک دفعہ ایک تباہ شدہ بستی کے پاس سے گزرے تو انہوں نے اس کی تباہی اور خستہ حالی کو دیکھ کر کہا کہ خدا تعالیٰ اس بستی میں رہنے والوں کو ان کی موت کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ اس پر خدا تعالیٰ نے انہیں مار ڈالا اور وہ سو سال تک اسی حالت میں مُردہ پڑے رہے۔ اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بستی کے لوگوں کو آباد کر دیا اور انہیں زندہ کر کے دکھا دیا کہ خدا تعالیٰ کیسا قادر ہے اور وہ مردوں کو کس طرح زندہ کیا کرتا ہے۔ جب وہ سو سال کے بعد زندہ ہو کر اُٹھ بیٹھے تو خدا تعالیٰ نے انہیں کہا کہ اپنے کھانے کو دیکھ کہ وہ بھی ابھی تک سڑا نہیں اور پھر اس نے ان کے گدھے کو بھی زندہ کر دیا اور اس کی گلی سڑی ہڈیوں پر

گوشت پوست چڑھا دیا۔

میرے نزدیک اگر یہ واقعہ اسی طرح ہوا ہو جس طرح مفسّرین بیان کرتے ہیں تو خود اس آیت کے مختلف ٹکڑے اس بیان کو باطل قرار دیتے ہیں چنانچہ پہلی بات جو ان معنوں کو رد کرتی ہے وہ اَنّٰی یُحۡیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِھَا کے الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اس نبی کا سوال صرف بستی کے متعلق تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا؟ یہ سوال نہیں تھا کہ مُردے کس طرح زندہ ہوں گے؟ اگر مُردوں کے زندہ ہونے کا سوال ہوتا تو کیا ان کے سامنے روزانہ کئی لوگ مرتے نہیں تھے؟ اور جب وہ روزانہ یہ نظارہ دیکھتے تھے کہ لوگ مر کر زندہ نہیں ہوتے تو اس دن ایک تباہ شدہ بستی کو دیکھ کر ان کے دل میں مردوں کے زندہ ہونے کے متعلق کیسے سوال پیدا ہو گیا؟ اور اگر ان کا سوال صرف بستی کے دوبارہ زندہ کئے جانے کے متعلق تھا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ بستی کے مردہ ہونے سے اس کا اجڑنا اور زندہ ہونے سے اس کا آباد ہونا ہی مراد ہوا کرتا ہے۔ مردوں کے زندہ ہونے سے اس سوال کا کوئی تعلق نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اَنّٰی سے مراد ''کب تک'' ہے یا ''کیسے'' ہے۔ اگر کسی سوال کرنے والے کے جواب میں ''سوسال'' کا لفظ بولا جائے تو اس کے یہی معنے ہوں گے کہ سائل کا سوال ''کب تک'' کا ہے ''کیسے'' کا نہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سائل تو یہ سوال کرے کہ یہ بستی کس طرح زندہ ہو گی اور جواب یہ دیا جائے کہ سوسال کے بعد زندہ ہو جائے گی۔ سوسال کے الفاظ صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ سوال کب کے متعلق ہے نہ کہ کیفیت کے متعلق۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سوسال تک مارے رکھا پھر زندہ کر دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا؟ اگر تو حضرت عزیر کی یہ غرض تھی کہ وہ دیکھیں کہ مُردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں تو اُن کو مار کر پھر زندہ کر دینے سے یہ غرض پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ موت کے بعد وہ یہ کس طرح جان سکتے تھے کہ مُردہ کس طرح زندہ ہوا کرتا ہے۔ اور اگر ان کی دوبارہ حیات سے اللہ تعالیٰ کا منشاء پورا ہو گیا تھا تو پھر وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا پر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف گدھے کو ہی مار کر اور پھر اسے زندہ کر کے انہیں اپنی قدرت کا نظارہ کیوں نہ دکھا دیا؟ خود انہیں سوسال تک کیوں مارے رکھا؟ آخر اپنی موت سے تو اس بات کا پتہ نہیں لگتا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔ یہ تو دوسرے کو دیکھ کر ہی پتہ لگتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کے گدھے کو بھی مارنا تھا تو پھر ان کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟

پھر سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہ کیا گیا کہ اس بستی میں سے ہی کسی ایک کو مار کر اسے زندہ کر کے دکھا دیا جاتا خود

عزیر کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسی طرح سوال یہ ہے کہ انہوں نے کونسی بات پوچھی تھی جس کا جواب یہ دیا گیا کہ اُنْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ۔ ان کا سوال تو یہ تھا کہ بستی کس طرح زندہ ہوگی؟ مگر جواب یہ دیا گیا کہ تُو اپنے کھانے اور پینے کے سامان کی طرف دیکھ کہ وہ سڑا نہیں۔

پس اوّل تو ھٰذِہٖ کا لفظ بتلاتا ہے کہ اس جگہ لوگوں کے مرنے اور دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی سوال نہیں بلکہ صرف شہر کی آبادی اور اس کی دوبارہ حیات کا سوال تھا۔

دوسرے مِائَةَ عَامٍ میں بتلا دیا کہ اَنّٰی کے ساتھ ’’کب‘‘ کا سوال کیا گیا تھا نہ کہ ’’کیسے‘‘ کا۔ یعنی سوال کیفیت کے متعلق نہ تھا بلکہ زمانہ کے متعلق تھا۔

غرض مفسّرین کے بیان کردہ واقعہ پر کئی اعتراضات پڑتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزیر کو کیوں مارا۔ اگر وہ نبی تھا تو یہ اس کے سوال کا اچھا جواب دیا کہ اسے سو سال تک مارے رکھا۔ اس عرصہ میں اس کے بیوی بچے بھی مر گئے اور اسے ایک صدی کے بعد غیر لوگوں میں زندہ کر کے بٹھلا دیا۔

اس شخص کو مار کر زندہ کرنے کی غرض زیادہ سے زیادہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مُردوں کو زندہ کیا کرتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ پھر گدھے کو گوشت پوست چڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس ثبوت کے لئے تو صرف گدھے کا مر کر جینا ہی کافی تھا۔ خود عزیر کو مارنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ سنت اللہ کے بھی خلاف ہے کہ کسی مُردہ کو زندہ کیا جائے۔ اور پھر اگر خدا تعالیٰ نے انہیں سو سال تک مارے رکھا تو اس کے ثبوت میں یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ دیکھو! تمہارا کھانا سڑا نہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے تھا کہ کھانا پینا تو الگ رہا دنیا ہی بدل چکی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تُو سو سال تک واقعہ میں مرا رہا تھا۔ مگر اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

غرض ان تمام امور پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسّرین نے اس واقعہ کو جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ درست نہیں۔ اب میں اس واقعہ کی وہ حقیقت بیان کرتا ہوں جو میرے نزدیک درست ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو اس شخص کی طرف دیکھ جو ایک بستی یا گاؤں پر سے ایسی حالت میں کہ وہ اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا گذرا اور اس نے سوال کیا کہ الٰہی یہ بستی اپنی ویرانی کے بعد کب آباد ہوگی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے اسے سو سال تک مارے رکھا (یعنی خواب میں) اور پھر اسے اٹھایا۔ اور اس سے پوچھا کہ تُو کتنی دیر تک رہا ہے۔ اس نے کہا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بات تو درست ہے لیکن اس کے علاوہ ہم تجھے ایک اور بات بھی بتاتے ہیں کہ تو سو سال تک بھی رہا ہے۔ تیری بات کے سچا ہونے کا تو ثبوت یہ ہے کہ تو اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ وہ سڑا نہیں۔ لیکن میری بات کے

سچا ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے تجھے کشفی حالت میں سو سال کا نظارہ دکھایا ہے اور جب یہ رؤیا پورا ہوگا اس وقت لوگوں کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تیرا خدا کے ساتھ سچا تعلق تھا۔ جب اس پر یہ حقیقت روشن ہوگئی۔ تو اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کے آگے یہ کچھ بھی مشکل نہیں کہ وہ ایسی اُجڑی ہوئی بستی کو اپنے فضل سے پھر دوبارہ آباد کردے۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ اس بستی سے یروشلم مراد لیا کرتے تھے۔ جسے بخت نصر نے تباہ کر دیا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ وہ آدمی جو یروشلم کے پاس سے گزرا حزقیل نبی تھا۔ جس پر خدا تعالیٰ نے اس بات کا انکشاف کیا کہ ایک سو سال تک یہ شہر دوبارہ آباد ہوجائے گا (حقائق الفرقان جلد ا زیر آیت ھذا)۔ اور میرے نزدیک یہی بات درست ہے۔

یہاں اس بستی کے متعلق خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ گاؤں اپنی چھتوں پر گرا ہوا تھا۔ یعنی پہلے چھتیں گریں اور پھر ان پر دیواریں گر گئیں۔ کیونکہ جو مکان عدم استعمال کی وجہ سے گریں بالعموم پہلے ان کی چھتیں گرتی ہیں۔ کیونکہ چھتوں میں لکڑی ہوتی ہے اور لکڑی کو دیمک لگ جاتی ہے جب چھتیں گر جاتی ہیں تو پھر بارش کی وجہ سے ننگی دیواریں بھی گرنے لگتی ہیں اور اس صورت میں وہ دیواریں چھتوں پر آ گرتی ہیں۔ اسی حالت کو واضح کرنے کے لئے خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ ورنہ جو مکان زلزلہ وغیرہ کی قسم کے حادثات سے گرتے ہیں۔ ان کی دیواریں پہلے گرتی ہیں اور چھت ان پر آ گرتی ہے۔ ان الفاظ میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف کیا گیا ہے کہ اس گاؤں کی ویرانی کا سبب زلزلہ وغیرہ نہ تھا۔ بلکہ اس کے باشندوں کا شہر چھوڑ کر چلا جانا اس کا موجب تھا۔ بہر حال حزقیل نبی کے دل میں یروشلم کی بربادی دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوا کہ خدا تعالیٰ اس بستی کو کب زندہ کرے گا؟ بستی کو زندہ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ مردہ لوگ کس طرح زندہ ہوں گے۔ بلکہ اس کا مطلوب وہی ہے جو دوسری جگہ بستیوں کو زندہ کرنے کے متعلق قرآن کریم نے بیان کیا ہے فرماتا ہے۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا۔ لِنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّ نُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا۔ (الفرقان: ۴۹، ۵۰) یعنی ہم نے بادل سے پاک وصاف پانی اتارا ہے۔ تا کہ اس کے ذریعہ ہم مُردہ ملک کو زندہ کریں اور اسی طرح اس پانی سے اپنے پیدا کیے ہوئے چارپائیوں اور بہت سے انسانوں کو سیراب کریں۔ اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (ق: ۱۲) ہم بارش کے ذریعہ مُردہ شہر کو زندہ کیا کرتے ہیں۔ پس مُردہ شہر کو زندہ کرنے کے معنے ویران شہر کو آباد اور خوشحال کرنے کے ہوتے ہیں۔ حضرت حزقیل نے بھی یہی سوال کیا کہ الٰہی! یہ شہر کب آباد ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں رؤیا میں بتایا کہ سو سال کے عرصہ میں آباد ہوجائے گا۔

یہ رؤیا جس کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے حزقیل نبی کی کتاب میں بھی پائی جاتی ہے صرف اتنا فرق ہے کہ حزقیل نبی کی کتاب میں سو سال کی میعاد کا ذکر نہیں۔ یہ قرآن کریم کی صداقت اور اس کے کامل ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے کہ جو ضروری امور پچھلی کتب میں بیان نہیں ہوئے قرآن کریم نے ان کو بھی بیان کر دیا ہے اور اس طرح ان کی کمی کو پورا کر دیا ہے۔ بہر حال حزقیل باب ۳۷ میں لکھا ہے۔

''خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے خداوند کی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھر پور تھی مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے آس پاس چوگرد پھرایا۔ اور دیکھ وے وادی کے میدان میں بہت تھیں اور دیکھ وے نہایت سوکھی تھیں۔ اور اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں۔ میں نے جواب میں کہا کہ اے خداوند یہوواہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیو! تم خداوند کا کلام سنو۔ خداوند یہوواہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں تمہارے اندر میں روح داخل کروں گا۔ اور تم جیؤ گے۔ اور تم پر نسیں بٹھاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا اور تم میں روح ڈالوں گا اور تم جیؤ گے اور جانو گے کہ میں خداوند ہوں۔ سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی۔ اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہوا۔ اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں۔ ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہوگئی۔ پر ان میں روح نہ تھی۔ تب اس نے مجھے کہا کہ نبوت کر۔ تُو ہوا سے نبوت کر۔ اے آدم زاد! اور ہوا سے کہہ کہ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ اے سانس! تو چاروں ہواؤں میں سے آ۔ اور ان مقتولوں پر پھونک کہ وے جیئیں۔ سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور ان میں روح آئی اور وے جی اٹھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔ تب اس نے مجھ سے کہا کہ اے آدم زاد یہ ہڈیاں سارے اسرائیل ہیں۔ دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی۔ ہم تو بالکل فنا ہو گئے۔ اس لئے تو نبوت کر اور ان سے کہہ کہ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے میرے لوگو میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا۔ اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا اور میرے لوگو جب میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو تمہاری قبروں سے نکالوں گا تب جانو گے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم جیئو گے۔ اور میں تم کو تمہاری

سرزمین میں بساؤں گا۔ تب تم جانو گے کہ مجھے خداوند نے کہا اور پورا کیا۔"

(حزقیل باب ۳۷ آیت ۱ تا ۱۴)

یہ پیشگوئی ہے جو حزقیل نبی نے کی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو اس وقت بابل میں قید تھے۔ وہ اس بستی کے پاس سے کب گزرے؟ سو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ہوسکتا ہے یہ گزرنا بھی خواب میں ہی ہو۔ جیسا کہ بائیبل کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نبوکدنضر جو بابل کا بادشاہ تھا اس نے ۵۸۶ قبل مسیح یروشلم پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا تھا۔ اور اس کا ایک حصہ گرا دیا تھا۔ وہ وہاں کے بادشاہ اور اس کے خاندان کے تمام افراد کو پکڑ کر اپنے ملک میں لے گیا۔ اسی طرح شہر کے تمام شرفاء اور بڑے بڑے کاریگروں کو بھی قید کر کے لے گیا۔ اور سوائے چند رذیل لوگوں کے وہاں کوئی باقی نہ رہا (جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ یروشلم Jerusalem)۔ حضرت حزقیل بھی ان قیدیوں میں ہی تھے (حزقیل باب ۳ آیت ۱۵) جنہیں نبوکدنضر نے گرفتار کیا۔ ان کے متعلق بحث ہوئی ہے کہ انہیں اس نے کیوں پکڑا؟ اور مؤرخین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ چونکہ وہ لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ نبوکدنضر کا مقابلہ کرو اور اپنے ملک کو نہ چھوڑو اس لئے وہ ان کو بھی قید کر کے لے گیا۔ پرانی تاریخوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ جن شہروں کو گراتے اور ویران کرتے تھے وہاں کے قیدیوں کو وہ ان کے اوپر سے گزارتے تھے تاکہ انہیں اپنی ذلّت اور بیچارگی کا احساس ہو۔

میرے نزدیک جب وہ پکڑے گئے اور یروشلم کے اوپر سے گزارے گئے اس وقت انہوں نے اس کے متعلق خدا تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ خدایا یہ کیا ہو گیا ہے؟ شہر گرا دیا گیا ہے۔ سب بڑے بڑے لوگ قید کر کے لے جائے جا رہے ہیں۔ ایسی خطرناک تباہی کے بعد اب یہ شہر دوبارہ کب آباد ہو گا؟ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا کے الفاظ بھی اسی امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یروشلم کے تباہ ہوتے ہی ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا جب کہ گری ہوئی چھتیں انہیں نظر آ رہی تھیں۔ ورنہ بعد میں تو لوگ سامان اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ الٰہی! یہ شہر دوبارہ کب آباد ہو گا۔ ہم تو سب قید ہو کر جا رہے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو سو سال کی موت کا نظارہ دکھایا۔ یعنی کشفی رنگ میں انہیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں اور سو سال کے بعد پھر زندہ ہوئے ہیں۔ اور خوابوں میں ایسا ہونا کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ انسان خواب میں مرتا بھی ہے اور مختلف قسم کے نظارے بھی دیکھتا ہے۔ حضرت حزقیل چونکہ اپنی قوم کے نبی تھے۔ اس لئے ان پر کشفی رنگ میں موت کی کیفیت وارد کرنے سے مراد

درحقیقت بنی اسرائیل کی موت تھی اور اللہ تعالیٰ اس ذریعہ سے انہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل سو سال تک غلامی اور ادبار کی حالت میں رہیں گے اس کے بعد ان کو ایک نئی زندگی عطا کی جائے گی اور وہ اپنے شہر میں واپس آ جائیں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جگہ رؤیا کا کوئی لفظ نہیں۔ مگر قرآن کریم کا یہ طریق ہے کہ وہ بعض دفعہ رؤیا کا تو ذکر کرتا ہے مگر رؤیا کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب بتایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ چاند اور سورج وغیرہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں تو انہوں نے رؤیا کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ پس یہ ضروری نہیں ہوتا کہ خواب کے ذکر میں خواب کا لفظ بھی استعمال کیا جائے۔

جب وہ یہ نظارہ دیکھ چکے تو ان کو اٹھایا گیا۔ یعنی ان کی کشفی حالت جاتی رہی۔ اور خدا تعالیٰ نے ان سے پوچھا کہ كَمْ لَبِثْتَ بتا تو کتنے عرصہ تک اس حالت میں رہا انہوں نے عرض کیا لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۔ میں تو صرف ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہا ہوں۔ محاورہ میں اس کے یہ معنے ہیں کہ اچھی طرح معلوم نہیں ۔ چنانچہ یہ محاورہ قرآن کریم میں بعض دوسرے مقامات پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ (المومنون: ۱۱۳، ۱۱۴) یعنی اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے ہو؟ وہ کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے ہیں۔ تُو گننے والوں سے پوچھ لے یعنی ہم بہت تھوڑا عرصہ رہے ہیں یا ہمیں معلوم نہیں کہ کتنا عرصہ رہے۔ حضرت حزقیل کا یہ جواب ادب کے طور پر تھا کہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کا اس سوال سے کیا منشا ہے۔ یعنی بات تو ظاہر ہے کچھ دیر ہی سویا ہوں۔ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بات کے علاوہ جو تیرے دل میں ہے ہم ایک اور بات بھی بتاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ تُو سو سال تک رہا ہے۔ یہاں بَلْ میں پہلے قول کی نفی نہیں کی گئی بلکہ ایک اور بات بیان کی گئی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۔ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۔ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۔ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۔ (الاعلیٰ: ۱۵ تا ۱۸) یعنی جو شخص پاک بنے گا وہ یقیناً کامیاب ہوگا بشرطیکہ اس نے اپنے ربّ کا نام لیا اور نماز پڑھتا رہا۔ مگر اے مخالفو! تم ورلی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت کہیں زیادہ بہتر اور دیرپا ہے۔ اس آیت میں بَلْ سے پہلے کی بات بھی درست ہے اور بعد کی بھی۔ اسی طرح اس آیت میں بَلْ کے لفظ سے حضرت حزقیل کے اس خیال کی کہ وہ دن یا دن کا کچھ حصہ اس حالت میں رہے تردید مدّ نظر نہیں بلکہ اس کے علاوہ ایک اور مضمون کی طرف ان کے ذہن کا انتقال کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک نقطۂ نگاہ سے دیکھو تو تم نے سو سال اس حالت میں گزارے ہیں۔ مگر چونکہ نبی کا قول بھی اپنی جگہ درست تھا اس لئے اس خیال سے کہ نبی خدا تعالیٰ کے قول کو مقدم رکھ کر اپنے

خیال کو غلط نہ قرار دے دے اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی فرما دیا کہ ہم تمہارے خیال کو رد نہیں کرتے وہ بھی درست ہے۔ چنانچہ دیکھو تمہارا کھانا اچھی حالت میں ہے سڑا نہیں اور تمہارا گدھا بھی تندرست اپنی جگہ پر کھڑا ہے جس سے ثابت ہوا کہ تمہارا خیال بھی کہ تم صرف چند گھنٹے اس حالت میں رہے ہوا پنی جگہ درست ہے۔ ورنہ جو سو سال تک واقعہ میں مرا رہا ہوا سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اپنا کھانا دیکھ وہ سڑا نہیں۔ اور پھر فرمایا کہ یہ رؤیا ہم نے اس لیے دکھائی ہے تا کہ ہم تجھے لوگوں کے لئے ایک نشان بنائیں۔ اب تو ان مُردہ ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم ان کو کس طرح کھڑا کرتے ہیں اور ان پر گوشت پوست چڑھاتے ہیں۔

اس کشف اور الہام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوشخبری دی کہ ایک سو سال تک یہ شہر آباد ہو جائے گا۔ چنانچہ ٹھیک سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس شہر کی ترقی اور آبادی کی صورت پیدا کر دی۔ یروشلم کی تباہی دو دفعہ ہوئی ہے ایک دفعہ ۵۹۷ قبل مسیح میں اور دوسری دفعہ یروشلم کی بغاوت پر ۵۸۶ قبل مسیح میں۔ اس جگہ سو سال دوسری تباہی سے ہی لئے جائیں گے کیونکہ شہر کو اسی میں برباد کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۵۱۹ قبل مسیح میں یروشلم کی دوبارہ بنیاد رکھی گئی اور تیس سال تک تعمیر جاری رہی جس کے نتیجہ میں ۴۸۹ قبل مسیح میں یروشلم صحیح طور پر آباد ہوا۔ پس درمیانی فاصلہ قریباً سو سال (۹۸ سال) کا ہی ثابت ہوتا ہے۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا ببلیکس بائیبل ڈکشنری زیر لفظ (Jerusalem

وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا کے الفاظ یہود کے اس قول کے مطابق استعمال کئے گئے ہیں جس کا حزقیل نبی کی کتاب میں بھی ذکر آتا ہے کہ

''ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی۔ ہم تو بالکل فنا ہو گئے''

(حزقیل باب ۳۷ آیت ۱۱)

اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ تم ایک بار پھر زندہ ہو گے اور پھر اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور عظمت حاصل کرو گے۔ غرض اس واقعہ کے متعلق بائیبل سے رؤیا بھی مل گیا۔ بنی اسرائیل کی ہڈیوں پر گوشت کا چڑھایا جانا بھی ثابت ہو گیا۔ اسی طرح حزقیل نبی کو پکڑ کر لے جانا بھی ثابت ہو گیا اور پھر سو سال کے بعد یروشلم کا دوبارہ آباد ہونا بھی تاریخ سے ثابت ہو گیا۔ حزقیل نبی کو پہلے تو صدمہ ہوا کہ یہ کیا ہو گیا ہے؟ مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ یہ ہمیشہ کی تباہی نہیں تو انہوں نے کہا اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ خدایا! اب میری تسلّی ہو گئی ہے۔ اور گو بظاہر ان حالات کا بدلنا ناممکن نظر آتا ہے مگر یہ بات یقیناً ہو کر رہے گی۔ اور خدا تعالیٰ دوبارہ اس شہر اور قوم کو ترقی عطا فرمائے گا۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ

اور (اس واقعہ کو بھی یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے کہا کہ اے میرے ربّ مجھے بتا کہ تو مُردے کس طرح زندہ کرتا ہے۔

لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ

فرمایا کہ کیا تُو ایمان نہیں لا چکا۔(ابراہیمؑ نے) کہا کیوں نہیں (ایمان تو بے شک حاصل ہو چکا ہے) لیکن اپنے

اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ

اطمینان قلب کی خاطر (میں نے یہ سوال کیا ہے)۔فرمایا۔اچھا تُو چار پرندے لے اور ان کو اپنے ساتھ سدھا

جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَ اعْلَمْ

لے۔پھر ہر ایک پہاڑ پر ان میں سے ایک (ایک) حصہ رکھ دے۔پھر انہیں بلا وہ تیری طرف تیزی کے ساتھ چلے

اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ ع

آئیں گے۔اور جان لے کہ اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

حل لغات۔صُرْھُنَّ صُرْ کے ساتھ جب اِلٰی کا صلہ آجائے تو اس کے معنے اپنی طرف مائل کر لینے کے ہوتے ہیں۔کاٹنے کے نہیں ہوتے۔ہاں جب یہ لفظ اِلٰی کے صلہ سے خالی ہو تو اس وقت اس کے معنے کاٹنے کے ہی ہوتے ہیں۔چنانچہ کہتے ہیں۔صَارَ الشَّیْءَ قَطَعَهٗ۔اسے کاٹ دیا۔پس صُرْھُنَّ اِلَیْكَ کے معنے ہیں۔ان کو اپنے ساتھ سِدھا لے۔(اقرب)

تفسیر۔فرماتا ہے تم اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا تھا۔کہ اے میرے ربّ! مجھے بتا کہ تُو مُردے کس طرح زندہ کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔کیا تو ایمان نہیں لا چکا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کے جواب میں بَلٰی کہا۔جس سے اس عقیدہ کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ مُردے زندہ کر سکتا ہے۔اور میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہ ایسا کر سکتا ہے گویا انہوں نے اس کے متعلق کسی شک کا اظہار نہیں کیا بلکہ اقرار کیا کہ خدا تعالیٰ یہ کام کر سکتا ہے اور مجھے اس پر کامل ایمان حاصل ہے۔

بَلٰی کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے پہلے خواہ نفی ہو یا اثبات اس سے مراد ''ہاں'' ہی ہوتی ہے۔ اگر اس جگہ نَعَمْ کا لفظ ہوتا تو اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے تھے کہ ہاں مجھے ایمان نہیں ہے۔ مگر اس جگہ بَلٰی کا لفظ رکھا گیا ہے۔ جس سے یہ شبہ دُور ہو گیا کیونکہ اس کے معنے ہر صورت میں اثبات ہی کے ہوتے ہیں۔

ایمان کے بعد لٰکِن کا لفظ رکھا گیا ہے۔ جو استدراک کے لئے آتا ہے یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ مجھے ایمان تو ہے کہ خدا تعالیٰ مردے زندہ کر سکتا ہے لیکن میں اس سے ایک زائد بات چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میرے دل کو بھی اطمینان حاصل ہو جائے کہ تو میری قوم کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ جیسے ایک شخص جو بیمار ہو اسے ایمان تو ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ بیماروں کو اچھا کر سکتا ہے۔ لیکن اطمینان نہیں ہو سکتا کہ اسے بھی اچھا کرے گا۔ یہ اطمینان خدا کے بتانے سے ہی ہو سکتا ہے۔ یا مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ بھوک کے بعد لوگ سیر ہو جایا کرتے ہیں مگر کیا اس سے ایک فاقہ زدہ کو یہ یقین ہو جائے گا کہ مجھے بھی کھانا مل جائے گا اور میں سیر ہو جاؤں گا؟ پس ایمان تو امر غیب کے متعلق ہوتا ہے جو انسان کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اور کسی چیز کے ہونے یا ہو سکنے کے متعلق اس کے یقین کامل کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اطمینان کا لفظ دو چیزوں کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک شک کے مقابلہ میں۔ دوسرے کرب و اضطراب کے مقابلہ میں۔ وہ اطمینان جو شک کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ وہ یہاں مراد نہیں۔ بلکہ وہی اطمینان مراد ہے۔ جو کرب اور اضطراب کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اثباتِ ایمان موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تھا کہ خدا تعالیٰ احیاء موتیٰ کر سکتا ہے مگر وہ اپنی قوم کے متعلق بھی یہ اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے کہ اس پر الٰہی فضل نازل ہو گا اور وہ بھی زندہ قوم بن جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تُو چار پرندے لے اور ان کو اپنے ساتھ سدھا لے۔ پھر ہر ایک پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک حصہ رکھ دے۔ پھر انہیں بُلا۔ وہ تیری طرف تیزی کے ساتھ چلے آئیں گے۔ اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور حکمت والا ہے۔

لوگ اس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ چار پرندے پکڑ کر ان کا قیمہ کر لے۔ اور ان کو اپنی طرف لے لے۔ لیکن یہ بالکل غلط اور محاورہ کے خلاف معنے ہیں۔ کیا کوئی شخص قیمہ کر کے اسے اپنی طرف بھی لیا کرتا ہے۔ پس یہ کوئی معنے نہیں کہ قیمہ کر کے اسے اپنی طرف لے لے۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ تو ان کو اپنے ساتھ سدھا لے۔

(مفردات و اقرب الموارد)

جُزْءًا کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ بتلاتا ہے کہ یہاں قیمہ کرنا ہی مراد ہے مگر یہ بھی غلط ہے۔ جُزْءٌ

کے معنے ایک پرندے کے ٹکڑے کے نہیں بلکہ چاروں پرندوں کا جزء مراد ہے جو ایک کا عدد ہے۔ اس کی مثال قرآن کریم کی اس آیت سے ملتی ہے کہ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ۔ (الحجر: ۴۴۔۴۵) یعنی جہنم سب کفار کے لئے مقررہ جگہ ہے۔ اس کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازہ کے لئے کفار کا ایک حصہ مقرر ہوگا۔ اس جگہ جُزْءٌ کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔ لیکن کوئی شخص یہ معنی نہیں کرتا کہ کفار کا قیمہ کر کے اس قیمہ کا تھوڑا تھوڑا حصہ سب دروازوں میں ڈال دیا جائے گا۔ بلکہ سب مفسرین متفق ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کچھ کافر ایک دروازہ سے لے جائے جائیں گے اور کچھ دوسرے سے اور کچھ تیسرے سے اور کچھ چوتھے سے (روح البیان زیر آیت الحجر ۴۴،۴۵)۔ پس سورہ حجر کی اس آیت نے بتلا دیا کہ جب جزء کا لفظ ایک جماعت پر بولا جائے تو اس سے اس جماعت کے افراد مراد ہوتے ہیں۔ اور انہی معنوں میں جزء کا لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے اور مراد ہر پرندہ کا جزء نہیں بلکہ چار کا جزء ہے۔ اور معنے یہ ہیں کہ ہر چوٹی پر ایک ایک پرندہ رکھ دے۔

یہ واقعہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ظاہری ہوتا تو اس پر بہت سے اعتراض پڑتے ہیں۔ اوّل یہ کہ احیاءِ موتی کے ساتھ پرندوں کے سدھانے کا کیا تعلق؟ دوم۔ چار پرندے لینے کے کیا معنے؟ کیا ایک سے یہ غرض پوری نہ ہوتی تھی؟ سوم پہاڑوں پر رکھنے کا کیا فائدہ کیا کسی اور جگہ رکھنے سے کام نہ چلتا تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ ظاہری کلام نہیں بلکہ مجازی کلام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ الٰہی احیاءِ موتی کا جو کام تو نے میرے سپرد کیا ہے اسے پورا کر کے دکھا۔ اور مجھے بتا کہ میری قوم میں زندگی کی روح کس طرح پیدا ہوگی جبکہ میں بڈھا ہوں۔ اور کام بہت اہم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے وعدہ کیا ہے تو یہ کام ہو کر رہے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ ہو کر تو ضرور رہے گا مگر میں اپنے اطمینان کے لئے پوچھتا ہوں کہ یہ مخالف حالات کس طرح بدلیں گے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو چار پرندے لے کر سدھا۔ اور ہر ایک کو پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو بلا۔ اور دیکھ کہ وہ کس طرح تیری طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ یعنی اپنی اولاد میں سے چار کی تربیت کر وہ تیری آواز پر لبیک کہتے ہوئے۔ اس احیاء کے کام کی تکمیل کریں گے۔ یہ چار روحانی پرندے حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت اسحاقؑ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسف علیہم السلام ہیں۔ ان میں سے دو کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے براہ راست تربیت کی اور دو کی بالواسطہ۔ پہاڑ پر رکھنے کے معنے بھی یہی تھے کہ ان کی نہایت اعلیٰ تربیت کر کیونکہ وہ بہت بڑے درجہ کے ہوں گے۔ گویا پہاڑ پر رکھنے میں ان کے رفیع الدرجات ہونے کی طرف

اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ بلندیوں کی چوٹیوں تک جا پہنچیں گے۔

اسی طرح چار پرندوں کو علیحدہ علیحدہ چار پہاڑوں پر رکھنے کے یہ معنے تھے کہ یہ احیاء چار علیحدہ علیحدہ وقتوں میں ہوگا۔غرض اس طرح احیاءِ قومی کا وہ نقشہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قریب زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا انہیں بتا دیا گیا۔اسی طرح بعد کے زمانہ کے لئے بھی اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی چار ترقیوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کیا تھا کہ آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تم کو میری طاقتوں پر ایمان نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ ایمان تو ہے وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۔ یہ زبان کا ایمان ہے، میں دیکھتا ہوں کہ آپ مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کرتے ہیں مگر دل کہتا ہے کہ یہ طاقت میری اولاد کی نسبت بھی استعمال ہو۔میں چاہتا ہوں کہ یہ نشان اپنے نفس میں بھی دیکھوں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری قوم چار دفعہ مردہ ہوگی اور ہم اسے چار دفعہ زندہ کریں گے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں۔ان کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز بلند ہوئی۔اور یہ مردہ زندہ ہوا۔پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کی آواز بلند ہوئی۔اور یہ مردہ زندہ ہوا۔پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعہ وہی آواز بلند ہوئی اور اس مردہ قوم کو زندگی ملی۔اور چوتھی بار حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ السلام کے ذریعہ ابراہیمی آواز پھیلی اور وہی مردہ زندہ ہوا۔چار دفعہ ابراہیمی نسل کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آوازیں دیں اور چاروں دفعہ وہ دوڑ کر جمع ہوگئی۔

پہلا پرندہ جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بلایا اور اطمینان قلب حاصل کیا وہ موسوی اُمّت تھی۔دوسرا پرندہ عیسوی اُمت تھی۔تیسرا پرندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جلالی ظہور کی حامل اور مظہر محمدی جماعت تھی۔اور چوتھا پرندہ آپؐ کے جمالی ظہور کی مظہر جماعتِ احمدیہ ہے۔جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب کو راحت پہنچائی اور آپ نے کہا کہ واقعی میرا خدا زندہ کرنے والا ہے بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ کا بھی یہی مطلب تھا کہ حضور زبان تو اقرار کرتی ہے۔اور میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ آپ مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔اس کا مجھے کس طرح انکار ہوسکتا ہے۔لیکن اگر میری اولاد ہدایت نہ پائے تو مجھے اطمینان قلب حاصل نہیں ہوسکتا۔پس اطمینان قلب کے لئے میں نشان مانگتا ہوں۔میری عقل وفکر میرے ہوش وحواس اور میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ آپ مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔مگر دل کہتا ہے کہ میں خود کیا تعریف کروں جب تک یہ پتہ نہ لگے کہ میری اولاد میں بھی یہ نشان ظاہر ہوگا۔خدا تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ تمہاری اولاد کو چار دفعہ زندہ کیا جائے گا۔اور چار بار اُس پر خاص فضل

نازل ہوگا۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت۔ دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت۔ تیسری دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت اور چوتھی دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد پر خدا تعالیٰ نے اپنا خاص فضل نازل کیا اور انہیں روحانی لحاظ سے زندہ کر دیا غرض اس میں قریب اور بعید دونوں زمانوں کیلئے پیشگوئی کی گئی تھی۔ جو اپنے اپنے وقت میں بڑی شان سے پوری ہوئی۔ اور خدا تعالیٰ کا عزیز اور حکیم ہونا ظاہر ہو گیا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ

جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ (تعالیٰ) کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے اس فعل) کی حالت اس دانہ کی حالت کے

حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ

مشابہ ہے جو سات بالیں اگائے (اور) ہر بالی میں سو دانہ ہو اور اللہ جس کے

حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۲﴾

لئے چاہتا ہے (اس سے بھی) بڑھا (بڑھا کر) دیتا ہے۔ اور اللہ وسعت دینے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ يُضَاعِفُ کلّیاتِ ابی البقاء میں لکھا ہے کہ اَقَلُّ الضِّعْفِ مَحْصُوْرٌ وَّ هُوَ مِثْلُ الْوَاحِدِ وَ اَكْثَرُهٗ غَيْرُ مَحْصُوْرٍ یعنی ضعف کی اقلّ ترین تعداد دوگنا ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ جتنی بھی ہو سب ضعف میں شمار ہوتی ہے۔

تفسیر۔ سابقہ رکوع میں اِحیاءِ قومی کی تین مثالیں دی گئی ہیں۔ اب اس رکوع میں اللہ تعالیٰ ایک چوتھی تمثیل بیان فرماتا ہے اور بتاتا ہے کہ اگر تم دینی کاموں کے لئے اپنے اموال خرچ کرو گے تو جس طرح ایک دانہ سے اللہ تعالیٰ سات سو دانے پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ تمہارے اموال کو بھی بڑھائے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ترقی عطا فرمائے گا۔ جس کی طرف وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ میں اشارہ ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بیشک بڑی قربانیاں کی تھیں۔ مگر خدا تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کا پہلا خلیفہ بنا کر انہیں جس عظیم الشان انعام سے نوازا اس کے مقابلہ میں ان کی قربانیاں بھلا کیا حیثیت رکھتی تھیں! اسی طرح حضرت عمرؓ نے بہت کچھ دیا مگر انہوں نے کتنا بڑا

انعام پایا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی جو کچھ خرچ کیا اس سے لاکھوں گنا زیادہ انہوں نے اسی دنیا میں پالیا۔ اسی طرح ہم فرداً فرداً صحابہؓ کا حال دیکھتے ہیں تو وہاں بھی خدا تعالیٰ کا یہی سلوک نظر آتا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو ہی دیکھ لو۔ جب وہ فوت ہوئے تو ان کے پاس تین کروڑ روپیہ جمع تھا (اسد الغابۃ عبدالرحمن بن عوف)۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی میں وہ لاکھوں روپیہ خیرات کرتے رہے۔ اسی طرح صحابہؓ نے اپنے وطن کو چھوڑا تو ان کو بہتر وطن ملے۔ بہن بھائی چھوڑے تو ان کو بہتر بہن بھائی ملے۔ اپنے ماں باپ کو چھوڑا۔ تو ماں باپ سے بہتر محبت کرنے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی کرنے والا کبھی بھی جزائے نیک سے محروم نہیں رہا۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ کہہ کر بتایا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام دینے میں بخل تو تب ہو جبکہ خدا تعالیٰ کے ہاں کسی چیز کی کمی ہو۔ مگر وہ تو بڑی وسعت والا اور بڑی فراخی والا ہے اور پھر وہ علیم بھی ہے۔ جانتا ہے کہ وہ شخص کس قدر انعام کا مستحق ہے۔ اگر کوئی شخص کروڑوں گنا انعام کا بھی مستحق ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اسے یہ انعام دینے کی قدرت رکھتا ہے دنیا میں ہم روزانہ یہ نظارہ دیکھتے ہیں کہ زمیندار زمین میں ایک دانہ ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سات سو دانے بنا کر واپس دیتا ہے۔ پھر جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرے گا کیسے ممکن ہے کہ اس کا خرچ کیا ہوا مال ضائع ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کئے ہوئے مال کا کم از کم سات سو گنا بدلہ ضرور ملتا ہے۔ اس سے زیادہ کی کوئی حد بندی نہیں۔ اگر انتہائی حد مقرر کر دی جاتی تو اللہ تعالیٰ کی ذات کو محدود ماننا پڑتا۔ جو خدا تعالیٰ میں ایک نقص ہوتا اسی لئے فرمایا کہ تم خدا کی راہ میں ایک دانہ خرچ کرو گے تو کم از کم سات سو گنا بدلہ ملے گا۔ اور زیادہ کی کوئی انتہا نہیں اور نہ اس کے انواع کی کوئی انتہا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو انجیل میں صرف اتنا فرمایا تھا کہ ’’اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔‘‘ (متی باب ۶ آیت ۲۰) لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے خزانہ میں اپنا مال جمع کرو گے تو یہی نہیں کہ اسے کوئی چرائے گا نہیں بلکہ تمہیں کم از کم ایک کے بدلہ میں سات سو انعام ملیں گے اور اس سے زیادہ کی کوئی حد بندی نہیں۔ پھر حضرت مسیحؑ کہتے ہیں۔ وہاں غلہ کو کوئی کیڑا نہیں کھا سکتا۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ صرف کیڑے سے ہی محفوظ نہیں رہتا بلکہ ایک سے سات سو گنا ہو کر واپس ملتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کسی انسان کی مدد کا محتاج نہیں مگر وہ اپنے بندوں پر رحم کرتے ہوئے اگر کسی کام کے کرنے کا انہیں موقع دیتا ہے تو اس لئے کہ وہ ان کے مدارج کو بلند کرنا چاہتا ہے چنانچہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی کو دنیا میں بھیجتا ہے تو اسے نئے سرے سے ایک جماعت قائم کرنی پڑتی ہے۔ مگر اس کی ابتداء ایسی ہوتی ہے کہ دنیا اسے دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں کر سکتی کہ وہ کامیاب ہو جائے گا لیکن خدا تعالیٰ اس

کے ذریعے دنیا کے نظام کو بدل دیتا ہے۔ اس وقت دنیا کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک زندہ خدا موجود ہے جس کے آگے کوئی بات ان ہونی نہیں۔ ایسے انبیاء کے زمانہ میں ان کی قوموں اور امتوں کو موقعہ دیا جاتا ہے کہ وہ دین کی خدمت کریں۔ چونکہ وہ وقت ایک نئی دنیا کی تعمیر کا ہوتا ہے اس لئے لوگوں کو قربانیوں کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ اور وہی وقت ثواب کے حصول کا ہوتا ہے۔

اوپر کے بیان کردہ مفہوم کے علاوہ اس آیت میں غلّہ کی زیادتی کے امکانات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ بعض حالات میں یہ ممکن ہے کہ ایک دانہ سات بالیں نکالے اور ہر بال میں ایک ایک سودانہ ہو۔ یعنی ایک دانہ سات سو گنا ہو جائے۔ یا ایک من بیج سے سات سو من گندم پیدا ہو۔ اور پھر اسی پر بس نہیں اللہ تعالیٰ چاہے تو اس سے بھی زیادہ بڑھا دے۔ اس اصول کے مطابق اگر دیکھا جائے تو چونکہ ہمارے ملک میں عام طور پر فی ایکڑ تیس سیر بیج ڈالا جاتا ہے۔ اگر ایک دانہ سے سات سو دانہ تک کی پیداوار ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ایک ایکڑ سے ۲۱۰۰۰ سیر اناج پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہ ۵۲۵ من بنتے ہیں۔ گویا قرآنی اصول کے مطابق ۵۲۵ من فی ایکڑ پیداوار ہو سکتی ہے۔ بلکہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے بھی بڑھا سکتا ہے۔

اس وقت لوگ اوسطاً پانچ من فی ایکڑ پیداوار پر گذارہ کر رہے ہیں۔ اگر یہ پیداوار بڑھ کر سوا پانچ سو من فی ایکڑ ہو جائے اور زیادتی کا جو وعدہ ہے وہ نہ بھی پورا ہو تب بھی دنیا میں اتنی گندم ہو سکتی ہے۔ جو موجودہ آبادی سے کئی گنا زیادہ آبادی کے لئے بھی کافی ہو۔ پھر ابھی کئی غیر آباد علاقے پڑے ہیں انہیں آباد کیا جائے تو پیداوار میں اور بھی زیادتی ممکن ہے۔ مثلاً افریقہ کے بعض علاقے ہیں جو ابھی غیر آباد ہیں۔ آسٹریلیا اور کینیڈا کے علاقوں میں بھی ابھی بہت کم آبادی ہے۔ اسی طرح روس کے بعض حصوں میں بھی زمینیں خالی پڑی ہیں۔ اگر ان علاقوں کی طرف توجہ کی جائے اور صحیح طور پر زراعت کی جائے اور سائینس کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے تو دنیا میں پیداوار کے لحاظ سے ایک عظیم الشان تغیر پیدا ہو سکتا ہے اور آبادی میں بھی کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ

جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ کرنے کے بعد

مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ

نہ کسی رنگ میں احسان جتاتے ہیں اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں ان کے ربّ کے پاس ان (کے اعمال) کا بدلہ

وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۶۳﴾

(محفوظ) ہے۔ اور نہ تو انہیں کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

حلّ لُغات ۔ اَلْمَنُّ کے معنے ہیں مَنَّ عَلٰی مَا صَنَعَ کسی پر احسان کر کے اُسے جتلانا۔ مثلاً کہتے ہیں۔ اَعْطَیْتُكَ كَذَا وَ فَعَلْتُ مَعَكَ كَذَا ۔ میں نے فلاں وقت تیرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا اور تجھے یہ کچھ دیا تھا۔ عربوں کا محاورہ ہے کہ اَلْمَنُّ اَخُو الْمَنِّ ۔ کہ احسان جتلانا کاٹ ڈالنے کے برابر ہے۔ مَنَّ کے معنے کاٹنے کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ دوسرا مَنَّ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (لسان العرب)

اَذًی تکلیف پہنچانا۔ گندی بات۔ گند۔ حدیث میں آتا ہے۔ اَمِیْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰی ۔ یعنی جب بچہ سات دن کا ہوجائے۔ تو وہ نجاست وغیرہ جو وہ اندر سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور بال اس سے دُور کردو۔ (لسان العرب)

تفسیر ۔ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًی میں بتایا کہ خدا تعالیٰ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے بعد تمہاری یہ کیفیت نہیں ہونی چاہیے کہ تم میں تکبر کے خیالات پیدا ہوجائیں اور تم یہ کہنا شروع کردو کہ ہم نے تو یہ کچھ دیا تھا۔ یوں مال قربان کیا تھا۔ یوں خدمتِ دین کی تھی۔ کیونکہ ایسا کرنا تمہاری نیکی کو ضائع کردے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں اَعراب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۔ (الحجرات: ۱۸) اے محمد رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ اپنے اسلام قبول کرنے کا بھی تجھ پر احسان جتاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تو ان لوگوں سے صاف صاف کہہ دے کہ لَا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ۔ تم مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتاؤ۔ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ ۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کا راہ دکھایا اور ایک سچے مذہب کو قبول کرنے کی توفیق بخشی۔ اسی طرح مالی قربانیوں کے بعد دوسروں پر احسان جتانا سخت نادانی ہے۔ کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے خدا کے لئے کام نہیں کیا تھا بلکہ بندوں کو ممنونِ احسان کرنے کے لئے کیا تھا اور یہ چیز اسے ثواب سے محروم کردیتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی ایک مقام پر اپنی جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

”یہ مت خیال کرو کہ تم کوئی حصہ مال کا دے کر یا کسی اور رنگ سے کوئی خدمت بجا لاکر خدا تعالیٰ اور اس کے فرستادہ پر کچھ احسان کرتے ہو۔ بلکہ یہ اس کا احسان ہے کہ تمہیں اس خدمت کے لئے بلاتا ہے۔...... پس ایسا نہ ہو کہ تم دل میں تکبر کرو۔ اور یا یہ خیال کرو کہ ہم خدمت مالی یا

کسی قسم کی خدمت کرتے ہیں۔ میں بار بار تمہیں کہتا ہوں کہ خدا تمہاری خدمتوں کا ذرا محتاج نہیں ہاں تم پر یہ اس کا فضل ہے کہ تم کو خدمت کا موقعہ دیتا ہے......

اگر تم اس قدر خدمت بجالاؤ کہ اپنی غیر منقولہ جائدادوں کو اس راہ میں بیچ دو پھر بھی ادب سے دُور ہوگا کہ تم خیال کرو کہ ہم نے کوئی خدمت کی ہے...... یہ تمام خیالات ادب سے دُور ہیں اور جس قدر بے ادب جلد تر ہلاک ہو جاتا ہے ایسا جلد کوئی ہلاک نہیں ہوتا۔‘‘

(تبلیغ رسالت جلد دہم صفحہ ۵۵۔۵۶)

پھر اَذًی کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے کہ انسان کسی سے کوئی نیک سلوک کر کے اُسے اپنا غلام سمجھ لے اور پھر اس سے مستقل طور پر فائدہ اٹھانا شروع کر دے۔ یا چندہ دینے کے بعد کہے کہ میں نے تو اتنا چندہ دیا تھا۔ اب مجھے بھی مدد دی جائے اور میری مشکلات کو دُور کیا جائے۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ میں یہ خوشخبری دی کہ ایسے لوگ جو خالصۃً لوجہ اللہ قربانیاں کریں گے وہ اپنے اس اعلیٰ کردار کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی خاص حفاظت میں آجائیں گے اور انہیں اپنے ماضی کی طرف سے بھی سکون قلب عطا کیا جائے گا اور اُن کا مستقبل بھی نہایت شاندار ہوگا۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ

اچھی بات (کہنا) اور (قصور) معاف کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے ایذارسانی

اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۴﴾

(شروع) ہو (جائے) اور اللہ بے نیاز (اور) بردبار ہے۔

حلّ لُغات۔ **قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ** کے معنے ہیں کوئی بھلائی کی بات۔ مثلاً سائل کو نرمی سے ٹلا دیا جائے یا یہ کہہ دیا جائے کہ ہمارے پاس اس وقت کچھ نہیں۔

اَمر بِالْمَعْرُوْفِ کوئی نیکی کی بات کہہ دینا۔ (اقرب)

مَغْفِرَةٌ پردہ ڈال دینا۔ کسی کا گناہ معاف کر دینا۔ کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس سے درگذر کرنا۔ (اقرب)

تفسیر ۔اس نصیحت کے بعد کہ خواہ کوئی دین کے لئے چندہ دے یا ان لوگوں کے لئے مالی قربانی کرے جو دین کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے اور ہجرت کر کے مرکز میں آجاتے ہیں یا غرباء کی اعانت کے لئے مال خرچ کرے۔اسے یہ نہیں چاہیے کہ وہ انہیں طعنہ دے کہ تم ہمارے چندوں پر پلتے ہو۔اور اس طرح ان کو اذیت پہنچانے کا موجب بنے یا یہ کہے کہ ہم نے تم سے فلاں وقت یہ سلوک کیا تھا۔اور ان پر احسان جتانے لگ جائے۔ اب بتاتا ہے کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ انسان اپنے منہ سے کوئی کلمۂ خیر ہی کہہ دیا کرے۔مثلاً کوئی سائل آیا تو اس سے کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ضرورت کو پورا کرے اور آپ کے لئے اپنے فضل کے دروازے کھولے۔اس طرح نرمی اور محبت کے ساتھ سائل کو ٹلا دے۔اور اس کے ساتھ پوری غمخواری اور اظہار ہمدردی کرے۔

اور مَغْفِرَت کا لفظ استعمال کر کے اس طرف توجہ دلائی کہ تم سے اگر کوئی شخص مدد مانگتا ہے۔ یا اپنی کوئی حاجت تمہارے سامنے پیش کرتا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ تم پردہ پوشی سے کام لو۔ یہ نہ ہو کہ جگہ جگہ اس کی مالی کمزوری اور احتیاج کا ذکر کرتے پھرو۔اسی طرح اس آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ امر بالمعروف یا عبادتِ لسانی یا دعا کر دینا اور لوگوں کے گناہ معاف کر دینا اس صدقہ سے زیادہ بہتر ہیں جس کے بعد ایذا رسانی کا سلسلہ شروع ہو جائے۔یعنی ایسی نیکیاں بجالانا جو جسمانی یا عقلی ہیں تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ تم ایصالِ خیر کی طرف قدم بڑھاؤ مگر کر نہ سکو۔

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ میں اس طرف اشارہ کیا کہ اگر روپیہ دے کر تم مَنّ اور اَذًی کے بغیر نہیں رہ سکتے تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے۔اسے تمہارے روپے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو کھڑا کر دے گا جو تم سے بہتر خدمت دین کرنے والے ہوں گے۔اور حَلِيْمٌ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ گو وہ تمہاری خدمتوں سے بے نیاز ہے مگر اس کے حلم نے تقاضا کیا کہ وہ تم پر رحم کرے اور تمہیں ہلاکت سے بچائے چنانچہ اس نے ان احکام کے ذریعے تمہاری جنت کو تمہارے قریب کر دیا ہے۔اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم چاہو تو اس کی صفت غنا کے ماتحت آجاؤ اور چاہو تو اس کی صفتِ حلیم سے فائدہ اٹھاؤ۔اور ہر قسم کی نیکیاں محض خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے کرو۔کوئی دنیوی منفعت اپنے سامنے نہ رکھو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ

اے ایمان دارو! تم اپنے صدقات کو احسان جتانے اور

الْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ

تکلیف دینے (کے فعل) سے اس شخص کی طرح ضائع نہ کرلو جو لوگوں کے دکھانے کے لئے مال خرچ کرتا ہے۔ اور

بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ

اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا کیونکہ اس کی حالت تو اس پتھر کی حالت کے مشابہ ہے جس پر کچھ مٹی (پڑی

فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ

ہوئی) ہو اور اس پر تیز بارش ہو۔ اور وہ اسے (مٹی دھو کر پھر) صاف پتھر (کا پتھر) کر دے۔ یہ (ایسے لوگ ہیں کہ)

مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۵﴾

جو کچھ کماتے ہیں اس کا کوئی حصہ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا اور اللہ اس قسم کے کافروں کو (کامیابی کی) راہ نہیں دکھاتا۔

حلّ لُغات۔ صَفْوَانٌ کے معنے ہیں اَلصَّخْرُ الْاَمْلَسُ۔ چکنا پتھر۔ (اقرب)

صَلْدًا اقرب الموارد میں لکھا ہے کہ مَالَا يُنْبِتُ شَيْئًا مِنَ الْحِجَارَةِ وَمِنَ الْاَرْضِيْنَ يُقَالُ حَجَرٌ صَلْدٌ وَ اَرْضٌ صَلْدٌ۔ یعنی جس پتھر یا زمین میں سے کچھ نہ اُگے اسے حَجَرٌ صَلْدٌ یا اَرْضٌ صَلْدٌ کہتے ہیں۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اے مومنو! مَنّ اور اَذٰی کے ذریعہ اپنے صدقات کو ضائع مت کرو۔ صدقات کے ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے نتائج کو ضائع نہ کرو۔

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ سے معلوم ہوتا ہے کہ ریا کے لئے کوئی کام کرنا خواہ کتنا ہی اچھا ہو بہت بُرا ہوتا ہے۔ مَنّ اور اَذٰی والا صدقہ تو احسان جتانے یا تکلیف پہنچانے کے نتیجہ میں باطل ہوتا ہے مگر ریا والے کا صدقہ تو ریا کا خیال آتے ہی باطل ہو جاتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَنّ وَ اَذٰی والے کا صدقہ بھی ریاء الناس والے کی طرح ضائع چلا جائے گا کیونکہ گو اس شخص کے دیتے وقت ریا مدنظر نہ تھی مگر اس کے دل کے گوشوں

میں ضرور مخفی تھی ورنہ وہ مَنّ وَ اَذًی سے کیوں کام لیتا۔

اس آیت میں ریا کی ممانعت کے ساتھ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ کے الفاظ اس لئے بڑھائے گئے ہیں کہ بعض دفعہ ایمان باللہ والیوم الاٰخر کے ماتحت دوسروں کی تحریص کے لئے لوگوں کو دکھا کر اپنا مال خرچ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرة: ۲۷۵) یعنی جو لوگ رات اور دن پوشیدہ بھی اور ظاہر بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے رہتے ہیں ان کے ربّ کے پاس ان کا اجر محفوظ ہے۔ اور انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ بعض دفعہ دوسروں کو دکھانے کے لئے کام کرنا بھی موجب ثواب ہوتا ہے جبکہ نیت یہ ہو کہ دوسروں کو نیکی کی تحریک ہو۔ لیکن اگر یہ نیت نہ ہو بلکہ ریاء فخر و مباہات کے لئے ہو تو ایسا فعل اعمال نیک کو اسی طرح ضائع کر دیتا ہے جس طرح ایک پتھر جس پر مٹی جمی ہوئی ہو جب اس پر بارش پڑے تو بجائے اس کے کہ اس پر دانہ اُگے بارش مٹی کو بہا کر لے جاتی ہے اور دانہ اُگنے کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔

اصل بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص اعلیٰ درجہ کا کام کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو بھی اس کا علم ہو مگر کوئی تو اس لئے اس کا اظہار کرتا ہے کہ دوسروں پر فخر کرے اور کوئی اس نیت سے اظہار کرتا ہے کہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ دیکھو! قرآن کریم ادھر تو کہتا ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح مت بنو جو ریا کے طور پر مال خرچ کرتے ہیں۔ مگر ادھر کہتا ہے۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحی: ۱۲) یعنی تمہیں خدا تعالیٰ نے جو نعمتیں بخشی ہیں ان کا لوگوں میں اظہار کرو۔ اب یہ اظہار ریا نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ لوگ بھی ان انعامات کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ پس ہر قسم کا اظہار ریا نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض حالات میں نیکیوں کا اظہار ریا ہوتا ہے اور بعض دوسرے حالات میں ریاء نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ایک شخص اچھے کپڑے پہن کر اس لئے لوگوں میں جاتا ہے کہ وہ اسے بڑا مالدار سمجھیں تو یہ ریا ہے۔ لیکن اگر وہی شخص عید کے دن یا جمعہ کے دن عمدہ لباس پہن کر اس لئے نکلے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کی تعمیل ہو تو یہ ریا نہیں ہوگا۔ یا مثلاً کہیں بخار پھیلا ہوا ہو اور کسی کے پاس کونین ہو اور وہ لوگوں کو بتائے کہ میرے پاس کونین ہے تو یہ ریا نہیں ہوگا اور کوئی نہیں کہے گا کہ یہ اپنی عقلمندی جتا رہا ہے کہ میں نے پہلے سے ہی کونین کا انتظام کر رکھا تھا بلکہ ہر شخص اس کے اس اظہار سے خوش ہوگا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ پس ریاء الناس اسی صورت میں گناہ ہے۔ جب ایسے شخص کا اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہ ہو اور اس سے اجر لینا

مقصود نہ ہو بلکہ محض لوگوں کو خوش کرنا مدّنظر ہو ورنہ ایمان باللّٰہ والیوم الاٰخر کے ساتھ لوگوں کو محض نیکی کی تحریص و ترغیب دلانے کے لئے اپنی بعض قربانیوں کا اظہار منع نہیں بلکہ ایک قابلِ تعریف فعل ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرۃ:۲۷۲) یعنی اگر تم علی الاعلان صدقے دو تو یہ بھی بہت اچھا طریق ہے اور اگر تم اپنے صدقات چھپا کر غریبوں کو دو تو یہ تمہارے نفس کے لئے زیادہ اچھا ہے۔

دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ریاکار کو خدا تعالیٰ اور یوم آخر پر ایمان نہیں ہوتا کیونکہ احسان وہی جتلاتا ہے جسے خدا تعالیٰ پر ایمان نہ ہو۔ اگر وہ اس نعمت کو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی سمجھے اور اسی سے اجر کی امید رکھے تو لوگوں کی واہ واہ کا وہ خواہش مند ہی کیوں ہو؟ اسی طرح اگر اسے یقین ہو کہ آخرت میں اجر ملے گا تو وہ کیوں اسی مسکین سے خدمت لے کر اپنا اجر پورا کرنا چاہے جس کی اس نے تھوڑی بہت مدد کی ہے؟ یہی حکمت ہے جس کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے منّ اور اذٰی کے مقابلہ میں ریاء الناس اور لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ رکھا ہے۔ کیونکہ مَنّ ریاء الناس کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور اَذٰی سے مراد اس پر بوجھ رکھنا ہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کو اپنے صدقہ اور خیرات کی خدا سے جزا ملنے کی امید نہ ہو اور یوم آخر پر یقین نہ ہو۔

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ۔ اب اللہ تعالیٰ ایک اور تمثیل بیان فرماتا ہے کہ خرچ کرنے کو تو ایک ریاکار بھی اپنا مال خرچ کرتا ہے مگر اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی پتھر ہو۔ اس پر کچھ مٹی پڑی ہوئی ہو اور اوپر سے زور کی بارش برس جائے تو بجائے دانہ اُگنے کے وہ دُھل کر صاف ہو جائے گا۔ یہی اس شخص کا حال ہے کہ جب تک صدقہ نہیں دیا تھا تب تک تو اس کی کسی قدر اچھی حالت تھی لیکن صدقہ دے کر اور پھر مَنّ وَ اَذٰی سے کام لے کر ریا ریا کر کے ایک خطرناک بدی میں مبتلا ہو گیا اور یہ اچھا فعل بجائے مفید ہونے کے مضر ہو گیا۔ گویا تھوڑی بہت جو فصل اُگنے کی اُمید تھی وہ بھی جاتی رہی۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ

اور جو لوگ اپنے مال اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور اپنے آپ کو مضبوط کرنے

تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ

کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کے (خرچ کی) حالت اس باغ کی حالت کے مشابہ ہے جو اونچی جگہ پر ہو

فَاٰتَتۡ اُكُلَهَا ضِعۡفَيۡنِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ

اوراس پر تیز بارش ہوئی ہو۔جس (کی وجہ) سے وہ اپنا پھل دو چند لایا ہو۔اور(اس کی یہ کیفیت ہو کہ) اگر اس پر

اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۶۶﴾

زور کی بارش نہ پڑے تو تھوڑی سی بارش ہی (اس کے لئے کافی ہو جائے) اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

حل لغات۔ اِبۡتِغَآءَ یہ حال ہے اور اس کے معنے ہیں ''چاہتے ہوئے''۔لیکن یہ مفعول لہٗ بھی ہوسکتا ہے۔اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی چاہنے کے لئے۔(اقرب)

تَثۡبِيۡتًا یہ بھی حال ہے۔اس کے معنے ہیں اپنی جانوں کو مضبوط کرتے ہوئے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مِنۡ کے معنے ل کے ہوں۔چنانچہ کہتے ہیں۔فَعَلۡتُ ذَالِكَ كَسۡرًا مِّنۡ شَهۡوَتِیۡ یعنی میں نے اپنی شہوت توڑنے کے لئے فلاں کام کیا۔اسی طرح یہاں مِنۡ کے معنے ہیں کہ اپنے نفسوں کی ثابت قدمی کے لئے۔

تثبیت کے ایک معنے ہیں کسی چیز کو گاڑ دینا۔نفس کو گاڑ دینے کے معنے یہ ہوں گے کہ جس بات پر اسے قائم کریں اس پر وہ مضبوط ہو جائے۔اس میں پختگی پیدا ہو جائے۔استقلال اور مردانگی آجائے۔(اقرب)

رَبۡوَةٌ مَا ارۡتَفَعَ مِنَ الۡاَرۡضِ۔زمین کا وہ حصہ جو بلند ہو۔(اقرب)

وَابِلٌ اَلۡوَابِلُ اَلۡمَطَرُ الشَّدِيۡدُ وَالضَّخِيۡمُ الۡقَطۡرِ۔موٹے موٹے قطرات والی سخت زور کی بارش۔

اٰتَتۡ (۱) دیئے (۲) لائے۔(اقرب)

ضِعۡفَيۡنِ (۱) بڑھا چڑھا کر (۲) دوہرے دوہرے کر کے۔بعض جگہ کسی اسم کے دُہرانے کی بجائے اسے تثنیہ کر دیتے ہیں۔اصل میں ضِعۡفًا وَضِعۡفًا تھا اس کی بجائے ضِعۡفَيۡنِ کر دیا۔(اقرب)

اَلطَّلُّ اَضۡعَفُ الۡمَطَرِ کمزور ہلکی بارش اَلنَّدٰی۔شبنم۔اوس۔(اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔وہ لوگ جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ ہو اور وہ اونچی جگہ پر ہو۔اس جگہ رَبۡوَة کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ اونچی جگہ ہمیشہ سیلاب سے محفوظ رہتی ہے۔جب بارش ہوتی ہے تو نشیب زمین میں پانی ٹھہر جاتا ہے جس سے کھیتوں کو نقصان پہنچتا ہے مگر اونچی جگہ محفوظ رہتی ہے۔ایسی جگہ پر تیز بارش ہو تو کھیتی بہت پھل

دیتی ہے۔لیکن اگر زیادہ بارش نہ ہوتب بھی تھوڑی بارش سے ہی پھل پیدا ہو جاتا ہے اور وہی اس کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔اس تمثیل میں بتایا کہ سچے مومن کا دل ایک باغ کی طرح ہوتا ہے جس میں نیک اعمال کے ہرے بھرے پودے کھڑے ہوتے ہیں۔ جب وہ صدقہ وخیرات کرتا ہے تو خواہ وہ صدقہ بارش کی طرح نہ ہو بلکہ معمولی شبنم کی طرح ہو تب بھی وہ اس نیکی کے بابرکت نتائج حاصل کر لیتا ہے۔ چونکہ اس قسم کے صدقات دینے والوں میں اکثر غرباء ہوتے ہیں۔ان کو خیال ہوسکتا تھا کہ ہمارے صدقے وابل کہاں کہلا سکتے ہیں؟ اس لئے فرمایا کہ وابلؔ نہیں تو طلؔ بھی اس کھیتی کو بڑھادے گی۔ گویا امیر آدمی کے صدقہ کو وابلؔ اور غریب آدمی کے صدقہ کو لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ (التوبۃ:۷۹) کے ماتحت طلؔ قرار دیا ہے۔مگر چونکہ ان کے دل میں اخلاص اور تقویٰ ہوتا ہے اس لئے فرمایا کہ وہ جو کچھ خرچ کریں گے اس سے بھی ان کی کشتِ عمل خوب ہری بھری ہو جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جزا دل کے اخلاص پر مبنی ہوتی ہے نہ کہ مال کی مقدار اور کمیت پر۔صحابہ کرامؓ میں دونوں قسم کے لوگ موجود تھے۔ ایک غربت کی وجہ سے تھوڑا خرچ کرنے والے۔ اور دوسرے بہت خرچ کرنے والے۔ جو لوگ تھوڑا خرچ کرنے والے تھے وہ کہہ سکتے تھے کہ ہماری قربانیاں تو وابل نہیں کہلاسکتیں۔اس لئے ان کی خاطر فرمایا کہ طل ہی سہی۔وہ تمہیں وابل جیسا فائدہ ہی دے دے گی۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عمل کی اصل حقیقت دیکھتا ہے اس کی ظاہری شکل نہیں دیکھتا۔اس لئے تھوڑا دینے والا گو دوسرے کے مقابلہ میں کم دیتا ہے مگر چونکہ اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ دے دیتا ہے اس لئے اس کو اس طلؔ سے ہی وابل والا فائدہ پہنچ جاتا ہے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انفاق فی سبیل اللہ کی دو اغراض بیان فرمائی ہیں۔اوّل ابتغاء مرضات اللہ دوم تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول اور قوم کی مضبوطی۔ کیونکہ صدقات کے نتیجہ میں غرباء کو ترقی کے مواقع میسر آجاتے ہیں اور وہ بھی اپنی قوم کا ایک مفید جزو بن جاتے ہیں۔جس قوم کے افراد گرے ہوئے ہوں وہ قوم بھی یقینی طور پر مضبوط نہیں ہوسکتی کیونکہ گرے ہوئے افراد اس کے لئے بوجھ بن جاتے ہیں اور وہ ترقی کی طرف اپنا قدم بڑھانے سے قاصر رہتی ہے۔اسی لئے یورپین قومیں جن کا خدا تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں وہ بھی محض اس لئے صدقہ وخیرات کرتی رہتی ہیں کہ قوم کے غرباء کی ترقی سے خود قوم بڑھتی اور ترقی کرتی ہے۔غرض صدقہ کی اسلام نے دو اغراض بتائی ہیں۔اوّل اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول جو سب سے بڑی اور حقیقی غرض ہے۔دوم قوم کی مضبوطی۔ کیونکہ غرباء کی مدد درحقیقت اپنی مدد ہوتی ہے۔

دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہیں کہ جب مومن کمزور اور بے سہارا لوگوں کی امداد کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد کرتا اور ان کی مضبوطی اور ترقی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ اسی نکتہ کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اشارہ کرتی ہے کہ جو شخص اپنے مومن بھائی کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کے مشکل اوقات میں اس کی تائید فرماتا ہے۔ (مسلم کتاب البر و الصلة و الادب۔ باب تحریم الظلم)

(۳) پھر روحانی طور اس انفاق کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے وہ آہستہ آہستہ دین میں مضبوط ہوتا جاتا ہے اسی وجہ سے میں نے اپنی جماعت کے لوگوں کو بارہا کہا ہے کہ جو شخص دینی لحاظ سے کمزور ہو وہ اگر اور نیکیوں میں حصہ نہ لے سکے تو اس سے چندہ ضرور لیا جائے کیونکہ جب وہ مال خرچ کرے گا تو اس سے اس کو ایمانی طاقت حاصل ہوگی اور اس کی جرأت اور دلیری بڑھ جائے گی اور وہ دوسری نیکیوں میں بھی حصہ لینے لگ جائے گا۔ یہ معنے اس صورت میں ہوں گے جبکہ تَثْبِيْتًا کو حال بنایا جائے۔ اگر اسے مفعول لِاَجْلِہٖ قرار دیں تو پھر پہلے دو معنی ہی ہوں گے۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ

کیا تم میں سے کوئی شخص چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ

جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ (اور) اسے اس میں سے ہر قسم کے پھل ملتے (رہتے) ہوں۔

اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ

اور اسے بڑھاپے نے بھی آ پکڑا ہو۔ اور اس کے چھوٹے (چھوٹے) بچے ہوں۔ پھر اس باغ پر ایک ایسا بگولا چلے

فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

جس میں آگ (کی سی گرمی) ہو اور وہ (باغ) جل جائے۔ (دیکھو) اللہ (تعالیٰ) تمہارے (فائدہ کے) لئے اس

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۷﴾

طرح اپنے احکام بیان کرتا ہے تا کہ تم فکر (سے کام لیا) کرو۔

حلّ لُغات۔ نَخِیْلٌ نَخْلٌ کی جمع ہے۔ اس کے معنے کھجوریں یا کھجوروں کے باغ کے ہیں۔ (اقرب)

اَعْنَابٌ عِنَبٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے انگور ہیں۔ (اقرب)

اَلْکِبَرُ کَبُرَ الرَّجُلُ اَوِالدَّآبَّۃُ کے معنے ہیں طَعَنَ فِی السِّنِ۔ آدمی یا جانور بڑا ہو گیا۔ (اقرب)

اِعْصَارٌ ایسی ہوا کو کہتے ہیں جو زمین سے مٹی اُڑاتی ہوئی ستون کی طرح آسمان کی طرف چلی جاتی ہے۔ ہماری زبان میں ایسی ہوا کو بگولا کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہمیشہ سختی کے اظہار کے لئے بولا جاتا ہے۔ عرب لوگ کہا کرتے ہیں۔ اِنْ کُنْتَ رِیْحًا فَقَدْ لَاقَیْتَ اِعْصَارًا۔ اگر تو تیز ہوا ہے تو جس سے تجھے پالا پڑا ہے وہ بگولا ہے۔ گویا آج تیرا واسطہ سخت شخص سے پڑا ہے۔ بگولہ میں سخت تیزی کی وجہ سے ایسی آگ پیدا ہو جاتی ہے جس سے جنگل کے جنگل جل جاتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ اب اللہ تعالیٰ ایک اور تمثیل کے ذریعے انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ دنیا میں اگر کسی کے پاس تھوڑا سا مال ہو اور وہ ضائع ہو جائے تو اس کا بھی اسے افسوس ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے ساتھ نہریں بہتی ہوں اور اسے اس باغ میں سے ہر قسم کے پھل ملتے رہتے ہوں۔ اور وہ خود بوڑھا ہو چکا ہو اور اسے زیادہ زندہ رہنے کی امید نہ ہو۔ اس کے بچے چھوٹی عمر کے ہوں جن سے کمائی کی اُمید نہ ہو۔ تو کیا اس کا دل چاہتا ہے کہ ایک بگولا زور سے آئے اور اس کے باغ کو جلا دے۔ بگولا اس لئے فرمایا کہ ایک تو وہ سخت تیز ہوتا ہے۔ دوسرے اچانک آتا ہے اور اس میں بوجہ تیزی کے آگ پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ بہت جگہ جہاں جنگل زیادہ ہوتے ہیں یہ نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔

اگر تھوڑا سا مال ہوتا تو وہ کہہ سکتا تھا کہ خیر تھوڑا سا مال تھا اگر ضائع ہو گیا تو کوئی بڑی بات نہیں یا اگر میرے کام آتا تو کب تک آتا؟ آخر اس نے ختم ہی ہونا تھا۔ پھر اگر بوڑھا نہ ہوتا تو خیال کر سکتا تھا کہ میری زندگی میں بچے بڑے ہو جائیں گے اور وہ اپنے لئے جائیداد پیدا کر لیں گے۔ لیکن اگر مال بھی زیادہ ہو۔ خود بھی بوڑھا ہو اور پھر اس کے بچے بھی چھوٹے ہوں تو وہ کبھی نہیں چاہتا کہ اس کا مال تباہ ہو جائے اور کسی حادثہ سے اس کی تمام جائیداد جل کر فنا ہو جائے۔ اور اگر کسی حادثہ سے اس کی تمام جائیداد جل کر تباہ ہو جائے تو تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اسے کس قدر صدمہ

ہوگا! یہی حالت قیامت کے دن ان لوگوں کی ہوگی جنہوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال خرچ نہیں کئے۔ اس وقت ان کے پاس کوئی مال نہیں ہوگا جسے وہ پیش کر سکیں اور نہ اولاد وغیرہ کام آئے گی اس لئے فرمایا کہ تم اپنا انجام سوچ لو! آج تم اپنے لئے سب کچھ کر سکتے ہو۔ مگر آخرت میں کچھ نہیں کر سکو گے۔ اگر آج تم اپنا مال خرچ کرو گے تو یہ مال تمہارے لئے وہاں ذخیرہ کے طور پر جمع رہے گا اور تم اس سے فائدہ اٹھا سکو گے ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ کے الفاظ خاص طور ہوشیار کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں کہ جب تم اپنے بچوں کے لئے دنیا کی محدود زندگی میں بھی یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ ایسی بے بسی کی حالت میں رہ جائیں تو تمہاری اپنی جان جو کہ اگلے جہان میں ایک بچہ کی حالت سے بھی زیادہ نازک حالت میں ہوگی کیوں توجہ کی مستحق نہیں۔

تم سوچو اور غور کرو کہ ایمان کی نعمت یا رضائے الٰہی جیسی نعمت جو ایسے وقت میں کام آنی ہے۔ جب بچہ جتنی طاقت بھی تمہارے اندر نہیں ہوگی اور خود تمہارے کام آنی ہے اس کو اس بے پروائی سے ضائع کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ پس تم ابھی سے ہوشیار ہو جاؤ اور موت سے پہلے اپنے لئے نیکیوں کا ذخیرہ جمع کر لو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ

اے ایمان دارو! جو کچھ تم نے کمایا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں اور (نیز) اس میں سے جو ہم نے

مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ

تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے (اللہ کی راہ میں حسب توفیق) خرچ کرو۔ اور ناکارہ چیز کو اور جس میں سے تم

مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ

خرچ (تو) کرتے ہو مگر خود تم سوائے اس کے کہ اس (کے قبول کرنے) میں چشم پوشی سے کام لو اسے ہرگز قبول نہیں

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۸﴾

کرتے۔ (صدقہ کے لئے) بالارادہ نہ چنا کرو۔ اور جان لو کہ اللہ (تعالیٰ بالکل) بے نیاز (اور) بہت ہی حمد کا مستحق ہے۔

حل لغات۔ اَلْخَبِيْثُ اَلنَّجَسُ۔ اَلرَّدِيُّ۔ اَلْمَكْرُوْهُ (اقرب) یعنی خبیث ہر ناپاک۔ ردّی اور

ناپسندیدہ چیز کو کہتے ہیں۔

تَیَمَّمُ تَیَمَّمَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں تَعَمَّدَہٗ جان بوجھ کر اور نیت اور ارادہ کے ساتھ کسی چیز کو اختیار کیا۔ پس لَا تَیَمَّمُوْا کے یہ معنے ہیں کہ تم قصداً اور ارادۃً ناکارہ چیز کو صدقہ کے لئے مت چنو۔ (اقرب)

تُغْمِضُوْا اَغْمَضَ عَیْنَیْہِ کے معنے ہیں۔ اَطْبَقَ اَجْفَانَھُمَا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور اَغْمَضَ عَنِ الشَّیْءِ کے معنے ہیں تَجَاوَزَہٗ کسی چیز سے تجاوز کیا۔ اور اَغْمَضَ عَلٰی کَذَا کے معنے ہیں۔ تَحَمَّلَہٗ وَرَضِیَ بِہٖ اسے برداشت کر لیا اور اس پر راضی ہو گیا۔ (اقرب) جب یہ لفظ بغیر صلہ کے آئے تو اس کے معنے بند کر لینے کے ہوتے ہیں۔ اور جب عَنْ کے ساتھ آئے تو اغماض کے معنے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ تینوں معنے ہو سکتے ہیں۔ (۱) یعنی تم اپنی آنکھیں بند کر کے لے لو (۲) یا تم اس میں تجاوز سے کام لو۔ یعنی دوسرے کی اس حرکت کو تم نظر انداز کر دو۔ اور اسے لے لو۔ (۳) یا یہ کہ تم دوسرے کی خاطر اسے برداشت کر لو۔

تفسیر ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی راہ میں جو کچھ دو اس مال میں سے دو جو تمہارا کمایا ہوا ہے اور اچھا مال ہے۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے اموال پر ناجائز تصرف کر کے ان کو خرچ کرنے لگ جاؤ۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے دل میں غریبوں کی امداد کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ ڈاکے ڈالنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر انہیں جو کچھ ملتا ہے اس کا ایک بڑا حصہ غریبوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو فلسفہ اخلاق سے واقف نہیں ہوتے بالعموم ایسے ڈاکوؤں کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں ڈاکو بڑا اچھا ہے کیونکہ وہ غریبوں کی خوب مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ غریبوں کی مدد کرنے کا کوئی طریق نہیں کہ ڈاکہ ڈالا اور دوسرں کا مال چھین کر غریبوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنی جائز کمائی میں سے جتنا دے سکتے ہو دو اور باقی کام خدا تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ لوگوں کا مال لوٹ کر غرباء کی امداد کرنا تو حلوائی کی دوکان پر دادا جی کے فاتحہ کا مصداق بنتا ہے۔ اگر تمہارے نزدیک غرباء زیادہ ہیں تو اس کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ تم جتنا دے سکتے ہو دو اور باقی کام خدا تعالیٰ کے سپرد کر دو۔

اس جگہ مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ سے یہ مراد نہیں کہ مومنوں کی کمائی میں کچھ پاک مال ہوتا ہے اور کچھ ناپاک اور انہیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ صرف پاک مال خرچ کیا کریں۔ ناپاک مال خرچ نہ کیا کریں۔ بلکہ یہ الفاظ مَا کَسَبْتُمْ کی صفتِ حسنہ کے اظہار کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور مراد یہ ہے کہ تم نے جو کچھ کمایا ہے وہ طیب ہی ہے لیکن ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم اس طیّب مال کا بھی (جس میں ہر قسم کا مال اور علم بھی شامل ہو سکتا ہے) ایک

حصہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا کرو۔ گویا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ فرما کر مومنوں کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ ان کا مال ہمیشہ طیب اور پاک ہی ہوتا ہے۔ ناپاک مال کی اس میں ذرا بھی آمیزش نہیں ہوتی۔

دوسرے یہاں طیب حرام کے مقابلہ میں نہیں بلکہ خبیث کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اَنْفِقُوْا میں صدقہ دینے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ تب پورا ہوگا جب تم اپنے اچھے اور مرغوب مال میں سے خرچ کرو گے۔ یوں مستعمل اشیاء بھی غرباء کو دی جاسکتی ہیں اور ان کا دینا ہرگز منع نہیں۔ مثلاً انسان اگر کسی کو پرانا کپڑا دے دے جس سے دوسرا شخص فائدہ اٹھالے تو یہ ناجائز نہیں بلکہ یہ فعل اسے ثواب کا مستحق بنائے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ میں صدقہ دینے کا جو حکم دیا ہے وہ اس سے عہدہ برآ نہیں ہوگا۔ وہ اس حکم سے اسی وقت عہدہ برآ ہوگا۔ جب وہ اس چیز میں سے دے جو اس کے کام کی ہے۔ یعنی اعلیٰ درجہ کا اور اچھا مال دے تا کہ اس کی قربانی زیادہ بلند شان رکھنے والی ہو۔

پھر فرمایا وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ تم اس میں سے بھی خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لئے زمین میں سے نکالا ہے۔ درحقیقت دنیا میں دو ہی طرح مال حاصل ہوتا ہے۔ ایک تو تجارت اور ملازمت وغیرہ کے ذریعہ۔ دوسرے ان ذخیروں کے ذریعہ جو خدا تعالیٰ نے زمین کے اندر رکھے ہیں۔ اور انسان کوشش کر کے ان کو نکالتا ہے۔ جیسے کھیتوں دفینوں اور کانوں وغیرہ سے انسان کو آمدنی ہوتی ہے۔ پس مِنَ الْاَرْضِ میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو زمین سے نکلتی ہیں۔ صرف زراعت مراد نہیں۔ اسی طرح نباتات وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ غرض دو قسمیں بتا کر ان دونوں کی طرف اشارہ کر دیا اور بتایا کہ خواہ تم ملازمت تجارت اور صنعت وحرفت وغیرہ کے ذریعہ روپیہ کماؤ۔ خواہ زمینی ذخائر اور معدنیات سے فائدہ اٹھاؤ۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے تمام اموال کا ایک حصہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔

وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مطلق اَلْخَبِيْثَ کا لفظ رکھا ہے۔ اور یہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ کس کے لئے خبیث ہو۔ اس وجہ سے اس کے کئی معنے ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک معنے تو یہ ہیں کہ وہ چیز جو فی نفسہٖ بُری اور ناقابلِ استعمال ہو نہ یہ کہ اضافی طور پر۔ یعنی جو چیز کسی فرد کے لئے بھی قابلِ استعمال نہ ہو وہ کسی کو نہ دو۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز دینے والے کے کام کی تو نہ ہو مگر لینے والے کے کام کی ہو۔ (۲) ایسی چیز نہ دو کہ جسے تم دینے لگے ہو وہ اسے ناپسند کرتا ہو یا اسے مکروہ نظر آئے۔ اس میں بتایا کہ جسے تم کوئی چیز دو اس کے احساسات کا بھی خیال رکھ لیا کرو تا کہ اس کا دل میلا نہ ہو یا ایسی چیز نہ ہو جو اس کے کام کی نہ ہو۔ (۳) تیسرے معنے تیمم کے لفظ سے یہ پیدا ہوتے

ہیں کہ تلاش کر کے ناپسندیدہ اور ناکارہ چیزیں مت دو۔ یعنی یہ دیکھ کر کہ فلاں چیز تو میرے کسی کام کی نہیں اس لئے دے دوں درست نہیں۔

وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔ فرمایا ایسی چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں مت دو کہ اگر خود تمہیں وہی چیز ملے تو تم شرم کے مارے تو لے لو مگر یوں نہیں لے سکتے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ فرماتا ہے۔ یہ صدقات تمہارے ہی فائدہ کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی کوئی احتیاج نہیں۔ اگر تم اس کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہو یا اس کے بندوں کو دیتے ہو تو درحقیقت خدا تعالیٰ کو ہی دیتے ہو۔ اس لئے تم اس کے بندوں کو صدقہ دیتے وقت خدا تعالیٰ کی عظمت کو ملحوظ رکھو۔ جب تم دنیوی لوگوں سے معاملہ کرتے وقت ان کی شان کو ملحوظ رکھتے ہو حالانکہ وہ بہت ہی معمولی درجہ کے ہوتے ہیں تو خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے جب تم صدقہ دیتے ہو تو اس کی شان کو کیوں ملحوظ نہیں رکھتے؟ وہ تو غنی بھی ہے اور حمید بھی۔ اسے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ تمہیں اس کی مدد کی ضرورت ہے اور پھر وہ ہر قسم کی حمد کا مستحق ہے۔ اس لئے تم اس کے بندوں سے اچھا سلوک کرو تا وہ بھی تم سے اچھا سلوک کرے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ

شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے۔ اور تمہیں بے حیائی کی تلقین کرتا ہے۔ اور اللہ اپنی طرف سے ایک

يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۖۙ ﴿۲۶۹﴾

بڑی بخشش اور بڑے فضل کا تم سے وعدہ کرتا ہے۔ اور اللہ بہت وسعت دینے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ يَعِدُكُمْ وَعَدَهٗ کے معنے اچھا وعدہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور بُرا وعدہ کے بھی۔ اسی طرح اَوْعَدَ کے معنے بھی دونوں ہوتے ہیں۔ خیر کے بھی اور شر کے بھی۔ لیکن اَوْعَدَ کا کثیر استعمال شر کے متعلق ہے جب تک کہ کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو۔ اسی طرح وعدہ کا کثیر استعمال خیر کے لئے ہے جبتک کہ کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو۔ اور قرینہ یہ ہوتا ہے کہ ساتھ مفعول بھی بیان کر دیتے ہیں اس سے خیر یا شر کا پتہ لگ جاتا ہے (اقرب) مثلاً کہیں کہ فلاں شخص کے ساتھ دس کوڑوں کا میں وعدہ کرتا ہوں۔ تو اس صورت میں اس کے معنے شر کے ہوں گے۔ یہاں چونکہ فقر کا ذکر آتا ہے اس لئے اس کے معنے شر ہی کے ہیں۔ اور وَعَدَ کے معنے ڈرانے کے ہیں۔

فَحْشَآءِ کے معنے ہیں ہر وہ بدی جو نمایاں ہو جائے۔ اسی طرح فحشاء بخل کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے۔ خواہ یہ ڈرانا مالی قربانی کے متعلق ہو یا جانی قربانی کے متعلق۔ یا اور سینکڑوں قسم کی قربانیوں کے متعلق۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم مال دو گے تو تمہاری ضروریات کے لئے کچھ نہیں رہے گا۔ تم تنگ دست ہو جاؤ گے اور لوگوں سے مانگتے پھرو گے۔ یا جان پیش کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر بے حیائی کے کام ہوں تو شیطان انسان کو بلا دریغ اپنا سارا روپیہ لٹا دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ گویا نیکی کی راہ میں تو وہ ایک ناصح مشفق بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بدی کی راہ میں دلیری سے قدم آگے بڑھانے کی تلقین کرتا ہے۔ غرض قربانی کرنے کو تو ایک مومن بھی کرتا ہے اور کافر بھی۔ مگر مومن کی قربانی خدا کے لئے ہوتی ہے اور کافر کی قربانی ایسے کاموں کے لئے ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے دور لے جانے والے ہوتے ہیں۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ شیطان انسان کے ساتھ وعدہ تو راحت و آرام اور دولت و آسائش کا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے رستہ میں اپنا مال خرچ نہ کرو گے تو تم بڑے مالدار ہو جاؤ گے۔ بڑی بڑی کوٹھیاں بنا لو گے اور ہر قسم کے سامان جمع کر لو گے۔ مگر اس کا نتیجہ فقر ہوتا ہے کیونکہ جو قوم غرباء کی طرف توجہ نہیں کرتی اور صرف اپنے عیش و آرام کا خیال رکھتی ہے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ مردہ قوموں کی حالت سے ظاہر ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ شیطان تم سے ایسی باتوں کا وعدہ کرتا ہے جو بظاہر تو بھلی معلوم ہوتی ہیں مگر ان کا انجام فقر یعنی تباہی اور بربادی اور رسوائی ہوتا ہے۔

وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ اور جن کاموں کا حکم دیتا ہے ان کا عیب کھلا اور ظاہر ہوتا ہے۔ فحش ہر ایسی بدی کو کہتے ہیں جس کی بُرائی ظاہر ہو...... اسی طرح فحش بخل کو بھی کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ تمہیں بخل کا حکم دیتا ہے حالانکہ بخل ایک ناپسندیدہ امر ہے اور عرب لوگ تو خصوصیت سے بخل کو سخت بُرا سمجھتے تھے یا یہ کہ وہ ہمیشہ بدی کا ہی حکم دیتا ہے۔ گویا عملاً بھی وہ بُری بات ہوتی ہے اور عزت کے لحاظ سے بھی نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور یہی دو باتیں انسان کو کسی کام سے روکتی ہیں۔ انسان یا عزت کو دیکھتا ہے یا فائدہ کو دیکھتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ۔اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ یعنی تمہاری کمزوریوں کی پردہ پوشی کرنے اور عیوب کو مٹا دینے کا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ دینے کا۔ یہاں اگر مغفرت کو عام رکھا جاتا تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس سے مراد بندوں کا ایک دوسرے کی کمزوری کو نظر انداز کرنا ہے مگر مَغْفِرَةً مِّنْهُ فرما کر اس طرف

اشارہ کیا کہ یہ مغفرت اس کی طرف سے ہوگی اور پھر یہی نہیں کہ وہ مغفرت کا وعدہ کرتا ہے بلکہ وہ فضل کا بھی وعدہ کرتا ہے۔ یعنی اس بات کا بھی کہ وہ تمہیں مزید ترقی دے گا اور تمہارے لئے اپنی برکتوں کے دروازے کھول دے گا۔

اگر پہلی آیت میں یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ کے معنے افلاس اور محتاجی سے ڈرانے کے لئے جائیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ شیطان تو فقر کو بڑا سمجھتا ہے اور خدا تعالیٰ گناہ کو۔ اس لئے وہاں فقر کو پہلے رکھا اور یہاں مغفرت کو۔ اس طرح رحمانی اور شیطانی سلسلوں میں جو اشیاء کی عظمت کا فرق ہے اس کو ظاہر کر دیا۔ حضرت خلیفہء اول رضی اللہ عنہ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ کی مثال میں اودھ کی ریاست کی مثال سنایا کرتے تھے کہ جب انگریزوں کا اس سے بگاڑ شروع ہوا تو انہوں نے ریاست کے ان تمام لوگوں کو جن کا روپیہ کلکتہ کے بنکوں میں جمع تھا نوٹس دے دیا کہ اگر تم ہمارے مقابلہ میں اُٹھے تو تمہارا تمام روپیہ ضبط کر لیا جائے گا۔ اس پر وہ اپنے فقر کے خیال سے چپ کر کے بیٹھ گئے اور انگریز نواب کو گرفتار کر کے لے گئے۔ لیکن یورپین اقوام چونکہ قربانی کی عادی ہیں اس لئے وہ اس قسم کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم میں کروڑوں روپیہ جرمنی کا انگریزوں کے ہاں تھا اور انگریزوں کا کروڑوں روپیہ جرمنی میں تھا۔ لیکن اس کی کوئی پرواہ نہ کی گئی اور پورے زور سے لڑائی شروع کر دی گئی۔ تو زندہ رہنے والی قومیں جانتی ہیں کہ روپیہ خرچ کرنے کے لئے ہی ہوتا ہے اس لئے وہ خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتیں لیکن جو قومیں روپیہ جمع رکھتی ہیں اور غرباء پر خرچ نہیں کرتیں وہ نقصان اُٹھاتی ہیں۔

یہاں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے حالانکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اور جب تم اپنے غریب بھائیوں سے برا سلوک کرو گے تو دشمن تک کہیں گے کہ یہ لوگ بڑے پست فطرت ہیں۔ انہوں نے غریبوں کا خیال تک نہ رکھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم صدقہ کرو گے تو اس کے نتیجہ میں تمہیں مغفرت حاصل ہوگی۔ یعنی جب تم غرباء کو اُبھارو گے تو تمہارے اپنے عیب بھی چھپ جائیں گے کیونکہ وہ شخص جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو اس میں اگر کوئی عیب بھی ہو تو لوگ اسے چھپا لیتے ہیں اور اگر یہ مطلب لیا جائے کہ وہ جن باتوں کا وعدہ کرتا ہے وہ آخر فقر پیدا کرتی ہیں تو اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ جن باتوں کا حکم دیتا ہے ان کا پہلا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ جب تم لوگوں کے عیوب ڈھانکو گے تو وہ تمہارے عیوب ڈھانکے گا۔ گویا اس ذریعہ سے تم خدا کے حضور میں بھی اور بندوں کی نگاہ میں بھی نیکی حاصل کرو گے اور دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہاں بھی تمہارے مال میں زیادتی ہوگی۔ کیونکہ قومی اخراجات میں حصہ لینے یا غرباء قوم کو بڑھانے اور ترقی دینے سے قومی طاقت ترقی کرے گی اور آخر تم کو مالی فائدہ بھی پہنچے گا اور اس خرچ کو بڑھا کر اللہ تعالیٰ تمہیں

اگلے جہان میں جو کچھ دے گا اس کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ میں بتایا کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے احکام کی اتباع کرو گے تو اس کے پاس سب کچھ ہے۔ وہ تمہیں بہت کچھ دے گا بلکہ تم اس کے وعدۂ فضل و مغفرت کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے اور نہ وعدۂ فضل کے معنوں کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہو اور پھر وہ عَلِيْمٌ ہے۔ تمہارے ہر ایک کام سے واقف ہے۔ اس سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ وہ تمہاری ان طریقوں سے مدد کرے گا جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔

اِن آیات پر غور کرو اور دیکھو کہ ان میں الفاظ کی ترتیب کیسی اعلیٰ درجہ کی رکھی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں فقر کو پہلے رکھا ہے اور فحشاء کو بعد میں اور دوسرے حصہ میں پہلے مغفرت کو رکھا ہے اور بعد میں فضل کو۔ حالانکہ ظاہر کے لحاظ سے فضل کو مغفرت سے پہلے رکھنا چاہیے تھا کیونکہ یہ فقر کے مقابلہ میں ہے۔ اور مغفرت کو بعد میں رکھنا چاہئے تھا۔ کیونکہ یہ فحشآء کے مقابلہ میں ہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ ایک تو ظاہری ترتیب ہوتی ہے اور ایک روحانی ترتیب ہوتی ہے۔ یہ ظاہری ترتیب ہے۔ یعنی شیطان پہلے فقرؔ سے ڈراتا ہے اور پھر فحشآء کا حکم دیتا ہے جس کے نتیجہ میں پہلے کسی قوم کو ذلّت پہنچتی ہے اور پھر ساری دنیا میں اس کی بدنامی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے پہلے مغفرت کا سلوک ہوتا ہے اور پھر فضل کا۔ جب اپنی قوم کے غرباء سے اچھا سلوک کیا جائے گا تو اس کے نتیجہ میں لازماً مغفرتؔ ہوگی اور پھر اس کے بعد فضل کا نزول ہوگا۔ یہ تو اس ترتیب کی ظاہری وجہ ہے۔ روحانی وجہ یہ ہے کہ شیطان کے نزدیک عزت و آبرو کی نسبت مال زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لئے اس کے ذکر میں مال کو مقدم رکھا اور عزت کو بعد میں لیکن خدا تعالیٰ کے نزدیک مال کی نسبت عزت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس لئے اس نے مغفرت کو پہلے رکھا اور فضل کو بعد میں یعنی پہلے نیک نامی کو مدّنظر رکھا اور بعد میں مال کو۔ دوسرے اس میں بتایا ہے کہ سچے اور جھوٹے مذہب میں یہ فرق ہے کہ جھوٹے مذہب میں دنیا مقدم رکھی جاتی ہے اور سچے مذہب میں دین کو۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ کوئی شخص ردّی چیز اس لئے دیتا ہے کہ اچھی چیز دینے سے فقر پیدا ہو جائے گا اور کوئی عمدہ اور اعلیٰ چیز اس لئے دیتا ہے کہ اس کا ایمان ترقی کرے گا۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ

وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ اور جسے حکمت عطا کی گئی ہو تو (سمجھو) کہ اسے ایک بہت ہی نفع رساں

اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۷۰﴾

چیز مل گئی۔ اور (یاد رہے کہ) عقلمندوں کے سوا نصیحت بھی کوئی حاصل نہیں کیا کرتا۔

حل لغات۔ اَلْبَابُ اَللُّبُّ کے معنے ہیں خَالِصُ كُلِّ شَيْءٍ ہر چیز کا خالص حصہ (۲) اَلْعَقْلُ۔ عقل (۳) اَلْخَالِصُ مِنَ الشَّوَائِبِ اَوْمَازُکِیَ مِنَ الْعَقْلِ فَكُلُّ لُبٍّ عَقْلٌ وَلَا عَكْسَ۔ یعنی لُبّ اس عقل کو کہتے ہیں جو خالص ہو اور ہر عقل خالص نہیں ہوتی اور نہ نقصوں سے پاک ہوتی ہے پس عقل عام ہے اور لُبّ خاص۔ ہر لُبّ عقل ہے مگر ہر عقل لُبّ نہیں کہلا سکتی۔ (۴) لُبّ مغز کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ یہ قومی ترقیات کے گُر ہیں جو ہمارا رسول تم پر ظاہر کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ اے خدا! تو ان میں ایک ایسا رسول بھیج جو يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ کا مصداق ہو۔ یعنی لوگوں کو کتاب اور حکمت سکھائے اور قومی ترقی کے راز ان پر ظاہر کرے۔ پس یاد رکھو! کہ حکمت کا سکھایا جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ جسے حکمت کی کوئی ایک بات بھی ملے۔ اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کثیر حاصل ہوئی ہے یعنی عمل نیک بھی اچھی شے ہے۔ مگر نیکیوں میں ترقی کرنے کے گُر اور کاموں کی حکمتیں معلوم ہو جائیں تو یہ ایک بڑی خیر ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ گویا ہیروں اور جواہرات کی ایک کان مل گئی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام اچھی تعلیمات قرآن کریم میں موجود ہیں۔ لیکن اگر اس کے احکام کی حکمت سمجھ میں آجائے تو انسان کا جوشِ عمل بڑھ جاتا ہے۔ اور ناواقفیت کی صورت میں سستی ترقی کرتی ہے۔ پس احکام کی حکمتوں کا علم بڑی مفید چیز ہے مگر فرماتا ہے کہ لوگ پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے صرف وہی لوگ جن کی نظر ذاتی فوائد پر نہیں ہوتی بلکہ ساری قوم کے فوائد پر ہوتی ہے وہی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَ مَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ

اور جو کچھ بھی تم (خدا کے لئے) خرچ کرو۔ یا جو کچھ بھی تم نذر مانو اللہ اسے یقیناً جانتا ہے

اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۱﴾

(وہ اس کا نیک بدلہ دے گا) اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔

حلّ لُغات۔ نَذَرۡتُمۡ نَذَرَ کے معنے ہیں۔ (۱) اَوۡجَبَ عَلٰی نَفۡسِہٖ مَالَیۡسَ بِوَاجِبٍ۔ اس نے اپنے نفس پر کوئی ایسی چیز واجب کر لی جو اس پر واجب نہ تھی۔ (۲) اَوۡجَبَ عَلٰی نَفۡسِہٖ تَبَرُّعًا مِنۡ عِبَادَۃٍ اَوۡ صَدَقَۃٍ اَوۡ غَیۡرَ ذٰلِكَ اس نے کوئی عبادت یا صدقہ وغیرہ اپنے اوپر فرض کرلیا۔ وَقِیۡلَ النَّذۡرُ مَا کَانَ وَعۡدًا عَلٰی شَرۡطٍ۔ اور کہا گیا ہے کہ نذر شرطی وعدہ کو بھی کہتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ اگر میرا فلاں کام ہوجائے تو میں ایسا کروں گا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ جو خرچ بھی تم خرچ کرو اور جو نذر بھی تم نذر دو مگر یہ ترجمہ اردو محاورہ کے لحاظ سے درست نہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''جو کچھ بھی تم خدا کے لئے خرچ کرو یا جو کچھ بھی تم نذر دو''۔ کیونکہ اردو میں جو مضمون ''کرو'' یا ''دو'' کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے عربی زبان میں اس کے اسم سے فعل بنا کر لے آتے ہیں اور اس سے وہ مضمون ادا کرتے ہیں۔ ہاں عربی کی ترکیب سے یہ زائد معنے ضرور پیدا ہوجاتے ہیں کہ جس چیز کو خرچ کیا جائے وہ خرچ کرنے کے قابل ہو۔ اور جو نذر دو وہ نذر میں پیش کرنے کے قابل ہو۔

نذر کے متعلق حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے پسند نہیں فرمایا (مسلم کتاب النذر باب النهی عن النذر)۔ ہاں اگر کوئی نذر مانی جائے تو پھر اس کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ نذر کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لئے ناپسند فرمایا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ سے ایک قسم کا ٹھیکہ ہوجاتا ہے اور خدا تعالیٰ سے ٹھیکہ کرنا کوئی پسندیدہ امر نہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اس کی بجائے صدقہ وخیرات اور دعاؤں سے کام لے۔ ہاں! اگر کوئی شخص صدقہ وخیرات اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ کوئی نذر بھی شکرانہ کے طور پر مان لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ میں یہ استنباط حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک عمل سے کرتا ہوں۔ آپ بعض دفعہ ان لوگوں کو جو آپ سے دعا کے لئے عرض کرتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ میں دعا کروں گا۔ آپ اپنے دل میں خدمتِ دین

کے لئے کوئی رقم مقرر کر لیں جسے اس کام کے پورا ہونے پر آپ خدا تعالیٰ کی راہ میں دے دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شکرانہ کے طور پر اگر کوئی نذر مان لی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ اس نذر کے ساتھ ساتھ دعاؤں اور گریہ وزاری اور صدقات وخیرات سے بھی کام لیا جائے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ میں بتایا کہ تم جو کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہو یا تم کوئی منت مانتے ہو اور اپنے اوپر واجب کر لیتے ہو اور پھر اس نذر کو پورا بھی کر دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم نے کیا کچھ دیا اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں کتنا اخلاص اور کتنا جذبۂ ایمان کام کر رہا تھا۔ پس وہ تمہارے اخلاص کے مطابق تمہیں اجر دے گا۔ اور تمہارا انفاق رائیگاں نہیں جائے گا۔ بلکہ وہ تمہیں بہت بڑی برکات سے حصہ دینے والا ثابت ہوگا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ میں یہ اشارہ مخفی ہے کہ محض روپیہ خرچ کر دینا یا نذر کو پورا کر دینا کافی نہیں بلکہ دل کی نیت کا درست ہونا بھی ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کسی نے نام ونمود کے لئے خرچ کیا ہے یا محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ اس کے اندر کام کر رہا ہے۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ کسی کے زیادہ دوست ہوتے ہیں اور کسی کے کم مگر ظالم ایسا ہوتا ہے کہ جب اسے دنیوی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو جو لوگ اسے مدد دے سکتے ہیں وہ بھی نہیں دیتے اور اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور اگر روحانی نقطۂ نگاہ لو تو اصل مددگار خدا تعالیٰ اور اس کے ملائکہ ہیں یا صلحاء اور اولیاء ہیں۔ مگر ظالم کو ان میں سے کسی کی مدد میسر نہیں آتی اور وہ بے یارو مددگار رہ کر اپنے جرم کی سزا پاتا ہے۔ اس جگہ ظالم سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور بخل کا شکار رہتے ہیں یا ڈرتے ہیں کہ اگر انہوں نے مال خرچ کیا تو وہ مفلس اور کنگال ہو جائیں گے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ فرماتا ہے۔ یہ نقطۂ نگاہ دنیوی لحاظ سے بھی غلط ہے اور روحانی لحاظ سے بھی۔ دنیا میں جو دوسروں کے لئے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ اور رفاہ عامہ کے کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر اور لوگ بھی اس کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یا کم سے کم اس سے ہمدردی رکھتے اور اس کی اخلاقی مدد کرتے ہیں۔ مگر غرباء کی مدد سے ہاتھ کھینچنے والے اور دوسروں کی تکالیف میں ہمدردی اور غمخواری نہ کرنے والے خوشحالی میں تو مست رہتے ہیں مگر جب اُن پر مصائب اور آفات آتی ہیں تو لوگ ان سے کسی قسم کی ہمدردی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے حالانکہ ہر انسان خواہ کتنا بڑا ہو مصیبت میں دوسروں کی ہمدردی اور محبت اور اعانت کا محتاج ہوتا ہے۔ اور اگر روحانی نقطۂ نگاہ لو تو یہ تو واضح ہی ہے کہ جس شخص نے خدا کے لئے روپیہ خرچ نہ کیا یا قوم کے غرباء کی پرورش اور ان کی بہبودی کا خیال نہ رکھا اسے

خدا اور اس کے ملائکہ کی نصرت اور اس کے پاک بندوں کی دعائیں کیسے حاصل ہو سکتی ہیں؟ وہ ان تمام نعمتوں سے محروم رہے گا اور اپنے ہاتھوں اپنی تباہی مول لے گا۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ

اگر تم علی الاعلان صدقے دو تو یہ (بھی) بہت اچھا (طریق) ہے۔ اور اگر تم وہ (یعنی صدقات) چھپا کر

تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ

غریبوں کو دو تو یہ تمہارے (نفس کے) لئے زیادہ اچھا ہے۔ اور وہ (یعنی اللہ اس کے سبب سے) تمہاری کئی بدیوں

سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۲﴾

کو تم سے دور کر دے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے۔

حلّ لُغات۔ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ كَفَّرَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں سَتَرَهٗ اس پر پردہ ڈالا۔ اور كَفَّرَ اللّٰهُ لَهُ الذَّنْبَ کے معنے ہیں مَحَاهُ اس کا گناہ مٹا دیا ہے۔ اور كَفَّرَ عَنْ يَمِيْنِهٖ کے معنے ہیں۔ اَعْطٰى مِنْهَا الْكَفَّارَةَ قسم کا کفارہ دیا۔ (اقرب) پس يُكَفِّرُ عَنْكُمْ کے معنے ہیں وہ تمہاری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے گا یا تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔

تفسیر۔ اس آیت میں صدقات کے ظاہر طور پر خرچ کرنے کے متعلق تو فرمایا کہ فَنِعِمَّا هِيَ۔ اور پوشیدہ طور پر خرچ کرنے کے متعلق فرمایا خَيْرٌ لَّكُمْ۔ نِعِمَّا هِيَ اصل میں نِعْمَ مَا هِيَ ہے۔ (تفسیر الخازن) یہ طریق کلام مخصوص بالمدح کہلاتا ہے۔ اور اس سے مراد نِعْمَ الشَّيْءُ شَيْئًا ہوتا ہے۔ جیسے اردو زبان میں بھی کہتے ہیں کہ بس کام ہے تو یہ ہے۔ لیکن اخفاء کے لئے خَيْرٌ لَّكُمْ کے الفاظ استعمال فرمائے کیونکہ اظہار کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے اور ان کو بھی صدقات کی تحریک ہوتی ہے جبکہ اخفاء کا اثر صرف انسانی قلب پر پڑتا ہے اور وہ کبر اور مَنّ اور اَذٰی سے محفوظ رہتا ہے۔ گویا نِعِمَّا هِيَ میں وسعتِ دائرہ اور محدود نیکی کا ذکر کیا۔ اور خَيْرٌ لَّكُمْ میں محدود دائرہ اور اعلیٰ نیکی کا ذکر کیا۔ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ میں قومی چندے اور تُخْفُوْهَا میں فردی خیرات مراد ہے۔ کیونکہ اوّل الذکر کا فائدہ ساری قوم کو اور ثانی الذکر کا فائدہ زیادہ تر اپنے نفس کو پہنچتا ہے۔ اسی لئے اس کے ساتھ لَكُمْ کا لفظ

بڑھا دیا گیا ہے۔

لیکن ایک اور نقطۂ نگاہ سے پہلے فقرہ میں زیادہ خصوصیت پائی جاتی ہے کیونکہ پہلے فقرہ میں یہ نہیں فرمایا کہ اظہارِ صدقہ کس کے لئے اچھا ہے؟ مگر دوسرے فقرہ میں لَّکُمْ کہہ کر بتایا کہ تمہارے لئے بہتر ہے۔اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر تم ظاہر طور صدقہ دو گے تو اس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے گا کیونکہ جب لوگ کسی کو صدقہ دیتے دیکھیں گے تو کہیں گے آؤ ہم بھی اس کی نقل کریں اور انہیں بھی تحریک ہوگی کہ وہ غرباء پروری میں حصہ لیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ (بخاری کتاب الجمعۃ باب الجمعۃ فی القرٰی و المدن) یعنی تم میں سے ہر ایک کی مثال ایک گڈریا کی سی ہے اور ہر ایک کے ساتھ کچھ نہ کچھ بھیڑیں لگی ہوئی ہیں۔جو اس کی نقل کرتی ہیں۔پس اگر کوئی ظاہر طور پر صدقہ دے گا۔تو اس کے بیٹے بھائی یا دوسرے رشتہ دار اسی طرح ملازم دوست اور آشنا وغیرہ بھی اس کی نقل میں صدقہ دیں گے اور یہ نیکی ترقی کرے گی۔دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ نسل کو فائدہ پہنچے گا اور بچوں کو بھی صدقہ دینے کی عادت پڑ جائے گی کیونکہ جب وہ اپنے بڑوں کو دیکھیں گے کہ وہ صدقہ دیتے ہیں۔تو سمجھیں گے کہ یہ بھی اچھی بات ہے۔اور اس طرح ان کی نیک تربیت ہوگی۔تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ بعض دفعہ لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ فلاں فلاں شخص امداد کا مستحق ہے۔جب وہ دوسروں کو ان کی امداد کرتے دیکھیں گے تو انہیں بھی ان کی غربت کا علم ہو جائے گا اور وہ بھی اپنے طور پر ان کی مدد کرنے لگ جائیں گے۔

پھر فرمایا کہ اگر تم پوشیدہ دو گے تو تمہارے اپنے نفس کی اصلاح کے لئے یہ طریق زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس سے ریا پیدا نہیں ہوگا جو ظاہر طور پر دینے سے پیدا ہو سکتا ہے بلکہ اس اخفاء کا ایک خاص انعام بھی بتایا کہ تم دوسروں کی کمزوری چھپاؤ گے۔تو خدا تعالیٰ تم سے بھی یہی سلوک کرے گا۔چنانچہ فرمایا۔وَیُکَفِّرُ عَنْکُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِکُمْ وہ تمہاری بدیوں کو تم سے دور کر دے گا اور تم کو پاک بنا دے گا۔اس آیت میں مِنْ تبعیض کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور زائدہ بھی۔اگر مِنْ تبعیضیہ لیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تمہارے بعض گناہ تمہاری طرف سے مٹا دے گا۔اس لئے یہاں یُکَفِّرُ لَکُمْ نہیں فرمایا بلکہ یُکَفِّرُ عَنْکُمْ فرمایا ہے کیونکہ انسانی گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک انسان کے اور ایک خدا کے۔خدا اپنے گناہ تو معاف کر دیتا ہے مگر بندوں کے نہیں۔کیونکہ اس میں ان کی معافی کی شرط ہوتی ہے۔گویا بتایا کہ جب تم غریبوں کی کمزوریوں اور عیبوں کو چھپاؤ گے اور ایسا طریق اختیار کرو گے کہ لوگوں پر ان کی کمزوری ظاہر نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بھی تمہاری بعض بدیوں کو مٹا دے گا۔یعنی خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق جو گناہ ہوں گے وہ انہیں معاف کر دے گا۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ تمہاری بدیوں کے متعلق اپنے پاس سے کفارہ دے دے گا۔ یعنی وہ لوگ جن کے تم نے گناہ کئے ہوں گے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے پاس سے صلہ دے کر کہے گا کہ یہ ہمارا بندہ ہے ہم تمہیں انعام دے دیتے ہیں تم اس کے گناہ معاف کر دو اس طرح وہ حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے گناہ بھی معاف کرا دے گا۔ کیونکہ جب نیکی ایک خاص حد تک پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ انسان کی طرف سے وکیل ہو کر بندہ سے اس کا گناہ معاف کرا دیتا اور اس کو اپنے پاس سے بدلہ دے دیتا ہے اور اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے۔

اس کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو خود تمہاری نظروں سے بھی چھپا دے گا۔ دراصل انسان کو خواہ کتنا ہی کہا جائے کہ اس کا گناہ معاف ہو گیا ہے پھر بھی یہ خلش اس کے دل میں باقی رہ جاتی ہے کہ میں نے گناہ کیا اور ایک شرمندگی اسے محسوس ہوتی ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو خود تمہاری نظروں سے چھپا دے گا یعنی خود تمہیں بھی اپنے گناہ بھلا دے گا اور تم اپنے حافظہ اور ذہن کے کسی گوشہ میں بھی ان کا کوئی نشان نہ دیکھو گے۔ سبحان اللہ یُکَفِّرُ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ کیا ہی مکمل فقرہ ہے۔ یہ ایسا اعلیٰ درجہ کا فقرہ ہے کہ کوئی اور فقرہ اس کی بجائے رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ گناہ کے متعلق کوئی پہلو ایسا نہیں جو اس میں آ نہ گیا ہو۔

اخفش نے اس آیت میں من کو زائدہ قرار دیا ہے (املاء ما من بہ الرحمٰن) جو بغرض تاکید بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ تمہاری بدیاں بالکل مٹا دے گا۔ اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ اور صدقات کو الگ الگ کیوں رکھا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہئے کہ زکوٰۃ بوجہ گورنمنٹ کی معرفت وصول ہونے کے ایک قسم کا ٹیکس معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے زکوٰۃ کا دینا فرض ہے پس زکوٰۃ نہ دینا یا زائد دینا یا کم دینا انسان کے لئے ناممکن ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ایک طریق تو زکوٰۃ کا رکھا تا کہ ہر مالدار کچھ نہ کچھ ضرور دے جس کے ذریعے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو اور تا کہ غرباء کے لئے بھی کچھ نہ کچھ انتظام ضرور ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرا طریق صدقات کا رکھا۔ اور صدقہ اس لئے مقرر کیا تا مخلص اور غیر مخلص کا فرق معلوم ہو۔ اور انسان کو اپنے ہاتھ سے دینے کی مشق ہو اور تا سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً دینے کا اسے موقعہ ملے کہ سرّاً دینا محبت کو بڑھاتا اور گناہوں کو بخشواتا اور ان پر پردہ ڈالتا ہے۔ اور علانیۃً دینے سے دوسروں کو بھی صدقات کی تحریک ہوتی ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ

انہیں راہ پر لانا تیرے ذمہ نہیں ہے۔ ہاں اللہ (تعالیٰ) جسے چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے۔ اور جو اچھا مال بھی تم

مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا

(خدا کی راہ) میں خرچ کرو اور حقیقت یہ ہے کہ تم ایسا خرچ صرف اللہ کی توجہ چاہنے کے لئے

ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ

کیا کرتے ہو سو اس کا نفع بھی تمہاری (اپنی) جانوں ہی کو ہوگا۔ اور جو اچھا مال بھی تم خرچ کرو وہ تمہیں پورا پورا

وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۳﴾

(واپس کر) دیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اول رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمایا کہ لوگوں کو ہدایت دینا تیرے ذمہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ ہدایت کے تین معنے ہوتے ہیں اوّل راستہ دکھانا دوم راستہ تک پہنچانا۔ سوم آگے آگے چل کر منزل مقصود تک لئے جانا (اقرب)۔ پہلی قسم کی ہدایت تو ایسی ہے جس میں بندہ بھی شریک ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بھی دوسروں کو راستہ دکھا سکتا ہے۔ لیکن آخری دو ہدایتیں ایسی ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یعنی صحیح راستہ تک پہنچانا۔ اور پھر اس راستہ پر قائم رکھتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچانا کسی بندہ کے اختیار میں نہیں۔ یہاں چونکہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو ہدایت پا چکے ہیں اس لئے فرمایا کہ ان کو ہدایت پر قائم رکھنا اور انہیں منزل مقصود تک پہنچانا یہ تیرا کام نہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے قائم رکھنے کے قابل سمجھتا ہے اسے قائم رکھتا ہے اور جسے ناقابل سمجھتا ہے اسے گرا دیتا ہے۔

دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ بھی تم خیر میں سے خرچ کرو گے اس کا فائدہ تمہاری جانوں کو ہی ہوگا۔ یہاں خَیْرٌ کا لفظ اس لئے رکھا کہ خیر کے معنے مال کے بھی ہوتے ہیں اور اچھے مال کے بھی۔ یعنی ایسے مال کے جو اچھے ذرائع سے کمایا گیا ہو یا مقدار میں زیادہ ہو۔ پس خیر کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ تم صرف اپنا مال ہی خرچ نہ کرو بلکہ یہ بھی دیکھتے رہو کہ وہ مال اچھے ذرائع سے کمایا ہوا ہو اور پھر قربانی بھی اپنی حیثیت کے

مطابق ہو۔ یہ نہ ہو کہ مثلاً تنخواہ تو چار سو روپیہ ہے اور پانچ روپے چندہ دے کر سمجھ لیا کہ انفاق فی سبیل اللہ کا حق ادا ہو گیا ہے۔

پھر مال خرچ کرنے پر سوال ہوتا تھا کہ ہم نے اپنا مال تو لوگوں کو دے دیا مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ تمہارا یہ مال خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسے زمیندار کھیت میں بیج ڈالتا ہے تو اس سے ہزاروں دانے بن جاتے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ میں اپنے دانے کیوں ضائع کروں؟ اسی طرح تم بھی یہ مت خیال کرو کہ اگر تم مال خرچ کرو گے تو اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ اس کے نتیجہ میں قوم ترقی کرے گی اور قوم کی ترقی سے فرد بھی ترقی کرتا ہے۔ دراصل ایسا خیال قلتِ تدبر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ورنہ یوروپین قومیں جنہوں نے اس نکتہ کو خوب سمجھا ہے وہاں دولتمند گو اس بات میں بدنام ہیں کہ وہ ہر وقت عیش و عشرت میں مبتلا رہتے ہیں لیکن وہ پھر بھی غرباء کو ابھارنے اور قوم کو ترقی دینے کے لئے اپنے اموال کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح عیسائیت کی تقویت کا موجب بنتے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ فرماتا ہے کہ بے شک غرباء کے لئے اپنے اموال خرچ کرنا قومی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے لیکن صرف اس فائدہ کو ہی اپنا مقصود و مدّعا نہ بنا لینا۔ ایک مسلمان سے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ خرچ کرے گا خالصةً لِلّٰہ اور اِبْتِغَآءَ لِوَجْهِ اللّٰهِ کرے گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی تعریف کی ہے اور نفی کے طور پر یہ فقرہ بیان کیا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ہم مومنوں سے اس کے سوا اور کسی چیز کی توقع ہی نہیں کر سکتے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خرچ کریں گے۔ یہ طریق کلام نہی کی نسبت زیادہ مؤثر ہوتا ہے جیسے اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ میں آپ سے یہ امید رکھتا ہوں کہ میری واپسی تک آپ یہیں تشریف رکھیں گے۔ تو یہ فقرہ بہ نسبت اس بات کے زیادہ بہتر ہوتا ہے کہ آپ یہیں بیٹھیں۔ اور میرے آنے تک کہیں نہ جائیں کیونکہ اس طرح خود اس کے دل میں کام کرنے کی تحریک پیدا کی جاتی ہے۔ پھر وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ کہہ کر اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ بے شک مومنوں کے چندوں سے دنیوی ترقیات بھی حاصل ہوتی ہیں اور دین کو بھی فائدہ پہنچتا ہے مگر اعلیٰ درجہ کے مومن اس سے بالا ہوتے ہیں۔ انہیں نہ دنیا کی ترقی مطلوب ہوتی ہے اور نہ جنت کے انعامات ان کا اصل مقصود ہوتے ہیں بلکہ ان کی نیکیوں کا حقیقی محرک صرف یہ جذبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے اور وہ انہیں محبت اور پیار کی نگاہ سے دیکھے۔

چوتھی بات اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا تمہیں پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ

نے اس امر کو اِبْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ کے بعد بیان کیا ہے۔ حالانکہ جہاں یہ بتایا تھا کہ جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا فائدہ تمہاری جانوں کو پہنچے گا اسی جگہ یہ بات بھی بیان کی جاسکتی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو بعد میں رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک مزید بات یہ بیان کی گئی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اسے تو پورا پورا بدلہ مل جاتا ہے مگر جو شخص دنیا کی خاطر دیتا ہے اسے دنیا میں تو لوگوں کی خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے مگر آخرت میں اسے کوئی انعام نہیں ملتا۔

آخر میں وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ کہہ کر ایک اور ظلم کی بھی نفی کی گئی ہے جس کا گذشتہ آیات کے تسلسل میں جنگ کے ساتھ تعلق ہے جو قوم جنگ کے موقعہ پر اپنا مال خرچ نہ کرے وہ تباہ ہو جاتی ہے اور دوسری قوم غالب آ کر اسے اپنے مظالم کا تختہ مشق بنا لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم اپنا مال خرچ کرو گے تو تم ہی غالب رہو گے اور کوئی دوسری قوم تمہیں مغلوب کر کے تم پر ظلم نہیں کر سکے گی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

(یہ مذکورہ بالا صدقات) ان محتاجوں کے لئے ہیں جو اللہ کی راہ میں (دوسرے کاموں سے) روکے گئے ہیں۔ وہ

ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ز يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ

ملک میں (آزادی سے) آ جا نہیں سکتے (ایک) بے خبر (شخص ان کے) سوال سے بچنے کے سبب سے انہیں غنی خیال

التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ج لَا يَسْــَٔلُوْنَ النَّاسَ

کرتا ہے۔ تم ان کی ہیئت سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اور تم جو اچھا مال بھی

اِلْحَافًا ط وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۴﴾ ع ۳۹/۲/۷

(اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

حلّ لُغات۔ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ کے معنے ہیں خَرَجَ تَاجِرًا اَوْ غَازِيًا وہ تجارت کرنے یا جنگ کرنے کے لئے نکل گیا۔ اور ضَرَبَ کے معنے اَسْرَعَ اور ذَهَبَ کے بھی ہیں یعنی اس نے جلدی کی اور

چلا گیا۔(اقرب)

اَلتَّعَفُّفُ عَفَّ الرَّجُلُ کے معنے ہیں کَفَّ عَمَّا لَا یَحِلُّ وَ لَا یَجْمُلُ قَوْلًا اَوْ فِعْلًا وَامْتَنَعَ۔ اس چیز سے جو جائز اور اچھی نہیں قولی یا فعلی طور پر رک گیا۔(اقرب)

اس جگہ مِنْ کے معنے سبب کے ہیں۔ جیسا کہ آتا ہے مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا (نوح:۲۶) وہ اپنے گناہوں کے سبب سے غرق کردیئے گئے۔

سِیْمَا کے معنے ہیں (۱) ہیئت (۲) علامت۔(اقرب)

اِلْحَافًا اَلْحَفَ السَّآئِلُ کے معنے ہیں اَلَحَّ۔ سائل نے اصرار سے کام لیا۔ اور اَلْحَفَ فُلَانًا الثَّوْبَ کے معنے ہیں اَلْبَسَهٗ اِیَّاهُ اسے لباس پہنا دیا گیا۔ پس اِلْحَافٌ کے معنے ہوئے پہنانا یعنی سوال پہنا دینا مراد اِس سے یہ ہے کہ کسی کا پیچھا نہ چھوڑنا اور سوال کرتے چلے جانا۔(اقرب)

تفسیر۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یہ ایک محذوف کی خبر ہے جو هِیَ کا لفظ ہے۔ اور اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ صدقہ کا حکم جو تمہیں دیا گیا ہے یہ فقراء کے لئے ہے۔ یا اس جگہ ایک فعل محذوف ہے۔ جو اِجْعَلُوْهَا ہے۔ یعنی اس صدقہ کو ان فقراء کے لئے مخصوص کردو جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں روکے گئے ہیں۔ یہاں اُحْصِرُوْا تو فرمادیا مگر یہ نہیں بتایا کہ کون روکتا ہے یا وہ کس وجہ سے رکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عام رکھنا چاہتا ہے کیونکہ روکے جانے کی کئی وجوہ ہو سکتی تھیں۔ بہرحال اس سے یہ امر یقینی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ نکمے اور سست نہیں ہوتے بلکہ کسی مجبوری کی وجہ سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ آگے وہ مجبوری بیان نہیں کی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دشمن روکنے والا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدمت دین کے کاموں میں رات دن مصروف رہنے کی وجہ سے دنیا کمانے کے دروازے ان پر بند ہوں۔ جیسے صحابہؓ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبۂ عشق اور آپ کی صحبت میں بیٹھنے کی تمنّا اور دین اسلام سیکھنے کی تڑپ اتنا کام کر رہی تھی کہ انہیں کسی اور بات کی طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ اس کی مثال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف تین سال قبل ایمان لائے تھے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں چونکہ بعد میں ایمان لایا تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں آپؐ کے دروازہ کو نہیں چھوڑوں گا۔ چنانچہ وہ اپنا تمام وقت مسجد میں گذارتے اور قضائے حاجات کے بعد پھر وہیں آ کر بیٹھ جاتے۔ ان کو کہیں باہر جانا پسند ہی نہیں تھا تا ایسا نہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات فرمائیں اور وہ اسے سن نہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تین سال کے عرصہ کی صحبت پانے کے باوجود اس قدر حدیثیں بیان کی ہیں کہ ان

سے بہت زیادہ عرصہ صحبت پانے والوں نے اتنی حدیثیں بیان نہیں کیں۔ ان کے بھائی نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی کہ یا رسول اللہ ابوہریرہ سارا دن بیکار پڑا رہتا ہے۔ آپ اسے ہدایت فرمائیں کہ وہ کوئی کام بھی کیا کرے۔ آپ نے فرمایا۔ کبھی خدا تعالیٰ دوسروں کی وجہ سے بھی رزق دے دیا کرتا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ اسی کی وجہ سے خدا تعالیٰ تم کو رزق دے رہا ہو؟ پس ایسے واقفین زندگی جنہوں نے اپنے تمام اوقات خدا اور اس کے رسول کے لئے وقف کر رکھے ہوں اور وہ کوئی تجارت وغیرہ نہ کر سکتے ہوں وہ بھی اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ میں ہی شامل ہیں۔

پھر ایک رُکنا وہ بھی ہے جس کا فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (التوبۃ: ۱۲۲) میں ذکر آتا ہے۔ یعنی کیوں نہ ہوا کہ ہر قوم اور جماعت کے کچھ لوگ مرکز میں دین سیکھنے کے لئے آتے اور اپنی قوم کو واپس لوٹ کر بے دینی سے ہوشیار کرتے تا کہ وہ گمراہی سے ڈریں۔ جیسا کہ اس زمانہ میں مختلف ممالک سے لوگ دین سیکھنے کے لئے احمدیت کے مرکز میں آتے اور کئی کئی سال تک تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر واپس جا کر اپنے ملک اور قوم کے لئے ہدایت اور راہنمائی کا موجب بنتے ہیں۔ پس ایک رُکنا دین حاصل کرنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس کے آرام کے لئے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اس کے دین کی خدمت کرنے کی وجہ سے روکے جاتے ہیں۔ وہ زمین میں پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے یعنی ہر وقت دین کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اور انہیں دینی امور میں اتنا شغف ہوتا ہے کہ معاش کے حصول کے لئے کسی اور طرف توجہ ہی نہیں کر سکتے لیکن مال کی کمی کے باوجود وہ اپنے نفس کو سوال کی دناءت سے بچاتے اور خاموش رہتے ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ لوگ جو غور کرنے کے عادی نہیں انہیں خوشحال سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق تمہارا فرض ہے کہ تم خود ان کی ضروریات کا خیال رکھو اور ان کے لئے اپنے اموال کا ایک حصہ خرچ کرو۔

اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ کی راہ اختیار کرنے کی وجہ سے لوگوں نے کسبِ معاش سے روک دیا ہے جیسے کئی احمدی ہیں جن کو محض قبول احمدیت کی وجہ سے ملازمتوں وغیرہ سے الگ ہونا پڑا یا کسبِ معاش کے ذرائع ان پر بند کئے گئے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ایسے لوگ چونکہ دستِ سوال دراز نہیں کرتے اس لئے جاہل لوگ انہیں تعفف کی وجہ سے مالی امداد سے بالا سمجھتے ہیں حالانکہ عزّتِ نفس نے ان کے لبوں پر مہرِ خاموشی لگائی ہوئی ہوتی ہے ورنہ وہ بعض محتاج دکھائی دینے والوں سے بھی زیادہ قابلِ امداد ہوتے ہیں اور ان کا حق ہوتا ہے کہ ان کی

مناسب امداد کی جائے اور ان کی پریشانیوں کو دور کیا جائے تا کہ وہ دینی خدمات کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکیں۔ میں نے دیکھا ہے عام طور پر لوگوں کو یہ عادت پڑی ہوئی ہے کہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم سے کسی نے مانگا ہے کہ ہم دیں۔ حالانکہ یہ آیت بتاتی ہے کہ مومن کا یہ ذاتی فرض ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھول کر حالات کا صحیح جائزہ لے اور دیکھتا رہے کہ کون حاجتمند ہے اور کون ہے جسے عزتِ نفس نے سوال کرنے سے روک رکھا ہے۔

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ میں بتایا کہ تو ان کی علامت یا شکل ہی سے ان کو پہچان لیتا ہے۔ سِيْمَا کے معنے اگر شکل اور حالت کے لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ تو ان کا چہرہ دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ وہ مالی پریشانی کا شکار ہیں اور اگر علامت کے معنے لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تو ان کا دریدہ لباس اور ان کی پھٹی پرانی جوتی۔ ان کی بوسیدہ پگڑی اور ان کی سادہ طرزِ رہائش پر نظر ڈال کر پہچان لیتا ہے کہ یہ لوگ قابلِ امداد ہیں۔ اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے مومنوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ہمارا رسول تو ایسے لوگوں کو پہچان لیتا ہے پھر تم کیوں نہیں پہچانتے اور کیوں اپنی آنکھیں کھول کر نہیں رکھتے۔ اس بارہ میں احادیث میں حضرت ابوہریرہؓ ہی کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ ایک دن وہ سخت بھوکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ پاس سے گذرے تو انہوں نے ان سے ایک آیت کا مطلب پوچھا۔ وہ بتا کر چلے گئے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ کیا میں ان سے کم معنے جانتا ہوں کہ وہ معنے بتانے لگ گئے؟ میرا تو یہ مطلب تھا کہ وہ شکل دیکھ کر پہچان لیں اور مجھے کچھ کھانے کو دیں۔ پھر حضرت عمرؓ پاس سے گزرے انہوں نے آپ سے بھی ایک آیت کا مطلب پوچھا۔ وہ بھی معنے بتا کر چلے گئے۔ حضرت ابوہریرہؓ پھر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا کہ کیا ابوہریرہؓ ان سے کم معنے جانتا ہے کہ انہوں نے آیت کے معنے بتائے اور چلے گئے۔ اتنے میں مسجد کی ایک طرف سے کھڑکی کھلی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے پیار سے فرمایا۔ ابوہریرہ! معلوم ہوتا ہے۔ تم بھوکے ہو۔ پھر آپ نے فرمایا۔ اگر مسجد میں کچھ اَور لوگ بھی بیٹھے ہوں تو ان کو بھی بلا لاؤ۔ اس وقت مسجد میں سات آدمی تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ ان کو بلا لائے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا ایک پیالہ دے کر فرمایا کہ پہلے ان کو پلاؤ۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ بھوک تو مجھے لگی ہوئی ہے اگر انہوں نے دودھ پی لیا تو میرے لئے کیا بچے گا۔ لیکن میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کے مطابق ان کو باری باری دودھ پلایا اور سب نے پی لیا مگر پھر بھی وہ پیالہ اسی طرح بھرا رہا۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے فرمایا کہ ابوہریرہ! اب تم پیو۔ آخر میں نے پیا اور خوب پیا۔ جب میں سیر ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر پیو۔ میں نے پھر پیا۔ آپ نے فرمایا۔

پھر پیو۔ میں نے پھر پیا۔ آپ نے فرمایا پھر پیو۔ آخر میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اب تو میرے ناخنوں تک دودھ کی تراوت پہنچ گئی ہے۔ اس پر آپ نے وہ پیالہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور خود پی لیا (بخاری کتاب الرقاق باب کیف کان عیش النبی صلی اللہ علیہ وسلم)۔ یہ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ کی صداقت کا کتنا زبردست ثبوت ہے۔ غرض اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ خوبی بتائی گئی ہے کہ ہمارا رسول ایسے محتاجوں کو ان کی علامتوں سے پہچان لیتا ہے۔ پس اے مسلمانو! تم بھی ان کو پہچاننے کی کوشش کیا کرو۔

لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کے یہ معنے نہیں کہ وہ سوال تو کرتے ہیں مگر لوگوں سے چمٹ کر نہیں صرف نرمی سے مانگ لیتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ لوگوں سے سوال ہی نہیں کرتے۔ گویا اِلحاف سوال کو مقید کرنے کے لئے نہیں بلکہ سوال کی شناعت بیان کرنے کے لئے ہے۔ یعنی وہ الحاف نہیں کر سکتے۔ کیونکہ الحاف چاہتا ہے کہ انسان دائماً مسئول عنہ کے ساتھ لگا رہے اور وہ خدا کے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ پس وہ اپنی غربت چھپانے کے لئے امراء کا سایہ بننے سے بھی گریز کرتے ہیں اور اس طرح دوسرے لوگوں سے جو سوال مجسم بن کر انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے اس سے بھی محروم رہتے ہیں۔ گویا یہ الفاظ بطور تفسیر ہیں نہ کہ بطور قید۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی یہی معنے ثابت ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ تَرُدُّهُ التَّمْرَةُ اَوِ التَّمْرَتَانِ وَلَا اللُّقْمَةُ وَلَا اللُّقْمَتَانِ اِنَّمَا الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ يَتَعَفَّفُ وَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ يَعْنِيْ قَوْلَهٗ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (بخاری کتاب التفسیر باب قول اللہ عزّوجلّ لا یسئلون الناس الحافًا) یعنی مسکین وہ نہیں جسے ایک یا دو کھجوریں یا ایک لقمہ یا دو لقمے دے دیں بلکہ مسکین وہ ہے جو سوال ہی نہیں کرتا۔ یہ اِلحاف کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تفسیر بیان فرمائی ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلٰكِنَّ الْمِسْكِيْنَ الَّذِيْ لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ وَلَا يُفْطَنُ بِهٖ فَيُتَصَدَّقَ عَلَيْهِ وَلَا يَقُوْمُ فَيَسْـَٔلُ النَّاسَ۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول اللہ عزّوجل لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا) یعنی مسکین وہ نہیں جو لوگوں سے مانگتا پھرتا ہے اور اسے ایک دو لقمے یا ایک دو کھجوریں مل جاتی ہیں بلکہ مسکین وہ ہے جس کے پاس کوئی مال نہ ہو اور نہ لوگوں کو اس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ اسے صدقہ ہی دے دیں اور نہ ہی وہ لوگوں سے سوال کر کے اپنی حاجت پوری کرے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسکین دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لوگوں سے سوال کرتے پھرتے ہیں اور انہیں دوسروں سے مانگنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ دوسرے وہ جو لوگوں سے

مانگتے نہیں بلکہ کام کر کے روزی کماتے ہیں لیکن ان کی آمد اس قدر کم ہوتی ہے کہ وہ بھی قابل امداد ہوتے ہیں۔ بہرحال احادیث میں سوال کرنے سے سخت روکا گیا ہے اور سوائے تین آدمیوں کے اور کسی کے لئے سوال کرنا جائز نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔اِنَّ الْمَسْئَلَةَ لَاتَصْلِحُ اِلَّا لِثَلَاثَةٍ لِذِیْ فَقْرٍ مُدْقِعٍ اَوْ لِذِیْ غُرْمٍ مُفْظِعٍ اَوْ لِذِیْ دَمٍ مُوْجِعٍ (مشکوۃ المصابیح کتاب الزکوۃ من لاتحلّ له مسئلة) یعنی تین آدمیوں کے سوا اور کسی کے لئے سوال کرنا جائز نہیں۔اول اس کے لئے جس کو کھانے کے لئے کوئی چیز نہ ملتی ہو۔یعنی ایسی حالت ہوگئی ہو کہ اور کسی ذریعہ سے اس کو کھانا ملنا ناممکن ہو۔دوم جس پر بلا اس کے کسی قصور کے چٹّی پڑگئی ہو اور اسے وہ ادا نہ کرسکتا ہو۔سوم۔کوئی قتل ہوگیا ہو اور اس کی دیت ادا کرنے کی اس میں طاقت نہ ہو۔ایسے موقعہ پر اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے۔مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے معنے یہ ہوں کہ ان لوگوں کے لئے دوسروں کو سوال کرنا جائز ہے نہ کہ خود اس کو۔اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ دو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سوالی بن کر آئے۔آپؐ نے ان کو سرتا پا دیکھا اور فرمایا۔اِنْ شِئْتُمَا اَعْطَيْتُكُمَا مِنْهَا وَلَاحَظَّ فِيْهَا لِغَنِيٍّ وَلَا لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ (مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۶۲) یعنی اگر تم چاہو تو میں تم کو مال دے دیتا ہوں۔مگر صدقہ کے مال میں صدقہ دینے والے آسودہ حال اور کمانے والے کا کوئی حق نہیں۔اسی طرح آپ نے ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ مَنْ سَأَلَ وَعِنْدَهٗ مَا يُغْنِيْهِ فَاِنَّمَا يَسْتَكْثِرُ مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ یعنی جو شخص دوسروں سے سوال کرے اور اس کے پاس اتنی چیز موجود ہو جو اس کے کام آسکے تو وہ جہنم کی آگ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ وَمَا يُغْنِيْهِ کفایت کرنے والی چیز سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا مَا يُغَدِّيْهِ اَوْ يُعَشِّيْهِ ایسی چیز جو اس کے صبح یا شام کے کھانے میں کام آسکے۔(مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۸۱) غرض لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا میں بتایا کہ وہ لوگ دوسروں سے سوال ہی نہیں کرتے۔کیونکہ خود سوال کرنا ہی اپنی ذات میں الحاف ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ

جو لوگ اپنے مال رات اور دن پوشیدہ (بھی) اور ظاہر (بھی) (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں

عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ

ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر (محفوظ) ہے۔اور نہ (تو) انہیں کوئی خوف ہوگا

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تفسیر ۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ کے متعلق بعض اوراموربیان کئے ہیں ۔فرماتا ہے۔ ہمارے مومن بندے صدقہ کے لئےکسی خاص وقت یا خاص دن کومخصوص نہیں کرتے بلکہ وہ رات کے وقت بھی صدقہ کرتے ہیں اوردن کے وقت بھی صدقہ کرتے ہیں۔اورمخفی طور پر بھی صدقہ کرتے ہیں اورظاہرطور پر بھی صدقہ کرتے ہیں۔یہ لَیل اور نَہَار اور سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً کا ذکراس لئےفرمایا کہ شریعت اسلامی کے نزدیک مومن پر کوئی وقت ایسانہیں آنا چاہیے جبکہ وہ نیکیوں میں حصہ نہ لے رہا ہو۔ چنانچہ نمازوں کی دن اور رات میں تقسیم اورروزوں اور حج کا قمری مہینہ میں رکھنا۔یہ سب اسی غرض کے لئے ہے۔پس دن اور رات میں سرًّا اورعَلَانیۃً صدقہ دینے کا ذکر کرکے بتایا کہ ہمارے مومن بندے صدقہ بھی مختلف اوقات میں دیتے ہیں تاکہ کوئی وقت صدقہ سے خالی نہ رہے اورقمری مہینوں کے لحاظ سے ان کی یہ نیکی سارے سال میں چکر کھاتی رہےاوراس کا کوئی حصہ بھی اس سے خالی نہ رہے۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے لیل کا ذکر پہلے کیا ہےاور نہار کا بعد میں اوراسی ترتیب سے سِرًّا کو پہلے رکھا ہےاور علانیۃً کو پیچھے یا یوں کہنا چاہیے کہ لیل کے مقابل میں سِرًّا رکھا ہےاور نہار کے مقابلہ میں علانیۃً۔اس ترتیب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مومنوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ بعض دفعہ رات کو پوشیدہ طور پر صدقہ دیتے ہیں اوراس طرح دیتے ہیں کہ لینے والے کو بھی پتہ نہیں لگتا کہ کس نے دیا ہے تاکہ لینے والے کوشرمندگی محسوس نہ ہواوران کے اپنے قلب میں بھی تکبراورریا کا جذبہ پیدا نہ ہو۔پھر وہ دن کو بھی صدقہ دیتے ہیں اور ظاہر طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے دیکھ کر دوسروں کو بھی غرباء کی امداد کی تحریک ہو اور قوم ترقی کرے۔ورنہ اپنی ذات کے لئے انہیں کسی شہرت کی تمنّا نہیں ہوتی۔غرض لیل کی سِرًّا میں تفسیر کی گئی ہےاور نہار کی علانیۃً میں اور بتایا گیا ہے کہ ہمارے مومن بندے وقتوں کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔اور حالتوں کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔اسی طرح لیل ونھار سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ دکھ اور سکھ دونوں حالتوں میں وہ صدقہ دیتے ہیں۔درحقیقت اگرغور سے کام لیا جائے تو اسلامی شریعت میں خدا تعالیٰ نے دو قسم کے صدقات رکھے ہیں۔اول زکوٰۃ جو حکومت وصول کرتی ہے۔یہ نظام اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ غرباء کے لئے امداد کی ایک یقینی صورت پیدا ہوجائے۔دوم صدقہ تاکہ اس کے ذریعہ مخلص اور غیر مخلص کا پتہ چلتا رہے جو شخص مخلص ہوگا وہ تو اپنے طور پر بھی صدقہ دے گا۔لیکن زکوٰۃ چونکہ گورنمنٹ کی معرفت وصول کی جاتی

ہے اس لئے وہ لوگوں کو ٹیکس کی طرح لازماً ادا کرنی پڑتی ہے اور اس میں مخلص اور غیر مخلص سب کو شامل ہونا پڑتا ہے پس اسلام نے زکوٰۃ کے علاوہ صدقہ بھی رکھ دیا تا کہ لوگوں کو خود بھی اس کا احساس رہے اور ان میں غرباء پروری کا جذبہ ترقی کرے۔

پھر زکوٰۃ کے قیام کی ایک غرض دوسروں کے جذبات کا احترام بھی ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کا روپیہ حکومت دیتی ہے اس لئے لینے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کس نے دیا ہے لیکن دوسری طرف صدقہ آپس کے تعلقات کو بھی خوشگوار بنانے کے لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس سے محبت بڑھتی ہے۔ غرض کچھ صدقہ غرباء اور فقراء کے لئے حتمی اور قطعی طور پر مقرر کر دیا اور باقی صدقات مخلصین کے امتیاز اور ان کے مدارج میں ترقی کے لئے رکھ دیئے۔

دنیا میں یہ قاعدہ ہے کہ جب تک کھیت میں بیج نہ بویا جائے اس وقت تک فصل نہیں ہوتی۔ اسی اصول پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ پہلے تم اپنے پاس سے کچھ خرچ کرو پھر میں تمہیں دوں گا۔ بے شک خدا تعالیٰ بغیر بیج کے بھی پیدا کر سکتا ہے لیکن چونکہ خدا تعالیٰ نے ہی یہ قانون بنا دیا ہے کہ بغیر بیج کے ہم کچھ پیدا نہیں کریں گے اس لئے فرمایا کہ پہلے تم بیج ڈالو۔ پھر دیکھو گے کہ ہم اس بیج کو کس طرح بڑھاتے ہیں؟

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ دنیا میں بیج بونے والا کبھی ثمرات سے محروم بھی رہتا ہے۔ مثلاً فصل کو آگ لگ جاتی ہے یا چوری ہو جاتی ہے اور اس طرح اس پر خوف و حزن طاری ہو جاتا ہے۔ مگر فرمایا ہمارے ہاں ایسا نہ ہوگا۔ پھر دنیا میں تو ایک دانہ کے عوض سات سو دانے ملتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ اجر دیتا ہے اور وہ غیر مقطوع انعامات سے اپنے بندوں کو نوازتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (بالکل) اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح

الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس پر شیطان (یعنی مرض جنون) کا سخت حملہ ہو۔ یہ (حالت) اس وجہ سے ہے کہ وہ

قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ

کہتے رہتے ہیں کہ (خرید و) فروخت (بھی تو) بالکل سود (ہی) کی طرح ہے۔ حالانکہ اللہ نے (خرید و) فروخت کو جائز

حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ

قرار دیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ سو (یاد رکھو کہ) جس (شخص) کے پاس اس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت

مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ

(کی بات) آئے اور وہ (اسے سن کر خلاف ورزی سے) باز آ جائے تو جو (لین دین) وہ پہلے کر چکا ہے اس کا نفع اسی

النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۶﴾

کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو لوگ پھر (وہی کام) کریں وہ (ضرور) آگ (میں پڑنے) والے ہیں۔ وہ اس میں پڑے رہیں گے۔

حلّ لُغات۔ تَخَبَّطَہٗ کے معنے ہیں ضَرَبَہٗ شَدِیۡدًا۔ اسے سخت مارا اور تَخَبَّطَہُ الشَّیۡطٰنُ کے معنے ہیں مَسَّہٗ بِاَذًی۔ شیطان نے اسے سخت تکلیف پہنچائی۔ (اقرب)

اَلْمَسُّ کے معنے ہیں اَلْجُنُوْنُ پاگل پن لِاَنَّہٗ عِنْدَ الْعَرَبِ یَعْرِضُ مِنۡ مَسِّ الْجِنِّ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کے نزدیک یہ عارضہ جنّات کے چُھونے کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سُود خوار لوگوں اور سُود خوار قوموں کی حالت بیان کرتے ہوئے ان مضرات کا ذکر فرمایا ہے جو سُود کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کے نتیجہ میں نہ صرف امراء اور غرباء کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے بلکہ دنیا کا امن بھی برباد ہو جاتا ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اس جگہ ربٰوا کے لفظ میں ہر قسم کا سُود شامل ہے۔ اس میں بنکوں کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ بلکہ خواہ بنک سے سود لیا جائے یا ڈاکخانہ سے یا کواپریٹو سوسائٹیز سے یا کسی فرد سے ہر صورت میں وہ ناجائز اور حرام ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے یوروپین اقوام سے ڈر کر سُود کی عجیب و غریب تعریفیں کرنی شروع کر دی ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں اس طرح کا سُود لینے کی تو ممانعت ہے کہ سو روپیہ دے کر دو سو لیا جائے لیکن معمولی سود لینے کی ممانعت نہیں کیونکہ یہ سُود نہیں بلکہ منافع ہے۔ ان لوگوں کی مثال بالکل اس کشمیری کی سی ہے جس سے کسی نے پوچھا تھا کہ تمہارا کوئی لڑکا بھی ہے؟ اس نے کہا۔ کوئی نہیں۔ لیکن جب وہ اُٹھا تو

چارلڑ کے اس کے لمبے کرتہ کے نیچے سے نکل آئے۔ پوچھنے والے نے کہا کہ تم تو کہتے تھے کہ میرا کوئی بچہ نہیں۔ یہ چار کس کے بچے ہیں۔ اس نے کہا۔ چار بچے بھی کوئی بچے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی کہتے ہیں کہ پانچ یا سات فیصدی سُود بھی کوئی سود ہے۔ سُود تو وہ ہے جو سو فیصدی ہو۔

بعض دوسروں نے یہ فتویٰ دے کر کہ غیر مسلموں سے سُود لینا جائز ہے اس کے جواز کی ایک اور راہ نکال لی ہے۔ پھر بعض نے یہ فتویٰ دے دیا کہ غیر مذاہب کی حکومتوں کے ماتحت جو مسلمان بستے ہیں ان سے بھی سُود لینا جائز ہے۔ آخر یہاں تک کہہ دیا گیا کہ سُود وہ ہوتا ہے جو بہت بڑی رقم کی صورت میں لیا جائے اور پھر اس رقم کو معیّن نہیں کیا گیا کہ کتنی ہو؟ گویا کسی کے لئے بھی روک باقی نہ رہی اور سب کے لئے سود لینا جائز ہو گیا حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سُود کو ایسی لعنت قرار دیا ہے کہ آپؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔ سُود لینے والا اور دینے والا اور اس پر گواہی ڈالنے والا سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔

(ترمذی کتاب البیوع باب ما جاء فی اکل الربا)

درحقیقت سُود سے روکنا اسلام کے اعلیٰ ترین احکام میں سے ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں دولت جمع ہو جائے اور باقی لوگ بھوکے مرتے رہیں بلکہ چاہتا ہے کہ سب کو ترقی کی دوڑ میں حصہ لینے کا یکساں موقع ملے اور تمدن اپنی صحیح بنیادوں پر قائم ہو اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر قسم کے سُودی کاروبار کو بند کیا جائے۔ کیونکہ سُود کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ امراء اس ذریعہ سے روپیہ حاصل کر کے ہر قسم کی تجارت اور صنعت وحرفت اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں اور دوسرے لوگ ان کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ پس سُود ہی ہے جس نے اس زمانہ میں چند ہاتھوں میں دولت جمع کر دی ہے اور امراء اور غرباء میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے۔

دراصل اگر غور سے کام لیا جائے تو سُود دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو مالدار آدمی اپنا مال بڑھانے کے لئے دوسرے مالداروں سے رقم لے کر ان کو ادا کرتا ہے۔ جیسے تاجر پیشہ لوگوں یا بینکوں کا دستور ہے۔ اور ایک وہ سُود ہے جو غریب آدمی اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کسی صاحبِ استطاعت سے قرض لے کر اسے ادا کرتا ہے۔ اسلام نے ان دونوں سُودوں سے منع کیا ہے۔ اس سُود سے بھی روکا ہے جو تجارت یا جائیداد کو فروغ دینے کے لئے مالداروں سے روپیہ لے کر انہیں ادا کیا جاتا ہے اور اس سُود سے بھی منع کیا ہے جو غریب آدمی اپنی غربت سے تنگ آ کر کسی صاحبِ استطاعت سے قرض لینے کے بعد اسے ادا کرتا ہے اور نہ صرف ایسا سُود دینے سے روکا ہے بلکہ لینے سے بھی منع کیا ہے اور نہ صرف سود لینے دینے سے منع کیا ہے بلکہ گواہی دینے والوں اور معاہدہ لکھنے والوں کو بھی مجرم

قرار دیا ہے۔

تاجر پیشہ لوگوں کے سُود کے متعلق تو جب کوئی شخص سوال کرے کہ مثلاً اس کے پاس دس ہزار روپیہ ہے اور وہ اس سے دس لاکھ کما سکتا ہے۔ اگر وہ بینکوں یا دوسرے افراد سے روپیہ لے کر اسے ترقی نہ دے تو کیا کرے؟ ہم اسے آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ صبر کرے دس ہزار روپیہ اس کے لئے کافی ہے اسی پر گذارہ کرتا رہے۔ مگر جس وقت یہ سوال پیش کیا جائے کہ ایک غریب آدمی بھوک سے مر رہا ہے۔ کھیتی اس کی نہیں ہوئی۔ اناج اس کے گھر میں نہیں آیا۔ بارشیں وقت پر نہیں ہوئیں۔ ایسی صورت میں اگر وہ اپنی زمین کے لئے روپیہ مانگتا ہے تو بغیر سُود کے لوگ اسے نہیں دیتے۔ اب وہ کیا کرے؟ اگر وہ بیل نہ خریدے گا تو کھیتی کا کام کس طرح کرے گا یا عمدہ بیج نہ لے گا تو وہ اور اس کے بیوی بچے کہاں سے کھائیں گے؟ اس کے لئے ایک ہی صورت ہے کہ وہ روپیہ قرض لے مگر جب لوگ اسے بغیر سُود کے قرض نہ دیں تو وہ کیا کرے؟ جب یہ سوال پیش کیا جاتا ہے تو اس کا جواب دینا ذرا مشکل ہو جاتا ہے اور درحقیقت یہی وہ سُود ہے جس کے حالات اور کوائف سننے کے بعد انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ وہ کیا جواب دے؟ مال دار آدمی کو تو ہم فوراً یہ جواب دے سکتے ہیں کہ سُود پر روپیہ مت دو۔ اگر تمہارے پاس دس ہزار روپیہ ہے تو اسی پر کفایت کرو۔ مگر ایک غریب آدمی کو ہم یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اسی حالت پر کفایت کرو۔ اس کو تو ایک ہی جواب دیا جا سکتا ہے کہ بھوکے رہو اور مر جاؤ مگر یہ کوئی ایسا معقول جواب نہیں۔ جس سے ہمارے نفس کو تسلّی ہو۔ یا سائل کے دل کو اطمینان حاصل ہو۔ پس ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے اس کا کیا حل رکھا ہے؟ اس نقطۂ نگاہ سے اگر ہم اسلامی تعلیم پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک غریب آدمی تو ایسا ہوتا ہے جس کے پاس روپیہ نہیں ہوتا مگر جائیداد ہوتی ہے۔ اس کے لئے تو یہ صورت ہے کہ وہ جائیداد رہن رکھے اور روپیہ لے لے مگر ایک ایسا غریب ہوتا ہے جس کے پاس جائیداد بھی نہیں ہوتی جسے وہ رہن رکھ سکے یا اگر جائیداد ہوتی ہے تو وہ اس قسم کی ہوتی ہے کہ اگر وہ اسے رہن رکھ دے تو اس کا کاروبار بند ہو جاتا ہے۔ مثلاً زمیندار ہے اگر وہ اپنی زمین رہن رکھ دیتا ہے تو وہ کھیتی باڑی کہاں کرے گا؟ اپنے مکان کی چھت یا صحن میں تو وہ کر نہیں سکتا۔ ان حالات میں اسلام نے یہ رکھا ہے کہ ایک طرف تو اس نے امراء پر ٹیکس لگا دیا جس سے غرباء کی امداد کی جا سکتی ہے اور دوسری طرف اس نے یہ کہا ہے کہ جب ٹیکس سے بھی کسی غریب کی ضرورت پوری نہ ہو تو اس کے دوست واقف کار یا محلّہ والے اسے قرض حسنہ دیں۔ اور فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ کے ماتحت کشائش تک اسے واپسی کی مہلت دیں تا کہ وہ اطمینان سے اپنی حالت درست کر سکے۔ یہ صورت ایسی ہے جس پر اسے سُود پر روپیہ لینے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ اس کی احتیاج پوری ہو جاتی ہے۔

وہ لوگ جو کہا کرتے ہیں کہ آج کل سُود کے بغیر ترقی نہیں ہوسکتی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ صحابہؓ کے زمانہ میں جبکہ دودو کروڑ روپیہ ایک ایک شخص کے پاس ہوتا تھا (اسد الغابۃ، عبدالرحمٰن بن عوف) کیا سُودی کاروبار ہوا کرتا تھا؟ سود کو تو وہ حرام سمجھتے تھے۔ پس یہ غلط ہے کہ سُود کے بغیر مال میں ترقی نہیں ہوسکتی۔

پھر اسلام نے اگر ایک طرف سُود سے منع کیا ہے تو دوسری طرف زکوٰۃ اور وراثت کے طریق کو جاری کیا ہے۔ اس ذریعہ سے دولت کسی خاص خاندان میں جمع نہیں رہ سکتی بلکہ جو محنت کرے وہی مال دار ہوسکتا ہے اور غریبوں کے راستہ میں کوئی روک نہیں رہتی۔ غرض سُود کی حرمت کا مسئلہ ایک نہایت ہی حکیمانہ مسئلہ ہے اور اسلام نے اسے ایسا ناپسند کیا ہے کہ جو شخص سُود لے اس کے اس فعل کو وہ خدا تعالیٰ سے جنگ کرنے کے مترادف ٹھہراتا ہے۔ گویا اسے بغاوت کے جرم میں داخل کرتا ہے اور جس طرح باغی ملک پر بادشاہ چڑھائی کرتے ہیں اسی طرح سُود لینے والوں کے متعلق فرماتا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ کیونکہ تم نے اس کی بغاوت کی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر سُود حرام ہے تو پھر موجودہ زمانہ میں اسلام کی اس تعلیم پر کس طرح عمل کیا جاسکتا ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ دین ایک نظام کا نام ہوتا ہے اور یہ نظام اسی صورت میں نیک نتیجہ پیدا کرسکتا ہے جب وہ اپنی مکمل صورت میں قائم ہو۔ ادھوری صورت میں اس کی پوری شان ظاہر نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ آج کل جب لوگوں کو سود کے خلاف کچھ کہا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ سود کے بغیر تو گذارہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اس سے ان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس زمانہ میں سوسائٹی اس قدر گندی ہوگئی ہے کہ انسان سود لینے پر مجبور ہو جاتا ہے بلکہ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سود ہی مصیبت کے وقت کا علاج ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سود انسان کی مشکلات کا علاج نہیں بلکہ وہ ایک مرض ہے جسے انسان نے خود پیدا کیا ہے اور اسلام میں اس کا علاج موجود ہے۔ لیکن وہ علاج ایک نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب تک اس نظام کو قائم نہ کیا جائے اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا جس طرح ایک مکان کی چاردیواری اور چھت اور دروازے اور کھڑکیاں جب تک کامل نہ ہوں وہ مکان حفاظت کا موجب نہیں ہوسکتا۔ اگر اسلام کی ساری تعلیم کو قائم کیا جائے تو سود کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور سود کی مضرتوں سے بھی دنیا نجات پا جاتی ہے۔ سود کی ضرورت مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے۔

(۱) غریب انسان اپنے گذارہ کے لئے قرض لیتا ہے۔

(۲) تاجر صنّاع یا زمیندار اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے قرض لیتا ہے۔

(۳) ایک صاحبِ جائیداد مصیبت زدہ جس کے پاس نقد روپیہ موجود نہیں کسی ناگہانی آفت سے بچنے کے لئے قرض لیتا ہے۔

(۱) ظاہر ہے کہ غریب انسان جو آٹھ روپے کما نہیں سکتا وہ آٹھ روپے سود پر لے کر نو کہاں سے ادا کرے گا؟ چنانچہ کسانوں کی موجودہ حالت اس حماقت کو کلّی طور پر ظاہر کر رہی ہے۔ ایک مرے ہوئے انسان کو مارنا انتہا درجہ کا ظلم ہے۔ جو پہلے ہی مر رہا ہے اس پر اور بوجھ لاد دینے کا کیا مطلب ہوا۔ آخر اس ظلم کے نتیجہ میں ایک اور ظلم پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب مقروض قرضہ نہیں دے سکتے تو وہ قرضہ سے کلّی طور پر انکار کر دیتے ہیں۔

(۲) تاجر یا صنّاع یا زمیندار اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے قرض لیتا ہے۔ زمیندار کی صورت میں اگر یہ قرض جائیداد کی بہتری کے لئے لیا گیا ہو تو اسلام نے رہن کی صورت کو جائز رکھا ہے۔ اس تدبیر سے اس نے ایک طرف تو لوگوں کو اتنا قرض اٹھانے سے جسے ادا کرنا ان کی طاقت سے باہر ہو روک دیا ہے۔ اور دوسری طرف جائز ضرورت کے پورا کرنے کا راستہ بھی کھلا رکھا ہے۔

ایک تاجر اور صنّاع کے لئے دوسرے لوگوں کو شریک کار کرنے کا راستہ کھلا ہے۔ اگر اسے سود سے کاروبار بڑھانے کی اجازت دی جائے اور وہ اپنی تجارتی کوشش میں ناکام رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے لوگوں کا روپیہ ضائع جائے گا اور اگر کامیاب ہو تو بے انتہا دولت ایک ہاتھ میں جمع ہو جائے گی جو انصاف اور ضروریاتِ تمدن دونوں کے خلاف ہے۔

(۳) تیسری صورت ایسی ہے کہ جسے ایک حد تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس پر نہ وہ اعتراض پڑتا ہے جو پہلی صورت پر پڑتا تھا کہ یہ دے گا کہاں سے۔ اور نہ وہ اعتراض پڑتا ہے جو دوسری صورت پر پڑتا تھا۔ یعنی یہ کیا حق رکھتا ہے کہ سب دنیا کی دولت اپنی ذہانت سے سمیٹ کر اپنے گھر میں جمع کر لے؟ کیونکہ اس صورت میں ایک ایسا شخص قرض لیتا ہے جس کے پاس جائیداد ہے یا قابلیت کمانے کی موجود ہے۔ لیکن ایک ناگہانی آفت کی وجہ سے اسے ایک وقت میں اتنا روپیہ دینا پڑ گیا ہے جو اس کے پاس جمع نہیں۔ بظاہر عقل کہتی ہے کہ اسے سود پر قرض لینے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس کو سود پر روپیہ قرض دینا ظلم بھی نہیں کیونکہ یہ صاحبِ حیثیت ہے اور یہ لوگوں کے روپیہ سے کھیلتا بھی نہیں کیونکہ اس کے پاس جائیداد ہے یا وہ نوکری پیشہ ہے جو اس کے قرض کے ادا ہونے کے لئے کافی ضمانت ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کو سود کی اجازت دے کر سود کا دروازہ کھول دینا زیادہ اچھا ہے یا ایسے شخص کے

لئے کوئی دوسری صورت کھولنا؟ یقیناً اگر اس شخص کو اجازت ملے تو دوسری دونوں قسم کے لوگ اس کی مثال پر اپنے لئے بھی سود لینے کا فتویٰ دیں گے۔ اور یہ لعنت دنیا میں قائم رہے گی۔ پس اس کے لئے بھی کوئی اور ہی راستہ کھولنا زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔

اسلام نے ان تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر ایک مفصل تعلیم دی ہے۔ اس تعلیم کا مغزیہ ہے کہ (۱) ہر شخص کو کھانا کپڑا مکان اور علم میسّر ہونا چاہیے۔ (۲) کسی ایک شخص کے پاس بے انتہا دولت جمع نہیں ہونی چاہیے۔ (۳) روپیہ پیسہ کسی کے پاس جمع نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسے چکر کھاتے رہنا چاہیے تا کہ سب لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ (۴) جن کو جائز ضرورتیں پیش آئیں ان کے پورا کرنے کا سامان کرنا حکومت اور سوسائٹی کے ذمہ ہے۔

نمبر ۲ کی شق کے ماتحت اس نے تجارتی سود کو منع کیا ہے۔ کیونکہ بے انتہا دولت ہمیشہ سود پر روپیہ لینے سے جمع ہوتی ہے اور اس طرح انسان دوسروں کے روپیہ سے ایک جؤا کھیلتا ہے۔ اگر کامیاب ہوا تو کروڑ پتی ہوگیا اور اگر ہارا تو اس کا روپیہ تو تھا نہیں۔ قرض خواہ کیا کرلیں گے زیادہ سے زیادہ قید کرا دیں گے۔

اس کی دوسری شق کے ماتحت اس نے تقسیم جائیداد کا حکم دیا ہے۔ یعنی ہر شخص کی جائیداد کو اس کے وارثوں میں تقسیم کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ یہ جائز نہیں رکھا کہ کوئی شخص صرف ایک لڑکے کو جائیداد دے دے تا کہ جو کچھ بھی اس شخص نے کمایا ہے وہ ایک ہی ہاتھ میں جمع رہ کر ہمیشہ کے لئے ایک خاندان کے بعض افراد کو فوقیت نہ دے دے۔

نمبر اوّل کے ماتحت اس نے حکومت کو حکم دیا ہے کہ سب کے لئے کھانا کپڑا مکان وغیرہ مہیا کرے۔ اور اس کے لئے زکوٰۃ اور خراج وغیرہ کا سلسلہ جاری کیا ہے اور افراد پر صدقہ واجب کیا ہے۔

نمبر ۳ کے لئے اس نے ورثہ اور زکوٰۃ کا سلسلہ جاری کیا ہے اور سود سے منع کیا ہے۔

اور نمبر ۴ کے لئے بھی زکوٰۃ اور صدقات کا سلسلہ اور رہن با قبضہ یا بیع سلم کا سلسلہ جاری کیا ہے۔

غرض ان اصول پر اس نے ایک مکمل نظام تیار کیا ہے۔ اگر یہ مکمل نظام دنیا میں جاری کیا جائے اور پھر کوئی نقص رہ جائے تب تو اسلام کی تعلیم پر اعتراض ہوسکتا ہے۔ ورنہ نظام تو مغربی جاری ہو اور اسلام پر اعتراض ہو کہ اس نے سود سے منع کر کے اس کا علاج کیا بتایا ہے ایک لغو اور بیہودہ فعل ہے۔

يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ جیسا کہ حلِّ لغات میں بتایا جا چکا ہے اس جگہ مسّ سے مراد جنون ہے اور جنون کے نتیجہ میں انسانی حرکات میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے اور سوچنے اور غور و فکر سے کام لینے کا مادہ اس میں

نہیں رہتا۔ پس مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے کام اس طرح ہوتے ہیں جس طرح ایسا شخص جسے جنون کی بیماری نے ستایا ہوا ہو کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح اس میں وقار نہیں ہوتا اور سرعت اور بے پرواہی ہوتی ہے یہی حال سود خواروں کا ہوتا ہے۔ ان کے کاموں میں بھی ناواجب سرعت پیدا ہوجاتی ہے اور پرواہ اور احتیاط کم ہوجاتی ہے۔ چنانچہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ سودی کاروبار کرنے والے لوگ ایسے فتنے پیدا کرتے رہتے ہیں جن کے نتیجہ میں لڑائی ہو۔ اوران کا روپیہ صرف ہو گویا جس طرح ایک مجنون نتیجہ دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا اسی طرح سود پر روپیہ دینے والا سود پر روپیہ دیتا چلا جاتا ہے اور یہ سوچتا نہیں کہ اس کا کیا انجام ہوگا؟ اسے صرف یہ دھت ہوتی ہے کہ کوئی فتنہ پیدا ہو اور لوگ ہم سے سودی قرضہ لیں اور اس طرح ہمارا مال بڑھے۔ پھر اس سے بڑھ کر بڑی بڑی حکومتوں کو بھی اپنی طاقت سے بڑھ کر سود پر قرض لینے کی جرأت ہوجاتی ہے۔ اور وہ عواقب سے لاپرواہ ہوکر خون ریز جنگیں شروع کر دیتی ہیں۔ درحقیقت ایسی لمبی لڑائیاں جو قوموں کی قوموں کو پیس ڈالتی ہیں۔ لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور کروڑوں بچوں کو یتیم بنا دیتی ہیں۔ جو لاکھوں بیٹوں کو برباد اور لاکھوں باپوں کو ہلاکت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں وہ تبھی جاری رہ سکتی ہیں جبکہ سود کے ذریعہ مالی حالت کو قائم رکھا جائے۔ پہلی جنگ عظیم میں سات کروڑ روپیہ یومیہ صرف گورنمنٹ انگریزی کا خرچ ہوتا تھا اور اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ جرمنی کا خرچ ہوتا تھا۔ اگر سود کا دروازہ کھلا نہ ہوتا تو جرمنی اس خرچ کو ایک سال تک بھی برداشت نہ کرسکتا اور اس کا سارا اندوختہ تھوڑی مدت میں ختم ہوجاتا۔ پھر اس نے کیا کیا؟ یہی کہ سود کے ذریعہ کئی سال تک خرچ چلاتا رہا۔ پھر لڑائی کی بنیاد بھی سود ہی کی وجہ سے پڑی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اتحادی حکومتوں نے دفاعی طور پر جنگ کی۔ لیکن جرمنی کو کس چیز نے لڑائی چھیڑنے کی جرأت دلائی۔ اسی سود نے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر جنگ شروع ہوگئی تو سود کے ذریعہ میں جس قدر روپیہ چاہوں گا حاصل کرلوں گا اور جنگ جاری رکھ سکوں گا۔ اگر سود کا دروازہ بند ہوتا تو اس قدر عظیم الشان جنگ جاری رکھنے کا اسے خیال ہی نہ آتا اور اگر براہ راست جرمنوں پر ٹیکس پڑتے تو وہ ایک سال بھی لڑائی جاری نہ رکھ سکتے اور فوراً ملک میں شور پڑ جاتا کہ ہم اس قدر بوجھ برداشت نہیں کرسکتے۔ لیکن سود کے ذریعہ روپیہ لے کر لوگوں کو اس بوجھ سے غافل رکھا جاتا ہے جو جنگ کے لمبا کرنے کی وجہ سے ان پر پڑتا ہے۔ پس سود لڑائی کا ایک بھاری سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احکام جنگ کے بعد سود کا بھی ذکر فرما دیا کیونکہ سود کا جنگ کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔ ان کا ربٰو کھانا اس وجہ سے ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں یہ بھی ایک تجارت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ

الرِّبٰوا۔تمہارے نزدیک تو یہ دونوں برابر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان دونوں کو یکساں قرار نہیں دیتا بلکہ وہ ان میں سے بیع کو جائز قرار دیتا ہے اور ربٰو کو ناجائز۔ پس اس کا ایک چیز کو جائز اور دوسری کو ناجائز قرار دینا صاف بتاتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک جیسی نہیں اور خدا تعالیٰ نے جو اس سے منع کیا ہے تو آخر کوئی حکمت ہوگی اور وہ حکمت وہی ہے جو پہلی آیت میں بیان ہو چکی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام جس تمدن کو قائم کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد دوسروں سے نیک سلوک کرنے اور غرباء کی ترقی پر رکھی گئی ہے۔لیکن سودی کاروبار کرنے والے حسن سلوک کو جانتے ہی نہیں صرف روپیہ کی زیادتی ان کے مدنظر ہوتی ہے خواہ دوسرے کا گلا گھونٹ کر کی جائے۔ پس چونکہ اس ذریعہ سے دوسروں سے نیک سلوک کرنے اور غرباء کو ابھارنے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور جنگوں کا دروازہ کھل جاتا ہے اس لئے اسلام نے اس کی کلّی طور پر ممانعت فرمادی۔لیکن مکان یا دوکان کا کرایہ ایک علیحدہ چیز ہے۔ کرایہ اس لئے لیا جاتا ہے کہ مکان یا دوکان کے گرنے کا امکان ہوسکتا ہے اور اس کی مرمت کے لئے مالک مکان کے پاس کچھ نہ کچھ روپیہ ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح تجارت بھی ایک علیحدہ چیز ہے۔ کیونکہ تجارت میں ایک شخص اپنے مال کا دوسرے کے مال سے تبادلہ کرتا ہے۔ پس بیع اور ربٰو کو ایک چیز قرار دینا نادانی ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ جس شخص کے پاس اس کے ربّ کی طرف سے کوئی نصیحت کی بات پہنچ جائے اور وہ اسے سن کر اس کی خلاف ورزی سے باز آ جائے تو پھر ہمارا قانون یہ ہے کہ ہم اس کی سابقہ کوتاہیوں پر اس سے کوئی باز پرس نہیں کرتے۔ پس تم بھی ایسے لوگوں کا معاملہ حوالہ بخدا کیا کرو اور ان کی توبہ کو قبول کر لیا کرو۔ ہاں اگر کوئی شخص توبہ کے بعد پھر وہی کام کرنے لگ جائے تو ایسا شخص ضرور سزا کا مستحق ہوگا۔

یہاں اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ لوگ تو کہتے ہیں کہ سود اور خرید و فروخت میں کوئی فرق نہیں مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر ان میں کوئی فرق نہ ہوتا اور دونوں ایک جیسے ہوتے تو خدا تعالیٰ ان میں سے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام کیوں قرار دیتا اور پھر باز آنے والوں کو معاف کیوں کرتا اور جو معافی کے بعد دوبارہ سود لینا شروع کر دیں انہیں سزا کیوں دیتا؟ یہ بات بتاتی ہے کہ بیع اور ربٰوا ایک جیسے نہیں۔ ربٰوا کا لازمی نتیجہ آگ ہے خواہ وہ لڑائی کی صورت میں بھڑک اُٹھے یا فتنہ و فساد کے رنگ میں ظاہر ہو۔ مگر بیع کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا اور پھر ربٰو کا یہ نقصان عارضی نہیں بلکہ جب تک یہ لعنت دنیا پر مستولی رہے گی فتنہ و فساد کی آگ بھی بھڑکتی رہے

گی۔اسی کی طرف هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ترتیب و ربط: چونکہ گذشتہ آیات میں خدا تعالیٰ کی راہ میں مال دینے کا ذکر تھا اس لئے یہ خیال ہوسکتا تھا کہ کیوں نہ سود پر روپیہ دیا جائے تا کہ غرباء کا بھی کام چل جائے اور روپیہ دینے والے بھی شوق سے روپیہ دے دیا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ سود لینے والوں کی حالت تو ایسی ہوتی ہے کہ گویا ان کو جنون ہو گیا ہے۔یعنی وہ خون چوسنے والی جونکیں بن جاتے ہیں۔نہ ان میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت رہتی ہے اور نہ ہمدردی اور مواخات کا کوئی جذبہ ہوتا ہے۔ پھر سود سے انسان کاہل اور سست ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اتنی آمدنی تو ضرور ہو جائے گی کوئی اور کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر انسان محنت کرے اور اپنے آپ کو ملک اور قوم کے لئے مفید وجود بنائے۔اسی طرح صدقات کے بعد سود کا ذکر اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنا مال خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑنے کو تیار ہو جائے گا وہ بے گانہ مال یعنی سود بھی آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار ہوسکتا ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ

اللہ سود کو مٹائے گا اور صدقوں کو بڑھائے گا۔اور اللہ (تعالیٰ) ہر

كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۷﴾

بڑے کافر (اور) بڑے گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔

حلّ لُغات۔ يَمْحَقُ مَحَقَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں اَبْطَلَهٗ وَ مَحَاهُ اسے باطل کر دیا اور مٹا دیا۔اور مَحَقَ فُلَانًا کے معنے ہیں اَهْلَكَهٗ۔اسے تباہ کر دیا۔اور مَحَقَ اللّٰهُ الشَّيْءَ کے معنے ہیں نَقَصَهٗ وَ ذَهَبَ بِبَرَكَتِهٖ۔اللہ تعالیٰ نے اسے کم کر دیا اور اس کی برکت کو لے گیا۔(اقرب)

يُرْبِيْ اَرْبَى الشَّيْءَ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ يَرْبُوْا اللہ تعالیٰ نے اسے بڑھا دیا۔(اقرب)

تفسیر۔فرماتا ہے۔اللہ تعالیٰ سود کو مٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا۔یعنی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ترقی عطا فرمائے گا جو سود سے پرہیز کریں گے اور صدقات پر زور دیں گے۔اس میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب اسلام کی تعلیم اپنی مکمل صورت میں دنیا میں قائم کی جائے گی۔اور ربوٰا جسے مال کو بڑھانے والا قرار دیا جاتا ہے وہ مٹا دیا جائے گا اور صدقات جنہیں مال کو گھٹانے والا قرار دیا جاتا ہے ان کی بے انتہا زیادتی

ہوگی۔ گویا پرانے نظام کو بدل کر ایک نیا نظام قائم کیا جائے گا اور قرآن اور اسلام کی حکومت دنیا میں قائم کی جائے گی اور یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے وقوع میں آئے گا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ

جولوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اور مناسب حال عمل کرتے ہیں۔ اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ ان کے

لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۸﴾

لئے ان رب کے پاس یقیناً ان کا اجر (محفوظ) ہے۔ اور انہیں نہ (تو) کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تفسیر۔ چونکہ پیچھے صدقات پر بہت زور دیا گیا ہے اس لئے ممکن تھا کہ کوئی شخص یہ خیال کر لیتا کہ صرف صدقہ دے دینا ہی کافی ہے اسی سے نجات ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرماتا ہے کہ ترکِ ربوٰا اور صدقات کا دینا ہی کافی نہیں بلکہ ہر قسم کے اعمال صالحہ کی بجا آوری اور نمازوں کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔ صرف ایک پہلو پر زور دے کر تم نجات حاصل نہیں کر سکتے۔

اس میں ان لوگوں کی غلطی کا ازالہ بھی کیا گیا ہے جو سمجھتے ہیں کہ جنت میں جانے کے لئے صرف منہ سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دینا کافی ہے اعمال صالحہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ فرمایا۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ جب تک ایمان کے ساتھ عمل صالح اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ نہ ہو اور تعلق باللہ اور شفقت علیٰ خلق اللہ کے لحاظ سے تمہارے ایمان کی تکمیل نہ ہو اس وقت تک تمہیں نجات میسر نہیں آ سکتی۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا

اے ایمان دارو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور اگر تم مومن ہو تو سود (کے حساب) میں سے جو کچھ

اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷۹﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ

باقی ہوا سے چھوڑ دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے (برپا ہونے والی) جنگ کا

مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ

یقین کرلو۔اور اگر تم (سود سے) توبہ کرلو تو (کوئی اتنا نقصان نہیں کیونکہ) تمہارا راُس المال تمہارے لئے وصول کرنا

اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

جائز ہے۔(اس صورت میں) نہ تم (کسی پر) ظلم کروگے اور نہ تم پر ظلم ہوگا۔

حلّ لُغات ۔فَاْذَنُوْا اَذِنَ بِالشَّیْءِ کے معنے ہیں عَلِمَهٗ اسے جان لیا۔پس فَاْذَنُوْا کے معنے ہیں تم جان لو۔یقین کرلو۔(اقرب)

رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ رَأْسُ الْمَال اُس اصل مال کو کہتے ہیں۔جس پر کوئی نفع نہ ہو۔چنانچہ کہتے ہیں۔ اَقْرَضَنِیْ عَشْرَةً بِرَءُوْسِهَا اَیْ قَرْضًا لَا رِبْحَ فِیْهِ فَیَرُدُّ عَلَیْهِ رَاْسَ الْمَالِ۔یعنی اس نے مجھے دس دینار بغیر اس کے کہ ان پر کچھ اور نفع مقرر کرتا قرض دیئے۔(اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے۔اے مسلمانو! اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو تم خدا اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔یہ ایک بہت بڑی تنبیہہ ہے جو مسلمانوں کو کی گئی مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور پھر اس کا خطرناک نتیجہ بھی انہوں نے دیکھا۔ان کی زمینیں اور جائیدادیں چھن کر دوسروں کے پاس چلی گئیں۔ اور وہ مفلس اور قلاش ہو گئے بلکہ مسلمانوں کی گذشتہ دَور میں جس قدر سلطنتیں تباہ ہوئیں ان کی تباہی کی بڑی وجہ بھی یہی ہوئی۔وہ اکثر سود لے کر یا سود دے کر ہی تباہ ہوئی ہیں۔اگر انہوں نے سودی روپیہ لیا تو روپیہ دینے والی سلطنتوں نے ان کے ملک میں آہستہ آہستہ اپنا تسلّط جمانا شروع کیا۔کبھی ریلوں کا ٹھیکہ لیا۔کبھی کانوں کو کفالت میں رکھا۔کبھی کسی اور چیز پر قبضہ کرلیا اور آہستہ آہستہ تمام ملک پر چھا گئے۔پھر اگر انہوں نے سود پر قرض دیا۔تو جب کبھی سلطنتوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی تو وہ ارکانِ سلطنت جنہوں نے اپنا تمام سرمایہ غیروں کو سود پر دیا ہوا تھا اپنے قرض داروں کے طرف دار ہو گئے تا کہ ان کا روپیہ نہ مارا جائے۔چنانچہ لکھنؤ اور اودھ والوں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے کسی کو سود دیا نہیں بلکہ خود لینا چاہا اور بہت سا روپیہ انگریزی بینکوں میں جمع کرا دیا۔جب لکھنؤ پر حملہ ہوا تو بڑے بڑے رئیسوں کو انگریزوں نے کہلا بھیجا کہ اگر تم ذرا بھی مخالفت کروگے تو تمہارا تمام مال جو ہمارے بینکوں میں ہے ضبط کرلیا جائے گا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب لوگ خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور ایک شخص بھی نواب کی تائید میں نہ

اُٹھا۔ ایک ڈاکو کے قتل پر بھی بہت سے لوگ مارے جاتے ہیں لیکن لکھنؤ کے نواب کے قتل پر ایک شخص بھی انگریزوں کے مقابلہ کے لئے تیار نہ ہوا۔ غرض سیاسی طور پر سود کا لینا بھی مسلمانوں کے حق میں سخت نقصان دہ ثابت ہوا۔ کیونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے حکم کی صریح خلاف ورزی کی۔ یوں تو دوسری حکومتیں بھی سود لیتی اور دیتی رہی ہیں مگر ان کو اس سے وہ نقصان نہیں پہنچا جو مسلمانوں کو ہوا۔ اس کی ایک روحانی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کو اللہ تعالیٰ نے کلی طور پر اس طرح چھوڑ رکھا ہے جس طرح ایک باپ اپنے بچہ کو عاق کر دیتا ہے اور اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن مسلمان اس بچہ کی طرح ہیں جس سے اس کے ماں باپ کو پیار ہوتا ہے۔ پس مسلمان جب بھی احکامِ الٰہیہ کی خلاف ورزی کریں گے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی طرح تھپڑ پڑے گا جس طرح ایک باپ اپنے بچہ کو تھپڑ مارتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنا تعلق منقطع کر لے گا اور دنیا میں اس کی اِصلاح کے لئے اپنا ہاتھ نہیں بڑھائے گا۔ مگر مسلمانوں کی تو یہ حالت ہے کہ ایک طرف تو وہ بڑے زور سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اقرار کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ کے احکام کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ اور یہ صورت ایسی ہے جس میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ ان کی گرفت کے لئے بڑھتا ہے اور انہیں وقتاً فوقتاً فہمائش کرتا رہتا ہے۔ ورنہ محض کفر پر اس دنیا میں نہیں بلکہ اگلے جہان میں عذاب دیا جاتا ہے اور ایسا کافر جو کسی کو دُکھ نہیں دیتا اور اپنے خیال کی بنا پر اپنے مذہب پر عمل کرتا رہتا ہے۔ اس سے یہاں کوئی پرسش نہیں کی جاتی۔ مگر وہ لوگ جو اسلام کو قبول کرتے ہوئے پھر بھی اسلام کے احکام پر عمل نہیں کرتے ان کو یہاں بھی سزا دی جاتی ہے تا کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ اور ان کا خدا تعالیٰ سے تعلق کلّی طور پر منقطع نہ ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسری سلطنتوں پر بھی مختلف اوقات میں زوال آئے۔ مگر وہ زوال صرف سیاسی رنگ کے تھے۔ لیکن اسلامی سلطنتیں محض اس لئے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے سود پر قرض لیا یا دیا اور اس طرح اسلامی احکام کی خلاف ورزی کی۔

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سُود دے یا لے۔ اس سے قومی طور پر بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ باغی ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے ایک واضح حکم کی نافرمانی کرنے والا ہے۔

وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حکم صرف ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے سود پر روپیہ دیا ہوا تھا مگر پھر انہوں نے توبہ کر لی۔ اللہ تعالیٰ انہیں فرماتا ہے کہ اگر آئندہ کے لئے تم اس

فعل سے توبہ کرلو تو رأس المال وصول کرنا تمہارے لئے جائز ہے۔ گو ممکن ہے کہ اس عرصہ میں تم اصل مال سے بھی زیادہ سود لے چکے ہو۔

وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا

اور اگر (کوئی) مقروض تنگ حال ہو کر آئے تو آسودگی (حاصل ہونے) تک (اسے) مہلت دینی ہوگی۔ اور اگر تم

خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ

سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو جان لو کہ تمہارا (اس شخص کو رأس المال بھی) صدقہ (کے طور پر) دے دینا سب سے اچھا (کام)

فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۫ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ

ہے۔ اور اس دن سے کہ جس میں تمہیں اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا ڈرو۔ پھر ہر ایک شخص کو جو کچھ اس نے کمایا ہوگا پورا

لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۲﴾ ع

(پورا) دے دیا جائے گا۔ اور ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا جائے گا۔

حلّ لُغات۔ اَلنَّظِرَةُ کے معنے ہیں اَلتَّأْخِيْرُ وَ الْاِمْهَالُ فِي الْاَمْرِ۔ ادائیگی کے لئے مہلت دینا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ آج اگر تم لوگوں سے حسنِ سلوک کرو گے اور اپنے قرضوں کی وصولی میں نرمی سے کام لو گے تو یاد رکھو ایک دن تمہارا بھی حساب ہوگا اس دن تم سے بھی اچھا سلوک کیا جائے گا اور تمہارے گناہوں سے درگذر کیا جائے گا لیکن اگر آج تم نیک سلوک نہیں کرو گے تو اس دن تم سے بھی کوئی نیک سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ وہی حکم ہے جس کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار توجہ دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ تم دنیا میں رحم سے کام لو تا کہ آسمان پر تمہارا خدا بھی تم سے رحم کا سلوک کرے (ترمذی کتاب البرّ و الصّلۃ باب ما جاء فی رحمۃ الناس)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ

اے ایمان دارو! جب تم کسی دوسرے سے کسی مقررہ میعاد کے لئے قرض لو

مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪

تو اسے لکھ لو۔ اور چاہیے کہ کوئی لکھنے والا تمہارے درمیان (طے شدہ معاہدہ کو) انصاف کے ساتھ لکھ دے۔

وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَ

اور کوئی کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے کیونکہ اللہ نے اسے (لکھنا) سکھایا ہے۔ پس چاہیے کہ وہ (ضرور) لکھے۔

لْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ

اور تحریر وہ لکھوائے جس کے ذمہ حق ہو۔ اور چاہیے کہ وہ (لکھواتے وقت) اللہ کا جو اس کا ربّ ہے تقویٰ مدّنظر رکھے

مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ

اور اس میں سے کچھ (بھی) کم نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے نادان ہو یا کمزور ہو یا (خود) لکھوانے

ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ

کی قدرت نہ رکھتا ہو تو چاہیے کہ (اس کی بجائے) اس کا کارپرداز انصاف کے ساتھ (تحریر) لکھوائے۔

بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ

اور تم اپنے مردوں میں سے (اس موقعہ پر) دو کو گواہ (مقرر) کر لیا کرو۔

فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ

ہاں اگر دونوں (گواہ) مرد نہ ہوں تو (موقعہ کے) گواہوں سے جن لوگوں کو (بطور گواہ) تم پسند کرتے ہو۔ ان میں سے

مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا

ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنا لیا کرو) (دو عورتوں کی شرط اس لئے ہے) تا ان میں سے ایک کے بھول جانے کی

الْاُخْرٰى ؕ وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْـَٔمُوْۤا

صورت میں دونوں میں سے (ہر) ایک دوسری کو (بات) یاد دلائے۔ اور جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔

اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ

اور (خواہ) چھوٹا (لین دین) ہو یا بڑا ہو تم اسے اس کی میعاد سمیت لکھنے میں سستی نہ کیا کرو۔ یہ بات اللہ کے نزدیک زیادہ

عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ

انصاف والی ہے۔ اور شہادت کو زیادہ درست رکھنے والی ہے۔ نیز (تمہارے لئے اس بات کو) قریب تر (کر دینے

تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ

والی) ہے کہ تم شک میں نہ پڑو (پس لین دین کا لکھنا ضروری ہے) سوائے اس (صورت) کے کہ تجارت دست بدست ہو۔

جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَ لَا

جسے تم آپس میں (مال اور رقم) لے دے کر (اسی وقت قصہ ختم کر) لیتے ہو۔ اس صورت میں اس (لین دین) کے نہ

يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ

لکھنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور جب باہم خرید و فروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو۔ اور (یہ امر یاد رہے کہ) نہ کاتب کو

بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

تکلیف دی جائے اور نہ گواہ کو۔ اور اگر تم (ایسا) کرو تو یہ (بات) تم میں نافرمانی (کی علامت) ہوگی۔ اور چاہیے کہ

(تم) اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور (اگر تم ایسا کرو گے تو) اللہ تمہیں علم دے گا۔ اور اللہ (تعالیٰ) ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

حلّ لُغات ۔ تَدَايَنْتُمْ تَدَايَنَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں اِسْتَدَانَ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ۔ ایک

دوسرے سے قرض لیا۔ (اقرب)

یُمْلِلِ اَمْلَلْتُ الْکِتٰبَ عَلَی الْکَاتِبِ اِمْلَالًا وَ اَمْلَیْتُهٗ عَلَیْهِ اِمْلَاءً کے معنے ہیں اَلْقَیْتُهٗ عَلَیْهِ اَیْ قُلْتُ لَهٗ فَکَتَبَ عَنِّیْ۔ یعنی اَمْلَلْتُ الْکِتَابَ عَلَی الْکَاتِبِ کے یہ معنے ہیں کہ میں نے کاتب کو کچھ مضمون لکھوایا جسے اس نے لکھ لیا۔ پس یُمْلِلِ کے معنے ہیں لکھوائے۔ اِملاء بھی اسی میں سے ہے۔ (اقرب)

سَفِیْهًا کے معنے کم علم اور جاہل کے ہیں۔ (اقرب) لیکن امام شافعیؒ نے مُسرف کے معنے کئے ہیں (روح المعانی) اور مجھے بھی یہی پسند ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ۔ (البقرۃ:۱۴) یعنی منافق کہتے ہیں ہم تو انکار کر کے اپنا مال بچاتے اور اسے محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ مال کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے؟ یہ لوگ تو ایمان لا کر اپنا مال تباہ کر لیتے ہیں۔

تفسیر ۔ اوپر کی آیات میں قومی تباہی کا ایک بہت بڑا سبب اللہ تعالیٰ نے سُود بتایا تھا۔ اب دوسرا سبب قومی تنزل کا یہ بتاتا ہے کہ لین دین کے معاملات میں احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا۔ قرض دیتے وقت تو دوستی اور محبت کے خیال سے نہ واپسی کی کوئی میعاد مقرر کرائی جاتی ہے اور نہ اسے ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے اور جب روپیہ واپس آتا دکھائی نہیں دیتا تو لڑائی جھگڑا شروع کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ مقدمات تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور تمام دوستی دشمنی میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپس کے تعلقات کو خراب مت کرو اور قرض دیتے یا لیتے وقت ہماری ان دو ہدایات کو ملحوظ رکھو۔ اول یہ کہ جب تم کسی سے قرض لو تو اس قرض کی ادائیگی کا وقت مقرر کر لو۔ دوم روپیہ کا لین دین ضبطِ تحریر میں لے آؤ۔ اس شرط کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اس طرح مقروض کو احساس رہتا ہے کہ فلاں وقت سے پہلے پہلے میں نے قرض ادا کرنا ہے اور وہ اس کی ادائیگی کے لئے جدوجہد کرتا رہتا ہے اور پھر ایک اور فائدہ یہ ہے کہ قرض لینے والا ایک معیّن میعاد تک اطمینان کی حالت میں رہتا ہے اور اسے یہ خدشہ نہیں رہتا کہ نہ معلوم قرض دینے والا مجھ سے کب اپنے روپیہ کا مطالبہ کر دے؟ غرض اس میں دینے والے کا بھی فائدہ ہے اور لینے والے کا بھی۔ قرض دینے والے کا فائدہ تو یہ ہے کہ مثلاً ایک مہینے کا وعدہ ہے تو وہ ایک مہینہ کے بعد جا کر طلب کرے گا۔ یہ نہیں کہ اس کو روز روز پوچھنا پڑے اور قرض لینے والے کا فائدہ یہ ہے کہ جب وہ قرض لینے لگے گا تو سوچے گا کہ میں جتنے عرصے میں ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں اتنے عرصہ میں ادا بھی کر سکوں گا یا نہیں۔ اس کے علاوہ یہ شرط اس لئے بھی عاید کی گئی ہے کہ بعض کمزور لوگ اعتراض کر سکتے تھے کہ ہم سُود پر روپیہ اس لئے دیتے ہیں کہ قرض لینے والے کو اس کی ادائیگی کا فکر رہتا ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ جلد اس قرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ لیکن اگر سود نہ لیا

جائے تو اسے ادائیگی کا احساس نہیں رہتا۔ اس وسوسہ کے ازالہ کے لئے فرمایا کہ جب تم ایک دوسرے کو قرض دو۔ تو معاہدہ لکھوالیا کرو کہ فلاں وقت کے اندر اندر ادا کردوں گا تا کہ تمہارا روپیہ بھی محفوظ رہے اور دوسرے شخص کو بھی اپنی ذمہ واری کا احساس رہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر قرض اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ہو تو لکھ لیا کرو اور اگر اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى نہ ہو تو بے شک نہ لکھو۔ اس لئے کہ جب کوئی شخص کسی کو قرض دیتا ہے تو بہرحال ایک اَجَلٍ مُّسَمًّى کے لئے ہی دیتا ہے خواہ وہ میعاد تھوڑی ہو یا بہت۔ اس کے بعد وہ اسے وصول کرنے کا حقدار ہوتا ہے۔ یہ تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے دوسرے کو قرض دیا ہو اور پھر اس کے واپس لینے کا اس کے اندر کوئی احساس ہی نہ ہو۔ ہدیۃً یا امداد کے رنگ میں اگر کسی کو کوئی رقم دی جائے تو وہ ایک علیحدہ امر ہے۔ لیکن جس چیز پر قرض کے لفظ کا اطلاق ہوگا وہ بہرحال اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ہی ہوگی۔ خواہ زبان سے کوئی میعاد مقرر کی جائے یا نہ کی جائے۔ ہاں اگر خاص وقت کے لئے قرض نہیں بلکہ یونہی ایک دو گھنٹہ کے لئے یا ایک دو دن کے لئے ہے تو ایسی صورت میں اگر نہ لکھا جائے تو کوئی شرعی گناہ نہیں۔

افسوس ہے کہ مسلمان ان دونوں باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ یعنی نہ تو قرض دیتے وقت دوستی اور محبت کے نقطۂ نگاہ سے کوئی مدت مقرر کرتے ہیں۔ بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ جب جی چاہے دے دینا اور نہ اسے ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں جس کی وجہ سے بعد میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور انہیں اس کے تلخ نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ۔ تیسرا حکم یہ دیا کہ لکھنے والا کوئی اور شخص ہو۔ قرض دینے والا یا لینے والا نہ لکھے بلکہ ایک غیر شخص ہو جو عدل اور انصاف کے ساتھ لکھے۔ یعنی اپنی طرف سے اس معاہدہ میں کوئی بات نہ ملائے بلکہ وہی کچھ لکھے جس کے لکھنے کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ پھر کاتب کو حکم دیا کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے اسی طرح اسے چاہیے کہ وہ لکھے یا یہ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے لکھنا سکھایا ہے وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ كَمَا عَلَّمَهُ کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ جتنا ہنر اس کو حاصل ہو اس کے مطابق لکھے۔ اور یہ بھی کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے اس پر فضل کیا ہے اسے بھی چاہیے کہ وہ لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ یہ نہ ہو کہ وہ انکار کر دے اور ضرورت مند قرض نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہو۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ ۔ چوتھا حکم یہ دیا کہ جس کے ذمہ حق ہو وہ املاء کروائے۔ یعنی روپیہ لینے والے کو چاہیے کہ وہ خود تحریر لکھوائے۔ اس میں ایک بہت بڑی حکمت ہے۔ بظاہر تو یہ چاہیے تھا کہ روپیہ دینے والا

لکھوائے۔ مگر یہ حکم نہیں دیا۔ بلکہ اس کی ذمہ واری قرض لینے والے پر رکھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ روپیہ لینے والے کی ضرورت روپیہ مل جانے کی وجہ سے پوری ہو جاتی ہے۔ وہ اس وقت اپنے اندر خوشی کی ایک لہر محسوس کرتا ہے اور روپیہ کی طرف سے لا پرواہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ بعد میں ضرورت پوری ہونے پر کہہ دے کہ مجھے تو اس وقت یہ خیال ہی نہ تھا کہ کیا لکھوا رہے ہیں اس لئے اسے کہا کہ وہ خود ہی لکھوائے تا کہ اس کی زبان کا اقرار موجود رہے ورنہ جس نے روپیہ دیا ہوتا ہے وہ تو چوکس ہی ہوتا ہے کیونکہ اس نے تو اپنے پاس سے رقم دی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو تو بہر حال یاد ہی رہتا ہے کہ میں نے اس قدر روپیہ دیا ہوا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تحریر اس کے پاس رہے گی جس نے روپیہ دیا ہے۔ پس اس کے لئے تو موقعہ ہے کہ دیکھ لے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔ مگر لینے والے کے پاس تحریر نہیں رہنی اس لئے اگر اس وقت اس کی پوری توجہ تحریر کی طرف نہ ہو تو اسے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے۔

وَ لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا۔ یہ پانچواں حکم دیا کہ لکھواتے وقت وہ کوئی چیز اس قرض میں سے کم نہ کرے بلکہ اسے صحیح صحیح لکھوائے۔ اس میں بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرض میں تو کوئی کمی نہیں ہو سکتی کیونکہ دونوں فریق آمنے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ پھر لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا کا کیوں حکم دیا؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ بعض قرض عجیب عجیب شکل میں ہوتے ہیں۔ جن کو تحریر میں لاتے وقت لوگ ایسے پیچیدہ الفاظ لکھتے ہیں جن کا نتیجہ آخر میں کمی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ قرض جو لمبی میعاد کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں۔ اور مختلف انواع کے ہوں ان کو تحریر میں لاتے وقت کئی قسم کے دھوکے کر لئے جاتے ہیں جیسے حکومتوں کے قرض ہوتے ہیں۔ چونکہ ایسے لمبے قرضوں میں عموماً معاہدات کے وقت چالاکیاں اور فریب کیے جاتے ہیں اس لئے فرمایا کہ لکھوانے میں دیانت سے کام لو اور ایک حبّہ بھی کم کرنے کی کوشش نہ کرو۔

فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ۔ فرماتا ہے اگر وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے دماغی لحاظ سے اس قابل نہ ہو کہ مالی معاملات کی اہمیت کو سمجھ سکے یا کمزور ہو۔ مثلاً بچہ ہو یا بہت بوڑھا ہو یا لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ مثلاً گونگا ہو یا پڑھا لکھا نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کی طرف سے ایک ولی مقرر ہونا چاہیے جو تمام امور پورے عدل اور انصاف کے ساتھ ملکی قانون کے مطابق لکھوائے چونکہ پہلے یہ حکم دیا جا چکا تھا کہ قرض لینے والا لکھوائے اس لئے فرمایا کہ اگر وہ لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس صورت میں اس کا ولی اس ذمہ داری کو ادا کرے۔

وَ اسۡتَشۡہِدُوۡا شَہِیۡدَیۡنِ مِنۡ رِّجَالِکُمۡ ۔ یہ ساتواں حکم دیا کہ اس کے لئے دو گواہ بھی مِنۡ رِّجَالِکُمۡ بنائے جائیں یعنی اپنے واقف آدمیوں میں سے جن پر تمہیں اعتماد ہو اور جنہیں ضرورت کے وقت تم آسانی سے بلا سکتے ہو۔ کوئی غیر ملکی یا مسافر یا ناواقف آدمی نہ ہوں جن کی گواہی ضائع چلے جانے کا خطرہ ہو ورنہ تم ان کو کہاں تلاش کرو گے۔ اس کے بعد جو مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّہَدَآءِ کے الفاظ آتے ہیں ان کا تعلق بھی وَ اسۡتَشۡہِدُوۡا شَہِیۡدَیۡنِ سے ہی ہے۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ اگر رجال پسند نہ ہوں تو عورتیں ہی گواہ مقرر کر لی جائیں۔ اس جگہ تَرۡضَوۡنَ میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ گواہ ایسے ہونے چاہئیں جو فریقین کے پسندیدہ ہوں۔ یعنی وہ گواہی دینے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔۔ ایسے نہیں ہونے چاہئیں جنہیں شاہد عادل قرار نہ دیا جا سکے۔

فَاِنۡ لَّمۡ یَکُوۡنَا رَجُلَیۡنِ فَرَجُلٌ وَّ امۡرَاَتٰنِ ۔ یہ آٹھواں حکم دیا کہ اگر دو مرد نہ ملیں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنا لیا کرو۔ مگر گواہ انہیں کو بناؤ جن کو تم پسند کرو۔ ایک مرد کی بجائے دو عورتیں رکھنے کی وجہ یہ بتائی کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔ وہ بھول جائے تو یہ یاد دلائے۔ چونکہ دونوں میں سے ہر ایک بھول سکتی اور ہر ایک یاد کرا سکتی ہے۔ اس لئے لفظ مبہم رکھے ہیں اور اس لئے بھی کہ یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ کون بھولی ہے؟ اس لئے فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک دوسری کو یاد دلا دے۔ دراصل گھریلو جھگڑوں سے تعلق رکھنے والی باتوں کو تو عورت خوب یاد رکھتی ہے لیکن قضاء سے تعلق رکھنے والے امور کو اپنے ذہن میں زیادہ عمدگی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت کی روشنی میں ایک واقعہ کی دو گواہ عورتوں کو بیک وقت قضاء میں بلایا جا سکتا ہے اور قاضی کے سامنے بھی ان میں سے ایک عورت دوسری کو یاد دلا سکتی ہے کہ بہن یہ بات یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔ گویا جس طرح مرد بعض باتوں کا سوچ کر جواب دیتا ہے اسی طرح عورتیں بھی ایک دوسری کو یاد دلا کر جواب دے سکتی ہیں۔ پھر جس بات پر وہ دونوں اتفاق کریں وہی ان کی گواہی سمجھی جائے گی۔

مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ ہر شخص جو کسی کام کا عادی ہوتا ہے وہ بہ نسبت دوسروں کے جو اس کام میں نہ پڑے ہوں زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے۔ مرد چونکہ لین دین کے معاملات اور مقدمات وغیرہ میں اکثر حصہ لیتے رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ شہادت دینا کتنی بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس لئے وہ تمام واقعات کو احتیاط سے یاد رکھتے اور ہوشیاری سے اپنا بیان لکھواتے ہیں لیکن عورتوں کا نہ تو لین دین کے معاملات میں زیادہ دخل ہوتا ہے اور نہ عدالتوں کی کارروائی سے وہ واقف ہوتی ہیں۔ ان کا دائرہ عمل صرف گھریلو زندگی تک

محدود ہوتا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ کسی بات کو وہ پورے طور پر یاد نہ رکھ سکیں۔ اس احتیاط کے پیش نظر ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کی گواہی مقرر کی گئی ہے۔

مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ کا بدل ہے بعض نے کہا ہے کہ فَرَجُلٌ وَّ امۡرَاَتٰنِ کی صفت ہے (روح المعانی زیر آیت ھذا)۔ لیکن ابو حیانؒ کا قول ہے کہ یہ اِسۡتَشۡهِدُوۡا سے متعلق ہے اور یہی درست ہے۔ یعنی اس جگہ اہلیت اور پسندیدگی کی شرط مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہے۔ صرف مردوں یا صرف عورتوں کے لئے نہیں۔

وَ لَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا۔ یہ نواں حکم دیا کہ جب گواہوں کو گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں اور خواہ کسی فریق کی ناراضگی کا ہی خطرہ ہو پھر بھی سچی سچی بات بیان کر دیں۔

وَ لَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ صَغِيۡرًا اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ۔ اس جگہ اجل کو اجلہٖ کہہ کر پھر پہلے حکم کو دہرا دیا ہے جس کا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى میں ذکر کیا گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غیر میعادی قرضہ کو نہ لکھو یا صرف مدت کی مقدار لکھ لو اور قرض کو مبہم رہنے دو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرض بھی لکھ لو اور مدت بھی مقرر کر لو۔ چونکہ الی کے ایک معنے مع کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ مدت کو بھی ساتھ ہی لکھ لیا کرو۔ گویا قرض اس کی ادائیگی کی میعاد اور شہادت سب باتوں کو اکٹھا لکھو تا کہ دوسرے کو خیانت کا موقعہ ہی نہ ملے۔

ذٰلِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَ اَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ فرماتا ہے۔ یہ بات انصاف کو قائم کرنے والی اور شہادت کو درست رکھنے والی ہے۔ اگر یہ قانون نہ رکھا جاتا تو نہ تو انصاف قائم ہوسکتا اور نہ ہی شہادت درست رہ سکتی۔

وَ اَدۡنٰٓى اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا۔ اس میں بتایا کہ اس قانون کی اتباع کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم دوسرے کی دیانت اور امانت کے متعلق مختلف قسم کے وساوس اور شبہات سے محفوظ رہو گے۔ اور اپنے روپیہ کے متعلق بھی تمہیں اطمینان رہے گا کہ وہ ضائع نہیں ہوسکتا۔

اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ ۔ فرماتا ہے کہ ہم اس قانون میں ایک استثنٰی کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر ایسی تجارت ہو جو آمنے سامنے کی اور دست بدست ہو جسے تم اِدھر اُدھر چکر دیتے ہو تو ایسی صورت میں اگر تم اسے تحریر میں نہ لاؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ کیونکہ وہ دین نہیں۔ گویا اگر حاضر تجارت ہو اور ایک تاجر دوسرے تاجر کو کہہ دے کہ میرا مال فلاں گودام میں پڑا ہوا ہے میں ابھی جا کر لے آتا ہوں آپ مجھے اتنا روپیہ دے دیں تو ایسی

صورت میں کسی تحریر کے بغیر بھی دوسرے کو روپیہ دے دینے میں کوئی حرج نہیں۔ تاجروں کو ایسے معاملات روزانہ پیش آتے رہتے ہیں۔ گو لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَکْتُبُوْھَا کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجارت کے وقت لین دین کو نہ لکھنا گناہ تو نہیں لیکن اچھا یہ ہے کہ اس میں بھی رسید کاٹی جائے۔ جیسا کہ انگریزی فرموں اور تاجروں میں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز ان سے خریدی جائے تو ساتھ ہی وہ رسید بھی لکھ دیتے ہیں۔ اس سے کئی جھگڑے مٹ جاتے ہیں اور کمی بیشی یا چوری وغیرہ کا الزام عاید نہیں ہوسکتا۔ بہرحال اس جگہ تجارتِ سلم اور تجارتِ نقد کا ذکر کیا گیا ہے۔ تجارتِ سلم کی صورت میں مال اور مدت کی تعیین لازمی قرار دی گئی ہے اور اس کا لکھنا فرض کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس خرید کی صورت میں بھی کہ مال لے لیا جائے اور رقم کی ادائیگی کا آئندہ وعدہ ہو لیکن جب نقد سودا ہو کہ مال لے لیا اور قیمت دے دی تو لکھنا فرض نہیں رکھا گیا۔ گو عبارت سے ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی پسندیدہ یہی ہے کہ تحریر دی جائے۔ ہاں جب تحریر نہ ہو تو گواہ مقرر کر لے۔ جیسا کہ وَ اَشْھِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ سے ظاہر ہے تا کہ بعد میں دوکاندار چوری وغیرہ کا الزام نہ لگا دے اور کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔

وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّ لَا شَھِیْدٌ۔ فرمایا گواہ اور کاتب کو خرچ دیئے بغیر عدالتوں میں بلانا ان کے لئے نقصان کا موجب ہے۔ اس لئے ان کو خرچ دینا تمہارے لئے ضروری ہے۔ یہ لین دین کے سلسلہ میں گیارھواں حکم دیا کہ معاہدہ لکھنے والے اور گواہوں کو خرچ دو اور ان کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ اگر ایک کاتب جس کا کام یہ ہے کہ وہ اُجرت پر لکھتا ہے اسے مجبور کیا جائے کہ وہ بلا اجرت کوئی مضمون لکھ کر دے تو یہ اس پر ظلم ہوگا یا مثلاً کوئی شخص اگر کسی اور بڑی ذمہ واری کے کام پر جارہا ہو تو ایسے شخص کو مجبور کرنا کہ وہی لکھے۔ یا بلا خرچ آ کر گواہی دے اس پر ظلم ہے۔

وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِکُمْ فرماتا ہے اگر تم ان کو دق کرو گے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم ہمارے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہو۔ اور اطاعت کا جُوا اپنی گردن سے اُتارتے ہو بِکُمْ کے معنے فِیْکُمْ کے ہیں۔ یعنی یہ بات تمہارے اندر فسق اور خروج عَنِ الطَّاعَة کی رُوح پیدا کرنے والی ہوگی۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ یُعَلِّمُکُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ فرماتا ہے۔ یہ تمدنی احکام ہیں جن پر تمہارے معاشرہ کی ترقی کا انحصار ہے اس لئے ان کو ہمیشہ مدّنظر رکھو اور اس بات کو سمجھ لو کہ تم جتنا تقویٰ اختیار کرو گے اللہ تعالیٰ تمہارے کاروبار میں اتنی ہی برکت ڈالے گا اور تمہیں اپنے علم سے حصہ عطا فرمائے گا۔ کیونکہ ترقی کی کوئی راہ اس سے پوشیدہ نہیں۔ وہ ہر چیز کو خوب جانتا اور سمجھتا ہے۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ

اور اگر تم سفر پر ہو اور تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (اس کا قائم مقام) رہن با قبضہ ہے۔

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ

پس اگر تم میں سے کوئی شخص کسی (دوسرے) کو امین جانے اور (اسے کچھ رقم دے دے) تو جسے امین سمجھا گیا ہو

اَمَانَتَهٗ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنْ

اسے چاہیے کہ اس کی (یعنی امانت رکھنے والے کی) امانت کو (عند الطلب) واپس کر دے۔ اور اپنی ربوبیت کرنے

يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۴﴾ ع ۳۹

والے اللہ کا تقویٰ اختیار کرے۔ اور تم گواہی کو (کبھی) مت چھپاؤ۔ اور جو اسے چھپائے وہ یقیناً ایسا (شخص) ہے

جس کا دل گنہگار رہے۔ اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

حلّ لُغات۔ رِھٰنٌ مصدر بھی ہے۔ اور رِھْنٌ کی جمع بھی۔ اور اَلرَّھْنُ کے معنے ہیں۔ مَا وُضِعَ وَثِيْقَةً لِلدَّيْنِ۔ وہ چیز جسے قرضہ حاصل کرنے کے لئے بطور ضمانت رکھا جائے۔ وَقِيْلَ الرَّهْنُ لُغَةً اَلْحَبْسُ مُطْلَقًا وَ كَثِيْرًا مَّا يُطْلَقُ عَلَى الشَّيْءِ الْمَرْهُوْنِ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رھن کا لفظ مطلق حبس پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر استعمال اس چیز پر ہوتا ہے جسے قرض کے لئے گرو رکھا جائے. (اقرب)

اُؤْتُمِنَ اِءْ تَمَنَهٗ کے معنے ہیں عَدَّهٗ اَمِيْنًا اَوِ اتَّخَذَهٗ اَمِيْنًا اسے امین سمجھا یا امین بنا لیا۔

اِنَّهٗ میں ضمیر شان استعمال ہوئی ہے اور اس کے معنے ہیں "بات یہ ہے"۔

تفسیر فرماتا ہے۔ اگر تم سفر پر ہو اور تمہیں کوئی کاتب اور وثیقہ نویس نہ ملے تو اس کا قائم مقام رہن با قبضہ ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم اپنی کوئی چیز قرض دینے والے کے پاس بطور رہن رکھوا دو تا کہ اسے اپنے روپیہ کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ رہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام قرض کے معاملہ میں کتنی احتیاط اور دور اندیشی سے کام لینے کی ہدایت دیتا ہے اور کس طرح قدم قدم پر مومنوں کے اموال اور ان کے ایمان کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر ان قواعد کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص قرض کا انکار کر دے اور اس طرح دوسرے کو مالی لحاظ سے اور

اسے خود ایمانی لحاظ سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے۔ اسلام اس قسم کے خدشات کا علاج یہ بتاتا ہے کہ قرض کے معاملہ کو اول ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ ضبط تحریر میں لاؤ جس پر گواہوں کی گواہی بھی ثبت ہو۔ دوم اگر باقاعدہ تحریر کا کوئی انتظام نہ ہو سکے جیسا کہ سفر کی حالت ہے تو رہن با قبضہ کی صورت میں قرض دے دو۔ یوں تو حضر میں بھی رہن رکھنا جائز ہے بلکہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ قرض لیا اور اپنی زرہ رہن رکھ دی۔ (مسند احمد بن حنبل مسند عائشۃ ؓ) لیکن سفر کا خصوصیت سے اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی اور انتظام نہ ہو سکنے کی دقت موجود ہوتی ہے۔

اس کے بعد نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ۔ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کے متعلق مطمئن ہو اور اسے بلا رہن روپیہ دے دے تو وہ شخص جسے روپیہ دیا گیا ہے اور جسے امین جانا گیا ہے اس کا فرض ہے کہ دوسرے کے مطالبہ پر روپیہ بلا حجت واپس کر دے۔ اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے۔ اس جگہ قرض کو امانت قرار دیا گیا ہے جس میں یہ حکمت ہے کہ دنیا میں عام طور پر امانت کی ادائیگی تو ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن قرض کی ادائیگی میں ناواجب تساہل اور غفلت سے کام لیا جاتا ہے اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرض بھی ایک امانت ہی کی قسم ہے۔ کیا صرف اس وجہ سے کہ اس کے استعمال کی تم کو اجازت دی جاتی ہے اور تم پر احسان کیا جاتا ہے۔ تم اس کی ادائیگی میں سستی کرتے ہو۔ آخر امانت اور قرض میں کیا فرق ہے؟ یہی کہ امانت ایسی حالت میں رکھوائی جاتی ہے جبکہ امین کو ضرورت نہیں ہوتی اور قرض اس وقت دیا جاتا ہے جبکہ اسے ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں قرض لینے والے پر دوسرے کا احسان ہوتا ہے اور اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ وقت پر خندہ پیشانی سے قرض ادا کر دے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے ہر قسم کی امانتوں کی حفاظت اور ان کی بروقت واپسی کا بھی ایک عام سبق ملتا ہے جس کی طرف قرآن کریم کی ایک دوسری آیت وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (المومنون: ۹) میں بھی اشارہ کیا گیا ہے اور نصیحت فرمائی ہے کہ تمدنی معاملات کی ایک اہم شاخ دوسرے کے پاس امانت رکھوانا بھی ہے۔ پس نہ صرف قرض کے معاملات میں بلکہ امانت کے معاملہ میں بھی تمہیں تقویٰ اللہ سے کام لینا چاہیے ایسا نہ ہو کہ امانت لینے والا آئے اور تم واپسی میں پس و پیش کرنے لگ جاؤ۔

پھر ایک اور نصیحت کرتا ہے۔ فرماتا ہے وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ۔ تم آپس کے لین دین کے معاملات میں ہمیشہ سچی بات کیا کرو اور کبھی کسی گواہی کو چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ تمہارا دل گناہ گار ہو جائے گا۔ اور جب دل گندہ

ہو گیا تو تم میں نورِ ایمان کہاں باقی رہے گا؟ اس آیت میں صرف گواہوں کی تخصیص نہیں کی گئی بلکہ وہ تمام افراد جو کسی معاملہ میں شریک ہوں ان سب کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو جھوٹ بولنا یا جھوٹی گواہی دینا تو الگ رہا سچی گواہی کو بھی چھپانے کی کوشش کرے ورنہ تم دنیوی فائدہ تو ممکن ہے حاصل کر لو لیکن تم سے نیکیوں کی توفیق چھین لی جائے گی اور تمہارا دل سیاہ ہو جائے گا۔ غرض تمدنی مشکلات کے حل کے لئے اسلام نے ان آیات میں نہایت جامع ہدایات دی ہیں۔ اگر مسلمان ان احکام پر عمل کریں تو وہ کئی قسم کے جھگڑوں اور فسادات سے بچ سکتے ہیں۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ

اور جو کچھ (بھی) آسمانوں میں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے۔ اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے

اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ

خواہ تم اسے ظاہر کرو یا اسے چھپائے رکھو اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جسے چاہے گا بخش دے گا۔

يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۵﴾

اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔ اور اللہ ہر ایک چیز پر بڑا قادر ہے۔

تفسیر۔ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا والی آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ یعنی پہلے تو یہ کہا گیا تھا کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اگر تم اسے ظاہر کرو یعنی اس کے مطابق عمل کرو تب بھی اور اگر تم اس کو چھپاؤ یعنی صرف دل کے خیالات تک ہی محدود رکھو تمہارے جوارح اس کے مطابق کوئی عمل نہ کریں تب بھی اللہ تعالیٰ اس کے متعلق تم سے حساب لے گا۔ لیکن پھر کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جو اس کی طاقت سے باہر ہو (کتاب الناسخ و المنسوخ للنحاس باب ذکر الآیۃ التی ھی تتمۃ ثلاثین أیۃ)۔ اور چونکہ دل کے خیالات کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے اس لئے وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ والی آیت منسوخ ہو گئی مگر ان کا یہ خیال درست نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نسخ حالات کے تغیر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے نہ کہ دل کے خیالات کے ساتھ۔ مثلاً

اسلام میں پہلے گدھے کا گوشت کھانے کی اجازت تھی مگر بعد میں اس سے روک دیا گیا۔لیکن صحابہؓ کے دل کی حالت تو پہلے بھی ویسی ہی تھی جیسے بعد میں تھی۔یعنی جس طرح پہلے وہ اپنے دل کے خیالات پر کوئی قابو نہیں رکھتے تھے اسی طرح بعد میں بھی نہیں رکھتے تھے۔پس دل کے خیالات کے متعلق نسخ کے کوئی معنے ہی نہیں ہیں۔منسوخ تو وہ احکام ہوتے ہیں جو تبدیلئ حالات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور یہ امر تو تبدیلی پذیر ہے ہی نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے اس آیت کو سمجھا ہی نہیں۔انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ انسان کے دل میں جو خیال بھی آجائے اس کے حساب لینے کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ اس آیت میں ان امور کا ذکر ہے جن کو انسان اپنے نفس میں چھپا کر رکھتا ہے۔آنی خیالات تو بخشے جائیں گے۔لیکن ایک غلط عقیدہ،بغض،حسد اور بخل وغیرہ کے خیالات سب دل میں ہی ہوتے ہیں اگر ان کو بھی بخش دیا جائے تو پھر ایمان کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ پس اس جگہ تُخْفُوْہُ سے مراد حسد،کینہ اور بغض وغیرہ ہے جو دل میں رکھا جاتا ہے۔اسی طرح اس سے ایسے خیالات مراد ہیں جن کو انسان اپنے دل میں قائم رکھتا ہے اور جن کو عمل میں لانے کی نیت کر لیتا ہے۔لیکن اگر ایک خیال آئے اور انسان اسے اپنے دل سے فوراً نکال دے تو یہ کوئی گناہ نہیں بلکہ ایک نیکی ہے جس میں اس نے حصہ لیا۔پس محض دل کے خیالات قابل مؤاخذہ نہیں جب تک کہ ان پر عمل نہ کیا جائے یا ان کو پختگی سے قائم نہ کر لیا جائے۔چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے صحیحین میں مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَاحَدَّثَتْ بِہٖ اَنْفُسُھَا مَالَمْ تَتَکَلَّمْ اَوْ تَعْجَلْ بِہٖ۔یعنی اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان خیالات سے درگذر فرمادیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔بشرطیکہ وہ ان کو زبان پر نہ لائیں اور نہ ان پر جلدی سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

پس اس آیت میں ان خیالات کا ذکر کیا گیا ہے جن کو انسان اپنے دل میں چھپا کر رکھتا ہے اور جن کے متعلق سکیمیں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔وقتی اور آنی خیالات کا اس میں کوئی ذکر نہیں اور نہ ان پر کوئی گرفت ہے۔ہاں غلط عقائد اور بغض اور حسد اور کینہ وغیرہ بھی اگر بغیر توبہ کے بخش دیئے جائیں تو پھر ایمان کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی اس لئے ان پر مؤاخذہ کیا جائے گا۔کیونکہ یہی تمام گناہوں کی جڑھ ہیں۔اسی وجہ سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَ لٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ (البقرۃ:۲۲۶) یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں سے لغو قسموں پر تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں کرے گا ہاں جو گناہ تمہارے دلوں نے بالا رادہ کمایا ہے اس پر تم سے مؤاخذہ کرے گا۔دوسری جگہ فرماتا ہے۔اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ

عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (بنی اسرائیل: ۳۷) یعنی کان آنکھ اور دل سب کے متعلق انسان سے سوال کیا جائے گا یعنی کان آنکھ کے گناہوں کے علاوہ ان خیالات کا بھی جائزہ لیا جائے گا جو مستقل طور پر کسی انسان کے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النور: ۲۰) یعنی وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ مومنوں میں بدی پھیل جائے۔ ان کے لئے بڑا دردناک عذاب مقدر ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اس آیت میں بھی ان لوگوں کا کوئی عمل بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے دل کی حالت بیان کر کے سزا تجویز کی گئی ہے۔ پس وہ خیالات جن کو انسان اپنے دل میں قائم رکھے اور ان کے متعلق سوچتا اور غور کرتا رہے خواہ ان کو عمل میں نہ لا سکے قابل سزا ہیں مگر وہ ناپاک خیالات جو دل میں آئیں اور انسان بائیں طرف تھوک کر اور استغفار اور لاحول پڑھ کر ان کو دل سے نکال دے۔ ان پر کوئی گرفت نہیں۔ اسی طرح اوپر کے رکوع میں ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ (البقرۃ: ۲۸۴) یعنی تم سچی گواہی کو مت چھپاؤ اور یاد رکھو کہ جو شخص سچی گواہی کو چھپاتا ہے وہ یقیناً ایسا ہے جس کا دل گناہ گار ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ اِذَا هَمَّ عَبْدِيْ بِسَيِّئَةٍ فَلَا تَكْتُبُوْهَا عَلَيْهِ فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا سَيِّئَةً وَاِذَا هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوْهَا حَسَنَةً فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْا عَشْرًا (مسلم کتاب الإیمان باب اذا ھمّ العبد بالحسنة.....) یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کو یہ حکم دے دیا ہے کہ جب میرا بندہ کسی بدی کا ارادہ کرے تو اسے مت لکھو ہاں اگر اس ارادہ کے مطابق عمل بھی کر لے تو ایک بدی اس کے نامۂ اعمال میں درج کر دو۔ لیکن اگر وہ کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو اس کی ایک نیکی لکھو۔ اور اگر اس نیکی پر عمل کر لے تو پھر دس نیکیاں لکھو۔

ان آیات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی خیالات تین قسم کے ہیں۔ اول۔ ایک وسوسہ یا خیال اٹھا اور خود بخود چلا گیا۔ اس کا تو نہ ثواب ہے نہ عذاب۔ دوم۔ ایک بدعقیدہ دل میں پیدا ہوا یا ایک بدکام کی تحریک دل میں پیدا ہوئی اور اس نے اس کو رد کر دیا۔ چونکہ بدی کا مقابلہ نیکی ہے اس کو ایک نیکی کا ثواب ملے گا۔ سوم۔ اگر اس نے اس کو باہر نہ نکالا اور اپنا مال سمجھ کر دل میں رکھ لیا۔ تو اس کو ایک بدی کا گناہ ہوگا۔

احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ تو صحابہؓ سخت گھبرائے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم نماز اور روزہ اور جہاد اور صدقہ وغیرہ احکام پر تو

عمل کر سکتے ہیں مگر اس آیت میں ایک تو ایسا حکم نازل ہوا ہے جس پر عمل کرنے کی ہم میں طاقت ہی نہیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَقُوْلُوْا كَمَا قَالَ اَهْلُ الْكِتٰبِ مِنْ قَبْلِكُمْ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا بَلْ قُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ فَلَمَّا اقْتَرَأَهَا الْقَوْمُ وَ ذَلَّتْ بِهَا اَلْسِنَتُهُمْ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْ اَثَرِهَا اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (مسلم کتاب الایمان باب بیان تجاوز اللہ تعالٰی عن حدیث النفس ....) یعنی کیا تم چاہتے ہو کہ تم وہی کہو جو اہل کتاب نے تم سے پہلے کہا تھا کہ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا۔ تمہارا فرض تو یہ ہے کہ تم کہو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ جب صحابہؓ نے اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ کہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور انہوں نے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ اور اس کی مغفرت اور رحم کے طلبگار رہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہار خوشنودی کے طور پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد پر صحابہ کرامؓ نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی۔ پھر یہ آیت منسوخ کس طرح ہو سکتی ہے نسخ تو کسی عمل کا ہوتا ہے اور یہاں کسی عمل کا ذکر نہیں۔ پس یہ بالکل غلط ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس آیت میں تزکیۂ نفس کے لئے خیالات کی پاکیزگی بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔ بے شک خیالات کو کلّی طور پر پاک رکھنا تو ہر انسان کے لئے ناممکن ہے لیکن اگر کوئی بُرا خیال پیدا ہو تو اسے اپنے دل سے نکال دینا تو ہر انسان کے لئے ممکن ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے دل میں یہ خیال آئے کہ میں رشوت لوں تو وہ اس کے متعلق سوچنا اور مختلف قسم کی تدابیر عمل میں لانا شروع نہ کر دے بلکہ جہاں تک ہو سکے اس خیال کو فوراً اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کرے ورنہ اس کا نقش مضبوط ہوتا چلا جائے گا اور پھر اس خیال کا مٹانا سخت مشکل ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی چلتے چلتے کہیں مال دیکھتا ہے اور اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ میں اسے اٹھا لوں تو صرف اس خیال کے آنے پر اس سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اس خیال کے آنے پر وہ سوچنا شروع کر دے کہ میں کس طرح اس مال کو اٹھاؤں اور کس وقت اٹھاؤں تو اس کا یہ سوچنا اور تدبیریں کرنا قابل مؤاخذہ ہوگا۔

غرض وہ خیال جو دل میں گڑ جاتا ہے اور جس کو سوچنے میں انسان لگ جاتا اور تدبیریں شروع کر دیتا ہے اس کا محاسبہ ہوگا۔ ورنہ اگر کسی کو خیال آئے کہ میں چوری کروں اور وہ اسے فوراً...... اپنے دل سے نکال دے تو وہ ایک نیکی کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو قتل کرنے کا خیال آئے لیکن وہ اسے اپنے دل سے نکال دے تو وہ نیکی کرنے والا سمجھا جائے گا۔ سزا کا مستحق وہ اسی حالت میں ہوتا ہے جب وہ اس خیال پر قائم رہتا ہے۔ غرض تزکیۂ نفس کی بنیاد انسانی

قلب کی صفائی پر ہے اور اس کی اہمیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور جگہ بھی بیان فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔ (بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرأ لدینہ) یعنی انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ تندرست ہوتا ہے تو سارا جسم تندرست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ غور کے ساتھ سنو! کہ وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔

پس اسلام میں پاکیزگی اس کا نام نہیں کہ صرف زبان پر اچھی باتیں ہوں یا اعمال تو اچھے ہوں اور دل میں بُرائی ہو۔ بلکہ اسلام میں اصل پاکیزگی دل کی سمجھی جاتی ہے جو انسان اپنے دل کے لحاظ سے پاکیزہ نہیں وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ہرگز پاک نہیں۔ ایک شخص اگر قطعاً کوئی گناہ نہ کرے۔ مگر اس کے دل میں گناہ اور بُرائی سے الفت ہو اور گناہ کے ذکر میں اسے لذّت محسوس ہو تو وہ نیک اور پاک نہیں کہلائے گا۔ جب تک کہ اس کے دل میں بھی یہ بات نہ ہو کہ اسے گناہوں میں ملوث نہیں ہونا چاہیے اسی طرح کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ عادت کے ماتحت انہیں غصہ آجاتا ہے مگر گالی نہیں دیتے لیکن ان کا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ فلاں انسان بڑا بدمعاش اور شریر ہے ایسے لوگوں کے متعلق ہم یہ نہیں کہیں گے کہ وہ پاکیزہ ہیں بلکہ یہ کہیں گے کہ وہ اپنے گند کو چھپائے بیٹھے ہیں۔ پس اسلام میں پاکیزگی دل کی ہے۔ اعمال اور زبان تو آلات اور ذرائع ہیں جن سے پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے کہ دل کی حالت بھی محاسبہ کے نیچے آتی ہے۔ خواہ تم اپنے دل کی حالت کو چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ یہاں خدا تعالیٰ نے کیا عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے کہ زبان اور اعمال تو دلی حالت کا اظہار کرتے ہیں اصل چیز دل کی حالت ہے اور خدا تعالیٰ اس کا محاسبہ کرے گا۔ پس فرماتا ہے کہ تم اپنی دلی حالت کو ظاہر کرو یا چھپاؤ یعنی تم گندے اعمال نہ کرو یا زبان سے ظاہر نہ کرو مگر تمہارے دل میں گند ہے تو ضرور پکڑے جاؤ گے۔

یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ میں باء کے تین معنے ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک معنے ذریعہ اور سبب کے ہو سکتے ہیں اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ تم سے حساب لے گا۔ یعنی تمہارے اعمال کی بنیاد دل پر رکھی جائے گی۔ صرف ظاہری اعمال کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ دل کی حالت کو بھی مدّنظر رکھا جائے گا۔ اور تمہاری نیتوں کو بھی دیکھا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی علی رسول اللہ) یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ پس اعمال کے ساتھ دل کی نیت کو بھی مدّنظر رکھا جائے گا۔ (۲) دوسرے معنے اس کے فِیْ کے ہو سکتے ہیں یعنی ’’اس کے بارے میں‘‘ جیسا کہ ایک دوسری آیت

میں آتا ہے کہ لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ (البقرۃ:۲۲۶)

(۳) تیسرے معنے اس کے عَلٰی کے ہو سکتے ہیں۔یعنی اس جرم پر اللہ تعالیٰ تم سے حساب لے گا۔

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ میں بتایا کہ جیسی جیسی انسان کی نیت ہوگی ویسی ہی اس کی جزا ہوگی۔ سزا کے مستحق سزا پائیں گے اور جو مغفرت کے مستحق ہوں گے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دامن مغفرت میں لے لے گا۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چار عظیم الشان کاموں کا ذکر کیا گیا تھا۔ اوّل۔تلاوتِ آیات۔دوم تعلیم کتاب۔سوم تعلیم حکمت۔چہارم۔تزکیہ نفوس۔آپؐ کے ابتدائی تین کاموں پر اس سورۃ میں تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔اب صرف یُزَکِّیْھِمْ کے وعدہ کا ایفاء باقی تھا۔سو اس رکوع میں اس شق پر بھی روشنی ڈال دی۔ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تزکیہ نفوس کا کام کسی انسان کے بس کا نہیں۔آخر والدین سے زیادہ محبت کرنے والا اور کون وجود ہو سکتا ہے مگر وہ بھی اپنی اولاد کا تزکیہ نفس نہیں کر سکتے۔تزکیہ میں دو باتیں ضروری ہوتی ہیں۔اول ترک گناہ۔دوم روحانیت میں ترقی۔ترکِ گناہ کے لحاظ سے فرمایا کہ ہم تم کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور آسمان و زمین اور کائنات کا ذرہ ذرہ سب اللہ تعالیٰ کے ماتحت ہے۔پس جس چیز کے لینے کی وہ اجازت دے صرف وہی تم لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ کیونکہ مالک کی اجازت کے بغیر کسی چیز کو استعمال کرنے والا مستوجب سزا قرار پاتا ہے۔دوسری شق روحانیت میں ترقی کرنا تھا۔اس کے لئے فرمایا کہ سب کچھ ہمارا ہے۔اور ہمارے ہی ذریعہ سے ہر قسم کی خیر و برکت مل سکتی ہے۔اس لئے جب تم ہمارے حکموں کی اطاعت کرو گے تو ہم تم کو اپنی مغفرت کے دامن میں لے لیں گے۔اور ہمارا اقادرانہ تصرف تمہیں ہمارے قرب میں پہنچا دے گا۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ط

جو کچھ بھی اس رسول پر اس کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر وہ (خود بھی) ایمان رکھتا ہے اور (دوسرے)

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ

مومن بھی (ایمان رکھتے ہیں)۔یہ سب (کے سب) اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں

بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ٝ

پر ایمان رکھتے ہیں۔(اور کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں میں ایک (دوسرے) کے درمیان (کوئی) فرق نہیں

غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیۡكَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۲۸۶﴾

کرتے اور (یہ بھی) کہتے ہیں کہ ہم نے (اللہ کا حکم) سن لیا ہے اور ہم اس کے (دل سے) فرمانبردار ہو چکے ہیں۔(یہ لوگ دعائیں کرتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔

تفسیر ۔اس آیت میں تزکیۂ نفوس کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لانا مومن کا شعار قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جب تک عقیدہ اور عمل دونوں کی اصلاح نہ ہو انسان اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔مگر افسوس ہے کہ اتنی واضح آیت کے باوجود بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ نجات کے لئے صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آنا کافی ہے۔اس کے رسولوں اور کتابوں وغیرہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔اسی قسم کے خیالات ڈاکٹر عبدالحکیم پٹیالوی کے بھی تھے(حقیقۃ الوحی روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۱۲)۔اور انہی خیالات کی وجہ سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے اخراج از جماعت کی سزا دی اور بڑے زور سے تحریر فرمایا کہ یہ عقیدہ اسلام کے سراسر خلاف ہے۔اسلام تمام رسولوں پر اور بالخصوص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانا نجات کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کسی ایک رسول کا انکار بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنا دیتا ہے۔پس خواہ کوئی نبی تشریعی ہو یا غیر تشریعی پہلے زمانہ میں آچکا ہو یا آئندہ زمانہ میں آئے ہر ایک کا ماننا ضروری ہے۔بیشک مدارج کے لحاظ سے ان میں بڑا فرق ہے۔جس مقام پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس مقام پر نہ موسیٰ علیہ السلام ہیں نہ عیسیٰ علیہ السلام اور نہ کوئی اور نبی۔مگر جہاں تک نفسِ ایمان کا سوال ہے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح بغیر کسی فرق کے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء پر بھی ایمان لانا ضروری ہے اور اس لحاظ سے انبیاء میں کسی قسم کی تفریق پیدا کرنا جائز نہیں۔اسی طرح خدائی کلام پر عمل کرنے کے لحاظ سے بھی انبیاء میں کسی قسم کا کوئی امتیاز کرنا جائز نہیں۔بیشک ان کے درجات مختلف ہوں لیکن ان پر کلام نازل کرنے والا چونکہ ایک ہی ہے اس لئے یہ فرق کرنا کسی صورت میں بھی

جائز نہیں کہ مثلاً فلاں نبی چونکہ درجہ میں بڑا ہے اس لئے اس پر نازل ہونے والے کلام کو تو ہم مانیں گے لیکن فلاں نبی چونکہ درجہ میں چھوٹا ہے اس لئے اس پر نازل ہونے والے کلام کو ماننا ہمارے لئے ضروری نہیں۔ اس قسم کا احمقانہ فرق کرنا ایسا ہی ہے جیسے مثلاً کوئی کہے کہ میرے افسر نے فلاں حکم چونکہ رجسٹری کے ذریعہ نہیں بھیجا بلکہ عام ڈاک میں بھیجا ہے اس لئے میں نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ کیا جاہل سے جاہل شخص بھی اس قسم کا عذر پیش کر سکتا ہے اور کیا اسے تسلیم کرنے کے لئے کوئی تیار ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر خدائی کلام کے متعلق یہ فرق کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہی مومنوں کی یہ علامت بیان فرمائی ہے کہ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ یعنی وہ احکامِ الٰہیہ کی اطاعت میں ایک ذرا سی غفلت اور سستی بھی گوارا نہیں کرتے بلکہ ادھر اللہ تعالیٰ کا حکم سنتے ہیں اور ادھر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا۔ اے ہمارے رب! ہم نے تیرا حکم سن لیا اور ہم اس کے دل سے فرمانبردار ہیں۔

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ غُفْرَانَكَ دراصل اِغْفِرْ غُفْرَانَكَ ہے۔ یعنی غُفْرَانَكَ سے پہلے ایک فعل محذوف ہے اور معنے اس کے یہ ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنی بخشش سے حصہ دے اور ہمیں معاف فرما۔

چونکہ گذشتہ آیات میں تزکیۂ نفس کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ کے نتیجہ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے جو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ کہنے والی ہے اور جس کا سر خدا تعالیٰ کے آستانہ پر ہر حالت میں جھکا رہتا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا

اللہ کسی شخص پر سوائے اس (ذمہ داری) کے جو اس کی طاقت میں ہو کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ جو اس نے (اچھا) کام کیا

مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ

ہو (وہ بھی) اس کے لئے (نفع مند) ہوگا اور جو اس نے (برا) کام کیا ہو (وہ بھی) اسی پر (وبال ہو کر) پڑے گا۔ (اور وہ

رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ

یہ بھی کہتے ہیں کہ) اے ہمارے ربّ! اگر (کبھی) ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہمیں سزا نہ دیجیو۔ اے

مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ

ہمارے رب! اور تو ہم پر (اس طرح) ذمہ داری نہ ڈال جس طرح تو نے ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے (گزر چکے)

وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَ اغْفِرْ لَنَا ۥ وَ ارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰنَا

ہیں ڈالی تھی اے ہمارے رب! اور اسی طرح ہم سے (وہ بوجھ) نہ اٹھوا جس (کے اٹھانے) کی ہمیں طاقت نہیں۔ اور

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۸۶ ع

ہم سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے۔ اور ہم پر رحم کر (کیونکہ) تو ہمارا آقا ہے پس کافروں کے گروہ کے خلاف ہماری مدد کر۔

حلّ لُغات۔ یُکَلِّفُ کَلَّفَهٗ کے معنے ہیں اَمَرَهٗ بِمَا یَشُقُّ عَلَیْهِ اسے ایسے کام کا حکم دیا جو اس پر گراں گذرا۔ حدیث میں آتا ہے کُلِّفْنَا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا نُطِیْقُ (مسلم کتاب الایمان باب قولہ تعالیٰ و ان تبدوا ما فی انفسکم) ہمیں ایسے ہی اعمال کا حکم دیا گیا ہے جن کی بجا آوری کی ہم طاقت رکھتے ہیں۔

اِصْرًا اَلْاِصْرُ کے معنے ہیں اَلثِّقْلُ۔ بوجھ اَلْعَهْدُ۔ پختہ عہد۔ اَلذَّنْبُ۔ گناہ۔ (اقرب)

حَمَّلْتَهٗ حَمَّلَهُ الْاَمْرَ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ یَحْمِلُهٗ وَ کَلَّفَهٗ بِحَمْلِهٖ۔ اس سے بوجھ اٹھوایا اور بوجھ اٹھوا کر اسے تکلیف اور مشقّت میں ڈالا۔

تفسیر۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جس کی بجا آوری کی انسان میں طاقت نہ ہو۔ یا اس کی استعداد اور قابلیت سے بالا ہو۔ پس جبکہ اس کی طرف سے ہمیشہ ایسے ہی احکام نازل ہوتے ہیں جن پر عمل انسانی مقدرت سے باہر نہیں ہوتا تو لازماً سب ذمہ داری انسان پر ہی عائد ہوتی ہے اور انعاماتِ الٰہیہ کا بھی وہی مستحق ٹھہرتا ہے اور عدمِ تعمیل کی بنا پر سزا کا بھی وہی مستحق قرار پاتا ہے اسی لئے آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ یعنی انسان اگر اچھا عمل کرے گا تو اس کا فائدہ بھی اسے ہی پہنچے گا۔ اور اگر بُرا کام کرے گا تو اس کا نقصان بھی اسے ہی ہوگا۔

ضمناً اس آیت میں اس مضمون کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جو کام اس زمانہ میں امتِ محمدیہ کے سپرد ہوا

ہے وہ اس کی طاقت اور قابلیت کے عین مطابق ہے اور ایک دن وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دنیا کو دکھا دے گی کہ وہ اس منصب کی سب سے زیادہ اہل تھی۔ اگر یہی کام پہلے کسی نبی کی امت کو کرنا پڑتا تو وہ اسے کبھی سرانجام نہ دے سکتی۔

(۲) اس آیت میں اسلام کی اس فضیلت کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس کے تمام احکام میں انسان کی کمزوریوں اور ضروریات کو مدّنظر رکھتے ہوئے ایسی لچک رکھی گئی ہے کہ ہر حالت میں وہ ان پر عمل کر سکتا ہے۔ مگر باقی مذاہب اپنی تعلیم میں یا تو افراط کی طرف چلے گئے ہیں یا تفریط کی طرف اور اس طرح وہ اپنے حقیقی توازن کو کھو بیٹھے ہیں۔ اور قلوب پر ان کی حکومت جاتی رہی ہے۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو فطرت انسانی کے مطابق تعلیم دینے کی وجہ سے انسان کے دل پر حکمرانی کر رہا ہے۔

(۳) اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ جب تم کو تمام احکام تمہاری طاقت اور قابلیت کے مطابق دیئے گئے ہیں اور تم پر کوئی ناقابلِ برداشت بوجھ نہیں ڈالا گیا تو اب تمہارا فرض ہے کہ تم بھی دیانتداری کے ساتھ ان احکام پر ایسا عمل کرو جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے۔

(۴) اس آیت میں کفارہ کا بھی ردّ کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ گناہوں سے بچنا انسانی مقدرت سے بالا نہیں بلکہ ہر انسان کے اندر ایسی طاقت رکھی گئی ہے کہ وہ اگر گناہوں پر غالب آنا چاہے تو آ سکتا ہے۔ پس اس کی نجات کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت نہیں بلکہ انسان کو خود اپنے فطری قویٰ کو ابھارنے اور ان سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ میں بتایا کہ ہم نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ اگر کوئی اچھا کام کرے گا تو اسے اس کا فائدہ پہنچے گا اور اگر کوئی بُرا کام کرے گا تو اس کا نقصان بھی اسے ہی پہنچے گا۔

کسب اور اکتساب میں یہ فرق ہے کہ کسب کی نسبت اکتساب میں زیادہ محنت اور مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے پس نیکی کے متعلق کسب اور بدی کے متعلق اکتساب کا لفظ رکھ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نیکی ایک فطری چیز ہے جس پر عمل انسان کے لئے کوئی بوجھ نہیں ہوتا لیکن بدی ایک غیر فطری چیز ہے جو اخلاقی قوتوں کو برمحل استعمال نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کے مرتکب کو ایسے رستہ پر چلنا پڑتا ہے جو اس کے لئے تکلیف اور اذیت کا باعث بنتا ہے۔

پھر ان الفاظ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نیکی تو ہر حال میں قابلِ جزا ہے۔ لیکن بدیوں میں سے

صرف اس بدی کی سزا ملے گی جس میں اکتساب کا رنگ پایا جائے گا۔ یعنی قصداً اور ارادتاً اس کا ارتکاب کیا جائے گا۔

اس کے بعد تزکیہ نفس کے لئے اللہ تعالیٰ مومنوں کو بعض خاص دعائیں سکھلاتا ہے کیونکہ دعا ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ کا چہرہ دیکھتا ہے اور دعا ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے اس کی قدرتوں پر زندہ ایمان پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ دُعا جو اللہ تعالیٰ خود سکھائے اس کی قبولیت میں تو کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہمارے مومن بندے ہمیشہ یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا۔ اے ہمارے ربّ! اگر ہم کبھی بھول جائیں یا کوئی خطا ہم سے سرزد ہو جائے تو ہمیں سزا نہ دیجیئو بلکہ ہم سے رحم اور عفو کا سلوک کیجیئو۔ بھول جانے کے معنے یہ ہیں کہ کوئی کام کرنا ضروری ہو مگر نہ کیا جائے اور خطا کے یہ معنے ہیں کہ کام تو کیا جائے مگر غلط کیا جائے۔ بعض لوگ اس بحث میں پڑ گئے ہیں کہ نسیان اور خطا دو ہم معنے لفظ یہاں کیوں لائے گئے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا میں تمام کام دو قسم کے ہوتے ہیں کوئی کام تو ایسے ہوتے ہیں جو کرنے ضروری ہوتے ہیں مگر انسان نہیں کرتا اور کوئی کام ایسے ہوتے ہیں جو انسان کرتا تو ہے مگر غلط طور پر کرتا ہے اور یہ دونوں ہی غلطیاں ہوتی ہیں۔ نسیان کے معنے بھول جانے کے ہیں اور بھولنا کرنے کے متعلق ہوتا ہے نہ کرنے کے متعلق نہیں ہوتا۔ پس لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ کے معنے یہ ہوئے کہ خدایا ایسا نہ ہو کہ جو کام ہمارے لئے کرنے ضروری ہیں وہ ہم نہ کریں اور اس طرح ہم ترقی سے محروم ہو جائیں۔ پس تو ہماری حفاظت فرما اور ہمیں اس غلطی سے محفوظ رکھ۔ اَوْ اَخْطَاْنَا اور یا الٰہی یہ بھی نہ ہو کہ جو کام ہمیں نہیں کرنا چاہیے وہ ہم کر لیں یا ہم کریں تو وہی جو ہمیں کرنا چاہیے مگر غلط طریق پر کریں پس نسیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کام کرنے تھے وہ انسان سے رہ جائیں اور خطا کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کام نہیں کرنے چاہیے تھے وہ کر لئے جائیں یا جن کاموں کا کرنا ضروری تھا وہ غلط طور پر کئے جائیں۔ غرض نسیان عدم عمل کا نام ہے اور خطا عمل کی خرابی کو کہتے ہیں۔ اسی لئے یہاں دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ پس ان میں سے کوئی لفظ بھی زائد نہیں بلکہ ہر لفظ اپنی اپنی جگہ ضروری ہے۔ نسیان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آدمؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ:۱۱۶) یعنی آدمؑ بھول گیا لیکن ہم نے بھی دیکھ لیا کہ اس کے دل میں ہمارا حکم توڑنے کے متعلق کوئی ارادہ نہ تھا۔

پھر فرماتا ہے۔ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔ یعنی مومن یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ اے خدا! ہم پر اس طرح ذمہ واری نہ ڈالیو۔ جس طرح تو نے ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں ڈالی تھی۔ اِصْرٌ کے ایک معنے چونکہ گناہ کے ہیں اس لئے اس دعا کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اے خدا! تو ہم پر اس

طرح گناہ نہ ڈال جس طرح تو نے پہلی قوموں پر ڈالا۔ یعنی ہمیں ان اعمال سے اپنے فضل سے محفوظ رکھ جن کے نتیجہ میں ہماری طرف گناہ منسوب ہوں۔ اور دنیا میں ہمیں ظالم اور روسیاہ قرار دیا جائے اور طرح طرح کے عیوب ہماری طرف منسوب کئے جائیں جیسا کہ پہلی قوموں کے ساتھ ہوا۔

اِصْرٌ کے دوسرے معنے عھدٌ کے ہیں اس لحاظ سے لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا کے معنے یہ ہیں کہ الٰہی! ہم سے کوئی ایسا عہد نہ لیجیئو جس کو توڑ کر ہم تیری سزا کے مستوجب ہوں جس طرح پہلی قومیں سزا کی مستوجب ہوئیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عہد لینا بُری چیز تھی تو پھر دوسری امتوں سے کیوں لئے گئے اور اگر اچھی چیز ہے تو اس امت سے کیوں نہ لیا جائے؟ بلکہ اس کے کامل اُمت ہونے کی وجہ سے تو ضروری ہے کہ اس کے ہر فرد سے عہد لیا جائے۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم سے کوئی عہد ہی نہ لیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے ربّ! آپ ہم سے جو عہد لیں اس کے متعلق ہمیں توفیق بھی عطا فرمائیں کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں اور پہلی قوموں کی طرح عہد شکن اور غدار قرار نہ پائیں۔ گویا یہ دعا عہد سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ عہد کی ذمہ داریوں پر باحسن طریق عمل پیرا ہونے کے لئے ہے۔

(۳) اِصْرٌ کے ایک معنے بوجھ کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے معنے یہ ہیں کہ اے ہمارے ربّ! تو ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر بوجھ ڈالا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ ہمیں اتنی نمازیں پڑھنے کو نہ بتا کہ جو ہم پڑھ نہ سکیں کیونکہ خدا تعالیٰ پہلے ہی فرما چکا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا خدا تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آتے ہیں وہ انسان کی طاقت اور اس کی توفیق کے مطابق ہوتے ہیں۔ پس اس کے یہ معنے نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ بعض جرائم کی بنا پر پہلے لوگوں کے لئے جو سزائیں نازل کی گئی تھیں وہ سزائیں ہم پر نازل نہ ہوں اور ہم سے وہ غلطیاں سرزد نہ ہوں جو پہلے لوگوں سے سرزد ہوئیں اور جن کی وجہ سے وہ تباہ کر دیئے گئے۔ انہوں نے تیری نافرمانیاں کیں اور تیرے احکام کے خلاف انہوں نے قدم اٹھایا جس کی وجہ سے ان پر ایسی حکومتیں مسلّط ہوئیں اور ایسے قوانین ان کے لئے مقرر کر دیئے گئے جو ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھے۔ تو ہمیں اپنے فضل سے ایسے مقام پر کھڑا کیجیئو کہ ہم سے ایسی خطائیں سرزد نہ ہوں اور ہمیں ایسی سزائیں نہ ملیں جو ہمارے نفس کی طاقت برداشت سے باہر ہوں اس کے یہ معنے نہیں کہ نفس کی طاقتِ برداشت کے مطابق اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی سزا ملے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر روحانی سزا انسان کی برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ یہ انسان کی رذالت ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ایسی سزا کو برداشت کر لیتا ہے ورنہ اگر شرافتِ نفس ہو تو چھوٹی سے چھوٹی سزا

بھی انسان کے لئے نا قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ جب کسی کو دوسرے سے محبت ہوتی ہے تو اس کی معمولی سی ناراضگی کو دیکھ کر ہی اس کا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ کہتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں میری طرف نہیں پھیریں۔ بعض دفعہ کہتا ہے اس نے مجھ سے اچھی طرح باتیں نہیں کیں۔ بعض دفعہ کہتا ہے اس نے مجھ سے باتیں تو کیں مگر ان میں بشاشت معلوم نہیں ہوتی تھی اور اس بات کا اس کی طبیعت پر اتنا بوجھ پڑتا ہے کہ وہ غمگین ہو جاتا ہے۔ پس اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمیں بڑی سزا نہ دیجیئو چھوٹی سزا دیجیئو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہمیں کوئی سزا دیجیئو ہی نہیں نہ چھوٹی نہ بڑی۔

پھر دنیا میں بعض مصائب ایسے بھی ہوتے ہیں جو بغیر قصور کے آجاتے ہیں۔ قصور ہمسایہ کا ہوتا ہے اور دکھ اسے پہنچ جاتا ہے قصور دوست کا ہوتا ہے اور سزا کا اثر اس پر آ پڑتا ہے اس لئے جہاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ دعا سکھلائی کہ تم یہ کہا کرو کہ ہم سے ایسی خطا یا نسیان نہ ہو جائے جس کی وجہ سے ہم تیری سزا کے مستحق ہو جائیں۔ وہاں دوسری دعا یہ سکھلائی کہ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ اے خدا! ایسا نہ ہو کہ قصور تو ہمارے ہمسایہ کا ہو اور سزا ہمیں مل جائے۔ یا قصور دنیا کا ہو اور اس کی مصیبت کا اثر ہم پر آ پڑے مگر یہاں ایک شرط بڑھا دی اور وہ یہ ہے کہ مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ اس شرط کو اس لئے بڑھایا گیا ہے کہ یہاں ناراضگی کا سوال نہیں بلکہ دنیوی مصائب اور ابتلاؤں کا ذکر ہے ناراضگی بے شک چھوٹی بھی برداشت نہیں ہو سکتی مگر چھوٹی تکلیف برداشت کر لی جاتی ہے۔ پس جہاں روحانی سزا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذکر تھا وہاں تو یہ دعا سکھلائی کہ ہم میں تیری کسی ناراضگی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں وہ ناراضگی چھوٹی ہو یا بڑی مگر جب دنیوی تکالیف کا ذکر آیا تو یہ دعا سکھلائی کہ چھوٹے موٹے ابتلاؤں پر مجھے اعتراض نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرا قدم ہمیشہ پھولوں کی سیج پر رہے۔ البتہ وہ ابتلاء جو تیری ناراضگی کا موجب نہیں اور جو دنیا میں عام طور پر آیا ہی کرتے ہیں۔ ان کے متعلق میری صرف اتنی درخواست ہے کہ کوئی ابتلاء ایسا نہ ہو جو میری طاقت سے بالا ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ مومن ایسے ابتلاء خود چاہتا ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے چونکہ بتایا ہوا ہے کہ میں مومنوں کا امتحان لیا کرتا ہوں اس لئے مومن یہ نہیں کہتا کہ خدایا میرا امتحان نہ لے بلکہ وہ کہتا ہے خدایا امتحان تو لیجیئو مگر ایسا نہ لیجیئو کہ میری طاقت سے بڑھ کر ہو۔

غرض جو حصہ ناراضگی کا تھا وہاں تو کہہ دیا کہ میں ذرا سی ناراضگی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر جہاں دنیوی تکالیف اور ابتلاؤں کا ذکر تھا وہاں کہہ دیا کہ خدایا! تکالیف تو آئیں مگر ایسی نہ ہوں جو ہماری طاقت سے بڑھ کر ہوں۔

پھر فرمایا وَاعْفُ عَنَّا۔ اے خدا ہم سے عفو کر۔ یہ نَسِیْنَآ کے مقابلہ میں ہے۔ یعنی جو کام ہمیں کرنے چاہیے تھے چونکہ ہم نے نہیں کئے اس لئے ہمیں تو معاف فرمادے۔

وَاغْفِرْ لَنَا اور جو غلط کام ہم کر چکے ہیں ان کے خمیازہ سے ہمیں بچالے اور ان کاموں کو نہ کئے کی طرح کر دے۔ عفو کے معنے رحم کے بھی ہوتے ہیں اور جو چیز کسی انسان سے رہ جائے اس کا ازالہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ وہ مہیّا کر دی جائے۔ اس لئے وَاعْفُ عَنَّا کے یہ بھی معنے ہیں کہ جو چیز رہ گئی ہے اس کو تو اپنے فضل اور رحم سے ہمیں مہیّا فرمادے۔ اس کے مقابلہ میں جو کام غلط ہو جائے اس کی درستی اسی طرح ہوسکتی ہے کہ اس کو مٹا دیا جائے۔ چنانچہ اَخْطَاْنَا کے مقابلہ میں اغْفِرْ لَنَا رکھ دیا۔ اور غَفَرَ کے معنے عربی زبان میں مٹا دینے کے ہی ہوتے ہیں (مفردات)۔ پس اس کے معنے یہ ہیں کہ اے خدا جو کام ہم غلط طور پر کر چکے ہیں ان کو مٹا دے اور انہیں نہ کئے کی طرح کر دے۔ گویا ایک طرف تو یہ کہہ دیا کہ جو کام ہم نے نہیں کیا اور اس طرح رخنہ واقع ہو گیا ہے اس رخنہ کو تو اپنے فضل سے پُر کر دے اور دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ جو کام ہم غلط طور پر کر چکے ہیں ان کو تو مٹا ڈال۔

وَارْحَمْنَا پھر اس کام کے نتیجہ میں ہم سے جو اور غلطیاں ہوئی ہیں اور جن ترقیات کے حصول میں روک واقع ہو گئی ہے ان غلطیوں کے متعلق بھی ہم پر رحم فرما۔ اور ہماری ترقیات کے راستہ میں جو روکیں حائل ہو گئی ہیں ان کو اپنے فضل سے دُور کر دے۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا تو ہمارا مولیٰ ہمارا آقا اور ہمارا مالک ہے۔ آخر ہماری کمزوریاں کسی نہ کسی رنگ میں لوگوں نے تیری طرف ہی منسوب کرنی ہیں۔ لوگوں نے یہی کہنا ہے کہ یہ خدائی جماعت کہلاتی تھی مگر اسے بھی دکھ پہنچا اور اسے بھی دوسروں کی طرح تکلیف ہوئی۔ پس اے ہمارے مولیٰ! تو ہمارا آقا ہے اور ہم تیرے خادم۔ تو آقا ہونے کے لحاظ سے ہم پر رحم کر کیونکہ ہماری کمزوریاں آخر تیری طرف ہی منسوب ہوں گی اور لوگ ہدایت سے محروم ہو جائیں گے۔

احادیث میں آتا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب ابوسفیانؓ نے بڑے زور سے کہا کہ لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ یعنی ہماری تائید میں ہمارا عزّٰی بُت ہے۔ مگر تمہاری تائید میں کوئی بت نہیں۔ تو اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ تم کہو۔ لَنَا مَوْلٰی وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ۔ (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ اُحد) ہمارا والی اور ہمارا مددگار ہمارا حیّ و قیوم خدا ہے مگر تمہارا کوئی والی اور مددگار نہیں۔ یہ اَنْتَ مَوْلٰنَا کی سچائی کا کیسا عملی ثبوت تھا کہ تلواروں کے سایہ میں بھی انہوں نے یہی کہا کہ اللہ ہمیں بچا سکتا ہے۔

آخر میں یہ تعلیم دی کہ تم خدا تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرتے رہو کہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی اے خدا! ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما۔ ہم بے بس اور کمزور ہیں لیکن ہمارا دشمن طاقتور اور تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ ہمارا غلبہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ تو ہمارے ساتھ ہو اور اپنے رحم اور کرم سے کام لے کر ہمارے ایک ایک آدمی کے اندر ایسی روح پھونک دے کہ وہ سو سو بلکہ ہزار ہزار مخالف پر بھی بھاری ہو اگر تو اپنے فضل سے ایسے سامان پیدا فرماوے تو ہم بچ سکتے ہیں ورنہ ہمارے بچاؤ کی اور کوئی صورت نہیں۔ پس اے ہمارے رب! جو لوگ ایسے کام کر رہے ہیں جن سے اسلام کی ترقی میں روک واقع ہوتی ہے ان پر تو ہمیں غالب کر اور ایسے سامان پیدا فرما جو تیری تبلیغ اور تیرے نام کو دنیا میں پھیلانے کا باعث ہوں۔

پھر یہ دُعا صرف مادی غلبہ کے لئے ہی نہیں بلکہ روحانی رنگ میں بھی دشمنوں پر غالب آنے کے لئے ایک عاجزانہ پکار ہے اور اس میں خدا تعالیٰ کے حضور یہ عرض داشت پیش کی گئی ہے کہ اے ہمارے رب! اگر ہمارے اندر تیرے اس پاک رسول پر ایمان لانے کے نتیجہ میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا اور کفار میں اور ہم میں ایک نمایاں روحانی امتیاز اور فرق لوگوں کو محسوس نہ ہوا۔ ہمارے اخلاق اور کردار ان سے بلند نہ ہوئے اور ہمارے معاملات ان سے بہتر نہ ہوئے تو دنیا ہمیں طعنہ دے گی کہ انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر کیا فائدہ اٹھایا؟ ان میں تو کوئی بھی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ پس اے خدا! تو اپنے فضل سے ہمیں اپنے اندر ایسا نیک تغیر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے رحم اور کرم کو جذب کر لیں اور کفار پر ہمیں جسمانی رنگ میں ہی نہیں بلکہ اخلاق اور روحانیت کے لحاظ سے بھی ایک نمایاں تفوق اور غلبہ حاصل ہو جائے اور تیرا دین دنیا کے کناروں تک پھیل جائے۔

تمّت

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

انڈیکس

جلد سوم

۞۞۞۞۞۞

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّی عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اشاریہ کلید مضامین

ذ

ر

ز

س

ش

اسماء

مقامات

حل اللغات

☆☆☆☆☆

کلیدِ مضامین

مرتبہ: سید عبدالحیٔ ایم۔اے

اللہ جل جلالہ

ہستی باری تعالیٰ

توحید

صفات الٰہیہ

مقصود

احتیاج

خلق

علم

کلام

رحمت

چ

حرم

حسن سلوک

حسن کلام

حق ج حقوق

حقوق العباد

حق الخدمت

حکمت

حکومت

حلال (نیز دیکھئے طیب۔ حرام)

قرب الٰہی

قربانی

قرضِ حسنہ

قروء

قسم

م

☆☆☆☆☆

اسماء

ش

ط

ع

ف

ق

ک

گ

ل

ھ

ی

☆☆☆☆☆

مقامات

☆☆☆☆☆

حلّ اللّغات

الف

☆☆☆☆☆

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر و ترجمہ

التفسیر الکبیر للامام الفخر الرازی
تفسیر ابن کثیر
الکشاف للزمخشری
البحر المحیط لابی حیان
تفسیر فتح البیان
املاء مامن بہ الرحمٰن
وہیری کا ترجمہ قرآن
روح المعانی
جامع البیان للطبری
تفسیر القرطبی
الدر المنثور
تفسیر الخازن
الجواھر فی تفسیر القرآن
تفسیر الثعلبی
تفسیر لماتریدی (تأویلات اھل السنة)
تفسیر مظھری
تفسیر القرآن العظیم لابن ابی حاتم
مجمع البیان
تفسیر ابن جریر
روح البیان
● Introduction to the Holy Quran by Richard Bell

حدیث

جامع صحیح البخاری
صحیح مسلم
سنن الترمذی
سنن النسائی
سنن ابی داؤد
سنن ابی ماجه
مشکاة المصابیح
مسند احمد بن حنبل
کنز العمال
شرح معانی الآثار لابی جعفر طحاوی
مؤطا امام مالك

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام و کتب سلسلہ

حقیقۃ الوحی
اسلامی اصول کی فلاسفی
کشتی نوح
تبلیغ رسالت
حمامة البشریٰ
الحکم
فتاویٰ حضرت مسیح موعود علیہ السلام

تاریخ

شرح العلامة الزرقانی علی المواھب اللدنیة
تاریخ الطبری
السیرۃ النبویة لابن ھشام
السیرۃ الحلبیة
اسد الغابة
اصابة فی تمییز الصحابة
سیرت عمر ابن الخطاب الجوزی
تاریخ الخمیس

اسلامیات

فتوحات مکیہ از محی الدین ابن عربیؒ
مثنوی مولانا رومؒ
فتاویٰ دار العلوم دیوبند
اشارات فریدی
تذکرۃ الاولیاء از حضرت فرید الدین عطار
الاستیعاب

کتب اہل کتاب

بائبل (عہد نامہ قدیم وجدید)

کتب ہندو مذہب

اتھروید
ستیارتھ پرکاش

ادب/صرف/نحو

السبع معلقات
الشعر و الشعراء لابن قتیبه
الصاحبی الاحمد بن فارس

متفرق

کتاب الفقه علی المذاھب الاربعة
بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع
الھدایة شرح بدایة المبتدی
مدارج السالکین

لغت

المنجد
لسان العرب
اقرب الموارد
الکلیات لابی البقاء
المفردات فی غریب القرآن لامام راغب الاصفهانی
تاج العروس من جواهر القاموس
مجمع البحار
انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا
- Encyclopedia Britannica

جیوش انسائیکلو پیڈیا
- Jewish Encyclopedia

نیلسنز انسائیکلو پیڈیا
- Nelson Encyclopedia
- Encyclopedia of religion and Ethics

سیبویه
شرح مختصر المعانی
اعراب القرآن الکریم للدرویش

☆☆☆☆☆